شیخ الاسلام

مولانا حسین احمد مدنی

فرید الوحیدی

بشکریہ جناب محمد زبیر صاحب

بیدل لائبریری

شرف آباد، بہادر آباد کراچی

ذخیرہ کتب

محمد احمد ترازی

شیخ الاسلام

مولانا حُسین احمد مدنی

ایک سوانحی و تاریخی مُطالعہ
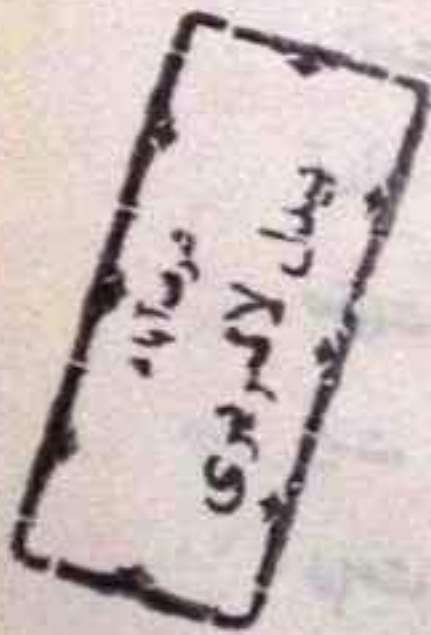
فریدُالوحیدی

فاضل (دیوبند) - ایم - اے - (علیگ)

قومی کتاب گھر

61/1 ذاکر نگر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵
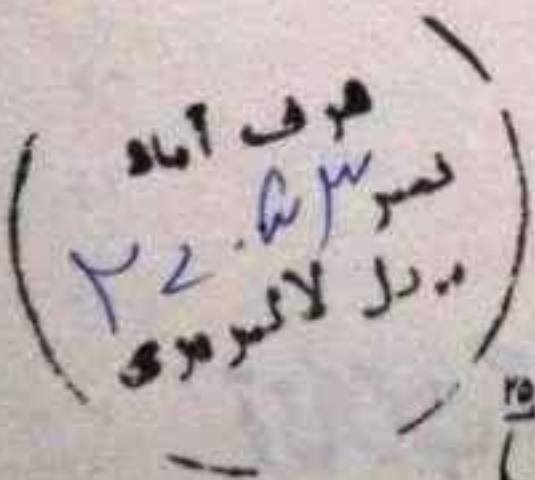
کتاب	شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ
مؤلف	فرید الوحیدی
کتابت	ایس۔ ایم۔ مظہر و سید ابوجعفر زیدی
ٹائیٹل	خلیق ٹونکی
اشاعت طبع اوّل	جنوری ۱۹۹۲ء
تعداد	ایک ہزار
صفحات	۸۵۶
قیمت	دو سو پچاس روپئے (مجلّد)
طباعت	بھارت آفسٹ پریس دہلی ۶

ناشر

قومی کتاب گھر 61/1 ذاکر نگر۔ نئی دہلی 110025

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ادائگی فرض کی ایک ناتمام کوشش ہے۔ اس کا مطالعہ اسی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔

حضرتؒ کی وفات پر کوئی چونتیس پینتیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں آپ کی حیات اور خدمات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے کی تالیفات اور موضوعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے ارباب فکر و نظر اور مورخین و محققین میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے افکار، نظریات، حیات اور کارناموں پر تحقیق کی پیاس و تلاش بڑھتی ہی جارہی ہے۔ چنانچہ مختلف زاویوں اور عنوانات کے تحت آپ کی سوانح نگاری کا سلسلہ تا ایں دم بڑے ذوق اور اہتمام کے ساتھ برابر جاری ہے[1]

ملت اسلامیہ کا ماضی مصلحین امت اور اولیائے کرام کے تذکروں سے معمور ہے۔ تاریخ کے صفحات میں ان کے کارناموں اور مجاہدات کا ہر ہر گوشہ پوری تحقیق کے ساتھ مذکور ہے۔ ان پاک باطن بزرگوں نے امت کی روحانی، اخلاقی اور عملی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی اور اپنی ساری زندگی اس خدمت میں گزار کر لاکھوں لاکھ تشنگان سلوک و معرفت کو سیراب کیا، مگر بعض نفوس قدسیہ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے دنیاوی اور دینی زندگی کے ہر ہر گوشے اور اجتماعی، سیاسی، ملکی، معاشرتی اور معاشی وغیرہ جہات انسانی کے ہر مرحلے میں پیش آمدہ مصائب و مشکلات کے مقابلہ و مجاہدہ میں

---

[1] پاکستان اور ہندوستان کی کچھ یونیورسٹیوں سے بعض محققین نے خود اور بعض نے دوسروں کے ذریعہ راقم کو حال ہی میں اطلاع دی کہ وہ حضرتؒ کی سوانح پر کام کر رہے ہیں۔

زندگیاں جاں نثاری اور بے جگری کے ساتھ وقف کردیں اور اپنے اخلاص، للہیت اور مثالی ایثار و قربانی سے قوم و ملت کی رہنمائی فرمائی۔ یہی وہ عظیم ہستیاں ہیں، جو نیابت انبیاء کے منصب کا حق ادا کرتی ہیں اور یہی وہ قدسی صفت شخصیتیں ہیں، جو مرکر بھی امر رہتی ہیں۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہی نہیں بلکہ اُن کے پیغامات اور ارشادات زمان و مکان کی حدود کو عبور کر کے قیامت تک منارۂ نور ثابت ہوتے ہیں اور ان کی مثالی زندگیاں ہر زمانے میں وقت کے اندھیاروں کے مقابلے میں ہدایت و رہنمائی کا چراغ جلائے رکھتی ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی نابغہ روزگار اور فقید المثال اکابر اولیاء میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ مسند تدریس و تبلیغ حدیث نبویؐ کے تاجدار تھے۔ دوسری طرف علوم اسلامیہ کے احیاء اور نشر و اشاعت کے علمبردار بھی تھے۔ اس کے ساتھ ہی تصوف و سلوک، تربیت باطنی اور تہذیب اخلاق کے لیے وقف تھے۔ اسی وقت میں جہاد آزادی کے سپہ سالار اور میدان سیاست کے شہسوار تھے۔ آپ کی زندگی اعلیٰ انسانی فضائل اور مکارم اخلاق کا نمونہ تھی اور زندگی کا ہر ہر لمحہ عبادت ریاضت تعلق مع اللہ اور صبر و توکل علی اللہ میں غرق تھا۔

اشتغال حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم تھا کہ شب و روز کی آٹھ یا دس ساعتیں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کی نذر تھیں۔ تعلیم و تدریس کی نشر و اشاعت سے ایسا شغف تھا کہ برعظیم ہندوستان کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا بچا ہو جہاں اسفار کی سختیاں اور مشقتیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر کے آپ نے خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ من علمہ کا پیغام نہ پہنچایا ہو۔

تصوف و سلوک و تربیت نفوس میں یہ مقام حاصل تھا کہ ایک ایک مجلس میں

سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طالبین رشد و ہدایت بیک وقت مرید ہو کر داخل سلسلہ ہوتے تھے۔

میدان جہاد میں ایسی بے جگری کے ساتھ نبرد آزما تھے کہ طوق و سلاسل کو زندگی بھر بازیچۂ اطفال سمجھا اور دار و رسن کو لبیک کہنے کے لئے ہر لمحہ تیار رہے۔

سیاسی معاملات میں حق تعالیٰ نے وہ بالغ نظری عطا فرمائی تھی کہ جو فیصلہ فرمادیا وہ نوشتۂ دیوار ثابت ہوا اور جو مسلک و نظریہ اختیار کرلیا اس کی صداقت اور معقولیت کو آج تک چیلنج نہیں کیا جاسکا۔ مکارم اخلاق اور خصائل حمیدہ میں ایسی برتری اور تفوق عطا ہوا تھا کہ زندگی کا ہر ہر قدم إِنِّي بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ کی مکمل تشریح و تعبیر تھا۔

عبادت و ریاضت اور تضرع و زاری کی یہ کیفیت تھی کہ کبر سنی اور ضعف کے عالم میں بھی راتوں کا بیشتر حصہ نوافل و تہجد میں گزرتا تھا۔ آدھ آدھ گھنٹے اور بعض اوقات اور زیادہ دیر تک قیام کی حالت میں کھڑے رہتے تھے اور جن آنکھوں نے تمام زندگی بڑے سے بڑے دنیاوی حادثہ پر گریہ و زاری کا تصور بھی نہیں کیا تھا اُن سے مصلیٰ و جانماز پر پہنچتے ہی آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور گھنٹوں سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز آتی رہتی تھی۔

کیا کیا بتلایا جائے اور کہاں تک لکھا جائے۔ ان تمام اوصاف و خصوصیات کے احوال و تفاصیل بیان کی جائیں تو حضرت کی زندگی کے ہر ہر گوشہ پر کئی کئی سو صفحات کی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔

ہندوستان کی مذہبی و تمدنی تاریخ اور اس کے باشندوں کی تہذیبی و لسانی خصوصیات اور مسائل کے پیش نظر حضرتؒ ملک میں متحدہ قومیت کی سیاست پر یقین رکھتے تھے اور اس کو یہاں کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، مذہبی اور اجتماعی مشکلات و مسائل کا واحد حل بتلاتے تھے۔ اس نظریہ کی مخالفت میں زمین و آسمان ایک کردئے گئے۔ وقت نے چند دہائیوں کے مختصر عرصہ میں برق رفتاری کے ساتھ صدیوں کی راہ طے کرلی۔ حالات حیرت ناک اور ناقابل یقین حدوں تک بدل گئے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ حضرتؒ کے سیاسی نظریہ کی صداقت و حقیقت آج تک زندہ و تابندہ ہے۔ انسانیت سسک رہی ہے۔ بنی نوع انسان ظلم، جبر، ناانصافی اور درندگی کے خنجر تلے پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ راقم الحروف نے بہت سے عوام و خواص لوگوں کی باتیں سنی ہیں۔ موافقین کی بات نہیں ہے جو لوگ حضرتؒ کے نظریات کے شدید مخالف تھے وہ بھی زبان سے نہیں لیکن دل میں اس کی صداقت اور حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ملکوں کے گوناگوں مسائل کا حل حضرتؒ ہی کے ارشاد کردہ نظریات میں ہے۔ الفضل ما شهدت به الاعداء۔

ملک کی آزادی کو کوئی پچاس برس ہونے کو آئے۔ خوش ہونے اور دل کی تسلی کے لئے بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ گننے کے لئے شمار کیا جائے تو سیکڑوں میدان ہیں جن میں ہندوستان نے ترقی حاصل کی ہے مگر ساتھ ہی تباہیوں، ہلاکتوں اور ناکامیوں کی فہرست بھی بہت طویل اور حوصلہ شکن ہے۔ یہ بڑی دردناک داستان ہے جس کے لئے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں صفحات تو ضرور ہی درکار ہیں۔ انہی مشکلات اور موانع میں ایک بڑا مسئلہ ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختلاف و انتشار کا ہے۔ یہ سلسلہ شروع دن سے شروع ہوا تھا اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے یہ اختلاف بڑھتا جا رہا ہے۔ آج چالیس پینتالیس برس گزر جانے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے کہ اصل کمزوری اتنی ہی لیپاپوتی سے حل ہونی مشکل ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آزاد ہندوستان میں مرکز اور ریاستوں کے درمیان ربط و تعلق، اختیارات و فرائض کی تعیین و تحدید پر مشتمل ایک خاکہ اور فارمولا پیش کیا تھا۔ اس وقت تو جذبات کے طوفان اور متوقع اقتدار کے نشے میں اس فارمولے پر کما حقہٗ توجہ نہیں کی گئی، مگر مرورِ ایام کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاہے نام نہ لیا جائے لیکن ہندوستان کو متحدہ مضبوط رکھنا ہے تو یہاں کی مرکزی حکومت اور ریاستوں کے درمیان پائیدار تعلق کی بنیادیں وہی ہوں گی جس کی نشان دہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فارمولے میں کی تھی اور جو اس وقت مدنی فارمولے کے نام سے مشہور ہوا تھا۔

اس مختصر سی صحبت میں حضرتؒ کی زندگی کے تمام گوشوں کی طرف اشارہ کرنا مشکل ہے مگر حضرت کے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کے لئے مذکورہ بالا اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر تحقیق کرنا ضروری ہے۔

راقم الحروف کی زندگی کے کم و بیش پینتیس برس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سایۂ عاطفت میں اس طرح گزرے ہیں کہ انفرادی و اجتماعی زندگی، علمی و سیاسی سرگرمیاں روحانی و اخلاقی تعلیمات شب بیداری و تضرع وزاری، مروت اور اعلیٰ اقدار انسانیت، غرض شب و روز کے اکثر اوقات اپنی ناقص عقل و فہم کی حدود کے اندر مشاہدہ و مطالعہ سے گزرے ہیں اب میں زندگی اور عمر کے اس مرحلے پر ہوں کہ دنیوی شہرت، عزت اور منفعت کا کوئی درجہ مجھے نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ تعالیٰ توفیق اور اخلاص نصیب فرمائے تو اب ان میں سے کسی متاع کی تمنا بھی نہیں ہے۔ مگر حضرت کے سوانحی تذکرے اور سیرتیں دیکھ کر احساس ہوا کہ ان میں حضرتؒ کی زندگی کے بعض اہم گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ یہ خطرہ بھی دل میں گزرا کہ اسی طرح غفلت میں کچھ اور دیر ہوگئی تو شاید یہ گنج گراں مایہ ہمیشہ کے لئے نگاہ و دل سے مستور رہ جائے۔ انہی خیالات کے ماتحت یہ خواہش تیز تر ہوتی گئی کہ اس باب میں جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اور جیسا کچھ بھی جانا اور پہچانا ہے بلا کم وکاست اور بدون مبالغہ و اضافہ کے صفحۂ قرطاس کے حوالے کردوں، شاید ہے کہ ہندوستان کی نئی نسل کو اس سے رہنمائی اور ہدایت نصیب ہو ورنہ کم ازکم اتنا تو ضرور ہوگا کہ خاندان کی آنے والی نسلیں جو ہندوستان، عربستان، یورپ اور امریکہ وغیرہ میں منتشر ہوتی جارہی ہیں، اپنی اصل و نسل اور اپنے گھرانے کی قدر و قیمت پہچان اور جان سکیں گی۔

ارادہ تھا کہ اپنی حیثیت و صلاحیت کے مطابق حضرت کی روحانی، علمی، سیاسی، تدریسی اور تربیتی زندگی اور کارناموں کے تفصیلی حالات بیان کرتا۔ مگر قلم اٹھایا تو پانچ برس کا وصہ اور ساڑھے آٹھ سو صفحات کی ضخامت صرف سوانحی حالات کی نذر ہوگئے مجبوراً پہلی جلد یہیں پر ختم کردینی پڑی، اگر زندگی اور حالات نے فرصت دی تو اصل مضامین دوسری جلد میں پیش کرنے کا خیال و ارادہ ہے۔

کتاب میں مدح سرائی، منقبت نگاری، القاب آرائی اور مبالغہ آمیزی سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کشف وکرامات، روحانی تصرفات اور خرق عادات کے بیان پر بھی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حضرت کی بیاسی برس کی عمر کا ایک ایک لمحہ کرامتوں، خرق عادات، عظمتوں اور عزیمتوں سے اس درجہ بھرپور ہے کہ روایاتی کراموں کا تذکرہ، تعریف وتوصیف اور مدح ومنقبت اس کے لئے تخفیف اور تحصیل حاصل کے مرادف ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تالیف کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ بلاکسی انشاپردازی اور رنگ آمیزی کے حضرتؒ کی زندگی اور سرگرمیوں کی سادہ اور تاریخی تصویر پیش کردی جائے۔

کوشش کی گئی ہے کہ واقعات کے ساتھ ان کے مستند مآخذ اور شہادتیں بھی احتیاط اور تحقیق کے ساتھ پیش کردی جائیں۔ اس کے لئے پہلے تو حضرت ہی کے بیانات اور اقوال کو مرجع بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد تاریخی وقائع وتحقیقات اور مورخین ومحققین کے مطالعہ اور اقوال پر بھروسہ کیا گیا ہے اور آخر میں ۱۹۳۷ء کے بعد کے حالات میں کسی درجہ میں اپنے ذاتی مشاہدات ومطالعہ کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تاہم پچاس برس کے عرصے پر پھیلے ہوئے سارے مطبوعات، اخبارات اور منشورات تک رسائی ممکن نہیں ہوسکی اس لئے کہ اس تلاش وجستجو کے لئے جس فرصت وفراغت کی ضرورت تھی افسوس کہ وہ میسر نہ آسکی۔

اس تذکرہ میں ہندوستان کی جنگ آزادی، ملک کی تقسیم اور قیام پاکستان کا پس منظر بھی شامل ہوگیا ہے۔ ان مراحل میں حضرتؒ اس طرح شامل رہے ہیں کہ آپ کا کوئی تذکرہ ان تفصیلات کے بغیر اور جنگ آزادی اور تقسیم ملک کی کوئی تاریخ بغیر حضرتؒ کا تذکرہ کئے مکمل نہیں ہوسکتی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم العالی نے باوجود کثرت مشاغل، مسلسل اسفار اور صحت کی کمزوری کے مسودہ کا مطالعہ فرمایا، قیمتی مشورے اور بعض اہم مضامین عنایت فرمائے اور حضرتؒ کی شخصیت اور کتاب کی اہمیت پر اپنے خاص اسلوب میں اپنے افکار عالیہ کو قلم بند فرمایا ہے۔

عزیز گرامی قدر پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی سلمہٗ پروفیسر ذاکر حسین چیئر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی نے بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ مسودۂ کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا اور بہت سے قیمتی اور مفید مشوروں سے رہنمائی کی۔

عزیز محترم مولینا سید اسجد مدنی سلمہٗ اللہ ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی نے قدم قدم پر ہمت افزائی کی اور حضرتؒ کی بعض بہت اہم نگارشات فراہم کیں۔

عزیزی مولینا ڈاکٹر سید رشید الوحیدی سلمہٗ ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی نے کتابت، طباعت، تصحیح و تہذیب کے صبر آزما مراحل بڑی دلسوزی و جانفشانی کیساتھ مکمل کئے۔ ویسے تو ان حضرات گرامی نے ایک قومی و ملی خدمت انجام دی ہے جس کیلئے ان شاء اللہ یہ دین و دنیا میں عند اللہ ماجور و مشکور ہوں گے مگر میرا فرض ہے کہ صمیم قلب سے ان کا نہ صرف شکریہ ادا کروں بلکہ بارگاہ رب العزت میں دعا کروں کہ حق تعالیٰ ان کے سایہ ہمایونی صحت و عافیت کے ساتھ دراز فرمائے اور قوم و ملک کو ان کی خدمات و رہنمائی سے متمتع اور بہرہ ور کرے۔ آمین ثم آمین۔

ہر چند کہ یہ کتاب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مکمل سوانح نہیں کہلائی جاسکتی مگر اتنا ضرور ہے کہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس سے ایک نقشہ اور خاکہ بنانے میں کافی مدد ملے گی۔

ایک آخری گذارش اور رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ مؤلف کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا صدق دل سے اعتراف ہے۔ میں نے شخصیات اور جماعتوں کے بیان میں خلوص نیت کے ساتھ پوری احتیاط ملحوظ رکھی ہے کہ کسی کی شان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ پھر بھی ایک وقائع نگار کی حیثیت سے بعض مقامات پر بہت سی باتیں نہ چاہنے کے باوجود بھی لکھنی ہی پڑیں اور اس کے نتیجے میں کہیں کہیں بہت سے حقائق منظر عام پر آگئے جن کے لئے مجھے معذور و مجبور سمجھنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ نہ مجھے علم و فہم میں کوئی غیر معمولی حیثیت نصیب ہے اور نہ میری زبان و قلم کو علمی اسلوب اور محققانہ طرز تحریر کا درجہ حاصل ہے۔ جو کچھ بھی بن پڑا اور جیسا بھی ہوسکا

معمولی عام فہم اور بول چال کی زبان میں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حضور میں پیش کردیا اور اس پر دماغ یہ ہے کہ اس حقیر کی ذرۂ بے مقدار خدمت کے صلے میں اپنے مولائے رحیم اور داتا کریم سے عفو و مقبولیت اور نجات و مغفرت کا طلب گار ہوں اور قارئین سے اسی دُعا کا اُمیدوار ہوں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

فرید الوحیدی

۳۰ نومبر ۱۹۹۱ء
ذاکر نگر۔ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ الاسلام مولٰینا حسین احمد مدنیؒ

مؤلفہ
مولٰینا سید فرید الوحیدی صاحب

(حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (مدظلہم العالی)

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، أما بعد

ایک جامع فضائل ہستی کے بارے میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس کے فضائل و کمالات میں مرکزی اور نمایاں صفت کون سی ہے جس کو اس شخصیت کی کلید قرار دیا جائے اور جس سے اس کی زندگی اور خصوصیات کو سمجھنا آسان ہو جائے، مولٰینا کو بہت سے لوگ ایک جلیل القدر عالم اور ایک عظیم استاذ حدیث کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک سیاسی رہنما اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو ان سب فضائل سے آراستہ کیا تھا۔

لیکن راقم کی کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے، ایک عزیمت دوسرے حمیت، عزیمت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آپ نے علماء اور اہل درس کے حلقہ سے باہر قدم نکالا اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کی، جو وقت کا اہم مسئلہ تھا اور عین انگریزی حکومت کے عروج کے زمانے میں جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا "اعلان کر کے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" کے افضل جہاد کا شرف حاصل کیا، مالٹا میں اسیری کے دن گزارے، اور ہندوستان کی جیلوں میں مہینوں رہ کر سنت یوسفی ادا کی اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مقابلے میں برسوں سینہ سپر رہے، یہاں

تک کہ آپ کا مقصد پورا ہوا۔

پھر یہ عزیمت آپ کی پوری زندگی میں نمایاں ہے، فرائض کی ادائیگی، نوافل و مستحبات کی محافظت، مخالف ماحول میں معمولات کی پابندی اس زمانہ میں بڑی استقامت ہے، وعدوں کے ایفار، دور دراز کے جلسوں اور اجتماعات میں شرکت اور اس کے لئے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنا مستقل عزیمت ہے، پھر اس کے ساتھ دار الحدیث کے اسباق کی پابندی اور کتابوں کی تکمیل ایک مستقل مجاہدہ، مہمانوں کی میزبانی اور مختلف الطبائع اشخاص کے ساتھ ضیافت و اکرام کا معاملہ اور ان کی مزاجی خصوصیات کا تحمل مستقل جہاد، پھر مریدوں کی تربیت اور نگرانی، کثیر التعداد خطوط کا جواب دینا اور سب اس ضعف و پیری اور مصروفیت میں، یہ سب آپ کی غیر معمولی عزیمت وعلوئے ہمت کی دلیل ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں اِنّ اللہ یحبّ معالی الامور ویکرہ سفسافھا (اللہ تعالیٰ (ہمت اور عزیمت والے) اونچے کاموں کو پسند فرماتا ہے، اور فروتر اور بے سود اعمال وحرکات کو ناپسند فرماتا ہے) پر عمل کر کے دکھادیا،

اسی طرح حمیت بھی آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا، جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد میں یہی روح کام کرتی رہی تھی، اور یہی آپ کو سدا جوان، مستعد و سرگرم رکھے ہوئے تھی، اور اسی نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش وولولہ کے ساتھ پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑجائیں گے، اور الفاظ نہیں ہیں بلکہ شرارے ہیں جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں۔

لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ جس جبروتی طاقت اور عظیم سلطنت کے مقابلہ میں وہ میدان میں آئے، اس کا (جہاں تک اسلام اور مسلمانوں، خلافت اسلامی اور آزاد ممالک اسلامیہ اور خود ہندوستان کا تعلق ہے) تاریخی کردار، اس کی اسلام دشمنی، اسلامی سطوت و وحدت کی بیخ کنی، اور خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ کے زوال واستیصال میں اس کا قائدانہ حصہ، جزیرۃ العرب، حجاز مقدس اور ان عرب ممالک پر اثر ونفوذ قائم کرنے کی کامیاب

جد و جہد جو دعوت اسلامی کا منبع و سرچشمہ، مقامات مقدسہ پر مشتمل اور مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا مرکز ہیں، نیز اس عظیم مردم خیز، تاریخ ساز تجدیدی و اصلاحی تحریکوں اور علوم دینیہ و اسلامیہ کے آخری مرکز ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ اور وہاں کی اس مسلم آبادی پر جس نے اس ملک پر آٹھ سو برس تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، تمدنی و تہذیبی، علمی و فکری، سیاسی و انتظامی طور پر اس کو چار چاند لگائے اور اس کو پہلی مرتبہ سیاسی وحدت و مرکزیت اور انسانی وحدت و مساوات اور سماجی عدل و انصاف سے آشنا کیا، ان سفاکانہ مظالم کی داستان بھی سامنے ہو جن کا اعتراف انگریز مصنفین و مؤرخین اور عسکری و انتظامی شعبے کے ذمہ داروں نے بھی کیا ہے، اور جن کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تحریک خلافت نے ہندوستان میں جو جوشِ ایمانی، غیرتِ اسلامی، حمیتِ دینی، بلند نگاہی اور مصائب و محن پر صبر و استقامت کی شان پیدا کر دی تھی، اس کو "حمیت" و "عزیمت" کے الفاظ سے بہتر الفاظ (بشرطیکہ ان کے صحیح وزن اور درجۂ حرارت کو سمجھا جائے) نہیں مل سکتے، اور اس کا مظہرِ اتم اور نمونۂ کامل حضرت مولینا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، جن کی انگریز دشمنی اور حمیتِ دینی، فکری و اعتقادی حدود سے آگے بڑھ کر قلبی و جذباتی نفرت و عداوت، اور قال سے آگے بڑھ کر حال میں تبدیل ہو گئی۔

شیخ الاسلام مولینا مدنیؒ، ان کی جماعت (جمعیۃ العلماء) ان کے رفقائے کار اور جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے اور اس کے سلسلے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانے والے اور مخالفین کی ناراضگی اور مقاطعہ کا نشانہ بننے والے علماء اور اہلِ دین کا (جن کے سرخیل اور پیشوا شیخ الاسلام مولینا مدنیؒ تھے) ملت اسلامیہ ہندیہ پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی قربانیوں، خلوص و بے غرضی، ہمت و عزیمت اور صبر و استقامت سے (جو کہ اکثریت کے بڑے سے بڑے قائدین کی قربانیوں سے کم نہیں) ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کو اس قابل بنا دیا کہ اس سرزمین پر اعزاز و افتخار کے ساتھ سر اونچا کر کے چلے، بڑی سے بڑی سیاسی اور مدعی ایثار و قربانی جماعت سے آنکھیں ملا کر بات کرے، اور اپنے دین و شریعت اور اپنی زبان و تہذیب، اپنے عائلی قانون (PERSONAL LAW) اور ملک کی آئین سازی

اور نظامِ تعلیم میں اپنے تشخص اور اپنی ملی ضروریات کے تحفظ کا (احساسِ کہتری کے ادنیٰ شائبہ کے بغیر) مطالبہ کرے اور اس کے لئے جدو جہد کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھے' یہ ملت پر اتنا بڑا احسان ہے جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی' اور تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی' ان دینی قائدین اور مجاہدین آزادی کو بہانگ دُہل اعلان کرنے کا حق ہے کہ۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

جیسا کہ کہا گیا آپ کا دوسرا امتیاز حمیت تھی' یہی حمیت تھی جو کسی منکر شرعی اور خلافِ سنت فعل کو دیکھنے کی روادار نہ تھی' اور جس کی حرارت اور آنچ آس پاس بیٹھنے والوں کو اکثر محسوس ہوتی' جن لوگوں نے آپ کے اس جذبہ کو پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ "حمیت دینی" آپ میں کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری تھی' وہ بعض اوقات اس سے غلط فائدہ اٹھالیتے" اسی طرح مولینا کی شرافت و مروت سے (جو آبائی ورثہ اور سادات کرام کا شیوہ ہے) بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھاکر آپ کے مخلص محبین اور نیاز مندوں کے لئے شرمندگی کا باعث بنتے اور اپنی اغراض برآری کر کے اپنی ہوشیاری اور موقع پرستی کا ثبوت دیتے اور مولینا کی ذات کو نقصان پہنچاتے۔

اس شانِ عزیمت و وصفِ حمیت کے علاوہ ان کی تیسری خصوصیت اور شانِ امتیازی ان کی انسانی بلندی ہے۔

تحریکِ آزادی کے رہنماؤں اور قائدین کے خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے' انھوں نے اپنی بلند نظری سے ملک کی آزادی سے جو توقعات قائم کی تھیں' اور اپنی فطری شرافت اور نفس کی پاکیزگی سے اس ملک کی اکثریت کے متعلق جو اندازے لگائے تھے' وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئے؟' اور ان کو زبان' کلچر' مذہبی تعلیم اور پرسنل لاء کے تحفظ کے بارے میں (جس کی کانگریس کے منشور اور ہندوستان کے دستور نے ضمانت کی تھی) آخری عمر میں جو مایوسی ہوئی اور ان کو اپنی سیاسی جدوجہد کے رفیقوں اور جیل

کے ساتھیوں کے متعلق (صاحبِ اختیار و اقتدار ہوجانے کے بعد) جو تلخ اور دل شکن تجربے ہوئے، آج ان کو خواہ زبان پر نہ لایا جا سکے مگر آنے والے مؤرخ کے قلم کو ان کے اظہار سے روکا نہیں جا سکتا، مگر جو چیز ہر شک و شبہ اور ہر بحث و نزاع اور ہر اختلاف سے بالاتر ہے۔ وہ مولٰنا کی بلند سیرت، پاکیزہ شخصیت، بے غرض جدوجہد، بے داغ زندگی اور مکارم اخلاق ہیں، جنھوں نے ان کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا اور ان کو اخلاقی و طبعی بلندی کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا، جس کے متعلق دورِ اوّل کے عرب شاعر نے کہا ہے ؎

هِجانُ الحَيِّ كالذَّهبِ المُصَفّیٰ

صَبيحةَ دِيمةٍ يَجنيهِ جانٍ

(قبیلہ کے شریف سردار ایسے کھرے سونے کی طرح ہیں، جو کسی بارش کی صبح کو زمین سے اٹھا لیا جائے، اور صاف کر لیا جائے)

راقم سطور نے اپنی ایک تازہ تصنیف "المرتضیٰ" کے "پیش لفظ" میں "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے ایک تلخ تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا، اس کا خفیف لفظی ترمیم کے ساتھ یہاں بھی نقل کر دینا مناسب (اور درجات کے تفاوت کے ساتھ) حسب حال ہے، راقم نے لکھا تھا کہ:

"یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ بہت سی تاریخ ساز، عہد آفریں اور نادرۂ روزگار شخصیات ایسی بھی ہیں، جن کی مکمل سیرت (جو ان کی روشن ترین خصوصیات پر حاوی اور ان کے مرکزی اور اہم کمالات و محاسن پر روشنی ڈالتی ہو) عرصۂ دراز تک مرتب نہیں ہوتی، اور یہ بات ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں پر ایک اخلاقی و دینی و علمی قرض کی نوعیت رکھتی ہے، جس کی ادائیگی بعض اوقات انھوں نے بھی نہیں کی جو ان کی تعظیم میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتے اور ان سے محبت و وابستگی کو سرمایۂ افتخار و شرف سمجھتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ قرض ماہ و سال کی مختصر مدت میں ادا

ہو جاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس پر طویل مدت گزر جاتی ہے۔"

یہی معاملہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ پیش آیا جن کی وفات ۱۲ رجادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں پیش آئی، لیکن تقریباً نصف صدی گزر رہی ہے کہ ان کی سیرت و تذکرہ میں ابھی تک کوئی شایان شان کتاب ملک کے سامنے نہیں آئی۔[۱]

متفرق طور پر مختلف اہل تعلق اور عقیدت نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی اور ان کی سعی بہرحال مشکور ہے، لیکن ضرورت تھی کہ کوئی ذی علم فرد خاندان، یا خاندانی، تاریخی وسوانحی اندرون و بیرون اور شب و روز کی زندگی کا واقف حال، اس وسیع اور نازک موضوع پر قلم اٹھاتا، اور اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ مستند مواد چشم دید واقعات اور مشاہدات و تجربات پیش کرتا۔

راقم کو اچانک یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اسی خاندان والاشان کے ایک فرزند مولانا سیّد فرید الوحیدی صاحب جو حضرت مولانا کے حقیقی بھتیجہ مولانا سید وحید احمد صاحب مرحوم اسیر مالٹا کے صاحبزادہ ہیں، انھوں نے مولانا کا مکمل تذکرہ مرتب کر لیا ہے اور اس کی کتابت بھی ہوگئی ہے۔ مولانا نے ازراہ تعلق و محبت اور اس علم کی بنا پر کہ راقم اور اس کے خاندان کو حضرت مولانا سے گہری عقیدت کا تعلق ہے، اس کو مولانا سے جزئی تلمذ

---

[۱] حضرت مولانا پر سب سے حقیقت افروز اور طاقتور مضمون غالباً وہ ہے جو والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "نزہۃ الخواطر" کی آٹھویں جلد میں شامل ہے، مصنف مرحوم نے اپنی زندگی میں ان کا تذکرہ کتاب میں شامل کیا تھا، مولانا کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب مصنف کے پیر بھائی بھی تھے۔

۱۹۸۲ء میں جب اس آخری حصہ کی اشاعت کا دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے فیصلہ کیا تو راقم سطور نے اس میں معتدبہ اضافہ کیا اور اس کی تکمیل کی، اب وہ کم سے کم عربی میں حضرت مولانا کے سلسلہ میں ایک طاقتور تعارفی مضمون ہے۔

کا شرف بھی حاصل ہے، اور اس کے برادر محترم مولینا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) مولینا کے دست گرفتہ اور گہرے عقیدت مند بھی اور لکھنؤ میں ان کا مکان مولینا کی مستقل فرودگاہ اور جائے قیام تھا، مجھ سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔

راقم نے اپنی شدید مصروفیت، کمزوری صحت اور مسلسل اسفار کے باوجود اس پر اجمالی نظر ڈالی اور اندازہ ہوا کہ اس تذکرہ میں کم سے کم وہ مواد اور معلومات زیادہ سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں، جو ایک واقف، متیقظ فرد خاندان ہی جمع کر سکتا ہے، یہ کتاب خاندانی حالات کا اچھا ماخذ ہے، اس میں اوّلین سفر حجاز کی دل دوز سرگزشت، قیام مدینہ طیبہ کے تفصیلی حالات، مدینہ طیبہ میں گھر کی عسرت اور معاشرت کا بولتا ہوا نقشہ، مالٹا کی اسیری کے بارے میں قیمتی معلومات (جن کا بڑا حصہ انھوں نے اپنے والد محترم سے سنا ہوگا) حضرت کے سوانحی حالات مثلاً دیوبند کی طالب علمی کی تفصیلات، والد ماجد مولینا حبیب اللہ صاحب کا قدرے تفصیل سے تعارف، اس کے ساتھ سیاسی شعور اور سرگرمیوں کی ابتدا، تحریک خلافت کے آغاز کی بعض قیمتی تفصیلات و معلومات، برطانیہ اور عالم اسلام کے بارے میں اس کے کردار پر مفید مواد، اور مولینا کی دعوتی تحریک کی سرگرمیوں، مجاہدات و ابتلاءات پر قیمتی مواد جمع کر دیا گیا ہے، پھر اخلاق و سیرت، معاشرت و تعلقات اور معاملات کے بارے میں وہ مفید اجزاء اور پہلو بھی آگئے ہیں، جو گھر کا کوئی فرد ہی پیش کر سکتا ہے۔

لیکن راقم اپنے ان سارے اعترافات اور شہادتوں کے ساتھ یہ لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ تحریک آزادی کے بحرانی دور، مسلم لیگ کے داعیوں اور رہنماؤں کے طرز عمل، قیام پاکستان کے داعیوں اور رہنماؤں کے بارے میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، اور جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، اسی طرح علامہ اقبالؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ اور حضرت حکیم الامت مولینا تھانویؒ، مولینا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، دار العلوم دیوبند کے اس وقت کے ذمہ داروں اور منتظمین، اور ان بعض شخصیتوں کے بارے میں جن سے مولینا کو فکری و مسلکی بنیاد پر اختلاف تھا، جس انداز میں تنقید کی گئی ہے، اور اس سلسلے میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، اس کو اگرچہ ایک پروردۂ نعمت اور سرشارِ عقیدت فرد خاندان

کی کسی حد تک نفسیاتی، خاندانی اور فکری ہم آہنگی پر محمول کر کے اس کی تاویل کی جاسکتی ہے، لیکن راقم اس کے بارے میں اتنا لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کو ان اثرات وتعلقات کے باوجود اس سے زیادہ محتاط اور مؤرخانہ بنایا جاسکتا ہے اور مخالفین کے لئے تاویل اور عذر تلاش کرنے کی گنجائش ہے، ممکن ہے کہ مصنف عزیز وفاضل اس مشورہ پر غور فرمائیں، اور اس حصہ پر امکانی حد تک نظر ثانی کریں، لیکن یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ پر قابل اظہار وتشکر ہے، کہ اس کتاب میں وسیع پیمانے پر ایسے مواد ومعلومات آگئے ہیں، جو آیندہ ہر سوانح نگار کے لئے چراغِ راہ اور رہنما ثابت ہوں گے، اور وہ ان کی موجودگی کی وجہ سے ایک بڑی محنت، جستجو اور "جوئے شیر" لانے سے بچ جائے گا، اس بنا پر حضرت کے سب معتقدین اور اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں کو مصنف کتاب کا ممنون وشکر گزار ہونا چاہیئے۔ شکر اللہ سعیہ وتقبل مجھودہ

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ
۲۰؍ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
۳۰؍ اکتوبر ۱۹۹۱ء

خاندانِ اور وطنِ اصلی

ملک اودھ[1] کے سابق دار السلطنت عروس البلاد فیض آباد سے کوئی چالیس میل دور مشرق میں دریائے گھاگھرا کے کنارے پر ایک مشہور مردم خیز اور زرخیز قصبہ "ٹانڈہ" آباد ہے۔ یہ مقام ہندوستان کے ان اہم اور متعدد مراکز میں شمار ہوتا ہے جہاں کپڑے کی صنعت صرف تجارت ہی نہیں بلکہ فن کی بنیادوں پر ترقی کرتی رہی ہے۔ زیادہ تر آبادی مسلمان ہے اور ان میں اکثریت اس جماعت کی ہے جس نے معاش اور معیشت کے لیے پارچہ بافی کی صنعت میں نام پیدا کیا ہے۔ یہ فن کار ہر زمانے میں نئی نئی فنی اور صنعتی ایجادات کرتے رہے ہیں۔ ان میں بعض خاندان اور افراد ایسے بھی ہوئے ہیں جو ہندوستان گیر شہرت اور اہمیت کے مالک ہوئے اور کپڑے کی صنعت میں اُن کا ثانی نہیں پیدا ہوسکا۔ یہ طبقہ تعلیم، تمدّن، ذہانت، شرافت، دین داری، فن کاری، وضع داری اور دیانت داری جیسی اعلیٰ صفات سے متصف ہے۔ قصبے میں ان کے اور بعض دوسرے مسلم طبقات کے علاوہ معدودے چند گھرانے شیوخ اور سادات کے بھی آباد ہیں۔ اب سے کچھ دنوں پہلے تک قصبہ بلکہ ضلع اور پورے علاقے کی دینی سرپرستی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت اور ذہنی و روحانی سیادت انھی شیوخ اور سادات میں مرکوز چلی آتی تھی۔ یہاں کے عوام و خواص ہمیشہ ان کی عزت و احترام کرتے رہے تھے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہے تھے۔ آج بھی ان خاندانوں اور ان کے افراد کا نام ادب لحاظ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات دور دراز تک مشہور رہے ہے۔ بعض ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہوئے اور بعض حضرات ساری دُنیا میں

---

[1] اب یہ مُلک ختم ہوچکا ہے اور ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی کا ایک حصّہ ہے۔

مقبول و محبوب ثابت ہوئے۔

انہی میں ایک "شاہ نور میاں" کا خاندان ہے۔ آپ کا پورا نام شاہ نورالحق قلندری چشتی سہروردی ہے۔ اور مقبرہ قصبے سے متصل ایک گاؤں اللہ داد پور میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ شاہ صاحب بڑے ولی اللہ، صاحب کشف و کرامات اور فنافی اللہ بزرگ تھے۔ آپ کسی دوسرے ملک سے سلاطین شرقی جونپور کے زمانۂ عروج میں پندرھویں صدی کے اواخر میں "ٹانڈہ وارد ہوئے تھے۔ کوئی متعین تاریخ آپ کی آمد کی نہیں ملتی، مگر حضرت شیخ مدنی نے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ تقریباً چار سو برس سے ٹانڈہ آپ کے خاندان کا مسکن [2] ہے۔ اس حساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی آمد ۱۵۰۰ء کے آس پاس کسی وقت ہوئی ہے۔ ٹانڈہ میں آپ کے فیض عام کی شہرت ہوئی اور خلقت کو آپ کی ذات سے رشد و ہدایت ملی تو عوام و خواص کا رجوع عام ہوا اور خانقاہ میں شب و روز ازدحام رہنے لگا۔ اس وقت ٹانڈہ میں راج بھر قوم کا کوئی راجہ برسر حکومت و اقتدار تھا۔ اس کی حکومت اور مطلق العنانی میں آپ کے معتقدین اور مریدین کے اجتماعات سے خلل اندازی ہوئی تو اُس نے شاہ صاحب کو نکالنے کی تدبیریں کیں۔ شاہ صاحب نے اُس کو راہِ راست پر لانے اور سلامت روی پر مائل کرنے کے لیے اسلام کی دعوت دی۔ اس پر وہ ایک بے سرو سامان بوریہ نشین فقیر کے درپے آزار ہو گیا اور قوت و شوکت اور ہتھیار کے ساتھ شاہ صاحب کی روحانیت اور توکل علی اللہ کے مقابلے پر آیا۔ شاہ صاحب نے اعانتِ غیبی طلب کی۔ طوفان و زلزلے نے اس کے پورے قلعے کو چشم زدن میں مسمار کر دیا۔ صرف بنیادیں رہ گئیں جو ہنوز باقی ہیں۔ راج بھر وہاں سے فرار ہو گئے۔ شاہ صاحب نے بستی کا نام اللہ داد پور رکھا۔ آپ کا مزار اسی قلعے میں ہے۔

آج سیکڑوں برس بعد بھی یہاں آپ ہی کے خاندان کے لوگ آباد ہیں جن میں

---

[1] اب یہ مقام قصبے کا ایک محلہ ہے۔ [2] حسین احمد مدنی، شیخ الاسلام، مکتبہ دینیہ دیوبند ج ۱، ص ۹

خال خال اولادِ ذکور اور اکثریت اولادِ اناث کی ہے۔

شاہ صاحب اور ان کے بعد آپ کے مریدین و منتسبین اسی قلعے میں دفن ہوتے رہے اور آج بھی آپ کے مرحومین اہلِ خاندان، ساکنانِ اللہ داد پور اسی میں آسودۂ خاک ہوتے ہیں۔ رحمہم اللہ۔

شاہ صاحب کا شجرۂ نسب، خاندانی تاریخ، منشا و مولد کے حالات مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع و برباد ہو گئے، اس لیے قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے۔ حسب و نسب کیا ہے اور خاندانی حالات کس طور پر ہیں۔ مگر تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب صحیح النسب سید اور حسین الاصغر بن امام زین العابدین کی اولاد میں ہیں، اور آپ کے اجداد میں حضرت سید محمد مدنی عرف سید ناصر ترمذی مدینۂ طیبہ سے ترمذ تشریف لائے اور ان کی اولاد میں حضرت مخدوم سید احمد توختہ تمثال رسول قدس اللہ سرہ العزیز ترمذ سے لاہور آئے اور آپ کی اولاد میں سید شاہ زید بن سید شاہ احمد شاہ نور الحق کے جد اعلیٰ ہیں۔ شاہ زید سے اوپر تک کا پورا شجرۂ نسب محفوظ ہے۔ اور شاہ نور الحق صاحب سے نیچے تک موجود ہے۔ لیکن شاہ زید اور شاہ نور الحق قدس اللہ سرہما العزیز کے درمیان کی دو یا تین کڑیاں ابھی تک نہیں مل سکی ہیں۔ ان دو تین نسلوں پر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو برس کا عرصہ گذرا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ممکنہ حد تک شجرے کی تحقیق فرمائی ہے مگر اس کے لیے جس فراغت اور فرصت کی ضرورت تھی وہ عمر بھر حضرت کو حاصل نہ ہوئی اس لیے کسی قدر کمی رہ گئی۔ نقشِ حیات میں مذکور ہے:

"مورثان سادات ٹانڈہ ضلع فیض آباد و سادات موسی و سادات جھوکر و سادات ملو پور پرگنہ کادی پور ضلع سلطان پور و سادات رائے پور و سادات کمال پور تکنی و سادات منڈیا ہو پرگنہ خاص و سادات دیوگاؤں پرگنہ خاص سادات آں بسیار نجیب اند و اکثر در قبائل ایشاں صاحب جاہ و جلال بود اند۔ و در سیادت ایشاں ہیچ شکے نیست۔"[1]

---

[1] حسین احمد مدنی، نقشِ حیات، مکتبہ دینیہ دیوبند، جلد ۱، ص ۱۰

"سادات ٹانڈہ وغیرہ۔ حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول کی اولاد میں ہیں[1]۔"

اور شجرہ یہ ہے:

سید شاہ زید بن سید شاہ احمد بن سید شاہ حمزہ بن سید شاہ ابوبکر ابن سید شاہ عمر بن سید شاہ محمد بن حضرت مخدوم سید شاہ احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السّلام) بن سید علی بن سید حسین بن سید محمد مدنی المعروف بہ سید ناصر ترمذی بن سید حسین بن سید موسیٰ حمصہ بن سید علی بن سید حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدین ابن شہید کربلا حضرت امام حسین علی جدہ وعلیہ السّلام

"حضرت مخدوم سید نور الحق چشتی ٹانڈوی قدس اللہ سرہ العزیز حضرت سید احمد توختہ تمثال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے تھے اور وہ سید محمد مدنی المعروف بہ سید ناصر ترمذی کی اولاد سے تھے۔ اور وہ حضرت سید حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدین ابن شہید کربلا حضرت امام حسین علی جدہ وعلیہم السّلام کی اولاد سے تھے۔ متفق علیہ نسابین ہے۔ (عمدۃ الطالب، منبع الانساب، کنز الانساب ائمۃ الہدیٰ، تاریخ آئینہ اودھ)[2]"

"سید محمد مدنی عرف سید ناصر، ترمذ سے تشریف لائے اور ان کی اولاد سے حضرت مخدوم سید احمد توختہ تمثال رسول (علیہ السلام) لاہور تشریف لائے اور ۶۰۶ھ میں وصال ہوا۔ لاہور میں اُن کا مزار ہے۔ ان کی اولاد میں سید شاہ زید بن سید شاہ احمد زاہد مورث سادات ٹانڈہ وغیرہ کے ہیں[3]۔"

"اس نسب نامہ اور دیگر احوال کی تفصیل مذکور حضرت شاہ ولایت احمد صاحب لاہرپوری کی مساعی جمیلہ سے حاصل ہوئی ہیں جس کے لیے ہم نہایت شکر گذار ہیں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء[4]"

موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"بڑی محنت اور تحقیق سے جو حالات شجرۂ نسبی حضرت شیخ الاسلام دریافت

---

[1] [2] [3] [4] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۵

ہوئے وہ پیش کیے جارہے ہیں۔ افسوس کہ سید شاہ زید بن سید شاہ احمد زاہد کے نیچے کا سلسلہ دریافت نہ ہوسکا۔[1]

شجرۂ نسب حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز

امام مظلوم نواسۂ رسول شہیدِ کربلا سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ

سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ ــــ سیدنا امام حسین اصغرؓ ــــ سید علیؒ ــــ سید موسیٰ حمصہ ــــ سید حسین ــــ سید محمد مدنی عرف سید ناصر ترمذی ــــ سید حسین ــــ سید علی ــــ مخدوم سید شاہ احمد توختہ تمثال رسول ــــ سید شاہ محمد ــــ سید شاہ عمر ــــ سید شاہ ابوبکر ــــ سید شاہ حمزہ ــــ سید شاہ احمد زاہد ــــ سید شاہ زید .... شاہ نور الحق ــــ شاہ محمد زاہدی ــــ شاہ عبدالواحد ــــ شاہ راجو ــــ شاہ منوّر ــــ شاہ قلندر ــــ شاہ لڈھن ــــ محمود ــــ شاہ محب اللہ ــــ شاہ صفتہ اللہ ــــ شاہ خیر اللہ ــــ شاہ محمد ماہی ــــ شاہ مدن ــــ سید شاہ نور اشرف ــــ سید جہانگیر بخش ــــ سید پیر علی ــــ سید حبیب اللہ مہاجر مدنی ــــ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی

شاہ نور الحق قدس اللہ سرہٗ العزیز کی اولاد میں چودھویں پشت، شاہ نور اشرف تک تمام حضرات بڑے صاحب فضل و کمال، اولیاء اللہ اور خدا رسیدہ بزرگ ہوتے رہے۔ ہر بیٹا مسند رشد و ہدایت پر باپ کا خلیفہ و جانشین ہوتا رہا۔ اللہ داد پور کی خانقاہ طالبینِ حق اور اہلِ باطن کے لیے مرکز و مرجع شمار ہوتی رہی۔ عوام کا تو ذکر کیا خواص بلکہ اخص الخواص تک اس درجہ معتقد اور مرید رہے کہ سلاطینِ دہلی میں سے کسی بادشاہ غالباً ہمایوں یا اکبر نے اوائل سولھویں صدی میں خانقاہ کے مصارف کے لیے چوبیس گاؤں پر مشتمل ایک علاقہ عطیہ و ہدیہ پیش کیا تھا۔ کاغذات ضائع ہو جانے کی وجہ سے یہ تحقیق باقی نہیں رہی کہ کس زمانے میں اور کس بادشاہ نے یہ عطیہ دیا تھا۔

۱۸۵۷ء تک پہنچتے پہنچتے اللہ داد پور کی خانقاہ کے انوار و برکات ماند پڑ چکے تھے۔

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۵

خاندان میں دینی، روحانی اور اخلاقی سیادت و تفوق کی جگہ دنیا داری اور حرص و طمع نے لے لی گیارہ گاؤں خاندان کے قبضے سے نکل گئے اور جو تیرہ گاؤں باقی بھی تھے۔ ان پر اہل خاندان کا، مالکانہ قبضہ و تصرف جاری ہوگیا تھا۔ خاندان کا ذریعۂ معاش زمینداری اور پیری مریدی تھا لیکن رشد و ہدایت سے خالی ہوجانے کی وجہ سے اور گردش ایام سے علاقہ ہاتھوں سے بتدریج نکل جانے کی وجہ سے آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور گذر اوقات کی تنگی ہوگئی تھی۔ اس پر مزید مصیبت یہ کہ افرادِ خاندان وبائی امراض ناگہانی حادثات اور دشمنوں کی تاخت و تاراج کی نذر ہوگئے تھے۔ آخر آخر میں خاندان کے صرف ایک بزرگ سید اکبر علی صاحب مرحوم باقی بچے تھے۔ آپ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے حقیقی نانا تھے اور خاندان کی تربیت، جائداد کی نگرانی اور علاقے کے انتظامات کی ذمہ داری صرف انہی پر منحصر رہ گئی تھی۔ مگر بد قسمتی سے آپ بھی بڑے نازک دور میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شہر ٹانڈہ سے ملا ہوا دریائے گھاگھرا بہت تیز رو اور بے راہ رو دریا ہے۔ ہر سال اس میں سیلاب آتا ہے اور گاہے گاہے یہ پوری پوری آبادیوں اور بستیوں کو نگل لیتا ہے۔ باشندگان ٹانڈہ اضلاع بستی، گورکھپور وغیرہ کے سفر میں اکثر اسی دریا کو عبور کرکے قطع مسافت کرتے تھے۔ ۱۸۵۶ء کے آخری ایام میں سید صاحب موجودہ ضلع بستی کے اپنے بارہ مواضعات کی نگرانی کے سلسلے میں اسی دریا میں کشتی کے ذریعے سفر کر رہے تھے۔ بیچ دھارے میں پہنچے تو کشتی کو طوفان اور تیز دھارے نے گھیر لیا، اور کشتی اُلٹ گئی۔ آپ تلوار لے کر دریا میں کود گئے اور تیر کر دریا پار کرنے کی کوشش کی۔ بہاؤ تیز اور کنارہ دور تھا۔ ہر چند ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی اور ڈوب کر داصل بحق ہوگئے۔ خاندان کا حال پہلے ہی ابتر تھا۔ سید صاحب آخری مربّی خاندان اور سرپرست تھے۔ اب ننھے ننھے بچے اور کمزور خواتین بالکل ہی بے سہارا رہ گئیں۔[1]

قرب و جوار میں اپنے حلیفوں کے ساتھ بھیٹی (BHEETY) کا راجہ قدیم زمانے سے

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۷

درپے آزار تھا مگر سید صاحب کی دلیری، بہادری اور جلالتِ شان کے آگے اُن کی ایک نہ چلتی تھی اور بارہا زک اٹھا چکے تھے۔ اب اِس موقع کو غنیمت جانا اور اعلان کیا کہ اکبر علی کے کسی بچے کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اس کے حملے کی تیاریوں کی خبر سُن کر خاندان کی عورتیں ننھے بچوں کو لے کر راتوں رات کسی طرح بچ بچاکر اور چھپ کر شہر ٹانڈہ کے ایک محلہ قصبہ میں اپنے اعزہ کے یہاں پہنچ کر پناہ گزیں ہوئیں۔ اُسے دوسرے دن ان کے صحیح وسلامت نکل جانے کا علم ہوا تو غصے میں آگ بگولا ہوگیا اور حویلیوں کے تالے توڑ کر دروازے اکھاڑ کر اور دیواریں ڈھاکر مال ومتاع لوٹنا شروع کردیا اور مہینوں تک گاڑیاں بھر بھر سامان اور اسباب منتقل کرتا رہا۔ یہی وہ وقت تھا جب شاہ نور الحق[ؒ] کا خاندانی شجرہ، قدیم تحریریں، تاریخیں اور یادگاریں، سلطانی وثیقے اور شاہی فرامین صدیوں پُرانے کاغذات اور مستندات غرض سب کچھ دست برد ہوگیا۔ خاندانی علاقہ جو گردشِ ایام کے ہاتھوں سے بچ رہا تھا اس میں سے بیشتر پر یانسی اور بھیٹی کے[۲] راجاؤں نے قبضہ کرلیا۔ ان ستم رسیدہ پناہ گزینوں میں سید صاحب کے تین صاحب[۱] زادگان اور

---

[۱] سید اکبر علی صاحب کے تین صاحبزادگان سید عبدالغفور، سید تصدق حسین اور سید تفضل حسین تھے۔ ایک صاحبزادی تھیں۔ صاحبزادی صاحبہ نور النساء[علیہا] مرحومہ مولوی حبیب اللہ صاحب مرحوم کی اہلیہ اور حضرت شیخ الاسلام کی والدہ تھیں۔ صاحبزادوں میں عبدالغفور لاولد فوت ہوئے۔ تفضل حسین کے دو صاحبزادے زوار حسین اور جواد حسین تھے۔ ڈاکٹر زوار حسین صاحب کے صرف ایک صاحبزادے سید انوار حسین صاحب دم تحریر بقیدِ حیات ہیں۔ ان کے دو صاحبزادگان ڈاکٹر سید حبیب احمد سول سرجن اور سید حمید احمد بقیدِ حیات اور صاحبِ اولاد ہیں۔ متعدد صاحبزادیاں ہیں۔ سید جواد حسین مرحوم کے دو صاحبزادے سید افتخار حسین آئی، اے، ایس ریٹائرڈ اور سید امتیاز حسین مرحوم تھے۔ مقدم الذکر الحمد للہ بقیدِ حیات ہیں

ان کے پانچ صاحبزادگان سید بشیر احمد بلال، شمیم احمد جمال، نصیر احمد نہال، کبیر احمد بلال، ور نسیم احمد جلال ہیں۔ ان کے علاوہ تین لڑکیاں ہیں۔ موخر الذکر کے صاحبزادگان اقبال، کمال، قدیر، صغیر اور دو لڑکیاں ہیں (دیکھیے ص)

---

[۲] بروایت مولانا سید حبیب محمود احمد صاحب مدینہ طیبہ نبیرہ مولوی شاہ حبیب اللہ[ؒ]۔

حضرت مخدوم شاہ نور الحق صاحب کی سترھویں اور شاہ نور اشرف صاحب کی چوتھی پشت میں سید پیر علی صاحب مرحوم و مغفور کے دو صاحبزادگان بھی تھے جن میں سے ایک کا نام حبیب اللہ تھا یہی وہ حبیب اللہ ہیں جو آگے چل کر مولوی شاہ سید حبیب اللہ صاحب مہاجر مدنی کہلائے اور انہی کے صلب سے حضرت شیخ الاسلام مرشد کامل مولانا حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ تولد ہوئے۔

مولوی سید حبیب اللہ صاحبؒ

آپ کی ولادت اللہ داد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد ملک اودھ میں ۱۸۵۷ء سے چار پانچ برس پہلے ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے حالات آپ کو بچپن کے دھندلے نقوش کی طرح یاد تھے۔ آپ کی پیدائش کے وقت گھر کے معاشی، اقتصادی، علمی اور روحانی حالات بہت کمزور ہو چکے تھے۔ دشمنوں نے جو لوٹ مار اور غارت گری کی تھی۔ اس کے بعد خاندان میں صرف دو گاؤں جڑاون پور اور اللہ داد پور بچے تھے۔ اس غارت گری سے پہلے جو مرفہ الحالی

(ص سے آگے) سید تصدق حسین مرحوم کے چار صاحبزادے سید مقبول احمد، سید خلیل احمد، سید فاروق احمد، سید بخشش احمد مرحومین تھے۔ مقبول احمد صاحب اپنے مریدوں میں صوبہ بہار میں جا بسے تھے۔ وہاں صاحب اولاد ہو کر فوت ہوئے۔ خلیل احمد صاحب کے دو صاحبزادیاں شاکرہ اور ذاکیہ مرحومین تھیں۔ ذاکیہ کے کوئی نہیں تھا۔ شاکرہ کے دو بچے عزیزان طفیل اور عبد المعبود صاحب اولاد ہیں۔ فاروق احمد وہ ہیں جن سے مدینہ میں حضرت شیخ الاسلام کی بہن منسوب ہوئیں مگر بعد میں مفارقت ہوئی۔ ان کے دوسری بیوی کے دو لڑکے پاکستان چلے گئے، ایک ہندوستان میں ہیں۔ بخشش احمد صاحب مرحوم کے دو لڑکے سید مسعود احمد صاحب اور سید جمیل احمد صاحب بقید حیات اور صاحب اولاد ہیں۔ تصدق حسین کے دو لڑکیاں صابرہ خاتون اور کنیز فاطمہ تھیں صابرہ خاتون کے ایک لڑکے محمد یٰسین اور کنیز فاطمہ کے تین صاحبزادگان سید توکل حسین صاحب، مولانا عزیز احمد قاسمی اور مولوی مشتاق احمد صاحب، صاحب اولاد اور ترقی پذیر ہیں۔ سید اکبر علی صاحب مرحوم کی یہ جملہ اولادیں اب دہلی، لکھنؤ، دیوبند، بنارس، پاکستان، بہار وغیرہ میں پھیل گئی ہیں۔ لے نقش حیات، ج ۱ ص ۲۵

اور فارغ البالی گھر میں تھی اس کے نقوش بھی آپ کے ذہن میں باقی تھے، فرمایا کرتے تھے
کہ ہمارے گھر میں اشیائے خورد و نوش اور مٹھائیوں کے مٹکے بھرے رہتے تھے۔ آپ کے دو بھائی
اور بھی تھے جن میں ایک سید نجیب اللہ صغرسنی میں ذخیرۂ آخرت ہوئے۔ دوسرے[1] سید اشرف علی
صاحب تھے جن کی اولاد آج بھی اللہ داد پور میں آباد ہے۔ مولوی صاحب کے والد سید
پیر علی صاحب کے دو بھائی سید نوازش علی اور سید تیغ علی اور بھی تھے۔ دونوں لاولد فوت ہوئے۔
تیغ علی صاحب نے آپ کو گود لے لیا تھا اور نہایت محبت و شفقت کے ساتھ پرورش شروع
کی تھی۔ قضا و قدر سے کس کو چارہ ہے۔ مولوی صاحب چار پانچ برس کی عمر کو پہنچے تو ۱۸۵۷ء
تک ان کے والد اور دونوں چچا آپ کو یتیم چھوڑ کر جوار رحمت میں جا بسے۔ اب دونوں بچوں
کا بار والدہ اور دو بڑی والداؤں پر آپڑا۔ تنگدستی اور عسرت تو تھی ہی۔ اب بڑی محرومی
یہ پیش آگئی کہ گھر میں کوئی مربی اور سرپرست نہیں رہا۔ مولوی صاحب کی بڑی والدہ جنھوں
نے آپ کو گود لے لیا تھا، کافی عمر تک زندہ رہیں۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنی ان دادی کو
دیکھا تھا۔ فرماتے تھے کہ ہماری منجھلی دادی کہا کرتی تھیں کہ میں نے حبیب اللہ کو بڑی تنگدستی میں
چرخہ کات کر پالا ہے۔ حالات کی سختیوں، بیچارگی اور درماندگی نے یتیم حبیب اللہ
کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع نہیں دیئے۔ مگر ناموافق حالات اور نامساعد ماحول میں بھی آپ نے
اپنی ذاتی کوششوں اور خداداد صلاحیتوں کے سہارے جس حد تک تعلیمی ترقی کی، وہ
قابلِ تعریف و تحسین ہے۔ پہلے آپ نے مقامی درسگاہ میں اس زمانے کے دستور کے
مطابق اردو، فارسی اور قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی اور اتنی قابلیت اور دستگاہ حاصل
کی کہ انشاپردازی اور فارسی زبان میں شعر کہنے لگے۔ فارسی دانی اس وقت میں قابلیت کا
معیار شمار ہوتی تھی کیوں کہ کچھ ہی دنوں پہلے تک یہ حکومت کی سرکاری زبان تھی۔ اس کے

---

[1] سید اشرف علی صاحب مرحوم کے دو صاحبزادے تھے۔ سید ظہیر الدین اور سید بشیر الدین مرحومین۔ سید ظہیر الدین
کے صرف ایک صاحبزادی تھیں، جن کے لڑکے ملک زادہ منظور احمد مشہور و معروف ہیں۔ سید بشیر الدین کے
ایک صاحبزادے مولوی سید فضل الرحمٰن ہیں۔

بعد آپ نے سرکاری اسکول سے مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ علمی ذوق اور فطری ذہانت اس امر کی مقتضی تھی کہ تعلیم جاری رکھی جائے۔ کوئی سرپر ہاتھ رکھنے والا اور سہارا دینے والا ہوتا تو یقین ہے کہ علمی اور معاشی میدان میں غیر معمولی ترقی کرتے۔

مگر افلاس اور تنگدستی کے بے رحم ہاتھوں نے مزید ترقی کے راستے مسدود کر دیئے۔ اور ٹانڈہ سے قریب آٹھ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ التفات گنج میں پرائمری اسکول کی ملازمت کرنی پڑی۔ آٹھ روپے ماہوار تنخواہ طے پائی۔ اس وقت یہ رقم آسودہ حالی کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ اس قلیل تنخواہ سے بڑی حد تک فراخی اور فارغ البالی آگئی۔ مولوی صاحب اب اٹھارہ برس کے ہو گئے تھے۔ کچھ اطمینان نصیب ہوا تو بڑی والدہ صاحبہ نے جنھوں نے پرورش کی تھی، شادی کر دینی ضروری سمجھی۔ گھر ہی میں سید اکبر علی مرحوم کی بلند اقبال صاحبزادی موجود تھیں۔ ان کی والدہ موضع نندرولی ضلع فیض آباد کے ایک نجیب الطرفین سید گھرانے کی لڑکی تھیں۔ والدہ کے ماموں بڑے ولی اللہ کامل، صاحبِ علم اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ موصوف نے بھانجی کو اُردو، ہندی، فارسی وغیرہ کے علاوہ اشغالِ تصوّف اور روحانی تربیت سے بھی بہرہ ور کیا تھا۔ وہ کشفِ قبور اور مکاشفات میں کامل تھیں اور ذکر و شغل میں مصروف رہتی تھیں۔ اُنھوں نے صاحبزادی کو بھی زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ علاوہ اُردو فارسی کے ہندی زبان میں بھی رائج الوقت کتابیں ہنس جواہر اور ملک محمد جائسی کی پدماوت وغیرہ پڑھائی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اشغالِ روحانیہ اور تصوّف کا ذوق بھی پیدا کر دیا تھا۔ اُس زمانے کے شرفا میں اپنے ہی خاندانوں اور گھرانوں میں شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ مولوی صاحب کا پیغام بھی سید اکبر علی کی صاحبزادی نور النساءؒ[1] سے دیا گیا اور آپ کی بڑی والدہ صاحبہ نے اس کے لیے بری کوشش کی۔ آخر بڑی جد و جہد کے بعد یہ پیغام منظور ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں جب صاحبزادی چودہ برس کی تھیں، مولوی صاحب کی شادی ہو گئی۔ اخراجات

---

[1] روایت سید حبیب محمود احمد صاحب مدظلہم العالی مدینہ منورہ

اور ضروریات بڑھیں تو آپ کو آمدنی اور ملازمت میں ترقی کی فکر ہوئی۔ مگر اس کے لیے تعلیمی اسناد کی ترقی پہلے ضروری تھی۔ چنانچہ نارمل اسکول کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت پورے ملک اودھ میں نارمل اسکول صرف لکھنؤ میں تھا۔ چنانچہ آپ وہاں چلے گئے اور امتیازی حیثیت سے یہ امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ضلع اناؤ کے قصبہ صفی پور میں تیس روپے ماہوار پر مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد اسی ضلع کے بانگرمئو قصبہ میں ٹرانسفر ہو گیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ الاسلامؒ کی ولادت باسعادت ہوئی اور یہیں پر مولوی صاحب کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا۔ قریب ہی گنج مرادآباد میں حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن صاحب کی مرجعِ خلائق خانقاہ تھی۔ حضرت اپنی فیض رسانی، تعلق مع اللہ، کشف و کرامات اور تقویٰ وللّٰہیت کی وجہ سے عوام و خواص ہر طبقے میں بے حد مقبول و محبوب تھے۔ غیر مسلمین اور عیسائی انگریز عہدہ دارانِ حکومت تک آپ کے حضور میں حاضر اور فیضیاب ہوتے تھے۔ شہرہ اور چرچا سن کر مولوی صاحب بھی دربار میں حاضر ہوئے اور معتقد ہو گئے۔ آپ کی خوشدامن چوں کہ خود صاحبِ معرفت بزرگ تھیں اور تصوف کی قدر و قیمت پہچانتی تھیں اس لیے برابر اصرار کرتی رہتی تھیں کہ تمھارے خاندان سے روحانی ترقی اور نسبت اولیا ختم ہو گئی ہے اور بغیر بیعت و خلافت کے مرید کرنا بڑی معصیت اور مواخذہ آخرت کا سبب ہے۔ تمھارے خاندان کے لوگ بلا کسی نسبت و خلافت کے پیری مریدی کرتے ہیں[1] مگر تمھیں کسی مرشد کامل سے تعلق پیدا کر کے اصلاحِ باطن اور تربیت روحانی کی طرف پوری توجہ کرنی چاہیے۔ حضرت شاہ صاحب کی محبت اور عقیدت مولوی صاحب کے دل میں پہلے ہی جاگزیں تھی۔ خوشدامن صاحبہ کے اصرار اور نصیحت سے طبیعت میں مزید جلا پیدا ہو گئی۔ خاندان میں یہ دستور تھا کہ کوئی فرد اپنے گھرانے سے باہر مرید نہیں ہوتا تھا، مگر باوجود اہلِ خاندان کی مخالفت اور ناگواری کے آپ مع اپنی اہلیہ محترمہ کے

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۱، ص ۸

حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے بیعت ہو گئے[1]

ٹانڈہ کی بیشتر آبادی انصاری جماعت پر مشتمل ہے۔ اس لیے باگجر مئو اور اناؤ کے لوگ آپ کی نسبت بھی یہی خیال کرتے تھے۔ ایک دن حضرت مولینا نے بھری مجلس میں فرمایا کہ:

"مولوی صاحب بڑے پیرزادے اور صحیح النسب سیّد ہیں۔ آپ کے جدِ اعلیٰ مخدوم سیّد شاہ نور الحق قدس اللہ سرہٗ العزیز بڑے عارف باللہ اور ولی اللہ بزرگ تھے۔ میں نے رات خواب میں ان کی زیارت کی اور انھوں نے فرمایا کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھنا۔"[2]

آپ کا شجرہ شاہ نور الحق صاحب تک مندرجہ ذیل ہے:

سیّد حبیب اللہ بن سیّد پیر علی بن سیّد جہانگیر بخش بن شاہ نور اشرف بن شاہ حمدان بن شاہ محمد ماہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ محب اللہ بن شاہ محمود بن شاہ لدھن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبد الواحد بن شاہ محمد زاہدی بن شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت گنج مراد آبادی بڑے صاحب کشف اور مستجاب الدعوات تھے۔ اس کا بارہا تجربہ ہو چکا تھا کہ حضرت کا فرمایا ہوا پورا ہوتا ہے اور آپ کی بات صحیح اور سچی ہوتی ہے۔ اس لیے اس اعلان کے بعد مولوی صاحب کے نجیب الطرفین سیّد ہونے کی حقیقت لوگوں میں مسلم الثبوت ہو گئی۔ اس کے علاوہ دوسرے قرائن اور دلائل سے بھی آپ کا صحیح النسب سیّد ہونا معلوم و مشہور ہے۔ اودھ کے بادشاہ آصف الدولہ مرحوم کے زمانے سے ملک میں اعلیٰ حسب و نسب کے شیعہ حضرات آباد ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب کی رشتہ داریاں فیض آباد، سلطان پور، ٹانڈہ وغیرہ کے مضافات میں اعلیٰ درجے کے شیعہ و سنّی خاندانوں میں قدیم زمانے سے چلی آرہی تھیں۔ آپ کے گھرانے کے تعزیہ اور مہندی کا جلوس محرم میں پورے شہر

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۳، ص ۱۰۔ [2] نقش حیات، ج ۱، ص

میں گشت کرتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے ایک نانا سید حسن علی شاہ نے اپنے صرفِ خاص سے ایک امام باڑہ بھی بنوایا تھا جو آج تک موجود ہے۔ خاندان کے چند بزرگوں کے اثر سے خاندان سنّی مسلک پر قائم رہا اور بڑی حد تک شیعہ خاندانوں سے قرابت داریاں ختم ہوگئیں تاہم کسی حد تک اب بھی باقی ہیں[1]۔ مختصر یہ کہ اودھ میں یہ خاندان برابر سادات کا خاندان شمار ہوتا آیا ہے۔

مولوی صاحب اپنی طبعی خصوصیات، تقویٰ، دینداری، امانت و دیانت، حسنِ کارکردگی، پابندیٔ اوقات اور نسبی تفوق کی بنا پر بانگرمئو کے قیام کے زمانے ہی میں بہت مقبول و مشہور ہوگئے تھے۔ ذمہ دارانِ محکمہ اور افسرانِ متعلقہ آپ سے بہت متاثر اور مہربان ہوگئے تھے۔ آپ کی مقبولیت اور صلاحیتوں کے پیشِ نظر مخلصین معاصرین نے مشورہ دیا اور ذمہ داران نے اشارہ کیا کہ اگر آپ انگریزی پڑھ لیں تو اعلیٰ مناصب تک پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کے کہنے سے انگریزی شروع بھی کی، مگر اس کے بعد زہد و قناعت کا مزاج اس سے مطابقت نہ کرسکا اور انگریزی ترک کردی۔ وطن میں مولوی صاحب کی جو بھی بچی کھچی جائداد تھی وہ رہن تھی۔ بڑے بھائی نہ اس کو واگزار کرانے کی وسعت رکھتے تھے، نہ انتظام کرسکتے تھے اور نہ شرکاء اور اعزّہ کی دست وبرد سے حفاظت کرسکتے تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر آپ نے درخواست گذاری اور کوشش کی کہ آپ کا تبادلہ ٹانڈہ ہوجائے۔ مخلصین اور افسران نے سمجھایا کہ موجودہ حالات میں تبادلہ مفید نہیں ہوگا۔ بڑا نقصان یہ پیشِ نظر تھا کہ ٹانڈہ کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ صرف بیس روپیہ تھی جبکہ یہاں تیس روپیہ ماہوار مل رہے تھے۔ مگر مولوی صاحب نے اس فرق کو برداشت کیا اور آخر کار تبادلہ پر ٹانڈہ چلے آئے۔ وطن پہنچ کر آپ نے جائداد کے انتظامات نہایت سمجھ داری، ہوش مندی اور مستعدی کے ساتھ شروع کیے۔ پہلے تو قرض اُدھار لے کر ساری جائداد رہن سے چھڑائی۔ اور پھر شرکاء اور اعزّہ کی ریشہ دوانیوں کا سدِّ باب کیا۔ اور پھر حسبِ قانون بند وبست و شریعت ساری جائداد تقسیم کی۔ اس طرح دونوں بھائیوں کو اطمینان اور فراغت نصیب ہوئی۔ بڑے بھائی

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۶

بھی کثیر العیال تھے اور آپ کے بھی تین بچے تھے۔ آبائی مکان سکونت کے لیے کافی نہ تھا۔ اس لیے موروثی اور جدی مکان سے الگ آپ نے اپنے لیے علیحدہ مکان بانگرمئو کے زمانۂ قیام ہی میں بنوا لیا تھا، جو نہایت فراخ، وسیع اور آرام دہ تھا۔ اب اس میں قیام پذیر ہو گئے۔ ان تمام امور سے فراغت پا کر اطمینان اور توجہ کے ساتھ بچوں کی تعلیم کا فکر کیا۔ اس وقت دو بڑے صاحبزادگان، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب اور حضرت مولانا سید احمد صاحب مرحومین اسکول میں تعلیم پاتے تھے۔ تیسرے صاحبزادے شیخ الاسلام مدنیؒ ابھی چھوٹے تھے۔ دو بڑے صاحبزادوں کی تعلیم و تربیت آپ نے اس قدر اہتمام کے ساتھ فرمائی کہ دونوں مڈل اسکول کے امتحان میں تمام صوبہ میں اول آئے۔[1]

سرکاری امتحانات میں اس قدر عظیم الشان کامیابی کے بعد ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کے وظائف کے اور اس کے بعد وسیع ملازمتوں اور ترقیات کے امکانات بہت روشن ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے مزید اقدامات کے لیے مشورے بھی دیئے اور ترغیب دی۔ مگر مولوی صاحب کا ارادہ اور فیصلہ یہ تھا کہ اولاد دینداری، تقویٰ اور علوم دینیہ میں ترقی اور کمال حاصل کرے۔ چنانچہ اس موقع پر آپ نے صاحبزادگان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور فرمایا کہ "میں نے تم سبھوں کو اس لیے پرورش کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو اور کچھ کر کے شہادت حاصل کرو۔"[2] اس کے بعد آپ نے تینوں صاحبزادگان کو مدرسۂ دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی کیمیا اثر تربیت اور دربار فیض بار میں داخل کر دیا۔ کچھ فراغت، فرصت اور وسعت نصیب ہوئی تو آپ نے معاشی برتری اور جائداد کی ترقی کی جانب توجہ دینے کا ارادہ کیا اور باغات لگوانے کا پروگرام بنایا۔ عزم، ارادہ، حسن تدبیر اور نظم و ترتیب میں مولوی صاحب بڑی امتیازی شان کے مالک تھے۔ اگر اسی پروگرام پر قائم رہتے تو عجب نہیں کہ علاقے کے بڑے رئیس شمار ہوتے۔ مگر اسی دوران ایک ایسا حادثہ پیش آ گیا جس سے آپ کا حوصلہ اور ارادے

[1] [2] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۰

متزلزل ہوگئے۔ آپ کو اپنے مرشد سے غایت تعلق تھا۔ مدتوں خدمت میں حاضر رہے تھے۔ ذکر و شغل اور معرفت کی دولت اسی دربار سے حاصل ہوئی تھی۔ حضرت بھی خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ نہ صرف دینی اور روحانی بلکہ دنیوی اور انتظامی معاملات میں بھی رہنمائی اور ہدایات سے بہرہ ور فرماتے تھے۔ آپ شیخ کے رنگ میں پورے طور پر رنگ گئے تھے اور فنافی الشیخ کے درجے پر تھے۔ اچانک ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں مرشد حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن صاحب کا ایک سو پانچ برس کی عمر میں وصال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس صدمے سے مولوی صاحب کے دل کی دنیا اُجڑ گئی۔ ارادے اور عزائم ختم ہوگئے۔ حوصلوں اور امیدوں کی عمارت زمین پر آرہی۔ جو شب و روز جد و جہد اور مشغولیتوں میں گذرتے تھے، اب آہ و زاری اور اختر شماری میں بسر ہونے لگے۔ ان کیفیات کی اطلاع صاحبزادوں کو دیوبند پہنچتی رہی اور وہ حتی المقدور تسکین و تسلی کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ایک بار منجھلے صاحبزادے مولینا سید احمد نے باپ کو خط لکھا "میاںؒ! اب باغ وغیرہ لگانے کی فکر بے کار ہے۔ ہندوستان اب رہنے کی جگہ نہیں رہی۔ اب تو مدینہ منورہ چل بسیے!" آپ کے دل میں آنچ تو سلگ ہی رہی تھی۔ صاحبزادے اور پھر عالم باعمل اولاد، شیخ کامل کے خصوصی شاگرد اور صحبت یافتہ لڑکے کا یہ اشارہ پاکر عشقِ محمدی کی آگ بھڑک اُٹھی اور ایسا لگا کہ جیسے گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا ہو۔ ہمہ وقت مدینۂ طیبہ اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی رٹ لگ گئی۔

گھر میں سوائے منجھلے صاحبزادے کے ہر شخص اتنی عجلت میں اس قدر لمبے سفر کا مخالف تھا[۲]۔ بڑے صاحبزادے کا کہنا تھا کہ سلوک و تصوف میں میری تربیت ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ آپ نے اپنے شیخ حضرت گنگوہیؒ سے بھی شکایت کی مگر حضرت نے فرمایا کہ باپ کی اطاعت ضروری ہے۔ ایسا ہی ہے تو اب چلے جاؤ پھر واپس آجانا اور اشغال و اذکار مکمل کرنا۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کو یہ عذر تھا کہ میری فنون کی کچھ کتابیں باقی ہیں۔ اعزہ اور اقربا نے اصرار کیا کہ جانا ہی ہے تو اس بار حج و زیارت کر کے واپس آجائیے

---

[۱] قدیم شرفاء کے دستور کے مطابق مولوی صاحب کو بچے "میاں" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ [۲] نقشِ حیات، ۱۵

اور دو چار سال بعد گھر بار کو لے کر ہجرت کی نیت سے چلے جائیں گا۔ سمدھیانے والوں نے اعتراض کیا کہ ہم اپنی بچیوں کو ہمیشہ کے لیے اتنی دور نہیں بھیج سکتے۔ عام لوگوں نے سمجھایا کہ اس سال طاعون کی وبا کی وجہ سے ہندوستان کی ساری بندرگاہیں بند ہیں اور انتہائی دقتیں اور پریشانیاں پیش آرہی ہیں۔ مگر مولوی صاحب کی آتش شوق بھڑک چکی ہی گئی اور کوئی دلیل کارگر نہیں ہوئی۔ سمدھیانے والوں سے فرمایا کہ جس کو اپنی لڑکی کو بھیجنے سے عذر ہو وہ طلاق لے لے۔ صاحبزادوں سے کہا کہ جس کی تعلیم و تربیت باقی رہ گئی ہو، وہ وہیں چل کر پوری کرے گا۔ اعزہ اقرباء سے یہ کہا کہ آپ لوگ مشکلات اور پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں مجھ کو اگر کہا جائے کہ تجھے توپ کے منہ پر باندھ کر گولہ چھوڑا جائے گا اور تو مدینہ طیبہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

سفر بھی معمولی نہ تھا۔ پانچ صاحبزادے، ایک صاحبزادی، تین بہوئیں، ایک پوتا اور دو میاں بیوی خود، کل بارہ افراد کا قافلہ تھا۔ سمندر پار کا سفر۔ نہ ریلیں ایسی مسلسل اور افراط، نہ ڈیزل سے چلنے والے تیز رفتار جہاز، نہ راستے مامون و محفوظ، نہ آج جیسے منظم قواعد و ضوابط۔ غرض قدم قدم مشکلات اور موانع کا ہجوم تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ اخراجاتِ سفر کا تھا۔ عمر بھر کے لیے رخصت ہو رہے تھے۔ ہجرت کی نیت تھی۔ جیتے جی واپسی کا ارادہ بھی نہ تھا۔ پورے قافلے کے کثیر اخراجات تھے۔ ایسے میں خدانخواستہ ضرورت پڑ جاتی تو کوئی قرض بھی نہ دیتا۔ کسی سے مدد لینا مولوی صاحب کے مزاج کے خلاف تھا۔ چنانچہ اپنی ساری جائداد فروخت کر دینے کا فیصلہ کیا اور ٹانڈہ کے ایک رئیس راجہ علی حسین کے ہاتھوں تین ہزار روپیہ میں کل جائداد فروخت کر دی۔ مکان کی قیمت اتنی کم لگی کہ فروختگی کا ارادہ ملتوی کر کے بعض اعزہ کو رہنے کے لیے عاریتاً دے دیا اور اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ مطابق جنوری ۱۸۹۹ء میں اللہ کے بھروسے پر قافلے کا کوچ ہو گیا۔

بسم اللہ مجرھا و مرسھا ان ربی لغفور الرحیم۔

مولوی سید شاہ حبیب اللہ صاحبؒ کی ہجرت مدینہ

۱۸۹۹ء

یہ خاندان جو کم و بیش تیسری صدی ہجری میں مدینے سے نکل کر چار یا پانچ سو برس کے عبوری اسفار کے بعد ترمذ اور لاہور ہوتا ہوا ٹانڈہ آ کر قیام پذیر ہوا تھا۔ آج اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں تقریباً ایک ہزار سال بعد پھر اپنے موروثی وطن مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ مولوی سید شاہ حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ، صاحبزادگانِ والاتبار مولینا صدیق احمد، سید احمد، حسین احمد، جمیل احمد، محمود احمد، خورد سال پوتا وحید احمد، صاحبزادی ریاض فاطمہ مرحومہ، تین بڑی بہوئیں اور اہلیہ محترمہ کُل بارہ نفر عازم سفر تھے۔ مولینا سید محمود احمد صاحب سات برس کے تھے اور مولینا وحید احمد صاحب کی عمر تین یا چار برس تھی۔ تین ہزار روپیہ تو جائداد سے حاصل ہوا تھا اور کچھ پہلے کا پسماندہ بھی تھا۔ کل ملا کر پانچ ہزار کی رقم کھانے پینے، اخراجاتِ سفر اور دوسری ضروریات کے لیے ساتھ تھی اور پھر منزل پر پہنچ کر بھی کچھ نہ کچھ رہنا ضروری تھا۔ ہم آج کے زمانے میں شاید اس حقیر سی رقم کی قیمت کا اندازہ نہ لگا سکیں۔ تاہم آئندہ واقعات سے کچھ نہ کچھ تخمینہ سمجھ میں آجائے گا۔ اس سال طاعون کی وبا کی وجہ سے ساری بندرگاہیں بند تھیں۔ صرف چاٹگام کی گودی تھوڑی بہت کھلی ہوئی تھی۔ تھوڑی بہت اس لیے کہ مسافروں پر سو سو پابندیاں اور سختیاں تھیں اور بہت سے لوگ قدم قدم پر ان رکاوٹوں کی وجہ سے سفر سے پہلے ہی حوصلہ چھوڑ بیٹھتے تھے۔ ٹانڈہ سے یہ قافلہ روانہ ہوا تو پہلی منزل الہ آباد کے قرنطینہ کیمپ میں ہوئی۔ شہر کے باہر سنگم کے کنارے ایک کوٹھی میں علاقے کے سارے حجاج محبوس تھے۔ باہر نکلنے، کسی کے ملاقات کرنے یا کوئی چیز خریدوانے منگوانے کی سختی سے ممانعت تھی۔ ہجرت کی اطلاع پا کر بہت سے لوگ مولوی صاحب کو الوداع کہنے اور

اُن سے ملنے کے لیے آئے۔ ان میں حضرت مولٰنا محمد حسین صاحب بھی تھے۔ آپ حضرت گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے اور بڑے اہل اللہ بزرگ تھے۔ چھوٹے بڑے امیر غریب سب آپ کو جانتے اور آپ کے معتقد تھے۔ مولٰنا کو بھی سعی و سفارش سے بس اتنی اجازت ملی کہ دروازے کے جنگلے سے دور کھڑے رہ کر دیکھ لیں اور دو باتیں کرلیں۔

قرنطینہ کیا ایک قسم کی سزا تھی کہ نئے نئے کپڑے، بھوؤں اور ریشمی اور قیمتی ملبوسات۔ اونی اور سوتی جڑا اور دو دو بار دوا کے کھولتے ہوئے پانی میں پکائے گئے۔ بجائے جراثیم ختم ہونے کے زندہ ہی رہ گئے۔ مگر کپڑے تو سارے کے سارے بے موت مر گئے۔[1]

ان حالات میں ایک دو نہیں پورے پندرہ دن اس قید میں رہ کر ۱۲ رمضان کو جب رہائی ہوئی تو اس طرح کہ پولیس کے پہرے میں ریل کے ایسے ڈبے میں سوار کرائے گئے جس کی ساری کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور جس میں خطرناک قیدی سفر کرائے جاتے تھے۔ دورانِ سفر بھی ڈبے میں پولیس کا پہرہ رہتا تھا اور اسٹیشن پر بھی دروازوں پر پہرہ ہوتا تھا۔ باہر نکلنے کی، کسی سے ملاقات کرنے کی اور کھانے پینے کی کوئی چیز خریدنے کی سخت ممانعت تھی۔ چاٹگام تک سارا سفر اسی قید و بند میں گذرا اور آخر ایک اسٹیشن پہلے پہاڑتلی ریلوے اسٹیشن پر حجاج کو اتارا گیا۔ یہاں ایک خس پوش بانس کی پردہ دار بیرک میں قیام کا انتظام تھا۔ یہاں قید و بند کی اتنی سختی تو نہ تھی مگر آزادانہ آمد و رفت کی یہاں بھی اجازت نہیں تھی۔ جہاز کے انتظار میں اس جگہ قافلے کو ایک ماہ تک قیام کرنا پڑا۔ اللہ کا فضل یہ ہوا کہ اس کیمپ کے نگراں، انگریز فوجی افسر کے دل پر مولوی صاحب کے حُسنِ اخلاق، پابندیِ اوقات اور سلامت روی کا بہت اچھا اثر پڑا۔ اُس نے دورانِ قیام بہت خدمت و رعایت کی۔

ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد بالآخر جب حاجی قاسم کمپنی کا جہاز "زبیدہ" چاٹگام پہنچا تو جہاز کے ذمہ داران سے مولوی صاحب کے آرام و راحت کی تاکید کی۔ چنانچہ جہاز کے سب سے اوپری طبقے کے وسطی حصے میں آپ کو ایک وسیع پردہ دار اور

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۵۰۔

ہوادار کمرہ دیا گیا جس سے پورا بحری سفر آرام اور راحت سے کٹا۔ مگر سفر بھی کیسا؟ آج جیسا نہیں کہ دہلی سے اُڑے اور پانچ گھنٹے کے بعد جدہ اُتر گئے۔ راستے میں کہیں رُکنے اور انتظار کرنے کی آدھ پون گھنٹے کی بھی زحمت نہیں ہوئی۔ یا اگر بحری جہاز ہی سے آئے تو بھی بمبئی سے چلے اور بغیر کہیں رُکے ہوئے چھٹے دن جدہ کے ساحل پر آلگے۔ یہ جہاز پورے سترہ دن پانی میں تیرنے کے بعد عدن پہنچا اور عدن میں کچھ قیام کرنے کے بعد روانہ ہوا تو کامران میں لنگر انداز ہوا۔ یہاں حجاج کو جہاز سے اُترنے کا حکم ہوا۔ اور پھر قرنطینہ میں ڈال دیئے گئے اور ایک دو دن نہیں پورے دس روز کی قید بامشقت بھگتنی پڑی۔ ستم ظریفی یہ کہ دس روپیہ فی کس اس سزا کی فیس بھی ادا کرنی پڑی۔ یہاں سے خدا خدا کرکے چھوٹے تو تین دن کا سفر طے کرکے جدہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے مگر ساحل کا تو صرف نام تھا۔ اس زمانے میں جہاز گہرے سمندر میں ٹھہرتا تھا۔ حجاج اور اور سامان بہزار دقت کشتیوں میں اُترتے تھے اور ہچکولے کھاتی ہوئی کشتیاں کنارے پر لگتی تھیں۔

مولوی صاحب کو سامان اُتروائی اور کشتیوں کا کرایہ ساڑھے سات روپیہ فی کس ادا کرنے پڑے۔ جدہ میں کسٹم، امیگریشن اور حاجیوں سے متعلق کارروائی میں دو ایک روز تو لگتے ہی ہوں گے۔ اس کے بعد مکۃ مکرمہ کو روانگی ہوئی۔ جدہ اور مکہ کے سفر میں آج کل زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ لگتے ہیں۔ مگر اُس وقت قافلے اونٹوں کے ذریعے اور خچروں پر سوار ہوکر دو دن میں یہ مسافت طے کرتے تھے۔ راستے میں آدھے فاصلے پر بحرہ کی منزل میں رات گذارتے تھے۔ مولوی صاحب کے قافلے کو ذی قعدہ کی ۲۴ یا ۲۵ تاریخ کو مکہ مکرمہ کی حاضری نصیب ہوئی۔ ابھی حج میں کچھ کم پندرہ دن باقی تھے۔ سید ابو بکر رشیدی مرحوم کو مطوف مقرر کیا گیا اور انہیں کے ایک بنگالی نژاد کارندے کے یہاں محلہ جیاد میں قیام ہوا۔ مکان تنگ و تاریک تھا۔ ہوا اور دھوپ کے گذر کا تو اُس زمانے کے مکانوں میں گویا رواج ہی نہ تھا۔ یہاں پانی کی بھی قلت تھی۔ مگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ کرنے کی فرصت بھی کسے تھی۔ حرم پاک؛

کعبہ، درِ کعبہ، غلافِ کعبہ، بابِ رحمت، ملتزم، میزابِ رحمت، حطیم، مقامِ ابراہیم، زمزم، عمرہ، نوافل، تہجد، طواف، نمازیں، دعائیں، تلاوتیں، تضرع وزاری، الحاح و بیقراری، توبہ و استغفار غرض قدم قدم اور پل پل کیسی کیسی رحمتیں اور کتنی کتنی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے بچھر بچھا کر نصیب فرمادی تھیں۔ اور کبھی کسی وقت اتفاق سے اگر خالی رہے تو مولوی صاحب اور صاحبزادگان حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب کے دربار میں حاضر ہو کر ذکر و شغل مراقبہ و مجاہدہ وغیرہ میں مصروف ہو جاتے تھے حضرت بھی بڑی شفقت اور خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ کیوں کہ یہ کوئی راہ چلتوں کا قافلہ نہ تھا۔ مولینا فضلِ رحمن گنج مرادآبادی۔ حضرت شیخ الہند محمود حسن، حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی کے خدام اور مقربین کا قافلہ تھا۔ ان کے سلام و پیام، حالات و تفصیلات لے کر آیا تھا۔ ع اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔ حضرت قطب عالم بڑے شوق سے ان خاصانِ خدا کی باتیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جی چاہتا ہے ایک بار اور ان حضرات سے ملاقات ہو جاتی۔ قصہ مختصر جب حج و عمرہ سے فراغت کے بعد مولوی صاحب مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہونے لگے تو حضرت حاجی صاحب نے خصوصی طور پر دعا فرمائی کہ بارِ الٰہا ان حضرات کو ہجرت کے شدید امتحانات سے بچانا۔[1] اونٹوں پر بارہ دن کے مسلسل سفر کے بعد ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۸ مئی ۱۸۹۹ء کو مولوی صاحب کے خاندان نے مدینہ طیبہ کی خاک کا سرمہ لگایا اور دربارِ رسالت میں باریاب ہوئے۔

منزلِ کوچۂ جاناں کی نہ پوچھو دوری جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

مولوی سید شاہ حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ کا مدینہ طیبہ میں قیام

۱۹۰۰ء

یہ تو اللہ ہی جانتا ہوگا کہ جب مدینہ طیبہ میں حاضری ہوئی ہوگی جب پہلے پہلے گنبدِ خضرا پر نظر پڑی ہوگی، جب مدینہ کی گلیوں میں سے گذرے ہوں گے، جب حرمِ نبوی

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۶۱

میں وہ منظر بیان ہوا ہوگا جب سرکار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کی ہوگی جب روضۂ مسن پر حسن الحزن میں سسک سسک کر رونے اور گڑگڑائے ہوں گے جب حجرۂ عائشہ کی جالیوں کا نظارہ کیا ہوگا اور جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت مولوی صاحب کے قلب وجگر پر کیا کیا گزری ہوگی۔ تاریخ میں تو بس اتنا لکھا ہے کہ مدینہ پہنچے تو سب سے پہلے سبز گنبد کے سامنے میں باب النساء کے قریب زقاق البدور میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا مکان چھوٹا تھا۔ خاندان کے افراد زیادہ تھے۔ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ تنگی ہو مگر تنگی فراخی دیکھئے تو کوچہ حبیب کی جنت کیسے نصیب ہوتی۔ سرکار کے دربار سے ایک قدم بھی ہٹنا گوارا نہیں تھا مگر بہت جلد حقائق کی تلخیاں اپنا رنگ دکھلانے لگیں۔ علائق اور ضروریات انسان کی زندگی کے ساتھ ہیں اور بہت ظالم ہیں۔ لاکھ کوششیں کیں مگر چھوٹے مکان میں گزر نہ ہوا۔ لاچار وہاں سے اٹھ آئے اور حارۃ الاغوات میں ایک وسیع اور فراخ ہوادار مکان ایک سو بیس روپیہ سالانہ پر کرایہ پر لے لیا۔ جب ذرا سکون اور فرصت ملی تو اولاد کو بلا کر مسائل ومعاملات کے شرعی فیصلے کیے۔ سفر سے جو رقم بچ رہی تھی وہ حسب قانونِ وراثتِ شرعی ایک ایک فرد کو تقسیم کر دی اور فرمایا کہ تم لوگ جیسے چاہو اس رقم کو خرچ کرو۔ میں تو ہجرت کی نیت کر کے حاضر ہوا ہوں اس لیے میرے لیے تو واپسی کا سوال نہیں ہے۔ تم میں سے جو واپس جانا چاہے اس کو اجازت ہے چلا جائے۔ کرایہ کے لیے یہ رقم کافی سے بہت زیادہ ہے۔ صاحبزادوں میں کسی نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی۔ قطب عالم حضرت حاجی صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے منع فرمایا تھا کہ ہجرت کے بعد منجانب اللہ بڑے شدید امتحانات ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ پھسل جاتے ہیں، واپس ہو جاتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔ جس کو دنیا مقصود ہو وہ ہندوستان میں رہے۔ اور جو اللہ رسول کو چاہے وہ مدینہ آجائے۔ اور جو دونوں کا طلبگار ہو وہ مکہ مکرمہ جا رہے۔ اس لیے صاحبزادگان نے بیک زبان عرض کی کہ ہم نے اگرچہ ہجرت کی نیت نہیں کی ہے مگر جب تک آپ کا سایہ اللہ برقرار رکھے آپ کو چھوڑ کر

نہیں جائیں گے۔[1] مولوی صاحب روشن ضمیر اور صاحبِ کشف بزرگ تھے، فرمایا کہ تم میں سے ایک کو تو آخر کار ہندوستان جانا ہی پڑے گا اور واقعی آگے چل کر یہ قرعۂ فال حضرت شیخ الاسلامؒ کے نام پڑا۔[2] اس زمانے میں اہلِ مدینہ اور مہاجرین کی گذر اوقات صرف ترکی حکومت کے وظائف، ممالکِ اسلامیہ کے تبرعات اور عام مسلمانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے رؤسا، نوابوں، تعلقداروں، جاگیرداروں اور ریاستوں کی پیش کردہ خدمات پر منحصر تھی۔ مولوی صاحب کو ان ذرائع پر بھروسہ کرنا پسند نہیں ہوا اور صاحبزادگان کو حکم دیا کہ کوئی باعزت روزگار تلاش کرنا ضروری ہے۔ ہندوستان سے روانہ ہوتے ہوئے یہ خیال تھا کہ لڑکے چوں کہ عربی زبان اور دینیات میں عالم و فاضل ہیں، اس لیے عرب ملک میں اچھی ملازمتیں آسانی سے مل جائیں گی مگر یہاں پہنچے تو یہ توقع پوری طرح صحیح نہیں ثابت ہوئی۔ چنانچہ باب الرحمۃ اور باب السلام کے درمیانی بازار میں اشیائے خورد و نوش اور ضروریاتِ زندگی مثلاً چائے، شکر، گھی، تیل وغیرہ کی ایک دوکان کھولی گئی۔

مدینہ طیبہ کی کھجور خاص تحفہ اور بیش بہا تبرک ہے۔ اس وقت تجار اور دکاندار فصل کے وقت کھجوریں خرید لیتے تھے اور ان کو حج کے موسم کے لیے محفوظ کر لیتے تھے۔ افریقہ کے ملکوں سے مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جہازوں پر بندرگاہوں تک اور پھر اونٹوں پر مدینہ تک آتے تھے۔ ان مٹکوں میں کھجوریں دبا دبا کر بھر کے اوپر سے نمک اور پتوں کی تہہ جما دیتے تھے۔ اس طرح کھجوریں سال کے سال محفوظ اور صاف رہتی تھیں اور ان میں کیڑے وغیرہ نہیں لگتے تھے۔ صاحبزادوں نے بھی ایک ایسا ہی گودام کرائے پر لے کر کئی سو روپے کی کھجوریں بھر لیں۔ دوکان کے لیے تھوک کی خریداری اور سامان کی فراہمی اور دوسرے بنیادی انتظامات بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب کرتے تھے۔ ان کو ان امور میں کافی سلیقہ، تجربہ اور واقفیت ہو گئی تھی۔ دوسرے دو بھائی مولانا سید احمد اور مولانا حسین احمد باری باری دوکان پر بیٹھتے تھے۔ اس طرح

---

[1] [2] نقشِ حیات، ۱۴۰، ص ۴۵

خاندان کی گذر بسر کا ایک معقول ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر تجارت اور دوکانداری کی پہلی شرط یہ ہے کہ تاجر پورے طور پر اسی کا ہو کر رہ جائے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے غرض چوبیس گھنٹے اسی فکر میں غرق رہے، دوسرے یہ کہ لین دین میں، قرضوں کی وصول یابی میں، خرید و فروخت میں کسی قسم کے لحاظ ملاحظہ اور رو رعایت کو روا نہ رکھے تیسرے یہ کہ شدید سے شدید ضرورت پر بھی دوکان بند نہ ہو اور تاجر اپنے مرکز سے غائب نہ ہو۔ یہاں معاملہ ان تمام اصولوں کے بالکل برعکس تھا۔ زندگی کا اصل مقصد تو حدیث تفسیر، فقہ اور دینیات کی تعلیم و تدریس تھا اور اصل مشغلہ ذکر و شغل، تصوف، مراقبہ، پاس انفاس، تزکیۂ نفس اور دوسرے روحانی اشغال تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ چوبیس گھنٹے یا شب و روز کے زیادہ ہی تر اوقات دوکانداری اور تجارت کی مشغولیت اور دھن میں گذر جاتے۔ اور یہ بھی کیسے ہو سکتا تھا کہ لین دین، خرید و فروخت اور قرضوں کی وصول یابی میں درشتگی، کھری معاملہ داری اور خشک کلامی اختیار کی جاتی۔ اور فرض کیجیے یہ سب کچھ ہو بھی جاتا تو جب پیر و مرشد گنگوہیؒ نے اذن حاضری دیا اس وقت ہندوستان کا سفر کیسے ٹالا جا سکتا تھا۔ پیرزادوں کا خاندان تھا۔ اہل اللہ کا گھرانہ تھا اور صوفیائے عظام کی اولاد تھے۔ پیر کے حکم کو اشارۂ غیبی گردانا۔ کیسی دوکان کہاں کی تجارت اور کس کی دنیا داری؟ سب کچھ جہاں تھا اور جس حال میں تھا چھوڑ چھاڑ دنیائے دوں کو ترک کر رضائے باری تعالیٰ کے راستے پر روانہ ہو گئے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں	ایں خیال است و محال است و جنوں

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

مولینا صدیق احمد صاحب اور مولینا حسین احمد صاحب تو حضرت قطب عالم گنگوہی کے حکم پر ہندوستان روانہ ہو گئے۔ مولینا سید احمد نرم خو، رحمدل اور رقیق القلب انسان تھے اور پھر اکیلے ان کے بس کی بات بھی نہیں تھی، اس لیے ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) ختم ہوتے ہوتے دوکان اٹھا لینے ہی میں نفع نظر آیا اور یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اب تینوں بھائی تعلیم و تدریس تصوف اور سلوک کے لیے بالکل فارغ تھے۔ حرم پاک میں حدیث شریف

کے اسباق مسجد اجابت میں اذکار و اشغال، قرآنِ پاک کی تفسیر، فقہ اور عقائد پر بیانات غرض اب کسی دینی اشغال میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اور یہ مولوی صاحب ہی کی ہمت اور توکل تھا کہ نہ تو خود آخرت پر دنیا کے عیش و عشرت کو ترجیح دی اور نہ اولاد کو کسی ایسی مصروفیت میں ڈالا جس سے ان کے تعلق مع اللہ اور خدمات فی سبیل اللہ میں رکاوٹ پیش آتی۔ تذکرہ کرنے اور لکھ دینے میں تو یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن تصوّرِ حالات کیجیے اور اندازہ ایک پردیسی اور خوددار خاندان کی مشکلات کا کیجیے تو حقیقت واضح ہوتی کہ یہ تسلیم و رضا صبر و قناعت اور یہ مجاہدہ و ریاضت ہر کس و ناکس کے بس کا سودا نہیں ہو سکتی مگر پھر بھی انسانی ضروریات اور بشری احتیاجات جیتے جی بنی آدم سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ آدمی خود تو جیسے چاہے تنگی ترشی میں گذر کرلے مگر معصوم بچوں اور ضعیف خواتین کا کیا کرے۔

شب چوں عقد نماز بر بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

چنانچہ مولٰنا سیّد احمد صاحب کو پڑھانے کی ملازمت کرنی پڑی جس کی تنخواہ بیس روپیہ ماہوار ملتی تھی۔ اس قلیل مقدار میں آٹھ دس افراد کے خاندان کا گذر کیسی ہی کفایت اور حسنِ انتظام سے ہو، ناممکن ہے۔ دس روپیہ ماہوار تو مکان کا کرایہ ہی دینا پڑتا تھا۔ اس لیے یہ زمانہ اس خاندان پر بڑا سخت اور عسرت و تنگدستی کا گذرا۔ اتنا تو اللہ کا فضل ہوا کہ فاقوں کی نوبت کبھی نہ آئی۔ مگر اس سے پہلے کی ساری تکلیفیں گذر گئیں۔ اور جب کوئی چارہ نہ رہا تو مولوی صاحب نے کسی سے پچاس روپے قرض لیے۔ اُس سے اتنا سہارا ہوا کہ کسی نہ کسی طرح قوت لایموت کا انتظام ممکن ہوا۔ مگر اس طرح کہ "ایک وقت کھچڑی اور ایک وقت نمکین پیچھ پر تمام گھر والوں کا گذران کئی ماہ تک رہا۔"[1] اور اس طرح گذر کرنے میں کیسا کیسا جگر کا خون کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ کرنا متوسط الحال لوگوں کے لیے مشکل نہیں ہے۔ کھچڑی اور نمکین پیچھ سے معصوم بچوں اور کمزور عورتوں کے پیٹ کیسے بھرتے ہیں یہ بھی خوب معلوم ہے۔ آخر کچھ

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۶۰

دنوں کے بعد صاحبزادگان نے ہندوستان سے کچھ رقم ارسال کی جس سے کسی قدر فراخی ہوئی اور خورد و نوش کی آسانیاں ہوئیں مگر اچانک ایک دوسرا امتحان پیش آگیا۔ مکان جس میں رہتے تھے اور کافی راحت و آرام سے گذر ہوتا تھا۔ اس کے مالک نے کرایہ بڑھایا اور بڑھا ہوا ایک سال کا پیشگی کرایہ طلب کرلیا۔ نیز عدم ادائیگی کی صورت میں انخلاء کا نوٹس دے دیا۔ اس ادائیگی کے لیے ایک سو بیس روپے کی ضرورت تھی۔ جس کا چولھا قرض سے روشن ہوتا ہو اس کے لیے اکٹھے اتنی رقم کی فراہمی مشکل ہوگئی۔ چار و ناچار دوسرے کی تلاش شروع ہوئی۔ اتنے بڑے کنبے کے لیے کافی قریب، ہوادار اور حسبِ گنجائش کرایہ کا مکان ملنا آسان نہ تھا۔ مگر کافی دوڑ دھوپ کے بعد بابِ مجیدی کی طرف شہر پناہ کے باہر ایک حیدرآبادی رئیس نواب جانی میاں مرحوم کا زیرِ تعمیر مکان ملا جو سرمایہ کی کمی کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا صدر دروازہ تو مکمل ہوگیا تھا۔ مگر اندرونی در اور کھڑکیاں وغیرہ بغیر دروازوں کے تھے۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب کا خیال کیا اور تا اختتامِ تعمیر مفت رہائش کے لیے دے دیا۔ چنانچہ پورا خاندان اسی نامکمل مکان میں اُٹھ آیا۔ سیمنٹ کے بجائے مٹی کا وقتی پلاسٹر کرلیا گیا اور دروازوں کھڑکیوں کی جگہ ٹاٹ کے پردے لٹکا لیے گئے۔ ؎

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

اسی مدینہ طیبہ میں آج اسّی نوّے برس بعد مولوی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سیّد محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے محل نما مکان میں درجنوں نوکروں، خادموں اور منشیوں اور جھماتی ہوئی موٹر کاروں کے ماحول میں بھرے گھر میں دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تحدیثِ نعمت فرمائی اور راقم الحروف کی کسی بات پر اپنے پوتوں سے فرمایا کہ اُس وقت ہمارے گھر میں ٹاٹ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ یہی دروازے بھی تھے اور پردے بھی۔ لڑکے یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ اور کئی دن تک پوچھتے رہے کہ اعلیٰ درجے کے بیش قیمت دروازوں اور ریشمی پردوں کے بجائے ٹاٹ کے پردے لگوانے میں دادا جان

کی کیا مصلحت تھی۔ اب انھیں یہ کون سمجھاتا کہ "تلک الایام نداولہا بین الناس" تو اس طرح وقتی طور پر مکان کا مسئلہ حل تو ہو گیا، مگر مولوی صاحب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جیسے بھی ہو اپنا گھر اور اپنی جھونپڑی بنانی ضروری ہے۔

خیال تو بہت اچھا تھا۔ ضرورت بھی شدید تھی اور اس کے علاوہ چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ مگر عملاً اس کی کیا شکل ممکن تھی؟ سرمایہ تو بڑی چیز ہے یہاں تو کوئی معمولی رقم بھی پاس نہ تھی، خود ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے، دونوں صاحبزادگان ہندوستان میں تھے۔ پردیس سے سابقہ تھا۔ لوگ بھی غیر، طرزِ تعمیر بھی الگ اور عمارتی سامان بھی ہندوستان کے اعتبار سے بالکل مختلف، اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ راج مزدوروں کی زبان عربی اور مولوی صاحب اردو بولنے والے، غرض قدم قدم رکاوٹیں اور مشکلات سدِ راہ تھیں۔ مگر یہی خصوصیتیں تھیں جنھوں نے آپ کو سطحِ عوام سے بہت بلند منصب کر دیا تھا۔ دشواریاں اور ناہمواریاں آپ کے عزائم اور حسنِ تدبیر و انتظام کے لیے ہمیشہ مہمیز ثابت ہوتی تھی اور قوتِ عمل کو اور بھی تیز کر دیتی تھیں۔

جتنی جتنی ستمِ دہر سے کھاتا ہے شکست
دل جواں، اور جواں، اور جواں ہوتا ہے

سفر سے بچی ہوئی جو رقوم آپ نے اولادیں تقسیم فرمائی تھیں، ان میں صاحبزادی کے حصے کے روپے امانت کے طور پر آپ کی تحویل میں تھے، اسی میں سے پانچ سو روپے بطور قرض لیے گئے۔ شہر سے باہر ایک زمین اغوات (حرم پاک کے خواجہ سرا خدام) کے لیے وقف تھی۔ اس میں کچھ کھجوریں تھیں اور کنواں تھا۔ اس زمین سے ایک قطعہ جس میں پانچ صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کا گذر ہو سکے، خرید لیا گیا۔ مولوی صاحب اس وقت تک حجاز کے باشندے نہ تھے اس لیے قانوناً رجسٹری ان کے نام نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ سرکاری طور پر زمین ڈاکٹر رفاقت علیؒ[1] مرحوم کے نام رجسٹری کرائی گئی۔ بعد میں جب آپ کو رعیت نامہ

[1] ڈاکٹر صاحب دیوبند کے شیخ عثمانی تھے، حکومت برطانیہ کے فوجی ڈاکٹر ہو کر افریقہ بھیجے گئے تھے، وہاں سے مدینہ طیبہ آئے اور ترکی فوج میں ڈاکٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ آپ نے مولوی صاحب اور خاندان کے ساتھ بڑے سلوک کیے اور
(ص آئندہ پر)

ملا تب زمین آپ کے نام ہوئی۔ اتفاق سے اس زمین پر مٹی کا ایک ڈھیر پہلے سے پڑا ہوا تھا۔ یہ کسی دوسرے کے لیے تو بے کار ہی ہوتا۔ اس کے اٹھوانے اور صاف کروانے میں کچھ پیسے اوپر سے ہی خرچ ہو جاتے۔ مگر مولوی صاحب نے اس مٹی سے کچّی اینٹیں پتھوالیں۔ اس ہی سے کسی قدیم عمارت کے پتھر کے چوکے بھی نکل آئے۔ آج تو ہر چیز نئے فیشن اور نئے طریقے کی ہوگئی۔ اُس زمانے میں مدینہ منورہ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سیاہ رنگ کے جو پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں اور جن کو کہا جاتا ہے کہ یہ کوہ آتش فشاں کا جلا ہوا لاوا یا پتھر ہیں انہی سے اینٹوں کی طرح چوکے گڑھے جاتے تھے اور انہی سے عمارتیں بنتی تھیں۔ جھانویں کی ساخت کے پتھروں کی سیاہ اینٹوں کی عمارتیں نہایت دیدہ زیب، مضبوط اور آرامدہ ہوتی تھیں۔ یہ اینٹیں مفت میں یا یوں کہیے کہ نفع میں مل گئیں تو بہت کفایت سے بہت جلد تیرہ فٹ اونچی چہار دیواری تیار ہوگئی۔ صاحبزادگان مولٰنا صدیق احمد اور حسین احمد سنہ ۱۳۲۰ھ میں ہندوستان سے لوٹے تو اپنی زمین اور اس پر چہار دیواری پاکر نہایت متعجب اور مسرور ہوئے۔ اتنی ہمت جو بڑھاپے میں باپ نے کی، شاید اُن جوانوں کے کیے نہ ہوتی۔ حضرت شیخ مدنیؒ ایک مدرسہ شمسیہ باغ میں پچیس روپیہ ماہوار پر ملازم ہوگئے۔ بڑے بھائی بھی ایک جگہ تعلیم و تدریس پر ملازم ہوگئے۔ اور ملازمت کے ساتھ ہی خارج اوقات میں حرم پاک میں شوقین اور خواہشمند طلباء کو حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ کا درس بھی دیتے تھے۔ طلباء کے رجحانات اور میلانات سے واقفیت اور عربی زبان میں تجربہ تو حضرت کو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب تدریس کی ملازمت کی وجہ سے وقت بھی مطالعہ اور تیاری کے لیے بالکل فارغ ملتا تھا۔ اس لیے بہت جلد بڑی شہرت ہوگئی۔

عام طور پر لوگوں میں رشک و حسد ہونے لگا۔ مدرسے کے ناظر صاحب بھی روز روز

(بقیہ ص ۵۰) ہمیشہ آڑے وقتوں پر کام آئے۔ حضرت مولٰنا مولوی عبدالحق صاحب مدنیؒ آپ کے صاحبزادے تھے آپ حضرت شیخ الاسلام مدنی کے شروع سے آخر تک شاگرد تھے اور استاد سے بہت تعلق خاطر رکھتے تھے۔ ڈاکٹر رفاقت علی مرحوم کی ایک صاحبزادی سے مولٰنا سید احمد صاحب کی شادی بھی ہوئی تھی۔ مولٰنا عبدالحق صاحب مدنی مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم رہے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے دیوبند میں سنہ ۱۹۵۳ء میں انتقال فرمایا۔

نئی نئی شرطیں لگانے لگے۔ حضرت امکانی حد تک ان کے سارے احکام کی تعمیل کرتے رہے۔ مگر ایک ایسی شرط بھی موصوف نے لگائی جسے پورا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ ناظر صاحب نے حکم دیا کہ مدرسہ کے اوقات کے علاوہ کہیں بھی کوئی سبق نہ پڑھایا جائے اور مدرسہ کے طلباء کے علاوہ کسی کو تعلیم نہ دی جائے اور حرم پاک میں حدیث و تفسیر کا درس نہ دیا جائے۔ مولوی صاحب نے صاجزادے سے فرمایا کہ میں نے تم کو اللہ رسول کے لیے وقف کیا ہے اور دین کی خدمت کے لیے تعلیم دی ہے، اس لیے نہیں کہ تم ملازمت کرو۔ چنانچہ حضرت نے استعفیٰ دے دیا اور سارا وقت حرم پاک میں درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ جس مکان میں مولوی صاحب مقیم تھے اس کا انتظام و اہتمام بھی ناظر مدرسہ ہی کے ذمہ تھا۔ اس استعفیٰ کی وجہ سے ان کو ناگواری ہوئی اور انھوں نے نوٹس دے دیا کہ مہینہ بھر کے اندر مکان خالی کر دیا جائے۔ کیسی مشکل اچانک آپڑی، سال سوا سال کے اندر اندر دوسری بار مکان کا سخت مرحلہ درپیش ہے مگر حق تعالیٰ کے قوانین کا تجربہ بنی آدم کو زندگی میں بار بار ہوتا ہی رہتا ہے۔ بات صرف احساس اور موعظت و عبرت حاصل کرنے کی ہے۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم۔ ناظر صاحب نے تو پریشان کرنے کے لیے یہ دھمکی دی تھی۔ مولوی صاحب کی عالی ہمتی کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ عسرت، تنگدستی اور موانع کا ادنیٰ سا خیال کیے بغیر ذاتی مکان کی تعمیر کا ارادہ کر لیا۔ کیسے ہوگا؟ کیا ہوگا؟ کہاں سے آئے گا؟ یہ سوالات آپ کے قدم نہیں ڈگمگا سکتے تھے۔ اذا ھم القیٰ بین عینیہ ھمہٗ۔ ونکب عن فکر العواقب جانبا۔ چہار دیواری بن ہی چکی تھی۔ پکی اینٹیں بھی موجود تھیں۔ پتھر کے کچھ چوکے بھی باقی بچ گئے تھے اور سب سے بڑا سامان تعمیر اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ اور توکل تھا۔ اتنی گنجائش تو تھی نہیں کہ راج مزدور لگائے جاتے۔ سارے خاندان کو لے کر خود ہی تعمیر میں لگ گئے۔ روزانہ عورتوں، بچوں اور صاحبزادگان کو لے کر جاتے تھے۔ دیوار خود اپنے ہاتھ سے چُنتے تھے۔ اینٹیں، چوکے اور گارا صاحبزادگان، علماء، اتقیا اور اولیا صاحبزادگان مولانا صدیق احمد صاحب خلیفہ مجاز مولانا رشید احمد گنگوہی تلمیذ خصوصی شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید احمد صاحب خلیفہ مجاز شیخ الہند مولانا محمود حسن

صاحب و مولنا خلیل احمد صاحب و بانی مدرسہ علوم شرعیہ مدینۂ منورہ اور حضرت شیخ الاسلام، محدث جلیل، مجاہدِ عظیم مولنا حسین احمد صاحب مدنی رحمہم اللہ ڈھوتے تھے۔ سونے کو کندن بننے کے لیے بھٹی میں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ کنویں سے پانی بھرنا، گارا بنانا، مصالحہ تیار کرنا اور دوسرے کام وہ محترم خواتین کرتی تھیں جنھوں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالے تھے۔ پانی کی ٹھلیا بھی نہیں اُٹھائی تھی اور کسی سخت کام کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا؎۔ اعضاءِ وجوارح محنت اور مشقت میں مصروف رہتے تھے اور زبان پر آیاتِ قرآنیہ اور ذکر اللہ جاری رہتا تھا۔ واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ مہینہ بیس روز تک شب و روز اسی طرح محنت اور سنتِ ابراہیمی و سنتِ نبوی ادا کرتے رہے۔

"احاطہ کے جانب مشرقی شمال میں پانچ کوٹھریاں، ایک غسل خانہ، ایک جائے ضرور اور ایک پردے کی جگہ ان تمام کوٹھریوں کے سامنے اپنے ہی ہاتھوں سے سب نے مل کر بنائی۔ کوٹھریوں کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ چھت اتنی اونچی بنائی گئی کہ چارپائی پر کھڑے ہوں تو چھت سر میں نہ لگے مگر زیادہ نیچی بھی نہ رہے۔ کڑی کی جگہ ببول کی موٹی موٹی شاخیں جو کہ بدوی لوگ شہر میں فروخت کرنے کے لیے لاتے ہیں، دور دور لگائی گئیں اور ان پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھل قریب قریب بچھائے گئے اور ان پر کھجور کے بوریے بچھا دیے گئے اور اُن پر گلاوہ (ترمٹی) بچھا کر خشک مٹی ڈال دی گئی۔ چھت اتنی مضبوط نہ تھی کہ بلا تکلف اس پر آدمی چل سکے۔ اور نہ اتنی موٹی تھی کہ زور کی بارش کو روک سکے۔ چھپر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی تھی۔ اس طرح دھوپ اور سردی سے حفاظت ہو گئی۔ معمولی بارش کی بوندوں سے بھی حفاظت ہوتی تھی۔ مگر زور کی بارش میں جو کہ مدینہ منورہ میں بہت کم ہوتی ہے، سب پانی اندر آتا تھا؎۔"

اس پھوس کی کٹی سے سارے ہی افرادِ خاندان کو جو مسرت، اطمینان اور راحت نصیب ہوئی، اس کا تذکرہ بھی حضرت ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے، معلوم ہوتا ہے

؎ ؎ نقشِ حیات، ج ۱، ص ۳۱

جھونپڑی نہیں حویلی اور مکان نہیں قلعہ تعمیر ہوگیا ہو سے

وہ دو تنکے سہی لیکن ہیں اپنے
بڑی راحت ہے مجھ کو آشیاں میں

"اس عمارت کے تیار ہوجانے پر ہم سبھوں کو اس قدر خوشی ہوئی جو حدِ بیان سے باہر تھی۔ گویا ہم سب قیدِ غلامی سے آزاد ہوگئے۔ اپنے مکان میں جہاں چاہیں بیٹھیں، جہاں چاہیں سوئیں، جہاں چاہیں پانی گرائیں، روشنی کھلی ہوئی تھی، ہوائیں بڑے صحن دار مکان کی طرح آتی تھیں، کوئی ٹوکنے اور کہنے والا نہ تھا۔ کرایوں کی فکر، اور تقاضوں کا کھٹکا باقی نہ رہا تھا۔ پانی بھی اس کنویں کا تقریباً شیریں تھا۔ صرف پینے اور کھانا پکانے کے لیے ایک مشک سقہ لاتا تھا۔ الحاصل بہت زیادہ اطمینان کی صورت پیدا ہوگئی ہے[1]

مکان کی راحت تو کسی درجے میں نصیب ہوگئی۔ کسی درجے میں اس لیے کہ گھاس پھوس کا مکان اور پھر اپنے ہاتھوں سے چھایا ہوا۔ جھونپڑا جیسا کچھ ہوگا ظاہر ہے۔ بہرحال سر چھپانے کا بہانہ تو ہو ہی گیا تھا۔ مگر معاش کی تنگی اپنی جگہ پر تھی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اُدھر مولانا سید احمد صاحب تربیت باطنی کی غرض سے گنگوہ شریف چلے گئے۔ اب صرف مولانا صدیق احمد صاحب کی ملازمت اور ان کی معمولی سی تنخواہ پر گذر تھا جو کسی طرح کافی نہ تھا۔ لیکن جیسا مولوی صاحب نے محض اللہ کے بھروسے پر اپنی اولاد کو دینی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ویسے ہی اللہ تعالیٰ نے غیب سے مدد بھی فرمائی۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ، ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء کے اواخر میں بعض اہلِ اخلاص و عقیدت مند حضرات کی کوششوں سے بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگمؒ کی حاضری کے موقع پر ایک جماعت دُعاگوئی کی مقرر ہوئی۔ اس میں مولوی صاحب اور ان کے تینوں صاحبزادگان کے نام بھی رکھے گئے۔ دس روپیہ فی نفر ماہوار اکرامیہ مقرر ہوا۔ مولوی

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۹۶

صاحب کے پندرہ روپے طے ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان وظائف کے نگراں شیخ حسن عبدالجواد کو ضرورت پیش آئی کہ اردو حساب وکتاب و اندراجات کے لیے کسی اُردو داں کو مقرر کریں۔ اس کے لیے موصوف نے حضرت شیخ کے نام کی سفارش کی۔ چنانچہ آپ کا نام وظیفہ یابوں میں سے تو نکل گیا۔ مگر چوبیس روپے ماہوار پر یہ مستقل ملازمت مل گئی۔ اُس زمانے میں مدینۂ منورہ کی ملازمتیں نام کی ہوتی تھیں۔ حکومت کا اور تنخواہیں دینے والوں کا اصل مقصد اہلِ مدینہ کی خدمت اور پرورش ہوتا تھا۔ لاتعداد اشخاص کا گذر اوقات ان ملازمتوں کے نام پر ہوتا تھا۔ ڈیڑھ سو یا اس سے زیادہ موذن حرم پاک میں اذان کے لیے مقرر تھے۔ نماز پڑھانے کے لیے دو سو سے زیادہ امام تھے اور ستر خطیب تھے[1]۔ یہ سب باری باری اپنی ڈیوٹی انجام دیتے تھے اور باری بھی شاید مہینوں مہینوں میں ایک ایک کی آتی ہوگی۔ مگر حضرت کو تو ہندوستان ہی کی ملازمت ملی تھی۔ تاہم اس مجموعۂ آمدنی سے مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑھاپے اور کمزوری میں کسی قدر سانس لینے کا موقع ضرور مل گیا۔

اتفاق سے اُسی زمانے میں نواب صاحب بھاولپور بھی حج و زیارت کے لیے حاضر ہوئے۔ ان کے وزیرِ اعظم مولانا رحیم بخش صاحب بڑے عالم، متقی اور باخدا شخص تھے اور حضرت قطب عالم گنگوہی کے متوسلین میں سے تھے۔ انتظامات کے لیے وہ نواب صاحب کی آمد سے پہلے ہی مدینۂ طیبہ حاضر ہوئے۔ قدرتی طور پر ان کو مولوی صاحب اور ان کے حضرت گنگوہی کے خلفا، صاحبزادگان سے خصوصی تعلق اور عقیدت ہوگئی اور نواب صاحب آئے تو موصوف نے ان کی جانب سے بھی دس روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کرادیا۔ یہ ساری مستقل آمدنیاں تھیں اور ان کے بند ہونے کا بظاہر خطرہ نہیں تھا۔ اس موقع پر بطور سپاس گذاری ایک واقعہ کا تذکرہ نوکِ قلم پر آیا جارہا ہے۔ مولانا صدیق احمد صاحب کی جواں عمری میں وفات کے بعد ان کا بھوپال کا وظیفہ مولانا وحید احمد مدنی کو ملتا رہا اور مولانا کے انتقال کے بعد تا انضمام ریاست وہ وظیفہ

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۶

راقم الحروف کے نام جاری رہا۔ قبض الوصول پر نام کے ساتھ وظیفہ خوار مدینہ منورہ لکھا رہتا تھا۔ میں وظیفہ بند ہونے کے بعد ہی اس قابل ہوا کہ صحیح طور پر اس اصطلاح وظیفہ خوار مدینہ منورہ کا مطلب سمجھ سکوں۔ الغرض، ہر چند کہ اب لیل ونہار کی گردش کی شدت میں کمی آچلی تھی۔ اور فی الجملہ فراخی اور فارغ البالی بھی میسر ہوگئی تھی مگر پھر بھی دنیاوی راحت و طمانیت کا جو معیار ایک عام متوسط الحال گھرانے کو نصیب ہوتا ہے اُس سے اب بھی کوسوں کی دوری تھی۔ مولوی صاحب نے عسرت اور تنگدستی ہی میں آنکھ کھولی تھی مگر تھے تو زمیندار ہی۔ گھر میں کھیتی تو ہوتی ہی تھی۔ گڑ، گھی، تیل، دودھ، دہی، چنا، مٹر، دالیں، گیہوں، چاول، پھل پھلاری، سبزی ترکاری، غرض سب ہی کچھ تو گھر میں پیدا ہوتا تھا۔ اور اس پر مستزاد مولوی صاحب کا نظام، انتظام، کفایت شعاری اور جزرسی تھی۔ اسی سلیقہ اور منظم زندگی کے نتیجہ میں مرہونہ جائداد واگذار کرائی۔ موروثی مکان سے الگ اپنے ہی صرفہ سے ایک اعلیٰ درجہ کا زمیندارانہ، وسیع، آرام دہ اور شاندار مکان بنوایا، بچوں کی شادیاں کیں اور ان میں خاندانی اور روایاتی عزت اور وقار محفوظ رکھا۔ مختصر یہ کہ مرفہ الحالی، کشادگی اور سپید پوشی کی زندگی گذارتے رہے۔

حضرت کی روایت سنیے: "واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین کا حسنِ انتظام ہی تھا کہ اس تھوڑی سی تنخواہ میں وہ سپید پوشی کے ساتھ کثیر الاولاد گھرانے کا روزمرہ کا خرچ، تعلیمی اخراجات اور تقریبیں پوری کرتے رہے۔ بڑے بھائی صاحب اور منجھلے بھائی صاحب کا ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۰۸ھ شوال میں نکاح کیا۔ اوّل الذکر کی برات شہزاد پور میں چھ کوس کی دوری پر گئی اور ثانی الذکر کی شادی ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے یہاں گاؤں ہی میں ہوئی۔ زیورات، جوڑوں، مہمانوں اور ولیمہ وغیرہ میں خاصی مقدار خرچ ہوئی جو کہ پس انداز مقدار سے پوری ہوئی۔ پھر ۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۲ھ میں میری شادی ہوئی اور مصارفِ کثیرہ برداشت کرنے پڑے مگر ایک پیسہ قرض نہیں لینا پڑا۔ اور ان کی حالت اعلیٰ درجہ کی شمار ہوتی تھی اور وہ بہت مطمئن اور خوش وخرم نظر آتے تھے"[۲]

---

[۱] اُس جائداد کے بقایا حصے میں آج کے دور میں بھی فراخی، فراوانی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہے۔ (مؤلف)
[۲] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۳۲

اُس زمانے کو ابھی بہت زمانہ نہیں گذرا۔ اودھ کے چھوٹے سے چھوٹے زمینداروں کے حالات کے عینی شاہد ابھی چار چھ برس پہلے تک تو بہت موجود تھے مگر انہی کی زبانی سُننے والے تو اب بھی ہر جگہ اور ہر مقام پر مل جائیں گے۔ ہر خاندان میں رعیت کے دو چار بلکہ دس پانچ گھر اور ملازموں کی ایک خاصی تعداد بیگاریوں کی ایک لائن اور حویلیوں میں خادماؤں کی ایک جماعت ہوتی تھی مگر یہ تو گھر کی اور وطن کی باتیں تھیں۔ یہاں تو مدینۂ طیبہ تھا۔ شہنشاہوں کے سرکار کا دربار تھا۔ احکم الحاکمین کے محبوب کا دیار تھا۔ یہاں پل پل آزمائش اور قدم قدم ابتلاء تھا۔ جن کے رُتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ وطن، ماں باپ اور اعزہ و اقرباء سے مفارقت، رہن سہن کی اجنبیت، آب و ہوا کے شدائد تو تھے ہی۔ گھر کی صفائی، جھاڑو پونچھا، برتن مانجھنا بھی خواتین کو خود ہی کرنا پڑتا تھا اور سب سے کٹھن مرحلہ کپڑے دھونے اور چکّی پیسنے کا تھا جن ملکوں میں گھر گھر دھوبی کپڑے دھوتے ہوں اور پنہاریاں چکّی پیستی ہوں وہاں کی عورتیں خود یہ کام کریں تو ان کو سو سو بار آفریں ہے۔

"عورتوں کو اُن کے وطن اور اعزہ سے تو جُدا ہونا ہی پڑا تھا مگر وہاں قیام کی صورت میں افلاس اور عادات و رسوم و اختلافِ موسم و ہوا وغیرہ کی وجہ سے بھی نئی نئی مشقتیں اُٹھانی پڑیں۔ اگرچہ ہمارا خاندان غریب تھا مگر تاہم ہمت سے کاروبار خانہ داری برتن مانجھنا دھونا، جھاڑو دینا وغیرہ گھر میں نوکر عورتیں انجام دیا کرتی تھیں مگر وہاں پہنچ کر یہ سب کام بھی انہی کو کرنے پڑتے تھے۔ کھانا پکانا تو یہاں وطن میں بھی حسب معمول ان کو انجام دینا ہوتا ہی تھا۔ مزید برآں ان کو آٹا بھی خود پیسنا پڑا حالانکہ یہ مشقت کبھی بھی ان کو وطن میں تحمل نہ کرنی پڑی تھی۔ والدہ مرحومہ باوجود ضعیف العمری بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں اپنی ہر بہو کی اگرچہ باری مقرر کر دی تھی مگر خود ہر ایک کے ساتھ چکّی پیسنے میں اور دوسرے کاروبار میں لگی رہتی تھیں۔ علیٰ ہذا القیاس عورتوں کو اپنے اور اپنے خاوندوں

اور بچوں کے کپڑے بھی دھونے پڑتے تھے۔ حالانکہ اس کا سابقہ کبھی بھی وطن میں ان کو نہ ہوا تھا۔[1]

یہ تو خواتین کی کہانی تھی اب ذرا اُن مرد حضرات کا قصہ سنیے جو ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کے مقتدا بنے، استاد ہوئے اور پیر و مرشد ثابت ہوئے۔

"ہم مردوں کو بھی بسا اوقات کپڑوں کا دھونا اور مشکوں میں میٹھا پانی کندھوں پر لاد کر لانا پڑتا تھا، جس کو ہم رات کو جبکہ نہر کے مخزن کی بھیڑ کم ہوجاتی تھی، انجام دیتے تھے۔ یہ کام مجھ کو اور بھائی سید احمد صاحب کو انجام دینا پڑتا تھا۔"[2]

مولوی صاحب کے مزاج میں نظم اور کفایت شعاری تو تھی ہی۔ خورد و نوش کی فراہمی میں بھی یہ کفایت شعاری ملحوظ رہتی تھی۔

"کھانا بھی سرمایہ اور محاصل کی کمی کی وجہ سے نہایت معمولی ہوتا تھا۔ والد صاحب نہایت منتظم طبیعت کے تھے۔ اکثر بازار کی سستی سے سستی ترکاری لاتے تھے اور کبھی کبھی گوشت اور اکثر دال پکتی تھی۔ روٹی اور چاول حسبِ عادت وطن مستعمل ہوتے تھے۔"[3]

ان تمام تفصیلات کے باوجود مولوی صاحبؒ کا زیادہ تر وقت ذکر و شغل اور اوراد و وظائف میں گذرتا تھا۔ مسجدِ نبوی میں نمازِ باجماعت کسی حال میں ترک نہیں ہوتی تھی۔ مدینہ طیبہ میں جاڑوں کے زمانے میں بڑے کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ فجر کی نماز بھی غلس میں منہ اندھیرے ہی ہوتی ہے مگر کوئی بھی نماز مولوی صاحب کی مسجدِ نبوی سے باہر یا بغیر جماعت کے یا بغیر تکبیرِ اولی کے نہیں ہوتی تھی۔ حرم پاک میں روزانہ مراقبہ میں بھی کافی وقت گذارتے تھے۔ عام طور پر لوگوں سے ملاقات، بات چیت یا مجالست سے گریز فرماتے تھے۔ صرف اہل اللہ، اتقیا، علما، اور صاحبِ نسبت بزرگوں کے پاس کبھی کبھی بیٹھ کر ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ کی نعمتیں حاصل کرتے تھے۔ ہندوستان میں ذکر و شغل پر مداومت

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۵۵ [2] ایضاً [3] ایضاً

تھی اور پیر و مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی خصوصی توجہات بھی شامل تھیں مگر بیعت و خلافت کی اجازت نہیں تھی۔ حضرت کے وصال کے بعد آپ نے خواب میں دیکھا کہ مولانا نے اجازت دے دی ہے، مگر مدینہ طیبہ میں کسی کو بیعت نہیں کیا۔[1] صاحبزادگان اپنے معمولات تدریس، تعلیم، مطالعہ اور اشغال روحانیہ میں مصروف تھے۔ معاش کی جانب سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ بظاہر زندگی ہموار اور مطمئن تھی، لیکن مکان جو بھوس، گارے اور کھجور کے ڈنٹھلوں سے بنا ہوا تھا، لو کے شدید تھپیڑوں، کڑکڑاتی ہوئی سردیوں کی لہروں اور تیز بارش کے جھونکوں کا مقابلہ کرنے سے بالکل معذور تھا۔ پہلے پہلے تو خوشی خوشی میں پتہ نہ چلا، مگر تھوڑے ہی دنوں میں تجربہ ہو گیا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں، کمزور عورتوں اور ضعیف بوڑھوں کے لیے سردی گرمی اور بارش سے بچاؤ کے لیے یہ مکان ناکافی تھا۔ اس لیے مولوی صاحب نے پختہ مکان بنوانے کا فیصلہ اور عزم کر لیا اور آہستہ آہستہ حسب گنجائش و استطاعت کچھ سامان، پتھر کے چوکے، کڑیاں، لکڑیاں وغیرہ خریدتے رہے۔ رفتہ رفتہ کچھ عمارتی ضروریات جمع ہو گئیں ——— تو اللہ کا نام لے کر دوسری بار مکان کی نیو ڈال دی۔ اب کے کچھ تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ حالات بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ ضروریات کی اہمیت بھی سامنے آ گئی تھی۔ اس لیے یہ مکان نہایت پائیدار، آرام دہ اور خوش منظر بنیادوں پر شروع کیا گیا۔ اس بار خواتین کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ الحمدللہ۔ دیواریں اٹھانے، پتھر چننے اور تعمیر کرنے کے لیے راج مزدور لگائے گئے۔ مگر پانی ڈھونے، گارا بنانے، اینٹیں پاتھنے اور راجوں کو سامان پہنچانے میں اس مرتبہ بھی صاحبزادگان کو سارے سارے دن لگنا پڑا۔ جو پڑھاتے تھے وہ سبق کا ناغہ کر کے اور کبھی کبھی دوران سبق سے اٹھ کر آتے اور کام میں لگتے تھے اور جو چھوٹے تھے، مدرسہ جاتے تھے، مولانا سید محمود احمد صاحب، مولانا جمیل احمد صاحب، مولانا وحید احمد صاحب، وہ مدرسہ سے آکر مکان میں لگ جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ دو سال کی مسلسل جد و جہد اور دن رات کی تگ و دو کے بعد ۱۳۲۱ھ

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۰

مطابق سنہ ۱۹۰۳ء میں ساتھ وسیع اور ہوادار کمروں کا دو منزلہ پختہ مکان، ہر منزل پر باورچی خانہ، غسل خانہ، جائے ضرور اور کنویں کے ساتھ تیار ہوگیا اور اب سارا خاندان وسعت اور راحت کے ساتھ اس نئے مکان میں منتقل ہوگیا۔ اس سے پہلے کئی بار سوچا گیا کہ سب لوگ الگ رہائش اختیار کریں، مگر حالات نے اس کی اجازت نہ دی تھی۔ اب ہر ایک کے لیے علاحدہ علاحدہ اطمینان بخش انتظام ہوگیا تو مولوی صاحب نے صاحبزادوں کو الگ کر دیا۔ مگر یہ مکان اور پہلا مکان اور دوسری زمین آپ نے وقف علی الاولاد کر دی تاکہ کوئی صاحب اپنا حصہ فروخت کر کے واپس نہ چلے جائیں۔ جس زمانے میں یہ مکان بنا ہے اس وقت مدینہ طیبہ میں بڑی رونق تھی۔ شہر کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ مرفہ الحالی اور مال داری کے آثار پورے شہر پر نمایاں تھے۔ ترکی حکومت کی طرف سے شہریوں اور باشندوں کی دیکھ ریکھ کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ نہایت شاندار خوبصورت ریلوے اسٹیشن قائم تھا۔ دن میں کئی کئی بار ریلیں آتی جاتی تھیں۔ باب مجیدی کی طرف شہر پناہ کے باہر بڑی آباد سڑکیں، شاندار مکانات اور خوبصورت دوکانیں قائم تھیں۔ اسی محلے میں مولوی صاحب کے مکانات تھے اور صرف اسی محلے کی آبادی کم و بیش تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی مگر دوسری جنگِ عظیم اور شریف حسین کی بغاوت کے بعد یہ محلہ تو اُجڑ ہی گیا، گنے چنے چند سو آدمی رہ گئے۔ پورا شہر مدینہ بھی غیر آباد ہوگیا۔ کل بارہ تیرہ ہزار افراد رہ گئے۔

"شریف حسین کے زمانۂ حکومت میں یہ تمام محلہ اُجڑ ہوگیا تھا۔ بلکہ بیرونی باب مجیدی جو کہ قبل از جنگ عمومی نہایت آباد اور قیمتی متعدد محلات کو مشتمل ہوگیا تھا صرف ان محلوں کی آبادی تقریباً تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی، مگر شریف موصوف کی بغاوت کی وجہ سے وہ آفت آئی کہ صرف چند سو کی آبادی رہ گئی۔ تمام مدینۂ منورہ کی تقریباً سوا لاکھ یا اس سے زائد مردم شماری تھی۔ جنگ کے بعد امن کے زمانہ میں صرف بارہ تیرہ ہزار کی مردم شماری رہ گئی۔"[1]

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۷۲۔

حُسنِ اتفاق سے راقم الحروف نے مولوی صاحبؒ کا مذکورہ مکان اور مدینہ طیبہ کا ریلوے اسٹیشن دیکھنے کی مسرت حاصل کی۔ مکان خوبصورت، ہوادار اور آرام دہ تھا۔ حضرت مولانا سیّد محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ نے مجھے بڑی تفصیل سے بتلایا کہ فلاں حصّہ والد صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ اس حصّے میں بڑے بھائی صاحب رہتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اسٹیشن کو اُجڑے ہوئے اگرچہ ستّر اسّی برس گذر چکے تھے مگر پٹریاں ابھی باقی تھیں۔ انجن اور ڈبّے، پلیٹ فارم پر شکستہ اور زخم خوردہ حالت میں صف بستہ تھے۔ اسٹیشن کی عمارت بذاتِ خود خوبصورت، شاندار اور ماڈرن تھی۔ اس پر مستزاد اس کا محلِ وقوع تھا اور اس کے ملحق چھوٹی سی ترکی و اسلامی طرز کی حسین مسجد نے دل کشی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ کم و بیش پون صدی گذر جانے کے بعد بھی اس جسمِ مردہ میں اب بھی زندگی کے ایسے آثار باقی تھے کہ نظریں بے اختیار ہو کر ٹکٹ گھر، ویٹنگ روم اور اسٹیشن ماسٹر آفس تلاش کرتی رہ گئیں۔ پلیٹ فارم پر ٹرین ہِش ٹنگ کی حالت میں انجن اور دور تک بچھی پٹریوں کو دیکھ کر راقم الحروف بے ساختہ ایک ڈبّے میں سوار ہو گیا اور چشمِ تصوّر کو ایسا لگا کہ ابھی مسافر بھر جائیں گے، سگنل ڈاؤن ہوگا، گارڈ سیٹی دے گا اور ٹرین بھک بھک کرتی ہوئی استنبول کی طرف روانہ ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ اس حال سے اُس ماضی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسی رونقوں، برکتوں اور رحمتوں والے دیار میں ایک غریب الدّیار درویش اور راضی برضا خاندان کا مسکن تیار ہو گیا تھا۔ اب ایسا لگا کہ کانٹوں بھرا راستہ کٹ گیا، مصائب کے بادل چھٹ گئے اور مشکلات کے پہاڑ ہٹ گئے۔ مگر کہاں؟ یہ دُنیا سرابوں اور نظر فریبیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کی ہر حقیقت وہم و خیال اور ہر قدم دھوکہ اور فریب ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے مصائب و مسائل کا کس مرحلے پر خاتمہ ہے اور کب اور کہاں ابتدا ہے ؎

کس نمی گوید م از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

مولوی صاحب کی زندگی کی اصل آزمائش، ابتلا، اور امتحان تو اب شروع ہو رہا تھا۔

اہل وعیال کی پے درپے اموات

مولوی صاحب کو امید تھی کہ پانچ بیٹوں کی اولاد پھلے پھولے گی تو اُن کو دین دُنیا دونوں کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ دینی اعتبار سے حضورؐ کے فرمان (انی مکاثرٌبکم الامم کی تعمیل کی فضیلت نصیب ہوگی اور دنیاوی حیثیت سے پردیس میں بڑا خاندان وجود میں آجائے گا۔

"والد صاحب کو یہ بھی خیال تھا کہ یہ سب میری اولاد پھلے پھولے گی اور آپس میں اپنی اولاد کی شادی بیاہ کرکے ترقی کرجائے گی اور ایک اچھا خاصا کنبہ اور خاندان بن جائے گا۔[1]"

آثار، قرائن اور صورتِ حالات دیکھتے ہوئے یہ امید اور توقع کچھ بیجا اور بے موقع بھی نہ تھی۔ تینوں بڑے بیٹوں کے کئی بچے ہوچکے تھے۔ دو غیر شادی شدہ نوجوان بیٹے تعلیم و تربیت، صورت سیرت اور صلاحیت ولیاقت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کررہے تھے۔ مکان اور پھر ایسا مکان کہ ہر فرد کے لیے علٰحدہ علٰحدہ حصہ بن کر تیار ہوگیا تھا۔ خاندان کے علم، فضل، بزرگی اور للّٰہیت کا چرچا ہو رہا تھا اور مقبولیت میں مدینہ طیبہ، عرب اور ہندوستان تک روز افزوں شہرت ہورہی تھی۔ لوگ، عوام، خواص، علماء، صلحا، اتقیا، روساء، امراء اور اہلکاران حکومت معتقدوں مداحوں اور مستفیدوں کے زمرے میں شامل ہورہے تھے۔ ایسے میں اگر مولوی صاحب کے قلب میں کثرتِ اولاد اور زیادتی خاندان کی آرزو پیدا ہوئی ہو تو بالکل قدرتی اور فطری بات تھی۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نظر کس طرح لگتی ہے اور کیوں لگتی ہے، یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہوگا مگر لاکھوں کے گھر پلک جھپکتے میں خاک ہوتے اور بھرے پورے خاندان دیکھتے ہی دیکھتے برباد ہوتے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ وسلم کا ارشاد "العین حق" اپنے کانوں سے سُنا۔ اللہ کی مرضی یہی تھی کہ مولوی صاحب کی ہری بھری اور لہلہاتی کھیتی صبح شام میں مرجھاگئی۔

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۷۴

سب سے پہلے حضرت مدنیؒ کی ایک دو سالہ صاحبزادی اور مولانا صدیق احمد صاحب کے ایک تین سالہ صاحبزادہ حمید احمد ۱۳۲۰ھ میں ذخیرۂ آخرت ہوئے اور اسی دوران ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء، ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء کے درمیان مولانا سید احمد صاحب کے کئی بچے ایامِ رضاعت میں انتقال کر گئے۔

۱۳۲۲ھ میں مولوی صاحب پر ایسا حادثہ گذرا جس نے ان کے سکون و راحت کی عمارت جڑ سے ہلادی۔ پینتالیس سال تک حقِ رفاقت ادا کرنے کے بعد خدمت گذار اطاعت شعار اور وفا شناس رفیقۂ زندگی سیدہ نور النسا، جنھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت میں، زمانہ کے گرم و سرد میں، گھرداری اور تعمیر و ترتیب میں دن رات تنکا تنکا چن کر اور قدم قدم چل کر ساتھ دیا تھا۔ اچانک داغِ مفارقت دے گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ گھر والوں، متعلقین اور مخلصین نے آپ کی دل بستگی اور راحت رسانی کی ہر ممکن کوشش کی۔ اہلیہ مرحومہ کی ایک بیوہ خالہ زاد بہن تھیں، ان کو ہندوستان سے بلاکر باصرار عقدِ ثانی برتیباً کیا گیا۔ مگر وہ مزاج دانی، دلداری اور خاطر داری جس کے مولوی صاحب عادی تھے، میسر نہ ہوئی۔ آخر ان زوجۂ ثانیہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ایک مہاجر خاتون سے آپ کا تیسرا عقد ہوا۔

۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں جواں سال سعادت مند اور نہایت ہونہار فرزند جمیل احمد جو ترکی میں حکومت کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، مرضِ دق میں مبتلا ہو کر آئے اور کچھ دن بیمار رہ کر جوارِ رحمت میں جا بسے۔ ایں ماتم سخت ست کہ گویند جواں مرد۔ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء کے آس پاس داماد سید فاروق احمد چوری چھپے، بیوی کے زیورات اور نقد لے کر فرار ہوگئے۔ کئی بچیوں میں ایک یہی بیٹی بچی تھیں، پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ باپ کے ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا تو تھیں ہی، اس کے علاوہ سارے گھر کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ کڑیل جوان بیٹے کی موت کے بعد لختِ جگر بیٹی کے ساتھ ایسا ظلم ہوا تو بوڑھے باپ کی دُنیا اندھیر ہوگئی۔

ابھی ان صدمات سے ہوش بھی نہ آیا تھا کہ اسی سال میں بڑی بہو یعنی مولانا

محمد صدیق صاحب کی اہلیہ دق میں مبتلا ہوئیں اور دس گیارہ برس کے ایک بچے وحید احمد کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوئیں۔ ان حادثات کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں حضرت شیخ مدنیؒ کی پہلی اہلیہ بھی دق میں مبتلا ہوئیں اور صرف چند ماہ بیمار رہ کر ایک تین برس کی بچی زہرہ کو چھوڑ کر راہی ملکِ عدم ہوئیں۔ اس طرح دونوں بیویوں کے بھرے پورے گھر دیکھتے دیکھتے اُجڑ کر رہ گئے۔

بڑے فرزند کی دوسری شادی بریلی کے ایک مہاجر سید فرزند علی مرحوم کی لڑکی سے کی گئی۔ یہ بیوی بھی صرف ڈیڑھ سال زندہ رہیں۔ ایک بچہ پیدا ہوا اور اسی زچگی میں انتقال کر گئیں۔ ان کے بعد ہی بچہ بھی ماں کے پاس چلا گیا۔

اس کے بعد صاحبزادی ریاض فاطمہ دق وسل میں مبتلا ہوئیں اور سال بھر بیمار رہ کر ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں چار برس کی ایک بچی چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوئیں۔ بچی بھی ماں کا صدمہ اور فرقت برداشت نہ کر سکی اور تھوڑے ہی دنوں بعد ماں کے پہلو میں جا سوئی۔

بڑے فرزند مولانا صدیق احمد صاحب کا تیسرا عقد کر دیا گیا اُن سے ایک بچہ ہوا اور کچھ عرصہ زندہ رہ کر انتقال کر گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ماں بھی مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ اس کے بعد صاحبزادہ سید محمود احمد صاحب کی پہلی اہلیہ جو بریلی ہی کے ایک خاندان کی اور شیخ ریاض الدین صاحب کی ہمشیرہ تھیں، بیمار ہوئیں اور تھوڑے دن تپ دق میں مبتلا رہ کر اللہ کو پیاری ہوئیں۔

مولانا صدیق احمدؒ کا چوتھا عقد ڈاکٹر رفاقت علی کی صاحبزادی سے کر دیا گیا تھا۔ ان سے ایک بچہ پیدا ہوا اور صغر سنی میں وفات پا گیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ چھوٹے بڑے بیسوں تیسوں افراد بوڑھے باپ نے اپنے ضعیف کندھوں اور کمزور ہاتھوں سے قبر میں اتارے۔

ابھی قربانی پوری اور امتحان مکمل نہیں ہوا تھا۔ انبیا کرام علیہم السلام کی طرح ان کی محبت اور جاں نثاری کے دعوے داروں کو بھی پیغمبرانہ امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔

مولوی صاحب بھی سرکارِ دو عالم ؐ کے جاں نثار اور عاشق زارِ الٰہی تھے چنانچہ بارگاہِ خداوندی میں جب صبر و شکر کا نذرانہ گذران چکے تو آزمائش کی آخری آنچ دکھنی شروع ہوئی۔

بڑے صاحبزادے مولانا صدیق احمد صاحب آج تک معاملات میں انتظامات میں اور مشکلات میں باپ کے دست و بازو تھے۔ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی تھی۔ بارگاہِ رشیدی میں لے جا کر مرید کرایا تھا اور اشغال روحانی کے راستوں پر لگایا تھا۔ ہجرت کے بعد تجارت، معیشت اور معاش کا بوجھ اپنے کاندھوں پر سنبھالا تھا۔ اب جب باپ کو اُن کی خدمت، سہارے اور موجودگی کی اتنی ضرورت تھی جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ تب وہ بیمار پڑے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد کل بیالیس تینتالیس سال کی عمر میں ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہوگا کہ پیری و کمزوری میں اس حادثے سے مولوی صاحب پر کیسی قیامت گذر گئی ہوگی۔ اس مختصر سی مدت میں پے در پے اموات سے کیسے کیسے مرمر کے جیے ہوں گے

بہر لحظہ می گیرم از غیب جانے   بہر لمحہ جانِ دگر می فروشم

تاہم حضرت شیخؒ نے ان مصائب کا مجمل تذکرہ 'نقشِ حیات' میں اس طرح کیا ہے:

"والد صاحب مرحوم کا آخری حصۂ عمر بالخصوص والدہ مرحومہ کی وفات کے بعد بہت زیادہ مکدر اور رنج دہ گذرا ہے۔ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور گھرانے کے نفوس تقریباً چالیس نفر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً چالیس نفر اپنے گھرانے کے میں نے اپنے ہاتھ سے مدینہ منورہ میں دفن کیے ہیں۔ مگر انتہائی ضبط اور صبر و استقلال پر عمل پیرا رہے[1]۔"

ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ فللّٰہ الحمد علی ما قدّر و قضیٰ رحمہم اللّٰہ علیہم اجمعین وعظم اللّٰہ اجر الجمیع۔

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۴

ایڈریا نوبل کی نظر بندی اور وصال

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴-۱۵ء کی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ ترکی بھی جنگ میں ایک شریک ملک تھا۔ خلافت عثمانیہ اور حکومت ترکی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جگہ جگہ بغاوتیں اور شورشیں ہو رہی تھیں۔ ذرا ذرا سے شک و شبہ پر گھر کے گھر کھود کر پھینک دیئے جاتے تھے۔ مولوی صاحب کا دولت خانہ ہندوستان کے اہل اللہ، علماء اور سربرآوردہ قائدین کا مہمان خانہ تھا۔ آپ کے صاحبزادگان حکومت برطانیہ کے مخالفین اور مجاہدین آزادی کے تربیت یافتہ شاگرد اور تلامذہ تھے۔ مدینہ طیبہ میں جہاں آپ لوگوں سے محبت، عقیدت اور ارادت عام تھی وہیں ایسے بھی بہت سے افراد و اشخاص تھے جن کو اس خاندان سے حسد و عداوت تھی اور اس کی وجہ ان کی شانِ استغنا، پروقار زندگی، سادگی اور کم آمیزی تھی۔ ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیبست۔ یہ لوگ حکومت اور افسران و ذمہ دارانِ حکومت کے یہاں موقع بے موقع شکایتیں پہنچاتے رہتے تھے کہ یہ لوگ خطرناک ہیں۔ ان کے یہاں ہندوستان کے سیاسی لوگ مہمان رہتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر وقت معتقدین و زائرین کا مجمع رہتا ہے۔ وقت نازک تھا۔ زخم ہرا ہو تو ذرا سی ٹھیس بھی لہولہان کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے فرزند مولانا حسین احمد اور سولہ سالہ پوتے وحید احمد کو شریف حسین نے مکہ میں گرفتار کروا کر اپنے حلیفوں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جنھوں نے دونوں حضرات کو پابہ جولاں مالٹا بھیج کر قید کر دیا۔ بوڑھا باپ مدینہ طیبہ میں ایک ایک پل بیٹے اور پوتے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک لختہائے جگر کی گرفتاری اور حالت قید میں جزیرہ مالٹا کو روانگی کی اطلاع ملی۔ جرم و سزا کی تفصیل تو معلوم نہیں ہوئی۔ یہ افواہ سنی کہ دونوں کو پھانسی دی جائے گی۔ مولوی صاحب صبر کی چٹان اور شکر کا مجسمہ تھے، مگر تھے تو گوشت پوست اور مٹی پانی کے بنے ہوئے انسان ہی۔ دونوں ہاتھ بارگاہِ الٰہی میں شکر کے لیے تو اُٹھے، مگر ساتھ ہی بے اختیار ٹوٹے ہوئے دل سے آہ بھی نکل ہی گئی ؎

یہی ہے سیر فقیروں کی اور یہی فریاد   زمیں پہ بیٹھ گئے سوئے آسماں دیکھا

ادھر مدینہ طیبہ کی ترکی پولیس جنگِ عظیم کی وجہ سے اور برطانوی رعایا ہونے کی وجہ سے سارے ہندوستانیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور اس خاندان پر تو حاسدین کی ریشہ دوانیوں اور دشمنوں کی کارروائیوں کی وجہ سے خصوصی نگرانی تھی۔ مزید یہ ہوا کہ انہی دنوں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہما اسی گھر میں رونق افروز ہوئے۔ ان حضرات کی زیارت، ملاقاتوں اور علمی و روحانی استفادے کے لیے ہر قوم اور ہر ملک کے عوام و خواص پر مشتمل ایک خلقت ٹوٹ پڑی اس غیر معمولی ہجوم و اجتماع پر بھی پولیس کو شک گذرا۔ ادھر ایک معمولی سا بہانہ اور ہاتھ آگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خدام میں بعض حضرات مدینہ طیبہ سے واپس ہوئے تو جدّہ سے آنے جانے والوں کے ہاتھ طول وطویل خطوط اور تفصیلات اُردو زبان میں حضرت کی خدمت میں روانہ کیں۔ سرکاری طور پر عربی اور ترکی زبانوں کے علاوہ کسی زبان میں اور سرکاری ڈاک کے علاوہ کسی اور ذریعے سے رسل و رسائل کی سخت ممانعت تھی۔ سو، اتفاق سے بعض خطوط اور کئی کئی صفحات پر مشتمل تفصیلات حکومت کے ہاتھ لگ گئیں۔ ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات تھی یا نہیں مگر شبہ و بدگمانی کے لیے بہانہ ضرور ہاتھ آگیا تھا۔ ترکی حکومت کمزور تو ہو ہی رہی تھی۔ جزیرہ عرب میں ہر جگہ اس کے پیر اکھڑ رہے تھے۔ اسی عالم میں اس نے مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے دو صاحبزادوں مولانا سیّد احمد صاحب اور مولانا سیّد محمود احمد صاحب کو گرفتار کرلیا۔ خاندان کے بیشتر افراد پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ایک جوان بیٹا اور نوخیز پوتا چند دن پہلے قید ہوکر سمندر پار بھیجے جا چکے تھے۔ اب کسی نہ کسی طرح ٹوٹے ہوئے حوصلے اور زخم خوردہ دل کے ساتھ بوڑھا باپ دو بیٹوں کی مدد سے بچے کھچے بچوں اور عورتوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ یہ تینوں بھی بے خطا و بے قصور پکڑے گئے تو حضرت شیخ الاسلامؒ کی اہلیہ ثانیہ، ان کا ایک ڈیڑھ سالہ بچہ اشفاق احمد پہلی اہلیہ کی گیارہ سالہ بچی زہرا مولانا سیّد احمد صاحب کی دوسری اہلیہ، مولانا سیّد محمود احمد صاحب کی دوسری اہلیہ اور مولوی صاحب کی چوتھی

اہلیہ کل چار بیمار اور ضعیف عورتوں اور دو بچوں کا اللہ کے سوا کوئی آسرا اور سہارا نہیں رہ گیا۔ مخلصین اور خیرخواہوں نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ حکومت کو یقین دلایا کہ یہ غریب الدیار، مخلص اور باخدا لوگ ہیں ان کو سیاسیات یا ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی یا تعلق نہیں ہے۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ باپ اور دونوں بیٹے پا بہ جولاں ترکی کے شہر ایڈریانوپل میں نظربندی کے لیے روانہ کردیئے گئے۔ مولوی صاحب اپنی سب سے بڑی تمنا پوری ہوجانے پر زندگی کی ساری مصیبتیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کررہے تھے۔ سب سے زیادہ عزیز دولت پاکر انھوں نے دنیا کی ساری دولتوں سے نگاہیں پھیرلی تھیں۔ اسی دیار کے لیے آپ نے اپنا عزیز دیار ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا۔ جب سے درِ اقدس پہ جبیں سائی نصیب ہوئی تھی، قدم باہر نہیں نکالا تھا کہ کہیں سرکار کے قدموں سے عمر بھر کے لیے دوری نہ ہوجائے۔ آج جب آپ کو قید کرکے مدینہ سے لے چلے اور ناخن کو گوشت سے جدا کرنے لگے تو زندگی میں پہلی بار مظلوم دل کا خون ہوگیا اور مجبور روح تڑپ اٹھی۔

ننھے ننھے معصوم بچوں، کمزور بیمار اور ضعیف العمر عورتوں کو بے یار و مددگار کس دل سے چھوڑا۔ راستے کے لیے کیا انتظام ہوا اور کیا زادِ راہ ملا۔ دورانِ مسافرت کیا کیا حالتیں پیش آئیں اور سفر کیسے کیسے گذرا۔ یہ تفصیلات لکھنے اور بتلانے کے بس کی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ ایڈریانوپل پہنچے تو شدید سردی تھی۔ رگوں میں خون منجمد اور ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے۔ مولوی صاحب گرم ملک میں پیدا ہوئے اور ساری عمر گرم ہی ماحول میں گذاری تھی۔ عسرت اور تنگدستی کے عالم میں بھی اولاد اور بچے قدم قدم راحت رسانی اور خدمت گذاری کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے رہتے تھے۔ اب جبکہ مصائب و آلام نے جسمانی قوت مدافعت بالکل ہی ختم کردی تھی۔ اس غریب الوطنی، نظربندی، قید و بند اور بے سروسامانی کو برداشت نہ کرسکے۔ حکومت نے ان قیدیوں کے قیام کا انتظام شہر سے دور خیموں کے ایک کیمپ میں کیا تھا۔ اور تین اشرفی ماہوار فی کس گذارے کے لیے مقرر کی تھی۔ اوّل تو یہ رقم مہینہ بھر کے لیے ویسے بھی ناکافی تھی۔ اور پھر زوال پذیر حکومت کے سکّے کی قیمت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ ایک اشرفی پیسوں کے بھاؤ میں چلتی تھی۔ ایسے میں گذر اوقات

کس طرح ہوتا ہوگا' اس کا علم اللہ ہی کو ہے اور پھر جیسے تو معمولی سردی گرمی سے بھی بچاؤ نہیں کر سکتے۔ وہ تو یخ بستہ ہوائیں تھیں۔ برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی تھا اور کھلا ہوا میدان تھا۔ صبح چار بجے تہجد کے لیے اٹھنا اور پھر ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا اور ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے میں نفلیں پڑھنا ایک ستر بہتر برس کے بوڑھے بیمار اور کمزور انسان کی طاقت سے باہر ہوگیا اور نمونیہ کا شدید حملہ ہوا۔ حکیم ڈاکٹر دوا علاج تو دور کی باتیں تھیں، معمولی آرام اور غذائیں بھی میسر نہ ہوسکیں۔ اور ایڈریا نوپل پہنچنے کے ایک ماہ بعد آپ مالک حقیقی سے جاملے اور وہیں کی خاک میں پیوند زمین ہوگئے۔

مولوی صاحب نہایت فہیم ذکی ذہین اور اولوالعزم انسان تھے۔ اگر حالات کچھ بھی مساعدت کرتے تو بڑے متبحر اور محقق عالم ہوتے۔ خاندانی مزاج اور موروثی مذاق کی بنا پر تصوف، معرفت اور اشغالِ روحانیہ سے آپ کو طبعی اور قلبی تعلق تھا۔ اگرچہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی نگاہ گہربار سے بڑی حد تک فیضیاب ہوئے تھے اور ذکر وشغل اور سلوک میں ترقی حاصل کی مگر حضرت کی طرف سے آپ کو خلافت واجازت نہیں تھی۔ آپ کے وصال کے بعد خواب دیکھا کہ شاہ صاحب نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔ صاحبزادوں کو تصوف ومعرفت کی راہ پر گامزن کرنے کیلیے آپ نے پوری کوشش اور اہتمام کیا۔ اور بیٹوں کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے بیعت ہونے کی تاکید کرتے رہے۔ باوجود مشکلات اور تنگدستی کے صاحبزادگان کو مدینہ طیبہ سے بارگاہ رشیدی میں تربیت روحانی اور تزکیہ باطنی کے لیے ہندوستان روانہ فرمایا اور جب واپسی میں کچھ دیر ہوئی تو حضرت قطب عالم کو معروضہ لکھا "سید احمد اگر کسی قابل ہوگیا ہو تو اس کو اجازت دے کر بھیج دیں مجھ کو اس کی ضرورت ہے اور اگر کسی قابل نہیں ہوا تو بہتر ہے کہ آپ کی چوکھٹ پر سر مار کر وہیں مرجائے[1]"۔ اس پر حضرت گنگوہی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مولوی سید احمد کے والد چونکہ سلوک اور طریقت سے واقف ہیں اس لیے اس کی قدر اور منزلت جانتے ہیں۔ پابندی شریعت،

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۳۲

اتباعِ سنت، تقویٰ اور توجہ الی اللہ کا بیحد اہتمام فرماتے تھے۔ اوراد و وظائف، مراقبہ و مجاہدہ پر آخر تک نہایت درجہ پابندی سے قائم رہے۔" اتباع سنت اور التزام جماعات خمسہ وغیرہ میں باوجود ضعف اور پیرانہ سالی انتہائی کوشاں رہتے تھے۔ سخت سردیوں اور سخت گرمیوں میں بھی اس طرح اوقات کی پابندی فرماتے تھے کہ ہم نوجوان اس سے عاجز رہتے تھے۔[1] دنیاوی معاملات میں بھی آپ کا نظم وضبط پابندی اوقات اور بااصول زندگی قابلِ تعریف تھی۔ گھر میں ہر کام کے لیے اوقات اور ہر وقت کے لیے مختلف کام اور افراد مقرر تھے۔ فرزندگان، بہوئیں اور گھر کے دوسرے افراد ان کے اصول و ضوابط کی پوری طرح پابندی کرتے تھے۔ راقم الحروف نے حضرت مولانا سید محمود احمد صاحبؒ کی اہلیہ مرحومہ سے ان کی بااصول زندگی کے احوال سُنے۔ وہ فرماتی تھیں کہ گھر کا کوئی فرد مقررہ ضوابط اور قواعد کے خلاف ایک قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ بہوؤں کو بڑے اہتمام سے کفایت شعاری، جفاکشی اور امور خانہ داری کی تربیت دیا کرتے تھے۔ اپنے گھروں کی تعمیر میں خود بہ نفس نفیس اور صاحبزادوں نے جس طرح گارا بنانے، سامان اُٹھانے، اینٹیں پاتھنے، روڑے جمع کرنے، کنویں اور گڑھے کھودنے کا کام کیا اور پھر ایک دو روز ہفتے دو ہفتے اور مہینے نہیں بلکہ مسلسل دو سال تک یہ مشقتیں برداشت کر کے آخر کار عمارت پوری کر کے ہی دم لیا یہ معمولی عزم و ارادے اور عام قسم کے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ستر بہتر برس کی عمر میں بھی گھر کی معمولی ضروریات، ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت، چارپائیوں کے پٹی پائے، سیڑھیاں پٹڑے اور کھونٹیاں خود اپنے ہاتھوں سے بنالیا کرتے تھے۔ بیٹے باصرار مشقت برداشت کرنے سے منع کرتے تھے۔ مگر فرماتے تھے کہ وقت اور زندگی دونوں دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیزیں ہیں۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

مولوی صاحبؒ کو عملیات اور تعویذوں کا شوق، تجربہ اور مہارت تھی، ضرورتمند لوگوں کا علاج بھی کرتے تھے اور سلب مرض کا عمل بھی کرتے تھے۔ مختلف بزرگوں کے علاوہ آپ کے مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے آپ کو عملیات کی بیاضوں اور مجموعات کی اجازت خصوصی مرحمت فرمائی تھی۔ علمی موضوعات میں اُردو، فارسی، برج

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۳۳

بھاشا، بندی، حساب اور ریاضیات میں آپ کی استعداد نہایت اعلیٰ اور مسلّم تھی۔ ریاضیات کے مشکل سے مشکل مسائل منٹوں میں اور انگلیوں پر حل کر دیا کرتے تھے۔ زبانوں میں آپ کی قابلیت اور مہارت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ آپ تینوں زبانوں میں بلیغ، برجستہ اور پُر اثر غزلیں، نظمیں اور قصائد کہتے تھے۔ اُس زمانے میں آج کی طرح رسائل و جرائد تو شائع نہیں ہوتے تھے مگر شاعری کے گلدستے اور مجموعے نکلتے تھے اور اس میں آپ کا کلام بھی شائع ہوا ہے۔ آج سے تقریباً سو برس پہلے کے یہ اشعار فنِ شاعری کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ جو حضرات اودھی زبان اور اس کی شاعرانہ انفرادیت سے واقف ہیں وہ آپ کی شاعری میں تشبیہ، استعارات اور حسنِ محاکات کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ فارسی اور اُردو میں بھی سادگی، برجستگی اور اثر انگیزی قابلِ غور ہے۔ انقلابِ زمانہ اور بار بار کی نقل و حرکت کے سبب آپ کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ ورنہ قدیم طرز اور زبان کا ایک سرمایہ ہوتا۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

ایں جمال و حسنِ عالم سوزِ تو ایں رخِ پُر نور دل افروزِ تو
کردہ بسمل صد ہزاراں جبرئیل ناوکِ مژگانِ سینہ دوزِ تو

اے بہارِ باغِ رضواں کوئے تو بلبلِ سدرہ اسیرِ موئے تو
سجدہ ریزاں آمدہ سویت حبیب اے ہزاراں کعبہ در ابروئے تو

جان و دل رامی بردیک آنِ تو این چہ حسن است اے عجائب شانِ تو
سخت از درودت حبیب ار چہ عجب اے بسا جبریل شد قربانِ تو

چار و ناچار جو محفل سے تری جاتے ہیں حسرت و رنج و قلق ساتھ وہ لے جاتے ہیں
جاں سے جانا ہے ترے پاس سے جاناں جانا جیتے جاتے ہیں مگر مردہ ہوئے جاتے ہیں
ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی لوگ میخانے سے پی پی کے چلے جاتے ہیں

اس حبیب دل خستہ پہ بھی ہو جائے نظر
درد مندوں کو دوا آپ دیئے جاتے ہیں

یہ کیسا روگ ہے مجھ کو کہاں یہ دل لبھاتا ہے
وہ موہن روپ ہے کیسا جو آنکھوں میں لبھاتا ہے

کہاں ڈھونڈوں کدھر جاؤں جتن کوئی نہیں بنتا
پھرا کرتی ہوں میں بن میں یہ آنا اور جانا ہے

کہوں میں کیا چلی کیدھر برہ کی آگ دل بھیتر
میں بالم کھوج میں نکلی مجھے پردیس جانا ہے

بہت دن بیتے اے سکھیو نہ پایوں درس پیتم کا
ہوئی کوئی خطا ایسی کہ من موہن کو ہانا ہے

مدینہ ہوز میں پر یا کہ ہو عرش بریں اوپر
وہیں وہ شیام بستا ہے مجھے اس دیس جانا ہے

میں عاجز بے نوا بندی کنیز کہ زادے سے کمتر
اور اس پر یہ دماغ اپنا کہ دل تجھ پر دوانا ہے

بصارت تیز کرتی ہے حبیب اس کوچہ کی مٹی
دل و جاں بیچ کر بھی مجھ کو وہ سرمہ لگانا ہے

حضرت گنج مراد آبادیؒ کے فراق میں بروگ

کون تیھا مورا جیا بورانا
کہہ برہا ھیا سالے بانا

کو سوامی موری بانھہ گہیا
کہاں گیو مورے کنور کنہیا

کہہ ڈھوبن تو ہے ڈھونڈن جاؤں
کت پاؤں سرجن ناؤں

تم بن کو مورا دھیر بندھیا
تم بن کو مورا بیر ہریا

کون کاج مورا جوبن بارا
جو چھٹ گیو کنھیا رتنارا

کون دیس مولے جوگی بھائے
کہہ کارن مولے سنگ نہ لائے

شاعری کی طرف آپ کا ایسا میلان نہ تھا جیسا عام طور پر شعرا کو ہوتا ہے۔ تعلق مع اللہ، عشق رسول اللہ اور پیرو مرشد کی محبت میں قلبی کیفیات و جذبات مرتب شکل میں زبان پر آجاتے تھے اور یہی آپ کی شاعری کا سرمایہ تھا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

آپ کی تاریخ پیدائش کہیں محفوظ نہیں ہے۔ مگر حضرت شیخ الاسلام نے

انقلاب ۱۸۵۷ء سے چار پانچ برس پہلے کی پیدائش لکھی ہے۔ اور اسارت مالٹا ۱۹۱۷ء کے کچھ دن بعد آپ کا وصال ہوا ہے۔ اس طرح کچھ کم یا زیادہ ستر برس کی عمر پائی۔ آپ نے تمام زندگی جیسی مشکلات، شدائد، محرومیاں، آلام اور مصائب پورے صبر شکر اور توکل علی اللہ کے ساتھ برداشت کیے اور رضائے باری تعالیٰ اور احیائے سنّت و شریعت کی راہوں میں جس طرح ثابت قدم رہے اور جیسے جیسے خاصانِ خداوندی کے لیے مخصوص ابتلاء و آزمائش میں پورے اُترے، ان کے پیشِ نظر عجب نہیں کہ آج جو آپ کی اولاد کو اور خاندان کے ہر فرد کو عزت، مقبولیت، راحت اور دینی و دنیوی نعمتیں نصیب ہیں۔ یہ آپ کی مقبولیت عند اللہ ہی کے طفیل ہوں۔

مولوی حبیب اللہ صاحبؒ کے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔ دو بچیاں زینب اور نسیم زہرا اللہ داد پور ہندوستان ہی میں چار برس اور ڈیڑھ سال کی عمر میں ذخیرۂ آخرت ہوئیں۔ ایک صاحبزادی پانچ بھائیوں اور باپ کے ساتھ مدینہ طیبہ آئیں۔ ان سب حضرات کے تفصیلی حالات آئندہ صفحات میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مولوی شاہ سید حبیب اللہ صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس اللہ سرہٗ کے اس بیان کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

"والد صاحب مستجاب الدعوات بہت زیادہ تھے۔ ایسے بہت سے واقعات پیش آئے تھے کہ جس نے ان کو ستایا یا جس کے واسطے انھوں نے بددعا کی، وہ پنپنے نہیں پایا۔ رحمۃ اللہ و رضی عنہٗ و ارضاہٗ۔ واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین میں اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں جمع کر دی تھیں وہ بہت کم لوگوں میں اجتماعی طور پر پائی جاتی ہیں۔"[1]

ابونا ابٌ لو کان للناسِ کلھم
ابٌ مثلہ اغناھم بالمناقبِ

(ترجمہ: ہمارے والد ایسے عظیم انسان تھے کہ اگر سب کو ایسے ہی باپ مل جائیں تو لوگ بڑائیوں اور

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۱

فضیلتوں سے مالا مال ہو جائیں)۔

مولوی صاحب کے پڑدادا سیّد نور اشرفؒ اور آپ کی اہلیہ کے پڑدادا سیّد تراب علی مرحومین حقیقی بھائی اور شاہ مدن کے صاحبزادگان تھے۔ آپ کی اہلیہ کا سلسلۂ نسب مندرجہ ذیل ہے۔

نور النسا بنت سیّد اکبر علی بن سید مخدوم بخش بن تراب علی بن سیّد شاہ مدن (مرحومین) سیّد شاہ مدن کے بعد اوپر تک شجرہ ایک ہے۔

مولینا سیّد صدیق احمد صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ مولوی سیّد حبیب اللہ صاحب مہاجر مدنیؒ کے سب سے بڑے اور پہلے فرزند تھے۔ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں بمقام ٹانڈہ فیض آباد (اودھ) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد اور والدہ سے حاصل کی۔ اُردو، فارسی اور قرآنِ پاک ناظرہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مقامی مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ اُس زمانے میں ان اسکولوں کی تعلیم اس قدر معیاری اور مکمل ہوتی تھی کہ آج کے ڈگری کالج کا معیار بھی اس درجے کو مشکل سے پہنچتا ہے۔ آپ کو فائنل امتحان میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور پورے صوبے میں اوّل آئے۔[۱] سرکاری اسکول اور گورنمنٹ کے امتحان میں ایسی امتیازی حیثیت سے پاس ہونے پر انگریزی کالج میں داخلے، تعلیمی وظیفے اور آیندہ ترقیات کے امکانات بہت روشن ہو گئے۔ اسکولوں کے ذمہ داران اور محکمۂ تعلیم کے افسران نے خوشی کا اظہار کیا، آیندہ کے لیے مختلف مشورے دیئے۔ اور مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ مگر اولاد کے لیے مولوی صاحب کا پروگرام اسلامی تعلیم اور دینی خدمت تھی اس لیے دنیوی تعلیم کا سلسلہ یہیں پر منقطع ہو گیا۔

بیس سال کی عمر میں ۱۳۰۸ھ میں آپ کی شادی قصبہ شہزاد پور تحصیل اکبر پور میں کر دی گئی۔ آپ طبعی اعتبار سے بہت مغلوب الغضب اور سخت مزاج تھے۔ کسی بات پر باپ سے

[۱] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۴

اختلاف رائے ہوا۔ باپ نے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آپ فوراً نکل گئے اور سیدھے دیوبند پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ مولینا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ کے خصوصی تلامذہ اور مقرب خدام کے زمرہ میں داخل ہوگئے۔ اس وقت مدرسۂ دیوبند حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ کے زیر اہتمام تھا اور اس مدرسے میں مطبخ وغیرہ کا انتظام شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے آپ کا کھانا حضرت شیخ الہندؒ کے دولتکدے سے مقرر ہوا اور قریب کے ایک مکان میں قیام کا بندوبست ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت نے خصوصی شفقت یہ فرمائی کہ مدرسے کے اسباق کے علاوہ کچھ درس خاص طور پر پڑھائے۔ دوران تعلیم آپ نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں مولینا سید احمد صاحب اور مولینا حسین احمد صاحب کو بھی وہیں بلالیا اور حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر کردیا۔ دیوبند سے فراغت کے بعد آپ حضرت قطب عالم مولینا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوگئے۔ آپ کا اپنا رجحان حضرت شیخ الہند سے بیعت کا تھا۔ مگر حضرت نے گنگوہ حاضر ہونے کا مشورہ دیا اور خود بیعت کرنے سے انکار کردیا۔ آپ کے والد اپنے پیر و مرشد حضرت گنج مراد آبادی سے بیعت کرانا چاہتے تھے۔ عرصہ تک اس بارے میں بذریعہ مراسلت اصرار و اعذار کا سلسلہ رہا۔ آخر کار والد نے اجازت دی اور آپ حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد بلند شہر، سیوہارہ اور امروہہ وغیرہ مقامات پر مدرسی خدمات دے رہے تھے کہ اچانک آپ کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد نے مدینہ طیبہ ہجرت کر جانے اور وہیں قیام کے مقصد سے سفر کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے والد سے بہت عرض و معروض کی کہ میری تربیت باطنی اور تعلیم روحانی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ مگر والد کا فیصلہ اٹل تھا۔ آپ نے اپنے پیر و مرشد سے بھی شکایتاً عرض کی مگر انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ باپ کی اطاعت ضروری ہے۔ ایسا ہی ہے تو کچھ عرصہ بعد واپس آجانا اور مقامات سلوک پورے کرلینا۔

چنانچہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں اہلیہ اور ایک صاحبزادہ وحید احمد بعمر چار سال کے ساتھ والد اور خاندان کی معیت میں مدینہ طیبہ روانہ ہوگئے۔ مدینہ طیبہ حاضر

ہو کر درس و تدریس، ذکر و شغل کے ساتھ گذر اوقات کے لیے کھجوروں کی تجارت اور ضروری اشیائے خورد و نوش کی دوکان میں مشغول رہے۔ خاندان کا گذران اسی تجارت پر تھا اور اس میں سارے چھوٹے بھائی آپ کے شریک و مساعد تھے۔ ان سارے مشاغل اور مصروفیتوں کے باوجود آپ کے دل سے قطب عالم حضرت گنگوہی کے پاس حاضری کی تڑپ کم نہیں ہوئی تھی۔ اسی دوران چھوٹے بھائی مولانا حسین احمدؒ کے نام حضرت کا گرامی نامہ آیا جس میں ان کو حاضری کا حکم دیا گیا تھا۔ چھوٹے بھائی کو تو باپ نے مالی حالات اور معاشی نظریات کی بنیاد پر اجازت دینے سے گریز کیا، مگر مولانا صدیق احمد کی آتش شوق اس خط سے اور بھی بھڑک اٹھی اور ایک دن بغیر کسی تیاری اور سامان کے ساتھ یا سٹھ روپیہ زاد راہ کے طور پر ساتھ لے کر چپکے سے حج کے لیے جانے والے رابغ کے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ رات کو دیر تک گھر نہیں آئے تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ آخر میں کمرے سے ایک پرچہ ملا جس میں روانگی کی اطلاع اور سفر کی تفصیل لکھی تھی۔ اس اطلاع سے یک گونہ اطمینان ہوا مگر باپ کو پھر بھی پریشانی لاحق رہی۔ سامانِ سفر ساتھ نہ تھا۔ راستے میں تنہائی تھی۔ مزاج میں استقلال اور جفاکشی بھی کم تھی۔ ان امور کا خیال کر کے والد صاحب نے حضرت شیخ سے فرمایا کہ "اصل میں بلاوا تو تمہارا تھا اور روانہ وہ ہو گئے اس لیے اب تم بھی رختِ سفر باندھو اور ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ ان کو راستے میں تنہائی کی وجہ سے تکلیف ہو گی"۔[1]

ادھر مولانا کو راستے کی تکلیفوں اور سفر کے شدائد نے ابتدا ہی میں گھبرا دیا۔ جدہ پہنچے تو فوری طور پر ہندوستان کے لیے کوئی جہاز بھی نہ ملا۔ وہاں جہاز کے انتظار میں غیر یقینی مدت تک قیام بھی اُن پر شاق گذرا۔ چنانچہ والد کو خط لکھا کہ میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ آگے سفر کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ حج کر کے واپس آ رہا ہوں۔ مولوی صاحب بڑے مستقل مزاج اور اولوالعزم انسان تھے۔ منجھلے بیٹے مولانا حسین احمد سے فرمایا کہ فوراً روانہ ہو اور صدیق احمد کو واپسی سے باز رکھو۔ جب ارادہ کر ہی لیا تو اپنے مرشد کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ حضرت

[1] نقشِ حیات، ج ۱

شیخ جدہ سے پہنچے تو معلوم ہوا کہ بڑے بھائی حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جا چکے ہیں۔ حضرت بھی مکہ حاضر ہوئے۔ مولینا چھوٹے بھائی کو پاکر بہت خوش ہوئے اور دونوں بھائی نعمتِ حج سے فیضیاب ہوئے۔ اور حج کے بعد جدہ پہنچ کر بڑی مشکلوں اور دقتوں کے بعد ہندوستان پہنچے۔ وہاں دونوں صاحبان حضرت قطبِ عالم کے دربار میں مشاغلِ سلوک و تصوّف میں مشغول ہو گئے۔ ڈیڑھ ماہ بعد حضرت گنگوہیؒ نے دونوں بھائیوں مولینا صدیق احمد اور مولینا حسین احمد صاحب کو ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء کے اوائل میں خلعت اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس سفر اور ان واقعات کی تفصیل حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ العزیز کے واقعات میں آگے پیش کی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۳۲۰ھ میں دونوں صاحبان مدینہ واپس ہوئے۔ دوکان اور تجارت تو آپ لوگوں کی غیبوبت میں جاری نہ رہ سکی تھی۔ اس لیے اب مختلف ملازمتوں کے ساتھ حرم پاک میں درس و تدریس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اس کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا کہ آپ نے بیعت اور اصلاح و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا یا نہیں؟۔ خلافت کے وقت آپ کی عمر کم و بیش تیس برس کی تھی اور اس کے بعد کل بارہ تیرہ برس بقیدِ حیات رہے۔ اس لیے خیال یہ ہے کہ بیعت و ارشاد کا مشغلہ آپ نے نہیں شروع کیا۔ پہلی اہلیہ سے آپ کے دو صاحبزادے وحید احمد اور حمید احمد پیدا ہوئے۔ موخر الذکر صرف تین سال کی عمر میں ذخیرۂ آخرت ہوئے۔ اور اہلیہ ۱۳۲۵ھ میں بڑے لڑکے وحید احمد کو چھوڑ کر دق و سل میں مبتلا ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ آپ کا دوسرا عقد بریلی کے ایک مہاجر سید فرزند علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوا مگر ڈیڑھ سال بعد زچگی میں ان کا بھی انتقال ہو گیا اور بچہ بھی فوت ہو گیا۔ تیسرا عقد بنارس کی ایک بیوہ سے ہوا۔ ان سے ایک بچہ پیدا ہوا مگر کچھ ہی عرصہ زندہ رہا اور پھر ماں بیٹے دونوں جنت میں جا بسے۔ آپ کی چوتھی شادی ڈاکٹر رفاقت علی کی صاحبزادی اور مولینا عبدالحق صاحب مدنیؒ کی بہن سے ہوئی۔ اُن سے بھی ایک بچہ ہوا جو کم سنی میں ہی فوت ہوا اور آخر کار ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں کل اکتالیس برس کی عمر گذار کر خود بھی اکلوتے بیٹے وحید احمد کو

یتیم کر کے اور بوڑھے باپ اور سعادت مند اور محبت کرنے والے بھائیوں اور بہن کو روتا چھوڑ کر جنت البقیع کی جنت میں جا سوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حق تعالیٰ نے آپ کو ذہانت، ذکاوت، علم و عمل، تعلق مع اللہ، تصوف اور اشغال روحانیہ سے بڑا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کو اپنے مشائخ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولینا رشید احمد صاحب گنگوہی سے غایت تعلق تھا۔ یہ حضرات بھی آپ کی جانب خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ ہجرت کی نیت سے جب آپ دیوبند سے رخصت ہونے لگے تو حضرت شیخ الہندؒ اسٹیشن تک پیادہ پا رخصت کرنے کے لیے تشریف لائے[۱] حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت بیعت دیتے وقت خلعت عطا فرمائی اور اپنے ہاتھوں سے دستار خلافت سر پر رکھی۔ یہ معمولی اعزاز اور شرف نہیں تھا۔ ان اولیائے کرام کی وہ شان تھی جن کے بارے میں کہا گیا ہے آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند۔ ان اوصاف و خصوصیات کے ساتھ آپ کے مزاج میں شدت اور غصہ بہت تھا۔ راقم الحروف سے مولینا سید محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس طرح تو ہم سے بات کرتا ہے سوالات کرتا ہے، اصرار کرتا ہے اس طرح ہم لوگ بڑے بھائی صاحب کے سامنے بات نہیں کر سکتے تھے۔ گھر میں ہر شخص ان سے ڈرتا تھا یہاں تک کہ میاںؒ بھی ان کے مزاج کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ "بڑے بھائی صاحب بہت سخت تھے اور خوب مارا کرتے تھے"[۲] مولینا عاشق الہٰی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت گنگوہی کے خلفاء کے ضمن میں اپنی کتاب تذکرۃ الرشید میں آپکا تذکرہ کیا ہے:

> "حضرت مولینا الحاج المولوی صدیق احمد صاحب مہاجر مدنی مدفیوضہٗ: آپ کا پہلا وطن موضع اللہ داد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے۔ حسینی سید ہیں۔ ہندوستان میں اٹھارہ یا انیس پشت گذار کر ۱۳۱۶ھ میں اپنے والد مولوی حبیب اللہ صاحب کے ہمراہ جو مولینا فضل رحمٰن صاحب کے خلیفہ راشد ہیں[۳]، مدینۃ الرسول کو ہجرت

---

[۱] نقش حیات، ج ۱ ص ۵۱۔ [۲] ایضاً، ص ۴۴۔ [۳] حضرت شیخ نے نقش حیات میں اس امر کا ذکر نہیں فرمایا ہے مگر عام طور پر مشہور یہی ہے۔ (مولف)

فرما گئے۔ دیوبند میں تعلیم دینیات سے فارغ ہوکر اوائل [illegible] میں امام ربانی
سے بیعت ہوکر کئی سال مجاہدات اور ریاضت نفس میں مصروف رہے۔ آخرکار
۱۳۱۶ھ میں شوق میں مغلوب ہوکر اہل وعیال سے اطلاع کے بغیر بغرض
اکتساب وحصول فیضان گنگوہ مراجعت فرمائی اور نسبت سلسلہ سے مالا مال
ہوکر بڑھتے اور گریہ و وجد کے روزانہ مزے لیتے ہیں۔ صبر و استقامت کا
پوچھنا ہی کیا۔ جبکہ اہلِ مدینہ کی متوکلانہ گذران سے ہر مسلمان واقف ہے۔
امتحاناً بہتیری بلاؤں میں جھڑ وجھڑائے گئے۔ مگر جب پختہ اترے تو خادم نواز
آستانہ عالیہ سے اب ان کو کوئی علیحدہ کرنے والا نہیں۔ حرم محترم میں درس
بھی دیتے ہیں اور دولتِ غنا سے مالا مال ہیں۔[1]

آپ کے اکلوتے صاحبزادہ مولانا وحید احمد مدنی مرحوم ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء
میں بمقام ٹانڈہ پیدا ہوئے۔ ۴ سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔
وہاں گورنمنٹ اسکول میں عربی اور ترکی زبانوں میں تعلیم مکمل کی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ
نے اپنی سوانح میں ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے:

"وحید احمد مرحوم اس وقت ترکی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور علوم جدیدہ اور
ترکی زبان میں اچھی طرح ماہر ہوچکا تھا۔ عربی کی تعلیم بھی ایک درجہ تک حاصل
کرچکا تھا مگر وہ قابل اطمینان نہ تھی۔ میرے سفر ہندوستان اور وہاں تین برس
تک قیام کی وجہ سے اس کی تعلیم میں بہت خلل پڑ گیا تھا۔ بڑے بھائی صاحب
مرحوم (اس کے والد) اس کی تعلیم و تربیت پوری طرح نہیں کرسکتے تھے۔
ان کے دوسرے نکاحوں اور سوتیلی ماؤں کے معاملات کی وجہ سے نیز اُن
کے مغلوب الغضب اور زیادہ سخت ہونے کی بنا پر اس کو طبعی طور پر اپنے
والد سے لگاؤ نہیں تھا۔ بلکہ مجھ سے اور والد مرحوم سے اس کو زیادہ تعلق تھا۔
اس بنا پر والد صاحب مرحوم نے اس کو ترکی اسکول میں داخل کردیا تھا مگر

۱؎ تذکرۃ الرشید مولفہ مولینا عاشق الٰہی میرٹھی، ج ۲، ص ۱۵۸

وہاں کے لڑکوں کی صحبت میں اس کے اعمال و اخلاق پر غیر مستحسن اثر پڑ رہا تھا۔
وہ طبعی طور پر نہایت ذہین تھا۔ زبان ترکی اور فنون جدیدہ رائجہ میں وہ
اپنے درجوں میں ممتاز رہتا تھا مگر علوم جدیدہ اور فلسفۂ طبیعیات اور یورپین
فیشن کا جو زہر یلا اثر مذہب کے خلاف اہل اسکول اور کالجوں پر پڑتا ہے
اس سے وہ بھی مسموم ہو رہا تھا۔ اس لیے والد صاحب مرحوم کا ارشاد ہوا
کہ اس کو دیوبند لے جا اور دارالعلوم دیوبند میں علوم عربیہ کی تکمیل کرا[1]

۱۳۱۳ھ کی ابتدا میں آپ چچا (حضرت شیخ) کے ساتھ دیوبند تشریف لائے اور
حضرت اقدس شیخ الہندؒ قدس سرہ کی خصوصی نگرانی، تربیت اور شاگردی میں تعلیم حاصل
کرنے لگے۔ ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپ بھی ہم کاب
مراجعت فرمائے وطن (مدینہ) ہوئے۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ گرفتار کیے گئے تو آپ بھی
ان حضرات کی معیت میں قید کر کے مالٹا روانہ کیے گئے۔ گرفتاری کے وقت ایسی صورتیں
ممکن تھیں کہ آپ قیدیوں کی اس جماعت سے الگ کرا لیے جاتے۔ مگر اپنے چچا اور
استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی ہم کابی سے الگ ہونا آپ نے کسی حالت میں پسند نہیں کیا۔
حضرت شیخؒ نے اسارت مالٹا کے حالات میں آپ کے متعلق لکھا ہے کہ گرفتاری کے بعد
بیان دینے کے بارے میں سب کو پریشانی تھی۔ خصوصاً وحید بالکل نوعمر اور ناتجربہ کار تھا
مگر حضرت شیخ الہندؒ کی برکت اور خدا کے فضل و کرم سے سبھوں کے بیانات تقریباً
متفق ہوئے[2]

مالٹا کی قید کے زمانے میں آپ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھتے رہے اور
اس کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ سے علوم دینیہ اور عربی بھی پڑھتے اور مطالعہ کرتے رہے۔
اس کے ساتھ ہی فارغ اوقات میں آپ مختلف قوموں کے قیدیوں سے ملتے اور ان کے
ساتھ تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ آپ کے مشاغل کے بارے میں حضرت نے تذکرہ کیا
ہے "وحید نے ابتدا ہی سے اجنبی زبانوں کی طرف توجہ کی اور اولاً فرانسیسی اور پھر جرمنی

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۲۸
[2] سفرنامہ اسیر مالٹا، ص ۵۸

زبان کو سیکھا۔ پھر جب دیکھا کہ پانسۂ جنگ پلٹ گیا ہے تو انگریزی کی طرف متوجہ ہوا۔ مختلف فنون عربیہ خصوصاً حدیث اور تفسیر کی چند کتابیں اس سفر میں اس نے مولانا سے پڑھیں[1]۔ ۱۹۲۰ء میں جب رہائی ہوئی تو آپ ان اولیائے کرام کی معیت میں دیوبند آگئے اور مدرسۂ دیوبند میں معین مدرس مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ کی شادی اپنے والد کی ماموں زاد بہن، زوجۂ سید فاروق احمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دیوبند سے آپ بمبئی چلے گئے اور اپنی زبان دانی اور ذہانت کی بنیاد پر کسی اخبار کے عملہ ادارت میں ملازم ہوگئے۔ بمبئی کا قیام راس نہ آیا تو واپس آگئے اور بہار شریف پٹنہ صوبہ بہار میں مدرسۂ عزیزیہ وقف بی بی صغرا اسٹیٹ میں مدرس ہوگئے۔ وہاں حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ عربی ادب پڑھاتے رہے اور عوام و خواص میں ادیب صاحب کے لقب سے مشہور رہے۔ زباں دانی میں آپ کو خاص ذوق اور ملکہ تھا۔ عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، فرانسیسی، جرمن، ہندی، اردو، پشتو اور بنگالی وغیرہ بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ہفت زباں مشہور تھے اور لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک آدمی بیک وقت اتنی زبانیں کس طرح یکساں مہارت اور قدرت کے ساتھ حاصل کرسکتا ہے۔ "عربی اردو مادری زبانیں تھیں۔ فارسی و انگریزی سبقاً حاصل کیں، ترکی اور فرانسیسی مالٹا کے مصاحبین سے سیکھیں، پشتو، بنگلہ اور کچھ دوسری زبانیں احباب کی مجلسوں سے۔ اس طرح ہفت زبان نہیں بلکہ وہ زبان ہوگئے تھے۔"[2] بعض اوقات خاص طور پر حالتِ سفر میں آپ کی ملاقاتیں انگریزوں اور دوسرے غیر ملکی لوگوں سے ہوتی تھیں۔ وہ جس ملک کے ہوتے تھے اسی میں آپ گفتگو شروع کردیتے تھے۔ چونکہ لباس وضع قطع اور ظاہری تراش و خراش میں حد درجہ سادگی پسند تھے اس لیے راقم الحروف کو ایسے بعض مواقع یاد ہیں کہ ایک معمولی سی شکل و شمائل کے ہندوستانی سے

---

[1] سفرنامہ اسیر مالٹا، ص ۱۲

[2] محمد میاں، اسیران مالٹا، الجمعیۃ دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۳

اپنی زبان، انگریزی، فرنچ یا ترکی سن کر وہ لوگ بے حد خوش ہوتے تھے اور بڑے احترام و تواضع سے پیش آتے تھے۔

شعروادب کا بڑا ستھرا اور اعلیٰ مذاق تھا۔ مختلف زبانوں میں ہزاروں شعر اور ادب پارے برنوک زبان یاد تھے۔ بڑے نڈر، جری اور بے باک تھے۔ کسی سے کسی مصلحت کی بنا پر دبنا یا جھجکنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ جو بات حق جانتے تھے اسے برملا کہتے تھے۔

"حوادث و مصائب سے کھیلنے والا انسان خوف و دہشت سے ناآشنا۔ صاف گو، صاف دل، نہایت پابند مگر نہایت آزاد، اصول کا پابند مگر تکلفات سے آزاد۔ نہ واسکٹ نہ شیروانی، نہ عبا نہ قبا، صرف کرتہ پاجامہ زیب تن، کرتے میں جیب نہیں، جیب کا کام نیفے کے ذمے، رونق مجلس، پرزور مقرر، جید عالم مگر وضع و قطع طالب علمانہ، فقر و فاقہ میں بھی ہشاش بشاش، خالی ہاتھ مگر دل کا تونگر"[1]

مدرسہ عزیزیہ گورنمنٹ برطانیہ کی ماتحتی اور کنٹرول میں تھا۔ اس وقت کے بادشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے موقع پر مدرسہ میں بڑا جشن، تقریبات اور عام جلسہ ہوا جس میں ذمہ داران مدرسہ نے مدح خوانی کی تقریریں کی اور مبارک بادی کے ریزولیشن پاس کیے۔ مولانا نے ان تقریبات میں شرکت اور جلسہ میں تقریر کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ اگر حکومت برطانیہ کی فرمانبرداری بھی ملازمت کی شرط ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند کی تربیت اور صحبت فیض رحمت نے آپ کو مکمل سیاسی فہم و بصیرت عطا کر دی تھی۔ حجاز میں قیام، سامراج کی انسانیت سوز اور اسلام کش چالوں کے مشاہدہ و تجربہ اور مالٹا کی اسارت میں مختلف قوموں کے لیڈروں سے تبادلہ خیالات نے آپ کے قلب و دماغ کو حریت، مساوات اور انسانیت کی اسپرٹ سے معمور کر دیا تھا۔ ہندوستان میں آپ متحدہ قومیت کے حامی اور انڈین نیشنل

---

[1] محمد میاں، اسیران مالٹا، الجمعیۃ بکڈپو دہلی ۱۹۷۰ء، ص ۶۰۳

کانگریس کے سپاہی تھے۔ تقریر و تحریر کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ کی سیاسی تقریریں خاص طور پر مقبول تھیں اور مختصر سی مدت میں کافی مشہور ہو گئے تھے کچھ دن جیے ہوتے تو بعید نہیں تھا کہ ہندوستان کی تاریخی شخصیتوں میں شمار ہوتے۔ راقم الحروف نے بعض اہل الرائے حضرات سے سنا کہ حضرت شیخ الاسلام کو اپنی جد و جہد میں مولانا وحید احمد سے بہت کچھ توقعات اور امیدیں تھیں۔ مختصر یہ کہ عمر بھر کی محرومیوں اور گردشوں کے بعد جب چین کے چند سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تو شفیق چچا نے آبائی وطن "ٹانڈہ" میں نہایت اعلیٰ درجہ کا قیمتی اور وسیع مکان بھتیجے کے لیے تعمیر کرایا۔ مگر مقدر کا لکھا پورا ہو کر رہا۔ پورے چھ ماہ بھی اُس مکان میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ شوال ۱۳۵۶ھ مطابق نومبر ۱۹۳۷ء میں بہار شریف سے بیمار ہو کر آئے اور ۱۳ دن نمونیہ میں مبتلا رہ کر رمضان شریف کا چاند دیکھنے کے چند گھنٹوں کے بعد پانچ ننھے ننھے بچوں کو یتیم اور اہلیہ کو بیوہ کر کے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ دنیاوی حوادث اور صدمات کو برداشت کرنے میں پہاڑ کی طرح ثابت و صابر تھے۔ اس صدمے کو بھی بے مثال صبر و شکر کے ساتھ جھیلا۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں خلاف عادت و مزاج کچھ نہ کچھ اظہار ہو ہی گیا۔ تفصیل تو حضرت ہی کے بیان میں۔ تاہم دو اقتباسات اس موقع پر مناسب ہیں۔ حضرت نے بھتیجے کی بیوہ کو لکھا:

"تمھارے رنج و غم کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ مگر تم مجھے دیکھ کر صبر کرو۔ اب یہ وقت تھا کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں پیوند زمین کرتا۔ مگر میری تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔"

اپنے ایک مخلص خادم مولانا وحید الدین صاحب سابق ناظم دفتر جمعیۃ علماء ہند کو تحریر فرمایا:

"خواب کی تعبیر ظاہر ہے۔ عزیزم مولوی وحید احمد کی دائمی مفارقت میرے لیے معمولی تکلیف نہیں ہے۔ وہ میری پرورش میں بچپن سے رہا تھا۔ اُس

کو اپنے والد مرحوم سے اتنا تعلق نہیں تھا جتنا مجھ سے تھا۔ وہ ننھے ننھے
۴ بچے چھوڑ کر اور اپنی اہلیہ کو بیوہ چھوڑ کر چلا گیا۔ ذٰلک تقدیر العزیز
العلیم۔

بہرحال آپ حضرات دعوات صالحہ سے امداد فرماتے رہیں۔

ننگِ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

نئی سڑک سلہٹ۔ ۱۱ر رمضان ۱۳۵۶ھ

مولینا وحید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ بڑا (راقم الحروف) فرید احمد ہے۔ اس کی شادی حقیقی ماموں سید توکل حسین صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ اس کے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ بڑا لڑکا عمید الوحیدی ڈاکٹر ہے۔ اس کی شادی مراد آباد میں ڈاکٹر مولینا بدر الدین الحافظ پروفیسر آف عربک بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس کی صاحبزادی سے ہوئی ہے اور اس کے ایک بچہ خالد الوحیدی ایک بچی عائشہ الوحیدی ہے، تیسرا علی الوحیدی ہے۔ دوسرا حسین احمد الوحیدی ثانویہ علمی پاس کر کے تجارت میں باپ کا دست راست ہے۔ اس کی شادی حقیقی پھوپھی رضیہ سلمہا کی لڑکی سے ہوئی ہے، تیسرا لڑکا فواد الوحیدی بھی ثانویہ علمی پاس کر کے تجارت میں باپ کا قوتِ بازو ہے۔ اس کی شادی حقیقی چچا سید الوحیدی سلمہٗ کی لڑکی یاسمین سے ہوئی ہے۔ اس کے دو بچے عمار اور معاذ ہیں۔ چوتھا لڑکا صدیق الوحیدی سلمہٗ ثانویہ کا طالبِ علم ہے۔ اس کی شادی ماموں کی لڑکی سے ہوئی ہے اور ایک لڑکا عمر ہے۔ لڑکی رعنا الوحیدی سلمہا کی شادی حقیقی پھوپھی کے لڑکے خالد جاوید سے ہوئی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ سلمہم اللہ ودعا فاہم اللہ۔

مولینا وحید احمد کے دوسرے لڑکے ڈاکٹر رشید الوحیدی کا قیام جامعہ ملیہ دہلی میں ہے جہاں وہ اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر ہے۔ اس کی شادی حقیقی ماموں سید

مشتاق احمد صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ نہایت متقی، پابند شریعت، صاحب تصانیف ہے۔ اس کے پانچ لڑکے ہیں۔ بڑا اسعد الوحیدی رومی جس کا ایک بچہ، عمیر اور ایک بچی مُزنی ہے، دوسرا وحید الوحیدی غزالی، تیسرا فہد الوحیدی رازی، چوتھا حبیب الوحیدی سعدی اور پانچواں سید احمد الوحیدی جامی، ایک بچی فاطمہ رشید الوحیدی زویا، سب ابھی بچے ہیں اور زیر تعلیم ہیں۔

مولینا کا تیسرا لڑکا ڈاکٹر سعید الوحیدی جدہ میں مقیم ہے۔ اس کی شادی بھی حقیقی ماموں سید توکل حسین صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ اس کے دو بچے اجمل و فیصل اور ایک بچی یاسمین الوحیدی ہیں۔ دونوں بچے زیر تعلیم ہیں۔

مولینا کی ایک لڑکی صفیہ بیگم نیرہ سلمہا کی شادی پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ڈائرکٹر ذاکر حسین اسلامک انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ سے ہوئی۔ اس کے دو لڑکے ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی پروفیسر و صدر اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ دہلی اور دوسرے ڈاکٹر علاء الحسن آباد فاروقی سائنٹسٹ سی میپ (CIMAP) لکھنؤ ہیں۔ ایک لڑکی ڈاکٹر عطیہ بیگم فاروقی اور دوسری ڈاکٹر عرفی فاروقی ہے، سب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

دوسری لڑکی رضیہ بیگم سلمہا کی شادی ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف اُردو جموں یونیورسٹی سے ہوئی۔ اس کے چار لڑکے خالد جاوید، طارق، ثاقب اور صہیب ہیں اور چار لڑکیاں شاہانہ، فوزانہ، سعدانہ اور دردانہ ہیں سلمہم اللہ جمیعاً

حضرت مولینا سید احمد صاحب مہاجر مدنی مؤسس مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ

آپ مولوی شاہ سید حبیب اللہ صاحبؒ کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ سنہ ۱۲۹۳ھ مطابق سنہ ۱۸۷۶ء میں قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق گھر ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد گورنمنٹ مڈل اسکول ٹانڈہ میں تعلیم حاصل کی۔ اور مڈل اسکول کے امتحان میں سارے صوبے میں امتیازی شان کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ سنہ ۱۳۰۸ھ میں آپ کے بڑے بھائی مولینا صدیق احمد صاحب آپ کو اپنے ساتھ دیوبند لے گئے۔ وہاں مدرسہ دیوبند میں پڑھنے کے ساتھ ہی حضرت

شیخ الہندؒ سے خصوصی طور پر روحانی اور علمی اور اخلاقی استفادہ اور تربیت حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ حضرت قطب عالم گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے اور اپنے والد ماجدؒ کو مع پورے خاندان کے مدینہ طیبہ ہجرت کرجانے کا مشورہ دیا۔ سارے گھر اور خاندان کی مخالفت کے باوجود صرف آپ ہی ہجرت کی تجویز کے موافق اور مؤید تھے۔ بلکہ ظاہری طور پر صرف آپ ہی اس تاریخی ہجرت کا سبب بنے۔ سنہ ۱۳۱۶ھ میں خاندان کے ساتھ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور درس و تدریس کے ساتھ اشغال تصوف و سلوک میں مصروف ہو گئے۔ معاش اور ضروریات کے لیے تجارت اور دو کانداری کا پیشہ اختیار کیا۔ سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء میں تزکیہ باطن اور اشغال روحانیہ کی تکمیل کے لیے اپنے مرشد کی خدمت میں گنگوہ تشریف لائے اور تین برس تک خانقاہ میں مقیم رہ کر حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد مراجعت فرمائے وطن (مدینہ طیبہ) ہوئے۔ یہاں آکر حرم پاک میں درس و تدریس اور بعض تدریسی ملازمتوں میں مشغول رہے۔ سنہ ۱۳۳۵ھ مطابق سنہ ۱۹۱۶ء کے قریب آپ کو والد اور چھوٹے بھائی کی معیت میں حکومت ترکی نے گرفتار کرکے ریڈریا نوپل روانہ کردیا۔ وہاں سے واپس آئے تو سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق سنہ ۱۹۲۳ء کے قریب آپ نے مدینہ طیبہ میں قرآن و سنت کی خدمت اور مدینۃ الرسول کے یتیم و مفلس اور غریب الوطن بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مدرسۃ العلوم الشرعیہ لیتامیٰ مدینۃ المنورہ کی بنیاد رکھی۔

یہ مدرسہ قائم تو اسی بے سروسامانی کی حالت میں اور توکل علی اللہ کی بنیادوں پر کیا گیا تھا جس سے مولانا خود دوچار تھے۔ مگر انتھک جدوجہد، اخلاص و للہیت، بے غرضی و حسن تدبیر نے مدرسہ کو بہت جلد تعمیر، معیار اور ترقی کے اعلیٰ مدارج سے ہمکنار کردیا۔ بہت سی خصوصیات و محاسن کے ساتھ مدرسہ کی ایک امتیازی شان آج تک نمایاں ہے کہ یہ بارگاہ نبوی کی چوکھٹ سے بالکل ملا ہوا اور باب النساء اور باب جبرئیل سے بالکل متصل قائم ہے[1]۔ آج تک اس کے صدر دروازے پر

---

[1] سنہ ۱۹۸۶ء-۱۹۸۵ء کے درمیان یہ مدرسہ حرم پاک میں ملا دیا گیا اور اب حرم سے دور واقع ہے۔

قائم کردہ "سید احمد فیض آبادی" نمایاں حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اس میں حدیث، تفسیر، فقہ، نحو صرف اور ادب عربی وغیرہ کی معیاری اور اعلیٰ تعلیم تو ہوتی ہی تھی، اس کے ساتھ خصوصیت یہ تھی کہ حضرت مولینا نے دنیاوی ضرورت کے مضامین تاریخ، جغرافیہ بنیادی سائنس، حساب وغیرہ بھی داخل نصاب کیے تھے اور ان سب مضامین پر جدید تعلیمی اصولوں اور طریقۂ تدریس کے مطابق اپنا نصاب اور کتابیں تیار کرائی تھیں اور طبع کرائی تھیں۔ تعلیمی، علمی اور درسی خدمات کے ساتھ مدرسہ میں صنعت و حرفت سکھانے کا ایک شعبہ قائم تھا جس میں نہایت نفیس، حسین، قیمتی اور فنی چیزیں اور سامان مدرسہ کے بچے اپنے ہاتھوں سے اور اپنی طبعی صلاحیت کے مطابق بناتے تھے۔ مقاماتِ مقدسہ کے مناظر، تاریخی مآثر، نقشے، کتبات، امثال، حکم چمچے، چھریاں، پلیٹیں، پیالے اور بہت سی دوسری چیزیں۔ اعلیٰ درجہ کی دھاتوں، قیمتی لکڑی، منبت کاری، کٹ ورک، دلاویز و جاذب نظر مخمل و حریر کے ذریعہ ایسی فنکاری و مہارت اور شوق سے بنائے جاتے تھے کہ قدردان حضرات اور تاجر صاحبان منہ مانگی قیمتیں دے کر خریدتے تھے۔ اس طرح یتیم اور نادار طلباء میں عزتِ نفس، خود اعتمادی اور معاشی استغنا کے قابلِ قدر جذبات پرورش پاتے تھے۔

جو بچے خالص علمی و تعلیمی مزاج و مذاق کے تھے ان کو تحریر، تقریر، انشا پردازی، تصنیف، صحافت وغیرہ کی تربیت دی جاتی تھی۔ حضرت مولینا کا لگایا ہوا یہ پودا جب گھنیرا اور سایہ دار درخت ہو گیا تو سیکڑوں بلکہ ہزاروں نونہالانِ مدینۃ الرسول اس کی حیات آفریں چھاؤں میں دم لے کر تازہ دم ہو کر آگے بڑھے اور اعلیٰ مدارج و مناصب تک پہنچے۔ بعض فضلائے مدرسہ حکومت کی وزارتوں پر فائز المرام ہوئے۔ بہت سے بڑے بڑے گریڈ کے افسر ہوئے۔ بڑی تعداد علماء، دینی رہنما اور معلمین و مدرسین کی نکلی۔ کچھ حضرات ممتاز انشا پرداز، اخبار نویس، مصنف اور صحافی بن کر چمکے۔ یہ سب حضرات صفِ اول کے انسانوں میں شمار ہوئے اور ان میں ایک صفت قدرِ مشترک رہی کہ جہاں بھی رہے، جس حیثیت میں بھی رہے، انھوں نے دین، ملک اور بنی نوعِ

انسان کی خدمت کو مقصدِ زندگی قرار دیا۔ حضرت مولینا خاموش تعمیری، مقصدی اور بنیادی کام کرنے والوں کا بہترین اور قابلِ تقلید نمونہ تھے۔ نہ آپ کی عوام میں روایاتی انداز میں شہرت ہوئی۔ نہ جلسے اور جلوس نکلے۔ نہ نعرے اور مجمع لگے۔ مشیخت، جبّہ و دستار اور حلقہ و خانقاہ کی رسوم و قیود سے کوسوں دور آپ ایک سادہ طبیعت، درویش مزاج اور معصوم صفت انسان تھے۔ غریبوں اور محتاجوں کے گھروں پر خود کھانا پہنچاتے تھے۔ کمزوروں، بیواؤں اور معذوروں کا سودا سلف خود خرید کر لاتے تھے۔ مسافروں، مہمانوں اور نوواردوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاتے تھے۔ یتیموں لاوارثوں اور تربیت و تعلیم کے ضرورت مندوں کو اعلیٰ مستقبل اور مقصدی زندگی کے لیے تیار کرتے تھے۔ بس یہ آپ کے عالمانہ، زاہدانہ اور صوفیانہ مشاغل تھے۔ حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسنؒ اور حضرت مولینا خلیل احمد صاحبؒ کے خلیفۂ مجاز تھے مگر زندگی بھر کسی کو مرید نہیں کیا۔ معمولی شرعی پاجامہ یا نصف ساق کی لنگی، گھٹنوں سے نیچا لمبا کرتہ، معمولی سی مولویانہ ٹوپی اور کندھے پر رومال، یہ آپ کا لباس اور وضع تھی۔ شکل و شمائل دیکھ کر کوئی مشکل سے یقین کر سکتا تھا کہ یہ فقیرِ بے نوا ایسا عالی دماغ، مدبّر اور بے مثال معلّم و مربّی ہو سکتا ہے۔

حضرت کے سارے شاگردوں کا احاطہ تو مشکل ہے مگر چند مشہور شاگردوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) فضیلۃ الشیخ الاستاذ سید حبیب محمود احمد صاحب صدر مجلس اوقاف مدینہ طیبہ و مہتمم مدرسہ علوم شرعیہ

(۲) فضیلۃ الشیخ الاستاذ عبد القدوس الانصاری مرحوم سکریٹری مجلس وزرا سابق و مدیر مجلہ المنہل مدینہ منورہ

(۳) معالی الشیخ محمد عمر توفیق وزیر مواصلات المملکۃ العربیۃ السعودیہ

(۴) استاذ عبد الحمید عنبر مرحوم مفتش مرکزی وزارۃ مالیہ و عضو مجلس شوریٰ بالمملکہ

(۵) استاذ عبد اللہ ابن الشیخ محمود السوقی امام مسجد نبوی مدینہ منورہ

اور یہ وہ تلامذہ ہیں جن سے راقم الحروف کو ملنے، بات کرنے اور حضرت مولینا سید احمد صاحبؒ کا تذکرہ سننے کا موقع ملا ہے۔ یہ حضرات جب اپنے استاد حضرت مولینا سید احمد صاحب کا تذکرہ کرتے ہیں تو آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اولاد اپنے حقیقی باپ کا تذکرہ کر رہی ہے۔ مولینا کے خاندان کے کسی فرد سے ملتے ہیں تو نہایت احترام، رعایت اور اہتمام ملحوظ رکھتے ہیں اور گفتگو میں نام کے بجائے سید صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ سعودی عرب کے مشہور مورخ، محقق اور عالم مولینا عبدالقدوس الانصاری مذکور بڑے اونچے درجے کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مختلف کتابوں کے مصنف تھے اور تیس برس سے آخر عمر تک ماہوار رسالہ "المنہل" کے ایڈیٹر رہے۔ بہت دنوں تک سعودی عرب کی مرکزی گورنمنٹ میں سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ مولینا کے خصوصی شاگرد تھے اور اپنے استاد کی سیرت پر عربی زبان میں ایک مفصل کتاب "السید احمد الفیض آبادی" تالیف فرمائی ہے۔ اس میں حضرت مولینا سید احمد صاحبؒ کی مجمل سوانح عمری، ان کی سیرت اخلاق وصفات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان کی علمی اور تعلیمی خدمات، سادہ مزاجی اور تواضع و انکسار کی تفصیل بیان کی ہے۔ مدرسہ علوم شرعیہ کی مختصر تاریخ لکھی ہے اور جن اعیان و مشاہیر نے مدرسہ کا معائنہ کیا تھا ان میں سے چند کی رائیں اور تفصیل لکھی ہے۔ ایسے چند اسماء کا تذکرہ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے:

حضرت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولینا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم رحمۃ اللہ

رئیس القضاۃ عبداللہ بن حسن آل الشیخ

محمد طاہر الدباغ ڈائرکٹر جنرل آف ایجوکیشن

معالی عبداللہ السلیمان وزیر مالیہ المملکۃ سابقاً

عبداللہ الفضل معاون نائب جلالۃ الملک

عبدالرؤف حبان رئیس مجلس معارف مصر

محمد طلعت پاشا حرب جنرل منیجر جنگ مصر
ڈاکٹر محمد حسین ہیکل منسٹر آف ایجوکیشن مصر
شکری بیک القوتلی صدر جمہوریہ شام

حضرت مولانا کی وفات پر جن حضرات نے اخبارات نے اور جرائد نے مقالات، تعزیتی افتتاحیات اور مرثیے لکھے تھے ان کو بھی کتاب میں نقل کیا ہے۔ یہ سارے مضامین اور مراثی تاثیر اور فصاحت و بلاغت کے بہترین نمونے ہیں۔ مگر ان کا نقل کرنا یہاں پر ممکن نہیں ہے۔ تاہم بطور نمونہ ایک دو سطور لکھ دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ استاذ احمد رضا حوحو المترجم ادارۃ البرق والبرید نے بہت اثر انگیز اور طویل مقالہ لکھا۔ اس کی دو ایک سطریں درج ذیل ہیں:

"رحمك الله ايها الاب الراحل وغفر ذنبك۔ لم نتفوه قبل اليوم باي حسنة من حسناتك۔ لانك كنت تبغض هذا وكنا نحافظ على رضاك۔ ولكن اليوم .... وقد اصبحت في جوار ربك اليوم۔ قد قبرت كل الضغائن التي تتعلق بشخصك اليوم ولم تبق سوى الحقيقة وحدها مجسمة فهل نستمر على السكوت الذي عودتنا عليه۔ كلا۔ فلا طاقة لنا على ذلك۔ باسمِ اولئك الابناء الذين كنت تحرص على راحتهم۔ باسمِ اولئك ايها الاب الجليل۔ اقف على هذا لمنبر المتواضع۔ ابكي فقدانك المولم۔"

یہ پورا تعزیت نامہ پڑھ کر لکھنے والے کی طرح پڑھنے والی کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ نظم میں جو مرثیے لکھے گئے ان میں حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد کا مرثیہ نہایت بلیغ پر اثر اور فصیح ہے۔ چند شعر اس کے بھی ملاحظہ فرمالیں:

قف بالبقيع وجدد ذكر من سا وا ذرع الدموع على تلك الرفات أسى

عساك تبصر من تحت الثرى دفنت ۔۔۔ عظامه وهو في الاحشاء قد رمسا
هذا هو السيد المحبوب في خلق ۔۔۔ قد زانه لم يكن فظاً ولا شرسا
يولي الجميل بلا منٍّ ولا كدرٍ ۔۔۔ ويكرم الضيف هشاً قط ما عبسا
في كل فن ترى الانهار جارية ۔۔۔ تروي العطاش على ما فاتها انسا
ذاك التقي النقي السيد العلم ۔۔۔ الشهم الذي لم يزل بالحق مقتبسا

کتاب سوانحی ادب، تاریخ اور تاثیر کے اعتبار سے بہت مفید اور دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ اب نادرالوجود ہے۔ پرانے مکتبات میں کہیں کہیں کوئی نسخہ موجود ہے اور اب اگر موجود بھی ہو تو اس سے دلچسپی رکھنے والے کہاں سے آئیں گے۔ حضرت مولینا رحمۃ اللہ کے تلامذہ اور عقیدت مند زیادہ تر اپنے اللہ کو پیارے ہوئے۔ ایسی ایسی ہزاروں کتابیں ہوں گی بلکہ اس سے ہزاروں گنا زیادہ قیمتی اور مفید، جو اب مرورِ ایام کی تہوں میں دفن ہو کر ختم ہو چکی ہیں۔ دیکھیے حضرت مولینا کا قائم کردہ یہ شجرِ سایہ دار مدرسہ علومِ شرعیہ بھی کب تک وقت کی دست و برد سے محفوظ رہتا ہے۔

مولینا کی پہلی شادی آپ کے ماموں سید تفضل حسین صاحب کی صاحبزادی سے ٹانڈہ میں ہوئی تھی۔ اُن سے کئی بچے ہوئے مگر سب ایام طفولیت میں ہی ذخیرۂ آخرت ہوئے۔ ۱۳۱۶ھ میں اہلیہ بھی اللہ کو پیاری ہوئیں۔ دوسری شادی ڈاکٹر رفاقت علی مرحوم کی صاحبزادی اور مولینا عبدالحق مدنی مرحوم کی بہن سے ہوئی۔ ان سے بھی جو بچے پیدا ہوئے وہ صغر سنی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ تیسری شادی مدینہ طیبہ ہی میں ہوئی۔ ان سے آپ کی اکلوتی بیٹی عائشہ مرحومہ پیدا ہوئیں۔ ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء کے رجب کے مہینے میں آپ بیمار پڑے۔ ضعیف اور کمزور تو پہلے ہی سے تھے، اس پر مسلسل جد و جہد، دن رات کی محنت اور خلقِ خدا کی خدمت میں متواتر بے آرامی نے جسم و جان کو بالکل گھلا دیا تھا۔ بیمار ہوئے تو حالت گرتی ہی چلی گئی۔ کئی عوارض بخار، نزلہ، دمہ اور قلب کی تکلیف نے ایک ساتھ حملہ کیا تھا۔ بھائی حضرت شیخ الاسلام سے ملاقات اور آخری دیدار کے لیے بے حد بے چین رہتے تھے۔

حضرت نے حتی الامکان جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کی مگر آج کل کی طرح ہوائی جہاز کے سفر تو تھے نہیں کہ ناشتہ کر کے دہلی سے چلو اور دوپہر کا کھانا مدینہ طیبہ میں ہو۔ اس وقت تو دیوبند سے کراچی تک ٹرین کا چار روز کا سفر، اور پھر پندرہ دن کراچی سے جدہ اور پھر جدہ سے دو دن میں مدینہ طیبہ۔ غرض بہت عجلت اور جلدی کی گئی پھر بھی دیر ہو ہی گئی اور حضرت مولینا بھائی کے پہنچنے سے پہلے حسرت دیدار دل میں لیے ہوئے شوال کے مہینے میں (۱۹۴۰ء) مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔ صاحبزادی عائشہ مرحومہ کی شادی حقیقی چچا حضرت شیخ الاسلام کے صاحبزادے مولینا اسعد مدنی صاحب سلمہ اللہ سے کی گئی۔ مرحومہ نہایت نیک، بے نفس، بے زبان، صابرو شاکر اور اطاعت گذار بچی تھی۔

آخر عمر میں کئی برس تک ہندوستان رہنے کے بعد مدینہ طیبہ واپس آئی۔

یہاں اُس کا پہلا اور آخری بچہ احمد سلمہ

میں تولد ہوا۔ اس کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصہ بعد طفلِ شیرخوار کو اللہ کے سہارے پر چھوڑ کر محروم و نامراد دنیا سے رخصت ہوگئی اور دکھوں سے نجات پا گئی۔ اللہ جنت کے اعلیٰ درجات میں جگہ عطا فرمائے۔ اس کا بچہ احمد جو حضرت شیخ مدنی کے صاحبزادے مولینا اسعد صاحب کا فرزند ہے۔ مدینہ طیبہ ہی میں تعلیم و تربیت پا کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ بہت ذہین، قوی الحافظہ اور محنتی نوجوان ہے۔ عربی تو اس کی مادری زبان ہے۔ انگریزی میں بھی معقول قابلیت کا مالک ہے۔ مکہ مکرمہ کے ایک مہاجر خاندان میں اس کی شادی ہوئی ہے۔ پہلے تو گورنمنٹ سعودی عرب کے مختلف شعبوں میں ملازم رہا۔ اب جدہ کے ایک بینک، بنک الجزیرہ کی ایک شاخ کا مینیجر ہے۔ اور تادم تحریر اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ خدا صحت، عافیت اور اطمینان کے ساتھ عمر طویل نصیب فرمائے اور اولاد کی نعمت سے مالامال کرے آمین۔

صاحبزادہ مولینا سید جمیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آپ مولوی صاحب کے چوتھے صاحبزادے تھے۔ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں بمقام ٹانڈہ ضلع فیض آباد تولد ہوئے اور ۱۴ برس تک ہندوستان ہی میں اردو، فارسی، ریاضی وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد والدین اور خاندان کے ساتھ مدینہ طیبہ ہجرت کی۔ یہاں سرکاری مدرسہ رشدیہ میں داخل ہوئے اور فطری ذہانت، حوصلہ مندی اور شوق کی بدولت تعلیمی میدان میں بہت جلد نمایاں ترقی حاصل کی۔ اور نہ صرف اپنی کلاس بلکہ پورے اسکول کے صفِ اوّل کے طلباء میں شمار ہوئے۔ تمام عبوری امتحانات اور فائنل امتحان میں اول درجہ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے آپ کو اسکول اور حکومت کی ایک خصوصی تقریب میں گورنر مدینہ نے "باش صنف" کا اعزاز اور تمغہ عطا کیا۔ گورنر اس وقت عثمان پاشا تھے اور زمانہ عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید مرحوم کا تھا۔ سید جمیل احمد صاحب کی قابلیت، لیاقت اور اعلیٰ کامیابیوں کی بنا پر حکومت ترکیہ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے دار الخلافہ استانبول بھیجے جانے والے طلباء میں آپ کا انتخاب کیا اور ان طلباء کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ترکی روانہ کیا گیا۔ ان کی آمد کی اطلاع دار الخلافہ کو بذریعہ تار دی گئی۔ حکومت ترکیہ یوں بھی حرمین شریفین کے رہنے والوں کا بہت اعزاز و اکرام کرتی تھی۔ پھر یہ تو فخر اور اعلیٰ صلاحیتوں سے بھرپور مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نونہال تھے۔ دار الخلافہ نے ان کے احترام اور توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ فوجوں کی سلامی، بینڈ باجے اور جلوس کے ساتھ پورے شان و شوکت سے ان کا استقبال کیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب پہلے ہی سال کے امتحان میں سارے کالج میں اوّل درجہ سے پاس ہوئے اور نمایاں کامیابی پر آپ کی عزت و توقیر پہلے سے دگنی ہوگئی۔ ان حالات اور ترقیات کو دیکھتے ہوئے ماں باپ اور خاندان کے علاوہ غیروں کو بھی قوی اُمید تھی کہ آپ بہت جلد غیر معمولی مدارج تک پہنچیں گے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ جانے کے بعد دوسرے

ہی سال کی تعلیم کے دوران آپ بیمار ہوئے، کچھ دن ترکی ہی میں علاج ہوا مگر افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ مجبوراً مدینہ طیبہ واپس آگئے اور مرض دق وسل تجویز ہوا۔ اور آخر تقدیر کا لکھا سامنے آیا۔ والدہ ماجدہ کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں بوڑھے باپ اور بھائیوں کو اور بہن کو چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوگئے۔

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

صاحبزادی ریاض فاطمہ مرحومہ

آپ مولوی صاحب کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں بمقام ٹانڈہ پیدا ہوئیں اور گیارہ برس کی عمر میں خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آبسیں۔ ۱۳۲۴ھ میں بعمر اُنیس برس اپنی والدہ کے حقیقی بھتیجے سید تصدق حسین صاحب مرحوم کے لڑکے سید فاروق احمد کے ساتھ بیاہی گئیں اور مدینہ طیبہ ہی میں مذکور داماد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ مولوی صاحب نے ان کے والدین سے اس ارادے کا اظہار کر دیا تھا کہ فاروق احمد کی تعلیم و تربیت مدینہ طیبہ میں مکمل ہو جائے۔ پھر چاہیں تو یہاں رہیں ورنہ ہندوستان واپس چلے جائیں گے۔ مگر بدقسمتی سے وہ سال بھر کے اندر ہی چپکے سے کچھ نقد اور سامان لے کر ہندوستان چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک بچی تولد ہوئی اور ان کے والدین نے اپنی بہو اور پوتی کو ہندوستان بُلانے پر بہت اصرار کیا۔ مگر داماد کی بے مروتی اور بے تعلقی کے پیش نظر مولوی صاحب نے صاحبزادی کو بھیجنا پسند نہ کیا۔ یہ کسی نہ کسی طرح صبر و شکر کے ساتھ گذر کرتی رہیں۔ مگر ان کے جانے کے تین سال بعد تپ دق میں مبتلا ہو کر سال ڈیڑھ سال تک بیمار رہیں۔ اور ۱۳۳۰ھ میں دو سالہ بچی کو چھوڑ کر اپنے مولیٰ سے جا ملیں۔ ان کے انتقال کے بعد بچی بھی ماں کی جدائی برداشت نہ کر سکی۔ اور کچھ ہی دنوں بعد ماں کے پہلو میں جا سوئی۔ اِنّا للہ

وانا الیہ راجعون۔

صاحبزادہ مولانا سید محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آپ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں بماہ شوال ٹانڈہ میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں خاندان کے ساتھ مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ پہلے تو خاندانی رواج کے مطابق گھر ہی میں عربی، اردو، حساب، قرآن وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر مدینہ طیبہ کے سرکاری اسکول اور کالج میں عربی، ترکی، ریاضیات اور دوسرے مروجہ علوم کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد آپ شریف حسین کی حکومت میں باش کاتب کے عہدے پر ملازم ہوئے۔ جب ملک عبدالعزیز آل سعود کی حکومت آئی تو آپ جدہ میں رجسٹرار یعنی کاتب عدل کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ لیکن حضور اور حضور کے دیار کی محبت آپ کو وراثت میں ملی تھی۔ جدہ کا قیام راس نہ آیا۔ مدینہ طیبہ میں تبادلہ نہیں ہوا تو آپ نے ملازمت سے استعفیٰ دیا۔ مدینہ طیبہ آ گئے اور تجارت کا شغل اختیار کیا۔ خدا نے بہت سی خوبیوں کے ساتھ آپ کو فہم و فراست، استقلال، مسلسل جدوجہد، قناعت، توکل اور تدبر جیسی صفات سے خصوصی طور پر نوازا تھا۔ تجارت کے لیے یہ صفات کامیابی کی ضمانت ہیں۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف تجارت بلکہ بہت جلد صنعت و حرفت میں بھی ترقی کی اور اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا۔ فرنیچر اور لکڑی کے سامان کا ایک کارخانہ قائم کیا اور نہایت قابل اور ماہر افراد کے ذریعے اس کو بڑی ترقی دی۔ برف کی فیکٹری لگوائی اور تمام شہر میں برف کی سپلائی کا انتظام بنایا۔

جائدادیں اور عمارتیں خریدیں۔ وسیع اور زرخیز باغات لگوائے۔ ان میں عظیم الشان کوٹھیاں اور سوئمنگ پول بنوائے۔ ان میں پالتو مویشی، گائے، بکریاں، دنبے وغیرہ پالے اور ان کے ساتھ ہی چھوٹا سا زولوجیکل شعبہ بھی بنایا جس میں ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، پہاڑی شتر مرغ، پہاڑی بکرے، زیبرا، طوطا، مینا، مور اور چمپانزی وغیرہ پال کر باغ کی رونق میں اضافہ کیا۔ لوگ دور دور سے اس پُرفضا ماحول میں کچھ

وقت گذارنے کے لیے آتے تھے اور حضرت مولینا بڑی فراخدلی سے ان کی راحت کا انتظام رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ اطراف عالم سے آئے ہوئے مشاہیر، امراء، وزراء، ملوک اور روساء کی مہمانداری ان باغات میں کرتے تھے۔ مرحوم شاہ سعود تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد پہلی بار جب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو حضرت مولینا نے اپنے بڑے باغ میں بادشاہِ وقت کا استقبال کیا اور اس تقریب میں ایک سفید مور کا جوڑا سنہرے پنجرے میں تحفۃً پیش کیا۔ اس موقع پر بادشاہ مرحوم نے آپ کو ایک بہترین قیمتی اور بہت بڑی امریکن کار کرسیلر انعام میں بخشی۔ اراکینِ دولت اور بادشاہ کو آپ کی اصابت رائے، دیانت، امانت، اخلاص اور تدبر پر ایسا اعتماد تھا کہ بڑے بڑے معاملات میں آپ کی رائے کو وقعت دی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ حکومت کی مختلف مجالس اور اداروں کے ممبر رہے۔ حق تعالےٰ نے آپ میں ایسی غیر معمولی صفات، خصوصیات اور صلاحیات جمع کر دی تھیں جن کے تفصیلی تذکرے کے لیے ایک کتاب درکار ہے۔

راقم الحروف اپنے تجربے اور فہم کی حدود میں عرض کرتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسے فہیم، ذکی، ذہین، محتاط، مدبر، منتظم، متواضع، سلیم الطبع، باوقار، مستقل مزاج، صائب الرائے، مردم شناس، منکسر مزاج، پابندِ اوقات اور منظم اشخاص بہت کم دیکھے ہیں۔ آپ کا ہر عمل، ہر اقدام اور گفتگو کا ہر ہر لفظ مرتب اور منظم ہوتا تھا۔ پہلے سے سوچے سمجھے بغیر نہ کوئی کام کرتے تھے اور نہ کوئی بات منہ سے نکالتے تھے چنانچہ روزمرہ کی زندگی میں کوئی وقت بیکار اور کوئی گفتگو بے مقصد نہیں ہوتی تھی۔ مجمع میں مجلس میں، انفرادی بات چیت میں، اجتماعی گفتگو میں، حویلی میں، مردانخانے میں غرض ہر موقع پر نہایت سنجیدگی، متانت، وقار اور کم گوئی کے ساتھ رہتے تھے، صرف ضرورت کے وقت بولتے تھے اور وہ بھی صرف بقدرِ ضرورت بولتے تھے۔ گفتگو میں نہ ایک لفظ کی کمی کی جاسکتی تھی اور نہ اضافے کی گنجایش ہوتی تھی۔ علمی اصطلاح میں جامع مانع اور خیر الکلام، بات کرتے تھے۔ صائب الرائے ایسے تھے کہ بڑے بڑے صاحب اثر و نفوذ

لوگ آپ کے مشوروں سے مستفید اور کامیاب ہوتے تھے۔ وضع کے بے حد پابند تھے۔ نہ کسی سے ایسے تعلقات رکھتے تھے جو احتیاط اور وقار کی حدود سے باہر ہوں اور نہ کسی سے معاندت و مخالفت رکھتے تھے۔ بعض حضرات سے روزمرّہ کی ملاقاتیں مقرر تھیں بعض حضرات سے ہفتہ میں ایک دن ملتے تھے۔ بعضوں سے سال کے سال عید بقرعید پر ملتے تھے۔ ان اوقات کی بہت پابندی فرماتے تھے۔ حرم پاک میں جماعت سے نماز کی بہت پابندی فرماتے تھے۔ ایک بار راقم الحروف سے فرمایا کہ اگر اوقات کی پابندی میں تھوڑا سا بھی تساہل ہوجائے تو نماز اور جماعت میں خلل واقع ہوتا ہے اس لیے مجبوراً میں فلاں معاملے میں کچھ زیادہ وقت نہیں دے سکا۔

حرکات و سکنات میں، شکل و شمائل میں، گفتگو اور لب ولہجے میں، عادات و خصائل میں، کھانے پینے میں حتیٰ کہ زبان اور الفاظ میں اپنے بڑے بھائی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ سے بے حد مشابہ تھے۔ بعض اوقات یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے میرا یہ احساس خاص ربط و تعلق کی بنا پر ہو۔ مگر ایک موقع پر مولینا ابوالحسن علی الندوی مدظلہٗ نے راقم سے اپنے اسی مشاہدہ اور احساس کا تذکرہ کرکے فرمایا کہ میں اکثر اسی شوق میں ان سے ملنے جاتا ہوں کہ محسوس ہوتا ہے جیسے حضرت کے پاس بیٹھا ہوں۔ شاید یہ فرمایا تھا کہ میں مولانا کی ایک ایک بات اور حرکت غور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ حضرت کی مکمل مشابہت نظر آتی ہے۔ موصوف نے جو نصیحتیں، فہمائشیں اور حکمتیں مجھ سے فرمائیں، ان میں سے کچھ سپردِ قلم کردینے کو جی چاہتا ہے کہ شاید نوجوانوں اور عام قارئین کے لیے مفید ہوں۔ اس لیے کہ مجھے ان سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ مجھ سے سعودی عرب میں قیام پر اصرار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنی حد تک تم ارادہ کرلو کہ اب یہاں سے نہ جاؤ گے۔ اگر کوئی قانونی مجبوری پیش آجائے تو مجبوری ہے مگر اپنے عزم میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اللہ پر بھروسہ کرو۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ۔ ایک موقع پر مجھے نصیحت فرمائی کہ کبھی کسی سے ایسی بے تکلفی اور عام حدود سے زیادہ تعلقات مت بڑھاؤ کہ کسی وقت

رنج اور تلخی کی نوبت آئے اور جس حد تک تعلقات ہو جائیں اُن کو آخر حد تک نبھاؤ۔ کبھی
کسی کے ساتھ مخالفت اور سخت کلامی سے پیش نہ آؤ۔ تسامح اور عفو و درگذر سے پیش آؤ۔
اور اگر کسی سے مخالفت پیش ہی آجائے تو بغیر تلخی پیدا کیے ہوئے خاموشی سے الگ ہو جاؤ۔
کسی تیسرے آدمی کو بلکہ خود اُسے بھی پتہ نہ چلے کہ تم اجتناب و اعراض کر رہے ہو۔ ادفع
بالتی ھی احسن ۔ ایک موقع پر فرمایا ہمیشہ اپنے مقاصد میں خاموشی سے لگے رہو۔
لوگوں سے اپنے معاملات کے تذکرے، اظہار و اعلان سے کاموں میں رکاوٹیں پیدا ہوتی
ہیں۔ استعینو فی امورکم بالکتمان ۔ ایک بار فرمایا کہ ایک ایک منٹ اپنے قیمتی
مشاغل میں خرچ ہونا چاہیے، لایعنی باتوں، مجالس اور کاموں سے بہت گریز کرنا چاہیے۔
ایک بار کہا کہ جن لوگوں کے ساتھ رہتے ہو، کام کرتے ہو اور جس گھر یا شہر میں رہتے ہو
اس کی خوشنودی اور رضاجوئی کا خیال رکھنا چاہیے۔ دارہ انت فی دارہ ۔ تجارت
کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کے ہر مشغلہ میں انسان کو انسان پر اعتماد اور
بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ صرف تجارت ایسا مشغلہ ہے اس میں تمام تر اعتماد اور توکل اللہ
پر ہوتا ہے اور وہی سب سے بہتر وکیل ہے۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر۔ ہر بات اس
طرح سمجھاتے تھے کہ دل میں اُتر جاتی تھی اور ہر نظریے کو قرآن، حدیث یا امثال و حکم
سے مبرہن کرتے تھے۔

ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ آٹھ برس کی عمر میں ہندوستان سے آئے اور
فرماتے ہیں کہ آنا مجھے خواب کی طرح یاد ہے اور زبان آپ ایسی بولتے ہیں کہ لگتا ہے اسی
سال ہندوستان سے آئے ہیں۔ فرمایا کہ ہمارے خاندان میں ہمیشہ اُردو بولی جاتی رہی اور
بہت دنوں تک رہن سہن بھی وہی رہا۔ مگر وقت کے ساتھ طور طریق بدل گئے۔

آپ کی پہلی شادی بریلی کے ایک مہاجر خاندان میں ہوئی تھی۔ اِن سے کوئی اولاد
نہیں ہوئی۔ پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی مراکش کے ایک مہاجر خاندان
میں ہوئی۔ انہی سے آپ کی تین صاحبزادیاں اور اکلوتے مشہور و معروف صاحب زادے
عالی جناب فضیلۃ الشیخ السید حبیب محمود احمد صاحب مدظلہم تولد ہوئے۔ سید حبیب صاحب

کی ولادت ملکِ شام میں ۱۳۳۶ھ میں اس وقت ہوئی جب خاندان کی جلاوطنی کے بعد خواتین اور بچے شام میں قیام پذیر تھے۔ آپ کی مکمل تعلیم مدرسہ علوم شرعیہ میں حضرت مولینا سید احمد صاحب کی زیرنگرانی ہوئی۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت نے آپ کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح پرورش کیا اور تعلیم و تربیت دی۔

آپ مدرسہ علوم شرعیہ کے مدیر و مہتمم ہیں۔ حکومت کے مختلف شعبوں اور مجالس کے ممبر ہیں۔ مجلس اوقاف مدینہ طیبہ کے صدر اور سعودی عرب کی اوقاف اعلیٰ کے ممبر ہیں۔

اس وقت مولوی حبیب اللہ کی اولاد میں اور خاندان میں سب سے بڑے اور سرپرست آپ ہی ہیں اور اپنے اس منصب کو نہایت کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ایک حقیقی مربی کی طرح نبھار ہے ہیں۔ حق تعالیٰ صحت و عافیت اور اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ آپ کا سایہ دراز فرمائے۔ آمین۔

آپ کی شادی مدینہ طیبہ ہی میں ہوئی ہے اور آپ کے تین صاحبزادے اور تین بیٹیاں ہیں۔ سب سے بڑے ڈاکٹر سید احمد حبیب محمود سلمہٗ ہیں۔ آپ کی شادی مدینہ طیبہ ہی میں ہوئی ہے جس سے ایک صاحبزادہ میاں خالد ہیں اور دو بچیاں فاطمہ اور خلود ہیں۔

دوسرے صاحبزادے میاں سید محمد حبیب ہیں، انھوں نے جرمنی سے جیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور اب پٹرولیم منسٹری میں اعلیٰ منصب پر فائز ہیں۔

تیسرے صاحبزادے میاں سید عدنان حبیب سلمہٗ ہیں۔

مولینا سید حبیب صاحب کی تین صاحبزادیاں ہیں۔

ان کے علاوہ مولینا سید محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تین بیٹیاں ہیں۔ سب سے بڑی محترمہ ناجیہ صاحبہ کی شادی جدہ کے مہاجر خاندان کے قاضی فضل اللہ صاحب کے صاحبزادے قاضی مسعود صاحب سے ہوئی ہے۔ دوسری بیٹی محترمہ آسیہ سلمہا ہیں۔ ان کی شادی بنگلہ دیش کے مہاجر ڈاکٹر عبدالمنان صاحب سے ہوئی ہے تیسری صاحبزادی محترمہ ذکیہ سلمہا ہیں ان کی شادی پورنیہ صوبہ بہار کے ایک ڈاکٹر محمد نسیم

صاحب مہاجر مدینہ طیبہ سے ہوئی ہے۔ اللہ سب کو خیریت وعافیت سے رکھ کر دارین کی مسرتیں، سعادتیں اور کامیابیاں نصیب فرمائے۔ آمین

الحمد للہ کہ بیاسی برس تک نہایت کامیاب زندگی گذار کر، تمام فرائض دینی و دنیوی سے فراغت پاکر اور حیاتِ مستعار کا ایک معتد بہ حصہ دنیائے دنی سے کنارہ کشی کے بعد حق تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں گذار کر حضرت مولانا محمود احمد صاحب ۱۹۷۳ء میں معمولی بخار میں مبتلا ہوئے اور کل تین چار دن کی علالت کے بعد نہایت اچھے حالات میں کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ

اہلاً و سہلاً مرحبا

علامہ اقبال سہیل مرحوم

اے سایہ ات بال ہما خوش آمدی خوش آمدی   اہلاً و سہلاً مرحبا خوش آمدی خوش آمدی

اے شمعِ ایوانِ حرم اے سروِ بستانِ حِکَم   اے خضرِ اربابِ ہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی

اے خازنِ اربابِ حق اے مہبطِ انوارِ حق   اے حق پسند و حق نما خوش آمدی خوش آمدی

سرکردۂ اربابِ دیں سردفترِ اہلِ یقیں   سرچشمۂ صدق و صفا خوش آمدی خوش آمدی

اے مستشارِ مؤتمن اے مقتدائے ممتحن   اے بادلِ درد آشنا خوش آمدی خوش آمدی

اے قاسمِ فیضِ کہن اے ظلِّ محمود الحسن   اے یادگارِ اتقیا خوش آمدی خوش آمدی

اے یوسفِ کنعانِ ما بادا فدایت جانِ ما   ہاں اے اسیرِ مالٹا خوش آمدی خوش آمدی

اے رایتِ فتحِ مبیں اے آیتِ علم و یقیں   اے شمعِ جمعِ اصفیا خوش آمدی خوش آمدی

اے کنزِ اخبارِ نبی مقبولِ سرکارِ نبی   اے پرتوِ شمعِ حرا خوش آمدی خوش آمدی

اے نازشِ خاکِ وطن اے مرجعِ اربابِ فن   اے دردِ دلہا را دوا خوش آمدی خوش آمدی

آئینۂ فیضِ ازل گنجینۂ علم و عمل   تصویرِ تسلیم و رضا خوش آمدی خوش آمدی

از مقدمت دل شاد شد ویرانہ ام آباد شد   اے بر تو چوں من صد فدا خوش آمدی خوش آمدی

دلہا تہِ اقدام تو وردِ زبانہا نام تو   آید زہر سو ایں صدا خوش آمدی خوش آمدی

ایں گلشنِ علم و ہنر شد از قدومت مفتخر
گوید ہمیں نورالہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی

۱؎ یہ نظم ۱۹۳۲ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں حضرتؒ کی تشریف آوری کے موقع پر پڑھی گئی۔ "صحیح زبان میں اتنی صحیح مدح صحیح موقع پر صحیح شخص کے لیے شاعری کے عالم میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے" (مولانا عبدالماجد دریاآبادی، ہفتہ وار "سچ" ۲۰؍ مئی ۱۹۳۲ء)۔ "واقعی نفیس ہے اور لطف یہ کہ سلیس ہے۔ گویا سہلِ ممتنع ہے۔ میں نے نقل کرلی ہے" (حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت ص ۲۲۲)۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ

ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت سنہ ۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۱ء

آپ مولوی سید حبیب اللہ صاحب کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ سنہ ۱۲۹۶ھ مطابق سنہ ۱۸۷۹ء میں قصبہ بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا جس سے تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ بہت بچپن میں اپنے والد کے تبادلے کے ساتھ ٹانڈہ چلے آئے جو مدینہ طیبہ کے قیام سے پہلے آپ کا آبائی اور اصل وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم اور تربیت اپنے گھر ہی پر ہوئی۔ اس زمانے کا یہی دستور تھا بچے کو سب سے پہلے گھر میں قاعدہ بغدادی، آمدنامہ، حمد باری، خالق باری، گلستاں، بوستاں اور قرآن پاک حساب وغیرہ پڑھاتے تھے۔ حضرت نے بھی اُردو، حساب، فارسی اور قرآن کی تقریباً مکمل تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور اس کے بعد مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ تربیت کے معاملے میں بھی اس وقت کا طور طریق آج سے بالکل مختلف تھا۔ حضرت کی تربیت بھی والدین کی شدید نگرانی اور قید و بند میں ہوئی۔ کھیلنے کودنے، دوستوں سے ملنے جلنے اور باہر گھومنے پھرنے کی تھوڑی سی آزادی اور بے فکری کے دن جو ہر انسان کو بچپن کے چند لمحوں کے لیے نصیب ہوتے ہیں وہ حضرت کو کبھی نہیں مل سکے۔ آنکھ کھولتے ہی اور ہوش آتے ہی آپ نے فرائض و ذمہ داریوں

اور پابندیوں کا بوجھ سر پر محسوس کیا۔

"مجھ کو ہوش و حواس جب آئے تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا۔ بانگر مئو بالکل یاد نہیں۔ والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا بہت زیادہ اور غیر معمولی خیال تھا اور اس کے لیے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے۔ ہر بچہ کو جبکہ وہ چار برس کا ہو جاتا تھا، پڑھنے لکھنے کے لیے بٹھا دیتے تھے اور نہ پڑھنے اور یاد نہ کرنے اور کھیلنے پر خوب مارتے تھے۔ اس لیے مجھ کو کھیلنے کا موقع صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے۔ جب اس عمر کو پہنچا تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور اس کے بعد سیپارہ پڑھتا تھا۔ صبح ساڑھے نو بجے تک تو یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ اسکول اللہ داد پور سے تقریباً ایک میل یا کچھ زائد دوری پر ہے۔ اسکول کی تعلیم میں بھی اس زمانہ میں مدرسین خوب مار پیٹ کرتے تھے۔ اس وقت مجھ کو درجہ آٹھ میں داخل کیا گیا (اس زمانہ میں درجوں کی ترتیب اس طرح تھی، مڈل کلاس کو اوّل درجہ کہا جاتا تھا اور سب سے نیچے کا درجہ اٹھواں کہلایا جاتا تھا) چار بجے شام تک اسکول میں قید رہنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم کے ساتھ گھر آنا ہوتا تھا۔ گھر پر بھی سخت قید تھی۔ باہر نکلنا، گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا، اس کی بالکل اجازت نہ تھی۔ اور اگر کبھی غفلت دیکھ کر یا والد صاحب کی غیبوبت میں موقع پا کر نکل جاتا تھا تو جب پتہ چلتا تھا تو سخت مار پڑتی تھی۔ ایک بکری بھی والد صاحب نے اچھی نسل کی پال رکھی تھی۔ اسکول جاتے اور آتے ہوئے اس کو اور اس کے بچوں کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ چونکہ اسکول کا احاطہ بڑا تھا تو وہ لانبی رسّی میں باندھ دی جاتی تھی اور دن بھر اسی طرح چرتی رہتی تھی اور

دیگر اوقات فارغہ میں یا تعطیل میں اس کو اور اس کے بچوں کو مکان کے قریب چرانا پڑتا تھا (اس طرح یہ سنّتِ نبوی علیہ السلام ادا کرنی پڑتی تھی) گاؤں میں میرا ہم عمر لڑکا ماموں زاد بھائی جواد حسین مرحوم تھا۔ موقعہ پاکر اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا تھا۔ صرف دو گھروں میں ہم آزادی کے ساتھ جاسکتے تھے ایک تائے صاحب مرحوم کے یہاں اور دوسرے ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے گھر میں، مگر چونکہ تائے صاحب کے یہاں کوئی ہم عمر لڑکا نہ تھا، اس لیے وہاں جانا بے سود ہوتا تھا۔ جواد حسین مرحوم کے یہاں بھی کھیلنے کی اگر خبر ہو جاتی تھی تو مار پڑتی تھی۔ بہرحال ایامِ طفولیت میں صرف گولی کھیلنے کی نوبت آئی اور وہ بھی چھپ لگ کر۔ آزادی کے ساتھ وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ گاؤں میں بعض ہم عمر لڑکے اور بھی تھے۔ مگر ان کے گھروں میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ بھائی سید احمد مرحوم اور میں اُپر آتلی کے تھے اس لیے وہ ہمیشہ کاٹ کرتے تھے (جیسے کہ فطرتاً اوپر آتلی کے بھائیوں کی عادت ہوتی ہے) وہ طبعی طور پر ابتداء سے سلیم الطبع تھے۔ کھیل کود کی طرف بہت کم رغبت کرتے تھے اور والدین مرحومین کی منشا کے مطابق زیادہ رہتے تھے۔ چھوٹے بچوں کی خبر گیری میں والدہ مرحومہ کی بہت زیادہ امداد کرتے تھے۔ میں جب کبھی غفلت دیکر کھیلنے کے لیے نکل جاتا تھا تو وہی تلاش کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے اور وہ گوشمالی کرتے ہوئے لاکر والد صاحب کے سامنے پیش کر دیتے تھے اور پھر مار پڑتی تھی۔ الحاصل آٹھ برس اس طرح وطن میں قیام رہا اور اس میں پانچویں سیپارے تک والدہ مرحومہ سے اور پانچویں سے آخیر تک والد مرحوم سے قرآن شریف ناظرہ پڑھنا ہوا۔ اس کے بعد آمد نامہ، دستور الصبیان، گلستاں کا کچھ حصّہ مکان پر پڑھنا ہوا۔ اور اسکول میں دوئم درجہ تک پڑھنا ہوا۔ اس وقت اسکول

میں فنون اور کتب بہت زیادہ تھیں، تمام اقسام حساب وجبرو مقابلہ تک، مساحت اور اقلیدس مقالہ اولی، تمام جغرافیہ عمومی وخصوصی، تاریخ عمومی وخصوصی، مساحت عملی (تختۂ جریب وغیرہ سے زمین ناپ کر باقاعدہ نقشہ بنانا) تحریر، املا، شکست لکھنا اور پڑھنا، اُردو کورس وغیرہ سب اس عمر میں پوری طرح یاد اور مشق کر چکا تھا اور ہر چیز میں اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ از بر بخوبی جواب دے سکتا تھا جبکہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہوا اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم اُردو مڈل پاس کر کے ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں دیوبند بھیج دیے گئے۔ بڑے بھائی صاحب پہلے سے وہاں پڑھتے تھے اور ان کی کتابیں آخری تھیں۔ جب وہ شادی ہو جانے کے بعد جانے لگے تو بھائی سید احمد صاحب بھی ان کے ساتھ کر دیے گئے۔ اب ہم مکان پر اس حیثیت سے آزاد ہو گئے کہ ہم کو ڈھونڈ کر گھروں میں سے نکال لانے اور والد صاحب کے سامنے پیش کر دینے والا کوئی نہیں رہا۔ طبیعت میں کھیل کود کا شوق تھا ہی۔ جہاں والد صاحب مرحوم نے کسی کام کو یا کسی کو بُلانے کے لیے بھیجا تو اس کو انجام دیا اور ماموں صاحب مرحوم کے مکان میں گھس گئے اور جواد حسین مرحوم کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ وہاں ہر ایک ہم سے محبت سے پیش آتا تھا اور ہماری اس مظلومیت پر کہ ہم کو کھیلنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا ہے تیلی کے بیل کی طرح دن رات لکھنے پڑھنے میں لگا رہنا پڑتا ہے، ہم سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب کو سخت کلفت پیش آئی۔ اگرچہ مارا پیٹا بھی بہت زیادہ مگر بے سود معلوم ہوا۔ دو چار دن مار پیٹ کا اثر رہا، پھر وہی کھیل کا شوق سوار ہوا۔ بالآخر والد صاحب مرحوم نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہیے اور دیوبند ہی بھیج دینا چاہیے۔ چنانچہ تین مہینہ بھائی صاحبوں کی روانگی کے گذرنے کے بعد جناب منشی

فیروز الدین صاحب بٹالوی کے ساتھ دیوبند بھیج دیا۔[۱]

اس تحریر سے چند باتیں واضح ہوئیں اور یہ وہ بنیادیں ہیں جن کا حضرت کی آئندہ زندگی پر اثر پڑا ہے۔ باوجود شوق اور میلانِ طبع کے آپ کو بچپن کے دل چسپ کھیل کود سیر و تفریح اور قصہ کہانی وغیرہ کا موقعہ کبھی نہیں ملا۔ صرف ایک کھیل گولی کا موقعہ ملا، وہ بھی اس قدر کم مدت کے لیے کہ آپ کی زندگی میں کھیل کود کا خانہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ضبطِ نفس اور خواہشات پر قابو کی مشق اور عادت اگر یہیں سے پڑ گئی ہو تو تعجب نہیں ہے۔

اسکول میں، محلے میں، قصبے میں، گاؤں میں اور خاندان میں غرض ہر جگہ بچوں کو ہمجولیوں، ہم عمروں اور ہم مذاقوں کی ایک فوج مل ہی جاتی ہے۔ کیسی کیسی دوستیاں، سیر و تفریح اور شرارتیں ہوتی ہیں۔ بعض دوستیاں عمر بھر باقی رہتی ہیں اور بعض کے اثرات زندگی بھر نمایاں رہتے ہیں۔ حضرت کے بچپن میں ایسے تعلقات اور دوستی کا کوئی خانہ نہیں رہا۔ صرف ایک ماموں زاد بھائی کے ساتھ کچھ دن کھیلنے کا موقع ملا۔ اور وہ بھی اتنا کہ نہیں کے برابر۔ کیا خبر ہے کہ والدین کی نیتوں اور مزاجوں کے زیرِ اثر تعلق مع اللہ اور پابندیٔ اوقات فی سبیل اللہ کی ابتدا، یہیں سے ہوگئی ہو۔ بچپن میں اور پھر انیسویں صدی کے بچپن میں آٹھ دس برس کی عمر تک بچوں کو اوّل تو پڑھنے کے لیے بٹھایا ہی کم جاتا تھا۔ زمینداروں اور شرفا کے گھرانوں میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ "ہمارے بچوں کو کیا نوکری کرنی ہے کہ پڑھا کر ان کی ننھی ننھی جانیں ہلکان کرائیں" اور یہ جانیں بیس پچیس برس کی عمر تک ننھی ہی ننھی رہتی تھیں اور اگر حُسنِ اتفاق سے بچے کسی مولوی صاحب، میاں جی یا گرو جی کے پاس (ماسٹر صاحب کی اصطلاح بہت بعد کی ایجاد ہے) بیٹھ بھی گئے تو، برس چھ مہینے تو ان کو عادت ڈلوانے ہی میں خرچ ہو جاتے تھے۔ اور پھر دو تین برس بعد جا کر اس قابل ہوتے تھے کہ درجہ بندی کے سلسلے میں داخل ہو سکیں مگر حضرت بارہ برس کی عمر میں پورا قرآن، گلستان تک فارسی، اُردو، جغرافیہ، تاریخ، میتھمیٹکس

---

[۱] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۳۔ منشی صاحب بٹالہ (پنجاب) کے رہنے والے فیض آباد کلکٹری میں ملازم تھے۔ فیض آباد سے ان کے وطن کا راستہ سہارنپور ہو کر جاتا ہے۔ دیوبند سہارنپور سے بالکل قریب ہے۔

الجبرا۔ اقلیدس۔ انشانگاری۔ رقعات نویسی وغیرہ کی تعلیم نہ صرف یہ کہ پوری کرچکے تھے بلکہ ہر مضمون میں امتیازی اور اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ اور مزید یہ کہ مڈل تک تعلیم پوری کرچکے تھے۔ شاید اسی تربیت اور نشو و نما کا اثر تھا کہ تمام عمر حضرت نے تعلیم، تعلّم، درس و تدریس اور مدرسہ و کتاب کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھا اور حدیث و قرآن کی خدمت ہی میں جان، جان آفریں کے سپرد کردی، اور اگر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ان تمام درسی اور تعلیمی مشاغل کے ساتھ یہ بچہ گھر کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی درجے میں اٹھائے ہوئے تھا۔ ماں اور باپ کی خدمت اور تعمیل احکام میں بھی حاضر رہتا تھا اور تھوڑی سی فراغت اور وقت مل جاتا تھا تو بکریاں چرانے لے جاتا تھا۔ تو خیال ہوتا ہے کہ زندگی بھر حضرت کی شخصیت میں تواضع، منکسر مزاجی، بے نفسی، بے غرضی اور جذبۂ خدمت کی جو صفات اور عناصر غالب رہے، یہ بچپن کی اسی معصومانہ ریاضت کا نتیجہ رہے ہوں گے۔ چند مہینے اور رہ جاتے تو اسکول کی تعلیم اور مڈل کا امتحان امتیازی شان سے پاس کرلیتے۔ مگر باپ کو تو دینی، اسلامی اور عربی تعلیم دینی مقصود تھی۔ چنانچہ تیرھواں سال شروع ہوتے ہوتے گھربار، ماں باپ، عزیز و اقارب وطن اور اہلِ وطن سب کو چھوڑکر دیوبند سدھار گئے۔

دیوبند میں طالب علمی ۱۸۹۱ء تا ۱۸۹۷ء

ماہ صفر کے پہلے ہفتے میں حضرت دیوبند پہنچے۔ دونوں بڑے بھائی پہلے ہی حضرت شیخ الہندؒ کے آستانے کے سامنے ایک مکان میں مقیم تھے۔ بڑے بھائی مولینا صدیق احمد صاحب حضرت شیخ کے خصوصی خادم اور عزیز شاگرد تھے۔ حضرت بھی بھائیوں ہی کے ساتھ حضرت شیخ کے سایۂ عاطفت میں سکونت پذیر ہوئے۔ عربی کی تعلیم علماء، صلحاء اور اولیاء اللہ کے مجمع میں حضرت شیخ الہندؒ مولینا محمود حسن صاحب اور مولینا خلیل احمد صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہوئی[1] ایک نوعمر لڑکا اچانک ماں باپ،

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۴

گھر بار اور وطن سے جدا ہو کر کالے کوسوں دور چلا جائے تو اس کی دل شکستگی اور پژمردگی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ حضرت تو صرف بارہ برس کے تھے اور پیدائشی کمزوری، طبعی خاموشی اور دُبلے پتلے ہوتے کی وجہ سے اپنی اصل عمر سے دو ایک برس کم ہی لگتے تھے۔ اُس پر مزید یہ کہ دونوں بھائی سخت گیر اور سخت مزاج تھے چنانچہ "دیوبند پہنچنے کے بعد وہ ضعیف سی کھیل کود کی آزادی جو کہ مکان پر تھی، وہ بھی جاتی رہی، دونوں بھائی صاحبان اور بالخصوص بڑے بھائی صاحب سب سے زیادہ سخت تھے، خوب مارا کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم ممکن ہے کہ ان کو مارتے وقت یا بعد میں کچھ شفقت آجاتی ہو مگر یہاں تو وہ بھی نہ تھی۔ بہرحال اس تقیید اور نگرانی نے مجھ میں علمی شغف زیادہ سے زیادہ اور لہو و لعاب کا شغف کم سے کم کر دیا۔ فرحمهم الله وجزاهم احسن الجزاء"[1]

ایک منحنی، کمزور، خاموش، کم آمیز، گرد و پیش سے بے خبر بچہ اتنی چھوٹی عمر میں گھر سے الگ کر کے کالے کوسوں دور بھیج دیا گیا تھا جس عمر میں بچے ایک ایک پل ماں باپ کے لاڈ پیار سے مالا مال رہتے ہیں۔ اس لیے ہر چھوٹا بڑا حضرت سے شفقت و محبت کا برتاؤ کرتا تھا اور جب اس عمر میں آپ کی قابلیت، حساب، تاریخ، جغرافیہ، اُردو، فارسی، پاکیزہ تحریر، پختہ خط، انشا پردازی، پابندی اوقات، ذمہ داری، سنجیدگی اور علمی ذوق و شوق کے جوہر کھلتے تھے تو لوگ حیران ہو جاتے تھے۔ تحریر کی پاکیزگی، حساب میں مہارت اور خط و انشاء کی پختگی کی وجہ سے عام طور پر لوگ اور پردہ نہ ہونے کی وجہ سے خاص طور پر خواتین آپ سے کتابیں پڑھوا کر سنتی تھیں، تحریریں نقل کرواتی تھیں، خطوط لکھواتی تھیں اور حساب و کتاب درج کرواتی تھیں۔ حضرت شیخ الہند کی اہلیہ مخدومہ حضرت کے ساتھ خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتی تھیں۔ اور اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتی تھیں۔

> "اگرچہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہو چکا تھا مگر جسم اس قدر دُبلا پتلا اور پستہ تھا کہ کوئی دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی عمر گیارہ سال سے زیادہ ہے اس وجہ سے مجھ پر وہاں شفقت زیادہ کی گئی۔ وہاں اس قدر

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۴

دور کے نو عمر اور چھوٹے طالب علم عموماً نہیں جاتے تھے اور چونکہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا' خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لیے اساتذہ کے یہاں خانگی خطوط اور خانگی حسابات کی خدمت اور گھروں میں جانا اور پردہ کا نہ کیا جانا وغیرہ کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ بالخصوص حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ (رحمہما اللہ) بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں۔ مستورات میں منشی مشہور ہو گیا تھا۔[1]"

دیوبند میں عربی تعلیم کی ابتدا ہوئی تو ابتدائی دو چار کتابیں بڑے بھائی مولٰنا صدیق احمد صاحب سے پڑھیں۔ مگر اس کے بعد باقی ابتدائی اور بہت سی متوسط اور اعلیٰ کتابیں حضرت شیخ الہندؒ نے بہ نفس نفیس بڑی توجہ اور شفقت کے ساتھ پڑھائیں۔ حضرت کے اساتذہ پر نظر ڈالیں تو متعدد حضرات، اکابر اس فہرست میں نظر آتے ہیں۔ مگر شروع سے آخر تک تعلیم، تربیت، نصابِ تعلیم اور کتابوں پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح طور پر نظر آتی ہے کہ آپ کی علمی تربیت اور تعلیمی ترقی شروع سے آخر تک شیخ الہندؒ کی نگرانی، توجہ اور تلمذ میں مکمل ہوئی۔ یہ اعزاز اور منصب دیوبند یا حضرت شیخ الہندؒ کے کسی اور شاگرد کو نصیب نہیں ہوا۔ اپنی خصوصیات صلاحیت اور صفات کے بارے میں ایک لفظ لکھنا اور ذکر کرنا تو دور کی بات ہے۔ اس مضمون کو سننا بھی حضرت نے عمر بھر گوارا نہیں کیا۔ اس لیے یہ تو کیسے کہتے کہ جوہر قابل کی پیشانی پر نوشتہ' تقدیر دیکھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے میری تعلیم و تربیت اپنے ہی ہاتھوں مکمل فرمائی۔ مگر نفسِ واقعہ تو کسی نہ کسی طور پر لکھنا ہی پڑا۔

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدرسِ اول تھے۔ اور ان کے پاس طلبہ کی بڑی بڑی کتابیں ہوتی تھیں۔ ابتدائی کتابیں ان کے پاس نہ ہوتی تھیں۔ اور نہ ہو سکتی تھیں مگر چونکہ حضرت رحمۃ اللہ کے حقیقی بھتیجے منشی حبیب حسن صاحب ہماری جماعت میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اُن سے بوجہ ان کی والدہ کے فوت ہو جانے اور قرابتِ قریبہ کے بہت زیادہ اُنس تھا اور اس وجہ سے بھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ہم تینوں پر بہت زیادہ شفقت تھی اور بڑے

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۴

بھائی صاحب خدمت میں غیر معمولی حاضری دیتے اور امور خدمت انجام دیتے رہتے تھے اس لیے رعایت خاصہ فرماتے رہے۔ اور مندرجہ بالا ابتدائی کتابیں بھی مجھ کو پڑھائیں اور اکثر کتابیں خارج اوقات مدرسہ میں پڑھائیں۔[1]

حضرت کا حافظہ بچپن ہی سے قوی تھا۔ ذہانت بھی حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اور اسباق اور تعلیم پر حضرت پوری طرح توجہ بھی فرماتے تھے۔ مگر اندازہ ہوتا ہے کہ جن عوامل نے سونے کو کندن بنا دیا وہ والدین مرحومین کا مکمل اہتمام، بڑے بھائیوں کی نگرانی اور تربیت اور حضرت شیخ الہندؒ کی خصوصی توجہات عالیہ اور تلمذ تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ طالبعلمی میں اس نوعمری کے دور میں حضرت نے اپنے اوقات ضائع نہیں کیے بلکہ وقت کا ہر ہر لمحہ پوری طرح حصولِ علم میں خرچ کیا۔ دینی علوم میں طلبہ کو اتنا طویل وقفہ نہیں ملتا جتنا دنیاوی تعلیم میں خرچ ہوتا ہے اور حضرت کو تو مشکل سے کل چھ ساڑھے چھ برس کا وقفہ ملا۔ اسی میں ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی، عام مطالعہ بھی کیا، استعداد بھی بہم پہنچائی اور فقہ، تفسیر اور حدیث کی آخری کتابیں بھی حرف بحرف پڑھیں اور ان تمام کامیابیوں میں بڑا درجہ کلاسوں اور اسباق میں پابندی کے ساتھ حاضری، پوری توجہ اور ذوق و شوق کے ساتھ درس کو سمجھنے اور انشراح صدر کے ساتھ مضامین کو ذہن نشین کرنے کا رہا۔ ساری محنتیں ہوں اور اسباق میں حاضری کی پابندی نہ ہو تو طالب علم کی کامیابی بڑی حد تک مشتبہ رہتی ہے۔ حضرت نے مواظبت اور اسباق کی پابندی کا خصوصی اہتمام رکھا۔ اور دورانِ درس مضامین عالیہ کو ذہن نشین کر لینے کی پوری کوشش کرتے رہے۔

"کتابوں کا پوری طرح مطالعہ کرنا، اور سبق پڑھنے کے بعد کتاب کو دیکھنا یا تکرار کرنا بہت کم ہوا۔ البتہ اس کا ہمیشہ التزام کیا کہ اسباق میں حاضری ضرور دیتا رہا۔ اور حتی الوسع مقام درس میں سبق سمجھ لینے کی پوری جد و جہد کرتا تھا۔"[2]

اور اصل واقعہ یہ تھا کہ اسباق اتنے مسلسل اور طویل تھے کہ ان کے بعد کسی مطالعہ مراجعہ اور پڑھائی کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور اسی مشکل کے حل کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سبق کے دوران ہی اس پر مکمل عبور حاصل کر لیا جائے۔ اس پابندی اور

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۶ ۔ [2] ایضاً

جد و جہد نیز اسباق پر مکمل توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو تعلیمی ترقی سالوں میں حاصل ہوتی ہے وہ حضرت نے مہینوں میں حاصل کرلی اور اساتذہ و اکابر کی خصوصی توجہات کا مرکز بن گئے۔ اسلامی دینی درسگاہوں کے اساتذہ ویسے بھی طلباء عزیز کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں، پھر وہ زمانہ تو تعلیمی اعتبار سے خیر القرون کا زمانہ تھا۔ اساتذہ و اکابر بھی ایسے تھے جو کتابوں سے زیادہ طالب علم کو روحانی فیض اور قلبی توجہ سے مالا مال کرتے تھے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے "آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند" اور طلباء بھی ایسے تھے کہ اپنے اساتذہ کی خدمت، ادب، احترام اور اکتسابِ فیض کے لیے جان قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے۔ ہر چند کہ حضرت نے اپنی اس تعلیمی محنت اور اکابر کی خصوصی توجہات کا تذکرہ معمولی الفاظ میں کیا ہے۔

> "اور اس طرح بہت سے اسباق خارج اوقات میں عصر بعد، مغرب بعد، عشا بعد ہوتے رہے جن کی وجہ سے مجھ کو جلد ترقی کرنے کا موقعہ ملتا رہا اور اپنے ہم سبقوں کو نیچے درجات میں چھوڑ کر اگلی جماعتوں اور کتابوں میں شمول کا امتیاز حاصل کیا اور اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذۂ کرام نے بھی اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں"[1]

مگر اصحابِ علم خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایام طالب علمی میں اور ایسی نو عمری میں حضرت نے کس طرح اپنی زندگی اور شب و روز علم کے لیے وقف کیے ہوں گے۔

یہ تفصیل تو ایامِ تعلیم کے عام دنوں میں پڑھنے، مطالعہ کرنے اور مضامین کو سمجھنے کے بارے میں تھی، مگر امتحانات کے زمانے میں دن و رات کا ایک گھنٹہ بھی پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے علاوہ کسی دوسرے شغلہ میں خرچ نہیں ہوتا تھا۔ سوتا، لیٹنا اور آرام کرنا تو حضرت نے بڑھاپے میں بھی کبھی نہ جانا، وہ تو جوانی بلکہ لڑکپن کا زمانہ تھا۔ پورے چوبیس چوبیس گھنٹے مطالعہ، پڑھنے اور یاد کرنے میں خرچ فرماتے تھے۔ عربی مدارس میں طلباء کا مقصد چونکہ علم حاصل کرنا ہوتا ہے اور امتحان میں کامیابی کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اس لیے ان میں اہم موضوعات (IMPORTANT) اور کامیابی کے لیے

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۵

خاص عنوانات یا مفاتیح (KEYS) کی کمزوریاں اور غلطیاں پوری طرح سرایت نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت امتحان سے پہلے کئی کئی مرتبہ کتابیں اور نصاب پر پوری طرح عبور اور قابو حاصل کر لیتے تھے۔ اور یہ اسی طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ دن رات سوائے پڑھنے کے اور کوئی کام نہ کیا جائے۔

"میں نے ایام امتحان میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو کتاب ابتدا سے آخیر تک مطالعہ کرتا تھا۔ اور تمام رات میں صرف ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم سوتا تھا۔ نیند کو دور کرنے کے لیے نمکین چائے کا انتظام کرتا تھا۔ جب بھی نیند غالب آتی تھی اس چائے کو پیتا تھا جس سے گھنٹہ دو گھنٹہ کو نیند جاتی رہتی تھی۔"[1]

اس بے مثال محنت، توجہ اور جد و جہد کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت امتحانات میں اعلیٰ درجہ میں کامیابی حاصل فرماتے رہے۔ ہر چند کہ اس کامیابی کا مقابلہ موجودہ طریقوں کے امتحانات میں کامیابی سے کیا جانا پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ تاہم فہم عام کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امتحانات میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن سے پاس ہوتے رہے۔ اور پوری تعلیمی زندگی میں (TOPPER) رہے۔ اگرچہ اصل اہمیت اس علمی شغف اور ذوق ہی کی تھی جس کی بنیاد پر طالب علمانہ زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی غیر علمی دل چسپی میں صرف نہیں ہوا۔ تاہم مندرجہ ذیل الفاظ حضرت کے علمی مزاج کی طرف ایک اشارہ ضرور کرتے ہیں۔

"اس طریقہ پر عمل کرنے کی وجہ سے مجھ کو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد بحمد اللہ کسی کتاب میں فیل ہونے کی نوبت نہیں آئی بلکہ اپنی جماعت میں اکثر امتیازی نمبر حاصل کرتا رہا۔"[2]

خیال رہے کہ تذکرہ کسی پختہ کار بڑی عمر کے طالب علم کی مسلسل محنت، انتھک جد و جہد اور علمی شغف، کا نہیں بلکہ ایک نو عمر پندرہ سولہ برس کے ناتجربہ کار لڑکے کا ہے جو صرف اپنے حوصلے، شوق اور علمی میلان کی بدولت ہر امتحان میں اعلیٰ سے اعلیٰ نمبروں سے پاس

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۶۔ [2] ایضاً، ص ۴۷

ہوتا تھا۔ کامیابی کے نمبر اور پاس ہونے کا معیار بھی قابلِ غور ہے۔

"اگر کوئی طالب علم غیر معمولی استعداد والا ہوتا تھا تو اس کو ممتحن بیس سے زائد نمبر بھی دیتا تھا جو کہ اعلیٰ درجہ کے نمبروں میں سے سمجھا جاتا تھا۔ بحمد اللہ اس زمانے میں اکیس اکیس، بائیس بائیس اور تیئس تیئس بھی متعدد کتابوں میں نمبر آتے رہے۔ اس کے بعد اراکین مدرسہ نے امتحانی اور تعلیمی ضرورتوں کی بنا پر اس قاعدہ میں تبدیلی کی اور ادنیٰ درجہ کا کامیابی کا چالیس اور متوسط درجہ پینتالیس اور اول درجہ پچاس مقرر کیا۔ اس تغیر کے بعد امتحانات میں اکیاون، باون، ترپن اور صدرا میں پچھتر نمبر حاصل کیے"[۱]

عام حالات میں طالب علم کو الگ الگ مضامین سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کسی کو ادب اور لغت سے تعلق ہوتا ہے۔ کسی کی طبیعت فقہ کی جانب مائل ہوتی ہے۔ کوئی منطق و فلسفہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہر عالم اپنے میلان کے مطابق مخصوص مضامین میں ترقی کرتا ہے۔ حضرتؒ نے بھی دورِ طالب علمی میں اپنے رجحانات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس تفصیل سے حضرت کے اس مخصوص علمی رجحان کا اندازہ ہوتا ہے جس میں آپ کی عمر گذری ہے:

"ابتدا میں مجھ کو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا۔ پھر علم ادب سے شغف ہوگیا۔ مقامات حریری، اور دیوانِ متنبی اور سبعہ معلقہ کے قصائد کے قصائد اور عبارتیں کی عبارتیں ازبر یاد ہوگئی تھیں۔ پھر علمِ حدیث سے شغف ہوگیا اور پہلے دونوں شغفوں میں کمی آگئی اور علمِ حدیث کے انہماک ہی میں دور طالب علمی ختم ہوگیا"۔[۲]

انما الاعمال بالخواتیم، چنانچہ ساری زندگی حضرت نے علم حدیث پڑھنے پڑھانے اور اس خدمت میں بسر کی۔ مشاغل دوسرے بھی تھے۔ اوقات اور کاموں میں بھی خرچ ہوتے تھے مگر حق یہ ہے کہ اپنے قصد، ارادے اور مزاج کے اعتبار سے حضرت اپنی بیاسی برس کی عمر کا ایک ایک لمحہ صرف آقائے نامدار صلی اللہ وسلم کی سنت اور شریعت ہی خدمت کی کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کی۔

---

[۱] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۷۔ [۲] ایضاً، ص ۴۸

بارہ برس کی عمر میں دیوبند پہنچے تھے اور چھ ساڑھے چھ برس تک وہاں تعلیم حاصل کرکے کل ۱۹ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوکر سندِ فضیلت حاصل کی۔ اس مختصر سی مدت اور چھوٹی سی عمر میں کیا پڑھا، کتنی تعلیم ہوئی اور کیا حاصل کیا، یہ بہت وضاحت اور صراحت کے ساتھ اپنی سوانح میں بیان فرمایا ہے:

"غرض یہ کہ ان مختلف علوم وفنون کی یہ سرسٹھ کتابیں جو سترہ فنون سے متعلق ہیں، ساڑھے چھ برس کی مدت میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا"[1]

لیجیے رسمی اور ظاہری تعلیم اور سبق و کتاب اور درسگاہ و مدرسہ کی پوری زندگی قریب قریب ختم ہوگئی۔ پڑھنے میں کتنی محنت کی۔ حصولِ علم کے لیے کیسے کیسے رات دن ایک کیے۔ کتابیں اور اسباق کس کس طرح ازبریاد کیے، اس کا مشتے نمونہ از خروارے تو مذکورہ بالا سطور میں گذر ہی چکا ہے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیجیے کہ طالب علمی اور ایسی سخت طالب علمی میں راحت و آرام، کھانے پینے، دلداری وحوصلہ افزائی کے کیا کیا سامان مہیا تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی عشرت اور بادشاہت ایک طالب علم کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ مسلسل تین مہینہ، چھ مہینہ یا بہت زیادہ ہوا تو نو دس ماہ کے بعد گھر جاتا ہے۔ وہ خوشی، مسرت اور دولت بتلانے کی چیز نہیں ہے۔ جن کو یہ بادشاہت نصیب ہوتی ہے وہی اس کا مزہ جان سکتے ہیں۔ دوسری مسرت آمیز نعمت ایک طالب علم کے لیے فرصت کے اوقات میں اپنے ذرائع کے مطابق کھانے پینے ناشتے یا چائے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے جس سے تھوڑی دیر کے لیے غربت ومجبوری کا غم غلط ہوتا ہے اور طالب علم پڑھنے کے لیے تازہ دم ہو جاتا ہے۔ حضرت کی طالب علمی میں ان خوشیوں اور مسرتوں کا کتنا گذر تھا، یہ بھی ملاحظہ ہو۔

"اگرچہ میرے اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے مصارف دارالعلوم دیوبند تحمل کرتا تھا مگر والد صاحب مرحوم اخراجاتِ زائدہ کے لیے ایک ایک روپیہ ماہوار ضرور بھیجا کرتے تھے اسی طرح ایامِ تعطیل سالانہ میں دیوبند سے وطن تک آمد و رفت کا خرچ بھی تحمل کرنا پڑتا تھا اور اس وجہ سے دوسرے

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۶

سال مکان جانا ہوتا تھا۔[1]

ہر چند کہ ایک روپیہ ماہوار کی قیمت آج سے سو سال پہلے بہت ہوتی ہوگی۔ پچاس سال پہلے کی بات تو راقم الحروف کو یاد ہے۔ دیوبند میں اعلیٰ درجے کا دودھ ایک آنے کا سیر بھر ملتا تھا۔ چار آنے کی سیر بھر بہترین شکر ملتی تھی۔ ایک پیسے کی دو پڑیاں چائے کی ملتی تھیں جو کئی وقت کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ فیض آباد تک کا ریل کا کرایہ ڈھائی روپیہ تھا۔ اس سے بھی پچاس سال پہلے کی قیمتیں اس سے آدھی تو یقیناً رہی ہوں گی۔ تاہم ایک طالبعلم کی زندگی میں مختلف قسم کی ضروریات کے لیے ایک روپیہ کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ راقم الحروف نے کئی بار حضرت سے سُنا کہ "ہمارے میاں ہم کو ایک روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے اور اسی میں ہم کو سارے خرچ پورے کرنے ہوتے تھے۔" اور اس سارے خرچ میں دھوبی، نائی، موچی، درزی، کپڑے، جوتے، چارپائی، چٹائی، بستر، لحاف، گدّے، چائے، ناشتہ، دوا علاج، کبھی کبھی ایک آدھ پیسے کی کوئی مٹھائی کھٹائی، چراغ بتی، ایک دو برتن، ڈاکیہ غرض کبھی کچھ شامل ہوگا۔ ڈاکیہ کا بھی ایک مستقل اور ماہوار خرچ تھا۔ راقم الحروف کے زمانے میں ہر ماہ منی آرڈر پر ایک آنہ ڈاکیہ کا مقرر تھا۔ حضرت کے وقت میں دو پیسے تو ضرور رہی رہا ہوگا۔ اس موقع پر ایک دل چسپ جملۂ معترضہ نوکِ قلم پر آ رہا ہے۔ دیوبند سے واپسی کے عرصۂ دراز کے بعد راقم ایک بار مادرِ علمی کی زیارت کے لیے دیوبند حاضر ہوا تو ایک ضعیف العمر شخص نے راستے میں سلام و مصافحہ کیا اور فرمایا کہ آپ کا منی آرڈر ہے۔ پہلے تو میں چونک گیا۔ دوسرے ہی لمحہ پہچان گیا کہ مدرسے میں ہمارے حلقے کا ہر دل عزیز پرانا ڈاکیہ ہے۔ وہی لہجہ، وہی زبان اور وہی آواز کانوں میں آئی تو خود بخود اس کے فوراً بعد والا جملہ جو ہمیشہ ناگفتہ رہا کرتا تھا سمجھ میں آگیا۔ یہ ڈاکیہ اب ریٹائر ہو کر تنگدستی کی زندگی گذار رہا تھا اور دیوبند کے طلبائے قدیم جو آتے رہتے تھے ان سے حسنِ طلب کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک روپیہ کی قیمت اس وقت زیادہ ہی رہی ہوگی مگر اخراجات اس سے بہت زیادہ تھے۔ اور یہ جو پچھلی سطور میں حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے مصارف دارالعلوم دیوبند تحمل کرتا تھا، اس کا مطلب کوئی تعلیمی وظیفہ یا قابلیت کی بنیاد پر کوئی ماہوار امداد نہیں بلکہ صرف دو وقت کا کھانا ہے۔

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۳۱

اب سے کچھ عرصہ پہلے مدارس عربیہ کا قاعدہ تھا کہ ان کے طلباء شہر کے اہل خیر کے یہاں کھانا کھاتے تھے اور وہ لوگ پورے اعزاز و تکریم کے ساتھ طلباء کی خدمت کرتے تھے اور اس کو اپنے لیے فخر و مباہات گردانتے تھے۔ بیشتر اکابر و اسلاف اہل علم نے اسی طرح اپنی طالب علمی کے ایام بسر کیے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور دوسرے اہل علم کے لیے کم و بیش اسی قسم کے انتظامات تھے۔ حضرت کے لیے بھی مدرسہ دار العلوم سے اسی طور پر کھانا مقرر تھا۔

"ہم تینوں بھائیوں کا بھی اُس زمانے میں دار العلوم کی طرف سے کھانا مقرر کیا گیا، چنانچہ میرا کھانا حضرت مولانا حافظ احمد صاحب خلف الصدق مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں اور بڑے بھائی صاحب کا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اور بھائی سید احمد صاحب کا دوسری جگہ مقرر ہوا۔ جب تک میں دیوبند میں رہا تقریباً تمام مدتِ اقامت میں میرا کھانا حضرت حافظ صاحب موصوف ہی کے در دولت پر رہا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء"[1]

وہ زمانہ مدرسہ دیوبند کے ابتدائی دور کا تھا۔ نہ دار الاقامہ کا انتظام تھا، نہ مطبخ تھا، نہ بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ چند گوشہ نشین اہلِ درد اور اہل اللہ جمع ہو گئے تھے اور مسجدوں اور گھروں پر اسباق و تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ مدرسے کے طلباء کی پہلی جماعت جو فارغ التحصیل ہوئی تھی، وہی اس وقت مدرسین اور مہتمم تھے، خود حضرت شیخ الہندؒ جو مدرس اول اور شیخ الحدیث تھے، وہ مدرسہ دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ حضرت کی تحریر سے اس وقت کے مدرسے کا نقشہ سامنے آجاتا ہے:

"میں جب دار العلوم میں داخل ہوا تو اہتمام جناب حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد جناب منشی فضلِ حق صاحب مرحوم مہتمم مقرر کیے گئے اور حضرت حاجی صاحب مذکور الصدر بمنزلہ صدر مہتمم و رکن

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۰

مجلسِ شوریٰ ان کے نگہبان ہو گئے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد مولینا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مقرر ہوئے۔ اور پھر بعض وقائع کی بنا پر غالباً ۱۳۱۳ھ میں مولینا الحافظ احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولینا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ مہتمم مقرر ہوئے اور تاحیات یعنی ۱۳۴۷ھ تک عہدۂ اہتمام پر رونق افروز رہے۔ ان کے زمانہ اہتمام میں دارالعلوم نے بہت زیادہ ترقی کی۔"[1]

دیوبند کی طالب علمی کے حالات کافی تفصیل کے ساتھ سامنے آ گئے۔ اس سے زیادہ تفاصیل بتلانے والے تقریباً سبھی لوگ اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ البتہ چلتے چلاتے ان اساتذہ کی بھی فہرست ملاحظہ فرمالیں جن سے حضرت نے پڑھا ہے اور اکتسابِ فیض کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مڈل اسکول کی تعلیم کے اساتذہ کا کوئی حال نہیں معلوم ہو سکا مگر قیاس ہے کہ اس کا زیادہ تر حصہ آپ کے والد صاحب مرحوم نے پڑھایا ہوگا اس لیے کہ وہی اس اسکول کے صدر مدرس تھے جہاں حضرت نے مڈل اسکول کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) والد مرحوم مولوی شاہ حبیب اللہ صاحب اور والدۂ ماجدہ — قاعدہ بغدادی۔ قرآنِ پاک۔ اردو۔ فارسی۔ حمد باری۔ آمدنامہ۔ دستور الصبیان۔ گلستاں۔ حساب۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ الجبرا وغیرہ

(۲) حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ — دستور المبتدی۔ زرادی۔ زنجانی۔ مراح الارواح۔ قال اقول۔ مرقات۔ تہذیب۔ شرح تہذیب۔ قطبی تصدیقات۔ میر قطبی۔ مفید الطالبین۔ نفحۃ الیمن۔ مطول۔ ہدایہ اخیرین۔ ترمذی شریف۔ بخاری شریف۔ ابوداؤد۔ تفسیر بیضاوی۔ نخبۃ الفکر۔ شرح عقائد نسفی۔ حاشیہ خیالی۔ موطا امام مالک۔ موطا امام محمدؒ

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۴۸

(۳) مولینا ذوالفقار علی صاحبؒ (والد ماجد شیخ الہند)	فصول اکبری
(۴) مولینا عبد العلی صاحبؒ مدرس دوم دار العلوم	مسلم شریف۔ نسائی شریف۔ ابن ماجہ۔ سبعہ معلقہ حمد اللہ۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔ توضیح تلویح۔ تصریح۔
(۵) مولینا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہانپوری مدرس دار العلوم دیوبند	تلخیص المفتاح
(۶) مولینا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دار العلوم دیوبند	پنج گنج۔ صرف میر۔ نحو میر۔ مختصر معانی۔ مسلم العلوم ملا حسن۔ جلالین شریف۔ ہدایہ اولین۔
(۷) مولینا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دار العلوم	شرح جامی بحث فعلی۔ کافیہ۔ ہدایۃ النحو۔ منیۃ المصلی۔ کنز الدقائق۔ شرح وقایہ۔ شرح مائۃ عامل۔ اصول الشاشی۔
(۸) مولینا غلام رسول صاحب بغوی مدرس دار العلوم	نور الانوار۔ حسامی۔ قاضی مبارک۔ شمائل ترمذی۔
(۹) مولینا منفعت علی صاحب	میر زاہد رسالہ۔ میر زاہد۔ ملا جلال۔ خلاصۃ الحساب۔ رشیدیہ۔ سراجی۔
(۱۰) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم	شرح ملا جامی بحث اسم۔
(۱۱) مولینا حبیب الرحمٰن صاحب	مقامات حریری۔ دیوانِ متبنّی۔
(۱۲) بڑے بھائی صاحب مرحوم	میزان الصرف۔ ایساغوجی۔

اس فہرست میں دو اسماء گرامی اور ہیں جن سے حضرت نے اکتساب علم و انوار و برکات حاصل کیے ہیں مگر ان کا تعلق حضرت کے قیامِ مدینہ طیبہ سے ہے اور اسی باب میں ان کا تذکرہ مناسب رہے گا۔ آخر کار طالب علمی کا مختصر سا زمانہ نہایت محنت اور انتھک جدوجہد کے ساتھ گذار کر اعلیٰ درجہ کی کامیابیاں حاصل کر کے اور اساتذہ خصوصاً

لہ نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۶

حضرت شیخ الہندؒ کی دعاؤں سے مالا مال ہو کر اٹھارہ اُنیس برس کا نوجوان حسین احمد سرکار دو عالمؐ کے قدموں میں بیٹھ کر درسِ قرآن و حدیث دینے کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوا۔ عظیم ترین استاذ اپنے عزیز ترین شاگرد کو وداع کرنے کے لیے کم و بیش دو میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے اسٹیشن تشریف لائے اور رخصت کرتے ہوئے آخری لمحات میں قرآن، حدیث اور دین و شریعت کی تبلیغ، تدریس اور نشر و اشاعت میں زندگی وقف کر دینے کی ہدایت فرمائی۔ استاذ کا یہ شفقت آمیز برتاؤ شاگرد کے لیے بڑے شرف، اعزاز اور فخر و مباہات کی بات تھی۔

"اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ سرہ العزیز بھی ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستے میں پُر زور طریقے سے ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا، چاہے ایک ہی دو طالب علم ہوں۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہو گیا تھا۔"[1]

یہاں پر دیوبند کی طالب علمی کا دور ختم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ بحیثیت طالب علم کے دیوبند کا قیام بھی منقطع ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت کی طالب علمی کے دو مختصر سے دور اور بھی ہیں جو آیندہ صفحات میں آرہے ہیں۔

شادی خانہ آبادی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی چار شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی ۱۳۱۲ھ میں ہوئی، جب حضرت کی عمر کل سولہ برس کی تھی اور دیوبند کی طالب علمی کو چار سال گذر چکے تھے تاہم شادی کے وقت آپ دیوبند ہی میں بسلسلۂ حصولِ تعلیم مقیم تھے۔ فیض آباد اور اعظم گڑھ کی عین سرحد پر شاہراہ عام سے ایک یا دو فرلانگ کی دوری پر شرفا کا ایک گاؤں قتال پور

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۵۶

ہے۔ وہاں پر شیخ کفایت اللہ صاحب (مرحوم) صاحب ثروت و مقتدرت بزرگ تھے۔ اودھ میں بلرام پور ایک ریاست تھی۔ اس زمانے کی ریاستیں ایک چھوٹا سا ملک شمار ہوتی تھیں۔ ان کے سربراہوں کو بڑی رعایتیں، اختیارات اور اقتدار حاصل ہوتا تھا۔ سپاہی، پیادے، کارندے، چوکیدار، رکابدار، منصرم وغیرہ کی ایک فوج ریاستوں میں موجود رہتی تھی اور لاتعداد ہتھیار اور اسلحہ رکھنے کی آزادی ہوتی تھی۔ ان میں بلرام پور بھی ایک بڑی ریاست تھی۔ اس کے گدّی نشین راجہ کہلاتے تھے اور ان کو سات خون معاف تھے۔ شیخ صاحب موصوف اسی ریاست میں دیوان اور معتمد کے عہدے پر متمکن تھے اور ان کا زیادہ تر قیام اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں بلرام پور ہاؤس میں رہتا تھا۔ بہن اور بہنوئی کے انتقال کے بعد شیخ صاحب نے اپنی بھانجی کو گود لے لیا تھا اور بڑے لاڈ پیار سے بچّی کی پرورش کی تھی۔ انہی صاحبزادی صاحبہ سے حضرت کی پہلی شادی ہوئی تھی اور برات بڑے طمطراق کے ساتھ ٹانڈے سے قنال پور گئی تھی۔

لکھنؤ میں اس وقت جھوائی ٹولہ کے حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم کا بڑا نام اور شہرہ تھا اور آپ کا مطب مرجع عوام و خواص تھا۔ شیخ صاحب موصوف نے اپنے داماد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حکیم صاحب کی خدمت میں رکھ کر طب پڑھانی چاہی۔ مگر حضرت کے والد ماجدؒ نے یہ تجویز منظور نہ کی اور فرمایا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد گدھے پر سوار کراؤں۔ اس کو وقت کے مشہور اکابر علما کرام کی خدمت میں رکھ کر علومِ دینیہ کی حدیث کی قرآن کی فقہ کی اور علم ادب کی تعلیم دے دی گئی ہے، اس سے بڑھ کر کون سی تعلیم ہو سکتی ہے۔ حضرت کے سفرِ مدینہ کے وقت شیخ صاحب نے بچّی کے لے جانے پر کچھ اعتراض کیا۔ مگر حضرت کے والد ماجد کے فیصلے کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ اِن اہلیہ کی وفات ۱۳۲۶ھ میں مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ انھوں نے ایک بچّی زہرا مرحومہ جو ۱۳۲۳ھ میں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئی تھی، چھوڑی۔ وہ والدہ کے انتقال کے بعد چودہ برس کی ہو کر ۱۳۳۷ھ میں دمشق میں اللہ کو پیاری ہوئی۔ ان سے ایک بچّی پہلے بھی پیدا ہو کر مدینہ طیبہ میں صغر سنی میں ذخیرۂ آخرت ہو چکی تھی۔ جعلہما اللہ ذخراً و اجراً و رحمہما اللہ

بیعت و ارادت

دیوبند سے تعلیمی فراغت کے بعد حضرت کے والد ماجدؒ کا ارشاد ہوا کہ کسی مرشدِ کامل سے بیعت و ارادت کا تعلق ہو جائے۔ آپ کی خواہش یہ تھی کہ تینوں بڑے صاحبزادے حضرت گنج مراد آبادیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیں۔ اس کے لیے زبانی بھی اپنی خواہش کا اظہار فرماتے رہے اور تعطیلات میں دیوبند سے واپسی پر تینوں صاحبان کو گنج مراد آبادؒ کی حاضری سے حکماً مشرف کراتے رہے[1]۔ بڑے صاحبزادے مولانا صدیق احمد صاحب نے جب حضرت گنگوہی سے بیعت ہونے کی اجازت چاہی تو والد ماجدؒ نے اپنے ہی پیر و مرشد سے بیعت ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ باپ بیٹے میں عرصہ تک اس بارے میں سوال و جواب اور خط و کتابت ہوتی رہی۔ آخر کار اجازت دے دی اور مولانا صدیق احمد صاحب حضرت گنگوہی سے بیعت ہو گئے[2]۔ والد ماجد کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی مولانا صدیق احمد صاحب سے ارشاد فرمایا کہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو حضرت گنگوہی کی خدمت میں لے جاؤ اور بیعت کرا دو اب یہ تعلیم سے فارغ ہو کر جا رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بدعتی پیر کے معتقد ہو کر اس سے وابستہ ہو جائیں[3]۔ حضرت رحمۃ اللہ پہلے ہی ذہنی، قلبی، روحانی اور علمی طور پر حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ نہ کسی کے لیے دل میں جگہ تھی اور نہ کسی سے تعلق منظور تھا۔ بڑے بھائی نے جب حضرت گنگوہی سے بیعت ہونے کے لیے فرمایا تو برجستہ جواب دیا کہ "میں تو حضرت شیخ الہندؒ ہی سے بیعت ہوں گا" اس لیے کہ علم، روحانیت، اخلاقِ عالیہ، شرافت، مروت، عزم و استقلال، اخلاص و للّٰہیت، بے نفسی و بے غرضی، جرات و حمیت، عزیمت و شہامت میں اُن کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

"واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ ایامِ طالبِ علمی میں بارہا حاضری کی نوبت آ چکی تھی

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۷۰۔ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

مگر حسنِ عقیدت اور محبت کا تعلق حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہی سے تھا۔
بچپن سے ان کی خدمت میں رہنا ہوا تھا اور ابتدائی کتابوں سے لے کر
آخری کتابوں تک کا اکثر حصّہ انہی سے پڑھتا رہا تھا۔ مضامینِ علمیہ اور
اخلاق عالیہ اور اعمالِ صالحہ کے مشاہدات حاصل ہوئے تھے۔ حضرت
ایسے الطاف وکرم فرماتے تھے جوکہ اولاد کے لیے ہوتے ہیں۔ اس لیے
پوری وابستگی انہی سے تھی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کو بہت بڑا
عالم ضرور جانتا تھا مگر قلبی تعلق ایسا نہ تھا اور نہ طریقت کا کامل
سمجھتا تھا۔[1]

مگر بڑے بھائی نے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنے تلامذہ، متعلقین، معتقدین اور
مقربین کی ہر طرح تعلیم و تربیت کرتے ہیں۔ مس خام کو کندن اور ذرّے کو آفتاب بنادیتے
ہیں۔ نظرِ فیضِ اثر سے خاک کو کیمیا بنادیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر مرید نہیں کرتے۔ میں
نے خود اپنے لیے بہت کوشش کی مگر قبول نہیں فرمایا اور حضرت گنگوہیؒ کے دامن سے
وابستہ ہونے کا حکم دیا۔ "تم دونوں کے لیے بھی اُن کا یہی ارشاد ہے۔"[2]

حضرت شیخ الہندؒ کے انکار کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہی اور پھر حکم صادر ہوا
تو بالکل ہی مجبوری ہوگئی اور "بادلِ ناخواستہ ہم دونوں وہاں (گنگوہ) حاضر ہوئے"
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی (مرحوم) نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ مولوی صدیق احمد
صاحب نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں مولوی سید احمد اور مولوی حسین احمد کو بیعت
ہونے کے لیے بھیجا ہے، وہ حاضر ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ آسانی سے کسی کو داخلِ سلسلہ
نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر علماء اور فضلاء کو بیعت کرنے میں بہت پس وپیش فرماتے
تھے کہ طلبِ صادق اور مناسبتِ قلبی کے بغیر بیعت و ارادت سے کما حقہٗ فیض نہیں
پہنچتا۔ مگر ان دونوں حضرات کو بلا تامل بخندہ پیشانی بیعت کرلیا۔[3] یہ تفصیلات اس
واقعہ کی تھیں کہ بیعت کے کیا دواعی تھے۔ کیا محرکات تھے۔ حضرت کا قلبی رجحان کیا تھا۔

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۷۰۔ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً

ذہنی طور پر کس شیخ کے دامن سے وابستہ تھے، کس کے فیوض و برکات سے مالامال تھے اور کس سے مرید ہوئے۔

اس کے بعد یہ حقیقت قابلِ ملاحظہ ہے کہ ظاہری طور پر حضرت رحمۃ اللہ کی روحانی اور باطنی تربیت حضرت گنگوہیؒ کی بارگاہ میں کتنے دن تک اور کس حد تک ہوئی؟ حضرت نے اپنے اس عالی مرتبت مسترشد کو تعلیم و تربیتِ روحانی کے لیے اپنے عالی مرتبت شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے سپرد فرمایا اور خود کچھ تعلیم و تلقین نہیں فرمائی۔

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمالیا مگر کچھ تلقین نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے بیعت تو کرلیا، اب تم مکہ معظمہ جارہے ہو وہاں حضرت (حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز) موجود ہیں ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرمادیں گے۔"[1]

یہ ظاہری تعلیم و تلقین کی بات تھی۔ اس کے ساتھ ہی شیوخ کامل کی اصل تربیت توجہات عالیہ باطنیہ کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ جن کے اثرات رشتۂ عقیدت و ارادت استوار ہوتے ہی طالبینِ حق پر ظاہر ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ حضرت اگرچہ بیعت ہوتے ہی گنگوہ سے واپس آگئے مگر بیعت اور توجہاتِ شیخ کے آثار پہلے ہی دن سے نمایاں ہونے شروع ہوگئے اور ساتھ ہی رویائے صالحہ مبشرہ کی نعمت ملی۔ آپ نے یہ خواب اپنے شیخ کو لکھے تو جواب آیا کہ انشاء اللہ منزلِ مقصود کو پہنچو گے۔ حضرت نے تحریر فرمایا ہے "اگرچہ بیعت بادلِ ناخواستہ ہوئی تھی مگر اس کے آثارِ مبارکہ میں نے اپنے اندر اسی دن سے محسوس کیے۔"[2] اس کے فوراً بعد حضرت اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس سفر کا مفصل حال پیچھے گذر چکا ہے۔

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۷۰
[2] ایضاً

مدینہ طیبہ کا قیام۔ درس و تدریس اور اشغالِ روحانیہ

حجاز پہنچے تو حضرت بیس برس کے ہو گئے تھے۔ اس عمر میں آپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضری تھی۔ حضرت گنگوہی نے بیعت تو فرما لیا تھا مگر تربیتِ روحانیہ اور تزکیہ و تعلیم کے لیے اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب کے سپرد فرمایا تھا۔ حضرت جب حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے غیر معمولی توجہ اور عنایت کا معاملہ فرمایا، اشغال و اعمال کی تعلیم دی اور حکم دیا کہ روزانہ میرے پاس حاضر ہو کر ذکر و شغل اور اوراد و وظائف میں مشغولیت اختیار کرو۔ حضرت جتنے دن مکہ مکرمہ میں رہے حاجی صاحب کے دربار میں حاضری اور ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہوتے رہے اور آخر میں جب مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے تو مرشد کامل کے فیض سے مالا مال ہو چکے تھے۔ حضرت حاجی صاحب کی زندگی کے یہ آخری ایام تھے۔ اہل اللہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے اپنی نسبتِ باطنی اور دولتِ معرفت باصلاحیت طالبینِ حق کو منتقل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تامل نہیں کرتے بلکہ ایک حد تک اہلِ دل کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حضرت شیخ نے رخصتی کی اجازت چاہی تو حاجی صاحب نے باچشمِ نم اجازت دی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اور دعا میں خاص الحاح وزاری اس نکتہ پر فرمائی کہ بارِ آلٰہا ان مسافروں کو امتحان کے ہر ابتلاء سے محفوظ فرمانا۔ دعا کے بعد ضعف، کمزوری اور بیماری کے باوجود اٹھ کر کھڑے ہوئے اور سینے سے لگا کر سر پر دستِ شفقت رکھا اور فرمایا کہ جاؤ تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ حضرات ادب و احترام سے خاموش رہے تو فرمایا کہ کہو کہ ہم نے قبول کیا۔ یہ واقعہ اس حیثیت سے اہم ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ بیعت حضرت گنگوہی سے ہوئے اور تعلیم و تربیت حضرت حاجی صاحب کے دربار میں شروع ہوئی اور چند ہی دنوں کے بعد اس مقام پر فائز ہو گئے جس کے بعد ایک مسترشد خود اصلاح دارشاد کے منصب پر

فائز ہو جاتا ہے۔ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں حضرت کو اجازتِ بیعت و خلافت ہوگئی تھی۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے۔ حضرت حاجی صاحب سے ملاقات اور ان کی توجہات کا واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔

"ہم دونوں بھائی (سید احمد اور راقم الحروف) نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ہم کو بیعت تو کر لیا تھا مگر یہ فرمایا تھا کہ تلقینِ ذکر حضرت سے حاصل کر لینا۔ تو آپ نے پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو آ کر یہاں بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔"[1]

حضرت ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ کی ۲۵ تاریخ کو مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تھے، کم و بیش ایک ہفتہ حج و عمرہ کی مشغولیت، سفر اور انتظامات میں ضرور لگ گیا ہوگا۔ حج سے فارغ ہو کر ذی الحجہ کی ۲۵ کو مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس طرح حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں کل تین ہفتوں کی حاضر باشی اور اشغالِ روحانیہ کا موقع مل سکا۔ وہ بھی اس طرح کہ حضرت نے ایک دن یا ایک لمحہ بھی اکتسابِ فیض سے غفلت نہیں برتی۔ طوافِ قدوم کے فوراً بعد حاضر ہوئے اور روانگی سے چند گھنٹے پہلے رخصتی سلام عرض کیا۔ حضرت حاجی صاحب اس وقت بہت ضعیف ہو گئے تھے اور مریدین و منتسبین سے صرف صبح کو ملاقات فرماتے تھے مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ رخصت ہوئے تو خاص طور پر ظہر کے بعد شرفِ باریابی بخشا "جب قافلہ حجاج اخیر عشرہ ذی الحجہ میں مدینہ منورہ کو روانہ ہونے لگا تو خلافِ معمول بعد از ظہر ہم تینوں کو حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت نے بہت شفقت فرمائی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ ہم نے سکوت کیا تو فرمایا کہ کہو ہم نے قبول کیا۔ ہم نے حسب تلقین عمل کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ نے دعا فرمائی۔ ہم نے رخصتی مصافحہ کیا۔"[2]

تعلیم سے فراغت اور بیعت کی فضیلت کے بعد حضرت کا یہ پہلا اشتغالِ روحانی تھا جس کی ابتدا عین عالمِ نوجوانی میں حضرت حاجی صاحب کی تعلیم و تلقین سے ہوئی۔

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۹۰۔ [2] ایضاً، ص ۸۰

حضرت رحمۃ اللہ نے ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں محرم کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ طیبہ باریاب ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر کم و بیش انیس یا بیس برس کی تھی۔ اگرچہ آپ نے مدینہ طیبہ میں قیام فرمانے کا ارادہ فرمالیا تھا اور سارے انتظاماتِ معاش و معیشت اور تعلیم و تعلم کے مکمل ہو گئے تھے مگر ہجرت کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، بلکہ والدین کی خدمت اور معیت کا شرف حاصل کرنے کے لیے اور مدینہ طیبہ کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہونے کے لیے تا بہ حد امکان وہاں کے قیام کا ارادہ تھا:

"بہر حال ہم میں سے کسی نے بھی سوائے حضرت والد صاحب مرحوم کے ہجرت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ صرف قیام کا ارادہ تھا۔ مگر والد صاحب مرحوم کو اکیلا چھوڑ کر آنا نہ والدۂ ماجدہ مرحومہ کو گوارا ہوا اور نہ اور کسی کو۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ جب تک آپ زندہ ہیں ہم یہاں ہی رہیں گے۔"[۱]

مگر رہنے کے ساتھ سب سے بڑا سوال معاش اور گذر اوقات کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر عربی تعلیم حاصل کر لی جائے تو عرب ممالک میں رہنا بسنا اور اعلیٰ مناصب تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ اس قسم کی امیدیں پوری حد تک پوری نہیں ہوتیں۔ حضرت کے والد ماجد مرحوم کو بھی اس قسم کی توقعات رہی ہوں تو بعید نہیں ہے۔ مگر بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ مسبب الاسباب پر بھروسہ کر کے معاش کے اسباب خود ہی تلاش کرنے ہوں گے۔ "(والد صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ میں نے اولاد کو عربی پڑھائی ہے اس لیے وہاں پر ان کی ملازمتیں بھی بآسانی ہو جائیں گی مگر ملازمتوں کا سلسلہ تو خیالِ خام ابتدا ہی میں نکلا۔"[۲] ان حالات میں حضرتؒ نے اپنی معاشی زندگی کی ابتدا تجارت جیسے شریف اور سنتِ نبوی کے مطابق پیشے سے کی۔ اس سلسلے میں سارے بھائیوں کو حسبِ استطاعت و صلاحیت باری باری دوکان پر بیٹھنا اور دوسرے کام کرنا پڑتے تھے۔ حضرت کا کام صرف اس قدر تھا کہ اپنی باری یا ڈیوٹی کے اوقات میں دوکان پر بیٹھیں۔ کاروباری انتظامات

---

[۱] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۵۴۔ [۲] ایضاً، ص ۷۳

اور مال کی فراہمی وغیرہ سے آپ کو زیادہ تعلق نہیں تھا۔" تھوک مال کی خرید بڑے بھائی مولینا صدیق احمد صاحب مرحوم کرتے تھے۔ ان کو اس کا شوق بھی تھا اور مہارت بھی جلد حاصل ہو گئی تھی۔ دوکان پر میں اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم باری باری بیٹھتے تھے۔[1]"

تجارت اور دوکانیں تو چلتے ہی چلتے چلتی ہیں۔ برسوں دن و رات ایک کرنے پڑتے ہیں۔ عرصۂ دراز تک حوصلہ اور بے جگری کے ساتھ صبر و انتظار کے امتحانات دینے پڑتے ہیں تب کہیں جا کے کامیابی اور سرخ روئی کی شکل نظر آتی ہے۔ حضرت کا خاندان بڑا تھا۔ اخراجات بھی کثیر تھے اس لیے کوئی اضافی آمدنی بھی ضروری تھی۔ صرف تجارت کی ابتدائی سبک خرامی پر گزر اوقات مشکل تھی چنانچہ آپ نے مدینہ طیبہ کے کتب خانوں میں نادر کتابوں کے نقل کرنے کا مشغلہ بھی شروع کیا۔ حضرت کا خط نہایت پاکیزہ تھا، اردو بھی بہت خوبصورت لکھتے تھے اور عربی تحریر بھی بہت دیدہ زیب ہوتی تھی۔ لکھتے تو نب اور فاونٹن پین ہی سے تھے مگر ایک ایک حرف چن چن کر ایسا ٹانک دیتے تھے جیسے کسی خطاط نے کلک سے نسخ اور نستعلیق لکھی ہو۔ مدینہ طیبہ کے دو کتب خانے مکتبۂ شیخ الاسلام عارف حکمت اور مکتبہ محمودیہ بڑے قدیم اور مکمل کتب خانے ابھی کچھ دنوں پہلے تک قائم تھے۔ کتابوں کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر بہت سے مقامی اور ممالک اسلامیہ کے غیر مقامی لوگ بعض کتابیں اجرت پر نقل کرواتے تھے۔ چنانچہ کچھ دنوں تک یہ پاکیزہ اور علمی مشغلہ بھی حضرت کے لیے منجملہ اسباب ظاہری شمار ہوا۔

> "تھوڑے عرصے میں تجربے سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ (تجارت) سے اگرچہ آمدنی ہے مگر کرایہ دوکان اور دیگر مصارف مہیا کرنے کے بعد آمدنی اتنی نہیں ہو سکتی جو کہ روزمرہ کے اخراجات کو کافی ہو سکے۔ اس لیے میں نے سلسلۂ کتابت علی الاجرت شروع کر دیا۔[2]"

دربارِ نبی ﷺ سے اکتسابِ علومِ نبویہ

تجارت اور کتابت تو وسائل اور اسباب معاش کے فریضہ کے طور پر اختیار کیے تھے

---

[1] و [2] نقش حیات، ج ۱، ص ۵۶

لیکن ابھی علم کی پیاس باقی تھی بلکہ کتاب و حکمت کے چشمۂ آب حیات پر پہنچ کر تشنگی اور بھی تیز ہوگئی تھی اس لیے روحانی اشغال و ریاضت و عبادت اور درس و تدریس کے ساتھ مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اس وقت مدینہ طیبہ میں ایک مشہور اُستاذِ ادب مولانا عبدالجلیل برادہ صاحب موجود تھے۔ حضرت نے ان سے ادب عربی کی کچھ کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ اسباب معاش کی مصروفیتوں، عبادت و ریاضت میں انہماک اور درس و تدریس کے مشاغل کے ساتھ ساتھ تعلیم و تعلّم کے لیے بھی وقت نکال لینا معمولی سطح کے انسان کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔

"باقی اوقات میں مشاغلِ سلوک اور درس و تدریس کا سلسلہ میں نے جاری کر لیا تھا۔ نیز چونکہ ادبیات میں بعض کتابیں باقی رہ گئی تھیں اس لیے مدینہ منورہ کے مشہور اور معمر ادیب الشیخ آفندی عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شام کو کچھ ادب کی کتابیں ہم تینوں بھائی پڑھتے تھے۔"[1]

مدینہ طیبہ میں حضرت کی طالب علمی کا یہ ایک ظاہری رُخ تھا۔ دوسرا رُخ حضور اکرم صلی اللہ و سلم سے باطنی اور روحانی اکتساب علم کا تھا جس میں حضرتؒ نے ذاتِ اقدس صلی اللہ و سلم سے براہِ راست تعلیم حاصل کی۔ یہ امر علمائے اہلِ سنّت والجماعت کے نزدیک مسلّم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ و سلم اپنے جسدِ مبارک کے ساتھ بقیدِ حیات اور برقرار ہیں۔ بہت سے علمائے حق نے اس امر کی تائید بھی کی ہے کہ حق تعالیٰ کے برگزیدہ اور مقرب نفوسِ قدسیہ کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عالمِ بیداری میں آپؐ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ بہر حال اتنی بات تو مسلّم ہے کہ ایک اُمّتی کے لیے ذاتِ اقدس سے اکتسابِ فیضان ہر وقت ممکن ہے۔ دربارِ نبوی میں حاضری کے وقت ایک عامی، عاصی، جاہل اور غافل مسلمان بھی غیر معمولی فیوض و برکات سے مشرف ہوتا ہے جیسے جیسے وہ دیارِ نبویؐ کے قریب ہوتا جاتا ہے اس کے دل و دماغ قلب و نظر اور رُوئیں رُوئیں میں عشقِ محمدیؐ کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرورِ کائناتؐ کے حضور میں

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۵۶

حاضر ہو رہا ہے اور رعب و ادب کے مقام پر موجود ہے۔ اولیاء اللہ اور صلحا و اتقیا کی ایسے مبارک موقع پر کیا کیفیت ہوتی ہوگی، اس کا علم و اندازہ اصحابِ باطن ہی کر سکتے ہیں۔ ایک پیش پا افتادہ ظلوم و جہول کے لیے یہ تذکرہ کیسے ممکن ہے۔ ؎

آنکھوں الاتری جیتوں کا تماشا دیکھے ۔۔۔ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

حضرت رحمۃ اللہ کو بھی اس مقام پر اور ان کیفیات و جذبات کے درمیان سرورِ کائنات صلی اللہ وسلّم کی زیارت نصیب ہوئی۔ شہنشاہِ کونین نے فرمایا جو کچھ مانگنا ہے مانگ لے فقیر نے جھولی پھیلادی کہ علومِ الٰہیہ اور برکاتِ نبویہ کا طلبگار رہوں۔ قرآن و سنّت کا علم چاہتا ہوں۔ رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا کہ تجھے ہم نے قرآن و سنّت کے علم سے مالامال کیا۔

"مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جب قضیمیہ سے رابغ کو قافلہ جا رہا تھا، رات میں اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا کہ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں۔ میں قدموں میں گر گیا آپ نے میرا سر اٹھا کر فرمایا کیا مانگتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں ان کو سمجھنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ تو فرمایا کہ تجھ کو دیا۔"[1]

اس واقعہ اور خواب سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرتؒ نے ایک طرف تو اپنی زندگی ابتدائے شباب اور زمانۂ طالب علمی ہی سے اسلام اور علومِ اسلامیہ کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کو زندگی میں ایسا موقع نصیب ہوا کہ سرورِ کائنات صلّی اللہ وسلّم نے زندگی کی سب سے بڑی خواہش اس یقین دہانی کے ساتھ دریافت فرمائی کہ جو مانگو گے ملے گا۔ اور انھوں نے اپنی سب سے بڑی آرزو حصولِ علومِ الٰہیہ بتلائی۔ دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ حضرت نے طلبِ علم کے سلسلے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ وسلّم سے براہِ راست فیض حاصل کیا۔ یہ واقعہ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ اس کے بعد مسلسل اسی قسم کے انعامات دورانِ قیامِ مدینۂ طیبہ میں پیش آتے رہے۔ مگر تاریخی ثبوت کے لیے دو چار ہی پیش کیے جا سکتے

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۸۰

ہیں۔ جن کا ذکر حضرت نے خود فرمایا ہے:

"دیکھا کہ میں باب السلام سے (مسجد نبوی کا سب سے بڑا دروازہ جو کہ بجانب غرب واقع ہے) مسجد میں داخل ہوا اور حجرۂ مطہرہ کی طرف جا رہا ہوں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک پر ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔ قبلہ کی طرف آپ کا چہرۂ مبارک ہے۔ میں داہنی طرف سے حاضر ہوا۔ (باب السلام مسجد نبوی میں قبلہ رو ہونے والے کے لیے داہنی جانب پڑتا ہے) جب میں بالکل قریب پہنچا تو آپ نے مجھ کو چار چیزیں عطا فرمائیں ان میں سے ایک علم ہے، باقی تین اشیاء کو نہیں جانتا کہ کیا تھیں[1]"

اس موقع پر بھی یہ حقائق واضح طور پر سامنے آتے ہیں کہ دنیا میں علوم الٰہیہ و علوم نبویہ کے علاوہ کسی طرف حضرت کو بھی توجہ اور رغبت نہیں رہی اور یہ علوم آپ کو حضور اکرم صلی اللہ وسلم سے براہِ راست حاصل ہوئے۔

یہ دو واقعات خواب کے تھے۔ مگر اسی طرح کے ایسے واقعات بھی ہیں جن میں حضرتؒ نے دربارِ نبویؐ میں اس طرح زانوئے ادب تہہ کیے ہیں اور استفادہ کیا ہے جیسے ایک شاگرد اپنے استاذ کی خدمت میں طلب علم کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"ایک مرتبہ ہدایہ اخیرین میں ایک مسئلہ ایسا آگیا کہ بہت غور و فکر اور حواشی و شروح کے مطالعہ سے بھی حل نہیں ہو سکا۔ سخت عاجز ہو کر حجرۂ مطہرۂ نبویہ پر حاضر ہوا اور بعد سلام و درود (مسئلہ مطلوبہ) عرض کیا، تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آگیا[2]"

حضرت کو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین، علوم اور طریقۂ استدلال سے خاص عقیدت اور نسبت تھی اور کبھی کبھی طالبین علم کو ان کے مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے مگر حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی کتابیں فہم عام سے کسی قدر بالاتر ہیں اور مضامین دقیق ہیں اس لیے بعض اوقات مطالعے میں دقت پیش آتی ہے۔ حضرتؒ نے ان علوم کا

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۹۲ ۔ [2] ایضاً ص ۹۸

تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اثنائے مطالعہ بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں :

"ایک روز بہت غلبۂ شوق ہوا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی رغبت اس قدر زیادہ ہوئی کہ مواجہ شریفہ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ میں حاضر ہوکر بہت رویا۔ اور ان علوم کے حاصل ہونے کی استدعا اور درخواست کرتا رہا۔ اور اپنی بے بضاعتی اور جہالت کا شکوہ بھی کیا۔ دیر تک اسی حالتِ گریہ میں رہ کر واپس ہوا تو چند قدم ہی چلا تھا کہ یکایک قلب میں واقع ہوا۔

لاتقنطو من رحمۃ اللہ"[1]

مذکورہ بالا حالات و واقعات سے حضرتؒ کی سوانح کا ایک تابناک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ آپ کے اساتذہ کی فہرست میں حضور اکرم صلی اللہ وسلم کا نام نامی بھی باعثِ شرف و افتخار ہے اور اس کے ساتھ مدینہ طیبہ کے ایک انسان مولینا عبدالجلیل صاحب برادہ کا نام بھی شامل ہے اور زمانۂ تعلیم دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے ساتھ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا سلسلہ مدینۂ طیبہ تک ممتد ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی ذہن میں رکھیے کہ طلب علم کا سلسلہ یہاں بھی انتہا کو نہیں پہنچتا ہے۔ بلکہ اصل طالب علمی مالٹا کے قید خانہ میں ختم ہوئی ہے جس کی تفصیل آیندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔

اشغالِ روحانیہ اور سلوک و تصوّف

حضرت نے ذکر و شغل اور روحانی ریاضت کی ابتدا رئیس الطائفہ حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی نگرانی اور تعلیمات کے مطابق مکۂ مکرمہ میں آخر ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ میں کی لیکن سفر حج اور روانگی مدینۂ طیبہ کی وجہ سے حاجی صاحب کی جسمانی صحبت کم و بیش ایک ماہ کے اندر ہی ختم ہو گئی۔ مدینۂ طیبہ پہنچ کر معاشی اور علمی مشاغل کی بنا پر ذکر و شغل کا سلسلہ تھوڑے عرصہ کے لیے منقطع رہا اور اسی دوران حاجی صاحب کا وصال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت نے سلوک و

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۱۰

تصوف کے اشغال حضرت حاجی صاحب کے تلقین کردہ طریقوں سے دوبارہ شروع کیے۔ اب آپ کے سامنے دو ہی مشاغل تھے۔ دن کے بیش تر حصے میں حرم پاک میں تعلیم دیتے تھے اور باقی اوقات ذکر و شغل میں صرف فرماتے تھے۔ سلوک و تصوف میں بظاہر تین مشاغل حضرت نے اختیار فرمائے تھے۔ پاس انفاس کی مشق کرتے تھے۔ ذکر بالجہر کرتے تھے اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ اوراد و وظائف ان کے علاوہ تھے۔ جن کی تلقین مشائخ کبار لازمی طور پر کیا کرتے ہیں۔ ان اشغال اور مجاہدات کے دوران بڑی بڑی کیفیات اور برکات قلب پر وارد ہوتی رہیں اور ساتھ ہی رویائے صالحہ کے ذریعے قبولیت اور فضیلت کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ خوابوں کا تذکرہ تو کسی آئندہ موقع پر آئے گا مگر بحالتِ بیداری جو کیفیات پیش آئیں ان میں سے ایک واقعہ حضرت کے ذہنی اور مزاجی رجحانات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک روز عبادت و ریاضت میں مشغول حضور اکرم صلی اللہ وسلم کے قدموں میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایسا محسوس ہوا کہ آپ کی ذات و شخصیت بجائے حسین احمد کے رشید احمد گنگوہی کے سراپا میں تبدیل ہو گئی۔ اس امر کا اس درجہ یقین ہو گیا کہ ایسا محسوس ہوا کہ حسین احمد معدوم ہی ہو گئے۔ معاملہ چونکہ بیداری کا تھا اس لیے بے حد گھبرائے اور بار بار اپنے جسم کو تکلیف پہنچائی اور ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹا کہ اگر حسین احمد کا وجود ہو گا تو تکلیف کا احساس بھی ہو گا۔ دو گھنٹہ یہ کیفیت رہی اس کے بعد زائل ہو گئی۔ یہ تفصیل آپ نے اپنے مخدوم پیر و مرشد کو تحریر فرمائی۔ حضرت گنگوہی نے لکھا کہ یہ حالت فنا فی الشیخ ہونے کی ہے۔[1]

حضرت کا مزاج یہ تھا کہ ان کو تمام عمر اپنے اکابر، مشائخ، اساتذہ اور اسلاف امت سے غائت درجہ کا تعلق رہا۔ مدینہ طیبہ میں حضرت کے سارے اشغال روحانیہ اور مجاہدات حضرت حاجی صاحب کے تلقین کردہ تھے۔ کیونکہ آپ کے پیر نے کوئی مشغلہ تعلیم نہیں فرمایا تھا:

"ان مشاغل نے اس قدر مشغول کیا کہ ذکر پر کوئی مداومت نہ ہو سکی۔ حضرت

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۸۱

قطب عالم قدس اللہ سرہٗ العزیز (حاجی صاحب) کے وصال کے بعد شوق پیدا ہوا کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت کی جائے۔ چنانچہ حرم محترم (مسجد نبوی) میں بیٹھ کر پاس انفاس کیا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے محبت اور تعلق قلب میں بڑھنا شروع ہوا۔ اور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس طرح حضرت گنگوہی کی محبت بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق پر ان کا تعلق بہت بڑھ گیا حالانکہ حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق کم نہیں ہوا بلکہ اپنی حالت پر ہی قائم رہا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد سلسلۂ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی۔ اس اثنا میں رویائے صالحہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی۔ نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگیں۔ مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں چونکہ لوگوں کا مجمع ہر وقت رہتا ہے اس لیے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے۔ وہ وقت آفتاب نکلنے سے ایک گھنٹہ بعد کا تھا۔ چنانچہ روزانہ ایسے وقت میں ناشتہ کر کے باوضو مسجد شریف میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا کر کے مواجہ شریف (قبر مبارک کے سامنے کی وہ جگہ جو کہ چہرۂ مبارک کے سامنے ہے) میں حاضر ہوتا اداب والفاظ شرعیہ زیارت کے بعد جس قدر ممکن ہوتا الفاظ صلوٰۃ وسلام بجا لا کر پھر مسجد شریف میں جہاں جگہ خالی پاتا وہاں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ (جس قدر جی لگتا تھا) ذکر میں مشغول رہتا تھا۔ مگر جب آثار ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں کی شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا۔ مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے (مدینہ منورہ کا مقبرہ)

آبادی نہیں ہے، اُدھر نکل جاتا تھا اور کبھی مسجد الاجابہ میں (یہ مسجد مشہور ہے) اور اب بالکل جنگل میں واقع ہے۔ یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں) اور کبھی اسی کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا۔ اسی حالت پر ایک مدت گذری۔[1]

مکہ مکرمہ میں کم وبیش ایک ماہ تک حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ذکر و شغل فرما کر مدینہ طیبہ حاضری کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا اور اس کے کم از کم چھ ماہ بعد ہی مدینہ طیبہ میں دوبارہ اشغال روحانیہ شروع ہو سکے ہوں گے۔ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ کو ہندوستان کا سفر پیش آیا جس کا ذکر اگلے صفحات میں آرہا ہے۔ اس طرح تخمیناً کل ڈیڑھ برس مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ میں حضرت نے سلوک و تصوف کے مشاغل میں گذارے۔ اس مدت میں دو ماہ کا عرصہ جو گنگوہ میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں خلافت و اجازت سے پہلے گذارا اور ملالیں تو خلافت سے پہلے کل مدتِ ریاضت و مجاہدات و ذکر و شغل ایک سال اور آٹھ ماہ ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام مشاغل حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی تعلیمات اور تلقین کے مطابق ہوئے ہیں۔

مدینہ طیبہ میں درس و تدریس

حضرت نے درس و تدریس کا مشغلہ مدینہ طیبہ اور حرم نبوی میں ۱۳۱۷ھ کی ابتدا سے شروع کیا تھا اور یہ سلسلہ ۱۳۳۵ھ کی ابتدا تک متعدد بار اسفارِ ہندوستان کی بنا پر منقطع ہوتے رہنے کے ساتھ جاری رہا۔ ان مدتوں کی تفصیل آئے گی۔ اس جگہ تعلیمی و تدریسی مشاغل کی ابتدا اور ابتدائی دو سال کے حالات کا بیان مقصود ہے۔ پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے کہ حضرت کے والد ماجدؒ نے اپنی اولاد کو دین اور علوم دینیہ کے لیے وقف کر دینے کی نیت کر لی تھی۔ اور خود ذاتی طور پر حضرت نے اپنے لیے علمی زندگی کو حیات مستعار کا سب سے بڑا مقصد قرار دے لیا تھا۔ ان حقائق کے

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۸۱

ساتھ ہی آپ کے استاد، مرشد اور مخدوم حضرت شیخ الہندؒ نے وداع کرتے ہوئے تاکید فرمائی تھی کہ کسی حالت میں درس و تدریس کا مشغلہ ترک نہ کرنا۔ مذکورہ قلبی اور ذہنی تقاضوں کے ساتھ کچھ خارجی اسباب بھی جمع ہو گئے۔ مدینہ طیبہ میں اور مسجد نبوی میں درس و تدریس کا مشغلہ تو جاری رہتا ہی تھا اور بہت سے عربی اور حجازی اساتذہ طالبان علم کو فیضیاب کراتے تھے مگر حضرت نے ابتدائی مضامین سے جب اپنے دروس کی ابتدا کی تو طلبا اور عوام طالبان علوم کا رجحان آپ کی طرف بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوا۔ خدا ہی کو علم ہے کہ اس مقبولیت عامہ کے اسباب کیا رہے ہوں گے مگر انداز آ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی فطری بے نفسی، بے غرضی، تواضع، خوش خلقی کے ساتھ عالم اسلام کے منفرد اور ممتاز اساتذہ سے حاصل کردہ تبحر علمی اور طریقۂ تدریس کا بہت حد تک دخل رہا ہوگا۔ اس بارے میں صحیح بات تو اس وقت کے کسی شاگرد رشید ہی سے معلوم ہو سکتی تھی، مگر صد افسوس کہ راقم الحروف کو جب ان حضرات کی صحبت نصیب تھی تو ایسی قیمتی معلومات کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کا شعور نہ تھا اور اب جب کسی قدر ہوش آیا تو شاگرد اور استاد سبھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ لاچار اور مجبور ہو کر حضرت کے بیان پر اکتفا کرنی پڑتی ہے جس میں طبعی تواضع و انکسار کی بنا پر مقبولیت کی اصل کیفیت یقیناً محذوف رکھی گئی ہے تاہم اس تفصیل سے ایک عام اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ "مدینہ منورہ پہنچنے پر بعض طلبا، ہندوستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصے تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی۔ اس لیے اشکال کا سامنا ہوا۔[۱] یہ اشکال معمولی نہیں ہوتا۔ اہل زبان اور خصوصاً اہل زبان عربی کسی غیر اہل زبان کی فضیلت، فوقیت اور علمیت کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر دیں۔ یہ غیر معمولی قابلیت اور تبحر علمی کے بعد ہی ممکن ہے۔ دوسری زبان یعنی عجمی زبانوں کی تقریر و تفہیم میں وہ روانی، فصاحت، سلاست اور بلاغت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے جس کے اہل عرب عادی ہیں تاہم ہندوستانی

۱۔ نقش حیات، ج ۱، ص ۵۷

علماء کی تحقیق، تبحر اور وسعتِ علمی کا اعتراف سب ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ حضرت نے لکھا ہے:
"مدینہ منورہ میں پہلے ہی علمائے ہند کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ حضرت شیخ محمد عابد انصاری سندی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت شاہ عبد الغنی نقشبندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رودولوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بڑے بڑے پایے کے علماء گذرے تھے۔ ان کی اعلیٰ استعداد استحقاق قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔"[1]

ایسے ماحول میں حضرت نے ابتدائی کتابوں سے تدریس کی ابتدا کی۔ اور بہت تھوڑے عرصے میں عربی تقریر اور تفہیم پر بھی قدرت حاصل کر لی اور ہندوستان کے علماء کرام کی روایت اور طریقے کے مطابق ابتدائی کتابوں کی تدریس سے بھی فراغت حاصل کر لی۔ لکھا ہے کہ "اس (تدریس) سے مجھ کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف و نحو و فقہ وغیرہ کی محفوظ ہو گئیں اور دوسرے یہ کہ زبان (عربی) صاف ہو گئی۔"[2] مدینہ طیبہ میں اہل عرب علماء کے بڑے مشہور و معروف حلقہ ہائے دروس ہوتے تھے۔ جوق در جوق عوام و خواص پروانہ وار ان اسباق میں حاضر ہوتے تھے۔ کسی نہ کسی درجے میں یہ طریقہ اور روایت اب بھی باقی ہے۔ ان کامیاب اور مقبول درسگاہوں یا حلقہ ہائے علوم میں ایک نوخیز، نوجوان، سبزہ آغاز، ہندوستانی اور خالص طالبعلمانہ شان کا عالم داخل ہو کر تعلیم دینا شروع کرے تو طبعی اور فطری طور پر معاندانہ اور معاصرانہ نگاہیں اٹھتی ہی ہیں اور پھر جبکہ علم دنیا کی سب سے بڑی دولت مانی گئی ہے اور تفاخر و تنافس کا سبب ہے بڑا سبب ہے۔ "اہل علم میں عموماً اور اہل حجاز میں خصوصاً حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقیدی معاملات اکثر پیش آتے ہیں۔"[3] حضرت کے ساتھ بھی مدینہ طیبہ میں مخالفت اور حسد کے حالات پیش آئے مگر اس ابتدائی دور میں غالباً حضرت نے اس طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ ویسے بھی حضرت کا مزاجی انداز یہ تھا کہ فضول باتوں

---

۱ نقشِ حیات، ج ۱، ص ۷۰ ۲ ایضاً ۳ ایضاً

سے گریز کرتے ہوئے مکمل مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ چنانچہ پہلی بار مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران دو برس تک صرف صَرف ونحو اور فقہ وغیرہ کی کتابیں مستقل مزاجی اور خاموشی کے ساتھ پڑھاتے رہے۔ ۱۳۱۸ھ کے آخر میں جب گنگوہ تشریف لے گئے تب یہ سلسلہ منقطع ہوا اور وہاں سے واپسی پر اعلیٰ کتابوں کی شہرت اور مقبولیت کے ساتھ تدریس شروع ہوئی۔ افسوس کہ تذکرہ میں کتابوں کے نام نہیں تحریر فرمائے ہیں اور صرف یہ لکھا ہے کہ "ہمارا گوشۂ گمنامی میں ایک ایک دو طالب علموں کو پڑھانا اور ابتدائی کتب نحو وصرف وفقہ وغیرہ سے اشتغال رکھنا بہت مفید ہوا۔ ۱۳۱۸ھ شوال تک اسی طرح ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علموں کو پڑھاتا رہا۔ حلقات درس وتدریس میں کوئی امتیازی شان پیدا نہیں ہوئی۔"[1] امتیازی شان ہوئی یا نہیں؟ یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ہم کوتاہ بینوں کی نظر میں تو یہی دین ودنیا کی بڑی دولت ہے کہ مدینہ طیبہ میں علم دین پڑھانے کا موقع نصیب ہو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں بیٹھ کر فقہ اور شرع کا درس دینے کا شرف حاصل ہو طلبائے علوم دینیہ، اللہ کے مہمان فرشتوں جیسے انسان اکتسابِ فیض اور علمی استفادہ کے طلبگار ہوں اور اس پورے عرصے میں اللہ اور اس کے رسول کی رحمتیں نازل ہوتی رہی ہوں۔ بہرحال اس ابتدائی دور میں ۱۳۱۶ھ کے آخر سے ۱۳۱۸ھ کے آخر تک عربی کی ابتدائی کتابیں زیر درس رہیں اور اس کے بعد ہندوستان کا سفر پیش آیا۔

ہندوستان کا پہلا سفر اور خلافت واجازت ۱۳۱۸ھ تا ۱۳۱۹ھ

حضرت اپنی ریاضتوں، مجاہدات اور قلبی کیفیات کی تفصیل حضرت گنگوہی کی خدمت میں لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی رویائے صالحہ سے بھی مطلع فرماتے رہتے تھے۔ شوال ۱۳۱۸ھ میں حضرت گنگوہی کا والا نامہ صادر ہوا کہ ہر چند کہ مدینہ طیبہ میں حاضری دین دنیا کی بڑی سعادت ہے اور یہ وہ دیار ہے کہ جہاں پر دن ورات رحمتوں اور

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۵۰

برکات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی اگر اس وقت تم کسی طرح کچھ دنوں کے لیے گنگوہ آجاؤ تو اچھا ہو[۵] یہ حکم پاکر حضرت نے ہندوستان کے سفر کا ارادہ فرمایا اور والدین مرحومین اور بھائی صاحبان سے اجازت طلب کی۔ گھر کے بھی لوگ آپ کی عبادت ریاضت اور روحانی حالات اور روز افزوں ترقیات سے واقف تھے اس لیے اجازت دینے میں کسی عذر کا سوال پیش نہیں آیا۔ مگر زادِ راہ اور ضروریاتِ سفر کے لیے اخراجات کا سوال مشکل تھا اور گھر کے مالی حالات اس کے متحمل نہیں تھے کہ اتنا بڑا سفر اختیار کیا جائے۔ اس لیے والد صاحب مرحوم نے سکوت اختیار فرمایا۔ مگر گنگوہ شریف سے بلاوے کا بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب پر بڑا اثر پڑا اور ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی چنانچہ وہ بغیر کسی سے بتلائے ہوئے مختصر سا سامان اور تھوڑے سے اخراجات لے کر چپکے سے عازمِ سفر ہوگئے۔ گھر والوں کو دوسرے تیسرے روز ایک تحریر کے ذریعے ان کی روانگی کی اطلاع ملی۔ تو والد صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اصل بلاوا تو تمھارے لیے آیا تھا مگر وہ روانہ ہوگئے۔ اب جس طرح بھی ہو تم روانہ ہو اور جدہ میں جاکر ان کے ہمراہ ہو جاؤ۔ ان کے پاس اخراجات بھی کم ہیں اور طبعی طور پر وہ تکلیفیں اور مشکلات برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں اس لیے تم راستے میں ان کو سہارا دینا۔ اس سفر کی دل چسپ داستان حضرت نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس میں حضرت کا اسلوب بیان بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

"۱۳۱۶ھ شوال میں والا نامہ گنگوہ شریف سے وارد ہوا کہ اگرچہ وہاں سب کچھ ہے مگر بہتر ہوتا کہ تو ایک مہینے کے لیے گنگوہ آجاتا۔ چونکہ والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحبان میری مشغولیٔ ذکر اور بعض رویا وغیرہ سے واقف تھے ادھر اس والا نامہ سے بھی واقف ہوگئے تھے اس لیے جبکہ میں نے اس والا نامہ کے مضمون کی وجہ سے سفر کی اجازت طلب کی تو والد صاحب نے بجز قلت خرچ اور کوئی عذر نہیں فرمایا اور یہ واقعی تھا کیونکہ اس مدت میں سرمایہ تقریباً قریب الختم ہو چکا تھا۔ اس لیے مجبوراً سکوت کرنا اور سفر سے باز

۵ نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۰

رہنا پڑا۔ مگر بڑے بھائی صاحب کو (مولینا صدیق احمد صاحب مرحوم) جو کہ تمام کاروبار تجارت اور ضروریات کو انجام دینے والے تھے اور ہندوستان سے روانگی پر جبکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے انھوں نے اپنے ذکر و شغل میں ناکامی کی شکایت کی تھی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا تھا کہ اب تو چلے جاؤ پھر وہاں سب کو چھوڑ کر چلے آنا۔ یہ مقولہ یاد آگیا اور ان کی آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور انھوں نے خفیہ طور پر انتظام کرنا شروع کر دیا۔

ماہ ذیقعدہ میں جبکہ ایک قافلہ مدینہ منورہ سے رابغ کو روانہ ہو رہا تھا اس کے ساتھ چھپ کر بارادہ ہندوستان روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ ساٹھ یا ستر روپے لے گئے۔ گھر میں جب دن بھر نہیں آئے تو تلاش ہوئی۔ ان کے کمرے میں ایک تحریر لٹکی ہوئی پائی گئی جس میں انھوں نے اپنے ارادے وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس پر مطلع ہونے کے بعد حضرت والد صاحب مرحوم نے مجھ کو فرمایا کہ اب تو بھی جا۔ تجھ کو تو وہاں سے طلب کیا گیا تھا مگر وہ روانہ ہو گئے ہیں خرچ کے نہ ہونے کی وجہ سے میں متوقف تھا ان کو راستہ میں تنہائی کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے زادِ راہ کا انتظام کر دیا۔ بھائی صاحب مرحوم رابغ سے بادبانی جہاز پر جدہ پہنچے۔ راستے میں تکلیف زیادہ ہوئی۔ طبیعت میں استقلال اور جفاکشی کم تھی، تنہائی بھی تھی۔ جدہ میں کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ دو چار روز جدہ میں رہ کر پریشان ہو گئے اور والد صاحب مرحوم کو مفصل خط لکھا کہ اب میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں اور چونکہ حج کا زمانہ قریب آگیا ہے، اس لیے حج کر کے واپس آجاؤں گا۔ والد صاحب مرحوم عزائم کے بہت پختہ تھے ان کو ناگوار ہوا اور مجھ سے کہا کہ تو جاکر ان کو واپسی کے ارادے سے باز رکھ۔ اور تم دونوں ہندوستان کو روانہ ہو جاؤ۔ مجھ کو بھی تقریباً ساٹھ روپے سفر خرچ کے لیے عطا فرمائے اور مال لانے والے قافلے میں جبکہ وہ مال پہنچا کر واپس ینبع البحر کو جا رہا تھا تاجروں کے ذریعے پشت شتر کرایہ کر کے روانہ کر دیا۔ اگرچہ قوافل ینبع سے پانچ یا چھ دن میں آتے ہیں مگر یہ خالی اونٹ تھے مختصر راستوں سے پہاڑوں میں ہوتے ہوئے رات دن چل کر دو یا تین دن میں ینبع پہنچ گئے۔ اتفاق سے خدیوی ڈاک کا جہاز جدہ جانے والا آیا ہوا تھا فوراً اس پر سوار ہو گیا اور اگلے روز

جدہ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی صاحب گھبرا کر مکہ معظمہ روانہ ہوگئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک جہاز بمبئی سے آیا ہوا ہے اور وہ بمبئی واپس ہونے والا ہے۔ میں نے اس کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر یہ چاہا کہ میں جلد سے جلد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں بھائی صاحب مرحوم سے پہلے پہنچ جاؤں اُن کو اس جلد بازی اور چھپ کر چلے آنے کی سزا دے دوں۔ اس کا ٹکٹ چالیس روپے میں خرید لیا اور ایک خط مکہ معظمہ میں بھائی صاحب کو اور ایک مدینہ منورہ میں والد صاحب مرحوم کو تفصیلی خط لکھ دیا اور اپنی روانگی کی اطلاع دے کر جہاز میں سوار ہوگیا مگر ایک روز کے بعد ہی بمبئی سے تار آگیا کہ جہاز بمبئی نہ آئے بلکہ جدہ ہی میں ٹھہرا رہے۔ حج کے بعد حجاج کو لے کر واپس ہو اس بنا پر ایک یا دو دن جہاز میں رہنے کے بعد جدہ واپس آنا پڑا۔ یہ تاریخیں اواخر ذیقعدہ کی تھیں۔ ٹکٹ کے روپے واپس لے کر اب یہی ضروری معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ روانہ ہو کر نعمت حج اور رفاقت بھائی صاحب مرحوم کا شرف حاصل کیا جائے۔ چنانچہ والد صاحب مرحوم کو اطلاع دے دی اور چونکہ خرچ کم تھا اور اسباب بھی زائد نہ تھا یکم ذی الحجہ کو شام کے وقت پیدل مکہ معظمہ روانہ ہوگیا۔ قرب حج کی وجہ سے راستے میں پیدل جانے والوں کی کثرت تھی۔ آخیر شب میں بحرہ پہنچ کر کچھ آرام کیا اور پھر دن بھر چل کر مکہ معظمہ پہنچا۔

بھائی صاحب مرحوم میرے خط اور جہاز کی خبر سے سخت پریشان اور پشیمان ہوگئے تھے اس واقعے سے بہت خوش ہوئے۔ بفضلہ تعالیٰ ادائے مناسکِ حج سے فارغ ہو کر جب جدہ پہنچے تو کرایہ جہاز فی کس ۶۵ روپے تھا۔ ہم دونوں کے پاس مصارفِ حج اور مصارفِ مکہ معظمہ کی وجہ سے اس قدر مقدار باقی نہیں رہ گئی تھی جو اس وقت کے دخانی جہازوں کے کرایہ کے لیے کافی ہوسکے۔ اگرچہ حج پیدل ہی دونوں نے کیا تھا' قیام بھی مولینا شفیع الدین صاحب کے پاس تھا مگر خورد و نوش وغیرہ کے مصارف میں اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ ہر ایک کے پاس چالیس چالیس روپے تقریباً باقی تھا۔ جہاز کے کرایہ کی کمی کا انتظار کیا گیا مگر کم نہ ہوا اور وہ روانہ ہوگیا۔ پھر دوسرا جہاز آیا۔ اس کا بھی کرایہ اس قدر گراں تھا' وہ بھی روانہ ہوگیا۔ اب بجز اس کے کوئی صورت بھی

یا تو جدہ میں مہینہ دو مہینہ ٹھہر جائے اور آخری جہاز کا جب وقت آئے تو مساکین کے ساتھ روانہ ہوں جو کہ قلت حجاج کی وجہ سے یقینی نہ تھا، یا مدینہ منورہ واپس ہو جائیں یا بادبانی کشتیوں میں مسقط یا مکلا یا عدن کو روانہ ہو جائیں اور وہاں سے کراچی یا بمبئی کو دخانی جہازوں پر روانہ ہوں۔ مگر جدہ کا خرچ پہلے امر کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ دوسرا امر مقصد کے بالکل مخالف تھا۔ تیسرے امر پر بھائی صاحب راضی نہ ہوتے تھے کیوں کہ رابغ سے جدہ تک وہ بادبانی کشتی ہی میں آئے تھے اور اس میں ان کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی بلکہ وہ تقریباً ارادے کو توڑ چکے تھے۔

جدہ میں ہم میمنوں کی رباط (مسافر خانہ) میں مقیم تھے۔ ایک شخص مستری غلام محمد مرحوم امرتسر کے باشندہ، وہ بھی ہندوستان جانا چاہتے تھے اور قلت خرچ کی وجہ سے دخانی جہاز میں سفر نہ کر سکے تھے۔ میں نے اور انھوں نے تیسرے امر پر بھائی صاحب مرحوم کو بمشکل آمادہ کیا اور ایک بڑی کشتی مسقط جانے والی بادخانی جس کو بغلہ کہتے ہیں حاصل کی۔ مبلغ دس روپیہ فی کس اس کا ٹکٹ لیا۔ جب چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر (کیوں کہ بغلے اپنی بڑائی کی وجہ سے وسط سمندر میں رہتے ہیں) وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بغلہ چھوٹ گیا مجبور ہو کر واپس ہوئے۔ اب بھائی صاحب مرحوم اور بھی مخالف ہو گئے، مگر ایک دوسرے بغلے کا پتہ چلا اس کے لیے بہ مشکل تمام بھائی صاحب کو آمادہ کیا۔ انھوں نے اس کو بہ مشکل اس شرط پر قبول کیا کہ اگر یہ بغلہ نہ ملا تو پھر ضرور بضرور مدینہ روانہ ہو جائیں گے مگر خدا کے فضل سے یہ بغلہ مل گیا اور ہم اس پر اسی کرایے میں سوار ہو گئے۔ یہ بغلہ بحرین کے تاجروں کا تھا وہ کھجوریں لے کر آئے تھے اور ان کو فروخت کر کے نیز حج سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے۔ اس میں تقریباً ایک سو بیس مسافر تھے۔ کچھ رباضی (خارجی) مسقط کے باشندے تھے۔ تقریباً ستر یا اسی بنگالی حجاج تھے اور تین شخص ہم ہندوستانی تھے اور دس پندرہ کشتی بان بحرین کے تھے۔ چونکہ ہوا قدرے مخالف تھی۔ اس لیے بغلے کو وسط سمندر میں کشتی بان نہیں چھوڑتے تھے بلکہ کنارے کنارے پر چلاتے تھے اور چونکہ اس دریا میں کنارے پر پہاڑیاں پانی میں زیادہ ہیں اس لیے رات

کو ٹھہر جاتے تھے اور دن بھر چلاتے تھے۔ پندرہ دن میں عدن کے قریب پہنچنا ہوا، مگر وہاں پر ہوا بالکل مخالف ملی اس لیے مکلّہ (باوجودیکہ دخانی جہاز سے صرف ایک دن کی مسافت ہے) پندرہ دن میں پہنچنا ہوا۔

خلاصہ یہ کہ جدّہ سے ایک مہینے میں مکلّہ پہنچنا ہوا۔ باوجودیکہ ہم نے احتیاطی طور پر کافی خورد و نوش کا سامان لے لیا تھا مگر سب ختم ہوگیا جس کی وجہ سے کشتی والوں سے چاول وغیرہ قرض لیتے تھے اور پھر مکلّہ پہنچکر ان کو ادا کیا گیا۔ مکلّہ پہنچنے تک مخالف ہوا کی وجہ سے بغلہ میں حرکت بہت زیادہ ہوتی تھی اس لیے بھائی صاحب مرحوم اور مستری غلام محمد صاحب کو چکر اور قے بہت آتی رہی، سائبان نہ ہونے کی وجہ سے سایے کی بھی تکلیف رہتی تھی۔ مگر مکلّہ سے ہوا موافق ملی تو کشتی بانوں نے بغلہ کو وسط سمندر میں ڈال دیا۔ رفتار بھی خوب تیز ہوگئی اور رات دن چلنا ہوا اس لیے سات دن میں مسقط پہنچ گئے۔ حرکت بھی ایسی نہیں ہوئی جس سے متلی یا چکر یا قے ہوتی۔ مجھ کو چونکہ بحری سفر میں چکر نہیں آتا، اس لیے اس سفر میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔[1]

یہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بغلہ میں دیکھے ہوئے ایک خواب کا تذکرہ فرمایا جو اسی باب کے آخر میں بیان ہو رہا ہے اور اس کے بعد سفرنامے کی تفصیل اس طرح جاری ہے۔

"مسقط کے قریب ہی ایک آبادی مطرح ہے اس میں صرف اہلِ سنّت والجماعت رہتے ہیں مگر مسقط کی زیادہ تر آبادی اباضیوں (خوارج) کی ہے اگرچہ حکومت دونوں جگہ سلطان مسقط ہی کی ہے جو کہ اباضی ہے اس لیے بغلہ والوں نے مطرح میں ہی ہم کو اتارا کیونکہ وہ سب سنّی شافعی تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاک کا جہاز کراچی جانے والا ایک روز پہلے جا چکا ہے۔ اب چھ سات دن کے بعد جائے گا۔ اس لیے وہاں سات دن ٹھہرنا پڑا۔ انگریزی عہدیدار کسٹم کا ہندوستانی مسلمان تھا اس نے جگہ دے دی۔ وہاں قیام کیا گیا اور ساتویں دن جب جہاز آیا تو دو روپیہ فی کس پر کراچی کا ٹکٹ لے کر اس پر

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۴۔

سوار ہو گئے اور ایک دن رات سفر کرنے کے بعد کراچی پہنچنا ہو گیا۔

ڈیڑھ مہینے سے کچھ زیادہ وقت میں یہ سفر طے ہوا۔ ربیع الاوّل کا وسط ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس جو کچھ نقد تھا وہ اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ سہارن پور کا ٹکٹ لینے کے بعد راستے میں کھانے پینے کے لیے صرف تین چار آنے باقی رہ گئے تھے۔ مگر جب ہم نے ڈاک گاڑی پر بیٹھنا چاہا تو ٹکٹ کلکٹر نے روک دیا اور کہا کہ اسباب زائد ہے اس کو وزن کراؤ۔ ہم نے دکھلایا کہ وزن زیادہ نہیں ہے گاڑی کا وقت قریب ہے جانے دیجیے۔ مگر اس نے نہ مانا۔ تلوانے اور بعض غیر ضروری چیزوں کے پھینکنے میں اس قدر دیر لگ گئی کہ گاڑی چھوٹ گئی۔ بالآخر دوسری پسنجر گاڑی میں روانگی ہوئی جو کہ لاہور تک نہیں جاتی تھی۔ اس لیے اُس نے راستے میں چھوڑ دیا اور وہاں ایک شب پڑا رہنا پڑا اور جو چند آنے کھانے کے ہمارے پاس تھے وہ بھی خرچ ہو گئے۔ اگلے دن ڈاک گاڑی میں روانگی ہوئی تو کھانے کا کچھ سامان نہ تھا۔ بالآخر مطرح سے بچھ سقط کے حلوے کے ڈبے ہم نے خریدے تھے ان کو مسافروں کے ہاتھ فروخت کرکے روٹی کھائی۔ آخرِ شب میں گاڑی سہارن پور پہنچی چونکہ ہمارے پاس مدینۂ منورہ کی کھجوریں اور دیگر تبرکات تھے اور کھجوروں پر چنگی لگنی ضروری تھی، پیسے پاس نہ تھے اس لیے میں مع اسباب اسٹیشن کی مسجد میں ٹھہر گیا اور بھائی صاحب حضرت مولٰنا خلیل احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں اس لیے چلے گئے کہ وہاں سے کچھ پیسے لاکر چنگی والوں کو دے دیئے جائیں۔[1]

اس سفر کی تفصیلات کوئی آنکھوں سے دیکھ سکتا تو کلیجہ منہ کو آجاتا۔ جدّہ میں کشتیوں میں سوار ہو کر بیچ سمندر میں جہاز پر سوار ہونا پھر دو دن کے بعد مع سارے اسباب و سامان کے اتر کر واپس آنا، پھر ٹکٹ کے پیسوں کی واپسی کے لیے دو دن تک دوڑ دھوپ کرنا، جدّہ سے مکہ مکرمہ پیدل چل کر حاضری دینا، قلّتِ مصارف کی حالت میں حج کے مناسک ادا کرنا، ان شدائد اور مسائل کا اندازہ شن کر یا پڑھ کر کہاں تک کیا

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۸۵

جاسکتا ہے۔ حضرت نے اس سفر کے حالات اگرچہ کافی تفصیل سے لکھے ہیں مگر آج کے زمانے میں جب دو چار گھنٹوں میں انسان جدّہ سے دلّی پہنچتا ہے اور سردی، گرمی، بھوک پیاس ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ اُس وقت کی تکالیف، چلچلاتی ہوئی دھوپ میں مہینوں کشتی کے سفر، جھلسا دینے والی گرمی میں پیدل مکہ مکرمہ اور حج کی قطع مسافت، ہفتوں ہفتوں بھوکے پیاسے ریل اور جہاز کے انتظار کے شدائد اور ابتلاء و آزمائش کی سختیوں کا اندازہ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سفر مکمل طور پر راہِ سلوک اور طریقِ معرفت و روحانیت کا ایک سفر تھا۔ صاحبِ بصیرت اور صاحبِ دل حضرات کے لیے ان واقعات سے حضرت کے خلوص، للّٰہیت، بے نفسی، بے غرضی، عزم و ارادہ، عزیمت و شہامت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

سہارن پور سے بڑے بھائی تو گنگوہ روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت پہلے دیوبند حاضر ہوئے۔ دیوبند حاضری سے یہ مقصد تو تھا ہی کہ مادرِ علمی اور اساتذۂ کرام بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کی زیارت سے شاد کام ہوں، مگر اصل مقصد یہ تھا کہ پیر و مرشد کی خدمت میں دیوبند سے پیادہ پا چل کر حاضر ہوں اور اس طرح حاضر ہوں کہ پھر اطمینان سے رہ سکیں اور جلد واپسی کا کوئی تقاضہ پیش نہ آئے۔

"میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے دیوبند حاضر ہو لوں، اس کے بعد وہاں سے گنگوہ شریف کا قصد کروں گا۔ جو ہدایا وہاں کے حضرات کے ہیں وہ بھی پہنچا دیئے جائیں گے اور ان کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو جائے گا۔ اور پھر با اطمینان گنگوہ شریف میں قیام ہو سکے گا۔ گنگوہ شریف کے لیے جو تبرکات عامہ تھے، وہ بھائی صاحب اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر حجرۂ شریفہ کا غبار، مسجد شریف کی کھجوریں (اس زمانے میں صحنِ مسجدِ نبوی میں بھی چند درخت کھجوروں کے تھے) اور بعض خصوصی تبرکات میرے ہی پاس تھے چونکہ حجرۂ مطہرہ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے خاص خدام جن کو آغاوات کہتے ہیں مجھ سے پڑھا کرتے تھے اس لیے خصوصی تبرکات مجھ کو حاصل کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ میں اوّل دیوبند گیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ کرام

سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ میری ایک غرض اس میں یہ بھی تھی کہ میں حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں تنہا اور پیادہ پا حاضر ہوں[۱]۔

مدینہ طیبہ سے حضرت کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے دو ماہ تک خیر خبر نہ پاکر حضرت گنگوہی کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا تھا کہ صدیق احمد اور حسین احمد آپ کی خدمت میں روانہ ہوئے ہیں اور اُن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملنے سے پریشانی ہے۔ چنانچہ حضرت گنگوہی بھی منتظر تھے۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب حاضر ہوئے تو حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں نے تم دونوں کے لیے ایک ایک جوڑہ کپڑوں کا تیار کرایا ہے۔ مولوی حسین احمد صاحب بھی آجائیں تب دونوں کو ایک ساتھ ہی دوں گا۔ چنانچہ حضرت اس طرح حاضر ہوئے کہ "دیوبند میں ایک دن قیام کرکے ظہر کے بعد پیدل روانہ ہوا اور چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے راتوں رات چل کر صبح کو نو دس بجے گنگوہ شریف پہنچا۔ اپنی نالائقی اور تن پروری اور راہِ طریقت میں کسل مندی وغیرہ کی وجہ سے شرمندگی اور خجالت کا اثر بہت قوی تھا، اس لیے راستے میں برابر گریہ طاری رہتا تھا۔ اور شوقِ حضوری بارگاہ میں کشاں کشاں قدم بڑھا رہا تھا۔ بالآخر حاضرِ خدمت ہوا۔ اور شرفِ ملاقات سے فیضیاب ہوا۔ بہت زیادہ شفقت فرمائی اور وہ دونوں جوڑے عنایت فرمائے[۲]"۔

حضرت گنگوہیؒ نے دونوں بھائیوں کو اپنا خاص مہمان بنایا اور مراقبہ ذات بحت تعلیم فرمایا۔ عصر بعد جب حضرت گنگوہی کی مجلس عام ہوتی تھی اس وقت حضرت مجلس میں حاضر رہ کر تعلیم فرمودہ مراقبہ پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ تک جاری رہا۔ اور اس عرصے میں حضرتؒ عبادت و ریاضت میں ہمہ وقت مشغول رہے۔ گویا اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں ان کے تلقین کردہ ذکر و شغل کا موقع اجازت بیعت و خلافت سے پہلے حضرت کو صرف ڈیڑھ ماہ تک ملا۔ راہِ طریقت و مقامات روحانیت کے اسرار و رموز تو اہل اللہ ہی خوب جانتے ہیں اور وہی اس عالم کے معاملات

[۱] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۸۵ - [۲] ایضاً، ص ۸۶

کا فیصلہ کر سکتے ہیں مگر حضرتؒ کے بچپن سے لے کر اس وقت تک کے حالات پیشِ نظر رکھیں تو ہم ظاہر بینوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیدائشی طور پر صلاحیت قابلیت اور عزیمت سے بہرہ ور تھے۔ اس پر آپ کے والد ماجدؒ کی تربیت اور شدّت اور بھائی صاحبان کی توجہ اور محنت نے سونے پر مزید سہاگے کا کام کیا لیکن جس چیز نے اس سونے کو کندن اور ذرہ کو آفتاب بنایا۔ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی توجہاتِ روحانیہ اور فیوضاتِ علمیہ تھیں۔ چنانچہ جس وقت آپ ہندوستان سے روانہ ہوئے ہیں اسی وقت اخلاقی روحانی، قلبی، ذہنی اور علمی طور پر کامل ہو چکے تھے۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خصوصی توجہات اور ان کے تلقین فرمودہ اعمال کی بنیاد پر اس قدر جلد اعلیٰ روحانی مقامات پر فائز ہو جانا اس کی واضح علامتیں ہیں۔

مقدر کی بات تھی کہ حضرت حاجی صاحب کا وصال ہو گیا۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی نگرانی اور تربیت کے تحت مقاماتِ سلوک و تصوف طے کرنے کے بعد حضرت کو انھی سے خلافت اور اجازت نہ مل جاتی۔ تاہم حاجی صاحبؒ کے دربار سے حضرت کو براہِ راست جو منصب عطا ہوا اس کا کچھ اندازہ اس خواب سے ہوتا ہے جو حضرت نے تحریر فرمایا ہے "اسی بحری سفر میں (مدینہ طیبہ سے گنگوہ شریف آتے ہوئے جس سفر کی تفاصیل ابھی گذری ہیں) میں نے ایک شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکہ معظمہ میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو جو کھجوریں مدینہ منورہ کی دے گیا ہے اس کو آ کر تقسیم کر دے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو آپ کے لیے لایا ہوں، میرے یہاں تو ان کی دوکان ہے تو فرمایا کہ نہیں تو ان کو تقسیم کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں کھجوریں کن دقتوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس خواب کو میں نے گنگوہ شریف پہنچ کر جب حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز سے ذکر کیا تو فرمایا کہ تجھ کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے یہاں سے اجازت ہو گئی ہے میرے یہاں سے بھی ہو جائے گی۔"[1]

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۴۴۔

اجازت و خلافت کے بارے میں رویائے صالحہ اور مکاشفات روحانیہ کا کیا درجہ ہے؟ راقم الحروف اس باب میں کچھ عرض کرنے سے قاصر ہے۔ مگر یہ انشراح صدر کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت گنگوہیؒ جیسے عارف ربّانی اور واقف اسرار نہانی کی تصریح و تثبیت کے بعد اس امر میں شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ حضرت کو ہندوستان پہنچنے سے قبل ہی پہلی خلافت براہِ راست دربار امدادی سے عطا ہوئی۔ اس کے بعد جب حضرت گنگوہ تشریف لائے ہیں تو ملاقات کے فوراً بعد پیرو مرشد کے دربار سے خلعت عطا ہونا اور یہ وضاحت فرمانا کہ میرے یہاں سے عنقریب خلافت ملے گی۔ اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ حضرت مدینہ طیبہ میں رہتے ہوئے ہی رشد و ہدایت کے درجے پر فائز ہو چکے تھے۔ چنانچہ بہت تھوڑے عرصے یعنی کم و بیش دو ماہ کے بعد باضابطہ اجازت اور دستار خلافت عطا ہوئی۔ مختصر یہ کہ مدینہ طیبہ سے طلبی کا جو حکم صادر ہوا تھا، وہ صرف اسی غرض کے لیے تھا۔

"ایک روز عشاء کے بعد دوسرے خدام کے ساتھ میں بھی حضرتؒ (حضرت گنگوہیؒ) کا بدن دبا رہا تھا، میں پشت کی طرف تھا۔ دباتے دباتے آنکھ جھپک گئی تو دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ چالیس دن گذرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا۔ اس تاریخ کے ٹھیک چالیس دن گذرنے پر عصر کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ بھائی صاحب لے آئے۔ حضرت نے ہر ایک کے سر پر اس کا عمامہ باندھ دیا۔ جس وقت حضرت رحمۃ اللہ میرے سر پر عمامہ باندھ رہے تھے مجھ پر زور دار گریہ طاری تھا اور اپنی کم مائگی اور خجالت کا شدید احساس تھا۔ اس کے بعد بھائی صاحب سے فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیسی دستار ہے؟ بھائی صاحب نے عرض کیا دستارِ فضیلت ہے۔ فرمایا کہ نہیں دستار خلافت ہے۔ میری طرف سے تم دونوں کو اجازت ہے۔"[1]

حضرت کی عمر اس وقت ۲۳ برس کی تھی۔ اس نوعمری میں پیری اور خلافت کا خیال بھی شاید ہی گزرا ہو۔ خلافت اور اجازت بیعت حضرت کا مقصود نہیں تھا اور اوپر کی سطور میں جو تذکرہ آیا ہے کہ فلاں وقت مقصود حاصل ہوگا' اس کا مقصد بھی خلافت نہیں ہے بلکہ

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۸۸

اصل صرف رضائے باری تعالیٰ ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ "میں نے (حضرت گنگوہی کی خدمت میں) عرض کیا کہ میں کسی دنیاوی مقصد یا نفسانی غرض سے نہیں آیا۔ میرا مقصد بجز طلبِ ذات حق سبحانہٗ اور کوئی نہیں ہے۔ ارشاد ہوا تھا کہ ایک جینے کے لیے تو یہاں آجا اس لیے حاضر ہوا ہوں، میں کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا[1] مگر خلافت درحقیقت ایک ولیِ کامل کی جانب سے مقبولیت عند اللہ اور صلاحیت و تقویٰ کی کسی حد تک تصدیق و تائید ہوتی ہے اس لیے اس کو مقصود سے تعبیر کیا ہے۔ ورنہ اصل واقعہ یہ ہے کہ خلافت عطا ہونے کے بعد حضرت پر انکسار و تواضع کی وجہ سے تاسف اور خجالت کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔" مجھ پر اس وقت سخت صدمہ تھا اور بار بار روتا تھا کیونکہ اپنی ناقابلیت، نامرادی اور بدحالی مشاہد تھی۔ اس صدمہ کا اثر گفتار و رفتار وغیرہ پر ظاہر تھا[2] پھر یہ کہ خلافت کے بعد حضرت کی رغبت تھی کہ اشغال سلوک و تصوف میں مزید سلاسل کے مقامات بھی طے کیے جائیں۔

چنانچہ پیر و مرشد سے عرض کیا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا سلوک بھی طے کرنا چاہتا ہوں۔ مگر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جو تعلیم میں نے دی ہے وہ بالکل آخری ہے اسی میں جد و جہد کر کے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے[3]

اس باب میں اپنی کیفیات کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اثنائے سلوک میں انوار، مکاشفات، الہامات وغیرہ بالکل پیش نہیں آئے۔ ہاں یہ بہت پیش آیا کہ اپنے سامنے بدر کامل یا تیز روشنی کی ایک ایک دو دو شمعیں بیداری و نیم خوابی کی حالت میں ہر جگہ مدینہ منورہ میں ہندوستان میں اور بعد میں احمد آباد جیل وغیرہ میں دیکھتا رہا جس سے حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فیوض و برکات سے استفادے کا اندازہ ہوتا تھا[4] خلافت کے بعد اچانک اس حالت کا تذکرہ فرمایا ہے کہ بار بار نماز میں اور ذکر و شغل کی حالت میں کائنات بالکل تنگ معلوم ہوتی تھی اور اس قدر گھبراہٹ پیش آتی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ نماز توڑ کر بھاگ جاؤں۔

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۹۶۔ [2] ایضاً، ص ۸۸۔ [3] ایضاً، ص ۸۸۔ [4] ایضاً ص ۸۸

حضرت سے عرض کیا تو فرمایا کہ کلیر شریف حاضر ہو۔ چنانچہ ہم دونوں بھائی کلیر شریف اور دیوبند وغیرہ گئے[1] اس سفر کے بعد تقریباً پندرہ روز گنگوہ میں قیام کر کے حضرت اپنے وطن ٹانڈہ وغیرہ تشریف لے گئے۔ اور اس کے بعد حجاز مقدس اور مدینہ منورہ کے لیے واپس ہو گئے۔ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ کی ابتدا میں گنگوہ پہنچے تھے اور شوال ۱۳۱۹ھ کی ابتدا میں واپسی کے لیے روانہ ہو گئے گویا چھ یا سات مہینے ہندوستان میں قیام رہا۔

دوسری بار مدینہ طیبہ کی واپسی اور درسِ حدیث

۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۱ء تا ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء

اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں رہنے کی پیاس ابھی بجھی نہیں تھی مگر گھر اور خاندان کے حالات اور والدِ ماجد مرحوم کا اصرار اس کا متقاضی ہوا کہ کل سات ماہ ہندوستان میں قیام کے بعد حضرت مدینہ طیبہ واپس ہو جائیں۔ اس مختصر سے وقفے میں سے بھی کل تین ماہ قطب العالم حضرت گنگوہیؒ کی صحبتِ بابرکت میں گذرا، باقی وقت دیوبند، امروہہ اور وطنِ مالوف (فیض آباد) کے اسفار میں لگ گیا۔ شوال ۱۳۱۹ھ کی آخری تاریخوں میں مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے اور حج وعمرہ وغیرہ کی برکات سے مشرف ہوتے ہوئے ۱۳۲۰ھ کے شروع میں مدینہ طیبہ کی حاضری دوبارہ نصیب ہوئی۔

> "بدقسمتی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایسے اسباب وعوارض پیش آگئے جنھوں نے قیام نہ کرنے دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ گھر والوں پر مدینہ منورہ میں سخت عسرت کا حال گذر رہا تھا۔ والد صاحب کے بھی تقاضے آتے تھے جن کی بنا پر حضرتِ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جلد واپسی کا ارشاد فرمایا۔"
>
> "حضرت نے دو حج بدل اپنے اعزہ کے عطا فرمائے جن سے مدینہ منورہ تک واپسی کی صورت ہو گئی۔ اس زمانے میں بمبئی اور کراچی کے بندر بند تھے۔ پور بندر سے حجاج کی روانگی مقرر ہوئی تھی۔ غالباً ابتدائی شوال میں

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۸۸۔

جہاز روانہ ہوا۔ ذیقعدہ کی ابتدا میں جدہ پہنچا اور پھر بعد از حج ابتدائے ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچنے کا شرف حاصل ہوا۔"[1]

مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد تدریس اور اسباق کا مشغلہ شروع فرمایا۔ طالبینِ علوم اسلامیہ اور تشنگانِ حدیث و قرآن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ اور حضرت رحمۃ اللہ نے قدرے قلیل آرام اور بشری ضروریات کے لیے گنجایش چھوڑ کر شب و روز کا سارا وقت قال اللہ و قال الرسول کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ حتیٰ کہ مشاغلِ طریقت اور سلوک و تصوّف کے لیے بھی وقت پوری طرح فارغ نہیں رہا۔ روزانہ چودہ پندرہ اسباق پڑھاتے تھے اور تعطیل کے ایام میں بھی آرام نہیں فرماتے تھے۔ تفسیر، حدیث، معانی و کلام، فقہ، ادب اور عقائد کی وہ کتابیں جو پڑھ پڑھا چکے تھے وہ تو تھیں ہی مگر ایسے علوم اور کتابیں بھی زیرِ درس رہیں جن کے مطالعے اور پڑھنے کا موقع اس سے پہلے نہیں ملا تھا گویا صحیح معنوں میں اس مصرعے کا مصداق ہو گئے:

"پگھلنا علم کی خاطر مثالِ شمع زیبا ہے"

اُس زمانے کی علمی جد و جہد کا تذکرہ حضرت ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"اِس مدت میں طلبہ میں کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ابتدائی کتابیں بھی صاف ہو چکی تھیں۔ عربی تقریر کی مشق بھی اچھی طرح ہو گئی تھی۔ اس لیے طلبہ کا ہجوم زیادہ ہوا۔ ضروری تھا کہ کچھ وقت مشاغل طریقت کے لیے روزانہ مقرر کیا جاتا اور اس میں تعلیم فرمودہ اشغال کو انجام دیا جاتا۔ مگر بدقسمتی سے جب بھی اس کے لیے بیٹھتا تھا تو ہجوم خواطر و احادیث نفس و غلبۂ نوم سے پریشان ہو جاتا تھا۔ ادھر طلبہ کے ہجوم نے اس پر مجبور کر دیا کہ جس قدر بھی ممکن ہو ان کو تعلیم کے لیے اوقات دیئے جائیں۔"[2]

معاشی ضروریات اور خاندان کی کفالت کے مسائل کا حل بھی ضروری تھا اس لیے ایک مدرسے میں مدرسی کی ملازمت بھی اختیار کی جس کی تنخواہ پچیس روپیہ ماہوار مقرر ہوئی۔ مگر اصحاب علم اور طلباء کے اصرار پر ملازمت کی تدریس سے جو وقت خالی بچتا تھا

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۸۹
[2] ایضاً، ص ۸۹

اس کا ایک ایک منٹ حرم نبوی کے دروس میں خرچ کرتے تھے۔

"چونکہ طلبا، کا ہجوم ہوا اس لیے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم نبوی میں پڑھانے لگا۔ صبح کی نماز کے بعد، عصر بعد، مغرب بعد بلکہ عشا بعد بھی مختلف علوم وفنون کی کتابیں شروع کرا دیں[1]۔"

جو کتابیں ہندوستان میں متداول نہیں تھیں اور جن سے اس سے پہلے تعلق نہیں رہا تھا ان کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ فرمایا ہے۔

"بہت سی ایسی کتابیں جن کو ہندوستان میں پڑھایا نہیں جاتا ہے اور مدینہ منورہ، مصر، استانبول وغیرہ میں وہ داخل نصاب میں وہ بھی پڑھانی پڑیں۔ مثلاً اجرومیہ، دحلان، کفراوی، الفیہ، ابن عقیل، شرح الفیہ ابن ہشام (نحو میں) شرح عقود الجمان، رسالہ استعارات، رسالہ وضعیہ للقاضی عقد وغیرہ (معانی وبیان میں) بدیعیہ ابن حجر (بدیع میں) نور الایضاح ملتقی الابحر ورد وغیرہ (فقہ) شرح جمع الجوامع للسبکی وشرح مستفعی الاصول ورقات وشرح منتہی الاصول وغیرہ (اصول شافعیہ ومالکیہ میں) مسامرہ شرح مسائرہ شرح طوالع الانوار جوہرہ وغیرہ (عقائد میں) الفیہ اصول الحدیث بیقونیہ ودیگر رسائل اصول حدیث میں۔

اسی طرح فرائض اور منطق وغیرہ کے متعدد رسائل اور کتابیں جن کو یہاں سنا بھی نہ تھا پڑھانا پڑا۔ چونکہ نفس فن میں ان فنون سے مناسبت تھی اس لیے کچھ دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ جن کتابوں کو یہاں (ہندوستان میں) پڑھا تھا خواہ تفسیر کی یا حدیث معانی کلام فقہ یا اصول وغیرہ کی، ان کی بھی بارہا نوبت آئی اور بحمد اللہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ دروس جاری رہے[2]۔"

یہ چودہ چودہ اور پندرہ پندرہ اسباق کی ریاضت اور مجاہدہ صرف پڑھانے اور سبق کی تقریر کرنے ہی پر ختم نہ تھی بلکہ ان اسباق کے لیے مطالعہ اور تحقیق تیاری اور

---

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۶۳۔ [2] ایضاً، ص ۹۸

ترتیب بھی کرنی پڑتی تھی۔ یہ مطالعہ اور تیاری ایک تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی ہوتی ہے جن کو ایک ہفتہ میں چھ یا سات پیریڈ لینے پڑتے ہیں۔ (پیریڈ لینا سبق پڑھانے سے بالکل مختلف چیز ہے) اور جو ایک ورق پر یا کاپی پر کچھ نوٹ لکھ کر لاتے ہیں اور اسی پر ایک لکچر دے دیتے ہیں مگر ایک مطالعہ اور سبق کی تیاری حدیث، تفسیر، فقہ اور معانی وبیان کے قدیم علماء اور اساتذہ کی ہوتی تھی۔ جس میں موضوع اور علم متعلقہ کے سارے ہی مالہٗ وما علیہ مستحضر کرنے پڑتے تھے اور کئی کئی کتابیں، شروح اور حواشی کا مراجعہ کرنا پڑتا تھا۔ حضرت نے اپنے اسباق کی تیاری کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"میں نے حافظہ کی تقویت کے لیے علمائے خیر آباد کا طریقہ اختیار کیا تھا کہ نفس کتاب یا شرح یا حاشیہ سبق پڑھاتے وقت سامنے نہ رکھتا تھا بلکہ ہر طالب علم کی قراءت عبارت کے بعد مسائل پر تقریر کرتا تھا اور سمجھاتا تھا۔ گھر پر کتاب اور اس کی شرح اور حواشی خوب دیکھ کر مسائل کو منضبط کر کے جاتا تھا۔"[1]

اسی سلسلے میں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"اس امر کا التزام تھا کہ کوئی کتاب بلا مطالعہ اور بغیر شروح وحواشی پر پوری طرح نظر ڈالے بغیر نہ پڑھائی جائے۔ اسی وجہ سے دن ورات میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ سونا ملتا تھا باقی اوقات مطالعہ یا تدریس یا ضرورتِ بشریہ وغیرہ میں صرف ہوتے تھے۔"[2]

ان علمی اور تدریسی مشاغل کے ہجوم میں، ایسی عابدانہ اور زاہدانہ زندگی کے درمیان میں اور ایسے تبحر علمی اور مشیخت کے درجات پر فائز ہوتے ہوئے بھی گھر بار، اہلِ خاندان اور والدین ماجدین کی روزمرہ خدمات بھی اپنے ہاتھوں انجام دینی پڑتی تھیں۔ مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ علماء ہوں یا محدثین ہوں، فضلا ہوں یا مفسرین ہوں انسانی ضروریات، اہل وعیال کی فرمائشات اور گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ تو سبھی کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ تاہم حضرت رحمۃ اللہ علیہ والدین یا اہلِ خاندان کی جو خدمات انجام

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۶۳۔ [2] ایضاً، ص ۹۰

دیتے تھے وہ بڑی بے مثال اور عظیم الشان خدمات تھی۔

جس وقت حضرت حرم نبوی میں حدیث و تفسیر قال اللہ و قال الرسول کا سبق پڑھا رہے تھے عین اسی وقت میں حضرت کے والد ماجد گھر کی تعمیر میں مصروف تھے۔ حالات کی تنگی کی بنا پر ایسی فراخی میسر نہ تھی کہ تعمیری ضروریات میں مستریوں، راجوں اور مزدوروں کی تعداد بقدر ضرورت مہیا کی جاتی۔ مجبوراً گھر والوں کو بھی کام میں لگنا پڑتا تھا۔ چنانچہ والد ماجد مرحوم جب مجبور ہوتے تھے تو حسین احمد کو بھی مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے بلوا بھیجتے تھے۔ کام بھی کوئی نگرانی یا پاسبانی یا حساب و کتاب کا نہیں تھا بلکہ وہ بیٹا جو مدینہ طیبہ کے اعیان علماء میں شمار ہونے لگا تھا جو حرم پاک میں طلبا و فضلا کو قال اللہ اور قال الرسول کا درس دیتا تھا جو مستقبل قریب میں شیخ الاسلام اور مجاہد فی سبیل اللہ کے درجے پر فائز ہونے جا رہا تھا۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں اینٹیں پاتھنے کے لیے، گارا بنانے کے لیے، مٹی ڈھونے کے لیے اور پتھر اٹھانے کے لیے بجمال خندہ پیشانی اور بہ صد طیب خاطر درمیانِ درس سے یہ کہہ کر اٹھ جاتا تھا کہ اب مزدوری کا کام کرنا ہے اس لیے باقی سبق اگلی فرصت میں ہوگا اور یہ جذبہ بطور خاص قابل صد آفریں ہے کہ اس کے برملا اظہار و اعلان میں ادنیٰ جھجک اور ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

"بسا اوقات مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا پڑھاتا ہوتا تھا اور آدمی آتا کہ والد صاحب بلاتے ہیں۔ طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹیں ڈھونے والا مزدور آج نہیں آیا۔ تم اس کام کو انجام دو۔ بہ مجبوری تمام دن یہ کام انجام دینا پڑتا تھا اور تمام اسباق کو معطل کرنا پڑتا تھا۔ بسا اوقات ایک ایک دو دو ہفتہ اسباق معطل کر کے تمام اوقات انہی تعمیری خدمات میں صرف کرنا پڑا۔ بڑے بھائی صاحب اور دوسرے بھائیوں اور بچوں کو بھی ایسا کرنا پڑتا تھا مگر میں سب سے زیادہ مضبوط اور نوجوان تھا اس لیے مجھ پر نزلہ زیادہ گرتا تھا۔ چھوٹے بھائی جمیل احمد مرحوم اور

محمود احمد بھی اگر اپنی تعلیمات سے فارغ ہوتے تھے تو وہ بھی یہ کام انجام دیتے تھے۔ گارا بنانا۔ گارا ڈھونا۔ اینٹیں پاتنا۔ اینٹیں معماروں تک پہنچانا۔ پانی بھرنا (گارے کے لیے) وغیرہ تمام ضروریات عمارت ہم لوگ انجام دیتے رہے[1]۔"

شروع شروع میں جب ہندوستان سے دوسری مرتبہ آمد ہوئی تو مدرسہ شمسیہ باغ میں مدرسی کی ایک ملازمت بھی مل گئی تھی جس کی تنخواہ پچیس روپیہ ماہوار ملتی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ ان طلبا کو جن کے لیے مدرسہ میں داخلہ ممکن نہیں تھا حرم پاک میں اسباق پڑھاتے تھے۔ مدرسہ کی ملازمت کا میدان تو محدود ہی رہا مگر حرم نبوی کے تلامذہ کا حلقہ روز افزوں وسیع اور مقبول ہوتا گیا۔ مدینہ طیبہ کے مقامی طلبا کے ساتھ دوسرے اسلامی ممالک کے نوجوان اور محبین علم و فضل جوق در جوق زمرۂ تلامذہ میں شامل ہونے لگے۔ یہاں تک کے دوسرے تمام اساتذہ اور شیوخ کے مقابلہ میں حضرت کا حلقہ تلامذہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

"علوم میں جد و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ اور علما اور مدرسین کے حلقہ ہائے دروس میں اس کی مثال نہیں تھی۔ بعض بعض علما ایسے بھی تھے کہ ان کے یہاں پہلے پہل رجوع بہت زیادہ تھا مگر بعد میں کم ہو گیا اور ان کے طلبا بھی میرے یہاں آنے لگے[2]۔"

حق تعالیٰ نے مقبولیت، شہرت، عزت اور علمیت کا ایسا درجہ عطا فرمایا تھا تو اس خاندان کا وجود لوگوں کی خاص طور پر علما اور مدرسین اور اعیان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ کچھ تو اس لیے کہ ایک ہندوستانی اور غیر ملکی خاندان جو ابھی چند دنوں پہلے وارد ہوا تھا اور کل تک گمنام اور مفلوک الحال تھا، دیکھتے ہی دیکھتے پورے مدینۃ الرسول میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور زیادہ تر اس لیے کہ ایک نوجوان نوعمر ہندی عالم ایسا بڑھ گیا کہ عوام و خواص اس کو عرب کے علما پر بھی فوقیت دینے لگے چنانچہ یہ لوگ مختلف طریقوں سے معاندت اور مخالفت کے درپے ہو گئے۔ حضرت کے اخلاقی فضائل اور مناقب میں ایک بڑی فضیلت یہ تھی کہ تمام عمر کبھی کسی معاند، حاسد اور

[1] نقش حیات۔ ج ۱۔ ص ۱۰۰۔ [2] ایضاً۔ ص ۹۹

دشمن کے خلاف نہ کبھی کوئی اقدام کیا، نہ زبان کھولی اور نہ کبھی کوئی توجہ کی۔

"جس طرح بہت بڑی جماعت محبین اور ارباب عقیدت کی پیدا ہوگئی اسی طرح ایک جماعت حاسدین اور رقباء کی بھی پیدا ہوگئی۔ اس میں غیر علمی ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جو محض اس بنا پر بغض رکھتی تھی کہ اس خاندان کو اس قدر مقبولیت اور وقعت کیوں حاصل ہوتی جارہی ہے۔ اگرچہ میرے طرز عمل اور اکابر کے اتباع اخلاق و اعمال اور تواضع کی وجہ سے ان کی کامیابی کی صورتیں منصۂ ظہور میں نہیں آسکیں مگر پھر بھی ان کے دلوں میں حسد کے زخم ہرے ہوتے رہے[1]۔"

یہ مخالفتیں، عداوتیں اور رقابتیں ابھی تک اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ اس لیے کہ حضرت کے اخلاقِ حسنہ، تواضع اور انکساری اور حلم و بردباری نے لوگوں کو کھل کر سامنے آنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ مگر اسی درمیان ایک ایسا موقع پیش آگیا جس نے لوگوں کی ریشہ دوانیوں کو طشت ازبام کردیا۔

۱۳۲۴ھ میں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور اپنی ایک تالیف "حسام الحرمین" پر مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ کے علماء اور اہل رائے حضرات کی تصدیق و تائید چاہی۔ اس تالیف میں ہندوستان کے اکابر علماء، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی وغیرہ وغیرہ رحمہم اللہ علیہم پر مختلف قسم کے اتہامات اور تکذیب و تکفیر تھی۔ جھوٹے، بدعقیدہ اور خلافِ ایمان اقوال اور عبارتیں ان حضرات اکابر کی جانب منسوب کی گئی تھیں اور اس کے بعد ان پر حکم لگایا تھا۔ معاندین اور حاسدین نے حضرت کے خلاف کارروائی اور سازش کا یہ موقع غنیمت جانا اور خان صاحب موصوف کے ساتھ اس سازش میں شریک ہوگئے کہ پہلے ان کے خلاف فتویٰ مکمل ہوجائے پھر یہ بات سامنے لائی جائے گی کہ یہی لوگ

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۰۰

مولانا حسین احمد صاحب کے اساتذہ اور شیوخ ہیں۔ منصوبے میں یہ بات بھی طے کی گئی کہ اگر مولانا حسین احمد صاحب کو اس کارروائی کا پتہ چل گیا تو ساری اسکیم خاک میں مل جائے گی اس لیے کہ تمام اعیان اور ذمہ داران و علماء تصدیق و تائید سے اس بنا پر انکار کردیں گے کہ فضیلۃ الشیخ الاستاذ الکبیر الفاضل الاجل السید حسین احمد المدنی جیسے باخدا ولی اللہ اور متبحر عالم کے شیوخ اور اساتذہ ہرگز غلط عقائد کے حامل نہیں ہوسکتے۔ اس لیے یہ ساری سرگرمی نہایت خفیہ اور پوشیدہ رکھی گئی۔ مگر جیسے ہی دو چار علماء کے سامنے خاں صاحب کا رسالہ پیش ہوا۔ انھوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے رسالے کا اس کے مضامین کا اور حضرات اکابر کا تذکرہ کردیا۔ اور حضرت نے فوراً پورا اہتمام توجہ اور وقت خرچ کرکے علماء مدینہ پر خاں صاحب کے رسالے کی حقیقت واضح کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے دستخط کردیے تھے ان میں اکثر نے خاں صاحب سے مطالبہ کیا کہ ان کا نام حذف کردیا جائے اور جنھوں نے نہیں کیے تھے انھوں نے رسالے پر کوئی توجہ نہیں کی۔ اس واقعہ کے بعد ہی حضرت نے اپنا پہلا رسالہ خاں صاحب اور ان کی جماعت کے بارے میں تالیف فرمایا جس کا نام "الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب" ہے۔ مسئلہ کی، عقائد کی اور اتہامات اور ان کے جوابات کی صحیح تفصیل و تحقیق تو حضرت کی اس تالیف ہی میں ملے گی مگر واقعے کا ہلکا سا خاکہ آپ حضرت کی تحریر سے ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

"مولوی احمد رضا خاں صاحب بعد از حج مدینہ منورہ پہنچے۔ ان کی آمد پر یہ زخمی جماعت (مخالف ہندوستانیوں وغیرہ کی) ان کے اردگرد جمع ہوگئی اور ہماری بڑھتی ہوئی وجاہت اور رفعت سے جو خطرات ان کو اپنے عقائد اور خیالات کے متعلق اور اپنی اپنی پوزیشنوں کے بارے میں نظر آرہے تھے پیش کیا۔ نیز یہ کہا کہ رسالہ حسام الحرمین کے خلاف اگر حسین احمد نے کوشش کی تو کامیابی نہ ہوسکے گی اور یہی عظیم الشان مقصد مولوی احمد رضا خاں صاحب کا تھا یعنی یہ کہ اس رسالے کی تصدیق علماء مدینہ کردیں اس لیے مشورہ ہوا کہ بڑے بڑے حکام سیاسی اور مذہبی سے ملاقات اور تعارف کرایا جائے اور ان کی

خدمات میں نذرانے پیش کیے جائیں وسائل مہیا کیے جائیں اور متعدد وسائل مولوی صاحب موصوف کے پیش کر کے ان کی علمیت سے مرعوب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس فیض آباد کے خاندان کو شہر بدر اور جلاوطن کر دیا جائے۔"[1]

اس مضمون کے تحت پوری تفصیل، علماء کے عقائد کا تفصیلی تذکرہ اور خاں صاحب کے اتہامات اور ان کے جوابات بڑے شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر آخر میں تحریر فرمایا ہے:

"اس فتنہ پر یہ کوشش بڑے زور سے عمل میں لائی گئی تھی کہ انہی حضرات کے تلامیذ اور متبعین حسین احمد اور اس کے برادران وغیرہ ہیں لوگوں نے کہا کہ آج تک ہم نے کوئی بات ان سے خلاف طریقہ اہل سنت والجماعت نہیں دیکھی تو یہ جواب دیا کہ وہ چھپاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سب لوگوں کو گمراہ کردیں گے۔ اس پروپیگنڈہ کو سید یٰسین مرحوم کابلی کے ذریعہ جو کہ عثمان پاشا والیِ مدینہ منورہ کے یہاں رسوخ کامل رکھتا تھا عثمان پاشا موصوف تک پہنچایا گیا مگر پول کھل جانے اور عنایت ایزدی کے شامل حال ہوجانے اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات نے ان کو ناکام کیا اور بحمد اللہ ہمارا کوئی بال بیکا نہ کر سکے، کچھ عرصہ تک ہندوستانی مجاورین اور بعض ان کے ہمنواؤں میں کھچڑیاں پکتی رہیں، مخالفتیں بھی لوگ کرتے رہے مگر میرا حلقۂ درس بڑھتا ہی رہا، قبولیت عامہ اہل مدینہ اور اہل علم و فضل میں روز افزوں ہوتی رہی اور مخالف اشخاص کو ناکامی کے ساتھ ذلت کا بھی سامنا ہوتا رہا۔ اگرچہ ہم نے کبھی کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا، مگر منتقم حقیقی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں دو تین ہی سال میں تمام مخالفین کا قلع قمع ہوگیا۔ وللہ الحمد والمنۃ"[2]

قیام مدینہ طیبہ کے اسی دور میں ۱۳۲۶ھ میں حضرت کی پہلی اہلیہ تپ دق میں مبتلا ہوکر انتقال فرماگئیں کل چودہ برس ان کی رفاقت رہی اور مرحومہ اپنی یادگار ایک صاحبزادی

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۰۱ ۔ [2] ایضاً ص ۱۱۸

زہرا بعمر تین برس چھوڑ گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ تعلیم تدریس مطالعہ تحقیق اور علمی مشاغل کے لیے حضرت کو جو ذہنی اور دلی سکون و طمانیت میسر تھی اس حادثے کی وجہ سے وہ سب درہم برہم ہوگئی۔ بچی کی پرورش کا سوال ایسا مسئلہ بن گیا جو ہر وقت بے چین کرنے لگا۔ بالآخر عقد ثانی کا فیصلہ کیا گیا، مگر اپنے کفو، خاندان اور بود و باش سے باہر خصوصاً عربی خاندانوں میں شادی کرنا مسائل اور مشکلات کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھانے کے مرادف تھا۔ موجودہ زمانے کی فیشن ایبل خواتین بہایت شاندار کثیر المصارف شوقین مزاج اور آرام پسند ہوتی ہیں۔ ہندوستانی خواتین میں جو قناعت، جز رسی، سادگی، کفایت شعاری اور تحمل و برداشت ہے۔ وہ دوسرے سارے ہی ممالک کی خواتین میں کم یاب ہے۔ اصل نسل، خاندان، خون، ہڈی وغیرہ کا جو لحاظ و اہتمام شادی بیاہوں میں ہندوستان میں کچھ عرصہ پہلے تک رکھا جاتا تھا اس کا غیر ممالک میں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ ان حالات کے پیش نظر حضرت کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حکم دیا کہ ہندوستان جا کر دہیں عقد ثانی کیا جائے۔

> "عرب کی عورتیں بہ نسبت ہندوستانی عورتوں کے زیادہ تر آزاد اور مصارف میں زیادہ تر وسعت پذیر ہیں۔ ان کی خوش خوراکی اور خوش پوشی کی فضول خرچیاں معمولی آمدنی سے پوری ہونی مشکل ہوتی ہیں۔ پھر آئے دن رشتہ داروں بالخصوص عورتوں کا آنا جانا۔ قیلہ (پکنک) اور اجتماعات کرنا اور ان کے مصارف کا بارِ گراں اٹھانا معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستانی مجاورین بھی وہاں کی عادات سے کم و بیش متاثر ہوگئے ہیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم اور عزیزم محمود سلمۂ کے نکاحوں سے تجربہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں کفو کا ملنا بھی سخت مشکل تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر ہندوستان کا سفر کرنے اور یہاں کفو میں عقد کرنے کا حکم والد صاحب نے نافذ کر دیا۔"[1]

حضرت کو بڑی آرزو تھی کہ ایک بار پھر اپنے شیخ اور استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۱۹

خدمت میں ایک معمولی طالب علم کی طرح زانوے ادب تہہ کرنے کا موقع نصیب ہو۔ مگر اس خواہش کی تکمیل کی کوئی شکل سامنے نہ تھی۔ نہ معاشی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ والد ماجد سے بلا کسی معقول وجہ اور شدید مجبوری کے حصول اجازت کی درخواست پیش کی جا سکتی تھی۔

"میری اس زمانہ میں عین خواہش تھی کہ اب جبکہ کتب درسیہ اور مضامین عالیہ علم کلام و فقہ و اصول حدیث و تفسیر وغیرہ کے مستحضر ہو چکے ہیں اور فنونی کتابوں پر عبور حاصل ہو چکا ہے کسی طرح حضرت استاذ الاساتذہ، راس المحققین مولینا شیخ الہندؒ قدس اللہ سرہٗ العزیز تک باریابی ہو جائے تو اپنے اشکالات کو حل کرنے اور کتب حدیث کے دوبارہ پڑھنے کا شرف حاصل ہو۔ مگر اس تمنا کے پوری ہونے کے اسباب مہیا نہ تھے۔ اس حادثہ کے واقع ہونے اور والد صاحب مرحوم کے اس حکم سے آرزوؤں کا باغ سرسبز ہو گیا"[1]

اور حضرت ۱۳۲۶ھ کے آخر میں ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ۱۳۳۰ھ کی ابتدا میں دوسری بار مدینہ طیبہ کی حاضری ہوئی تھی اس طرح اس بار کل سات برس کامل شب و روز دربارِ نبوی کی دربانی اور حرم پاک میں حدیث و قرآن کی مدرسی کا شرف نصیب ہوا۔

ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

ہندوستان کا دوسرا سفر ۱۳۲۶ھ تا ۱۳۲۹ھ

دوبارہ طالب علمی، دیوبند کی مدرسی، دستار بندی اور نکاح ثانی

یہ سفر شیخ احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں ہوا جو بڑے مخلص، ولی اللہ اور صاحبِ حال بزرگ تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وطن مالوف فیض آباد میں ٹانٹ شاہ کی مسجد میں مدرسہ احمدیہ حنفیہ قائم کر کے دین و شریعت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اسی مدرسے میں

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۱۹

حضرت شیخ الہندؒ کے مشہور و محبوب شاگرد، عالمِ دین حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کم و بیش پچاس سال تک قرآن و سنّت کی روشنی پھیلاتے رہے۔ حضرت مدنیؒ مدینہ منورہ سے بمبئی، جھانسی اور دہلی ہوتے ہوئے دیوبند پہنچے۔ دلی مقصد چونکہ حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ و استفاضہ تھا اس لیے آتے ہی استاذ کے اسباق ترمذی اور بخاری میں شریک ہو گئے۔ مدینہ طیبہ کا مشہور و مقبول شیخ الحدیث، حرمِ نبوی میں قرآن و سنّت کا مدرس، اعلم عرب و عجم کے ہزاروں تشنگانِ علوم الٰہیہ کا استاذ، دنیائے اسلام اور مسلمانانِ عالم کے ایک بڑے حصے کا مقتدا و مطاع آج پھر مدرسہ دیوبند میں اپنے محبوب استاد کی درسگاہ میں ٹاٹ کے بوریے پر ایک مبتدی طالب علم کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔ اس دوسری طالب علمی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ عرصۂ دراز تک حدیث و تفسیر، فقہ و عقائد وغیرہ مضامین پڑھانے کے بعد بہت سے ایسے مسائل، اشکالات اور سوالات سامنے آئے تھے جن کے متعلق مکمل بحث و تحقیق کی ضرورت تھی اور یہ مقصد حضرت شیخ الہندؒ ہی کے ذریعے حل ہو سکتا تھا۔

"مدینہ طیبہ سے میں سیدھا دیوبند پہنچا اور ترمذی شریف اور بخاری شریف کے درس میں شریک ہو گیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پھر پڑھا۔ مسائل پر پوری بحث کیا کرتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلافِ عادت تحقیقی جوابات نہایت وضاحت سے دیتے تھے"[1]۔

اس زمانے میں بھی مدرسہ دیوبند تعلیمی اور تنظیمی اعتبار سے بڑے انتشار اور کمزوریوں کا شکار تھا۔ فاضل اور متبحر علماء و مدرسین کی بھی کمی تھی اور نظم و ضبط بھی متزلزل ہو رہا تھا۔ مولانا محمد یعقوب کا وصال ہو چکا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مدرسے کے اہتمام کو چھوڑ کر حجاز ہجرت کر گئے تھے۔ مولانا سید احمد دہلوی صدر مدرس مدرسہ کے حالات سے بیزار ہو کر مستعفی ہو گئے تھے۔ کبھی حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ مہتمم مقرر ہوتے تھے۔ کبھی منشی فضل حق کو مہتمم بنایا گیا۔ پھر مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی مقرر ہوئے اور آخر میں مولانا حافظ احمد صاحب مقرر ہوئے۔ اس ردّ و بدل اور تقرر و تنزّل میں مدرسے کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچ رہا تھا اور

لہ نقشِ حیات، ج ۱، ص ۹۸

تعلیمی سرگرمیاں بھی بہت متاثر ہو رہی تھی [1]

ان حالات میں حضرات اکابر دیوبند حضرت شیخ الہندؒ مولانا حافظ احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن ہمہ وقت مدرسہ کی فلاح و بہبودی اور اصلاح و ترقی کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے۔ اسی سلسلے میں حضرت مولانا حافظ احمد صاحب نے شیخ الہندؒ سے عرض کی کہ اگر کسی طرح مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدرسہ میں آجاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانے پر پہنچ جاتی [2]
اتفاق سے اس تجویز کے بعد حضرت رحمۃ اللہ کی دیوبند تشریف آوری اور اسباق مذکورہ میں شرکت اور فراغت کا واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ باتفاق رائے آپ کا تقرر مدرسۂ دیوبند کی مدرسی پر چوبیس روپیہ ماہوار پر کر دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اگر حضرت مدینہ طیبہ چلے جائیں تو جب بھی واپس آئیں گے بدستور مدرسہ کے مدرس شمار ہوں گے اور از سرِ نو تعین و تقرر کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ مدرسہ دیوبند اور ہندوستان میں حضرت کا پہلا منصب تھا جو آخری عمر تک باقی رہا۔

"۱۳۲۶ھ شوال میں مجھ کو تدریس کا حکم دیا گیا۔ جلسہ اہلِ شوریٰ نے حضرات شیخین رحمہما اللہ کی خواہش اور تجویز کو پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ چوبیس روپیہ ماہوار مدرس کر دیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس آئے اس کو بغیر تحریری اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے چنانچہ مجھ کو متعدد اسباق اوپر کی کتابوں کے دیے گئے [3]"

مدینہ منورہ میں رہ جانے، بس جانے اور توطن اختیار کر لینے کے بعد حضرتؒ کی ہندوستان واپسی کے ظاہری اسباب تو آئندہ واقعات سے آپ اخذ کریں مگر باطنی سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُمت کے اکابر نے تاحیات آپ کو دارالعلوم دیوبند اور اس کے واسطے سے ہندوستان میں علمی دینی اور مذہبی خدمات کے لیے اس موقعہ پر مقرر کر دیا تھا۔ دینی اور علمی خدمت کا شرف ہونے کے ساتھ حضرت کو بڑی دولت یہ

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۲۳۔ [2] ایضاً، ص ۱۳۱۔ [3] ایضاً، ص ۱۲۳۔

میسّر آئی کہ شب و روز سفر حضر سوتے جاگتے اور جلوت خلوت میں اپنے محبوب، مربّی، استاذ اور شیخ کی خدمت اور ملازمت کی سعادت نصیب ہوئی حتیٰ کہ قیام بھی حضرت ہی کے آستانے پر مقرر ہوا۔

تصوّرِ عرش پر ہے وقفِ سجدہ ہے جبیں میری ۔۔۔ تو میرا پوچھنا کیا آسماں میراز میں میری

عین اسی زمانے میں مدرسہ دیوبند کا جلسۂ دستار بندی طے پایا۔ یہ اپنی نوعیت اور مخصوص طرز کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ اس میں ہزاروں فضیلت مآب علماء جو مدرسہ سے فارغ ہو چکے تھے، شریک ہوئے اور ان کی دستار بندی کی گئی۔ اس کی شان وشوکت انتظام و انصرام اور کیفیات و کارروائیوں کی تفاصیل کا یہاں موقع بھی نہیں ہے اور خارج از بحث بھی ہے۔ مگر اتنا تذکرہ یہاں اس لیے کیا گیا کہ جلسے کے انتظام میں حضرت کے ذمّہ یہ خدمت کی گئی کہ طلباء کو تقاریر اور خطاب کے لیے تیار کریں اور خود بھی اپنے مواعظ حسنہ سے حاضرین کو مستفیض کریں۔ چنانچہ جب نوعمر اور نوخیز طلباء نے اعلیٰ درجہ کی فصیح و بلیغ اُردو اور عربی زبان میں تقریریں کیں تو سننے والے دنگ رہ گئے اور لاکھوں انسانوں کے مجمع میں ایسی خاموشی چھا گئی کہ سوئی گر جائے تو آواز سنائی دے۔ طلبا اور کئی علماء کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آقائے نامدار سرکارِ دو عالم صلی اللہ وسلم کی سیرت پر تقریر فرمائی اور پھر اسی مجمع میں حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحب نے اپنے محبوب شاگرد اور روحانی فرزند کے سر پر اپنے ہاتھوں سے دستارِ فضیلت باندھی۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اپنی جانب سے دستاریں اور عمامے پیش کیے[1] ان تمام علمی اور روحانی مشاغل میں تین سال گذر گئے۔ ہندوستان آنے کا مقصد تقریباً پورا ہو چکا تھا۔

والد ماجد کا حکم عقد ثانی بھی اس طرح پورا ہوا کہ اپنے خاندان میں تو کوئی اپنی لڑکی کو ہمیشہ کے لیے سمندر پار بھیجنے پر رضامند نہیں ہوا۔ مگر حسنِ اتفاق سے بچھراؤں ضلع مراد آباد کے ایک بزرگ حکیم غلام محمد صاحب اس شرط پر اپنی صاحبزادی کے ساتھ

---

[1] نقشِ حیات۔ ج ۱۔ ص ۱۲۵

رشتہ کرنے پر تیار ہو گئے کہ اول تو برات میں تمام اکابر اور علماء دیوبند تشریف لائیں۔ دوسرے یہ کہ رخصتی کے دو ایک سال بعد دلہن کو ہندوستان لاکر سب سے ملاقات کرائی جائے۔ دوسری شرط تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے لیے آسان تھی مگر اپنی برات میں صرف شادی کی شرکت کے لیے اپنے اساتذہ اور شیوخ کو زحمت دینا آپ نے گوارا نہیں کیا۔ مگر اس شرط کے لیے آپ کے روحانی باپ اور استاذ شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں اپنی ذمہ داری پر یہ شرط منظور کرتا ہوں۔ سب کی خوشامد کرلوں گا اور سب کو برات میں لے چلوں گا چنانچہ اکابر امت اور کبار علماء پر مشتمل یہ برات زاہدانہ اور فقیرانہ شان سے بھمراؤں تشریف فرما ہوئی اور ۱۳۲۷ھ کے آخر میں حضرت کا دوسرا عقد منعقد ہوا۔ دلہن بھی رخصت ہو کر حضرت شیخ الہندؒ کے دولت کدہ پر اتاری گئیں اور مدینہ طیبہ واپسی تک اسی آستانے پر قیام رہا[1]۔ اب والد مرحوم اور دوسرے اہل خاندان کو حضرت کی جدائی شاق گذرنے لگی تھی۔ خود حضرت کو بھی مدینہ منورہ اور سرکارِ دو عالم کے قدموں میں حاضری کے شوق نے بے چین کیا۔ ارضِ مقدس کے طلباء اور علماء کا تقاضہ بھی مسلسل تھا۔ اتفاق سے الٰہ آباد کے جناب عبدالباقی خاں صاحب مرحوم نے حضرت سے اپنے والد کے حج بدل کے لیے عرض کیا۔ چنانچہ ۱۳۲۹ھ کے آخر میں مبیئی سے ایک آسٹرین جہاز میں اڑسٹھ روپیہ کرایہ دے کر دس دن کا سفر کر کے پورٹ سعید تک آئے۔ یہاں چھ دن تک دوسرے جہاز کا انتظار کیا جس سے حیفا تک آئے۔ اُس زمانے میں حیفا اسرائیل کے قبضے میں نہیں تھا۔ حیفا سے ٹرین میں سوار ہو کر کل اٹھارہ دن کا سفر طے کر کے مدینہ طیبہ کی خاک پاک کا سرمہ لگایا اور اس بار ہندوستان میں کم و بیش تین سال قیام رہا[2]۔

مدینہ منورہ کا تیسرا قیام ۱۳۲۹ھ تا ۱۳۳۱ھ

اگرچہ ہندوستان میں اس بار قیام طویل اور غیبوبت کا وقفہ زیادہ ہو گیا تھا مگر حضرت کی شہرت اور مقبولیت میں روز افزوں ترقی رہی۔ چنانچہ واپسی کے بعد فوراً

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۱۲۱۔ [2] ایضاً، ص ۱۳۶

دروس اور اسباق کا سلسلہ شروع ہوگیا اور قرآن و سنت کی خدمت پہلے سے زیادہ محنت اور مصروفیت کے ساتھ جاری ہوگئی۔ اب آپ کا شمار حجاز کے کبار علماء اور مشائخ میں کیا جانے لگا تھا۔ اُس زمانے کے ارباب حکومت اور ذمہ داران نظم و نسق بھی حضرت کے علم و فضل کے معترف و معتقد ہوگئے تھے۔ ایسا اندازہ ہونے لگا تھا کہ اب حضرت کو اور اہل خاندان کو مدینہ طیبہ میں استقرار و استقلال کے ساتھ رہنا اور مشاغل علمیہ میں آزادی کے ساتھ مشغول رہنے کا موقع نصیب ہوگیا ہے۔ مگر اچانک ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے پورے خاندان کی جمی ہوئی جڑیں پھر ہلا کر رکھ دیں۔ حضرت کے بڑے بھائی مولٰنا صدیق احمد صاحب خاندان کے تمام معاملات اور ضروریات کی بڑی حد تک ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ والد ماجد رحمۃ اللہ بھی معاملات میں ان کی رائے اور اقدامات پر اعتماد اور اطمینان فرماتے تھے۔ نتیجے کے طور پر گھر کے سبھی افراد اپنے اوقات معمولات اور مشغولیات میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ مشیتِ ایزدی اور مصلحتِ خداوندی سے ۱۳۳۰ھ میں کل بیالیس برس میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نے ایک بارہ تیرہ برس کا بچہ وحید احمد اپنی یادگار چھوڑا۔ اب حضرت کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔ یتیم بھتیجا پہلے ہی سے آپ کی تربیت اور نگرانی میں تھا۔ اب مکمل ذمہ داری آپ ہی کے سر آگئی۔ اسی درمیان میں ایک اُلجھن اور بھی پیش آئی کہ آپ کے دوسرے خسر حکیم غلام محمد صاحب نے ایفاءِ شرط اور اپنی صاحبزادی کے سفر ہندوستان کا مطالبہ کر دیا۔ موصوف اس وقت حج کے لیے آئے ہوئے تھے، اُن سے کافی عرض و معروض کی گئی اور مجبوریاں بیان کی گئیں مگر وہ نہیں مانے اور آخر ۱۳۳۱ھ میں حضرت کو تین برس تک مدینہ طیبہ میں متواتر قیام کے بعد تیسری بار ہندوستان کا سفر اختیار کرنا پڑا۔

ہندوستان کا تیسرا سفر ۱۳۳۱ھ

یہ سفر حجاز ریلوے کے ذریعے ہوا۔ قافلے میں اہلیہ کے علاوہ سال بھر کے صاحبزادے

الطاف احمد اور نو عمر یتیم بھتیجے وحید احمد بھی ساتھ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حصولِ علم کے لیے جا رہے تھے۔ ٹرین کے ذریعے فلسطین کی بندرگاہ حیفا تک پہنچے ٹکٹوں کا انتظام حکومت حجاز نے کیا تھا اور قیمت سرکاری خزانے سے ادا کی گئی تھی۔ حیفا اس وقت اسرائیل کی نہیں بلکہ فلسطین کی بندرگاہ تھی اور یہودیوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا وطن تھا۔ یہاں سے بمبئی تک بحری جہاز کا سفر پچپن روپیہ فی کس کرائے میں ہوا۔ بمبئی سے اہلیہ کے وطن بھراؤں کے سفر میں صاحبزادے الطاف احمد بیمار ہو گئے۔ بچہ کے چہرے مہرے سے اقبال مندی، ذہانت اور صحت مندی کے آثار نمایاں تھے۔ ٹرین میں خواتین نے بڑے پیار سے گود میں لیا، کھلایا اور تعریفیں کیں۔ بعض خواتین نے کہا کہ یہ بچہ شکل و شباہت سے ہندوستانی بچہ نہیں معلوم ہوتا۔ مشیتِ خداوندی کہ الطاف یہاں پہنچتے ہی بیمار ہوئے اور پھر جتنے دن رہے بیمار ہی رہے۔ اس لیے حضرت اس مرتبہ زیادہ دن قیام نہ کر سکے اور جتنے دن رہے پریشانی اور اضطراب میں رہے۔ چنانچہ اسی سال کے آخر میں بھتیجے وحید احمد کو حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں چھوڑ کر مع اہل و عیال کے چوتھی مرتبہ مدینہ طیبہ واپس ہو گئے اور مصارفِ سفر اس بار بھی حج بدل کے ذریعے پورے ہوئے۔

مدینہ طیبہ کا چوتھا اور آخری دور۔ سیاسی شعور اور سرگرمیوں کی ابتدا ۳۵-۱۳۳۱ھ

اب تک حضرت کی زندگی کی تمام تر سرگرمیاں اور جوش و خروش، تعلیم و تعلّم اور روحانی اشغال و تصوف تک محدود تھا۔ مگر مدینہ طیبہ میں اس مرتبہ قیام کے دوران آپ نے دنیائے اسلام کے حالات اقوام عالم کے سیاسی داؤ پیچ اور مسلمانوں کے مستقبل پر ایک قلبِ حساس کے ساتھ نظر ڈالی۔ دنیا کے تمام اسلامی ملک جن سے اسلام اور مسلمان دشمن طاقتیں اور خاص کر سرمایہ دار اور سامراجی جماعتیں خائف رہتی تھیں اور جہاں اسلام کا جھنڈا نہ صرف لہراتا رہتا تھا بلکہ اس کے سایے سے ساری غیر مسلم دنیا متاثر و فیضیاب ہوتی جا رہی تھی اور جہاں اللہ اور رسول اللہ کا نام ذرہ ذرہ پر

شب و روز بلند ہوتا تھا، وہ سارے علاقے اور ممالک ایک ایک کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے تھے اور اُن پر استعماری مکر و فریب کے پنجے مضبوط ہو رہے تھے۔ عدن اور اس کے اطراف کے سارے علاقے برطانیہ کے ماتحت ہو گئے تھے۔ فلسطین اور قبلۂ اوّل پر انگریز فتح حاصل کر چکے تھے۔ ترکی کے بہت سے صوبوں بلغاریا، رومانیا، قبرص، بلقان وغیرہ سامراجی سازشوں کا شکار ہو کر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ نہرِ سوئز کو برطانیہ نے خرید لیا تھا اور مصر اور سوڈان برطانیہ کے پنجۂ اقتدار کی گرفت میں آ چکے تھے۔ شام اور لبنان میں ہزاروں مسلمان عوام و خواص ذبح کیے گئے اور اب یہ اسلامی ممالک فرانس اور برطانیہ کے رحم و کرم پر تھے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی اور وہاں کے عوام و خواص سسک سسک کر توہین و ذلت اور مظلومی کی زندگی گذار رہے تھے۔ حجاز پر انگریزوں کی ریشہ دوانیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں اور شریف حسین خلافت سے بغاوت کر کے خود بادشاہ بننے کی سازشیں کر رہا تھا اور برطانیہ کے ہاتھوں کھلونا بن چکا تھا۔ یہ سارے زخم عالمِ اسلام کے جسم پر ناسور بنکر رِس رہے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ سلطنتِ ترکیہ اور خلافتِ عثمانیہ نے اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا اور اتحادیوں یعنی برطانیہ، فرانس وغیرہ کے خلاف جہاد کیا۔ برطانیہ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو جو اس کے ماتحت تھے ترکی اور خلافتِ عثمانیہ سے لڑنے پر مجبور کیا۔ حریت پسندوں اور غیرت مند افراد و اجتماعات کو یہ آخری چوٹ برداشت نہ ہو سکی۔

ان حالات اور واقعات کی تاریخ و تحقیق کوئی پڑھے تو آنکھیں خون کے آنسو رو دیں اور کلیجہ منہ کو آجائے اور کوئی لکھے تو برسوں کی محنت اور ہزاروں صفحات کی تحریر و تسوید بھی کافی نہ ہو۔ حضرت رحمۃ اللہ نے بہت سی باتیں اور حقیقتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں آپ کی پیدائش سے کچھ ہی عرصہ پہلے عالمِ اسلام پر چاروں طرف سے ضرب کاری پڑ رہی تھی۔ اپنے دورِ اقتدار اور سامراج کی فریب کاریوں اور مظالم کے تذکرے اور آنکھوں دیکھے حالات آپ نے بزرگوں سے براہ راست سنے اور سمجھے تھے اقتصادیات، ریاضیات

اور تاریخ سے مناسبت اور طبعی دل چسپی ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے شاندار ماضی کی داستانیں ان کی معاشی اور اقتصادی ترقیاں اور ان کے اعداد و شمار اور حقائق آپ کے دل پر نقش کالحجر تھے۔

"جبکہ میں اسکول میں پڑھتا تھا تو مجھ کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دل چسپی پیدا ہوئی اور ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی قدرتی ہمہ گیر برکتوں نے نہایت گہرا اثر کیا۔ اور پھر اہل ہند کی موجودہ بے کسیوں کا اثر روز افزوں ہوتا رہا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس احساس میں ترقی بھی ہوتی رہی۔ اس زمانے کے ختم ہونے پر مجھ کو آزاد ممالک عرب، مصر، شام وغیرہ کی سیاحت اور قیام کی نوبت آئی اس نے مجھ کو وطن کی محبت میں اور زیادتی پیدا کردی اور اس احساس کو نہایت قوی کر دیا کہ آزادی کس قدر ضروری چیز ہے اور بغیر آزادی کے کسی ملک کے باشندے کس قدر بے بس اور اپنے ملک کی قدرتی فیاضیوں سے محروم ہوتے ہیں۔"[1]

ہوش آتے ہی حضرت شیخ الہندؒ جیسے مجاہد آزادی، انقلاب پسند مفکر اور سیاسی رہنما کی فکری ذہنی اور روحانی توجہات خصوصیہ کے ماتحت تربیت پائی تھی۔ اس کے فوراً ہی بعد خلافت اسلامیہ کے مرکز سرزمین حجاز میں قیام کا موقع پیش آیا اور اقصائے عالم کے علما، مفکرین اور فضلا سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات اور واقعات و حالات کے براہ راست مطالعہ و مشاہدہ کی نوبت آئی۔ چنانچہ اس بار دوران قیام اگرچہ بظاہر حسب معمول اپنے علمی، روحانی اور تدریسی معمولات میں مشغول رہے مگر ساتھ ہی حساس اور غیور دل و دماغ میں اندر ہی اندر احساس اور دردمندی کا لاوا پکنا شروع ہوگیا۔

حضرت کے حلقۂ درس میں عالم اسلامی کے زیادہ تر ملکوں کے نوجوان شریک تھے۔ آپ کے خیالات، احساسات اور جذبۂ اسلامی کا اثر بلا کسی قصد و ارادے کے

---

[1] الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر طبع ثانی، مطبوعہ پاکستان، ص ۲۰

بھی اُن پر پڑنا لازمی اور فطری بات تھی مگر اس کے علاوہ بھی حضرت اسلامی دنیا کی حالت زار پر توجہ دلا کر ان کی ذہنی تربیت و تعمیر کرتے تھے۔ مصر، سوڈان، ترکی، الجزائر اور افریقہ کے مختلف مسلمان نوجوان جذباتِ حریت اور قومی و ملی احساسات سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ اس سلسلے کی ساری تفصیلات، افراد و اشخاص کے حالات اور اس وقت کے پورے واقعات کا جوئے شیر تو کسی فرہاد ہی کے بس کی بات ہے تاہم حضرت کے رجحانات کا اندازہ کرنے کے لیے ایک واقعہ بھی کافی ہو سکتا ہے۔

الجزائر کے سپہ سالار و مجاہد آزادی اور اس ملک میں روحِ حریت کے بانی الشیخ عبدالحمید بن بادیس اس وقت حضرت کے حلقہ فیضان برکات میں شامل تھے۔ ان کے سوانح نگار جناب ترکی رابح لکھتے ہیں۔ "(مدینہ طیبہ میں شیخ بن بادیس) کے سابق شیخ الاستاذ حمدان مونیسی نے ان کو الجزائر سے ہمیشہ کے لیے ہجرت اور حجاز مقدس میں مستقل قیام کا مشورہ دیا۔ لیکن (جناب) شیخ حسین احمد الہندی نے اُس مشورے کے خلاف ان کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی اور فرمایا کہ تمہارا واپس جانا ضروری ہے کیونکہ الجزائر تمہارے علم و عمل کا زیادہ مستحق و محتاج ہے۔ چنانچہ وہ شیخ موصوف کی حکمت آمیز نصیحت پر عمل پیرا ہو کر واپس چلے آئے اور حجاز میں قیام کا ارادہ ترک کر دیا۔ خود شیخ بن بادیس نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مجھے یاد ہے کہ جب میں مدینہ طیبہ گیا تو اپنے شیخ استاذ حمدان مونیسی سے اور اپنے دوسرے شیخ حسین احمد الہندی سے ملا۔ مقدم الذکر وطن سے قطع تعلق کر کے مدینہ طیبہ ہجرت کا مشورہ دیا اور مؤخر الذکر نے جو بڑے عالم ہونے کے ساتھ صاحب رائے بھی ہیں انھوں نے مشورہ دیا کہ وطن واپس جاؤ اور جس قدر ممکن ہو اسلام اور وطن کی خدمات انجام دو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ حسین احمد الہندی ہی کے فرمانے کو پورا کیا۔"[1]

اس بارے میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

> "عہدِ شباب کی بات ہے کہ وہ (مردِ حق آگاہ) سید المرسلین رحمۃ للعالمین کے حرم اطہر میں درس و تدریس کے ذریعہ قال اللہ و قال الرسول کی خدمات انجام دیا کرتا تھا اور مشرق اوسط، افریقہ، چین اور جزائر مشرق الہند کے تشنگانِ علوم

[1] الشیخ عبدالحمید بن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیۃ العربیۃ فی الجزائر الحدیثۃ مولفہ شیخ ترکی رابح۔ ص ۲۶ و ۲۷۔

اور رہ نوردان طریقت وسلوک اس کے ظاہری و باطنی کمالات اور ملکات سے فیضیاب ہوا کرتے تھے۔ مگر اس کی نگاہِ حقیقت آگاہ نے جب یہ دیکھا کہ حیاتِ ملی کس طرح مظلومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ کی جارہی ہے اور انسانیت کس طرح درد و کرب میں مبتلا ہے تب وہ خدمات ملی کے تنہا اس گوشہ پر قانع نہ رہ سکا، اس نے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ عالم اسلامی پر گہری نظر ڈالی۔ وہ نظر جو رحمۃ للعالمین کے جوار کے طفیل میں رحمت وشفقت، محبت ورافت اور ہمدردی وغم خواری کے جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی وسعت فرقہ واریت کی تنگنائیوں سے آزاد اور تحزب وگروہ بندی کے گرد وغبار سے پاک تھی[1]

یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت کے قلب ونظر کی دنیا میں بے چینی، احساس وشعور میں سیاسی بیداری اور ہمت وحوصلہ میں عزم وارادہ کی بنیاد پڑی۔ اب اسلاف واکابر اور اساتذہ ومشائخ کی امانت کی اور مجاہدین ۱۸۵۷ء کے حقوق کی ادائیگی کا وقت آپہنچا تھا۔ اسلام اور دنیائے اسلام کی بیخ کنی کرنے والوں کے خلاف اشتعال وانتقام کی چنگاری لو دینے لگی تھی چنانچہ ایک خاموش عالم محدث مفسر ایک گوشہ نشین مدرس اور ایک روحانی وخانقاہی درویش میدان جہاد کا علمبردار اور آسمان سیاست کا شہسوار بن کر اللہ کے راستے میں نکل کھڑا ہوا۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام وسنداں باختن

اس آہنی عزم وارادہ اور سرفروشانہ فیصلہ کا تذکرہ حضرت ہی کی زبانی سنتے چلیے۔

"اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا یعنی سیاسیات سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلے میں عزم انقلاب جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے

[1] نقش حیات، ج ۱، ص ۲

انگارے خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصۂ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پُر نور اور ضمیرِ درخشاں میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں جنگِ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔[1]

اس موقع پر اتحادیوں نے ترکی کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں آخری حد تک پہنچا دیں تو خلیفۃ المسلمین نے جرمنی کے ساتھ معاہدہ کر کے برطانیہ وغیرہ کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے کر اعلانِ جنگ کر دیا۔ ایک انگریزی اخبار "گرافک" نے خلیفۃ المسلمین کی تصویر شائع کی جس میں وہ جہاد کے فتویٰ کا اعلان کر رہے ہیں اور اس پر یہ عنوان دیا کہ "سلطان جہاد کا اعلان کر رہے ہیں ترکی خود ہی اپنی موت کا فتویٰ دے رہا ہے"[2] اس اعلان پر تمام دنیا کے مسلمانوں اور عالمِ اسلام میں ایک آگ لگ گئی اور وہ جماعتیں اور مسلم ملک جو اتحادی طاقتوں کے دامن سے وابستہ یا ان کے زیرِ اثر نہیں تھے دامے درمے قدمے سخنے جہاد میں شرکت کے لیے تیار ہو گئے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی اور پوری ہندوستانی حریت پسند قوم برطانیہ کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ مدینہ طیبہ میں بھی جوان فوجی اور والنٹیر فوج میں بھرتی ہو کر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہونے لگے۔ اس سلسلے میں مدینۃ الرسول کے ایک میدان مناخہ میں عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں فریضۂ جہاد اور قومی و دینی حمیت و غیرت کی ہمت افزائی پر وعظ اور تقریریں کی گئیں۔ ایک مشہور مقبول اور ممتاز عالمِ دین اور محدثِ وقت کی حیثیت سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس اجتماع میں ایک بصیرت افروز اور شعلہ بار تقریر فرمائی۔[3] یہ سیاسیات میں حضرت کی عملی شمولیت کا پہلا دن اور زندگی کی پہلی سیاسی تقریر تھی

انھی دنوں حضرت کے اکابر حضرت مولینا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور حضرت شیخ الہندؒ مع اپنے رفقا مولینا عزیز گل صاحب، حکیم نصرت حسین صاحب، مولینا وحید احمد مدنی کے ہندوستان سے پہنچ گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ جنگِ آزادی کے محاذِ جنگ افغانستان

---

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۴۹
[2] تحریکِ خلافت از قاضی عدیل عباسی، ص ۹۳
[3] نقشِ حیات، ج ۱،

اور یاغستان جانے کے لیے اور حکومت عثمانیہ سے اس محاذ کے لیے رسد اور اسلحہ حاصل کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ ان سب حضرات نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ ہی کے دولت کدے پر قیام فرمایا۔ شیخ الہندؒ مدینہ طیبہ میں اپنے مشن اور مقصد کے لیے کام کر کے مکہ مکرمہ واپس آئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا وحید احمد مدنی بھی مکہ مکرمہ کے اس سفر میں ہمرکاب رہے۔ حضرت کا پروگرام یہ تھا کہ مکہ اور جدہ تک خدمات ضروریہ اور ہمرکابی کا شرف حاصل کر کے مدینہ واپس چلے جائیں گے مگر نیرنگیٔ تقدیر سے یہ روانگی مدینہ طیبہ سے آخری سفر ثابت ہوئی اور پھر مستقل قیام کی غرض سے تاحیات مدینہ طیبہ واپسی نہیں ہوئی۔ اس بار قیام میں حضرت کے اکلوتے صاحبزادے الطاف احمد جو ہندوستان ہی سے بیمار آئے تھے' ذخیرۂ آخرت ہوئے اور اس مرتبہ کل چار برس تک قیام رہا۔ کل ملا کر کم و بیش پندرہ سال تک حضور اکرم سرورِ کائنات صلی اللہ وسلم کے قدموں میں درس و تدریس، روایت حدیث اور قال اللہ و قال الرسول کی خدمات کی انجام دہی کا فخر اعزاز اور سعادت نصیب ہوئی جو مندرجہ ذیل اجمالی نقشے سے ظاہر ہے۔

پہلا قیام	ابتدائے	۱۳۱۶ھ	تا انتہائے	۱۳۱۸ھ	دو سال
دوسرا قیام	"	۱۳۲۰ھ	تا "	۱۳۲۶ھ	سات سال
تیسرا قیام	"	۱۳۳۰ھ	تا "	۱۳۳۱ھ	دو سال
چوتھا قیام	"	۱۳۳۲ھ	تا "	۱۳۳۵ھ	چار سال

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

واقعات کے تسلسل کے لیے اس جگہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی قربانیوں اور جنگِ آزادی کا اجمالی تذکرہ اور تعارف مناسب ہے۔ حضرت دیوبند کے عثمانی خاندان کے فرزند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے روحانی اور علمی شاگرد و جانشین اور دارالعلوم دیوبند کے محدث اور صدر مدرس تھے۔ آج دیوبند کے نام سے اسلامی دنیا میں جو مکتب فکر و عمل اور تحریک رواں دواں ہے اس کا سرچشمہ مکمل طور پر آپ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس طرح دنیائے اسلام کے چپے چپے پر ہزاروں علماء، صلحاء، فضلاء اور دینی رہنماؤں کا سلسلۂ فیض و برکات آپ ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ اگرچہ بظاہر ایک گوشہ گیر عالم دین اور بوریہ نشین درویش تھے مگر حقیقت میں اس کے ساتھ ہی وہ ایک انقلابی مفکر اور حریت پسند مجاہد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ کے اساتذہ اور مشائخ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ نے میدان جنگ میں شمشیر بکف شریک ہو کر داد شجاعت دی تھی۔ اگرچہ بالکل وقتی طور پر یہ جنگ ملتوی ہو گئی تھی اور برطانیہ کی طرف سے ان مجاہدوں کے لیے پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہوا تھا مگر ان حضرات نے اپنی طرف سے نہ شکست تسلیم کی نہ جنگ بند کی۔ کسی نہ کسی طرح روپوش ہو کر اپنی جانیں بچائیں اور علم جہاد کی امانت اپنے علمی روحانی اور سیاسی وارث محمود حسن کے ہاتھوں میں سونپ دی۔ اب اسی وراثت کی حفاظت اور امانت کی ادائیگی کے لیے استاد اپنے روحانی اور علمی فرزند حسین احمد کو تیار کر رہے تھے کہ جب تک فتح کامل نصیب نہ ہو جائے اور ہندوستان آزادی سے ہمکنار نہ ہو جائے، ۱۸۵۷ء کا علم جہاد سرنگوں نہ ہونے پائے اور جنگِ آزادی پورے حوصلہ، ہوشمندی اور جاں نثاری کے ساتھ جاری رہے۔ جنگِ عظیم کا زمانہ ۱۹۱۴ء وہ زمانہ تھا کہ اس وقت تک ہندوستان کے کسی گوشے سے آزادی کامل

کی آواز نہیں اُٹھ سکی تھی۔" انڈین نیشنل کانگریس اس وقت تک ایک معتدل جماعت تھی جس کا نصب العین ہندوستان اور برطانیہ میں دوستی قائم کر کے آہستہ آہستہ حکومتِ برطانیہ کے زیرِ سایہ حکومتِ خود اختیاری قائم کرنا تھا۔ کانگریس، برطانیہ کے ساتھ اور مہاتما گاندھی جنگ میں انگریزوں کے حامی تھے اور رنگروٹ بھرتی کر رہے تھے۔[۱]"

سرسید جو اس وقت مسلمانوں کے مصلحِ اعظم تھے، ان کی ساری سرگرمیوں کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ "مسلمانوں کو انگریزی حکومت پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے، وہی ان کے حقوق کا تحفظ کر سکتی ہے اور ان کو انتظامیہ میں بااثر نمائندگی عطا کر سکتی ہے۔[۲]" سرسید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریز کی غلامی میں جکڑے رہیں، "انگریز ہندوستان سے نہ جائیں"[۳]۔ غلامی کے ایسے تاریک دَور میں جب روشنی کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہیں دکھائی دیتی تھی، شیخ الہند وہ پہلے سیاسی رہنما تھے جنھوں نے ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے غور و فکر کر کے جد و جہد اور قربانی کا ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ ملک اور قوم کو مدرسہ و خانقاہ، تعلیم و تدریس اور دفتر و کتاب سے زیادہ آزادی، عزت، وقار اور سلامتی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت نے پوری رازداری اور خفیہ طور پر سرفروشوں، مجاہدوں اور جاں بازوں کی ایک جماعت تیار کی جس میں ہندو مسلمان سکھ سب شریک تھے۔" اپنے مکان کے قریب ایک مستقل مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے، اس میں حضرت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقاء انقلاب ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کو نہایت رازداری کے ساتھ ٹھہرایا جاتا تھا۔ اور حضرت اور ان کے درمیان مکمل تنہائی اور رات میں مشورے ہوتے تھے۔ یہ لوگ انقلابی ہندو اور سکھ ہوتے تھے۔ چونکہ معاملات نہایت رازداری کے ساتھ انجام پاتے تھے اور چونکہ ہمارے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت تک تحریک سے بالکل غیر متعلق تھے اس لیے ان لوگوں کے

---

[۱] تحریکِ خلافت از قاضی عدیل عباسی، ص ۵۴

[۲] سرسید کی ایک تقریر سے اقتباس بحوالہ تحریکِ خلافت از قاضی عدیل عباسی، ص ۵۰

[۳] تحریکِ خلافت، ص ۵۵

نام اور پتے معلوم نہیں ہو سکے اور نہ کبھی تتبع اور تلاش کی نوبت آئی[1]
اس میں شریک ہونے والے تمام حضرات کی پہلے پوری طرح جانچ کی جاتی تھی اور پھر ان سے حلفِ وفاداری لے کر جہاد پر بیعت لی جاتی تھی اور ان کو ضروری ٹریننگ دی جاتی تھی۔ تحریک دن بدن زور پکڑتی رہی اور اس کے برگ و بار پھیلنے لگے تو ایسے خطرناک اوقات بھی آئے کہ لوگوں کو تشویش ہونی شروع ہوئی۔

"مولینا عبدالرحیم صاحب مرحوم رائے پوری نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ لوگوں سے بیعت جہاد لے رہے ہیں، یہ تو بہت خطرناک امر ہے۔ انگریزوں کو خبر ہو گئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور مسلمانوں کا یہ دینی اور علمی مرکز اجاڑ دیا جائے گا۔ چونکہ مجھ کو اس کی کوئی خبر نہ تھی، اس لیے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ میں خود حضرت شیخ الہندؒ سے پوچھوں گا۔ واقعہ یہی تھا کہ باوجودیکہ مجھ پر بہت زیادہ کرم فرماتے تھے مگر اس وقت تک کسی کارروائی کی خبر نہیں کی گئی۔ مولینا عزیر گل صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کرنا اور اپنی کارروائیوں کی خبر دینا چاہیے۔ تو فرمایا کہ وہ صرف چند دنوں کے لیے ہندوستان آیا ہے اس کو مشوش مت کرو۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحب کا مقالہ ذکر کیا۔ تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ حضرت مولینا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے، سو بحمد اللہ پچاس برس گذر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے۔ میں یہ جواب سن کر دم بخود ہو گیا اور سمجھ گیا کہ حضرت کا اس امر میں پختہ خیال قائم ہو گیا ہے۔ اب اپنے ارادے سے ٹل نہیں سکتے اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے"[2]

[1] نقشِ حیات، ج ۲، ص ۲۰۷
[2] ایضاً، ص ۲۰۳

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے محاذِ آزادی کے کئی مرکز دیو بند، دہلی، کراچی، دین پور شریف، چکوال، امروٹ وغیرہ ہندوستان میں قائم کیے اور ہر جگہ مختلف حضرات کی سربراہی میں تحریک آزادی کے لیے مجاہدین سے جہاد پر بیعت لی جارہی تھی اور لوگ جوق در جوق تحریک میں شریک ہو رہے تھے[1] آزاد قبائل کے علاقہ یاغستان کو جدوجہد کا عملی مرکز مقرر فرمایا اور وہاں اپنے سپاہیوں اور قائدین مولانا سیف الرحمٰن، مولانا فضل محمود اور مولانا محمدؒ اکبر صاحب کو ہندوستان سے روانہ کر کے برطانوی حکومت پر حملہ کے لیے مجاہدین کی تنظیم کا حکم دیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں جب انگریزوں کی چیرہ دستیاں ہندوستانیوں اور مسلمانانِ عالم کے خلاف حد سے زیادہ تیز ہوگئیں تو حضرت شیخ نے اپنے خاص سپہ سالار حاجی صاحب ترنگ زئی کو مطلع کیا کہ اب مزید انتظار کا وقت نہیں ہے، فوراً مناسب وقت دیکھ کر طبلِ جنگ بجا دیا جائے۔ اس وقت تک مجاہدین کی فوج کافی طاقتور ہو چکی تھی چنانچہ حاجی صاحب موصوف کی قیادت میں برطانیہ کے کیمپوں پر حملہ بول دیا گیا اور باضابطہ جنگ جاری ہوگئی جس میں برطانیہ کو پے درپے جانی و مالی نقصان اور پسپائیوں کا سامنا کرنا پڑا[2]۔ یہ جنگ بغیر دوسرے ملکوں اور حکومتوں کے اتحاد، امداد اور سہارے کے کامیاب نہیں ہوسکتی تھی، اس مقصد کے لیے حضرت شیخ نے پہلے ہی سے مختلف ملکوں افغانستان، ترکی، جرمنی وغیرہ کی طرف اپنے سفیر مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا سیف الرحمٰن صاحب وغیرہ روانہ کر دیئے تھے۔ یہ حضرات حکومت برطانیہ سے چھپ کر بھیس بدل کر اور بڑے شدائد اور آبلہ پائیاں برداشت کر کے اپنے اپنے مرکزوں پر پہنچ کر نہایت کامیابی کے ساتھ سرگرمِ عمل تھے[3]۔

---

[1] نقشِ حیات، ج ۲، ص ۲۰۲۔

[2] ایضاً، ص ۲۱۰

[3] ایضاً، جلد ۲۔

حضرت کے ان سفیروں میں سے بعض حضرات نے راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر منصور انصاری اور مرزا محمد علی وغیرہ سے مل کر کام کو بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ راجہ صاحب مذکور حضرت کے معتمد اور معتقد تھے۔ ان سب حضرات نے جنگ کو جاری رکھنے اور حکومتوں کی تائید و مدد حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی موقتہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ راجہ صاحب اس کے صدر اور مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ اس کے ممبر تھے۔[1] بعض حکومتوں نے اس موقتہ حکومت ہند کی مکمل تائید و نصرت شروع کر دی تھی اور اُدھر جنگ پوری ہوش مندی اور تدبیر کے ساتھ جاری تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے پاس یاغستان سے متواتر رپورٹیں موصول ہونے لگیں کہ رسد اور اسلحہ کی کمی کی وجہ سے محاذ جنگ کمزور پڑ رہا ہے۔ حضرت اس کی تدبیروں پر غور فرما رہے تھے اور خود یاغستان، افغانستان اور ترکی کا پروگرام بنا رہے تھے کہ اچانک بہت خاص ذرائع سے ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب انصاری وغیرہ کو اطلاع ملی کہ شیخ الہندؒ کا پورا منصوبہ اور تحریک حکومتِ برطانیہ کے علم میں آچکی ہے اور حکومت آپ کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

حقیقت میں شیخ الہندؒ کا یہ کارنامہ اور پروگرام ہندوستان کے کسی بھی لیڈر اور قائد آزادی کے کارناموں سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت کی اس تحریک کے تیس پینتیس برس بعد سبھاش چندر بوس نے بھی اسی سے ملتا جلتا پروگرام بنایا اور بھیس بدل کر افغانستان ہی کے راستے جرمنی وغیرہ نکل گئے اور آزاد ہند فوج قائم کی اور پھر اُسی راستے میں ملک پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ ان کو ہندوستان نے جو درجہ دیا اور جیسا نام اور احترام ان کا ہوا، وہ بھولنے والی چیز نہیں ہے۔ راقم الحروف نے دلی کے لال قلعہ میں ایک کرسی دیکھی جس پر آزاد ہند فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے وہ بیٹھے تھے، وہ یادگار کے طور پر قلعہ کے میوزیم میں

[1] نقشِ حیات، ج ۱، ص ۱۶۵۔

رکھی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حقائق اسی عزت و احترام کے مستحق تھے مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ناقابل نظر اندازی ہے کہ شیخ الہندؒ کی ذاتِ گرامی ان سے زیادہ نہیں تو ان سے کم قابل احترام نہیں ہے اور ان کا نام بھی تاریخ میں سنہرے حروف سے ثبت ہونے کا مستحق ہے۔ مگر زمانہ کی نیرنگی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ آستانہ جہاں یہ تحریک پروان چڑھی تھی، جہاں ۱۸۵۷ء کے بعد جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی تھی، وہ مرکز جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے سپاہیوں، سپہ سالاروں اور علماء و فضلاء نے زانوئے ادب تہہ کیا تھا، آج ویران پڑا ہوا ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں گزرا کہ یہ وہ آستانہ ہے کہ وہ بھی قومی آثار میں ایک اہم یادگار کا درجہ رکھتا ہے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں جہاں نہایت معمولی اور تیسرے درجے کے سپاہیوں کا تذکرہ بڑے الفاظ اور اہم عنوانات سے کیا گیا ہے۔ اس سپہ سالار اعظم اور آزادی کی جدوجہد کا سنگ بنیاد رکھنے والے بطل جلیل کا نام تک نہیں ہے۔

بہر حال جماعت کو جب گرفتاری کا خطرہ لاحق ہوا تو یہ پلان بنایا گیا کہ حضرت شیخ حج کے ارادے سے حجاز روانہ ہو جائیں اور وہاں سے ترکی وغیرہ ہوتے ہوئے افغانستان اور یاغستان پہنچیں۔ چنانچہ بڑی رازداری اور حسن تدبیر کے ساتھ بمبئی ہوتے ہوئے آپ کا قافلہ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز کے لیے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم اس اسکیم میں دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح اور ہر موقع پر نہ صرف یہ کہ شریک کار رہے بلکہ انہی کے مشوروں پر یہ قافلہ حق سرگرم سفر رہا۔ انڈین نیشنل کانگریس اس وقت تک گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، مسز اینی بسنٹ اور دادا بھائی نوروجی وغیرہ کی لیڈرشپ میں صرف کچھ سیاسی رعایتیں اور گورنمنٹ برطانیہ سے مہربانیوں کی طلبگار تھی۔ ۴۰ سالہ محمد علی جناح قانونی قابلیت، ہوشیاری اور موقع شناسی کی بدولت بمبئی کے عوام و خواص میں بھی مقبول ہو رہے تھے، گورنمنٹ برطانیہ کے مخصوصین میں شمار ہونے لگے تھے اور کانگریس میں بھی لیڈرانہ مقام حاصل کر رہے تھے۔ مگر کون کانگریس؟ وہ نہیں جو مکمل آزادی کی طلبگار تھی بلکہ صرف وہ جو حکومت

برطانیہ کی مہربانیوں کے لیے عرضی گذار تھی۔ گاندھی جی ابھی افریقہ ہی میں تھے، اور وہاں کے ہندوستانیوں کی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے تھے۔ انہی میں ایک خدمت یہ بھی تھی کہ برطانیہ اور حکومت برطانیہ کے لیے رنگروٹ اور رضا کار بھرتی کر رہے تھے اور انگریز کے انعامات، تحفہ جات اور القاب سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔ چار برس پہلے ۲۲ سالہ ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" کے ذریعے ملک میں ایسا صور پھونکا تھا جس سے سوئے ہوئے دماغ اور دل جاگ اٹھے تھے اور شیخ الہندؒ نے فرمایا تھا کہ "الہلال نے ہمیں وہ فرض یاد دلا دیا جو ہم بھول چکے تھے۔" یہ تھا وہ ماحول جس میں چند سرفروشوں کا یہ قافلہ ملک کی قربان گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ گورنمنٹ نے روانگی سے پہلے ہی وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا تھا۔ مگر چونکہ حضرت کی روانگی حج کی خبریں عام ہو گئی تھیں اس لیے ہر ہر قدم پر اور ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر ہزاروں انسانوں کا جم غفیر زیارت کے لیے امڈا پڑتا تھا۔ اس لیے افسران متعلقہ نے مناسب نہ سمجھا کہ اس طرح علانیہ گرفتاری عمل میں لائی جائے۔ بہتر یہ سمجھا گیا کہ جب بمبئی پہنچیں تو روک لیا جائے۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ بمبئی کو احکام اس وقت پہنچے جب بحری جہاز حضرت کو لے کر روانہ ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری پس پردہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اول تو احکامات تاخیر سے صادر ہوں اور جب صادر ہی ہو جائیں تو ان کے ارسال کرنے میں دیر کی جائے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے عدن کے گورنر کو احکامات بھیجے تو وہاں بھی تاخیر کی وجہ سے گرفتاری عمل میں نہ آ سکی۔ اب عدن کے گورنر نے جدہ کو احکامات بذریعہ تار بھیجے کہ جہاز پہنچتے ہی کپتان کو گرفتاری کے آرڈر مل جائیں مگر اس وقت حجاز حکومت نے یہ انتظام کیا تھا کہ حجاج کو بجائے جدہ کے جزیرۂ سعد میں اتار کر سیدھے مکہ مکرمہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ جدہ میں کپتان کو احکامات ملے تو حجاج حکومت حجاز کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور اب گرفتاری بذریعہ معمولی وارنٹ نہیں بلکہ دو حکومتوں کے درمیان باضابطہ خط و کتابت ہی کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ حضرت کی نگرانی کے لیے حکومتِ برطانیہ کی سی آئی ڈی کا جو عملہ سفر کر رہا تھا حکومتِ ترکی نے حضرت

کے جاں نثاروں کی اطلاع پر جزیرۂ سعد میں آتے ہی اس عملہ کو گرفتار کر لیا مگر پھر بھی کچھ افراد اس عملے کے نظرانداز ہوگئے اور حضرت شیخ کے ساتھ لگے رہے۔

مکہ مکرمہ پہنچتے ہی حضرت شیخ اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے اور مختلف معتمد اور بااثر افراد اور جماعتوں سے ملاقات کر کے ان کو اپنے مشن کی اہمیت سمجھائی۔ آخر میں سلطنت عثمانیہ کے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی اور ان کو اپنے کام کا نقشہ اور تحریک کی اہمیت سمجھا کر فرمایا کہ میں ترکی جانا اور انور پاشا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس سلسلے میں ضروری سہولتیں اور اعانت مہیا کریں۔ غالب پاشا نے مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کر کے اور مکمل طور پر تبادلۂ خیال کر کے عرض کی کہ ہم ہر طریقے سے تحریک کو بقدرِ امکان تقویت بہم پہنچائیں گے۔ اس نے ایک خط مدینہ کے گورنر بصری پاشا کو لکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورے احترام کے ساتھ استقبال کیا جائے اور ممکنہ سہولتیں مہیا کر کے ان کو ترکی روانہ کیا جائے۔ دوسرا خط ترکی کے ڈیفنس منسٹر انور پاشا کو لکھا جس میں حضرت کا مکمل تعارف کرا کے لکھا کہ تحریک کو پوری تائید اور مدد ملنی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ غالب پاشا نے حضرت شیخ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کا پورا نقشہ سمجھا کر اس نکتہ پر زور دیا کہ تمام ہندوستان کو من حیث المجموع آزادی کامل کا نعرہ لگا کر اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہندوستانی عوام اور لیڈران برطانیہ اور سامراجی طاقتوں کے فریب میں مبتلا ہو کر ڈومینین اسٹیٹس وغیرہ قسم کی ناقص خود اختیاری پر مصالحت کر لیں۔ آپ ملک کے اندر رہ کر قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ ہم باہر سے جس قدر بھی ممکن ہوگی مدد کریں گے۔

مکہ مکرمہ کی اس مہم سے فارغ ہو کر حضرت مدینہ منورہ تشریف لائے۔ یہاں آپ کے ساتھ صرف وہ رفقاء ہمرکاب تھے جن سے ان ممالک میں کام لینا تھا۔ باقی حضرات کو آپ نے مختلف مراکز کے لیے ہدایات و تعلیمات دے کر واپس ہندوستان کے لیے روانہ کر دیا۔ مدینہ منورہ میں آپ نے اپنے علمی و روحانی فرزند حضرت شیخ مولانا مدنی کے مکان پر قیام فرمایا اور پہلی فرصت میں حضرت کو تنہائی میں طلب فرما کر

تحریک کی پوری تفصیلات سے مطلع کیا۔ اس آخری بیعت کی تفصیل بھی حضرت مدنیؒ ہی کے قلم سے ملاحظہ کرنی ضروری ہے:

"میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولینا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ سویز کے لیے متطوعین (والنٹیرس) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینہ منورہ سے گئے تھے مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہندؒ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور مولینا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور بسم اللہ کا وقت ہے۔ اور یہی وقت مولینا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہٗ۔"

اس گفتگو اور افہام و تفہیم کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند کی تحریک کے گویا باضابطہ ممبر ہو گئے اور جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہو گئے۔ سب سے پہلے حضرت نے مدینہ طیبہ کے بااثر اور صاحب اختیار حلقہ میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی جماعت اور تحریک کے لیے تائید، ہمدردی اور شرکت کے لیے فضا ہموار کی۔ اس کے بعد مدینہ کے گورنر بصری پاشا سے ملاقات کر کے ان کو جماعت کی اہمیت اور تفصیل سمجھائی۔ غالب پاشا کے خطوط دیئے اور حضرت شیخ اور ہمراہیوں کے لیے ترکی کے سفر کے لیے سہولتوں کا مطالبہ کیا۔ پہلے تو بصری پاشا نے اس بنا پر تردد کیا کہ جنگ کا زمانہ ہے ہندوستان اور وہاں کی حکومت سلطنت عثمانیہ کی دشمن ہے۔ ممکن ہے ہندوستانیوں کا ترکی جانا مضر ثابت ہو مگر غالب پاشا نے مکہ مکرمہ سے دوبارہ تاکید بھی اور بتلایا کہ حضرت شیخ الہندؒ اگرچہ ہندوستانی ہیں مگر یہ اور ان کی پوری جماعت برطانیہ اور اتحادیوں کے خلاف برسرپیکار ہیں چنانچہ بصری

پاشانے تاخیر اور تعویق کے لیے حضرت شیخ سے معذرت چاہی اور کہا کہ جب اور جس وقت آپ ترکی روانہ ہونا چاہیں گے حکومت آپ کے سفر کا پورا انتظام کرے گی آپ سفر کی تیاری کریں اور پروگرام سے ہمیں مطلع کریں۔ عین اسی وقت یہ اطلاع ملی کہ سلطنتِ عثمانیہ کے ایک کمانڈر اور ڈیفنس منسٹر جمال پاشا اور انور پاشا زیارت کی غرض سے مدینہ حاضر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ نے سفر کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا تاکہ ان دونوں صاحبان سے پہلے یہیں ملاقات کر لی جائے۔

یہ حضرات جمعہ کے روز نمازِ جمعہ سے کافی پہلے بذریعہ ٹرین مدینہ حاضر ہوئے۔ اسٹیشن پر اہلِ شہر کا ایک جمِ غفیر استقبال کے لیے موجود تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے باضابطہ جلوس کا انتظام تھا اور ان کی سواری کے لیے مشکی گھوڑوں کی گاڑی تیار تھی، مگر انھوں نے سواری سے انکار کر دیا کہ ہم سرکارِ دو عالم کے فقیر ہیں اور غلاموں کی طرح دربار میں حاضری دیں گے چنانچہ اسٹیشن سے حرم پاک تک دست بستہ نگاہ روبرو باادب باملاحظہ حاضر ہوئے۔ ہمارے حضرت مدنی قدس اللہ سرہٗ نے راستے ہی میں اپنی تحریر پیش کی جس میں حضرت شیخ الہندؒ سے تنہائی میں خصوصی ملاقات کا وقت مانگا گیا تھا۔ مقامی افسرانِ بالا پہلے ہی سے تائید و موافقت میں تھے چنانچہ اسی دن مغرب بعد حضرت شیخ اور مولانا خلیل احمد صاحب نے ان حضرات سے ملاقات کی اور پوری تفصیل و شرح کے ساتھ اپنی تحریک، اس کے مقاصد اور لائحہ عمل ان کے سامنے پیش کیے۔ انھوں نے ہر قسم کی اعانت، امداد اور تائید کا وعدہ کیا اور ایک خط ہندوستانی عوام کے نام اور دوسرا ترکی افسران متعلقہ کے نام حضرت کے سپرد کیا۔

ہندوستان کے نام خط میں تمام ہندوستانی عوام کو جدوجہد آزادی پر مبارک باد دی گئی تھی اور یہ وعدہ تھا کہ ترکی حکومت ہر طرح ہندوستان کی آزادی کے مشن میں ان کے ساتھ ہے۔ اور جس وقت کسی مدد کی ضرورت ہوگی حتی الامکان حاضر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ تاکید تھی کہ آزادی کے مطالبہ کے لیے پوری ہندوستانی قوم کو متحد ہو کر صف آرا ہو جانا چاہیے اور ترکی افسران کے نام خط میں یہ ہدایت

تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ پر مکمل اعتماد کیا جائے اور اُن کو ہر قسم کی سہولت دی جائے، حضرت نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہم لوگوں کا افغانستان اور یاغستان پہنچنا بہت ضروری ہے اس کے لیے انتظامات کر دیئے جائیں مگر ان حضرات نے فرمایا کہ روس نے ایران اور افغانستان کے درمیان قبضہ کر لیا ہے اس لیے اس وقت افغانستان جانا مشکل ہے۔

مفتی مدینہ شیخ مامون بری سے جمال پاشا اور انور پاشا نے خواہش کی کہ ہم علمائے مدینہ سے نصائح اور موعظت حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر تنگیٔ وقت کی بنا پر ہر ایک سے علٰحدہ علٰحدہ شرفِ ملاقات حاصل کرنے سے معذور ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کو حرم اطہر میں علماء حرم کا ایک اجتماع ہوا جس میں حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس اللہ سرہٗ نے فضیلت جہاد پر ایک مبسوط تقریر فرمائی جو بہت پسند کی گئی اور حضرت کا شکریہ ادا کیا گیا۔ مختصر یہ کہ افغانستان کے راستے میں رکاوٹوں کی وجہ سے یہ تجویز قرار پائی کہ مکران بلوچستان وغیرہ کے راستے سے یاغستان کا سفر کیا جائے اور انور پاشا کی تحریروں کی نقلیں تحریکِ آزادی ہندوستان کے سبھی مراکز کو روانہ کر کے انتظام کیا جائے کہ عام ہندوستانیوں تک یہ پیغامات پہنچیں۔ چنانچہ لکڑی کے صندوقوں کے تختوں کے درمیان یہ تحریریں جڑ دی گئیں اور رفقاء کے ساتھ ان کو ہندوستان وغیرہ روانہ کیا گیا اور حضرت خود بعض رفقاء کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تاکہ روانگی سے پہلے غالب پاشا سے کچھ اور گفتگو اور معاملات کر سکیں۔ غالب پاشا اس وقت طائف میں مقیم تھے۔ اس لیے حضرت نے اپنے تین ہمراہیوں مولانا عزیر گل صاحب مدظلہم، حضرت شیخ مدنی قدس اللہ اور مولانا وحید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ طائف کا قصد فرمایا۔ یہاں پہنچے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ شریف حسین نے حکومت ترکیہ کے خلاف بغاوت کر دی اور اہم فوجی مرکزوں پر حملہ کر دیا۔ طائف چاروں طرف سے محصور ہو گیا اور آمد و رفت کے سارے ذرائع مسدود ہو گئے۔ بڑی بڑی مشکلوں اور تدبیروں سے حضرت کا قافلہ مکہ مکرمہ واپس ہوا اور ہندوستان روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ عین روانگی کے

وقت باغی شریف حسین کے ہرکارے اور پیادے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک اعلان پر دستخط کا مطالبہ کیا۔ اعلان میں درج تھا کہ ترکی کے تمام مسلمان اور ترک قوم کافر ہے۔ اور سلطنت عثمانیہ خلافت اسلامیہ کے منصب کی حقدار نہیں ہے اور شریف حسین نے ترکوں سے بغاوت کر کے نہایت ایماندارانہ دور جرأتمندانہ اقدام کیا ہے۔ حضرت شیخ نے اس اعلان پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ اگرچہ اس انکار کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں مگر میں دین اور دیانت اور شریعت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ خطرہ شدید ہو گیا کہ شریف حسین اس کا بدلہ لے گا۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ مکہ مکرمہ سے ہندوستان واپسی کے لیے فوراً روانگی ہو جانی چاہیے۔ مگر روانگی سے پہلے ہی شریف حسین نے حضرت شیخ کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔

مکہ مکرمہ کے سرکاری شیخ الاسلام سے وہاں کے سربرآوردہ حضرات نے بہت سفارش اور صفائی کی۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے پاس گئے اور اپنے مرشد اور استاد کو بچانے کے لیے اس کے ہاتھ چومے۔ شیخ الاسلام مجبور تھے کیونکہ شریف کے برطانوی نمائندے کرنل ولسن مقیم جدہ نے اصرار کیا کہ جس طرح بھی ہو مولانا محمود حسن اور ان کے سارے ساتھیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ شریف کو برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداریوں کے صلے میں جزیرہ عرب کی بادشاہت عطا ہونے کا لالچ تھا۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب کو فوراً جدہ روانہ کیا جائے مگر اس عرصہ میں حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا وحید احمد مدنی روپوش ہو کر کسی خفیہ جگہ پر منتقل ہو چکے تھے۔ شریف کی پولیس کے سپاہیوں نے شیخ کو نہ پایا تو حضرت شیخ مدنی قدس اللہ سرہ کو قید کر کے جیل خانہ میں ڈال دیا اور کہا کہ یہ حکومت برطانیہ کی مخالفت کی سزا ہے۔ تاہم حق تعالیٰ کا خصوصی احسان یہ ہوا کہ حضرت کو اس جیل میں رکھا گیا جہاں کوئی تعذیب و تکلیف نہ تھی اور کھانے پینے اور رہنے کا فی الجملہ آرام تھا۔ تلاش بسیار کے بعد بھی حضرت شیخ الہند کا سراغ نہ لگا تو شریف نے حکم دیا کہ اگر مولانا محمود حسن نہ ملیں تو ان کے ساتھیوں کو گولی

مار دی جائے اور ان کے مطوف کو کوڑوں سے پیٹا جائے اور معلمی سے محروم کر دیا جائے۔ یہ سن کر حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے آپ کو شریف کے حوالے کر دیا اور فرمایا کہ الحمد للہ میں کسی گناہ میں نہیں بلکہ مصیبت میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ جو گزرے گی، برداشت کروں گا۔ بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد۔ مگر اپنے رفقا کو کوئی گزند نہ پہنچنے دوں گا۔ چنانچہ ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ اتوار کے دن رات کو عشا کے بعد حضرت شیخ الہندؒ، مولینا عزیر گل صاحب، مولینا وحید احمد مدنی اور حکیم نصرت حسین صاحب کو دو اونٹوں پر سوار کر کے جدہ روانہ کر دیا گیا۔ مولینا عزیر گل صاحب تو حضرت کے خاص خادم اور تحریک جہاد کے سرگرم رکن تھے۔ پشاور کے رہنے والے تھے، دیوبند سے فارغ اور وہیں سے حضرت کے ساتھ آئے تھے۔ مگر حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکہ مکرمہ ہی سے ساتھ ہوئے تھے۔ حضرت شیخ کے شاگرد اور خادم تھے مگر تحریک جہاد کے بنیادی رکن نہیں تھے۔ لیکن مصیبت اور قید و بند میں اپنے شیخ سے جدا ہونا گوارا نہیں کیا اور ایسے ساتھ ہوئے کہ مالٹا ہی کی زمین پر ابدی نیند سو گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ و برد اللہ مضجعہ۔ صبح کو جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ کو علم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ سنگینوں کے پہرہ میں جدہ روانہ کر دیئے گئے اور وہ خود آٹھ دس روز میں رہا کر دیئے جائیں گے تو بے چین و مضطرب ہو گئے اور اپنے بعض مخلصین پر زور دیا کہ اگر حضرت کو قید کر کے کہیں بھیج دیا گیا تو خدمت کے لیے میری حاضری نہایت ضروری ہے اس لیے جس طرح بھی ہو مجھے خدمت میں بھجوا دیجیے۔ اُن لوگوں نے شریف سے کہا کہ اس جماعت کے ایک فرد کو چھوڑنا خطرناک ہے ممکن ہے سرکار برطانیہ کی خوشی میں کوئی کمی رہ جائے چنانچہ دوسرے ہی دن حضرت کو بھی خچر کی سواری پر جدہ روانہ کر دیا گیا۔ اور وہاں پوری جماعت کو ساتھ رکھا گیا۔ جدہ میں کم و بیش ایک ماہ تک قید رہے اور جیل کے بجائے ایک کمرہ میں رکھا گیا جہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔[لہ]

لہ سارے واقعات سفرنامۂ اسیر مالٹا اور نقش حیات سے ماخوذ ہیں۔

مالٹا کے قیدی[1]

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو زندہ کنم دار و رسن را

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اب شیخ الہندؒ کے مشن اور تحریک کے معتمد اور اہم ممبر تھے۔ شیخ نے مدینہ طیبہ میں سارے معاملات سمجھا کر آپ کو مہم میں شریک کر لیا تھا۔ باوجود اس کے حضرت مدنی رحمۃ اللہ کا ارادہ حضرت شیخ الہند کی ہم رکابی میں صرف جدہ تک آنے کا تھا۔ حکومت برطانیہ کو بھی حضرت کی گرفتاری مطلوب نہیں تھی۔ لیکن جب یہ اندیشہ ہوا کہ برطانیہ حضرت شیخ کو قید کر کے کسی دوسری جگہ پہنچانے والی ہے تو استاد کی خدمات اور راحت رسانی کے لیے حضرت رحمۃ اللہ نے اپنے آپ کو بھی قید کرانے کی پوری کوشش کی۔ اگر یہ کوشش اور خواہش نہ ہوتی تو ظاہری صورت حالات ایسی تھی کہ آپ رہا ہو کر مدینہ طیبہ واپس آجاتے۔

"مجھ کو قید خانہ میں (حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری وغیرہ کی) کوئی حالت صبح تک معلوم نہیں ہوئی۔ صبح کو جب احباب ملنے آئے تب سب کیفیت معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سید امین عاصم صاحب کے بھانجہ زادہ سید احمد جعفری آئے اور کہا کہ سید صاحب نے کہا ہے کہ ہم نے تیرے چھڑانے کے لیے بہت کوشش کی مگر چونکہ شریف بہت خفا ہے اس لیے کم از کم آٹھ دس دن تک تجھ کو قید خانہ میں رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا چونکہ میں مدینہ منورہ سے فقط مولانا کی خدمت کے لیے نکلا ہوں اس لیے مجھ کو خدمت میں رہنا ضروری ہے۔ اگر جدہ سے مولانا ہندوستان تشریف لے گئے تو

---

[1] اس باب کا پورا مضمون سفرنامۂ اسیرِ مالٹا مرتبۂ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ سے ماخوذ ہے۔

پھر میرے ساتھ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں بہت سے اہل علم موجود ہیں اور اگر کسی دوسری جگہ ان کو بھیجا گیا تو میرا ساتھ رہنا ضروری ہے اس لیے جس طرح بھی ممکن ہو مجھ کو مولانا کے پاس بھجوا دیجیے۔[1]

یہ پانچ حضرات جدہ میں بہاء الدین بے آفندی (ذمی اسپکٹر) کے مکان میں شریف مکہ کے سپاہیوں کی نگرانی میں نظر بند رہے۔ اور کم و بیش ایک ماہ تک زیر حراست رہنے کے بعد ۱۳ جنوری سنہ ۱۹۱۷ء مطابق ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۵ھ کو جدہ سے بذریعہ اسٹیمر مصر کے لیے روانہ کر دیے گئے۔ جہاز پر حراست یا قید نہیں تھی بلکہ کسی قدر آزادی تھی۔ منگل کے روز ۱۶ جنوری کو جہاز سویز کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ وہاں اللہ کے ان شیروں اور اسلام کے مجاہد قیدیوں کا استقبال بندوقوں اور سنگینوں سے مسلح گوروں کی ایک گارد نے کیا اور ان کو اپنے جلو میں لے کر جس کو وہ پہرہ و حراست سمجھتے رہے، قریب کے کیمپ میں پہنچایا۔ کیمپ پر پہرہ کے لیے ہندوستانی سپاہی موجود تھے جنھوں نے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ دوسرے دن علی الصباح ٹرین کے تیسرے درجہ میں سوار کر کے گورے سپاہیوں کی پوری گارد کی حفاظت اور سنگینوں کے سایے میں یہ قافلہ قاہرہ کے لیے روانہ ہوا۔ اور اسی دن دو بجے قاہرہ پہنچا۔ قاہرہ اسٹیشن پر سب سے پہلے آپ حضرات نے باجماعت نماز ظہر ادا کی۔ چاروں طرف گوروں کا پہرہ تھا۔ منزل اور مستقبل نامعلوم تھا اور سروں پر بندوقوں اور سنگینوں کا سایہ تھا۔ اور درمیان میں اللہ کے پانچ غریب الوطن قیدی سپاہی اس کی بارگاہ میں سربسجود تھے۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر روانگی میں اتنی دیر ہوئی کہ نماز عصر بھی وہیں ادا کی۔

اسٹیشن سے آپ حضرات کو قاہرہ کے ایک محلے جیزہ کے قید خانہ پہنچایا گیا۔ جیل میں داخلہ سے پہلے تلاشی لی گئی اور ساری چیزیں اور سامان مع ایک سی

[1] سفرنامہ اسیر مالٹا، ص ۴۲

اسٹرلنگ پاؤنڈ کے لے لیے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان حضرات کو ایک عدالت کے سامنے بیان دینے کے لیے پیش کیا گیا جس کے تین ممبر تھے اور تینوں انگریز تھے۔ جن میں سے دو صاف اُردو بول رہے تھے۔ اس وقت تک سب کو یہ خیال تھا کہ یہ گرفتاری شریف حسین کی حکم عدولی اور اس کو باغی قرار دینے کی بنا پر ہوئی ہے۔ مگر بیان کے وقت جب دفتر کھلا اور ہر ایک کی علٰحدہ علٰحدہ فائلیں سامنے آئیں۔ تحریک آزادی غیر ممالک میں برطانیہ کے خلاف سرگرمیوں اور مکمل اسکیم کے صحیح واقعات کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ تب یہ بات کھلی کہ حضرت شیخ الہندؒ پر بغاوت اور حکومتِ ہند سے غداری کا الزام ہے اور اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ ان حضرات کو پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ وقت بڑا نازک تھا۔ وطن اور اہلِ وطن سے سات سمندر پار کی دوری تھی۔ مقدمات غیر جانب دار نہیں بلکہ دشمن عدالت کے سامنے تھے۔ کوئی ہمدرد غم گسار، مشیر یا وکیل میسر نہیں تھا۔ سوال قید و بند یا جیل خانہ کا نہیں بلکہ موت و زندگی اور پھانسی کا تھا۔ مگر اللہ کے شیروں کے لیے روباہی ممکن نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے کمال بے اعتنائی، بے التفاتی اور بے جگری کے ساتھ مسکت اور الزامی جوابات دیئے —— انگریز حکام نے ایک مولوی صفت، معمولی شکل و شمائل کے بوڑھے کمزور اور مریض پا بہ جولاں قیدی سے یہ طرز بیان اور قوت استدلال کا ہے کو سُنا ہوگا۔ بیان ختم ہوا تو انھوں نے حیرت اور ناگواری سے کہا کہ شاید مولینا کو کبھی حکام سے ملنے اور اُن سے معاملہ کرنے کا سابقہ نہیں پڑا ہے۔ فائلوں کی موجودگی اور تحریک کے خفیہ حقائق کے متعلق سوالات کی افتاد بالکل اچانک اور بے سان و گمان سامنے آئی تھی۔ ان میں سے کسی کو کبھی عدالت بالخصوص انگریز حکام سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ان کے دل حکومت کی طرف سے نفرت اور عداوت سے پُر تھے۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کے بارے میں یہ خیال بھی تھا کہ افسران کوئی ناشائستہ بات کریں گے تو انھیں لڑنے میں بھی دریغ نہ ہوگا حضرت مولینا عزیر گل صاحب مدظلہم نہایت بے باک اور سریع الغضب تھے۔ مولینا

وحید احمد مدنی نوعمر اور ناتجربہ کار تھے۔ اس لیے سب کو اور خصوصاً رئیس قافلہؒ کو یہ اندیشہ تھا کہ نہ جانے کس کی زبان سے کیا خلافِ مصلحت و خلافِ واقعہ بات نکل جائے کم از کم اتنا خطرہ تو قوی تھا کہ بیانات سب کے ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گے۔ مگر بیان ختم ہوئے اور دوسرے روز ہوا خوری کے لیے سب حضرات احاطے میں نکالے گئے تو حضرت الشیخ کو پتہ چلا کہ ایسے یکساں اور نپے تلے جوابات دیئے گئے ہیں گویا سب سے مشورہ کر کے جوابات اور مضمون پہلے سے طے کر لیے گئے ہوں۔

حضرت مدنیؒ کا بیان دو دن تک جاری رہا جو علمی، منطقی اور تاریخی حوالوں سے لبریز تھا۔ افسران نے برملا اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ مقدمہ کی کارروائی پھانسی کی سزا کی بنیادوں پر چل رہی تھی، مگر بیانات نے فیصلہ کا رُخ موڑ دیا ہے۔ یہ قیدی اکابر کال کوٹھریوں میں بند تھے جس میں روشنی اور ہوا کے لیے صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ ہر کوٹھری پر سنگین پہرہ تھا اور کسی کو ان کے قریب سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ان اذیتوں سے جسمانی اور نفسیاتی جو شدائد گزرے وہ تو زبان و قلم کے بس کی بات نہیں مگر ظاہری طور پر اس امر میں شبہ کی بہت کم گنجائش رہ گئی تھی کہ حکم پھانسی ہی کا ہوگا اس لیے کہ ان کال کوٹھریوں میں وہی مجرمین رکھے جاتے تھے جن کو پھانسی دینی ہوتی تھی۔ مگر یہ صاحبان اپنے مولیٰ کی رضا پر راضی تھے اور کسی قسم کی گھبراہٹ بے چینی جزع و فزع کا گذر بھی ان کے قریب نہ ہوتا تھا۔ ذہنی طور پر ہر فرد اس طرح تیار تھا گویا فیصلہ ہو چکا تھا بس وقت کا انتظار تھا۔ مولانا عزیر گل صاحب اپنی کوٹھری میں بار بار یہ تجربہ کر رہے تھے کہ پھانسی میں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔ اپنی گردن اور گلے کو ناپتے تھے اور پھندا گلے میں ڈال کر تھوڑی بہت مشق کرتے تھے کہ وقت پر زیادہ تکلیف نہ ہو۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف اسیر مالٹا میں تحریر فرمایا ہے کہ "ہم لوگ نو گرفتار تھے۔ قید و بند پابندی و گرفتاری سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ سب لوگ نوجوان تھے۔ گھروں سے اعزہ و اقارب سے اور خاندان سے جدا تھے۔ دور دور کوئی مونس و غم خوار ہمدرد و غم گسار نظر نہ آتا تھا

ہم سب کو یقین یا کم از کم ظن غالب یہی تھا کہ ہمیں پھانسی ہونے والی ہے۔ مگر باوجود اس کے ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ اضطراب، بے چینی، جزع و فزع رونا دھونا قلق اور صدمہ تو بڑی باتیں ہیں کسی کے دل میں معمولی گھبراہٹ بھی نہ تھی۔ کسی وقت یہ خیال بھی دل میں نہ آتا تھا کہ کاش ہم مولینا کے ساتھ یا ان کے مشن اور تحریک میں شریک نہ ہوتے۔" اسی طرح مصر میں ایک ماہ یا اس سے کچھ زیادہ قید رہنے کے بعد ایک روز ایک برطانوی افسر خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت شیخ سے عرض کی کہ کل آپ لوگوں کو مالٹا روانہ کیا جائے گا، سفر کے انتظامات کر لیجیے۔ اسیروں اور قیدیوں کے انتظامات ہی کیا۔ دو چار کپڑوں، جانمازوں اور چند کتابوں کی گٹھریاں باندھ کر ہاتھوں میں لے لیں اور خاصان خدا کا قافلہ کوچ کے لیے تیار ہو گیا۔ ۱۶ر فروری ۱۹۱۷ء کی صبح کو پانچ مجاہدین کی یہ فوج گورے سپاہیوں کی گارد کی نگرانی میں موٹر کے ذریعہ قاہرہ کے ریلوے اسٹیشن پہنچائی گئی اور تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں اسکندریہ کے لیے روانہ ہو گئی اور اسکندریہ میں اسی طرح شدید پہرہ اور نگرانی کے درمیان جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ جہاز میں آپ حضرات کو اوپر کے حصے میں ایک طویل و عریض کمرہ ملا جس میں بہت سے ترکی سپاہی قیدی بھی ہے۔ جہاز کے ذمہ داران نے حضرت شیخ سے کھانے کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ سے ہم صرف روٹی لے سکتے ہیں۔ سالن اور گوشت نہیں لیں گے۔ چنانچہ جہاز والوں نے ضروری سامان خورد و نوش مہیا کر دیا، حضرت مولینا مدنی حکیم نصرت حسین صاحب اور مولینا وحید احمد رحمہما اللہ نے کھانا پکانے اور انتظامات کا چارج لے لیا۔

زمانہ جنگ عظیم کا تھا۔ ہر ہر قدم پر جرمنی کی آبدوزیں برطانوی اور اتحادی جہازوں کے شکار کے لیے گھومتی پھرتی تھیں، آئے دن اتحادی جہازوں کی غرقابی کی خبر اڑا کرتی تھی اس لیے اس جہاز پر ریڈ کراس کا نشان لگایا گیا اور ایک جنگی جہاز نگرانی کے لیے اس کے جلو میں روانہ کیا گیا۔ منٹ منٹ پر تمام جنگی قیدیوں کو ہدایت دی جاتی تھی اور مشق کرائی جاتی تھی کہ سگنل ہوتے ہی ہر ہر فرد لائف بیلٹ باندھ کر لائف بوٹس

کے پاس پہنچ جائے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پاس مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تبرکات ناخن کے تراشے اور بال وغیرہ تھے وہ آپ نے سب خدام میں تقسیم کیے کہ نہ جانے کب کس کا وقت آجائے تو پسماندہ کے پاس کچھ تو رہ جائے گا۔ جہاز کے قیدی وہ جنگی قیدی سپاہی اور افسران ترکی اور جرمنی افراد تھے جو اتحادیوں، برطانیہ وغیرہ کے خلاف اور خلافتِ عثمانیہ کے دفاع میں صف آرا تھے۔ یہ لوگ جب ہندوستانی علماء، فضلاء، محدثین اور مشائخ کو اسی جرم اور اسی حیثیت میں قید دیکھتے تھے جس میں وہ قید تھے اور جب انھیں یہ تفصیل معلوم ہوتی تھی کہ یہ حضرات اسی ہندوستان کے رہنمایانِ ملک و ملت ہیں جس کے سپاہی عراق ایران شام و مصر وغیرہ میں خلافت عثمانیہ کے خلاف برسرِ پیکار ہیں تو ان کے سر احترام و عقیدت سے جھک جاتے تھے اور وہ ان اکابر کے ہاتھ چوم چوم لیتے تھے۔ غرض پانچ شب و روز کے متواتر بحری سفر کے بعد ۲۱ر فروری ۱۹۱۶ء کی صبح کو جہاز مالٹا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔

شام کو چار بجے تک دفتری کارروائی وغیرہ ہوتی ہوگی۔ چار بجے یہ حضرات اُتارے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ گھوڑے گاڑی پر روانہ ہوئے اور باقی حضرات سپاہیوں اور گارڈ کے جلوس میں پیدل روانہ ہوئے۔ یہ جنگی قیدی تھے۔ ان کی گرفتاری اتحادیوں کی کامیابی کی علامت تھی اس لیے بندرگاہ سے اسارت گاہ تک عوام، بچے، عورتیں دو رویہ استقبال کے لیے کھڑی تھیں، جہاں جہاں سے یہ قافلہ گزرتا لوگ خوشی کے نعرے لگاتے اور ہوا میں جھنڈیاں لہرا کر اظہارِ مسرت کرتے تھے۔ اس طرح شہر کے درمیان سے گذر کر یہ جلوس اسارت گاہ تک پہنچا۔ یہ جگہ دراصل ایک بڑے مضبوط اور سنگی قلعے کا ایک حصہ تھی۔ اصل میں تو یہ قطعہ فوجی بیرکوں اور دفتروں کے لیے مخصوص تھا مگر پہلی جنگِ عظیم میں جب خطرناک فوجی قیدیوں کے لیے کسی محفوظ قید خانہ کی ضرورت پیش آئی تو پورے قلعے کو فوجی جیل خانہ میں تبدیل کر دیا گیا اور کانٹے دار تاروں کے ذریعہ اس کو مختلف کیمپوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

قیدی کیمپ کی تفصیلات

ان کیمپوں کے الگ الگ نام جرمن کیمپ، روگیٹ کیمپ، روم کیمپ، عرب کیمپ وغیرہ تھے۔ ان میں افسران، معمولی سپاہیوں، فوجی عہدہ داروں اور مختلف ممالک کے قیدی علٰحدہ علٰحدہ کیمپوں میں رکھے جاتے تھے۔ مسلمان فوجی اور سویلین عموماً عرب کیمپ میں جگہ پاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی روگیٹ کیمپ میں بھی مسلمان ہی قیدی رکھے جاتے تھے۔ یہ کیمپ قلعہ سے باہر دروازہ سے ملحق قطعہ پر خیموں پر مشتمل تھا۔ مگر باورچی خانہ غسل خانہ اور پانی کے انتظامات پختہ عمارت میں تھے۔ بیت الخلائیں کے بنے ہوئے تھے۔ مگر قیام و سکونت کے جملہ انتظامات خیموں ہی میں تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ کا پورا قافلہ اسی روگیٹ کیمپ میں رونق افروز ہوا۔ ایک خیمہ حضرت شیخ الہندؒ حضرت مدنیؒ اور مولینا عزیز گل صاحب مدظلہم کی استراحت کے لیے مخصوص کیا گیا اور اس کے برابر کا دوسرا نسبتاً چھوٹا خیمہ حکیم نصرت حسین صاحبؒ اور مولینا وحید احمد مدنی کے لیے مقرر کیا گیا۔ ہر چند کہ حکومت برطانیہ کی نظر میں ان حضرات پر خطرناک حد تک سخت تھیں اور سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں بھی ان میں سے بیشتر کے بارے میں شدید تھیں مگر کیمپ میں ان پر کوئی ایسی سختی نہیں تھی جس سے ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے، پڑھنے لکھنے اور میل ملاقات پر کوئی پابندی عائد ہوتی۔ ان حضرات کے ساتھ فوجی اور سیاسی قیدیوں جیسا باعزت برتاؤ کیا گیا اشیائے خورد و نوش دال، چاول، روٹی، گوشت، چائے، شکر، گھی، تیل سب حسبِ ضرورت حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں۔

گوشت کے معاملے میں شروع شروع میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اس لیے کہ جو گوشت ان کو اور سارے قیدیوں کو سپلائی کیا جاتا تھا وہ برف میں لگا ہوا کئی کئی برس پرانا اور منجمد (FROZEN) ہوتا تھا۔ قطعِ نظر اس کے کہ اس قسم کے گوشت کا مزہ بہت ناگوار اور بو بہت ناخوشگوار ہوتی ہے، عام طور پر اس کا ذبیحہ صحیح نہیں ہوتا۔ اس لیے ان حضرات نے یہ گوشت کھانے سے انکار کر دیا۔ گورنمنٹ نہ تو اس کو واپس لیتی تھی،

نہ کوئی متبادل انتظام کرتی تھی۔ چنانچہ بہت غور و خوض کے بعد یہ غیر مسلموں کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اور ہفتہ میں دو بار مرغ، کبوتر، خرگوش یا مچھلی بازار سے منگا کر خود ذبح کر کے پکاتے تھے۔ کیمپ میں زندہ جانور منگانا بالکل ممنوع تھا۔ جو لوگ تازہ گوشت کھانا چاہتے تھے ان کے لیے باہر ہی سے ذبح شدہ جانور آتے تھے مگر ان حضرات کے لیے خصوصی طور زندہ جانور منگانے اور اپنے ہاتھوں ذبح کرنے کی اجازت مل گئی تھی تاہم بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ جانور اس کوردہ میں ایسے نایاب تھے کہ سونے کے بھاؤ ملتے تھے۔ دو یا تین روپے کا ایک کبوتر، چھ یا سات روپے کا ایک مرغ، چار پانچ روپے کا ایک خرگوش، چار یا پانچ روپے کی ایک سیر مچھلی ملتی تھی۔

ستر پچھتر برس پہلے کی یہ قیمتیں آج کے حساب سے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں روپے تک ضرور پہنچتی ہوں گی۔ چنانچہ بہت کفایت کے ساتھ یہ حضرات ہفتے میں صرف دو بار گوشت تناول فرماتے تھے۔ باقی دنوں میں دالوں اور ترکاریوں پر اکتفاء کرتے تھے۔ سبزیوں، پھلوں، اشیائے خورد و نوش اور دوسری ضروریات کے لیے ان کیمپوں میں قیدیوں ہی نے حکومت کی نگرانی میں دوکانیں کھول رکھی تھیں جو امدادِ باہمی کے اصول کے تحت چلتی تھیں۔ دالیں وہاں دستیاب نہ تھیں، صرف مسور اور مٹر کی دالیں ملتی تھیں لیکن کبھی کبھی ہندوستان سے بذریعہ پارسل مختلف دالیں مونگ ماش، ارہر اور بڑیاں وغیرہ پہنچ جاتی تھیں جس کو یہ حضرات بڑے شوق اور قدر سے نوش فرماتے تھے۔ کھانا پکانے اور اس کے متعلق انتظامات کے لیے ان حضرات کو کوئی خادم نہیں ملا تھا۔ اس لیے خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس جماعت کے کھانے پکانے کا انتظام فی الجملہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہی فرماتے رہے۔ کبھی کبھی دوسرے حضرات بھی ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ مولانا عزیر گل اور حکیم نصرت حسین صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمے لینی چاہی مگر حضرت نے صاف انکار فرما دیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت ہی میری حاضری کا سبب ہے اس لیے آپ حضرات اس میں دخل نہ دیں۔ خورد و نوش کے ان انتظامات کے علاوہ ان کیمپوں میں علاج و معالجہ

کے لیے دو اسپتال تھے جن میں دیکھ بھال اور علاج کا معقول انتظام تھا۔ سنسر اور جملہ قواعد و ضوابط کی ماتحتی میں ڈاک کی سہولتیں بھی مہیا تھیں۔ لفافوں کی جگہ ائرلیٹر اور کارڈ مہیا کیے جاتے تھے مگر کارڈوں کی قیمت قیدیوں کو اپنے پاس سے ادا کرنی پڑتی تھی۔ ایرانی کو آپس میں ملنے جلنے کی مکمل آزادی تو نہ تھی مگر اجازت طلب کرنے پر ایک سے دوسرے کیمپ میں جانے کی روزانہ ایک وقت مقررہ پر بآسانی اجازت مل جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قیدیوں کو تفریح، سیر اور سمندر میں تیرنے اور غسل کرنے کی بھی اجازت آسانی سے مل جاتی تھی۔ بڑے ذی منصب اور اعلیٰ افسران کی تفریح کے لیے گھوڑے گاڑیوں کا انتظام ہوتا تھا۔ اور بیمار و کمزور حضرات کے لیے بھی مخصوص گاڑیوں کا انتظام تھا۔ ان حضرات اکابر کے قافلے سے عام طور پر مولینا عزیز گل صاحب اور مولینا وحید احمد صاحب روزانہ تفریح کے لیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی حکیم نصرت حسین صاحب بھی جاتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ صرف ایک بار اس تفریح میں تشریف لے گئے تھے۔

ان آسانیوں کے ساتھ ہی قیدیوں کے لیے بعض انگریزی، عربی اور ترکی زبانوں کے مخصوص اخبارات بھی مہیا کیے جاتے تھے اور بعض نیوز ایجنسیوں کے تازہ بتازہ تار بھی مہیا کیے جاتے تھے جسے قیدی اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے عام جگہوں پر دیواروں پر آویزاں کر دیتے تھے۔ بہت سے قیدی اپنے طریقے سے شہر سے سامان منگا کر اور لکڑی لوہے اور کپڑوں کے سامان بنا کر تجارت بھی کرتے تھے۔ قیدیوں کے اپنے اپنے ملک کی ہلال احمر اور صلیب احمر انجمنیں ان کے لیے ضروری سامان اور نقد بھی بطور ہدیہ بھیجا کرتی تھیں۔ ترکی کی انجمن کی جانب سے ہمارے حضرات اکابر رحمہم اللہ کو بھی ہدایہ اور نقود کی پیش کش کی گئی مگر حضرت شیخ الہندؒ نے انکار فرما دیا۔ بلکہ الٹے اس میں اپنی جانب سے چندہ دیا۔ قیدی اپنے طور پر کیمپ کے میدانوں میں لکڑی، ٹین اور ٹاٹ کے عارضی کمرے اور مکان بھی بنوا لیتے تھے اور سبزیوں اور پھولوں کی کیاریاں لگا کر خوبصورت چمن تیار کر لیتے تھے۔ جو قیدی کتاب و مطالعہ سے شغف رکھتے تھے وہ اپنے مطالعہ، تعلیم اور علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے اور مختلف زبانوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

مولانا وحید احمد صاحب نے یہیں جرمن اور فرنچ زبانیں سیکھی تھیں۔ موصوف عربی اور ترکی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور انہی زبانوں کے ماحول و مدارس میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی اس لیے بہت سے عرب اور ترک قیدیوں کو حدیث شریف خصوصاً مشکوٰۃ شریف کا درس دیا کرتے تھے[1] حضرت شیخ الہندؒ شب و روز کے بیشتر اوقات ترجمہ و تفسیر قرآن کی ترتیب حدیث شریف کی تدریس اور مشاغل روحانیہ میں صرف فرماتے تھے۔ اسی طرح حضرت کے دوسرے اکابر ہمراہی بھی زیادہ تر اوقات علمی روحانی مشاغل میں خرچ کرتے تھے۔ رحمہم اللہ

مالٹا میں حضرت کے مشاغل

ایک ماہ تک روگیٹ کیمپ میں قیام کے بعد ان حضرات کے لیے عرب کیمپ میں منتقلی کے احکام آئے۔ روگیٹ میں عمارتیں نہیں تھیں اور خیموں میں گذر کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے شدید سردی سے بچاؤ کی کوئی مستقل تدبیر نہ تھی۔ مالٹا میں دن رات برفیلی ہوائیں چلتی تھیں۔ رات کو باوجودیکہ ہم اپنے اپنے کپڑوں کو پہنے ہوئے دو دو کمبل اور ایک چادر اوڑھے ہوئے گدّوں پر ایک کمبل بچھائے ہوئے سوتے تھے مگر دو ڈھائی بجے رات کو شدت سردی کی وجہ سے نہ نیند آتی تھی اور نہ اُٹھنے کی ہمت ہوتی تھی۔ صبح کے وقت مجبور ہو کر نماز کے لیے اُٹھنا پڑتا تھا تو خیمے سے سر نکالنا ایک عذاب الیم کا سامنا ہوتا تھا۔ سرد ہوا کے اس زور کے تھپیڑے لگتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔[2] عرب کیمپ میں تشریف آوری کے بعد پختہ کمرے اور مکان میں قیام ہوا اور خیموں سے نجات ملی۔ تاہم مالٹا کی شدید سردی میں حضرت شیخ الہندؒ کے لیے چوبیس گھنٹے گرم پانی کا انتظام رکھنا ضروری تھا۔ دن میں تین مرتبہ

---

[1] تذکرہ حضرت مدنی، مولفہ مولانا راشد حسن عثمانیؒ

[2] اسیر مالٹا (حضرت رحمۃ اللہ)، ص ۹۱

ناشتے میں اور صبح و شام کھانے کے بعد چائے بنتی تھی۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ملاقاتیوں اور دوسرے کیمپوں سے حضرت کی زیارت کے لیے آئے ہوئے قیدیوں کے لیے چائے وغیرہ کا انتظام بھی کرنا پڑتا تھا۔ روزانہ علی الصباح ناشتہ تیار کرنا اور دونوں وقت کھانا پکانا کافی مشقت طلب مشغولیتیں تھیں۔ کھانا نکالنا لگانا اشیائے خورد و نوش کی فراہمی حساب کتاب اور اسی طرح کے بہت سے کام شدید مصروفیت کے متقاضی تھے۔ ان سارے کاموں کی ذمہ داری حضرتؒ ہی نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ دوسرے ہمراہی، ساتھی اور مخلصین بہت اصرار و کوشش کر کے کچھ ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ مگر بنیادی طور پر حضرت نے یہ ذمہ داریاں اپنے ہی ذمہ رکھیں۔ "چونکہ دیگر رفقاء کھانا پکانے سے ناواقف تھے۔ علاوہ ازیں ان کو دیگر مشغولیتیں فرصت بھی نہ دیتی تھیں، پھر وہ مداومت بھی نہ کر سکتے تھے اور میرا ہمراہ ہونا فقط ادائگیِ خدمت کی غرض سے تھا اس لیے تمام ضروری خدمتوں کو انجام دینا میرا فرضِ منصبی تھا۔ جس کے لیے میں نے مالٹا پہنچتے ہی اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا اور ہر کام کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ دوسرے رفقا نے بسا اوقات معارضہ کیا اور کاروبار کے بعض یا اکثر حصّہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ بعضوں نے نوبت مقرر کرنے کی خواستگاری کی مگر میں نے مخالفت کی اور یہی کہا کہ میرے فرضِ منصبی میں آپ لوگوں کو دخل نہیں دینا چاہیے۔"[1] اور جب اپنا فرضِ منصبی اور ذمہ داری استاد کی خدمت ہی کو مقرر کر لیا تھا۔ تو خدمتیں صرف کھانے اور اس کے انتظامات ہی تک تو محدود نہ تھیں، چھوٹی بڑی بیسوں ضرورتیں ہر ہر قدم پر پیش آتی رہتی تھیں جن کو حضرت اپنے لیے فخر و سعادت کا باعث سمجھتے تھے اور پوری مستعدی سے انجام دیتے تھے۔

ان مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کے ساتھ اس قید کی مغتنم فرصت میں تین دیرینہ تمنائیں پوری کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ یہ تمنائیں اور پھر دیرینہ تمنائیں بھی قابلِ ملاحظہ ہیں۔ "مالٹا میں داخل ہونے پر بلکہ اسیر ہونے کے زمانے ہی سے میری

[1] اسیرِ مالٹا، ص ۸۹

تین آرزوئیں تھیں۔ ترکی زبان سیکھنا۔ قرآن شریف حفظ کرنا۔ باطنی اشغال میں ترقی کرنا۔ چنانچہ مالٹا پہنچ کر چند دن تو وہاں کے انتظامات وغیرہ میں خرچ ہوگئے۔ اس کے بعد نصف جمادی الاوّل سے اواخر شعبان تک پندرہ پارے یاد ہوگئے[1] گویا فی ہفتہ سوا پارہ حفظ کا حساب ہوا اور یہ مقدار اس حالت میں ہوئی کہ "چونکہ فارغ وقت فقط ظہر کے بعد دو ڈھائی گھنٹہ یا اس سے بھی کم ملتا تھا، اس لیے زیادہ یاد نہیں ہوسکا"[2] اِدھر پندرہ پارے حفظ ہوئے اُدھر رمضان شریف کی برکات کا ظہور ہوا حضرت شیخ نے حکم دیا کہ یہ پارے جو حفظ ہوئے ہیں نوافل میں تراویح کے بعد سنائے جائیں۔ سب کی خواہش یہ رہی ہوگی کہ آدھا آدھا پارہ تراویح میں پڑھا جائے۔ مگر مقتدی صرف یہی اہل عزیمت وعظمت اکابر ہی تو نہ تھے۔ ترکی، عربی، ایرانی، ہندوستانی ہر طرح کے نرم وگرم لوگوں پر مشتمل جماعت ہوتی تھی جن میں زیادہ تر حضرات کو چھوٹی چھوٹی سورتوں میں تراویح کی عادت تھی۔ چنانچہ حضرت نے یہ پندرہ پارے نوافل میں سُنائے۔ عید کے بعد بقیہ پندرہ پاروں کے حفظ کا اہتمام کیا اور اس میں مشغول ہوگئے۔ اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جو کسی ہمہ شما کے ساتھ پیش آجاتا تو دل ودماغ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتا۔ عین اس وقت جب حضرت پوری توجہ سے حفظ میں مشغول تھے گھر کے خطوط ملے جن سے بیک وقت پانچ یا چھ افراد خاندان کی وفات کی اطلاع ملی۔ اس موقع پر دل کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ تو کیسے معلوم ہوسکتی ہے مگر حفظ کی سرگرمی میں ایک منٹ کے لیے بھی کوئی فرق نہیں آیا۔" رمضان شریف کے بعد پھر آگے یاد کرنا شروع کیا مگر اس مدت میں مدینہ منورہ کے واقعات، والد مرحوم کی خبر وحشت اثر اور جملہ کنبہ والوں کے رنجدہ واقعات نے بہت تشویش پیدا کی تاہم فضل خداوندی سے ماہ صفر تک پورا قرآن ختم ہوگیا[3] اس کے بعد ترکی زبان کی طرف توجہ فرمائی۔ وہ وقت آج کے زمانے سے بالکل مختلف تھا۔ اُس زمانے کی سیاست، حالات اور تہذیب وثقافت بھی الگ تھی۔ ترکی زبان خلافتِ اسلامیہ کی اور عالم اسلام کی سیاسی وسرکاری وثقافتی زبان تھی۔ دنیا کی

---

[1] اسیر مالٹا، ص ۱۲۱ [2] اسیر مالٹا، ص ۱۲۱ [3] اسیر مالٹا، ص ۱۳۱

ایک عظیم ایمپائر کی زبان تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مدینہ طیبہ کی دفتری اور حکومتی زبان تھی۔ چنانچہ حضرت نے تھوڑے ہی دنوں میں اس میں بھی مہارت پیدا کرلی۔

اسی کے ساتھ روحانی اشغال میں بھی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ غرض قید کا یہ زمانہ نہایت کامیابی کے ساتھ تین عظیم آرزوؤں کی تکمیل میں صرف ہوا۔" خدا کے فضل وکرم سے دو اوّل کی (تمنائیں) تو ایک درجہ میں حاصل ہوگئیں مگر تیسرا مقصد باوجود صحبت شیخ کامل اور فراغ وقت کے اپنی بدنصیبی کی وجہ سے ناکام رہا۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

مگر تاہم مجھ کو افضال خداوندی اور بزرگوں کی جوتیوں کے طفیل اس باب میں بہت کچھ اُمیدیں ہیں[1]۔"

یوں تو حضرت مدۃ العمر اپنے کو طالب علم کہتے اور سمجھتے رہے۔ مگر درحقیقت ظاہری طالب علمی کا دور جو چار یا پانچ برس کی عمر سے ٹانڈہ میں شروع ہوا تھا، اب جاکر مالٹا میں قرآن پاک کے حفظ اور ترکی زبان پر عبور کے ساتھ ختم ہوا۔ اس جگہ وہ واقعہ ایک بار پھر یاد آتا ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ میاں حسین احمد جو چاہو مانگ لو۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور علم اور صرف علم الٰہی کا طلب گار ہوں۔ بیاسی برس کی طویل زندگی میں یہی تمنائیں زندگی کی پہلی اور آخری تمنائیں رہی ہوں گی اس لیے کہ حضرت کی زندگی میں دنیاوی خواہشات، آرزوؤں، اور تمناؤں کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ اللہ نے چاہا تو اگلے صفحات میں کہیں اس اجمال کی تفصیل عرض کروں گا۔ مختصر یہ کہ نوافل تہجد اور تراویح میں قرآن پاک سناتے اور دور کرنے کا جو مشغلہ مالٹا میں شروع ہوا تھا وہ زندگی کے آخر دن تک اسی ذوق وشوق کے ساتھ جاری رہا۔ اور اشغال روحانیہ اوراد واذکار احتساب وتزکیۂ نفس کا جو طریقہ اس وقت شروع کیا تھا وہ آخر دم تک جاری رہا۔ ترکی زبان بھی تمام عمر بولتے اور سمجھتے رہے اگرچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ رسم الخط دُنیا

[1] اسیر مالٹا، ص ۱۲۱

سے اُٹھ ہی گیا اور اُس زبان کی اہمیت ختم ہو گئی۔

ایّامِ اسیری میں صدمات

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حضرت جب مدینۂ طیبہ سے روانہ ہوئے تھے تو بھرا پورا خاندان اور بسا بسایا گھر چھوڑ کر نکلے تھے۔ سفر صرف دو چار دنوں کا اور انتظام مختصر سی جدائی کا تھا مگر مقدّر کی بات کہ سفر طویل ہوتا گیا۔ گرفتاری ہوئی۔ مصر کی جانب روانگی ہوئی۔ سزا ہوئی۔ پھانسی کی خبریں گرم ہوئیں اور مالٹا کی قید واسارت پیش آئی۔ استاذ کی قربت اور ان کی پدرانہ شفقت نے ہر مشکل آسان اور ہر مصیبت قابل برداشت بنا دی تھی۔ قید وبند کی سختیاں صبر وشکر کے ساتھ جھیل رہے تھے۔ اچانک ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ کوئی معمولی انسان ہوتا تو صبر کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ ہی جاتا۔ ایک دن بلا اندیشہ وگمان یہ اطلاع ملی کہ بوڑھے ضعیف باپ اور دو جوان بھائیوں کو حکومت ترکی نے قید کر کے ترکی روانہ کر دیا اور بچے اور کمزور عورتیں مدینہ طیبہ میں اکیلے اور بے سہارا رہ گئے۔ کیسی عجیب اور طرفہ تماشا بات تھی کہ وہ ترکی حکومت جس کے لیے یہ لوگ تن من دھن کی بازی لگانے کو تیار تھے اُسی نے حضرت کے بوڑھے باپ اور بھائیوں کو محض اس جرم میں قید کر لیا تھا کہ وہ اصلاً ہندوستانی تھے اور ہندوستان کی حکومت اور ترکی سے لڑائی تھی۔ بُرا وقت آتا ہے تو روشنی بھی اندھیرا بن جاتی ہے۔

دوست دشمن می شود صائب بوقت عاجزی
خونِ زخم آہواں رہ می دہد صیّاد را

حضرت کے والد ماجد تو مدینہ ہی کی خاک میں پیوندِ زمین ہونے کی تمنا میں گھر بار اعزہ اقربا اور وطن چھوڑ کر دیارِ حبیب میں آ رہے تھے۔ اب جو اُن کو اس طرح پابند و مجبور کر کے ترکی روانہ کیا گیا تو اللہ ہی جانتا ہو گا کہ اس طرح ناخن کو گوشت سے اور روح کو تن سے

جدا کر دینے کی خبر سے حضرت کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ مدینہ میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ جانے والوں میں بوڑھی سوتیلی والدہ، دو بیمار بھاوجیں، اہلیہ، ایک خورد سال صاحبزادے اور ایک نوعمر صاحبزادی تھیں جن کا اللہ کے سوا کوئی ظاہری سہارا نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم یہ معلوم کر کے کچھ اطمینان ہوا کہ "مولینا عبدالحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت مدینہ طیبہ ہی میں تھے اور بعد میں ہندوستان آکر مدرسہ شاہی کے مہتمم ہوئے انھوں نے حتی الامکان خبر گیری اور امورِ ضروریہ کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔"[۱] یوں تو امید ہی کے سہارے مصائب کے پہاڑ کٹ جاتے ہیں مگر حضرت صبر و شکر اور راضی برضائے باری تعالیٰ کا نمونہ تھے۔ اس کے علاوہ ابھی اُمید کا ایک رشتہ برقرار تھا کہ کبھی تو یہ اندھیرے چھٹیں گے اُجالا نمودار ہوگا، ادھر ان چچا بھتیجوں کو رہائی ملے گی اُدھر باپ اور بھائیوں کی بیڑیاں کٹیں گی تو بوڑھے اور کمزور باپ کی آنکھیں روشن اور کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔ نوعمر و نوخیز بھتیجا وحید احمد جس نے آنکھ کھول کر دادا ہی کی ذات میں ماں اور باپ کی شفقت پائی تھی ایک ایک دن انتظار میں گذار رہا تھا کہ کب وہ لمحہ میسّر ہو کہ اُجڑے ہوئے افرادِ خاندان پھر ایک جگہ مل بیٹھیں مگر یہ کسے معلوم تھا کہ ابھی عشق کے بڑے بڑے اور کٹھن امتحان باقی تھے۔

سونا ابھی کندن نہیں ہوا تھا اور کچھ آخری آنچوں کی کسر ابھی باقی رہ گئی تھی۔ عین اس وقت جب حضرت کا ایک ایک لمحہ قرآنِ پاک کے حفظ میں گذر رہا تھا، ایک دن کئی ہفتوں کی رُکی ہوئی ڈاک ملی اور اس کے ہر خط میں کسی نہ کسی فردِ خاندان کی وفات کی خبر درج تھی۔ اس طرح ایک ہی وقت میں باپ، جواں سال بچّی، ہونہار بیٹے، جاں نثار بیوی، بیمار والدہ اور دو دو بھاوجوں اکٹھے سات افرادِ خاندان کی موت کی جانکاہ خبر ملی۔ دوسرے لفظوں میں دو بھائیوں کو چھوڑ کر پورا خاندان اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔ موت تو برحق ہے۔ جس نے ماں کی گود دیکھی اُسے قبر کی آغوش دیکھنی ہی پڑتی ہے مگر جن حالات میں اور جس مجبور ماحول میں جس طرح یہ اطلاعیں ملیں اُنھیں برداشت کرنے کے لیے پہاڑ جیسا کلیجہ چاہیے تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ کس سے مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ

[۱] نقشِ حیات

گھر میں بزرگوں سے راقم الحروف نے اُس وقت کی چشمِ دید کیفیت سُنی ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ مولانا وحید احمد نے مالٹا سے واپسی پر اہلِ خاندان کے سامنے اس واقعے کا تذکرہ ضرور کیا ہوگا کہ ظہر کی نماز کے بعد حضرت حسبِ معمول حفظ میں مشغول تھے کہ مولانا وحید احمد نے ڈاک لا کر دی۔ خدا کو ہی علم ہے کہ دل میں کیا خطرہ گذرا ہوگا کہ قرآن بند کیا اور خطوط پڑھنے شروع کیے۔ ہر خط کے ختم پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ غرض ایک ایک کر کے سارے خطوط ختم کیے۔ زیرِ لب انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور پھر ٹھیک اسی طرح جیسے دس منٹ پہلے مشغول تھے، دوبارہ حفظ میں مصروف ہوگئے۔ قرآن پاک کی حکایت 'اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون' کی اس سے اچھی تعبیر صحابہ کرام میں تو ضرور ہی ملتی ہوگی، آج کے زمانے میں تو نہ کانوں سے سُنی نہ آنکھوں سے دیکھی۔ بھتیجا وحید احمد گھر والوں کی خیریت و حالات اور خوشخبریوں کے شوق و انتظار میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ مگر خط دیتے تو کیا کہہ کر دیتے اور بتلاتے تو کس کلیجے سے بتلاتے کہ جن پیاری اور شفیق ہستیوں کی خیر و خبر کے تم منتظر ہو وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئیں اور جس گھر کے حالات تم سُننا چاہتے ہو وہ گھر سدا کے لیے اُجڑ گیا۔

کچھ دوسرے قیدی رفقاء

"مولانا مرحوم (شیخ الہندؒ) کی صداقت، ان کی حقانیت، ان کی للّٰہیت اور تقویٰ و طہارت، نے فقط احباب ہی کے دل پر سکہ نہ جمایا تھا بلکہ مخالف بھی اُن کی وقعت دل میں بہت زیادہ رکھتا تھا اور معاملہ عظمت ہی کا برتتا تھا۔ بڑے بڑے فوجی افسر جرنل اور کرنل میجر باوجود انگریز ہونے اور اس بات کو سمجھنے کے کہ مولانا ہمارے سیاسی امور میں مخالف ہیں اور ہماری موجودہ حکومت کو ہند میں نہیں چاہتے بلکہ ہندوستان کی آزادی کے خواہاں ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی خلافت کے دوست ہیں، جب مولانا کو دیکھ لیتے تھے تو نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے ٹوپی اُتار لیتے تھے

اور بعض تو بہت زیادہ جھک جاتے تھے۔"[1]

قیدیوں میں مختلف مذاہب اور ممالک کے مسلمان، عیسائی، یہودی، یورپین، ترکی، عرب، افریقی، کالے گورے تقریباً تین ہزار افراد تھے۔ ان میں زیادہ تر فوجی افسران، کمانڈرس، جنرل، کرنل، لیفٹیننٹ، عام سپاہی اور کچھ سویلین عام شہری بھی تھے مگر یہ سب اتحادیوں اور انگریزوں کے مخالف و معاند تھے۔" ذہنی ہمخیالی اور مصیبت نے سب میں ایسا رشتہ جوڑ دیا تھا کہ ہر ایک دوسرے پر جان نثار اور فدا نظر آتا تھا اور حقیقت میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا۔ وہاں پر ایک عجیب منظر دکھائی دیتا تھا۔ گویا کہ تفرقہ مذاہب و اقوام و اوطان عالم انسانیت سے بالکل اٹھ گیا ہے۔ انسانیت کے رشتۂ اتحاد نے ایک کو دوسرے سے ایسا جکڑ دیا ہے کہ گویا ہر ایک دوسرے کا حقیقی بھائی اور رشتہ دار ہے۔"[2] بڑے بڑے ذی وجاہت اور اعلیٰ عہدہ دار افسران دیکھتے تھے کہ اہم ترین فوجی قیدیوں اور خطرناک ترین سیاسی نظر بندوں کی جماعت میں چند سیدھے سادے، متواضع و منکسر مزاج، متقی و پرہیزگار علما صلحا کا یہ گروپ بھی شامل ہے اور اتحادیوں کا مخالف ہے اور اس کے خلاف حکومتِ برطانیہ کا تختہ الٹ دینے کی سازش کا الزام ہے تو ان کے سر تعظیم سے جھک جاتے تھے۔" حضرت مولانا رحمۃ اللہ سے عموماً ہر قوم کے ذی علم اور مقتدر لوگوں کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اور بہت تعظیم سے پیش آتے تھے۔ عید کے ایام میں مسلمانوں کے علاوہ جرمنی، آسٹریا وغیرہ ممالک کے مقتدر اور ذی وجاہت لوگ ملنے اور مبارکباد دینے کے لیے آتے تھے اور گلدستہ وغیرہ پیش کرتے تھے۔ پرنس جرمنی جو کہ غالباً قیصر جرمنی کا بھتیجا تھا اور آنڈن جہاز میں بحری فوجی کپتان کے عہدے پر تھا اور جملہ جرمنی کے اسرا میں باعتبار مرتبہ یعنی شاہی خاندان ہونے کے بہت بڑی عظمت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ عید کے دن مولانا کے پاس آتا تھا، چند منٹ بیٹھتا تھا اور چائے نوش کر کے چلا جاتا تھا۔ مولانا بھی دو چار مرتبہ اس کے یہاں نہایت مختصر طور پر

---

[1] اسیرِ مالٹا، ص ۸۲۔ [2] ایضاً، ص ۸۱۔

تشریف لے گئے۔ جب کبھی راستے میں مولینا اس کو نظر پڑجاتے تھے تو دور سے ٹوپی اُتار کر اور سر جھکا کر سلام کرتا تھا[۱]۔

مسلمان قیدیوں، شامیوں، ترکیوں، مصریوں وغیرہ کو اس مقدس جماعت سے قربت کے مواقع زیادہ حاصل تھے۔ ایمان، عقائد اور مذہب کی ہم آہنگی کی بنا پر ان لوگوں کو حضرت سے بہت زیادہ روحانی تعلق اور ذہنی عقیدت ہوگئی تھی۔ شامی اور ترکی قیدی، وقت اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ خدمات کا اور استفادے کا موقع ملے۔ ان میں بہت سے حضرات شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے اور برابر صحبت بابرکت میں حاضر باش رہے۔ سب سے پہلے ہندوستان کے ڈاکٹر غلام محمد صاحب اور مسٹر سیدار حضرت کی خدمت میں حاضر باش ہوئے۔ غلام محمد صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے اور مصر میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے مگر زمانہ جنگ میں ہندوستانی ہونے کی بنا پر شبہ میں گرفتار کیے گئے تھے۔ مسٹر سیدار بنگالی اور ذات کے برہمن تھے۔ یہ انگریزوں کے خلاف ایک بم کیس میں ماخوذ تھے۔ ان دونوں صاحبان نے مالٹا پہنچنے کے فوراً بعد بڑی گرمجوشی سے حضرت کا استقبال کیا۔ ع

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں موافق اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

ایک ترکی فوجی افسر قیدی علی بیگ کا واقعہ بہت عبرتناک اور نصیحت آموز ہے۔ یہ اور ایک دوسرا فوجی افسر حکومت ترکیہ کے فرار شدہ مجرم تھے اور مصر میں روپوش تھے۔ جنگ کے زمانے میں دونوں کو قید کر کے مالٹا بھیجا گیا۔ یہاں کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور علی بیگ نے دوسرے ترکی قیدی پر چھری کا ایسا کاری زخم لگایا کہ وہ جانبر نہ ہوسکا۔ مقدمہ چلا اور علی بیگ کو پھانسی کا حکم ہوا۔ اُس نے درخواست کی کہ اس کو ان حضرات اکابر سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شیخ مدنی کو متعدد بار اس کی قیام گاہ پر لے جایا گیا۔ اُس نے یہ درخواست بھی کی کہ پھانسی کے وقت یہ دونوں اکابر اس کے قریب موجود رہیں اور تکفین و تدفین ان ہی

---

[۱] اسیر مالٹا، ص ۸۲۔

دونوں کے ہاتھوں سے انجام پائے۔ یہ دونوں دیکھا اتھیں ٹنظور کی گئیں۔

پھانسی کے دن صبح صادق سے کچھ پہلے ان حضرات اکابر کو آفس میں لے جایا گیا۔ وہیں انھوں نے فجر کی نماز ادا کی اور وہاں سے جیل خانے تک موٹر پر لے جائے گئے۔ سات یا آٹھ بجے صبح کو جانے تیار کی گئی جس کو پہنچنے والوں میں علی بیگ شاہ بھی شریک رہا اور پھر اس نے کچھ وصیتیں کیں۔ آخر کار جب پھانسی کا وقت آگیا اور اس کو ہتھکڑیاں پہنائی گئیں تو اس نے حضرت شیخ الہندؒ سے عرض کی کہ پھانسی کے چبوترے اور تختے تک آپ میرے ساتھ رہیں۔ چنانچہ اس نے حضرت کے ہاتھ پکڑ لیے اور تختے تک لے گیا۔ جب اسے تختے پر کھڑا کیا گیا تب حضرت کے ہاتھ اس نے چھوڑے۔ مگر حضرت اس کے قریب ہی رہے۔ حتیٰ کہ پھندا اس کے گلے میں ڈالا گیا۔ اس نے کلمہ پڑھا اور تختہ کھینچ لیا گیا۔ حضرت مفتیؒ نے خود اس کی تجہیز و تکفین کی اور اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے نماز پڑھائی اور پھر ایصال ثواب کرتے رہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

قیدیوں میں ایک بڑے ترکی فوجی افسر بجوحت حسن تھے۔ ویسے تو وہ دمشق کے رہنے والے تھے مگر ترکی فوجی افسر ہونے کی وجہ سے زیادہ وقت ترکی میں گذارا تھا۔ بڑے بامروت، شریف اور بلند اخلاق تھے۔ حضرت اور ان کے بزرگ ہمراہیوں کی شہرت اور ان کی پاکیزہ سیرتوں کی باتیں سنیں تو درخواست بھیجی کہ میں زیارت کا متمنی ہوں اور حاضری کی اجازت چاہتا ہوں۔ حضرت شیخ الہندؒ تواضع و انکسار کی تصویر تھے۔ ان کی درخواست سن کر خدام کرام کے ساتھ بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ وہ حسب توفیق بڑی تواضع، اخلاق، اعزاز اور تکریم کے ساتھ پیش آئے اور بہت اصرار سے عرض گذار ہوئے کہ مجھے کسی خدمت کا موقع عنایت کیا جائے۔ حضرت نے شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ الحمد للہ مجھے کسی خدمت یا چیز کی حاجت نہیں ہے مگر بجوحت صاحب نے ڈاکٹر غلام محمد صاحب سے علیحدگی میں فرمایا کہ یہ حضرات اللہ کے برگزیدہ بندے اور دنیا کی ہر چیز سے مستغنی ہیں۔ اس لیے اللہ کے سوا کبھی کسی سے اپنی حاجت نہ کہیں گے مگر آپ توجہ

کے ساتھ خیال رکھیے اور جس لمحہ کوئی ضرورت اخراجات یا مصارف یا انتظامات کی پیش آئے فوراً مجھے اطلاع دیجیے۔ جزاہ اللہ ورحمۂ راحمۃً رحمۃً واسعۃ۔

ایک دوسرے بڑے ترکی افسر کرنل اشرف بیگ تھے۔ یہ حافظ قرآن تھے اور بچپن میں سلطان عبدالحمید مرحوم کی زیرنگرانی شاہی محل میں تربیت پائی تھی۔ بڑے انقلابی اور مجاہد مسلمان تھے۔ قومی درد اور ملی غیرت ان کے سینۂ پُرنور میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بارہا جلاوطن کیے گئے۔ قید میں ڈالے گئے۔ نظر بند ہوئے۔ روپوش ہوکر صحراؤں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرے مگر حق گوئی اور بیباکی سے باز نہیں آئے۔ بڑی بڑی جماعتیں بنائیں۔ فوجیں تیار کیں۔ دشمنوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور اسلام و مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لیے میدان میں سینہ سپر ہوئے۔ آخر کار مالٹا میں قید کیے گئے۔ ان کو بھی حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی عقیدت اور بہت تعلق تھا۔ حضرت بھی غیر معمولی توجہ اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے اور موقع بہ موقع ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ مالٹا سے رہائی کے بعد کرنل موصوف جب ترکی پہنچے اور مصطفےٰ کمال پاشا کے مشن میں شریک ہوئے تو اتاترک نے بیان دیا کہ اشرف بیگ کے آنے سے مجھے ایسا محسوس ہوا اور اتنی تقویت ملی جیسے میری دونوں آنکھیں مجھے مل گئی ہوں۔

ان کے علاوہ بہت سے فوجی افسر قیدی، بحری فوج کے کپتان سید حسن، آفندی بغدادی، کپتان نیازی آفندی، میجر سہا بیگ، جیب بیگ، جلال بیگ، کرنل جواد بیگ، جنرل محمود پاشا، جنرل فخری پاشا، فائق بیگ، مفتی حسن فہمی آفندی، شیخ الاسلام خیر الدین آفندی، انور پاشا کے والد احمد پاشا، سابق صدر اعظم ترکی سعید حلیم پاشا اور ان کے بھائی عباس حلیم پاشا وغیرہ وغیرہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور توجہات عالیہ کے خواستگار ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ حضرات نے بیعت کی درخواست بھی کی جن میں سے بعض کو حضرت نے داخل سلسلہ فرمایا۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی اور کرنل جلال بیگ نے حضرت کی

خدمت میں دلائل الخیرات شریف اور حمائل شریف ہدیۃً پیش کی تھی جنھیں حضرت پڑھا کرتے تھے اور ان کے لیے دعائے خیر فرماتے تھے۔ کیسے کیسے اہل اللہ باصفا اور مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہوں گے جن کے ذکر ہی سے قلب کی حالت متغیر ہو جاتی ہے۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

قیدی شہید

حضرت شیخ الہندؒ کے قیدی رفقا میں حکیم نصرت حسین صاحب کوڑہ جہان آباد ضلع فتحپور کے باشندہ تھے۔ دیوبند کے فاضل، حضرت کے شاگردِ خصوصی، مرید اور جاں نثار تھے۔ آپ اپنے بہنوئی سید ہاشم صاحب کے ساتھ حضر موت کے ایک شہر مکلا تشریف لے گئے تھے۔ سلطان مکلا حکیم صاحب کے زیر علاج تھا۔ اُس نے اپنے خرچ پر ان دونوں صاحبان کو حج کے لیے بھجوا دیا۔ سید صاحب تو حج کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور حکیم صاحب زیارت مدینہ طیبہ کے شوق میں مکہ مکرمہ میں قیام فرما رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ جب مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو حکیم صاحب اپنے استاد اور شیخ کے قافلے میں شامل ہو گئے اور جب حضرت کا قافلہ گرفتار ہوا تو آپ بھی قید ہو کر جدہ لائے گئے۔ یہاں پر سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر بہاء الدین نے آپ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ اعلان کر دیں کہ آپ کا اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو میں آپ کی رہائی کی صورت پیدا کر سکتا ہوں۔ حکیم صاحب نے بہ کمال استقامت جواب دیا کہ میں تو آخرت میں بھی اس جماعت اور شیخ الہندؒ کے زیرِ سایہ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے دنیا ہی میں ان سے الگ کیے دیتے ہیں۔ اگر آپ سب کی رہائی کا انتظام کر سکیں تو فبہا، ورنہ میں تنہا کسی بھی حالت میں حضرت سے الگ ہونا نہیں چاہتا۔ بالکل یہی پیش کش مالٹا میں بہ حالت قید گورنر یوپی کے سکریٹری مسٹر برن نے بھی کی تھی اور اس کو قبول کرنے کے لیے حضرت شیخ اور ہمراہیوں نے حکیم صاحب سے بہت اصرار کیا تھا۔ مگر مسٹر برن کو بھی آپ نے بالکل یہی جواب دیا تھا۔

مالٹا میں غریب الوطنی، شدید سردی، خورد و نوش کی تکلیفیں اور راحت و آرام کا

فقدان تو تھا ہی، اس پر مزید یہ کہ حکیم صاحب پہلے ہی سے بیمار اور کمزور تھے۔ معدہ کی شکایتیں تھیں اور وقتاً فوقتاً حرارت اور بخار کی شکایت ہو جاتی تھی۔ ان عوارض اور ضعف کی حالت میں ان کو خصوصی راحت، سکون، آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ مگر گھر بار اور وطن سے دور اور وہ بھی دشمنوں کی قید میں راحت و آرام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ حکیم صاحب ریاضت و عبادت، سحر خیزی جانسوزی میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ "بعد مولینا مرحوم کے ہماری جماعت میں کوئی بھی بااوقات شب خیز، اور تہجد گذار اُن (حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے زیادہ نہ تھا بلکہ تمام کیمپ اسرائِ مالٹا میں بھی کوئی ایسا نہ تھا۔ مولینا کی نظرِ عنایت ان پر بہت زیادہ تھی"[1] مالٹا پہنچنے کے بعد کافی دنوں تک آپ کی صحت قابلِ اطمینان رہی مگر رجب ۱۳۳۶ھ میں تپ و لرزہ کی شکایت ہوئی جو تین ماہ تک جاری رہی۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اسپتال میں داخل کر دیا جائے، مگر اتنی مدت تک شدید تکلیف میں مبتلا رہنے کی وجہ سے مریض کی حالت بہت ہی سقیم ہو گئی تھی۔ ان حضرات نے اسپتال کے داخلے میں بہت پس و پیش کیا اور کہا کہ اگر داخلہ ضروری اور لازمی ہی ہو تو کسی ساتھی کو ساتھ رہنے کی اجازت ملنی چاہیے مگر ڈاکٹروں نے کسی طرح اس کی اجازت نہ دی۔ اور داخلہ بھی اجباری اور لازمی قرار دیا۔ لاچار ہو کر بادلِ ناخواستہ آپ کو اسپتال روانہ کیا گیا۔ خدا نے فضل فرمایا اور ہمراہیوں اور احباب کو وہاں جانے اور ضروری خدمات کی انجام دہی کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ یہ حضرات برابر جاتے رہے۔ لیکن حالت دن بدن کمزور ہی ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں اور دوسرے تیمارداروں نے توجہ، علاج اور دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا مگر علاج کے ساتھ ہی ساتھ مرض بھی بڑھتا ہی رہا۔ آخر کار ڈاکٹروں نے گوشت اور پرندوں کا سوپ اور الکوحل سے مرکب مقویات کا استعمال کرانا چاہا، مگر حکیم صاحب نے بالکل انکار کر دیا کہ موت و حیات اللہ کے اختیار میں ہے مگر محرمات کا استعمال نہیں کروں گا۔

---

[1] اسیرِ مالٹا، ص ۱۲۲

اِدھر دن بدن مرض کا غلبہ ہوتا جارہا تھا، اُدھر لمحہ بہ لمحہ کمزوری بڑھتی جارہی تھی۔ احباب نے ایک بار پھر اسپتال سے نکال کر ساتھ رکھنے کی کوشش کی مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ آخر کار بالکل ہڈی چمڑا رہ گئے۔ ڈاکٹروں نے چارپائی سے اُٹھنے اور چلنے پھرنے کی سخت ممانعت کردی۔ بار بار ضعیف والدہ، اہلیہ اور معصوم جگر گوشوں کو یاد کرتے تھے۔ حالت مایوسی کو پہنچ گئی۔ ہلنے کی طاقت بھی ختم ہوگئی مگر سکون و اطمینان میں فرق نہیں آیا۔ ذرا موقع ملتا تھا اور کچھ سانس لیتے تھے تو چارپائی سے اُتر کر پورے ارکان کے ساتھ نمازیں اور تہجد ادا فرماتے تھے۔ ایک روز یہ حضرات تشریف لے گئے تو فرمایا کہ میرے اذکار و اشغال برابر جاری ہیں اور الحمدللہ قلبی تعلق اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور کسی قسم کی پریشانی اور گھبراہٹ بالکل نہیں ہے۔ ذیقعدہ ۱۳۳۷ھ کی نویں تاریخ جب یہ اکابر اپنے غریب الوطن قیدی ساتھی اور بیمار و جاں نثار رفیق سے ملنے گئے تو انھیں یہ روح فرسا و صبر آزما خبر ملی کہ جادۂ تسلیم و رضا اور راہِ وفا کے اس مسافر نے جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ زبان و قلم میں یہ طاقت اور الفاظ میں وہ وسعت کہاں سے لائی جائے کہ اس غم و اندوہ کی کیفیت بیان کی جائے۔ لیکن یہ بڑے صابرین و شاکرین کی جماعت تھی اور مقربین بارگاہِ الٰہی کا مجمع تھا۔ پھر بھی بشر تھے، اطلاع سُن کر دل تھام کر رہ گئے اور راضی برضا ہو کر مالکِ حقیقی کا شکر بجالائے۔

تجہیز و تکفین و تدفین کا مرحلہ سامنے آیا تو وہاں کے ذمّہ داروں اور خصوصاً ڈاکٹروں نے انکار کردیا کہ چونکہ مرض متعدی تھا اس لیے کسی کو غسل دینے، کفن پہنانے اور قریب جانے کی بھی اجازت نہیں۔ ساتھیوں نے اور دوسرے قیدیوں نے اس پر احتجاج کیا تو صرف اس کی اجازت ملی کہ دور سے جنازے کی زیارت کرلی جائے اور نماز جنازہ ادا کرلی جائے۔ جب کوئی احتجاج اور درخواست کارگر نہیں ہوئی تو حضرت کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ ہم لوگ کسی چیز میں شریک نہ ہوں گے۔ چنانچہ بڑی ردوقدح کے بعد اجازت دی گئی کہ غسل اسپتال کے عملے نے دے دیا ہے

تکفین و تدفین آپ لوگ اپنی مرضی کے مطابق کریں۔ چنانچہ ان حضرات نے اپنے ہاتھوں سے تجہیز و تکفین کی اور حضرت شیخ الہندؒ نے بہ قلب حزیں و بہ چشم نم اپنے جاں نثار خادم کی نماز پڑھائی جس میں کم و بیش ساٹھ مسلمان قیدی شریک ہوئے اور پھر ترکی کے سلطان عبد العزیز مرحوم کے وقف کردہ قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے پیوندِ زمیں کر دیا۔ تدفین، تکفین اور لوحِ مزار کے تمام اخراجات کرنل اشرف بیگ نے بالا ہی بالا ادا کیے۔

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

رہائی کے آثار

ان اکابر کی رہائی کے لیے ہندوستان کے عوام متواتر بے چین اور ملک کے مقتدر و نام آور حضرات برابر کوشاں تھے۔ حکومت حضرت شیخ الہندؒ کی مقبولیت اور پبلک کے احتجاج اور مطالبات پر سنجیدگی سے غور کر رہی تھی اور اس کا رویہ بہت کچھ بدلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس ماحول میں جنگِ عظیم بھی اتحادیوں اور خصوصاً برطانیہ کی فتح پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد مالٹا کے سارے ہی قیدیوں کی رہائی کے آثار و قرائن نظر آنے لگے۔ "غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ایک روز مولینا کو آفس میں بلایا گیا اور کمانڈر نے کہا کہ ہمارے پاس آپ کے لیے خاص طور پر حکم آیا ہے کہ آپ کی خاطرداری غایت درجہ کریں اور جو مراعات اور حقوق فوجی کپتان کے لیے ہیں وہ آپ کے ساتھ ملحوظ ہوں۔ اس لیے ہم آئندہ ان کا اہتمام کریں گے۔ اگر آپ کو کوئی ضرورت یا شکایت ہو تو بیان فرمائیے۔ مولینا مرحوم نے فرمایا کہ میں کیمپ میں جا کر کل لکھ کر بھیج دوں گا۔ اس نے کہا کہ اپنے قیام کے لیے جس کیمپ اور کمرے کو آپ چاہیں پسند فرمالیں، ہم وہاں انتظام کر دیں گے"[1] انگریز قوم اور برطانوی حکومت بنیادی پالیسی اور عمومی سیاست کی نبض پر مکمل کنٹرول رکھتی تھی لیکن عام رکھ رکھاؤ اور معمولی معاملہ اور برتاؤ میں وہ پوری رعایت اور مروت کا لحاظ بھی کرتی تھی، خصوصاً فرق مراتب کا خیال ضرور رکھتی تھی، چنانچہ اسی زمانے میں ایک روز حضرت کی خدمت میں قیدی کیمپ کا انگریز ڈاکٹر حاضر ہوا اور عرض کی کہ حکومت ہند نے مجھے حکم بھیجا ہے کہ آپ کی صحت اور عافیت کے بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کروں اور خورد و نوش کی ضروریات میں حسب ضرورت و خواہش اضافہ کروں۔

اس قسم کی چھوٹی چھوٹی رعایتوں کے تین چار ماہ بعد ایک روز حضرت کو

---

[1] اسیر مالٹا، ص ۱۰۷

آفس میں بُلایا گیا وہاں گورنر یوپی کے سکریٹری مسٹر برن نے آپ سے ملاقات کی۔ یہ شخص صاف اُردو بولتا تھا اور سب کے ساتھ ادب اور اخلاق کے ساتھ بات کرتا تھا۔ اُس نے تفصیل کے ساتھ حضرت کی مزاج پرسی کی اور پوچھا کہ یہاں کی آب وہوا کا آپ کے مزاج مبارک پر کوئی ناگوار اثر تو نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہاں کی سردی اور ناموافق آب وہوا مجھے بالکل موافق نہیں ہے۔ اگر حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مجھے قید میں رکھا جائے تو دیوبند یا ہندوستان کے کسی بھی دوسرے مقام پر مجھے منتقل کر دیا جائے۔

حضرت مدنی نے نہایت مدلّل اور بہترین طریقے سے اُسے قائل کر دیا کہ ہماری روزمرہ کی غذا کی ہر چیز، گوشت، دالیں، تیل، مصالحہ، گڑ، گھی غرض ہر چیز یہاں نایاب ہے۔ جو غذا آپ لوگوں کے لیے پسندیدہ اور قابلِ ترجیح ہے وہ ہمارے لیے ناجائز اور حرام ہے۔ اگر کچھ چیزیں کسی نہ کسی طرح دستیاب بھی ہیں تو اتنی گراں اور کمیاب ہیں کہ ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ گورنمنٹِ برطانیہ ہم کو ضرورت کے مطابق مصارف بھی نہیں دیتی۔ مصری، ترکی، عربی، جرمنی اور دوسری حکومتیں اپنے قیدیوں کو مکمّل اخراجات دیتی ہیں۔ میرے بھائی ایڈریانوپل میں نظربند ہیں۔ ان کو نہ صرف یہ کہ چھ پاؤنڈ فی کس خرچ ملتا ہے بلکہ رہنے سہنے اور آنے جانے کی مکمّل آزادی ہے اور ان کے اہل وعیال بھی ان کے پاس پہنچا دیئے گئے ہیں مگر آپ کی حکومت نہ ہماری صحت وضروریات کی طرف توجہ دیتی ہے نہ اخراجات پوری طرح دیتی ہے اور نہ ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مسٹر برن حضرت کے معقول دلائل اور قانونی وضاحتوں سے بہت متاثر ہوا۔

حضرت مولٰینا حکیم نصرت حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس نے بہت زور دیا کہ میں آپ کی رہائی کے احکامات فوراً جاری کرا دوں گا۔ ساتھیوں نے اور حضرت شیخ الہندؒ نے بھی بہت اصرار کیا کہ وہ مسٹر برن کے کہنے کے مطابق یہ لکھ کر دے دیں کہ میں رہائی چاہتا ہوں مگر آپ کو تو رہ وفا میں شہید ہونا تھا۔ چنانچہ اُس سے صاف

انکار کر دیا کہ چھوٹیں گے تو سب ساتھ چھوٹیں گے، میں اکیلے اپنی رہائی نہیں چاہتا۔
حضرت مولینا عزیر گل صاحب مدظلہم نے اس سے نہایت سختی سے باتیں کیں اور فرمایا کہ کیا آپ کی حکومت کو ہمارے حالات اور تکالیف کا علم نہیں ہے جو آپ ہمیں بیوقوف بنانے آئے ہیں۔ ایسی جرات آمیز اور صاف باتیں سُن کر اُس نے کہا کہ شاید آپ ہی مولینا عزیز گل صاحب ہیں۔ ان ملاقاتوں کے بعد دوسرے دن وہ ان حضرات کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ چونکہ فارسی اور اُردو کا خاصا علم رکھتا تھا۔ اس لیے مختلف موضوعات پر باتیں کیں اور حضرت کی کتابیں دیکھیں۔ نیز نہایت عقیدت و احترام کا اظہار کیا۔ رخصت ہوتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ میں نے آپ کی راحت و آرام کے سارے انتظامات کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہر معاملے میں آسانی ہو گئی اور سامان خورد و نوش کے بجائے نقد روپیے ملنے لگے۔ حضرت کے لیے چار اور دوسرے لوگوں کے لیے دو شلنگ روزانہ مقرر ہوئے۔
اس کے جانے کے بعد ہندوستان کے علماء و اکابر کے خطوط ملے کہ متعدد وفود حکومت سے ملے اور زور دیا کہ جلد سے جلد ان حضرات کی رہائی عمل میں لائی جائے۔ اور اسی بنا پر مسٹر برن جا رہے ہیں۔ آپ لوگ ان کی شرائط منظور کر لیں۔ تاکہ جلد از جلد واپسی ہو سکے۔ یہ سارے قرائن اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ ایام اسارت ختم ہونے والے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد عام قیدیوں کی رہائی شروع ہو گئی۔ ان حضرات کو نہایت اعلیٰ درجہ کی قیام گاہوں میں منتقل کیا گیا۔ رہائی کی ابتدا کچھ جرمن، آسٹرین اور بلگیرین قیدیوں سے ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ مصری، شامی اور ترکی قیدی بھی رہا کیے جانے لگے۔ چار چھ ماہ کے وقفے میں کافی قیدی رہا ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ آخر میں صرف یہ حضرات اور دس بارہ ترکی افسران سعید حلیم پاشا سابق صدر اعظم ترکی، ان کے بھائی عباس حلیم پاشا، کرنل جلال بیگ سابق گورنر صوبہ بورصہ ترکی جنرل علی سلیمان، احسان پاشا، جنرل فخری پاشا، شیخ الاسلام خیرالدین آفندی اور جنرل محمود پاشا جیسی اہم اور بڑی شخصیتیں رہ گئیں۔

مالٹا سے رہائی اور روانگی

گلوئے عشق کو دار ورسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہوگا کہ رہائی، آزادی اور دیدار وطن کے انتظار میں ان حضرات اکابر کا ایک ایک منٹ کیسے گذر رہا ہوگا مگر آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ یہ لوگ مقدرات الٰہیہ پر صبر اور رضائے باری تعالیٰ پر شکر کی زندہ مثال تھے۔ راقم الحروف کو ان میں تین حضرات مولانا وحید احمد، مولانا عزیر گل اور حضرت شیخ مدنی کی زیارت اور مجالست کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اوّل الذکر دو حضرات بھی بڑے دل گردے کے لوگ اور مقربین بارگاہِ بزرگ تھے مگر حضرت شیخ جیسے راضی برضائے الٰہی، صابر شاکر اور نفوسِ مطمئنہ کتابوں میں تو بے شک موجود ہیں اس دنیا میں چلتے پھرتے تو آپ ہی کو اپنی مثال دیکھا۔ نہ دنیا کی کسی دل چسپی سے دل چسپی تھی، نہ کسی رنج سے تکلیف تھی۔

نہ شادی داد سامانے نہ غم افزود حرمانے
بہ پیش ما غریباں ہر کہ آمد بود مہمانے

اور جب خدام کا یہ حال تھا تو حضرت شیخ الہندؒ کے لیے تو یہ تصور بھی نہیں آسکتا کہ آپ ایک ایک دن رہائی کا انتظار کرنے لگے ہوں گے۔ تاہم اب امتحان پورا ہو چکا تھا۔ جیل کی چہار دیواروں کال کوٹھریوں اور تختۂ دار تک پہنچ کر حق کے یہ علمبردار ثابت قدم ثابت ہو چکے تھے۔ چنانچہ وسط فروری ۱۹۲۰ء کی ایک صبح کو کمانڈر کا حکمنامہ آ پہنچا کہ آٹھ دن کے اندر اندر سفر کے لیے تیار رہیں۔ ٹھیک آٹھویں روز دوسرا حکم ملا کہ صبح کے اسٹیمر سے آپ لوگ ہندوستان کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ حضرات پوری طرح تیار ہوئے، سامان درست کر لیا گیا اور روانگی کے سارے چھوٹے بڑے انتظامات کر لیے گئے، مگر عین وقت پر اطلاع ملی کہ اسٹیمر کے مسافروں

میں کوئی بیماری پھیلی ہوئی ہے، اس لیے دوسرے اسٹیمر کا انتظار کرنا پڑے گا اور اس کا کوئی وقت دن، تاریخ متعین نہیں کی گئی۔ بالآخر کم و بیش ایک ماہ بعد ۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن دس بجے ان کو اسٹیمر پر سواری کا حکم دیا گیا۔ گنے چنے چند قیدی حضرات جو باقی رہ گئے تھے وہ ان اکابر کے فراق سے بے چین تھے چہرے آنسوؤں سے تر اور دل رنج والم سے معمور تھے۔ رخصت کے وقت عجیب و غریب منظر تھا مسلمان تو مسلمان ہی تھے غیر مسلم بھی آزردہ اور نم دیدہ تھے۔ قیدی ہی نہیں بلکہ چھوٹے بڑے سارے ہی ذمہ داران اور افسران وداع کرنے کیلیے بندرگاہ پر جمع تھے۔ حضرت شیخ نے سواری پر قدم رکھا تو شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے باآوازِ بلند دعا مانگی۔ حاضرین نے بھرائی ہوئی آوازوں سے آمین کہا۔ مالٹا سے بڑے بڑے قیدی، وزراء، شاہزادگان، افسران اور ذمہ داران رخصت ہوئے تھے مگر ایسا روح پرور اجتماع، ایسی تعظیم و تکریم جو ان بوریہ نشین فقیروں کی کی گئی کسی کے حصے میں نہیں آئی تھی غیر مسلم افسران اور انگریز ذمہ داران اس غیر معمولی عقیدت و محبوبیت پر انگشت بدنداں تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ کم و بیش تین برس کی اسارت کے بعد یہ قافلہ قیدی کیمپ سے نکلا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ جہاز میں انھیں سکنڈ کلاس میں فرو کش کرایا گیا اور خدمت کے لیے صوبہ سرحد کے مسلمان پٹھان حاضر ہوئے۔

مولینا سید عزیز گل صاحب مدظلہم بھی اسی صوبے کے باشندے تھے اور آپ کے آباء و اجداد بھی پشتہا پشت سے اس علاقے کے روحانی اور دینی پیشوا و مقتداء تھے۔ اس پر مزید یہ کہ پشتو زبان کے اشتراک کی وجہ سے اقربا اور اعزہ کی سی محبت و تعلق میسر آیا۔ چنانچہ ان خدام نے خدمت اور محبت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ایسے خوشگوار ماحول میں جہاز اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ مگر نگرانی بدستور تھی۔ پہرے چوکی اب بھی قائم تھے اور سرکاری طور پر یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ قافلے کا رخ کس منزل کی طرف ہے۔ غیر سرکاری طور پر یہ اطلاعات ضرور ملی تھیں کہ جہاز بمبئی کیلیے

روانہ ہوا ہے۔

کس نمی گفت کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

۱۵ر مارچ کی صبح کو جہاز اسکندریہ پہنچا۔ دن بھر قیدیوں کو اتارنے، ٹھہرانے اور لانے لے جانے کے انتظامات ہوتے رہے۔ شام کو سپاہیوں اور فوجیوں کے پہرے میں آپ حضرات کو اتارا گیا اور ٹرام کے ذریعے اسکندریہ کے فوجی قیدیوں کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا جس میں قیام و طعام اور راحت و آرام کے انتظامات ایسے ناقص تھے کہ ساری رات بے چینی اور بے خوابی میں گذارنی پڑی۔ صبح کو کیمپ سے جیل خانہ کی طرف روانگی ہوئی۔ دو طرفہ بندوقوں اور سنگینوں سے مسلح سپاہیوں کی قطاروں کے درمیان یہ حضرات پیدل جیل خانہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ برسوں کی قید اور اسیری نے چلنے پھرنے کی طاقت یوں بھی کم کر دی ہوگی اور پھر تین چار دن کے سفر کی تکان اور رات کی بے خوابی نے مزید خستہ و شکستہ کر دیا ہوگا۔ نہ جانے پیدل کیسے چلے ہوں گے۔ ؎

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور مرے بال و پر میں ہے

مگر عزم و عزیمت کے آگے ہر دشواری آسان ہوتی ہے۔ یہ پیدل سفر بھی آسانی بلکہ خندہ پیشانی سے پورا ہوا۔ اس جیل خانہ میں ترکی اور عربی قیدی بھی تھے۔ سپاہی اور پہرہ دار سب ہندوستانی تھے، نگران کو کسی سے ملنے اور بات چیت کی اجازت نہ تھی۔ یہ سارے ہی حضرات ملاقات اور استفادہ کے آرزو مند ہوئے مگر باوجود درخواست کے اجازت نہ ملی۔ تاہم چلتے پھرتے سلام و مصافحہ ہو جاتا تھا اور یہ لوگ ہدایا اور تحفے ارسال کر دیتے تھے۔

اٹھارہ دن تک اسی پابندی کے ساتھ اس جیل میں رہ کر ۲ر اپریل ۱۹۲۰ء کو اسکندریہ سے سوئز کے لیے بذریعہ ٹرین فسٹ کلاس میں روانہ ہو کر شام کو وہاں پہنچ گئے۔ یہاں نگرانی کی سختیوں میں کمی ہوگئی اور ملنے جلنے کی پابندی بھی ختم ہوگئی۔ سوئز میں اسٹیمر کے انتظار میں پونے دو ماہ تک ٹھہرنا پڑا۔ ۲۳ر مئی ۱۹۲۰ء کو اسٹیمر ملا اور اس میں

فسٹ کلاس میں راحت و آرام کے ساتھ سفر شروع ہوا جو پورے پندرہ دن کے بعد ختم ہوا۔" مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچ کر ہم کو رہا کیا گیا تھا۔[1]

رہائی کی خوش خبری آپ حضرات کو بمبئی لنگر انداز ہونے کے بعد ہی ملی چنانچہ اب اترنے سامان آتارنے اور دوسرے معاملات کے انتظامات انھیں خود ہی کرنے تھے جس کے لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور مولینا عزیر گل صاحب بذریعہ کشتی بمبئی شہر روانہ ہو گئے اور حضرت شیخ الہندؒ نیز مولینا وحید احمدؒ موٹر بوٹ کے انتظار میں جہاز ہی پر رہے۔ بمبئی کے عوام اور خلافت کمیٹی کے ذمہ داران کو اپنے محبوب رہنماؤں کے قدوم میمنت لزوم کی اطلاع ملی تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو گئے مگر ساتھ ہی یہ حسرت بھی ہوئی کہ ایک گھنٹہ کی مدت میں نہ تو شایانِ شان استقبال کی تیاریاں کر سکیں گے، نہ جلسہ وجلوس کے انتظامات ہو سکیں گے اور نہ اطراف و جوانب کے ذمہ داروں کو یہ خوشخبری بھیج سکیں گے۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کا استقبال بارانِ رحمت کے ساتھ فرمایا۔ ادھر جہاز لنگر انداز ہوا، ادھر رحمت کی بارش نے بڑھ کر پیشوائی کی اور چوبیس گھنٹے تک ایسی بارش ہوئی کہ موٹر بوٹ کا جہاز تک پہنچنا اور مسافروں کا اترنا متعذر ہو گیا۔ اس عرصے میں مادرِ وطن نے اپنے جاں نثار سپوتوں کے لیے گود آراستہ کرلی۔ لاکھوں عقیدت مند، پروانہ ہائے شمع آزادی عوام، خواص، لیڈران اور رہنمایان، علمائے دیوبند، مولینا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ، حکیم عبدالرزاق انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نواب محی الدین صاحب قاضی ریاست بھوپال، مولینا عبدالباری فرنگی محلی، مہاتما گاندھی اور سیکڑوں دوسرے لیڈران خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام بندرگاہ پر استقبال کے لیے صف بستہ ہو گئے۔ جہاز سے اُترنے سے پہلے ایک انگریز افسر دو تین ہندوستانی افسروں کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست

[1] نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۳۵

کی۔ تخلیہ میں اُس نے کہا کہ مولینا رحیم بخش صاحب[1] آئے ہیں، وہ آپ سے بات کریں گے، آپ ان کی باتوں کو غور سے سُنیں۔ اس کے بعد مولینا رحیم بخش آئے اور انھوں نے حضرت کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپ جہاز سے اتر کر سیدھے اسٹیشن تشریف لے چلیں آپ کے سفر کے انتظامات ہو جائیں گے مگر بمبئی میں قیام نہ کریں اور سیاسیات سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیں، ورنہ حکومت کی طرف سے سختی اور شدید کارروائی کا اندیشہ ہے۔ حضرت شیخ نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دی اور بمبئی میں نہ صرف یہ کہ قیام فرمایا بلکہ اُس جلسے میں بھی شرکت فرمائی جو استقبال کے لیے خلافت کمیٹی نے ترتیب دیا تھا۔ اس کے علاوہ "بمبئی اترتے ہی مولینا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ مولینا عبد الباری صاحب فرنگی محل لکھنؤ سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہند کے استقبال کے لیے تشریف لائے تھے۔ نیز دوسرے لیڈران سے خلوت و جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد کا پروگرام ہندوستان کے لیے ضروری قرار دیا اور پھر اسی طریقے پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی"[2] اس کے بعد یہ قافلہ دیوبند کے لیے روانہ ہو گیا۔

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

رہائی کے بعد ہندوستان میں

حضرت جب گرفتار ہوئے تھے تو وطن آباد تھا۔ خاندان بھلا بھولا اور کامیاب تھا۔ ماں باپ بھائی بھاوجیں اہل و عیال اور گھر بار اطمینان و عافیت سے

---

[1] مولینا کا ذکر گذشتہ صفحات میں حضرت مدنیؒ کے والد کے واقعات میں گذر چکا ہے۔ ریاست بھاولپور میں مدار المہام تھے۔ حضرت گنگوہی کے متوسلین میں اور علماء کرام کے بڑے معتقد تھے۔ تاہم حکومت برطانیہ کے خیر خواہ اور معتمد تھے۔

[2] اسیر مالٹا، ص ۱۳۰۔

ہم کنار تھے۔ غرض زندگی کا چمن سرسبز و شاداب تھا۔ اب ساڑھے تین برس کے بعد رہا ہوئے تو وطن لٹ چکا تھا۔ گھر اور خاندان اُجڑ گیا تھا اور ماں باپ اور اہل و عیال ختم ہو چکے تھے، چالیس بیالیس کی عمر تھی، کہیں گھر تھا نہ در تھا، نہ خاندان باقی رہا تھا نہ اہل و عیال زندہ بچے تھے۔ ؎

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
بہار بھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا

بہرحال بمبئی پہنچ کر حضرت نے مدینہ طیبہ واپسی کا ارادہ فرمایا۔ اب تک مدینہ طیبہ کا قیام اس ارادے سے تھا کہ جب تک والدین مرحومین بقیدِ حیات ہیں ان کی خدمت سے محرومی نہ ہو جائے۔ مگر اب جو واپسی کا ارادہ ہوا تو یقیناً مستقل توطن اور دائمی اقامت کے لیے ہوا ہو گا۔ "چونکہ میں اپنی خواہش سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر جدہ سے روانہ ہوا تھا تاکہ سفر میں حضرت کی خدمات انجام دوں اور حتی الوسع تکالیف سفر کو کم کر دوں، اس لیے واپسی پر قصد مصمم تھا کہ بمبئی پہنچ کر حجاز کو واپس ہو جاؤں گا۔"[1] اس ارادے کا ذکر حضرت شیخ الہندؒ سے فرمایا اور واپسی کی اجازت چاہی مگر حضرت نے اجازت نہیں دی۔ "اس خیال کو جب میں نے ایک روز سویز میں ظاہر کیا تو فرمایا کہ میں تراجم ابواب بخاری شریف کی شرح لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا۔"[2] بظاہر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ استاد نے شاگرد کو علمی اور دینی خدمت کے لیے روکا تھا۔ اور حضرت انہی مقاصد کے لیے رُک گئے تھے مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے روکنے اور حضرت کے رُک جانے میں مشیت باری تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ "میں نے عرض کیا کہ ایک شرط پر میں تا اختتام شرح تراجم، دیوبند میں ٹھہرنے اور امور متعلقہ انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ فرمایا وہ کیا شرط ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جو وقت آپ اس کام کے لیے عطا فرمائیں، اس وقت میں چاہے کیسا بھی بلند مرتبہ شخص

---

[1] نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۵۰۔ [2] ایضاً

آئے اس کے لیے صرف نہ فرمائیں۔ فرمایا کہ قبول ہے۔ مگر ہماری بھی ایک شرط ہے۔ میں نے عرض کیا وہ کیا ہے تو فرمایا کہ پھر کہیں گے۔[1]

افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ کی اس شرط کی وضاحت نہ ہو سکی اور اگر ہوئی بھی ہو تو حضرت نے اسے کبھی ظاہر نہیں فرمایا۔ بہر حال "(میں نے) یہ ارادہ کر لیا کہ دیوبند میں حضرت کی خدمت میں تا اختتام تراجم ابواب رہوں گا۔ مگر جب بمبئی پہنچا اور تحریک خلافت کا زور و شور دیکھا اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تحریک آزادی کی جدوجہد کی طرف قوی تر ہو گیا اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہیں تو یقین ہو گیا کہ کسی قریبی زمانہ میں تراجم ابواب کا کام نہیں ہو سکتا، اس لیے میں نے حضرت سے (پھر) عرض کیا اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مدینہ منورہ چلا جاؤں اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں تو فرمایا کہ تیرا جانا تو کسی طرح اس زمانہ شریفی میں مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔[2]

یہاں ایک بات واضح ہوتی ہے کہ زندگی اور تمام تر سرگرمیوں کے اس مرحلے تک حضرت سیاسی تحریکات اور جدوجہد آزادی میں شرکت کی طرف مائل نہ تھے اس کے علاوہ اس وقت تک آپ کا ارادہ ہندوستان میں مستقل قیام کا بھی نہ تھا۔ بلکہ استاد کی تعمیل حکم میں صرف تراجم ابواب کے اختتام تک عارضی طور پر ٹھہرنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ مگر دیوبند پہنچنے اور حضرت شیخ الہندؒ کی سرگرمیاں تحریک آزادی کے لیے وقف ہو جانے کے بعد کوئی ایسا مرحلہ پیش آیا کہ حضرت مدنی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں اس وقت تک قیام کا ارادہ کر لیا جب تک ملک آزاد نہ ہو جائے بلکہ روحانی اور دینی و علمی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ہی ساتھ قوم اور ملک نیز سیاسی تحریکات آزادی کے لیے بھی وقف فرمانے کا فیصلہ کر لیا۔ بعد کے واقعات اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت شیخ الہندؒ نے جس شرط کا تذکرہ فرمایا تھا وہ یہی رہی ہو اور آپ نے اہمیت کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کی ذمہ داری حضرت کے سپرد فرمائی ہو۔

---

[1] نقش حیات، ج ۲، ص ۲۵۰۔ [2] ایضاً

"ان کا (حضرت شیخ الہندؒ) قلبی مذاق یہی تھا۔ مرض وفات کے زمانے میں کئی مرتبہ فرمایا کہ میں اس مرض سے اچھا ہو جاؤں تو قصد کرتا ہوں کہ تمام ہندوستان میں اسی تحریک و اشاعت کے لیے دورہ کروں گا۔"[1] بہرحال کوئی نہ کوئی ایسا اہم کام اور پروگرام تھا جس کی بنا پر حضرت شیخ الہند سعادت مند و فرماں بردار شاگرد کو ایک دن کے لیے بھی اپنے سے جدا ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ "میں نے عرض کیا کہ اچھا اتنی تو اجازت عطا فرمائیں کہ میں بمبئی میں تین چار دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیوبند پہنچوں۔ میرے چند احباب یہاں ہیں ان سے ملنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔"[2]

دیوبند پہنچنے پر اور راستے میں ایک ایک اسٹیشن پر دلی میں، میرٹھ، غازی آباد اور دوسرے سارے اہم مقامات پر ان حضرات اور حضرت شیخ الہندؒ کا جس محبت، خلوص اور شان و شوکت کے ساتھ استقبال ہوا، ان کی تفصیلات اور تذکرہ بڑی تطویل کا محتاج ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے گھرانے اور افرادِ خاندان نے حضرت مدنی کا استقبال بالکل اس انداز میں کیا جیسے کسی فردِ خاندان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ حضرت نے جس محبت، خلوص اور تن دہی کے ساتھ استاد کی خدمت کی اور جس طرح محض استاد کی راحت رسانی کے لیے قید و بند کے مصائب کو لبیک کہا۔ ان سب واقعات سے شیخ الہندؒ کے تمام ہی افراد خاندان حضرت سے غیر معمولی تعلق و محبت کا برتاؤ کر رہے تھے مگر خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ نے حقیقی اولاد کی طرح شفقت و مہربانی کا معاملہ فرمایا۔ حضرت بچپن ہی سے اسی گھر میں رہے پلے اور بڑھے تھے۔ ایسی عمر میں آئے تھے جب حویلی میں اُن سے پردہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اب جو مالٹا سے واپس آئے تو موصوفہ نے چاہا کہ آپ سے پردہ نہ کریں اور سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کریں۔ حضرت شیخ الہندؒ سے اس کی اجازت طلب کی گئی تو آپ نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا کہ میرا بھی دل نہیں چاہتا کہ تم حسین احمد سے پردہ کرو۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو

[1] اسیر مالٹا، ص ۱۳۰۔ [2] نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۰۱۔

اتنی خدمت نہ کرتا جتنی انھوں نے کی ہے مگر بہرحال شرعی طور پر سامنے آنے کی اجازت نہیں ہے[1]

دیوبند آنے کے فوراً بعد حافظ زاہد حسن صاحب نے امروہہ کے مدرسہ عربیہ کی مدرسی کے لیے حضرت کی خدمات حاصل کرنی چاہیں، اس کے لیے بھی حضرت شیخ الہندؒ اجازت نہ دیتے تھے۔ بڑے اصرار کے بعد اجازت دی تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد حکم بھیجا کہ مجھ کو تمھاری ضرورت ہے اور پھر جب علی گڑھ کے اجلاس میں ایک آزاد قومی درس گاہ کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت کو لکھا کہ فلاں تاریخ کو علی گڑھ کے اجتماع میں تمھارا شریک ہونا ضروری ہے۔ حضرت کے وصال کے بعد جب حضرت مدنیؒ دل برداشتہ وافسردہ آستانۂ شیخ پر حاضر ہوئے تو "بہت رنجیدہ تھے مگر خاموش خاموش اور اُداس اُداس رہتے تھے۔ میں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے برادران مولینا حکیم محمد حسن صاحب اور مولینا محمد محسن صاحب نے میرے شیخ الاسلام (حضرت مدنی) کو پلنگ پر بٹھایا۔ ایک بھائی ایک طرف دوسرے بھائی دوسری طرف درمیان میں حضرت شیخ الاسلام حضرت مولینا مدنی رحمۃ اللہ علیہ، میں نے اپنے کان سے یہ بات سنی کہ اب ہندوستان میں میرا کیا ہے، میرے سرپرست اس دنیا میں نہیں رہے، میں بے سہارا ہوں اور ان شیخ الہندؒ کے برادران نے روتے ہوئے فرمایا کہ بے شک! فوراً حکیم محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ اب آپ اس خاندان کے بڑے اور حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین ہیں تو چھوٹے بھائی مولوی محمد محسن صاحب نے فرمایا کہ یہ مکان آپ کا ہے جس طرح بڑے بھائی رہتے تھے اب آپ اس میں رہیں گے۔ آپ کا قیام اس خاندان کی خوش نصیبی ہے۔ الحاصل شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد تمام خاندان، تمام معتقدین اور تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا کہ جانشین شیخ الہندؒ حضرت

---

[1] تذکرۂ حضرت شیخ مدنی مرتبہ مولینا راشد حسن عثمانیؒ برادر زادۂ حضرت شیخ الہندؒ، ص ۱۱۲

مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔ اس زمانے میں تحریکات کا زور تھا۔ سیاسی کشمکش زوروں پر تھی۔ لیڈروں کا شمار نہ تھا مگر تمام سیاسی لیڈروں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کو جانشینِ شیخ الہندؒ تسلیم کیا۔ ہر ہر اخبار جب حضرت مولانا مدنی کا نام شائع کرتا تھا تو جانشینِ شیخ الہندؒ ضرور لکھتا تھا۔[1] مختصر یہ کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ملک اور قوم نے حضرت کے کاندھے پر علمی، دینی اور سیاسی خدمات اور قیادت کا بوجھ ڈال دیا اور آپ نے بہ صد تسلیم و رضا ان فرائض کی ادائیگی کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دیا۔ آئندہ صفحات میں یہ تفصیل آرہی ہے کہ مدینہ طیبہ واپسی کا ارادہ کیسے ملتوی ہوتا رہا اور ہندوستان کا عارضی قیام کس طرح مستقل ہوتا گیا۔

---

[1] تذکرۂ شیخ مدنی مرتبہ مولانا راشد حسنؒ، ص ۱۱۹

حضرت کا سیاسی رجحان اور اس کا پس منظر

ہر چند کہ ابھی تک حضرت کی سیاسی زندگی کا آغاز منظرِ عام پر نہیں آیا تھا مگر دیوبند کی طالب علمی، حضرت شیخ الہندؒ کے روحانی علمی اور فکری فیضِ صحبت، مدینہ طیبہ میں قیام اور عالمِ اسلام کے اصحابِ فکر و علم سے تبادلۂ خیالات، مالٹا کا سیاسی قیام اور فوجی و انقلابی افراد سے ملاقاتیں اور اسی قبیل کے دوسرے جزوی موثرات ایسے عوامل تھے کہ آپ ملت کے الم انگیز حالات اور دنیائے اسلام کے درد و کرب سے نہ صرف یہ کہ پوری طرح باخبر ہو گئے تھے بلکہ قلب و دماغ میں امت کی خدمت اور اس کے لیے قربانی و جہاد کی چنگاری بھڑکنی شروع ہو گئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلامی جمیعت و اجتماعیت جس کو ابھی کچھ دنوں پہلے تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہونے کا منصب حاصل تھا اور جس کے استمزاج و موافقت کے بغیر دنیا میں کہیں کوئی سیاسی تبدیلی نہیں ممکن تھی۔ آج سامراج کی سازشوں اور فریب کاریوں کا شکار ہو رہی تھی۔ مصر کی نہر سویز کے سارے ہی حصے برطانیہ نے چند کھوٹے سکوں کے عوض خدیو اسماعیل سے خرید لیے تھے۔ اسلام کے قبلۂ اولیٰ تیسرے حرم شریف، بیت المقدس اور انبیائے کرام کی سرزمین فلسطین کو برطانیہ یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی سازش کر رہا تھا اور اس میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ پوری عرب دنیا میں انگریز جاسوسوں اور خفیہ کاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور خلافت اسلامیہ کی بیخ کنی کی مہم جاری تھی۔ ترکی کے سلطان عبد الحمید خاں کو اور افغانستان کے امیر حبیب اللہ خاں کو دامِ تزویر میں اسیر کر لیا گیا تھا۔ ہندوستان کی ہزار سالہ مسلم حکومت کو دھوکہ، فریب اور چال بازیوں کے ذریعے تباہ و برباد کر کے پورے ملک کو اس طرح غلام بنا لیا گیا تھا کہ ظلم و ناانصافی کے پنجے اس کے جگر تک

پیوست ہو گئے تھے۔

آج سے ایک صدی پہلے یا اس کے آس پاس پیدا ہونے والوں نے وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس کے زمین و آسمان پر مسلمانوں کی شوکت و عظمت کے مٹتے ہوئے کچھ نہ کچھ آثار اب تک باقی تھے۔ بات کتنی بھی طویل کر دی جائے مگر اُس وقت کے سیاسی حالات، مسلم ملکوں کے درد انگیز واقعات اور سامراجی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کی تفصیل کے لیے یہ صفحات ناکافی ہوں گے۔ مختصر یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر نظر ڈالنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ مسلم ممالک میں ریشہ دوانیوں کی حکمت عملی میں برطانیہ اور انگریزوں کا ہاتھ سب سے زیادہ موثر تھا۔

سبب تو چاہے جو بھی رہا ہو۔ حضرت کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی نیت و منت موثر رہی ہو یا حضرت ہی کے قصد و ارادہ کا دخل ہو مگر حقیقت یہ تھی کہ حضرت کی زندگی علم و عمل، خدمت و ایثار اور قربانی و جد و جہد کے لیے وقف تھی۔ تن آسانی، مصلحت اندیشی، غرض پسندی اور منفعت کوشی جیسی صفات سے آپ کی زندگی یکسر پاک و مبرا تھی۔ اس مزاج اور اُن خصوصیات کے حامل ایک عالم باعمل، اکابرامت کی صحبتوں سے بہرہ ور ایک بالغ نظر اور حساس ذاتِ گرامی کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اُمت کے حالِ زار کا یہ عالم اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور مدرسہ و خانقاہ میں گوشہ نشین رہتا۔ چنانچہ مالٹا کی اسارت سے بہت پہلے جب خلافت اسلامیہ پر حملے شروع ہی ہوئے تھے تو گوشہ نشینی کی زندگی کے باوجود آپ جوشِ عمل سے بے تاب ہو گئے تھے اور مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے تقریر فرمائی تھی۔ اس کے بعد ہی آپ کے مقتدا، مربی اور استاد نے سامراج سے مقابلے کے لیے اپنا پروگرام آپ کے سامنے رکھا اور اسی کے بعد مالٹا کی گرفتاری پیش آئی۔ اب قدرتی طور پر آپ کے قلب و دماغ میں جذبۂ حریت اور آزادی کی چنگاری سُلگ اُٹھی تھی۔ اس چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے کے لیے ضرورت بس ذرا ہوا دینے کی

اور راستے پر لگانے کی تھی۔

مالٹا سے واپسی کے موقعہ پر ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ خلافت اسلامیہ کی حمایت و نصرت کے لیے پورے ملک کے قلب میں ایک مجاہدانہ اسپرٹ بیدار ہو گئی تھی۔ ملک کے تمام ہی باشندے یا یوں کہیے کہ سارے ہی ہندوستانی بلا لحاظ مذہب و ملت آپس میں شیر و شکر کی طرح ایک ہو گئے تھے۔ عجیب جوش و سرمستی کا عالم تھا۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، شیعہ سنی، برہمن شودر دیوبندی بریلوی، غرض پوری قوم اور پورے ملک نے آپس کے اختلافات حرفِ غلط کی طرح دھو ڈالے تھے۔ سبھی ایک زبان ہو کر خلافتِ اسلامیہ زندہ باد، بھارت ماتا کی جے اور نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعرے بلند کر رہے تھے۔ خلافت کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔[1] ہندو مسلم اتحاد کا عجیب دل خوش نظارہ تھا۔ تمام ہندو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ علمائے اسلام سرفروشی کی تمنا دلوں میں لیے لبوں سے انگریز کے خلاف آگ اگلتے ترکِ موالات کو جہاد قرار دے رہے تھے۔[1] "ہندو مسلم اتحاد اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند نے (دلی کی) جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔"[2] یہ ماحول تھا جس میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء اسیرانِ مالٹا ہندوستان پہنچے۔ اور خلافت کی تحریک اور کانگریس کی ہمنوائی اور تائید کی۔ حضرت نے جس خلافت اسلامیہ کی نصرت و تائید کے لیے مدینہ طیبہ میں آواز اٹھائی تھی۔ اسی خلافت کی نصرت کے لیے پورے ہندوستان کو سرگرم پایا۔ جوں جوں حالات کا مطالعہ دل و دماغ میں اترتا گیا۔ وہ دبی ہوئی چنگاری چمکنے اور لَو دینے لگی۔ شیخ الہندؒ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو کامیابی اور فتح و نصرت سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنے اساتذہ اور مشائخ مجاہدین، مولینا محمد قاسم، مولینا رشید احمد گنگوہی، مولینا حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمہم اللہ اجمعین کی طرف سے امین اور ان کے وارث تھے۔ ۱۸۵۷ء کی

---

[1] تحریک خلافت، ص ۱۰۰۔ [2] تحریک خلافت قاضی عدیل عباسی۔ ص ۹۰

جنگِ آزادی کے شعلے دب تو گئے تھے مگر سرد نہیں پڑے تھے۔ سرفروش اور جانباز مجاہدین ابھی تک معصوم بچوں کی لاشوں، نوجوانوں کے اُبلتے ہوئے خون اور کمزور بوڑھوں کی کراہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور کانوں سے سُن رہے تھے معصوموں اور بے گناہوں کی پھانسیوں کے نشانات اب تک تازہ تھے۔ معصوم بچوں اور باعصمت عورتوں کے خون سے نہائے ہوئے خونیں دروازے اور دیواریں گذرگاہِ عام پر کھڑی ہوئی انتقام کا مطالبہ کررہی تھیں۔ تمام دنیائے اسلام خصوصاً ہندوستان اور اس کے باعزت مسلمان غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوچکے تھے۔ ان حالات میں "حضرت شیخ الہندؒ اس مدت مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کرکے ہندوستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت میں اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی۔ بلکہ ہندوستانی مارشل لا، رولٹ ایکٹ کے نفاذ، جلیان والہ باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدہ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اُترتے ہی مولینا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ مولینا عبدالباری صاحب فرنگی محل لکھنؤ سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہندؒ کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔ نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت وجلوت میں باتیں ہوئیں۔ تو آپ نے بھی عدم تشدد (نان وائلنس) کا پروگرام ہندوستان آزاد کرانے کے لیے ضروری قرار دیا۔ اور پھر اسی طریقہ پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی[1] ادھر آپ حضرات نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اُدھر آخر جون ۱۹۲۰ء الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا اس میں وائسرائے ہند کو ایک نوٹس دیا گیا کہ اگر معاہدۂ سیورے میں ترمیم نہیں کی گئی اور مسلمانوں کے ایک خالص مذہبی مسئلۂ خلافت اسلامیہ کا حل نہیں پیش کیا گیا تو پورا ہندوستان برطانوی گورنمنٹ کے ساتھ عدم تعاون پر مجبور ہوگا۔ یہ نوٹس تو خلافت کمیٹی کے وفد نے دیا جس میں بیرسٹر مظہر الحق،

[1] نقش حیات، دوم، ص ۲۴۷

مسٹر یعقوب حسن، مولینا شوکت علی اور مولینا ابوالکلام آزاد شریک تھے مگر اس سے دو چار روز پہلے مہاتما گاندھی نے بھی وائسرائے کو خط لکھا کہ "میں نے لندن میں انڈین والنٹیر ایمبولنس وغیرہ میں محنت و جانفشانی کے ساتھ بھرتی کرائی اور ہمیشہ برطانیہ کا وفادار رہا۔ میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق کرا دیجیے۔ اب بھی وقت باقی ہے ورنہ مجبوراً میں پہلا شخص ہوں گا جو علمِ بغاوت بلند کرے گا۔ میری رائے میں مسلمانوں کے لیے موجودہ حالات میں تین راستے باقی ہیں: جہاد بالسیف، ہجرت اور عدم تعاون۔ میں نے ان کو عدم تعاون کا مشورہ دیا ہے[1]۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس اور خلافت کمیٹی نے رولٹ ایکٹ میں بھی ترمیم کا مطالبہ کیا تھا لیکن حکومتِ برطانیہ نے ان تمام مطالبات اور فریادوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور معاہدہ سیورے بھی اسی طرح باقی رہا اور رولٹ ایکٹ کا طوق بھی ہندوستانیوں کی گردن میں تنگ ہوتا گیا۔ آخر کار ایک ماہ کا عرصہ ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی نوٹس کے مطابق حکومتِ برطانیہ سے عدم تعاون کا دن آ پہنچا۔ دوسرے لفظوں میں ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستان پر آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ چنانچہ اس دن سب سے پہلے گاندھی جی نے اپنے خطابات اور تمغہ جات حکومت برطانیہ کو واپس کر دیے۔ آپ نے وائسرائے کو لکھا " میں قیصر ہند گولڈ میڈل جو مجھے افریقہ میں خدمت انسانیت کے اعزاز میں عطا کیا تھا اور زولو وار میڈل جو ۱۹۰۶ء میں بحیثیت افسر انچارج انڈین ایمبولنس، کور مجھے عطا ہوا تھا اور بوئر وار میڈل جو مجھے بحیثیت سپرنٹنڈنٹ انڈین اسٹریچر بیرر کور ۱۹۰۸-۹ء میں ملا تھا وہ سب واپس کر رہا ہوں۔ ان تمغات کو میں کیسے استعمال کر سکتا ہوں جب ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی اس ظلم کے نیچے کراہ رہے ہیں جو ان کے مذہبی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی ان تمغہ جات کی واپسی کا سبب وہ خونی ڈرامہ بھی ہے جو پنجاب میں حکومتِ برطانیہ نے کھیلا ہے

---

[1] تحریکِ خلافت از قاضی عدیل عباسی، ص ۱۵۶

اب میں برطانیہ کا وفادار نہیں رہ سکتا۔[1] خلافت کمیٹی کے اس چیلنج اور مہاتما گاندھی کے اس اقدام نے ملک میں نشۂ آزادی کی ایک لہر دوڑا دی۔ نوجوان طلبا اور طالبات کالج اور اسکول چھوڑ کر باہر آگئے۔ وکلا اور بیرسٹروں نے کچہریوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ملازمین، کلرک اور بڑے بڑے افسران نوکریوں سے استعفیٰ دینے لگے۔ بڑے بڑے خطاب یافتہ لوگوں نے اپنے امتیازات اور خطابات واپس کر دیئے۔ ملک کے مقتدر اور ممتاز ترین پانچ سو علماء کے دستخطوں سے ایک فتویٰ شائع ہوا جس میں صاف صاف اس امر کا اعلان کیا گیا کہ حکومتِ برطانیہ سے کسی قسم کا بھی تعاون جائز نہیں ہے اور برطانوی فوج میں نوکری حرام ہے۔ یہ فتویٰ جمیعۃ علماء ہند کی طرف سے ۶ ستمبر ۱۹۲۰ء کو شائع ہوا تھا جس کی مجلسِ عاملہ میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں، مولینا شبیر احمد عثمانی، مولینا آزاد سبحانی، مفتی کفایت اللہ، مولینا حسرت موہانی وغیرہ شریک تھے۔ ملک کے مانے ہوئے اور چوٹی کے بیرسٹروں نے جن کی ماہوار آمدنی وکالت سے پچاس یا ساٹھ ہزار روپے ماہوار تھی وکالت ترک کر دی یا وکالت کی آمدنی کو تحریکِ آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ بیرسٹر حسن امام، سی۔آر۔ داس اور موتی لال نہرو بیرسٹروں کی اس جماعت کے ممتاز ترین افراد میں سے تھے۔ اُس وقت کا ایک روپیہ اگر آج کے دس روپے کے برابر بھی مان لیا جائے تو ان لوگوں کی آمدنیاں آج کے اعتبار سے پانچ پانچ لاکھ روپے ماہوار تھی۔ سی۔آر۔ داس نے تو یہ کمال کیا کہ کوٹھی بیچ کر روزمرہ کا حساب کتاب بے باق کیا اور بیرسٹری ترک کر دی اور پھر تمام عمر قرض اُدھار اور تنگی ترشی میں زندگی گزار دی۔ بہر حال قصہ مختصر کہ اس فضا اور ان حالات میں ستمبر میں کلکتہ اور ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو ناگپور میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں کانگریس نے سوراج اور ترکِ موالات کا ریزولیشن پاس کیا اور مسلم لیگ نیز تمام مسلم لیڈروں نے اس کی تائید کی[2] اور حضرت شیخ الہندؒ مولینا محمود حسن صاحب نے کانگریس کی تائید

---

[1] تحریکِ خلافت، ص ۱۵۹۔ [2] EIGHT LIVES P. 133

اور موافقت فرمائی۔ اگرچہ ملک کے بعض مقتدر لوگوں نے جن میں مسٹر محمد علی جناح، مسز اینی بسنٹ اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اس تحریک کی زبردست مخالفت کی مگر اُس زمانے میں ان کی آواز نقار خانے کی طوطی سے زیادہ وقعت نہیں پا سکیں۔ شیخ الہندؒ کو اللہ نے غیر معمولی فہم بصیرت، مقبولیت اور محبوبیت نصیب فرمائی تھی۔ آپ نے ترکِ موالات کی موافقت فرمائی اور اس کی تائید میں فتویٰ دیا تو ہندوستان کے تمام علما، اور مشائخ نے بھی آپ کی اقتدا، کی۔ مگر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ دیوبند ہی کے دو ایک علما، نے ترکِ موالات، تحریکِ آزادی اور برطانوی استعمار سے مقابلے کی مخالفت بھی کی۔ یہ مخالفتیں آخر تک جاری رہیں اور مرورِ وقت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ برگ و بار لاتی رہیں بلکہ ان کے متبعین کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس کے ساتھ علی گڑھ گروپ بھی تحریکِ آزادی کا شدید ترین مخالف تھا۔ وہاں انگریز اساتذہ، ذمہ داران اور پرنسپل اسی مقصد کے لیے کام کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو برطانوی طاقت اور اقتدار کے ماتحت رہنے کا سلیقہ سکھلایا جائے۔ مگر پھر بھی مسلمان نوجوان اُس جوش اور جذبے سے الگ نہ رہ سکے جو اس وقت ہندوستان کے بچے بچے کے دماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ چند طلباء نے مولانا ابوالکلام کو مدعو کیا اور مولانا نے یونیورسٹی یونین میں تقریر کی جس میں طلبا کو جنگِ آزادی میں شرکت اور ترکِ موالات کی نصرت کے لیے آواز دی۔ ماحول میں حدت تو پہلے سے موجود ہی تھی اُس پر سے مولانا کی شعلہ بار خطابت نے اپنا کام کیا طلباء کے قلب و دماغ نشۂ عمل سے معمور ہو گئے اور کالج کی چہار دیواری چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ ان طلباء کے لیڈر تھے۔ مولانا آزاد کی دعوت پر اس جماعت نے ملک و قوم کی آواز پر لبیک کہنے اور ایک آزاد یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنی قیادت کے لیے حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن سے درخواست کی۔ حضرت نے

لہ عزیل عباسی۔ تحریکِ خلافت

اپنے ہاتھوں سے اس جامعہ کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس کا نام "جامعہ ملیہ اسلامیہ" تجویز ہوا۔ اس موقع پر جامعہ کے بارے میں جناب حفیظ جالندھری کی یہ نظم بڑی دلچسپی کا سبب ہوگی۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

ادر کاساً و ناولہا الا یا ایہا الساقی
ابھی اک اور زندہ معجزے کا ذکر ہے باقی
رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے
مدینے ہی سے وابستہ یہ طورِ لامعہ بھی ہے
قیامِ جامعہ ان ظلمتوں میں ان فضاؤں میں
چراغِ راہ ایسی تند زہریلی ہواؤں میں
مقابل ساحرانِ مغربی کے اک یدِ بیضا
خدائی اتنے فرعونوں کی، تنہا جراتِ موسیٰ
یہ ملت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی
وجود اس جامعہ کا معجزے سے کم نہ مانے گی

سُنا ہے میں نے یہ قصہ بزرگوں کی زبانوں سے
اندھیری رات میں اک نور اُترا آسمانوں سے
زمینِ ہند پر طاری تھا خوابِ خود فراموشی
مُسلسل ایک سناٹا، مسلسل ایک خاموشی
مسلماں سو چکے تھے دامنِ ادبار و ذلت میں
بجز عبرت کوئی پُرسانِ ملت تھا نہ ملت میں
یہ عبرت ایک غیرت مند مومن کی بصیرت تھی
اسیرِ مالٹا کی حریت آموز سیرت تھی
یہ بندہ تک رہا تھا دور سے گردش ستاروں کی
نگہبانی اسے مطلوب تھی قسمت کے ماروں کی
سکوتِ مرگ کی اس وادیٔ خاموش میں گویا
اسی کے چشم و دل تھے آسمانی نور کے جویا
یہی آباد گھر دیکھا۔ یہی اک در کھلا پایا
ملا آنکھوں کا زینہ، نور سینے میں اتر آیا
یہ شیخ الہند محمود الحسن کا باصفا سینہ
وہ نور اک چاند تھا انوارِ اسلامی کا آئینہ
یہ خورشیدِ رسالت کی طرف سے اک امانت تھی
اسے اُمت کی آنکھوں میں بسا دینا دیانت تھی
یہ اک تازہ بشارت تھی یہ اک پیغامِ نوری تھا
اسے سینہ بسینہ منتقل ہونا ضروری تھا

جنابِ شیخ نے اس کام کا آغاز فرمایا
جگایا اہلِ دل کو محرمانِ راز فرمایا
امینِ راز تھے بحرِ وفا کے بے بہا گوہر
یہ دو آنکھیں تھیں اک دل۔ اجمل و انصاری جوہر

سفارش سوزِ کامل کی تقاضا دردِ بے حد کا
انھیں عہدہ ملا تبلیغِ ارشادِ محمد کا

اسی دل نے انھیں آنکھوں نے مل کر طرح نو ڈالی
یہی تینوں تھے کشتِ جامعہ کے اوّلیں مالی

تمنا تھی کہ چمکے اس طرح کچھ جوہرِ حنا کی
کہ جس کی دید کا مشتاق ہو خود نورِ افلا کی

وہ گرمی جس سے داغِ عشق کا شعلہ ہویدا ہو
مسلمانانِ ہندی کی نگاہوں سے بھی پیدا ہو

تھی خدمت ان کے ذمے ظلمتِ شب کو مٹانے کی
انھیں ترکیب سوجھی چاند سے سورج اگانے کی

نگاہِ ظلمتِ مغرب نے بھی یہ ماجرا دیکھا
طلسمِ غفلتِ مشرق کا جادو ٹوٹتا دیکھا

اٹھی اندھیر گردی ہر طرف سے لے کے تعزیریں
سزائیں، ابتلائیں، تازیانے اور زنجیریں

تجلّی طورِ سینا کی بسی ہو جن نگاہوں میں
غضب کے امتحاں رکھے گئے ہیں انکی راہوں میں

نہ بھولو تربتوں میں اب وہ زیرِ خاک سوتے ہیں
کبھی سوتے نہیں جو بیج بیداری کا بوتے ہیں

شہیدانِ مقاصد کو کہاں آرام ملتا ہے
بحالِ قید و آزادی، برابر کام ملتا ہے

ابھی جاری ہے اُن رُوحوں کا فیضِ کار فرمائی
طلوعِ جامعہ سے ہے عیاں اُن کی مسیحائی

بسِ مردن ملا ہوگا انھیں اتنا ہی چین اب تک
کہ وقفِ جامعہ ہے خدمتِ ذاکر حسین اب تک

جوانمردوں نے جھیلی تھی جفا پیرانہ سالی میں
وفا کے بیج آخر بو گئے افکارِ عالی میں

وہ عالی فکر جن کو جامعہ کا باغباں کہیے
دمِ جاری و ساری مانیے روحِ رواں کہیے

یہی سادہ سے ذاکر یا رفیقِ کار ہیں ان کے
انھی سے پوچھیے پوشیدہ کیا اسرار ہیں ان کے

کبھی ان کی نظر پڑتی نہیں اسبابِ زینت پر
خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر

اسی اک دائرے میں کاٹ کر مدت اسیری کی
بساتے جارہے ہیں بستیاں روشن ضمیری کی

زمینِ شور پر ہل چل رہا ہے خشک سالی میں
کمی کرتا نہیں خونِ جگر دریا نوالی میں

یہی ذاکر جو پیکر تھا کبھی حسن و جوانی کا
ذرا پوچھو تو باعث کیا ہے اس کی ناتوانی کا

لہو کا قطرہ قطرہ وقفِ گلشن کر دیا اس نے
جمالِ ذات سے پھولوں کا دامن بھر دیا اس نے

یہ چہرے نونہالوں کے یہ بازو نوجوانوں کے
جنھیں اک روز ہونا ہے مقابل قہرمانوں کے

انہی چہروں سے دنیا میں اُجالا ہونے والا ہے — یہی بازو ہیں جن کا بول بالا ہونے والا ہے

ظہورِ معجزہ سے کم نہ پاؤ گے ظہور ان کا
جگر کے خون سے سینچا گیا ہے باغِ نور ان کا

اس موقع پر نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے شیخ الہندؒ نے فرمایا۔ "میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک متاعِ گم شدہ کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نمازوں کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اُٹھو اور اس اُمتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا۔ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومتِ وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے"[1]

یونیورسٹی کے طلبا نے حضرت شیخ الہندؒ سے ترکِ موالات کی موافقت میں فتویٰ لیا۔ اس کے خاص خاص نکات درج ذیل ہیں۔ "ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ وہ (۱) سرکاری اعزازات اور خطابات واپس کردے۔ (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے (۳) صرف اپنی ملکی اشیا، اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے"[2]۔ اس فتوے کو روکنے کے لیے حکومت نے بہت کوشش کی

---

[1] نقشِ حیات، دوم، ص ۲۵۸۔ [2] ایضاً، ص ۲۵۴۔ (فتوے کی پوری عبارت نقشِ حیات میں موجود ہے)

اور مولانا سر رحیم بخش کو حضرت کی خدمت میں بھیجا کہ کچھ سمجھائیں، کچھ ڈرائیں اور کچھ نتائج سے آگاہ کریں مگر حضرت نے حکومت کی آگاہیوں کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی اور یہ فتویٰ خلافت کمیٹی کی طرف اور جمیعۃ علماء ہند کی طرف سے اور پانچسو علماء کے دستخط سے شائع ہوکر ملک کے چپے چپے میں پھیل گیا۔ ان تمام مراحل میں ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاد کے حکم کی تعمیل میں ان کے ساتھ اور شریک رہے۔

کلکتہ میں بھی اسی طرز کا ایک نیشنل مدرسہ قائم کیا گیا جس کی صدارت کے لیے شیخ الہندؒ نے حضرت کو منتخب فرمایا اور اس طرح رخصت کیا گویا ۱۸۵۷ء کا علم جہاد اور بارِ امانت آپ کے حوالے کر رہے ہوں کہ جب تک دم میں دم ہیں اور جب تک آزادی حاصل نہ ہوجائے یہ علم سرنگوں نہ ہونے پائے۔ یہ وہ حالات تھے وہ ماحول تھا اور وہ احساسات تھے جن کی موجودگی میں حضرت کے قلب میں دبی ہوئی معمولی سی وہ چنگاری جو مشرق وسطیٰ اور مالٹا کے قیام کے دوران دنیائے اسلام کی زبوں حالی پر روشن ہوئی تھی بھڑک کر شعلۂ جوالہ بن گئی اور آپ نے اپنی زندگی اسلام مسلمانوں اور ملک کی خدمت کے لیے وقف کردی۔

شیخ الہند مولٰینا محمود حسن کا وصال

دیوبند آنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اپنے اسفار اور سیاسی افکار میں مشغول ہوگئے۔ امروہہ کی جامع مسجد کے مدرسے کے سربراہ حافظ زاہد حسن صاحبؒ نے ہمارے حضرت سے امروہہ کے مدرسے کی مدرسی کی درخواست کی۔ حضرت شیخ الہندؒ ایسے وقت میں حضرت کو جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ادھر دیوبند کے مدرسہ کو یہ اعتراض ہوا کہ حضرت کا دائمی تقرر دیوبند کے لیے پہلے ہی ہوچکا ہے مگر حافظ صاحب کی خاطر ان تمام بزرگوں کو عزیز تھی اس لیے بادل ناخواستہ حضرت کو امروہہ کی مدرسی کی اجازت دینی پڑی اور آپ مدرسہ امروہہ میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ انھی ایام میں حافظ صاحب نے تیسری شادی کی تحریک کی اور یہ چاہا کہ جو گھر دو مرتبہ اُجڑ چکا ہے وہ تیسری بار پھر آباد ہو۔ دوسری اہلیہ مرحوم کی ایک بہن ابھی ناکتخدا تھیں حافظ صاحب کی تجویز اور کوششوں سے اسی سال میں اُن سے عقد ہوگیا۔ اس وقت حضرت کی عمر تقریباً اکتالیس برس کی ہوچکی تھی۔ اب بظاہر حضرت کی زندگی ایک گوشہ میں مرکوز ہوگئی تھی، مگر حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کا انتخاب کچھ دوسرے ہی مقاصد کے لیے کیا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد حاضری کے لیے حکم نامہ پہنچا۔ حضرت حاضر ہوئے تو فرمایا کہ مجھے تمھاری ضرورت ہے اور تمھارا میرے پاس رہنا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے وہاں کوئی دوسرا انتظام کر کے فوراً آؤ۔ حضرت مزاج کے اعتبار سے نہایت مستقل مزاج تھے۔ مشاغل اور معمولات میں بہت مشکل اور بہت مجبوری ہی کی حالت میں تبدیلی کرتے تھے اس لیے کچھ عرض معروض کرنا چاہا مگر کوئی عذر کارگر نہ ہوا اور شیخ نے صرف اتنی اجازت دی کہ ایک ماہ کے اندر وہاں کا کوئی انتظام ہو جائے اور اس وقت تک تم وہاں رہ سکتے ہو۔ اس دوران حضرت

شیخ الہندؒ کی سیاسی تقریریں، آزادی کے لیے ان کی کوششیں اور اہل وطن کے لیے بیانات پورے ملک میں پھیل چکے تھے اور ہر علاقے سے آپ کے بلانے کے لیے مطالبات ہو رہے تھے۔ آپ کا اپنا ارادہ بھی یہ تھا کہ وقت اور حالات مہلت دیں تو جد و جہد آزادی کے سلسلے میں تمام ہندوستان کا دورہ کریں۔ قرائن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس جد و جہد اور دورہ میں ہمارے حضرت کو ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں جب علی گڑھ کے طلباء نے ایک آزاد جامعہ کا آغاز کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہندؒ سے قیادت و رہبری کی درخواست کی اور چاہا کہ حضرت ہی اپنے ہاتھوں سے اس کا سنگِ بنیاد رکھیں۔ حضرت وہاں تشریف لے گئے اور ہمارے حضرت کو حکم بھیجا کہ اگرچہ ابھی تک ایک ماہ کی مدت جو میں نے قیامِ امروہہ کے لیے منظور کی ہے پوری نہیں ہوئی ہے مگر اہمیت کے پیشِ نظر علی گڑھ کے اجلاس و اجتماع میں شریک ہونے کے لیے پہنچو۔ اس موقع کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ یہاں سے واپس ہوتے ہوئے علاج اور طبی معائنہ کے لیے دہلی میں قیام فرمایا۔ جمیعۃ علماء ہند اس سے کچھ ہی دنوں پہلے قائم ہوئی تھی اور نومبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں اس کا افتتاحی اجلاس ہوا تھا جس کے صدر مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی تھے[1]۔ حضرت شیخ الہند کا قیام دہلی میں ہوا تو جمیعۃ کے ذمہ داران نے اس کا دوسرا عام اجلاس حضرت کی صدارت میں منعقد کیا جس میں حضرت نے قوم کے نام یہ پیغام دیا جو درحقیقت آپ کی آخری وصیت ہے۔

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طرح آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق دائمی کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اور اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی

[1] تحریک خلافت، ص ۱۶۰

آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔ ہاں! یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت و آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑنے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ مگر دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی زبانی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے۔ ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔ اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن میں پانی نہ پیے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں ہے۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے

امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورے کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔ تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکریہ ہیں، استخلاص وطن کے لیے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ اندازی نہ ہو۔ اگر موجودہ زمانے میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعتِ اعداء کے لیے جائز ہو سکتا ہے باوجودیکہ قرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔[1] اس موقعہ پر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے بہت سے ممتاز علماء ہند موجود تھے جنھوں نے حضرت کی اس تقریر کو گوشِ دل سے سنا اور تمام عمر حرزِ جاں بنا کر رکھا۔ مگر ہمارے حضرت کی تو اسی دن کے لیے برسوں سے تربیت ہو رہی تھی چنانچہ آپ نے اپنے شیخ، مربی اور مقتدا کی آخری وصیت کو دل و دماغ میں جگہ دی اور اس کی تعمیل کو اپنے لیے فرض اور واجب قرار دے لیا۔ حضرت شیخ الہندؒ دیوبند پہنچے تو طبیعت بہت نڈھال ہو چکی تھی اور کمزوری دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ادھر کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں مدرسہ عالیہ کے طلباء نے ایک دوسرا نیشنل مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ اس کو آل انڈیا قومی مدرسہ بنایا جائے اور ملک کے تمام قائدین اور علماء مل کر اسے پروان چڑھائیں۔ چنانچہ آپ نے اس کی سربراہی کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کا نام نامی تجویز کیا اور حضرت کی خدمت میں اس مقصد کے لیے اپنا پیغامبر روانہ فرمایا۔ حضرت شیخ علالت اور کمزوری کی وجہ سے اس بار کے متحمل نہ تھے

[1] نقشِ حیات، ص ۲۶۰

اس لیے اپنی جگہ نہایت غور وخوض کے بعد ہمارے حضرت کا تعین فرمایا۔ حضرت نے ایک بار پھر یہ کہنا چاہا کہ میں نے امروہہ کے قیام کو فقط آپ کی خدمت میں حاضر باشی کے لیے ترک کیا تھا اور اب آپ کی خدمت سے بھی محرومی ہوتی جارہی ہے مگر استاد نے فرمایا کہ یہ خدمت میری خدمت سے زیادہ اہم اور بامقصد ہے چنانچہ حضرت نم دیدہ و دل شکستہ اپنے محبوب استاد سے رخصت ہوئے اور کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

رخصتی اور روانگی کا منظر قابل دید تھا۔ مولینا راشد حسن عثمانیؒ[1] نے اپنی تالیف تذکرۂ شیخ مدنیؒ میں لکھا ہے کہ حضرت رخصت ہونے کے لیے خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ الہندؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپ نے حضرت مدنیؒ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے تمام جسم پر پھیرا اور دعائیں دے کر خدا حافظ کہا۔ حضرت جانے کے لیے مڑے، دس پانچ قدم چلے گئے تو استاد نے شاگرد کو پھر آواز دی، سینے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ جاؤ تم کو اللہ کے حوالے کیا۔ اُس وقت ماحول پر عجیب کیفیت طاری تھی اور حاضرین خاص قسم کی برکات وفیوض کا وجود محسوس کر رہے تھے۔ اہلِ تصوّف اپنی اصطلاحوں اور اپنے فن میں ایسے مواقع کو نسبت خصوصی کی منتقلی کا لمحہ بیان کرتے ہیں۔ بہر حال حقیقت واقعہ جو کچھ بھی ہو مگر ظاہر بین نگاہوں نے یہ دیکھا کہ اس لمحے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ کی زندگی کا رُخ گوشہ نشینی سے نکل کر میدان جنگ کی طرف مڑ گیا۔

حضرت کلکتہ روانہ ہوئے تو " امروہہ میں شیعہ سنّی مناظرہ طے ہو چکا تھا۔ کئی مہینے پہلے سے اعلان، اشتہار وغیرہ شائع ہو رہے تھے۔ اخبارات میں زور شور تھا۔ سہارنپور سے میرے حضرت قدس سرہٗ (مولینا خلیل احمد صاحب) اور لکھنؤ سے مولینا عبدالشکور صاحب پہنچ گئے۔ دونوں اس نوع کے مناظرہ کے امام اور شہرۂ آفاق تھے۔ اہلِ تشیع جواب تک بہت ہی زوروں پر تھے ان حضرات کے پہنچنے پر اس کوشش میں لگ گئے کہ مناظرہ ہرگز نہ ہو، اور التوا بھی سنّیوں کی طرف سے ہو۔ اس لیے انھوں نے آدمی بھیج کر مولوی محمد علی جوہر مرحوم کو دہلی سے بُلالیا۔ اور مرحوم نے مناظرہ کے خلاف

[1] مولینا راشد حسن حضرت شیخ الہند کے حقیقی بھتیجے اور ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔

آپس کے اتحاد پر مجامع میں اور مجالس میں ۲۴ گھنٹہ تک وہ زور باندھے کہ حد نہیں۔ میں (حضرت شیخ الحدیث مولینا ذکریاؒ) نے مرحوم کو عمر بھر میں اسی وقت دیکھا، نہ اس سے پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھنا یاد ہے۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ مجھے آپ سے ملنے کا عرصے سے اشتیاق تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاید ایک دو منٹ میرے اشتیاق پر مجھے دیں مگر وہ میرے حضرت اور مولینا عبدالشکور صاحب کے اقدام پر بہت ہی ناراض ہو رہے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے سخت ناراض ہوکر یہ کہا کہ اس سے نمٹ لوں پھر ملوں گا۔

سارے دن یہ ہنگامہ رہا۔ دوسرے دن ۷ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو علی الصباح میرے حضرت نے حضرت شیخ الہند کے نام بہت مختصر پرچہ اس مضمون کا لکھوایا کہ صورتِ حال یہ ہے اور شیعوں کی طرف سے اس وقت التوا، ہرگز مناسب نہیں۔ آپ میرے نام ایک خط جلد بھیج دیں کہ مناظرہ جاری رکھا جائے یا مناظرہ ملتوی نہ کیا جائے۔ بہت مختصر پرچہ لے کر میں امروہہ سے دلی روانہ ہوا۔ جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو دو چار آدمی ملے، مصافحہ کیا۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ حضرت شیخ الاسلام مولینا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ جو اسی گاڑی سے کلکتہ جا رہے ہیں، ان کی زیارت کے واسطے آئے ہیں۔ میرے پاس نہ کاغذ نہ پنسل، ایک ردی کاغذ اسٹیشن سے ڈھونڈا اور ایک کوئلہ اُٹھایا اور جو مجھے اسٹیشن پر پہنچانے کے واسطے گیا تھا اس کے ہاتھ حضرت قدس سرہٗ کے نام کوئلے سے پرچہ لکھا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کو وہیں اُتار لیں۔ میں یہ کہہ کر دہلی روانہ ہوگیا۔ میرے حضرت نے گاڑی پر آدمی بھیجا اور حضرت سے اُترنے کو فرمایا۔ باوجود اس کے کہ حضرت کا کلکتہ کا ٹکٹ تھا اور سامانِ سفر ساتھ تھا، میرے حضرت کے حکم پر حضرت مدنی وہیں اُتر گئے۔ انقیاد اکابر جتنا میں نے حضرت (مدنی) میں دیکھا اتنا کسی میں کم دیکھا۔ اپنی طبیعت کے جتنا بھی خلاف ہو مگر اپنے بڑوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا اُن ہی کا حصہ تھا اور سارے دن مناظرہ کے متعلق زوردار تقریریں فرمائیں جس میں فریقین کو نصیحت کہ یہ زمانہ آپس میں اشتعال کا نہیں ہے۔ اس وقت تو غیر مسلموں سے بھی صلح کرنے کی شدید ضرورت ہے چہ جائیکہ

آپس میں لڑائی جھگڑا کیا جائے۔

میں حضرت قدس سرہ کا گرامی نامہ حضرت شیخ الہندؒ کے نام لے کر مغرب کے قریب حضرت کی قیام گاہ پر پہنچا تو حضرت شیخ الہندؒ پر مرض کا شدید حملہ تھا، پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے دن صبح کو وصال ہوگیا اور دنیا بھر میں تار ٹیلیفون دوڑنے لگے۔ حضرت مدنی قدس سرہ کے نام کلکتہ اور اس کے قرب وجوار کے چند اسٹیشنوں پر تار دیئے گئے، جہاں تک اہل الرائے کی یہ رائے ہوئی کہ صبح کی جس گاڑی سے حضرت مدنی گئے ہیں وہ اس وقت تک کہاں پہنچی ہوگی۔ اس جگہ سے لے کر کلکتہ تک ہر مشہور اسٹیشن پر تار دیا گیا۔ میں نے کہا ایک تار حضرت مدنی کو امروہہ بھی دیدو۔ سب نے مجھے بیوقوف بتلایا اور بعضوں نے یہ سمجھا کہ یہ حضرت سہارن پوری کو تار دلوانا چاہتا ہے حضرت مدنی کے نام سے۔ ہر شخص نے کہا آخر امروہہ کا کیا جوڑ؟ میں نے کہا احتیاطاً۔ جناب الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمیعۃ علما نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ باوجودیکہ میں سیاسی حیثیت سے ان کے ساتھ نہیں تھا، ممکن ہے کسی جگہ مولینا کا تذکرہ ذرا تفصیل سے آسکے، لیکن مفتی صاحب کو شفقت بہت تھی اور بہت وقعت سے میری بات قبول فرمایا کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی میرے بار بار اصرار اور لوگوں کے انکار پر تیز لہجے میں فرمایا کہ جب یہ بار بار فرما رہے ہیں تو آپ کو ایک تار امروہہ دینے میں کیا مانع ہے۔ چنانچہ تار دیا گیا، شاید ارجنٹ نہ دیا ہو کہ دینے والوں کی رائے کے خلاف ہو۔ دوسرے دن امروہہ تار پہنچا۔ تیسرے دن علی الصباح حضرت مدنی حضرت شیخ الہند کے مکان پر پہنچے۔ یہ ناکارہ اس وقت تک امروہہ روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ جا ہی رہا تھا۔ وہ منظر ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت مدنی انتہائی ساکت۔ قدم بالکل نہیں اٹھتا تھا۔ ہر قدم ایسا اٹھ رہا تھا جیسے ابھی گر پڑیں گے۔ مصافحہ بھی ایک آدھ ہی نے کیا۔ میں نے تو کیا نہیں ہر شخص اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ مولینا مدنی حضرت شیخ الہندؒ کے مردانہ مکان کی سامنے کی سہ دری میں جاکر دو زانو بیٹھ گئے اور

چپ۔ دو چار حاضرین بھی گھر میں موجود تھے، وہ بھی جمع ہوکر مولانا کے پاس بیٹھ گئے۔[۵]

پس از گل گر رود بلبل بہ گلشن جائے افتاد است

بہ آں چشمے کہ گل دیدہ است نتواند خزاں دیدن

یہ تو حضرت شیخ الحدیث کا آنکھوں دیکھا حال تھا۔ اب خود حضرت کی زبانی اُس کیفیت کا حال سُنیے: "میں صبح کو تقریباً ۹ بجے دیوبند پہنچا۔ حضرت کے دردولت پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہوکر واپس آرہے ہیں۔ اپنی بدقسمتی اور بے بھاگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کرسکا۔ کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔"[۶] حضرت ضرورت سے زیادہ الفاظ کے عادی ویسے بھی نہیں تھے، خاص طور پر رنج والم کا بیان اور اظہار تو شاید ہی زندگی میں کبھی کیا ہو۔ پہاڑ جیسے صدمات سے گذرتے رہے اور صبر وشکر کے علاوہ کوئی لفظ کبھی کسی نے نہیں سُنا۔ اس صدمے کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا تو یقین ہے کہ واقعی کلیجہ ہی پکڑ کر رہ گئے ہوں گے۔ بزرگوں کی وفات کے موقع پر لوگوں کا طریقہ ہے کہ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کے مشن کو جاری رکھنے اور پورا کرنے کا عہد کیا کرتے ہیں۔ ہمارے حضرتؒ نے بھی یہ عہد کیا، مگر آپ کا یہ عہد اور فیصلہ ہمہ شما کا عہد نہ تھا۔ اس راہ میں حضرت کو زندگی کے آخر سانس تک تند وتیز ہواؤں اور طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خارزار وادیاں عبور کرنی پڑیں اور سنگلاخ میدانوں سے آبلہ پا گذرنا پڑا۔ اپنوں کی گالیاں اور پتھر کھانے پڑے۔ غیروں کے طعنے اور وار سہنے پڑے۔ قید وبند کے مصائب جھیلنے پڑے مگر دنیا کی کوئی رکاوٹ اور کوئی مشکل آپ کو دین ومذہب اور ملک وملت کے میدانِ جہاد سے ایک قدم نہ ہٹا سکی۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من

آں منم کاندر میانِ خاک وخوں بینی سرے

پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ صاحب رائے حضرات اور ذمہ دار اصحاب اور اکابرِ اُمت

[۵] آپ بیتی، از حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ، ص ۱۱۱۔ [۶] نقشِ حیات، دوم، ص ۲۴۳

نے اب کلکتہ جانے پر اعتراض کیا۔ ملک نے ہمارے حضرت کو شیخ الہندؒ کا جانشین مقرر کیا۔" میں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے برادر مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مولانا محمد محسن صاحب نے میرے شیخ الاسلام کو پلنگ پر بٹھایا۔ ایک بھائی ایک طرف اور دوسرے بھائی دوسری طرف۔ بیچ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ میں نے اپنے کان سے یہ بات سنی کہ حضرت نے فرمایا کہ اب ہندوستان میں میرا کیا ہے۔ میرے سرپرست اس دنیا میں نہیں رہے، میں بے سہارا ہوں۔ اور ان شیخ الہندؒ کے برادران نے روتے ہوئے فرمایا بے شک۔ مگر فوراً حکیم محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ اب آپ اس خاندان کے بڑے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین ہیں تو چھوٹے بھائی مولوی محمد محسن صاحب نے فرمایا کہ یہ مکان آپ کا ہے جس طرح بڑے بھائی رہتے تھے اب آپ اس میں اسی طرح رہیں گے۔ آپ کا قیام اس خاندان کی خوش نصیبی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ الحاصل شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد تمام خاندان، تمام معتقدین اور تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا کہ جانشین شیخ الہندؒ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔ اُس زمانے میں تحریکات کا زور تھا۔ سیاسی کش مکش زوروں پر تھی۔ لیڈروں کا شمار نہ تھا۔ مگر تمام سیاسی لیڈروں نے حضرت شیخ الحرم مولانا مدنی کو جانشین شیخ الہندؒ تسلیم کیا۔ ہر ہر اخبار جب حضرت مولانا مدنی کا نام شائع کرتا تھا تو جانشینِ شیخ الہندؒ ضرور لکھتا تھا[1] اور جانشینی کا سب سے پہلا فریضہ دارالعلوم دیوبند کی مشیخت حدیث اور صدارت تدریس تھی۔ سبھی اکابر اس راستے میں حائل ہوئے کہ اب کلکتہ جانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو فوری طور پر آپ کی ضرورت ہے مگر حضرت اپنے ارادے پر قائم رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ ایک دن کے لیے بھی حضرت کی دوری کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ مدینہ طیبہ واپسی کی اجازت نہیں دی۔ بمبئی میں دو چار روز تاخیر کی اجازت نہ دی۔ امروہہ کی ملازمت ترک کرائی۔ سیاسی اجلاسوں میں ساتھ رکھنے کے لیے تار دے دے کر بلوایا۔ مگر کلکتہ

[1] تذکرہ حضرت شیخ مدنی از مولانا راشد حسن صاحبؒ، ص ۱۱۹

کے مشن میں کوئی خصوصیت ضرور تھی کہ خود حکم دے کر روانہ کیا اور اس طرح کہ جیسے کوئی مومن و مسلمان اپنے کڑیل جوان بیٹے کو بہ تمام انبساط قلب و بہ چشم نم میدان جہاد کے لیے روانہ کیا کرتا ہے۔ تو کیسے ممکن تھا کہ اب لوگوں کے منع کرنے سے حضرت اُس مشن سے رُک جاتے۔ چنانچہ " دو چار روز رہ کر کلکتہ کا عزم کیا تو حضرت مولینا حافظ احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنی شدید بیماری کے دوران جبکہ خود میری حاضری کی ضرورت کو محسوس فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند اہم ضرورتیں در پیش تھیں، ان سب کو نظر انداز فرما کر کلکتہ روانگی کا حکم دیا۔ اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت کا حکم پس پشت ڈال دیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے[1]۔" مختصر یہ کہ شیخ الہندؒ کی وفات کے دو چار روز بعد حضرت کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

کلکتہ میں قیام اور سیاسی زندگی کی ابتداء

کلکتہ میں آپ کا انتظار تھا اور وہاں پہنچنے پر قومی مدرسہ کا مولینا ابوالکلام آزاد کی زیر قیادت گاندھی جی کے ہاتھوں افتتاح ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں مولینا آزاد اور گاندھی جی نے تقریریں کیں۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں فرمایا " میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ اپنے ارادوں میں مستقل رہیے اور جو پاؤں آگے اُٹھ چکا ہے اُسے پیچھے نہ ہٹائیے۔ اس وقت اسلام خطرے میں ہے خلافت تباہ کر دی گئی ہے۔ مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی خودداری کو پنجاب میں شکست دے دی گئی ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمر بستہ ہوں اور جو

[1] نقش حیات، دوم، ص ۲۷۲

فرائض آپ کے ذمہ اسلام اور ہندوستان کے ہیں انھیں ادا کریں۔ اساتذہ دینی تعلیم دیں جو طلباء کو سچّا مسلمان اور سچّا ہندوستانی بنادے۔ قومی مدرسوں کو جاری کرنے کا یہی مقصد ہے کہ ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو غلامی سے گریز کریں۔ اور آزادی پر جان دیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام بنی نوعِ انسان سے محبت کی تعلیم دیتا ہے۔"[1] اس درسگاہ میں حضرت نے حدیث، تفسیر اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ طلباء اور قوم کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے کام کا آغاز کیا، اور یہیں سے بیالیس برس کی عمر میں آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ کلکتہ میں اور بنگال میں خلافت اور کانگریس کے جو اجلاس ہوتے تھے، ان میں آپ بحیثیت صدر یا مقرر کے شریک ہونے لگے اور آپ کی تقریریں اور خطبات مقبولِ عوام وخواص ہونے لگے۔ اس طرح ایک طرف تو آپ کی ہندوستان گیر شہرت بحیثیت عالمِ دین وشریعت کے بڑھتی رہی، دوسری طرف ایک عدیم المثال روحانی مقتدار کی حیثیت سے مرجع عوام وخواص ہوتے گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما اور لیڈر کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں مشہور ومعروف ہوگئے۔ سیاسی جدوجہد کی یہ بالکل ابتدا تھی۔ اور تدریس حدیث وتفسیر اور وعظ وتبلیغ میں بھی ہندوستان کی سرزمین پر شروعات ہی تھی۔

حال ہی میں حضرت کانگریس کے باقاعدہ ممبر بنے تھے۔ "مالٹا سے واپسی پر میں کانگریس کا باقاعدہ ممبر بن گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا۔ اور قید وبند کے مصائب بھی اہلِ ملک کے ساتھ جھیلتا رہا"[2] مگر آپ کی مزاجی وطبیعی، جرات، بیباکی، بےنفسی، بےغرضی، اخلاص اور مسلسل جدوجہد نے بہت جلد آپ کو صفِ اول کے لوگوں میں جگہ دے دی۔ مالٹا سے آنے کے بعد مدینہ طیبہ واپسی کا فوری ارادہ تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تعمیلِ حکم میں ہندوستان میں قیام کا ارادہ بھی کیا تو وہ بھی بالکل عارضی تھا مگر اب صورت حالات بدل گئی تھی۔ مدینہ طیبہ سے بھائی صاحبان کا اصرار تھا کہ خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے آپ آئیں تو اجڑا ہوا گھر پھر آباد ہو۔

---

[1] تحریکِ خلافت از قاضی عدیل عباسی، ص ۱۷۷-۱۷۸۔ [2] نقشِ حیات، دوم، ص ۲۰۲

مخلصین و معتقدین تقاضا کر رہے تھے کہ آپ جلد تشریف لائیں کہ ہمارے حلقوں اور مجلسوں میں پھر جان پڑ جائے۔ تلامذہ اور شاگرد منتظر تھے کہ حضرت جلد سے جلد حرم نبوی میں سند حدیث کو رونق بخشیں۔ خود اپنی طبیعت کا تقاضا بھی واپسی کا تمام عمر شدید رہا مگر اب یہ مصلحت سامنے تھی کہ اس وقت دین و ملت اور قوم و ملک کی خدمت ہندوستان میں زیادہ ضروری ہے اور کچھ مقاصد اور امور یہاں زیادہ اہم ہیں۔ جیسے ہی وہ پورے ہو جائیں گے انشاء اللہ روانگی عمل میں آئے گی۔ ان فرائض اور مقاصد کی اہمیت حضرت کی تقریروں سے واضح ہوتی ہے۔ اُس وقت کے صوبہ آسام کے ضلع سلہٹ مولوی بازار میں جمیعۃ علماء، کانگریس اور خلافت کمیٹی کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ کانگریس کے اجلاس کی صدارت اس وقت کے مخلص اور قابل ترین لیڈر مسٹر سی۔ آر داس نے کی۔ اور جمیعۃ و خلافت کے اجلاسوں کی صدارت حضرت نے کی۔ ایک دوسری کانفرنس جمیعۃ علماء کی زیرِ صدارت حضرت رحمۃ اللہ منعقد ہوئی، اس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا:

"اے حضرات علماء کرام! جیسے آپ کا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور جان کی حفاظت میں اپنے تن اور من کو صرف کریں اور ہر ممکن طریقے سے اس میں کوشاں رہیں اسی طرح آپ کا فرض منصبی ہے کہ مسلمانوں کے مال و آبرو کی حفاظت میں بھی پورا حصہ لیں۔ اگر من قتل دون نفسہ فہو شہید نفس مسلمہ کے واجب الاحترام ہونے پر دلالت کرتا ہے تو من قتل دون عرضہ فہو شہید اس کے مال اور آبرو کے واجب الاحترام ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے۔" آگے چل کر فرماتے ہیں:

"آپ حضرات خیال فرمائیں، ہندوستان کی خصوصاً مسلمانوں کی مالی حالت کس طرح برباد کی گئی ہے۔ لگان فیصدی پچاس بلکہ بعض جگہ اسّی فیصدی تک لیا جاتا ہے۔ تعلیمات، حفظان صحت، صفائی وغیرہ کے لیے ستر فیصدی لیا جاتا ہے۔ مزید براں ٹیکسوں کی ایسی بھرمار ہوتی ہے کہ پیداوار کا اسّی اور نوے فیصدی اسی طرح نکل جاتا ہے۔ باقی ماندہ زمیندار کاشتکار دونوں میں مشترک ہے وہ بھی ریلوے، پوسٹ آفس تار

اور مختلف چندوں سے بچنے کے بعد یورپین تاجروں کی نظر ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کچھ رہا سہا تو دونوں پر قربان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں تقریباً فیصدی نوے محتاج ملیں گے اور فیصدی دس بھی مشکل سے خوشحال ملیں گے۔ پھر خزانہ ملکی حالت پر اگر آپ نظر ڈالیں گے تو عجیب حالت ہے۔ اول تو یورپین عہدہ داروں کو اس قدر بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں جس کی حد و غایت نہیں۔ فوج میں ایک گورے کے مصارف بہ نسبت ہندوستانی فوجی کے گیارہ گنا زیادہ ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ انگریز عہدہ داروں کی پنشن کا سالانہ چلا جاتا ہے۔ دفتر وزارتِ ہند کا خرچہ کئی ملین پونڈ کا ہے۔ ان دونوں مدوں کا مجموعی خرچ نوے کروڑ سالانہ ہے۔ علاوہ ازیں انڈین نیشنل ڈیوٹیشن جو کہ تقریباً تیرہ کروڑ پونڈ ہے جو مختلف لڑائیوں کی بنا پر بلا وجہ ہندوستان پر ڈالا گیا ہے۔ اس کا سود سات کروڑ پینسٹھ لاکھ پونڈ سالانہ خزانہ ہند سے نکالا جاتا ہے جس کے ایک ارب چودہ کروڑ پچھتر لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں خیال فرمائیے کہ ہندوستان کی مالی حالت کس طرح درست ہو سکتی ہے۔ ابھی ابھی ڈیوک آف کناٹ کے مصارف اکتالیس لاکھ ترپن ہزار خزانہ ہند سے خرچ کیے گئے ہیں۔ جس کو اسٹیٹس مین مورخہ ۲، مارچ ۱۹۲۱ء نے تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ ممدوح کی آمد سے جو جو فوائد ہندوستان کو ہوئے وہ معلوم ہیں۔ گذشتہ مصارف کی تلافی میں سوائے بھلا دینے کی وصیت کے اور کیا بڑھایا؟ خود تجارت اور صنعت و حرفت کی بنا پر جو صدمہ ہندوستان کی مالی اور اقتصادی زندگی پر پڑا ہے وہ حد بیان سے باہر ہے۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں اور پھر گذشتہ زمانہ اور حال کا مقابلہ فرمائیں، دیکھیے کس طرح زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ ہندوستان کی تاریخ ابتدائے دنیا سے آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے تک نہایت چمکدار اور زریں نظر آتی ہے۔ وہ فقط زراعتی ملک نہ تھا بلکہ تجارت میں بھی اس کا پایہ تمام ملکوں سے بلند تھا۔ اُس نے فقط علم ہندسہ، نجوم، طب، ویدک اور موسیقی ہی سے تمام عالم کی رہنمائی نہیں کی تھی بلکہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ سے اعلیٰ قوانین اور فرماں روائی اور

جہاں داری کے عمدہ سے عمدہ ضوابط بھی بنائے جس کے سبب سے بزرجمہر اور دیگر حکمائے فارس ویونان کو طالب علمی کے لیے یہاں آنا پڑا۔ شاہانِ فارس ویونان سیکڑوں روپیہ نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں دینار خرچ کر کے یہاں کے علوم اور کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے دربار میں ہندوستان کے مشہور اطبا اور فلاسفر ذکر کیے جاتے ہیں۔ نوشیرواں اور بطلیموس کی تاریخوں میں بھی آپ ہندوستانی علوم وفنون اور یہاں کے حکماء کا ذکر نہایت وقعت اور عظمت کے ساتھ سنیں گے۔ آپ ہر قسم کی صنعتوں میں گذشتہ تواریخ میں ہندوستان کا مرتبہ اعلیٰ دیکھیں گے۔ جب سے ہندوستان کو اسلامی آفتاب نے روشن کیا اس وقت سے اس کی عظمت دوبالا ہوگئی۔ اس میں عجم اور ترک اور عرب سے ایسے بہت سے فنون اور صنعتیں بڑھ گئیں جن کا وجود پہلے سے یہاں پر نہ تھا۔ غرضیکہ ہندوستان کمالات مادیہ اور روحیہ ظاہریہ اور باطنیہ کا اعلیٰ درجہ کا مرکز رہا ہے جس کے شواہد کثرت سے بلکہ روشنی میں ستاروں سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر انگریزی تسلط کا ہونا تھا کہ ہر ایک کمال جوں حرفِ غلط صفحۂ ہستی سے مٹنا شروع ہوگیا۔ اوّل تو یہ ہندوستان اپنی مصنوعات اور ملبوسات سے ایشیا افریقہ یورپ کو مزین کرتا تھا۔ پرتگال، فرنچ حکومت ہند، جزائر سوریہ انگلینڈ تجارت کے لیے یہاں کی ساختہ چیزیں وغیرہ لے جاکر نفع اٹھاتے تھے مگر آج یہ حال ہے کہ دیگر چیزوں کو چھوڑ کر فقط سوتی کپڑے کی وجہ سے ساٹھ کروڑ روپیہ ہندوستان سے نکل رہا ہے۔ بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ ابھی گذشتہ سال میں فقط ربڑ کی کنگھیاں وغیرہ چار کروڑ روپیہ سے زاید کی باہر سے آئی ہیں۔

اے حضرات علماء کرام! جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ دینی اور دنیاوی ترقی کمال صنعت وحرفت وغیرہ پر موقوف ہے اور ان چیزوں کا شرعی حیثیت سے بھی محفوظ کرنا آپ پر ضروری ہے ادھر انگلینڈ اپنی قوت، ثروت اور تجارت، صنعت وحرفت کے بڑھانے کے لیے خلافِ عہد ہر صورتِ قانونی اور عمل مخفی سے ہندوستان کی مالی اور اقتصادی زندگی کا گلا گھونٹ رہا ہے، جس کی تفصیل میں اس مختصر بیان میں نہیں

دکھلا سکتا، البتہ آپ کے سامنے ایک اجمالی حالت پیش کر کے اندازہ کرانا چاہتا ہوں کہ انگلینڈ کی مجموعی آمدنی کی حیثیت سے فی کس سالانہ آمدنی تین سو دو پونڈ ہے۔ جس کے چار ہزار پانچ سو تیس روپیہ ہوتے ہیں اور ہندوستان کی مجموعی آمدنی کے لحاظ سے فی کس سالانہ ایک پونڈ تو درکنار ایک روپیہ بلکہ آٹھ آنہ بھی نہیں ہوتی۔ یہی تو وجہ ہے کہ آج ہندوستانی قحط اور بھوک کی وجہ سے بے خانماں ہوتے ہوئے جاں بحق تسلیم کر رہے ہیں اور دوسرے ملکوں میں ٹھوکر کھا رہے ہیں۔ کوئی پیشہ ان کے ہاتھ میں کمائی کا نہیں رہا۔ آخر آپ حضرات پر اس کی فکر بھی لازم ہے یا نہیں؟ ریلوے، تار، پوسٹ آفس، جنگلات وغیرہ کے ذریعہ سے جو کچھ ہندوستان کا روپیہ کھینچا جا رہا ہے وہ علیحدہ ہے۔ غرضکہ یہ بھی ایک بڑا فریضہ ہے جس کی ذمہ داری سے آپ کسی طرح نہیں نکل سکتے۔

آپ خود ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ فوجوں کی تنخواہیں ہندوستان کے خزانے سے دی جا رہی ہیں۔ رسد ملک کی پیداوار سے ہی۔ سپاہی ہندوستان سے ہی بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ اپنے اور اپنے اتحادیوں کی اغراض کے لیے کروڑوں روپیہ چندے میں لیا جاتا ہے۔ انگلینڈ کے بڑے بڑے تاجر جبکہ قرض جنگ کے لیے دینے سے جان چراتے تھے ہندوستان کے مالدار وغیرہ سے ہزاروں حیلے سے کروڑوں روپیہ قرضہ میں لیا گیا مگر بالآخر اس کے نتیجے میں ہندوستان کو کیا ملا۔ بڈھی ماؤں اور بڈھے باپوں کا بے اولاد اور بے خانماں ہونا۔ نوجوان عورتوں کا رانڈ اور بیوہ ہونا۔ ننھے ننھے بچوں کا بے باپ اور یتیم ہونا۔ رولٹ بل کا پاس ہونا۔ جلیانوالہ باغ میں رائفل اور مشین گن کا شکار ہونا۔ پنجاب وغیرہ میں طرح طرح کے مظالم کی دھواں دھار بارش میں ہلاک ہونا۔ ہر طرف سخت سے سخت قوانین زیر تجویز تحفظ ہند پاس ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہی وہ امور مذہبی و سیاسی ہیں جنھوں نے تمام عالم میں بے چینی پھیلا رکھی ہے۔ اسی لیے رہنمایان قوم اور علمائے اسلام اور پنڈتوں نے قرار دیا ہے کہ جب تک خلافت کے متعلق فیصلے ہمارے مطالبات کے موافق اور مجرمین پنجاب کو سزائیں حسب قرارداد عدالت و مساوات تمام ہندوستان کے لیے آزاد مستقل حکومت (سوراج) جس کے

ذریعہ سے ہر آیندہ شدائد سے نجات ہو سکتی ہے نہ مل جائے، کوشش سے صبر و سکون نہیں ہو سکتا۔[1]

مذکورہ بالا تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نے اُس وقت تک اپنی کوششیں اور جدوجہد جاری رکھنے کا عہد کرلیا تھا جب تک مسلمانوں کے مذہبی مطالبات نہ پورے ہوجائیں اور ہندوستان آزاد نہ ہوجائے۔ اس لیے کہ جس چیز سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اسی لیے میں نے دور دراز ملک میں قیام کرنا پسند کیا ہے۔ حالانکہ میرا دل مدینۂ منورہ، آں حضرت صلعم، شان مدینہ اور برادرانِ عزیز کی یاد میں بے چین رہتا ہے۔[2] اس کے علاوہ آپ نے علمائے دین کو آواز دی اور ان کو یہ پیغام دیا کہ دین کی خدمت کا یہی مطلب نہیں ہے کہ آپ لوگ مدرسہ و خانقاہ میں گوشہ گیر ہوکر کتاب و کاغذ ہی تک منحصر رہیں بلکہ مسلمانوں کی اور ملک کی اقتصادی اور معاشی نیز سیاسی ترقی اور استحکام کے لیے جدوجہد بھی دینی فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ اس پیغام کو عام کرنے کے لیے حضرت ہندوستان کے مختلف مقامات کا سفر کرتے رہے اور مذہبی اور علمی اجتماعات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور انقلابی جلسوں میں تقریریں فرماتے رہے، صدارت کرتے رہے اور اپنے خطبات صدارت قوم کے سامنے پیش کرتے رہے۔

۲۳ اگست ۱۹۳۱ء میں جمیعۃ علماء کی ایک کانفرنس حضرت کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس میں حضرت نے عالم اسلام پر مغربی طاقتوں کے مظالم کا تفصیلی تذکرہ کرکے فرمایا کہ دنیا کے تمام مسلمانوں اور اسلامی دنیا کی نجات اور فلاح و بہبود کا یہی ذریعہ سب سے زیادہ کامیاب ہے کہ ہندوستان کو برطانیہ کے چنگل سے نجات مل جائے۔ حضرت کا یہ خطبۂ صدارت ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی رخ متعین کرنے کے لیے ایک پروگرام کے مرادف تھا۔ حضرت کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لیے اس

---

[1] حسین احمد مدنی، مجموعۂ خطبات صدارت دنایاب تقاریر، ہندوستان پریس دہلی، ص ۴۵ تا ۵۰

[2] مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، ص ۲۱

خطبۂ صدارت کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اسلامی دنیا پر وہ پہاڑ ڈھائے گئے کہ خود عیسوی دنیا بھی چیخ اٹھی۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے کچھ عرض کرتا ہوں۔ انیسویں صدی کا آنا کیا ہوا کہ اسلام پر یورپ نے ہر طرف سے قیامت برپا کر دی۔ ۱۸۲۷ء میں انگریزی جہازوں نے ناگاہ گیلی پولی کے بیڑے پر حملہ کر کے ڈبو دیا۔ ۱۸۳۱ء میں یورپ نے یونان کو ترکوں سے بغاوت پر ورغلایا۔ الکسندر البلانٹی بغاوت کے علمبردار تھے جنھوں نے روسی مدد کا پورا یقین دلایا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں۔ تم (یونانیو) ترکوں سے دور نہیں کیونکہ ایک بڑی طاقت تمھاری پشت پناہ ہے اور دشمنوں کی سرکوبی کے لیے موجود ہے۔" اس کے بعد حضرت نے یورپین شعرا کے اس مشن کا تذکرہ کیا ہے جس میں انھوں نے تنظیم کے ذریع پوری عیسائی دنیا اور خاص طور پر یونان کو ترکوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔ شعرا میں آپ نے فرانسیسی شاعر وکٹر ہیوگو اور انگریزی شاعر اور لارڈ بائرن کا تذکرہ کیا اور موخر الذکر کی ایک نظم کا ترجمہ لکھا جس میں اس نے ترکوں کے خلاف زہر اگلا ہے۔ اس کے بعد لکھا: "اس بغاوت میں یونانیوں اور ان کے یورپین مددگاروں نے وہ ستم ڈھائے ہیں جن کے ذکر ہی سے دل کانپتا ہے۔" فرانسیسی امیر البحر ہارجن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے "مونمباریا کے قلعہ میں سو یونانی تھے جن کے ساتھ ترکوں نے اپنے قبضے کے دوران نہایت عمدہ سلوک کیا اور ان کے گرجوں کا احترام ملحوظ رکھا لیکن باغی یونانیوں نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد ترکی آبادی کے ساتھ یہ برتاؤ نہ کیا بلکہ خود مسجدوں میں نہایت شنیع اور وحشیانہ افعال کے مرتکب ہوئے۔ قیدیوں کو انھوں نے بلا زاد سفر کاروس روانہ کر دیا۔ چنانچہ زمین پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے اسلامی خاندان دیکھے گئے جن کا بھوک پیاس نے برا حال کر دیا تھا اور جزیرہ کے قرب و جوار میں مقتولین کے انبار لگے ہوئے نظر آئے جنھیں یونانیوں نے قتل کیا تھا۔ صرف اسی قدر نہیں، بلکہ ستم زدہ ترکی خاندان کو باغیوں نے گولی سے اڑا دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن موسیو بونفور نے ان کو چھین کر ایک جہاز میں بٹھا دیا اور یونانیوں سے کہا کہ جو حرکات

تم نے کی ہیں یہ بحری قزاقوں کی سی حرکات ہیں۔"

وہاں کی حالت ایک پادری فرنٹرس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔" زخمی لڑکیاں جان بچانے کے لیے ساحل پر بھاگتی پھرتی تھیں۔ مگر یونانیوں کی بندوقوں سے انھیں کہیں پناہ نہ تھی۔ عورتیں ننھے ننھے بچوں کو چھاتی سے لگائے سراسیمہ پھر رہی تھیں۔ مگر گولیاں ان کے لخت ہائے جگر کے ٹکڑے اُڑائے دیتی تھیں حتیٰ کہ جنھوں نے اپنے کو سمندر کے حوالے کر دیا تھا ان کو بھی نجات نہ ملتی تھی۔ یونانیوں نے ماؤں کی گودوں سے بچوں کو چھین کر ان ہی کے سامنے بوٹی بوٹی کر ڈالا اور ان کے گوشت کو سمندر میں اس طرح پھینکا جس طرح کتے بھی نہ پھینکے جاتے ہوں گے۔"

۵ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو باغیوں نے شہر ٹریبوٹرا پر قبضہ کر لیا۔ اور جو ستم ڈھایا اس کا بیان ناممکن ہے۔ تین روز تک مسلسل قتل عام ہوتا رہا۔ مردوں کے سڑنے کے تعفن سے تمام ملک یونان میں زور شور سے وبا پھیل گئی۔ مسٹر تنلے تاریخ یونان میں اپنے چشم دید واقعات کی بنا پر یہ الفاظ لکھتا ہے:" اس خوں ریزی کی مثال تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن تعجب انگیز تو یہ ہے کہ یورپین حکومتوں پر ان کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ بلکہ الٹے ترک ظالم و سفاک ٹھہرائے گئے۔ زار روس نے باب عالی کو ایک نوٹ لکھا کہ باب عالی مسیحیت کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ بتائے کہ آیا وہ مسیحی قوم (یونان) کو بلاجرم و جرا برباد ہونے دے گی اور صلیب کے برخلاف ہلال کی اہانتوں کو خاموشی سے دیکھتی رہے گی۔"

۱۸۲۷ء کو انگلستان، روس اور فرانس نے اپنے جنگی بیڑوں کو یونانیوں کی مدد کے لیے بندرگاہ ناردین پر پہنچایا۔ اور ابراہیم پاشا مصری امیر البحر کو جو کہ بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بحکم خلیفۃ المسلمین آئے تھے، حکم دیا کہ وہ یونانیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ اور فوج کو مصر واپس لے جائے۔ ابراہیم پاشا موصوف نے جنگ کرنے سے توقف کیا اور باب عالی کے حکم کا انتظار کیا۔ مگر اس حالت میں بھی یورپ یونانیوں کو بھڑکاتا رہا۔ ابراہیم پاشا نے بہت کچھ صدائے احتجاج بلند کی مگر ایک نہ سنی گئی۔

آخر کار ایک دن جبکہ ابراہیم پاشا مورہ میں دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ موقع پاکر انگریزی امیر البحر نے اپنے متفقہ بیڑے سے ۲۰ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو عثمانی و مصری بیڑوں پر بندرگاہ ناردین میں اچانک حملہ کرکے اول سے آخر تک تمام جہازوں کو ایک ایک کرکے ڈبو دیا جس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ایک مصری سپاہی نے ایک انگریز کو قتل کر ڈالا تھا۔ اگر یہ افترا صحیح بھی ہو تو کیا ایک گورے کے قتل کا جرم اتنا سنگین ہو سکتا ہے جس پر یورپ اور انگلستان دو اسلامی سلطنتوں کے تمام بیڑوں کو مع سپاہیوں اور سامان کے غرق کر دینے کو جائز سمجھتا ہے۔ اس شرمناک حادثے پر خود جارج چہارم شاہ برطانیہ نے بھی اظہارِ نفرت کیا۔ وہ کہتا ہے: "یہ ایک منحوس حادثہ ہے۔" شہنشاہ اسٹریا کہتا ہے: "یہ ایک بڑی بھینٹ ہے۔" انگلستان میں امیر البحر مذکور اور پارلیمنٹ پر لبرل پارٹی نے سخت اعتراضات کیے جس پر گورنمنٹ انگریزی نے عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ حالانکہ یہ حرکت یقیناً تینوں حکومتوں کے ایماء سے ہوئی تھی۔ موسیو الفریڈ بلیٹر اپنی کتاب استقلال یونان میں لکھتا ہے کہ "متحدہ بیڑہ نے جو کچھ کیا وہ سب فرانس، روس اور انگلستان کی رائے سے کیا تھا۔" اخبار ڈیلی نیوز جو اس زمانے میں روس کا بڑا حامی تھا اس کا نامہ نگار ۲۷ر جنوری ۱۸۷۸ء کو ایڈریانوپل سے لکھتا ہے:

"جب ہم فیلوپو پلیس سے گذر رہے تھے تو ہمیں کاشتکاروں کے جتھے برف سے ڈھکے ہوئے ہر طرف نظر آرہے تھے جن میں سے بعض کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس شنیع حالت میں دو تین ہفتوں سے پڑے ہوئے تھے۔ ہم یہاں مقتولین کی ہڈیوں کو سامان جنگ کی وجہ سے مجبور تھے کہ روندتے ہوئے چلیں۔ کیوں کہ ہمیں راہ نہ تھی اور تمام زمین پر مقتولین اسی طرح بچھے ہوئے پڑے تھے جس طرح کہ فرش بچھا دیا جاتا ہے۔ ۳۵ میل تک یہی حالت تھی۔ ہر جگہ عورتیں لڑکے شیرخوار بچے بڑے ٹکڑے کیے ہوئے مرد برف کی سلوں پر دکھائی دیتے تھے۔ برف کا رنگ خون کی وجہ سے بالکل سرخ ہو رہا تھا اور اکثر عورتیں اس طرح پڑی تھیں گویا اس دنیا سے اور تمدن کے مصائب سے تھک کر آرام کر رہی ہیں۔ مردوں کا یہ حال تھا کہ ان کی صفیں برابر

بچھی ہوئی تھیں جن کے چہروں پر باوجود موت کے عظمت و شجاعت کے آثار ہویدا تھے ان کی داڑھیاں خون میں لت پت تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ سینوں پر تھے۔ گویا وہ اپنے شریف دلوں کو دشمن کے ناپاک سُموں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ لڑکے اور شیرخوار بچے بھی اکثر سردی سے مرے تھے جن کے بھولے بھولے چہروں پر برف کی ہلکی ہلکی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ان کی معصومی ان کے بشروں سے صاف ظاہر تھی۔ وہ گویا میٹھی نیند سو رہے تھے اور ان کے نرم اور گورے گورے ہاتھ برف کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ معصوم اپنی ماؤں کی گود میں سردی کی شدت سے مر گئے ہوں گے تو انھوں نے مایوس ہو کر ان کو برف پر سلا دیا ہوگا۔" اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھا ہے: "خود باسکوی میں جب ہم پہنچے ہیں تو وہاں ترکی سپاہیوں کی ہڈیاں ڈھیر تھیں جن کو بلغاری پتھروں سے کچل رہے تھے۔ میں نے ایک ترکی خاندان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جاؤ گے۔ اس نے کہا کہ پانچ ماہ ہوتے ہیں ہم سمرنا سے چلے ہیں۔ نہ ہمارے پاس کپڑا ہے نہ زادِ راہ۔ اگر راستے میں کوئی جانور مرا ہوا مل جاتا ہے تو اس کا گوشت کھا لیتے ہیں۔ اس خاندان میں تین شخص بچے تھے۔ ایک بدقسمت بوڑھا باپ تھا، ایک بدنصیب ماں تھی جس کے سینے سے ایک شیرخوار بچہ چمٹا ہوا تھا اور ایک دو سالہ بچّہ تھا۔ سب کے سب برہنہ تھے۔ صرف چیتھڑوں سے بمشکل انھوں نے ستر پوشی کر رکھی تھی۔ زمین ان کا بچھونا اور آسمان اوڑھنا تھا۔ باسکوی سے جب ہم چلے تو قدم قدم پر ایسے ہولناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ جسم لرز گیا۔ نہیں معلوم کہ کتنی عورتیں برہنہ پڑی تھیں جن کے شوہر انھیں کے پہلوؤں میں پڑے تھے۔ اور بچے ان کے گرد آخری سانسیں لے کر سو گئے تھے اور نہیں معلوم کتنے بوڑھے نظر آئے جن کی کھوپڑیوں کے ٹکڑے اُڑ گئے تھے اور ان کی سفید داڑھیوں پر خون کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ یہ بیان کرتے ہوئے دل پارہ پارہ ہوتا ہے کہ ایک معمر ترک کو میں نے زمین پر بے گور و کفن پڑے ہوئے دیکھا جس کے پہلو میں قرآن کھلا ہوا رکھا تھا اور اس کے صفحوں پر اس کا خون جما ہوا تھا۔"

"رومیوں نے جب ڈینیوب عبور کیا تو اونھوں نے ہزار ہا ترکی عورتوں اور بچوں کو شہر شملا میں جمع کیا اور ان کے ساتھ جو برتاؤ کیا' اس کا حال سترہ سر برآوردہ یورپین اخبارات کے نامہ نگاروں نے چشم دید بیان کیا ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف، منچسٹر گارڈین، مارننگ پوسٹ اور ٹائمس کے نامہ نگار ان میں شامل ہیں۔ ان کے بیان کو ترکی وزیر خارجہ نے ۲۱ر جولائی ۱۸۷۷ء کو پیرس روانہ کردیا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس بربریت کی اطلاع دنیا کو کردیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے زخمی عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو دیکھا ہے کہ جن کے جسم سے خون کے فوارے جاری تھے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ روسیوں اور بلغاریوں نے ہر ہر گاؤں میں مسلمانوں کو اس طرح ذبح کیا ہے جس طرح بھیڑیں ذبح ہوتی ہیں۔ ہم نامہ نگار علی الاعلان کہتے ہیں کہ زخمیوں میں اکثر عورتیں اور بچے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں ارمنوں سے بغاوت کرائی گئی جس میں برٹش گورنمنٹ سب سے آگے تھی اور فرانس اٹلی روس بھی شریک تھے حالانکہ ارمنی تمام ترکی ممالک میں منتشر تھے۔ کسی خاص ضلع یا صوبہ میں ان کا مستقر اصلی نہ تھا اور نہ کسی جگہ ان کا غالب عنصر تھا۔ وہ مسلمانوں سے زیادہ مالدار اور خوشحال تھے اور نہایت راحت اور آرام سے زندگی بسر کرتے تھے مگر یورپ کو کب چین تھا۔ طرح طرح کی خفیہ کارروائیاں عرصۂ دراز سے جاری تھیں۔ سنہ مذکورہ میں انگورہ میں تحقیقات بغاوت ارمن کے لیے کمیٹی بٹھائی گئی جس میں اقوام اجانب کے نمائندے بھی تھے۔ انھوں نے تحقیق کرکے دکھلایا کہ صرف پروٹسٹنٹ ارمنی برسر بغاوت ہیں کیتھولک ارمنیوں کو بغاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے بعض امریکن پادری اس سازش میں شریک ہیں۔ چنانچہ امریکن نمائندہ کا یہ قول ہے ترکی حکومت نے جو تحقیقات کی ہیں وہ بالکل ٹھیک ہیں اور جو پروٹسٹنٹ پادری گرفتار ہوئے ہیں وہ کسی شفقت کے مستحق نہیں ہیں۔ اس کمیٹی نے یہ بھی ثابت کیا کہ انگریزی مدبرین خصوصاً مسٹر گلیڈسٹون نے خفیہ طور پر ارمینیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ہم ارمینیوں کو خود مختار سلطنت کرادیں گے۔ اس راز کے فاش ہوتے ہی انگریزی اخباروں

نے قیامت برپا کردی۔ مسٹر گلیڈ اسٹون آپے سے باہر ہو گئے اور ترکی اور خلیفۂ اسلام پر گالی گلوج کی دھواں دھار بارش کردی[1] معلومات اور تاریخی وثیقہ کے طور پر یہ پورا خطبہ مکمل مطالعہ کے قابل ایک قیمتی دستاویز ہے۔ اس کو پڑھ کر ان سازشوں، فریب کاریوں اور افترا پردازیوں نیز واقعات کا اجمالی خاکہ سمجھ میں آئے گا کہ یوروپین ملکوں نے جن کا سربراہ اس وقت برطانیہ تھا اور جن کے ساتھ اس وقت کی روسی شہنشاہیت بھی شامل تھی۔ کس طرح اسلام کی مرکزیت اور مسلمانوں کی عظیم سلطنت کو پارہ پارہ کرایا۔

یہ حالات ایسے ہیں کہ ایک عام انسان خصوصاً مسلمان کو بے چین و مضطرب کردینے کے لیے کافی ہیں۔ چہ جائے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے اسلامی شوکت و عظمت کے کھنڈرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مظلوم مسلمانوں کی دُہائی اور کراہ کو اپنے کانوں سے سُنا تھا۔ اور ملت بیضا کے درد و کرب کی چبھن کو اپنے دل میں محسوس کیا تھا۔

اسی خطبۂ صدارت میں آگے چل کر حضرت نے فرمایا: "اس لیے ہم سبھوں کو شرعی حیثیت سے فرض اور لازم ہے کہ بوجہ عدم استطاعتِ مقابلہ بالقوت، ملائم اور نرم جنگ یعنی ترک موالات سے کسی طرح منہ نہ موڑیں اور نہایت استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اس میدان میں قدم بڑھائیں، اور اپنے کو آزاد کرانے کے لیے ہر ممکن کوشش کو امن و صلح و شورہی کے ساتھ اتباع مذہب کرتے ہوئے عمل میں لائیں۔ اپنی آزادی ہی سے ہم دوسرے ممالک اسلامیہ کی حفاظت، خلافت کی تقویت اور مقامات مقدسہ کی حمایت کرسکتے ہیں اور پھر اپنے دین، اپنے اہل و عیال، جان و مال کی بھی حفاظت ہوسکتی ہے۔ بغیر اس کے ہمارے لیے ہر عمل میں روڑے موجود ہیں[2]۔"

---

[1] حسین احمد مدنی، خطبات و نایاب تقاریر۔ ہندوستان پریس دہلی، ص

[2]

اس موقع پر ایک خاص نکتہ قابل غور ہے کہ حضرت کی ساری سیاسی جدوجہد میں آپ کا یہ ذہن کارفرما رہا ہے کہ برطانیہ اور سامراج کے قدم اگر ہندوستان سے اکھڑ جائیں تو ایک ایک کر کے تمام ممالک اسلامیہ ان کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں حضرت اعداد و شمار سے یہ دلائل دیتے تھے کہ برطانیہ کی ساری شوکت و ثروت کا انحصار استقلال اور استحصال بالجبر پر ہے اور اس استحصال کا سب سے بڑا مرکز ہندوستان ہے۔ مشرق اور خصوصاً ہندوستان پر اپنے پنجے مضبوط رکھنے کے لیے برطانیہ کو محفوظ راستوں کی سب سے پہلے ضرورت ہے اور اس کے لیے اُسے ممالک اسلامیہ اور عرب کو اپنے زیر اثر و اقتدار رکھنے کے مختلف ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ سامراج کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔

۲۱ر فروری ۱۹۲۱ء کو سیوہارہ ضلع بجنور میں حضرت کی زیر صدارت خلافت کمیٹی کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔

اس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے ہندوستان کی گذشتہ عظمت، شوکت اور دولت کا بڑے فکر انگیز الفاظ میں بیان فرمایا:

"ہندوستان اُس وقت متمدن تھا جب سارا عالم وحشی تھا۔ وہ عالم و فاضل تھا جبکہ طبقات زمین میں جہل کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ شکم سیر تھا جبکہ ساری دنیا بھوکی تھی۔ علم ہندسہ اور حساب جو کہ ترقی اور تمدن کا اکیلا مدار ہے۔ کیا اسی کا جملہ عالم کو عطیہ نہیں ہے۔ علم حکمت (ویدک) اور نجوم کیا اسی کا مایۂ ناز نہیں ہے۔ علم سیاستِ ملوک کیا اسی کا وہ خزانہ نہیں ہے جس کے لیے بادشاہان فارس مدتوں سرگرداں رہے ہیں۔ روحانی علوم میں کیا وہ اپنے گرد و نواح کے ملکوں کا پیشرو نہیں تھا۔ اسلام کا چمکدار اور نہایت روشن آفتاب جبکہ ہندوستان پر پرتو افگن ہوا تو اُس نے ہندوستان کے قدیمی کمالات میں کسی قسم کی کمی نہیں کی بلکہ عرب و عجم اور روم و ترک کے ان کمالات کا اضافہ کر دیا جن کی ہوا ہندوستان کو اس وقت تک نہ لگی تھی۔ ہندوستان فطرتی طور پر نہایت سمجھدار دماغ نہایت ذکی طبیعت نہایت گہری فکر نہایت شعور والا قلب اور نہایت صبر والا جسم رکھنے والا ملک بنایا گیا تھا۔

اس کا اعتدال ہوائی اس کے تفاخر کا گواہ اور اس کا مرکزِ انسانی ہونا اس کی فوقیت کا شاہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدتوں تک یورپ نے اس طرف اپنی ہمتوں کو متوجہ کیا۔ اور سالہا سال تک ہزاروں قسم کے اس فکر میں مصائب جھیلے۔ وہ کونسا بادشاہ ہے جس کی عنانِ خواہش اس ملک کی طرف اس کے قدرتی کمالات کی وجہ سے متوجہ نہیں رہی اور وہ کون سی قوم ہے جس نے ہندوستان کے فرطِ عشق و محبت میں اس کے حسنِ خداداد کی بنا پر داغِ رنج والم نہیں کھائے۔ کون سی چیز دنیا میں موجود ہے کہ ہمارا پیارا وطن اس کا گنجینہ نہ ہو۔ اور کون سا وہ کمال ہے جو دیگر اقوام میں اقامت پذیر ہوا ہو اور ہندوستانی قومیں اس سے عاجز رہی ہوں۔" اس سیاق میں ہندوستان کی دوسری خصوصیات و امتیازات اور بے مثل ترقی و تمدن کا ذکر فرمایا ہے اور پھر ان حقائق کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح یورپ نے اور بالخصوص برطانیہ نے اس ملک پر اپنے پنجے گاڑ دیئے اور کس طرح اس ملک کی دولت، ثروت، علم و فن کا آفتاب یورپین قوموں کے ہاتھوں گہن میں آگیا ہے۔

"وہ ہندوستان جو کچھ دنوں پہلے فقط اپنے ملک کو ہی نہیں بلکہ سیکڑوں ملکوں کو جامہ ہائے گوناگوں سے مزین کرتا تھا۔ اس کی تجارتِ پارچہ ایشیائی، افریقی اور یورپین ممالک میں بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ آج وہ ایسا محتاج و دریوزہ گر، یورپین حکمت عملیوں اور مغربی اصلاحی اسکیموں کے ذریعہ سے بنا دیا گیا ہے کہ فقط سوتی کپڑوں کے لیے تقریباً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ اس کو انگلینڈ بھیجنا پڑتا ہے۔ وہ ہندوستان جو کہ اپنی پیداوار سے اپنے بچوں کی وسیع پیمانہ پر پرورش کرتا ہوا دوسرے ممالک کو بھی پالتا تھا آج اس کے بچوں کو روٹی کا ٹکڑا ملنا مشکل ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد ہندوستان کی زبوں حالی اور ہندوستانی عوام کی فقر و تنگدستی کا جو برطانوی حکومت کی پالیسی کے ہاتھوں پیش آرہی ہے تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان پر اپنا قبضہ و اقتدار قائم رکھنے کی غرض سے کن کن ملکوں پر اپنا پنجۂ استبداد گاڑ رکھا ہے۔" آج اس کی غلامی کے شکنجے کو اور زیادہ

سخت کرنے کے لیے ابد الآباد تک کی فکریں کی جارہی ہیں۔ جبرالٹر، مالٹا، عدن وغیرہ پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ بحری سیادت اور بحری حکومت اپنے لیے مخصوص کی جاتی ہے۔ مصر کو دبایا جاتا ہے۔ عراق کو دبوچا جاتا ہے۔ فلسطین کا شکار کیا جاتا ہے۔ ایران ذبح کیا جاتا ہے۔ خلافت (ترکی) کا شیرازہ بکھیرا جاتا ہے۔ ممالک سوڈانیہ و عربیہ کی قوت پاش پاش کی جاتی ہے۔" اس کے آگے حضرت نے ہندوستان کی مختلف قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں میں یک جہتی اور اتفاق و اتحاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اور بتلایا ہے کہ نااتفاقی اور اختلافات اگر باقی رہے تو ہم قوم و ملک کو آزاد نہیں کراسکتے۔ حکومت کی پوری کوشش ہے کہ مذہبی جذبات ابھار کر ہندوستانیوں میں نفاق اور پھوٹ ڈالے۔ اس لیے ہندوستانیوں کو اور ملک میں رہنے والی تمام قوموں کو پوری قوت کے ساتھ آپس میں شیر و شکر ہو کر ملک کا دفاع کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں حضرت نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اتفاق و یکجہتی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندوستانی اپنے مذہبی اقدار و مسائل میں بھی اتفاق و اتحاد کریں۔ بلکہ ان معاملات میں ہر قوم اپنے اپنے مذہبی حدود و شعائر پر قائم رہے۔ اتحاد و موافقت صرف ملکی اور سیاسی حدود تک رہے۔ یہ بالکل وہی پالیسی تھی جو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے سیاسی مسلک کے لیے وضع کی تھی اور جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں حضرت فرماتے ہیں: "جیسا کہ فدائے قوم و وطن مسٹر گاندھی جی اور مولینا شوکت علی صاحب وغیرہ لیڈران قوم اور علمائے جمیعۃ علماء کے سالانہ اجلاس دہلی میں تقریر کی تھی کہ ہم مذہبی مسائل میں سے ایک مسئلہ کو بھی اس اتفاق میں داخل کرنا اور چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ہر فریق اپنے مذہب میں پورا آزاد ہے۔ ہندو دھرم اپنی جگہ پر ہندو ہو کر اور مسلمان دھرم اپنی جگہ پر مسلمان رہ کر ہندوستانیت کی حیثیت سے جان توڑ کوشش اور کامل اتفاق کر کے اپنے حقوق اور آزادی کی فکر کریں۔"

ان تمام مظالم کا، اس کمزوری کا، اقتصادی بربادی کا بے عزتی اور رسوائی کا علاج اور اس تمام جدوجہد اور اتحاد و اتفاق کا مقصد بھی ملاحظہ فرمائیں: "پھر آخر

اس کا علاج کیا ہے اور آئندہ کے لیے صورتِ فلاح کیونکر ہو سکتی ہے۔ غلامی کا طوق اور جی حضوری کی بیڑیاں کس طرح کٹ سکتی ہیں۔ ظالم کو حق کے کس طرح دو زانو بٹھا سکتے ہیں اس پر غور کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر اس مرض کے علاج میں اب بھی سستی کی جائے گی تو رہی سہی رمق بھی جاتی رہے گی۔ اور موت کے سوا کوئی راہ ہمارے لیے ہے اور نہ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ہو سکتی ہے۔ ہم اس کلی کو فقط ایک فرد میں منحصر پاتے ہیں وہ یہ کہ حکومت مستقلہ حاصل کی جائے جس کو سوراج سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ماسوا تجارت کے جملہ راستے بند کر دیئے ہیں جب تک وہ نہ حاصل ہوں، ہم کو نہ اپنے آپ کو اور نہ آئندہ نسلوں کو زندہ خیال کرنا چاہیے اور دوسری ایشیائی اور افریقی قوتوں کی محافظت کرنا ناممکن سمجھنا چاہیے۔[لہ]

یہ تقریریں، بیانات اور خطبات مالٹا سے رہائی کے فوراً بعد اور سیاسی زندگی کی بالکل ابتدا کے ہیں۔ ان کی سیاسی، تاریخی اور جذباتی قوت اور اہمیت موجودہ پیمانوں سے نہ پایئے۔ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے مسلمانوں کے زخم بالکل ہرے تھے۔ ترکی کی اسلامی سلطنت اور خلافت عثمانیہ پر تازہ تازہ ضرب کاری پڑی تھی۔ فلسطین پر ابھی ابھی سامراج کے ظالمانہ پنجے گڑنے شروع ہوئے تھے۔ برطانیہ کی طاقت اور غرور اپنے عروج پر تھا۔ جیل کی دیواریں اور پھانسی کے تختے ذرا ذرا سے شک و شبہے پر مظلوموں کو نگل لینے کے لیے تیار رہتے تھے ایسے میں سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کا نعرہ بلند کرنا معمولی دل گردے کی بات نہ تھی۔ مگر ہمارے موضوع کے لیے ان بیانات کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری سیاسی زندگی کا پروگرام ان کی انقلابی جدوجہد کی پالیسی اور ان کی عوامی زندگی کا دائرۂ کار مرتب شکل میں اور واضح صورت میں سامنے آجاتا ہے اور ہم کو آپ کی زندگی اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی روشنی مل جاتی ہے۔

پہلا اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ حضرت سارے اسلامی ممالک اور خلافتِ اسلامیہ

لہ مجموعہ خطبات صدارت و نایاب تقاریر، ص ۳۱۔

کے انحطاط و انتشار کی پوری ذمہ داری یورپین ملکوں اور خصوصاً برطانیہ پر عائد کرتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں آپ کے پاس دلائل اور شواہد کا انبار ہے جو ثابت کرتے ہیں کہ صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ مسلمان ہیں اور دنیا کی عظیم طاقت ہیں، مکر و فریب کے ذریعے پیچھے سے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا گیا ہے اور ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت خیال فرماتے ہیں اور ان کا مطالعہ اور فیصلہ یہ ہے کہ اگر یورپین طاقتوں اور برطانیہ اور دوسرے لفظوں میں سامراج سے ہندوستان کی گلو خلاصی ہو جائے۔ تو نہ صرف ممالک اسلامیہ بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کی غلامی کی بیڑیاں کٹنی شروع ہو جائیں گی۔ اس کے دلائل دیتے ہوئے بھی حضرت اپنی تقریروں اور خطبات میں گھنٹوں گفتگو فرماتے تھے اور اس مسئلہ کا شمار بھی ان حقائق میں ہے جس کو اہل بصیرت جانتے اور سمجھتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت کو علی وجہ البصیرت یہ یقین تھا کہ ملک کی آزادی کے لیے جہاد و جدوجہد ہر مسلمان اور ہر ہندوستانی کا فرض منصبی ہے۔ غلامی کی حالت میں انسان نہ اپنے دینی اور مذہبی شعائر و فرائض ادا کر سکتا ہے اور نہ اُسے معاشی، اقتصادی اور معاشرتی اطمینان و سکون نصیب ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر آپ برطانوی حکومت سے مادی، جسمانی، مالی، ذہنی یا فکری، غرض ہر قسم کے تعاون کو حرام قرار دیتے تھے اور تعاون کرنے والوں کو قابلِ مذمت و ملامت سمجھتے تھے۔

چوتھی حقیقت ان خطبات سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہندوستانی اقوام کے درمیان سیاسی، اقتصادی، جغرافیائی اور مقصدی اعتبار سے فکری اتحاد اور عملی اشتراک کو ضروری بلکہ فرض قرار دیتے ہیں لیکن یہ اتحاد صرف سیاسی حدود تک تھا۔ مذہبی اور دینی مسائل و معاملات اس سے بالکل علیحدہ تھے اور اس میں ہر قوم اپنے ادیان کے دائرے میں آزاد تھی۔ جو شخص یا جماعت ہندوستانیوں میں افتراق و تشتت پیدا کرتی ہے۔ اس کے رد اور مدافعت میں کسی مداہنت یا مصلحت بینی

کو روا نہیں رکھتے۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ اگر ہندوستانی اقوام میں اتحاد نہیں ہوتا تو ایشیا اور بالخصوص ہندوستان آزاد نہیں ہوسکتا اور سامراج کو کسی نہ کسی شکل میں یہاں پنجے جمائے رکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔

پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ حضرت کو اپنے ملک اور مادرِ وطن ہندوستان سے ایک سچے وطن پرور اور محب وطن کی طرح محبت تھی اور آپ تہذیب و تمدن، سیاست و اخلاق، ذہانت و فراست، معیشت و معاشیت اور علم و عمل غرض ہر اعتبار سے اس کو دنیا کے تمام ملکوں سے افضل اور اعلیٰ خیال فرماتے تھے۔

"انسان کی طبعی بات ہے کہ اس کو اپنے وطن عزیز سے اس قدر محبت ہوتی ہے جو کہ دوسری جگہوں سے نہیں ہوتی۔ جس سرزمین میں وہ پیدا ہوتا ہے اور پرورش پاتا ہے خواہ کتنا ہی تکلیف دینے والا ہو مگر انسان کو اس کا کانٹا بھی دوسری جگہوں کے پھولوں سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مشہور شعر ہے:

حُبِّ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر"[1]

پیچھے گذر چکا ہے کہ سالوں مدینہ طیبہ میں قیام کے باوجود حضرت نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی۔

بہرحال سیاسی میدان میں عملی اقدام اور زندگی بھر کی سیاسی جدوجہد کا یہ رخ اور پالیسی متعین کر لینے کے بعد جیتے جی افکار و خیالات میں اور منزل و راہگذر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ قدم قدم مصائب کی آندھیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ حوادث اور طوفانوں کے آگے سینہ سپر رہے۔ اپنوں کی عداوتوں اور غیروں کی مخالفتوں کے زخم کھاتے رہے مگر رہِ وفا کا کوئی خارزار اور صحرائے جہاد کا کوئی طوفان پائے ثبات و استقلال کو ڈگمگا نہ سکا۔

---

[1] حضرت کا عدالتی بیان منقول از الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر طبع ثانی، مطبوعہ پاکستان، ص ۱۹

کراچی کا مقدمہ اور سابرمتی جیل

اسارت مالٹا کے سالوں میں ملک کے گوشے گوشے میں چھوٹے بڑے قصبات اور شہروں میں مدارس اور درسگاہوں میں خلافت کمیٹی اور کانگریس کی زیر قیادت بڑے بڑے احتجاجی جلسے اور تجویزیں ہوئیں جن کی خبروں سے اخبارات اور اشتہارات پوسٹر اور اعلانات بھرے رہتے تھے اور ان میں خوب خوب تعارف اور ذکر ان اسیروں اور ان کی قربانیوں اور بڑائیوں کا ہوتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تعارف میں تفصیل ان کے دار العلوم دیوبند کے لائق و فائق و قابلِ فخر فرزند ہونے کی، حضرت شیخ الہندؒ کے خصوصی شاگرد اور معتمد ترین خادم ہونے کی، قطب العالم حضرت گنگوہیؒ کے خلیفۂ اجل ہونے کی اور سرکارِ دوعالم کے قدموں میں سالوں تک درسِ حدیث و قرآن دینے کی بھی آتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے عوام و خواص میں بہت کچھ بلکہ کافی حد تک حضرت کا تعارف اور شہرت تو اسی زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔ مگر شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد جب قوم و ملک نے آپ کو منصب جانشین حضرت شیخ الہندؒ کا دیا تو شہرت اور مقبولیت میں جو کچھ تھوڑی بہت کمی اور کسر رہ گئی ہوگی وہ بھی پوری ہو گئی اور اب حضرت کا نام شیخ العرب والعجم، مجاہد اسلام، اسیر مالٹا، جانشین شیخ الہندؒ حضرت مولینا الحاج حسین احمد مدنی لکھا اور لیا جانے لگا۔ مدینہ طیبہ سے نسبت اور مدنی کا لفظ اسی وقت سے اس طرح نام کا جز بنا کہ پورے ملک میں یہی مشہور ہوا کہ ایک شیخِ طریقت اور فاضل و عالم مدینہ طیبہ میں رہتے اور حرم نبوی میں قال اللہ و قال الرسول کا سبق دیتے تھے حکومتِ برطانیہ نے ان کو قید کر کے مالٹا بھیج دیا اور اب ہندوستان میں قرآن و سنّت کے علمبردار ہیں۔

دیارِ ہندوستاں میں اپنا چراغ ہے وقفِ نور پاشی
بنام پاکِ حسین احمد نبی کے پیارے وطن کا باشی[1]

حضرت کے نام کے ساتھ یہ القاب و آداب حقیقت اور واقعیت کے مطابق تو تھے ہی، مگر ساتھ ہی ساتھ آپ کے تقویٰ و طہارت، تعلق مع اللہ، اخلاص فی سبیل اللہ، وقار اور ایثار اور دوسری خصوصیات پر پھبتے اور سجتے بھی خوب تھے۔ جس عنوان، جس موقع اور جس جگہ پر بھی حضرت کی آمد آمد کا چرچا ہوتا تھا۔ عوام و خواص پروانہ وار ان خصوصیات، امتیازات اور صفات کے پیکر کی زیارت کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ کانفرنسوں، جلسوں اور اجتماعات میں حضرت کا نام اور قدم آجائیں تو مجمع دس گنا اور اثر آفرینی پچاسوں گنا بڑھ جاتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں جولائی کا مہینہ تھا کہ کراچی میں خلافت کمیٹی کی ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں اعلان حق، سرفروشی اور جہاد آزادی کی تجویز پیش کرنے کے لیے حضرت تشریف لائے اور پوری بے جگری اور بے خوفی کے ساتھ بہ بانگِ دہل یہ اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہونا یا کسی قسم کی فوجی ملازمت کرنا یا کسی کو فوجی خدمات کی ترغیب دینا بالکل حرام ہے اور یہی نہیں بلکہ گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ تعاون اور موالات چاہے وہ کسی درجے کی بھی ہو قطعاً حرام ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک فرض بھی بتلایا کہ ہر مسلمان پر ترک موالات اور اس کی ترغیب و تحریص فرض ہے۔ اس تجویز کی تائید اور تائیدی تقریریں اس زمانے کے شیرِ خدا مولانا محمد علیؒ اور دوسرے لیڈروں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد صاحب سندھی اور سوامی کرشن تیرتھ شنکر اچاریہ نے کیں۔ یہ ساری کارروائی برطانیہ حکومت سے کھل کر بلکہ للکار کر مقابلہ اور چیلنج کی تھی۔ چنانچہ گرفتاری اور سزا میں مجوزہ مقررین کو کوئی شبہ تھا نہ عام ہندوستانیوں کو کوئی شک تھا۔ بس دیر کاغذی کارروائیوں کی اور انتظار صبح و شام کا تھا۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو جب حضرت دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے آستانے پر مقیم تھے، وارنٹ گرفتاری آپہنچا۔

---

[1] عامر عثمانی مرحوم مدیر تجلی دیوبند

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

بہتر ہے کہ گرفتاری کا آنکھوں دیکھا حال چشم دید گواہ حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا راشد حسن عثمانی مرحوم کی زبانی سنیے:

"۱۰ ستمبر کی صبح سے حضرت کی گرفتاری کی افواہ گرم تھی۔ لوگوں میں شدید ہیجان تھا اور ہر شخص کی زبان پر یہ تھا کہ ہم کسی حالت میں حضرت کو گرفتار نہ ہونے دیں گے۔ مقامی حکام کہتے تھے کہ ہمارے پاس اس قسم کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اچانک دوپہر بعد ایک انگریز افسر پولیس کچھ مسلح گارد لے کر دیوبند پہنچا اور حاکم تحصیل نیز تھانے دار کو لے کر گرفتاری کے لیے آستانۂ شیخ الہندؒ پر جہاں حضرت قیام فرما تھے حاضر ہوا۔ جونہی شہر میں اطلاع پھیلی کہ پولیس افسران آستانۂ شیخ کی طرف جا رہے ہیں فوراً پورا بازار بند ہو گیا اور پورا شہر کیا ہندو کیا مسلمان، آستانۂ شیخ کی جانب دوڑ پڑا۔ عوام میں اتنا شدید غم و غصہ تھا کہ ان انگریز افسران کو جان سے مارنے پر تیار تھے۔ آخر کار انگریز ڈپٹی کلکٹر، انگریز انسپکٹر پولیس اور عبدالعزیز سی آئی ڈی انسپکٹر حضرت تک پہنچے، وارنٹ دکھلایا، اور کہا کہ آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیے۔ مجمع میں سے کوئی بولا کہ آپ کو وارنٹ دکھلانے کا حق ہے یا گرفتار کرنے کا بھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ دو چار افراد اس پر حملہ کر بیٹھے اور بچاتے بچاتے بھی اس پر دو چار ہاتھ جڑ دیئے۔ مجمع تھا کہ سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور جوش و خروش بڑھتا ہی جاتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے حضرتؒ اور دوسرے بزرگوں نے ان انگریز افسران اور سی آئی ڈی انسپکٹر کو گھیرے میں لیکر بچایا۔ کمرے تک پہنچایا اور ان کو اندر کر کے باہر سے تالا بند کر دیا۔ عوام قابو سے باہر ہو رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ انگریزوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ جب حالت کسی طرح قابو میں نہ آئی تو حضرت نے عوام کے سامنے تقریر فرمائی جو عصر سے لے کر مغرب تک اور مغرب سے عشا تک جاری رہی۔ جس میں آپ نے اپیل کی کہ عوام قانون کو ہاتھ میں نہ لیں اور جوش و خروش کو ہنگامہ آرائی اور غلط راستوں میں استعمال

نہ کریں لیکن ظہر سے لے کر عشا تک بھوکی پیاسی جو پبلک اپنے شیخ پر جانیں قربان کرنے کے لیے دیوار بن کر کھڑی تھی کسی قیمت پر حضرت کو حکومت کے حوالے کرنے پر رضا مند نہیں ہوئی۔ آخر میں حضرت نے اپنا عمامہ سر سے اُتار اور عوام کے سامنے کر کے فرمایا کہ آپ لوگ میری پگڑی کی لاج رکھ لیں اور خاموشی اور صبر کے ساتھ مجھے گرفتار ہو جانے دیں۔ اس پر مجمع شدتِ جذبات سے بے قابو ہو گیا۔ لوگ رونے لگے اور مجبور ہو کر اس معاہدے پر فیصلہ ہوا کہ اس وقت گرفتاری ملتوی رہے، صبح کو ہم لوگ خود جلوس کی شکل میں حضرت کو اسٹیشن پہنچائیں گے مگر پولیس اور انگریز افسران حضرت کو یہاں سے گرفتار کر کے نہیں لے جائیں گے۔ افسران نے یہ شرطیں مان لیں اور تھکی ہاری پبلک خستہ و شکستہ دل بردا شتہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ تقریباً رات کو گیارہ بجے انگریزوں اور افسران کو آستانۂ شیخ کے پچھلے حصے سے نکال کر تھانے کی عمارت میں پہنچا دیا گیا۔[1]

اگر کہیں حکومت اپنے معاہدے پر برقرار رہتی تو صبح تک تو مجمع ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہی ہو جاتا۔ وہ تو کہیے خیریت گذری اور حکام نے پوری طرح وعدہ خلافی کر کے راتوں رات گوروں اور مسلح سپاہیوں کی ایک اسپیشل ٹرین دیوبند اسٹیشن پر لا کر کھڑی کر دی۔ اور پہلے پورے شہر کی ناکہ بندی کی کہ باہر کی پبلک نہ پہنچنے پائے۔ پھر نہایت خاموشی کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے آستانے کا محاصرہ کر لیا اور اس طرح قلعہ بندی کر کے دروازے پر دستک دی۔ حضرت تشریف لائے اور خاموشی سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ احباب اور اہل خانہ جو پہلے سے گھر میں موجود تھے ریلوے اسٹیشن پر وداع کرنے کے لیے ساتھ گئے۔ اسپیشل ٹرین پہلے سے تیار تھی۔ جو فوراً حضرت کو لے کر روانہ ہو گئی۔ ورنہ جہاں جذبہ اور جوش یہ رہا ہو کہ جان لے لیں گے یا دے دیں گے مگر حضرت کو گرفتار نہ ہونے دیں گے، اور خبر جنگل کی آگ کی طرح اطراف و جوانب کی پچاسوں بستیوں اور قرب و جوار کے متعدد اضلاع میں پھیل چکی ہو، وہاں صبح ہوتے ہوتے لاکھوں ہی انسان تو جمع ہو جاتے اور نہ جانے کتنی لاشیں گر جاتیں۔

---

[1] تذکرۂ شیخ مدنی ——— از مولانا راشد حسن مرحوم

قصہ مختصر اسپیشل ٹرین سے حضرت کو کراچی پہنچایا گیا۔ کیس وہیں کا تھا اس لیے مقدمہ بھی وہیں ہوا۔ مگر سماعت بجائے عام عدالت کے خصوصی اجلاس میں ہوئی جو خالق دینا ہال میں منعقد ہوا۔ عمارت کے چاروں طرف مسلح گارد اور سنگینوں کا پہرہ تو تھا ہی، اوپر سے پورے علاقے کو خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا تھا۔ الزام اس بار بھی بغاوت ہی کا بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین، فوجوں اور ہندوستانیوں میں بغاوت پھیلانے کا تھا۔ اور وہ بھی نشۂ حکومت میں چور اور طاقت کے غرور سے بھرپور دولت برطانیہ کے خلاف، جس کی بغاوت اور تختۂ دار کے درمیان فاصلہ دو ہی چار ہاتھ کا رہا کرتا تھا۔ مقدمہ کے اصل ملزم حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ دوسرے حضرات مولانا محمد علیؒ مولانا نثار احمدؒ ڈاکٹر سیف الدین کچلو پیر غلام مجدد سندھی اور سوامی کرشن تیرتھ پر صرف حضرت کی تائید و تصویب میں تقریر کا الزام تھا۔ سب سے پہلے ملزمین کے بیانات ہوئے۔ حضرت کے بیان میں اگر دو چار الفاظ کا ہیر پھیر بھی ہو جائے تو ایسے نازک موقع پر اس میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ دروغِ مصلحت آمیز کی تاویل ایسے ہی مواقع کے لیے رکھی گئی ہوگی۔ اور اگر یہ مناسب نہیں تھا تو موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر تھوڑی بہت مدافعت میں کوئی قباحت نہ تھی۔ عین اسی زمانے میں ایسی کئی مثالیں آنکھوں کے سامنے تھیں۔ بہرحال اگر ضمیر اس پر بھی تیار نہ تھا تو کم از کم بیان میں تھوڑی بہت نرمی تو کی ہی جا سکتی تھی مگر سپاہی اور پھر مردِ مومن جب ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر رن میں کودتا ہے تو ان سیاستوں اور مصلحت کوشیوں کو پیروں سے کچلتا ہی ہوا آگے بڑھتا ہے۔ حضرت نے بھی برسرِ میدان دشمن کو للکارا، اور ایسے ویسے نہیں اس طرح للکارا کہ سننے والوں کے سینوں میں دل دہل گئے۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

آپ نے اپنے بیان میں فرمایا: "میں ایک مولوی ہوں۔ احکام خداوندی کا ماننا میرے اوپر بمقابلہ غیر عالم کے زیادہ ضروری ہے۔ میرا فرض منصبی ہے کہ میں خداوندی احکام دوسروں

تک پہنچاؤں۔ قرآن اور مذہب میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی بات کو جو اس سے دریافت کی گئی ہو، چھپائے گا تو وہ دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا بے شک قرآن میں کافر کے لیے بہت سخت سزا ہے لیکن ایسے شخص کے لیے جو دوسرے مسلمان کو قتل کرے، پانچ سزائیں ہیں۔ پہلی یہ کہ دوزخ میں ڈالا جائے گا، دوسری یہ کہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا، تیسرے اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر ہوگا، چوتھے یہ کہ اس پر خدا کی لعنت ہوگی، پانچویں مختلف طریقوں سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔ قرآن حکیم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو غلطی سے بھی نہ مارنا چاہیے۔ غلطی سے مارنے والے کے لیے بھی سزا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب لاکھ صحابۂ کرام کے اجتماع میں عرفات کے موقع پر تقریر فرما رہے تھے تو آپ نے بہت تاکید کے ساتھ مسلمانوں کو وصیت فرمائی کہ احتیاط سے رہو، ایسا نہ ہو کہ میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو اور کفر کا طریقہ اختیار کر لو۔ دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے بجز اس کے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا ہو۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے، تمام دنیا کا تباہ و برباد ہو جانا آسان ہے لیکن ایک مسلمان کا دوسرے کو قتل کرنا آسان نہیں ہے۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو گالی دینا بھی فسق ہے۔ قیامت کے دن سات چیزیں مسلمان کو تباہ کرنے والی ہوں گی ان میں سے ایک قتل مسلم ہے۔ مذہبی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ قیامت کے اندر سب سے پہلے قتل و خون ریزی کے متعلق بازپرس ہوگی۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کا خون اور اس کا مال و متاع کعبہ شریف سے بھی زیادہ واجب الاحترام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک ان مسلمانوں کے لیے ہے جو کسی مسلمان پر ہاتھ اٹھائیں۔ نیز ارشاد ہوا کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو دھمکی دیتا ہے تو وہ خدا کی دھمکیوں سے محفوظ نہیں رہے گا۔ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان کی جائداد یا ملک پر قبضہ کرنا حرام ہے۔ مذہبی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ایک بے گناہ مسلمان کو قتل کرنا جرم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان سے سود کھانے اور شراب

پینے اور مردہ کھانے کو کہے کہ وہ ایسا نہ کرے گا تو بادشاہ اس کو قتل کر دے گا تو شخص مذکور کو ایسا کرنا چاہیے ورنہ اگر وہ قتل کر دیا گیا تو گنہ گار ہوگا۔ لیکن اگر اُسے الفاظ کفر ادا کرنے کا حکم بادشاہ کی طرف سے دیا جائے تو اس کو تعمیل نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اس حکم عدولی پر وہ قتل کر دیا جائے گا تو گنہ گار نہیں ہوگا اور اگر کسی مسلمان کے سامنے یہ صورت ہو کہ اگر اُس نے دوسرے مسلمان کو قتل نہ کیا تو وہ خود قتل کر دیا جائے گا تو اس کے لیے خود قتل ہو جانا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ کسی دوسرے بے گناہ مسلمان کا ہاتھ قتل کرے۔ پس! علمائے کرام نے فتویٰ دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے گورنمنٹ برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے۔ یہ امر کہ یہ رزولیشن کانفرنس میں پاس ہوا تھا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کا پاس کرنا اسی طرح ضروری تھا جس طرح ایک طبیب وحکیم کے لیے خاص طبی مشورہ دینا۔ جب لائڈ جارج اور چرچل نے اس بات کا اعلان کیا کہ یہ جنگ اسلام اور برطانیہ کے درمیان جنگ ہے تو اس وقت نہ صرف ضروری بلکہ ہمارا اہم ترین فرض تھا کہ ہم اعلان کر دیں کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اسلام کے خلاف تمام طاقتوں کے خلاف جنگ کرے۔ ایک مسلمان گورنمنٹ کے ساتھ اسی حد تک وفادار رہ سکتا ہے جہاں تک اُس کے مذہب نے اجازت دی ہے۔ اگر گورنمنٹ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کی تعمیل نہیں کرنا چاہتی اور اگر مذہبی فرائض اور پابندیوں کا لحاظ واحترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلے کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے اور ۳۳ کروڑ ہندوؤں کو یہ خیال کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مذہبی آدمی کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے۔ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے پر تیار ہے تو مسلمان اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کرونگا۔[1]

بیان کے دوران سارے ہی وقت میں عدالت میں موجود حاضرین دم بخود تھے کہ ظالم حکومت کے بھرے دربار میں ایک فقیر درویش کس بل بوتے پر حق کا نام ایسی

[1] بیان مقدمہ کراچی، حیاتِ شیخ الاسلام

ہمت سے بلند کررہا ہے۔ کورٹ اور جج حیران تھے کہ اس جرأت وشہامت کے جرم کی کیا سزا دی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر بیان کے آخری جملوں پر تو لوگوں کے کلیجے اچھل کر حلق میں آگئے۔ ایسی بے جگری اور بے خوفی اور وہ بھی حکومت برطانیہ کے انگریز ججوں کے سامنے اور جانب دار عدالت میں دیکھنا تو کیا قوم و ملک نے کبھی سُنی بھی کاہے کو ہوگی۔ ایسے ماحول میں جب حضرت مدنی نے پورے اطمینان، بلند آہنگی اور للکارتی ہوئی آواز میں بیان کا آخری جملہ ارشاد فرمایا تو مولینا محمد علی فرطِ جذبات، عقیدت اور سرشاری سے بے تاب ہوگئے اور برسرِ عدالت دوڑ کر باچشمِ نم حضرت رحمۃ اللہ کے قدم چوم لیے[1]۔ افضل الجہاد کلمۃ حقٍ عند سلطانٍ جائر کی تعبیر انہی اللہ کے شیروں نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔

بغاوت کا یہ مقدمہ خصوصی عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ اس بیان کے بعد کیس سیشن سپرد ہوگیا۔ یہاں بھی حضرت نے پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا بیان دیا۔ اس کی روح اور اسپرٹ تو وہی ہے جو عدالت خصوصی والے بیان میں گذر چکی ہے۔ مگر کچھ خاص اجزا اس کے بھی قابلِ غور ہیں "جو قرارداد میں نے پیش کی ہے وہ محض ایک قرارداد نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک مذہبی فریضے کا اعلان ہے۔ ہم اپنے اور ہندو اپنے دھرم سے محبت کرتے ہیں۔ یہ مذہبی معاملہ ہے اس کا فیصلہ لارڈ ریڈنگ کا نہیں بلکہ مذہبی علماء کا کام ہے۔ الفاظ میں کہا گیا ہے کہ پولیس کی ملازمت کرنا حرام ہے۔ اس استغاثے کے متعلق لارڈ ریڈنگ نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت نہیں کی گئی ہے۔ مگر میں یہ معلوم کرکے خوش ہوں کہ سرکاری وکیل اور جج نے کہا ہے کہ احکامِ قرآنی کو پیشِ نظر نہیں رکھا جائے گا اور اس سے بھی زیادہ خوش ہوں گا اگر لارڈ ریڈنگ، مسٹر مانٹیگو اور لائڈ جارج اس بات کا اعلان کردیں کہ مسلمانوں کو تمام احکامِ قرآنی پر عمل کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ ہمارے لیے بہتر ہوگا اور سوراج چار ماہ کے بجائے دو ہی ماہ میں حاصل ہو جائے گا۔ آخر میں ڈنکے کی چوٹ

[1] حیاتِ شیخ الاسلام، ص ۵۸

اعلان کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے[۱]۔"

اس طرح بغاوت کے اقبالِ جرم پر اور پھر ڈنکے کی چوٹ اعلانِ بغاوت کے بعد اب سزا میں اور آخری سزا میں شک و شبہ بھی کیا رہ جاتا تھا۔ ملزم نے تو بیان ہی اس قصد و ارادے سے دیا تھا کہ ہمارے سر سے جو کچھ بھی گذر جائے مگر جس طرح بھی ہو آج برطانوی استعمار و سامراج کی اینٹ سے اینٹ بج کر ہی رہے۔ بیان سن کر بھری عدالت کو وکلاء، اور بیرسٹران کو اور پورے قوم و ملک کو بھی سزا کا یقین ہو گیا' انتظار بس اس بات کا رہ گیا کہ سزا کیا ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے۔ اس قسم کے آخری لمحات میں کمانڈر کا فرض ہوتا ہے کہ رخصت ہوتے ہوئے اپنی فوجوں کو نقشۂ جنگ سمجھاتا جائے اور اپنے بعد جنگ جاری رکھنے کے اسرار و رموز بتلا کر ان کے حوصلے بڑھاتا جائے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسے وقت میں اپنی قوم و ملک یا یوں کہیے کہ جنگ آزادی کی افواج کے نام یہ پیغام دیا۔ اس کو پڑھنے سے پہلے خوب ذہن نشیں کر لیجیے کہ یہ کوئی خطیبانہ، لیڈرانہ، شہرت پسندانہ اور اخباری رسمی اشاعت نامہ نہیں تھا بلکہ جیل کی کوٹھری' عداوتوں اور دشمنیوں کی یلغار اور قاتل کے ہاتھ میں اٹھی ہوئی تلوار کے نیچے سے دی ہوئی ما بینہٗ و بین اللہ ایک وصیت تھی جو اس ارادے سے دی جا رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ آج کے بعد اپنے جاں نثاروں سے بات کرنے کی نوبت پھر نہ آئے۔ اس کو حضرت کے دینی اور سیاسی مزاج کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔

"یہ وقت اسلام پر نہایت سخت آپڑا ہے جس کی نظیر پہلے نہیں گذری۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کو جو کچھ بے چینی ہو وہ بہت ہی کم ہے، آج ہم اور آپ نہیں برباد ہو رہے ہیں بلکہ آج دشمنانِ اسلام، اسلام کا جنازہ اٹھانا چاہ رہے ہیں اور اس کی صورتیں کر لی ہیں اور اپنے زعم میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگرچہ خدا بے نیاز ہے اس کو کسی کی پروا نہیں ہے۔ مساجد کو گرجا بنوا تا ہے، جب چاہتا ہے خانۂ کعبہ میں

---

[۱] حیاتِ شیخ الاسلام، ص ۹۳

بت پرستی کراتا ہے، اپنے جاں نثاروں کو خون کے آنسو رلاتا ہے، آروں سے چروا تا ہے آگ میں جلواتا ہے، اس کو دنیا وما فیہا کی حاجت نہیں مگر ہم نالائق بندے اس کے محتاج ہیں۔ اس کا وعدہ ہے کہ اس دین کی آخر تک حفاظت کروں گا اس لیے ہم کو پوری پوری امید ہے کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کرے گا اور انشاء اللہ ضرور کرے گا۔ فقط ہم کو اتنی ضرورت ہے کہ اس خدمت ضروریہ میں اور لازمی عملدرآمد میں اگر ہماری بھی کچھ ٹانگ اڑ جائے، ہمارے قول فعل مال جان کسی کو بھی دخل ہو جائے تو کل کو قیامت کے دن منہ دکھانے کو جگہ ہو گی۔ کل ہم رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اور رب العزت کے سامنے یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہم نے اپنی طاقت کے موافق کوئی کمی نہیں کی۔

اے میرے پیارے بزرگو! آپ لوگوں کو میری جدائی، میری تکلیف، میری شفقت کا ادنیٰ درجہ کا بھی خیال نہ ہونا چاہیے۔ دینِ محمدی کی فکر ہونی چاہیے۔ دشمنانِ اسلام نے ہزاروں نہیں لاکھوں خاندان برباد کر دیے جن کا آج نام و نشان نہیں ہے۔ وہ ہمارے ہی مسلمان بھائی، مسلمان بہنیں اور مائیں اور بچیاں تھیں۔

میرے عنایت فرما بزرگو! ہم کمزور ہیں، ہم میں اتفاق نہیں، ہم ہتھیار نہیں رکھتے، ہم مال نہیں رکھتے، ہمارا دشمن قوی ہے، اس کے پاس ہر قسم کا سامان ہے، ہم کو اسے سیدھا کرنا اور اس سے بدلہ لینا ضروری ہے مگر ہمیشہ مقابلہ سمجھ اور طاقت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ یہی طریقہ قرآن، حدیث اور آں حضرتؐ نے بتلایا ہے، اسی لیے ہم کو جب تک کہ ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ یعنی خلافت کی آزادی، جزیرۃ العرب کی آزادی، ہندوستان کی آزادی، پنجاب کی تلافی، اس وقت تک نہ ہم کو چین سے بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ آپ پر شرعاً فرض ہے کہ اگر ایک مری ہوئی چیونٹی کی طرح آپ کاٹ ہی سکتے ہیں تو ضرور کاٹ لیجیے۔ اس کے معنی یہ نہ سمجھیے کہ آپ خلافِ امن کوئی بات کریں، خوں ریزی کریں۔ نہیں نہیں! صبوری کے ساتھ جس قدر

ممکن ہو نقصان پہنچائیں۔ دوسروں کو آمادہ کریں۔ دشمن کی قوت کو کمزور کریں۔ ان کی تجارت کو گھٹائیں۔ ان کی صنعت کو گھٹائیں۔ ان کی محبت اور ان کے خوف کو دلوں سے دور کریں۔ لوگوں میں جرأت پیدا کریں۔ سچ کہنے سے نہ رکیں۔ لوگوں کو نرمی اور حکمت سے سمجھائیں۔ شدت کو کام میں نہ لائیں۔ ٹوٹے ہوؤں کو ملائیں، ملے ہوؤں کو نہ توڑیں۔ اسی دھن میں دن رات لگے رہیں۔ لوگوں میں سپہ گری پھیلائیں، بانک بنوٹ، تلوار لکڑی، گھوڑے کی سواری وغیرہ جو ہمارے بزرگوں کا طریقہ تھا جس کو تمام شریف خاندان کے لوگ سیکھنا اپنا فخر سمجھتے تھے، اس کی طرف لوگوں کو ترغیب دیں۔ کم از کم روزانہ ایک آدھ گھنٹہ اگر یہ عمل جاری رہے تو ہم خرما و ہم ثواب کا کام دے۔ جسمانی صحت حاصل ہو، ایک فن ہاتھ میں رہے، وقت بے وقت کام آئے۔ اپنی اور مال و اولاد کی حفاظت ہو۔

میرے پیارے دوستو! دیکھو اس بامن جنگ (عدم تشدد) نے اس قدر فائدہ دیا کہ ہم سات آدمیوں کے پکڑے جانے کے بعد تمام ملک میں تحریک بہت زور و شور پکڑ گئی۔ لوگوں کے دلوں سے خوف گورنمنٹ کا بہت کم ہو گیا جس مسئلے کو ہم مہینوں کوشش کر کے سب کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے تھے، وہ دم کے دم میں پہنچ گیا۔ انگورہ کے مجاہدین کا چندہ بہت بڑے پیمانے پر جمع ہو گیا۔ بہت سے آدمیوں نے اس حرام نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور بھی سیکڑوں فائدے ہوئے۔ اگر تشدد آمیزی کی کارروائی ہوتی تو یہ فائدہ نہ ہوتا۔

میرے معزز کرم فرماؤ! ہم تو اسی بامن ترکِ موالات سے گورنمنٹ کو شکستِ فاش دے دیں گے ذرا ملک کو پوری طرح تیار تو ہو جانے دو۔ اور لوگوں میں احساس اور اتفاق پیدا کرو۔ ہاں! ایسا سختی سے لوگوں کو نہ پکڑو کہ کل کو گھبرا کر چھوڑ بیٹھیں شریعت کی پابندی کراؤ۔ روز روز جلسے ہونے شاید لوگوں کی ہمیشگی سے مانع ہوں۔ میرے خیال میں ہفتے میں ایک دو جلسے یا پندرہ بیس دن میں ایک جلسہ کافی ہے۔ مگر کام بہت نظم سے ہونا چاہیے۔ جو کام مجمع کے اور بڑے ہوتے ہیں

اس میں غلط فہمیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہم کو اس وقت ملنے اور ملانے کی زیادہ ضرورت ہے، متوسط طریقہ پر کوشش جاری رہے۔ نرمی اور خوش کلامی میں فرق نہ ہو۔

میں اب تک بہت آرام سے ہوں۔ غالباً کل یا پرسوں حکم سنایا جائے گا اگر مجھ پر یا دوسرے رفقاء پر کوئی سخت حکم ہو تو آپ لوگ ہرگز صدمہ نہ کریں اور نہ کوئی ایسی حرکت ظاہر ہو جس سے بے چینی، قلق یا اضطراب ظاہر ہو۔ بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ دشمنان اسلام یہ سمجھیں کہ ان لوگوں کو ذرا بھی پروا نہیں ہوئی اور نہ اپنے مطالب سے ہٹے۔

ہم ہر روز اپنے مقصد یعنی آزادی ہند اور دیگر مذہبی مقاصد کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ الحمد للہ! ملک اور قوم کے قدم نہایت تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ خداوند کریم مددگار ہے۔ ہم ضعیف ہیں مگر انشاء اللہ لبیک کہہ کر کھڑے ہوں گے اور گورنمنٹ کے موجودہ طریقہ اور جماعت کو دبا میں مبتلا کر کے ڈھائی گھڑی کی لگا دیں گے۔ بعون اللہ تعالیٰ۔

یہ زاہد فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

بھائیو! گھبراؤ نہیں۔ مایوس مت ہو۔ ایک خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہمارے ساتھ ہے۔ کوشش کیے جاؤ۔ کامیابی دیکھو گے۔[1]

اس پیغام کو سرسری نظر سے پڑھ کر نہ گذر جائیے بلکہ چند اہم پہلوؤں پر غور فرماتے چلیے۔ عدم تشدد، ترک موالات اور سودیشی اشیاء کے استعمال اور جہاد آزادی میں شرکت کی دعوت صرف اس لیے ہی نہیں ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اور جلیانوالہ باغ کے حادثے کی تلافی ہو بلکہ اس لیے بھی ہے کہ خلافت آزاد ہو، جزیرۃ العرب آزاد ہو اور عالم اسلامی کو طاقت حاصل ہو۔ ایک پیغام یہ بھی ہے کہ چاہے کتنے ہی کمزور ہو کیسی ہی بے سروسامانی ہو مگر حوصلہ نہ ہارو اور دشمن کو قلیل یا کثیر جتنا بھی نقصان پُرامن طریقے سے (یہ پُرامن طریقے کی بات بھی دھیان میں رہے) ممکن ہو پہنچایا جائے اور آخری

[1] حیات شیخ الاسلام مرتبہ مولانا محمد میاں، ص۔

بات اور سب سے اہم بات شریعت پر پابندی، اللہ پر بھروسہ اور رب العزت کے سامنے سرخروئی کی تمنا ہے کہ جب حاضری کا وقت آئے تو سرخرو ہو کر حاضری نصیب ہو۔

آخر یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا اور اگرچہ بغاوت کے جرم سے بری قرار دیا گیا مگر زیر دفعہ ۵۰۵ اور دفعہ ۱۰۹ سب حضرات کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ زندگی بار۲ میں بھی تختۂ دار تک پہنچ کر لوٹ آئی تھی۔ اور یہاں بھی پھانسی کا پھندہ گلے کے پاس سے ہو کر گذر گیا۔

سزا کے بعد شروع میں تو حضرت کراچی ہی جیل میں رہے بعد میں احمد آباد کے قریب سابرمتی جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ وہاں آپ کے محبوب مشاغل اشغالِ روحانیہ، ذکر و وظائف، سلوک و معرفت تو تھے ہی، ایک بڑا کام قرآنِ پاک کے حفظ میں جو کمزوری رہ گئی ہوگی اس کو پختہ کرنا بھی تھا۔ جیل کے کچھ ساتھیوں کو قرآنِ پاک کا ترجمہ اور تفسیر بھی تعلیم فرماتے رہے اور اسی ضمن میں مولینا محمد علی مرحوم کو جب تک ساتھ رہے، ترجمہ و تفسیر پڑھاتے رہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ کی جیل کی زندگی پر ایک صاحبِ بصیرت اور عارف باللہ کی گفتگو بھی سنتے چلیں۔ یوں تو قیدیوں کی اس جماعت میں سبھی مخصوصین اور مقربین تھے مگر حضرت پیر غلام مجدد صاحب سندھی خاص طور پر بڑے صاحبِ نسبت اور برگزیدہ بندے تھے۔ ہمہ وقت ذکر و شغل خاص طور پر تلاوتِ کلامِ پاک میں مشغول رہتے تھے۔ گورنمنٹ کے اعداد و شمار کے مطابق ان کے سولہ لاکھ مرید درج رجسٹر تھے۔ ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں کچھ زیادہ ہی رہے ہوں۔ ہمارے حضرت قدس اللہ سرہٗ کے ایک مخصوص خادم حاجی احمد حسین صاحب لاہرپور ضلع سیتاپور کے باشندے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ کراچی کی سزا کاٹنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں دہلی میں آل انڈیا کانگریس اور مرکزی خلافت کمیٹی کے اجلاس ہو رہے تھے اور یہ سب حضرات دہلی میں تشریف فرما تھے۔ حاجی صاحب مذکور نے حضرت کی خدمت میں بیعت کی درخواست پیش کی۔ حضرت ابھی تک مشکل ہی سے کسی کو بیعت کرتے تھے

اس لیے آپ نے حاجی صاحب کو پیر غلام مجدد صاحب کے پاس بھیج دیا۔ یہ پہنچے تو آپ تلاوت کر رہے تھے۔ کلام پاک بند کر کے آنے کا سبب پوچھا اور فرمایا" مولینا حسین احمد یہاں پر موجود ہیں اور تم مجھ سے بیعت ہونے آئے ہو۔ میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے میں بحلف کہتا ہوں کہ جیل میں میں نے جو حالات حضرت مدنی کے بچشم خود دیکھے ہیں ان کی بنا پر میری رائے ہے کہ اس وقت روئے زمین پر بزرگی اور اتباع شریعت کے اعتبار سے مولینا مدنی کا ثانی نہیں ہے۔[1]

صبر و شکر اور راضی برضائے الٰہی رہنے کی صفات تو ایسی بیش بہا خصلتیں ہیں کہ عام حالات اور روز مرہ کی زندگی میں بھی اگر نصیب ہو جائیں تو قطرہ کو موتی، پتھر کو ہیرا اور انسان کو فرشتہ بنا دیں ——— جیل اور قید و بند کی زندگی میں جن کو یہ گرانمایہ نعمتیں نصیب ہوں ان کے علو مرتبت اور درجات عالیہ کا کیا پوچھنا ہے۔ ہمہ شما تو اُن بلند مقامات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تاہم الفاظ و بیان سے ایک ظاہری نقشہ ضرور سامنے آجاتا ہے۔ صبر و شکر کا یہ مقام انبیاء و رسل ہی کو نہیں کبھی کبھی ان کے نائبین کو بھی نصیب ہو جاتا ہے۔

"خدا کے فضل سے مجھ کو یہاں اور نہ کراچی میں کوئی خاص تکلیف ہوئی اور نہ ہے۔ میں بلا تکلف واقعی طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ سوائے اپنے اکابر و احباب کی دوری کے۔ سو وہ بھی عارضی ہے جس کو الکتابۃ نصف الملاقات دور کر دیتی ہے۔ مجھ کو بفضلہ تعالیٰ جو اطمینان و سکون یہاں حاصل ہے وہ عقلی مرتبہ میں مجھ کو مجبور کرتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کی دعا تک بھی نہ کروں، خواہش اور کوشش تو دوسری بات ہے ؎

نالہ از بہر رہائی نکند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

ہاں رضا باقضا ضروری امر ہے۔ میں خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس قید

[1] حضرت مدنی کے حیرت انگیز واقعات، ص ۱۵۸

میں مجھ کو ظاہری اور باطنی بہت سے انعامات سے نوازا اور اگر میں بانصیب نالائق اور کاہل نہ ہوتا تو اب تک بہت کچھ الطاف الہیہ سے فیضیاب ہو چکا ہوتا مگر اپنی بدقسمتی کا گلہ کس سے اور کیا کروں؟ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میرے لیے یہ قید رحمت ہی رحمت ہے اور پھر اگر خداوند کریم قبول فرمائے اور اخلاص ہو تو ہر ہر لمحہ آخرت کے لیے توشہ ہے ؎

خاکیاں بے بہرہ اند از جرعۂ کاس الکرام
ایں تطاول بیں کہ از عشاق مسکیں کردہ اند

فللّٰہ الحمد والمنۃ، الحاصل ہر طرح افضال الٰہی شامل ہے۔ اپنے ہر دو بزرگوں مرشدنا ومولانا حضرت گنگوہی اور مولینا دیوبندی قدس اللہ اسرارہما کے الطاف کو ہر لحظہ چربند ول پاتا ہوں پھر کیا غم ہے اگرچہ ایسی قیدیں سالہا سال کے لیے ہوں خداوند کریم اپنی رضا اور اپنے پیاروں کی رضا عطا فرمائے۔

اذا صح منک الود فالکل هين
وکل الذی فوق التراب تراب[1]

(اگر اس کا عشق نصیب ہو جائے تو ہر مشکل آسان ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے سب مٹی ہی مٹی ہے)

اپنوں سے دوری، اہل وعیال سے مجبوری، اعزہ واحبا، کی فرقت، آزادی سے محرومی، قید وبند کے مصائب ایک محبوب کی نظر کرم حاصل کرنے کے لیے برداشت تھے اور محض برداشت ہی نہیں سر آنکھوں پر تھے، تمنا صرف اتنی تھی کہ کسی طرح وہ اپنی رضا سے اور اپنے پیاروں کی رضا سے نواز دے جان چاہے رہے یا جائے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

یہ معمولی قید اور محض قید نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ با مشقت کی سزا بھی لگی ہوئی تھی۔

[1] مکتوب بنام حافظ زاہد حسن امروہوی از اسارت مالٹا بحوالہ مکتوبات شیخ الاسلام، جلد دوم، ص ۸۲

ہر چند کہ جیل کے افسران اخلاق عالیہ اور صفات حسنہ کے پیش نظر ممکنہ رعایت و مروت روا رکھتے تھے مگر بنیادی اور اصولی طور پر دوسرے اور معمولی درجے کے قیدیوں کی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھی گھنٹوں مشقت کی ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ صبر و شکر کی تفصیل پڑھتے وقت یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے تو عزیمت و شہامت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، اس مشقت کی تفصیل بھی دیکھ لینی چاہیے تاکہ جیل کی زندگی کا صحیح نقشہ سامنے آجائے۔

"اگرچہ حکام بالا کی ماتحت حکام کو سخت تاکید ہے اور ہوتی رہتی ہے کہ ان پولیٹکل قیدیوں کے ساتھ معمولی قیدیوں کا معاملہ کیا جائے کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ ہو اور مع ہذا یہ لوگ معمولی معمولی قیدیوں سے بالکل علٰحدہ رکھے جائیں، ان سے میل جول گفت و شنید کی نوبت نہ آنے پائے، یہ لوگ آپس میں نہ ملیں، خوراک پوشاک وغیرہ وہی ہوں مگر تاہم حسب گنجائش قانون ہمارے ساتھ بعض بعض مراعات برتی جاتی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ ان دنوں اگرچہ یوروپین ہے مگر بہ نسبت سابق سپرنٹنڈنٹ اور دیگر حکام کے اس میں آدمیت اور معقولیت زیادہ ہے۔ اس کو فی نفسہٖ قیدیوں کے ساتھ عموماً ہمدردی ہے۔ ان کے خورد و نوش پوشاک وغیرہ کا بہت لحاظ رکھتا ہے۔ اگرچہ یہاں عام قیدیوں کو گیہوں کی روٹی بلا عذر نہیں دی جاتی مگر پولیٹکل قیدیوں کو دونوں وقت گیہوں کی روٹی ملتی ہے ان روٹیوں میں ریت یا کنکریاں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ دال (جو کہ روزانہ ایک وقت) اور ترکاری (جو کہ دوسرے وقت) ملتی ہے، ایک درجہ تک اچھی ہوتی ہے۔ دال ہر روز بدلی جاتی ہے۔ ہفتہ میں ایک قسم کی دال ایک روز ملتی ہے۔ بعض بعض قیدیوں کو دودھ بھی ملتا ہے چنانچہ مجھ کو روزانہ ایک پاؤنڈ دودھ ملتا ہے۔ مشقت ہم لوگوں کی بہت سہل کام کی ابتدا سے ہے۔ پہلے تو پانچ چھ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا مگر اب تو دو ڈھائی گھنٹہ کام کرنا ہوتا ہے۔ اون کے تاروں کا گولہ بنانا پڑتا ہے۔ پہلے سوت کے تاروں کو چرخ پر دوہرا کرنا ہوتا تھا۔"[1]

مختصر یہ کہ اس دوسری اسارت کے یہ دو سال بھی عبادت ریاضت اور اپنے

[1] بنام حافظ زاہد حسن مکتوبات شیخ، جلد دوم، ص ۸۲

مولیٰ کی رضا جوئی میں خرچ ہو کر ۱۹۲۳ء میں ختم ہوئے۔ اس موقع پر عوام و خواص بلکہ پورے ملک کی خوشی کا اندازہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ جیسے سر دھڑ کی بازی گرفتاری کے وقت لگادی تھی ویسا ہی شاہانہ استقبال بھی کرنا چاہتے تھے۔ جلسہ و جلوس کی تیاریاں دنوں اور ہفتوں سے نہیں بلکہ مہینوں سے ہو رہی تھیں۔ دتی میں مولانا محمد علی کا استقبال تو اس شان سے ہوا کہ مثال قائم ہوگئی۔ ان کی سواری عوام نے اپنے ہاتھوں اور کاندھوں پر تمام شہر میں گشت کرائی۔ کہتے ہیں کہ اس شان کا استقبال اور جلوس دلی کی آنکھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ کو تو نام و نمود اور شہرت و ظاہر داری سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ قید کی رہائی پر جلسہ و جلوس تو کیا نکلتے کسی اپنے پرائے، دوست دشمن یا چھوٹے بڑے کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ جیل کے پھاٹک سے نکل کر سیدھے اسٹیشن پہنچے اور تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر دیوبند کے لیے سوار ہو گئے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ وہ بھی ایسے موقع پر عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر جب تک بیماری پیری اور ضعف نے بالکل معذور و مجبور نہیں کر دیا۔ اس وقت تک حضرت کے سارے ہی اسفار چاہے قریب کے ہوں یا دور کے، ہمیشہ عوامی درجے ہی میں ہوتے رہے۔ یہ راقم السطور کا ذاتی مشاہدہ تو ہے ہی، ایک اور گواہی بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

"۱۹۲۰ء میں سیوہارہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا۔ میں اس کا ناظم تھا۔ ہندوستان کے مشہور ہندو مسلمان لیڈروں اور علما نے اس میں شرکت کی تھی میں نے سکنڈ کلاس کا کرایہ اور ایک خادم کا کرایہ اور کچھ زائد خرچ بذریعہ منی آرڈر تمام مدعوئین کو روانہ کر دیا تھا (یہ خیال رہے کہ ۱۹۳۰ء کا سکنڈ کلاس آج ۱۹۸۷ء کے فرسٹ ایر کنڈیشنڈ کے برابر تو ضرور تھا اور اس میں زیادہ تر متوسط درجہ کے انگریز حکام اور افسران ہی سفر کرتے تھے۔ اونچے درجے کے ہندوستانی اس وقت تک صرف انٹر کلاس میں چلتے تھے یہ درجہ اب ختم ہو چکا ہے) مولانا (مدنی مرحوم) اس زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھے، ان کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور بحساب بالا منی آرڈر بھیج دیا گیا تھا۔ کلکتہ سے سیوہارہ تک میل ٹرین میں چھبیس گھنٹہ کا سفر ہے۔ مولانا بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ کوئی خادم وغیرہ ساتھ نہ تھا، کیمپ آتے ہی

سب سے پہلے حضرت نے دریافت کیا کہ ناظم صاحب دفتر کہاں ہیں۔ دفتر میں میرے پاس آئے اور سلام و مصافحہ کے بعد میز پر ایک پرچہ اور کچھ روپے رکھ کر قیام گاہ کو تشریف لے گئے۔ پرچہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مولینا نے (اتنا طویل) سفر تھرڈ کلاس میں کیا ہے اور ناشتہ وغیرہ میں صرف سات آنے خرچ کیے ہیں [۱]۔"

آخر اس طرح سفر پورا کرکے ٹرین رات کو دو بجے دیوبند اسٹیشن پہنچی اور دو سال پہلے جس طرح رات کی تاریکی میں بالکل خاموشی کے ساتھ اس آستانہ سے رخصت ہوئے تھے اسی طرح رات کے اندھیرے میں چپ چپاتے حاضر ہو گئے۔ نہ جاتے ہوئے کسی نے دیکھا تھا نہ آتے ہوئے کسی نے جانا۔ کچھ مخلصین نے اس طرح خاموشی سے آمد پر شکوہ کیا اور جلسہ وجلوس کی اجازت چاہی۔ لوگ خوش تھے کہ قید سے رہائی ملی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو صدمہ تھا کہ اس دو سال کے عرصے میں غلامی کی زنجیریں اور مضبوط ہو گئیں۔ جلسہ وجلوس کے سوال پر فرمایا:

"کیا جلوس؟ کیا ہم نے برطانیہ کو شکست دے دی ہے؟ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ رنج اس بات کا ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے ہیں۔ کہیں شکست خوردہ لوگ بھی جلوس و جلسہ کرتے ہیں [۲]۔"

اس طرح ہندوستان کے ان تمام مقامات پر اوس پڑ گئی جہاں رہائی کی خوشی میں اجتماعات اور جلسہ وجلوس کی تیاریاں تھیں۔ یہ واقعہ حضرت کی غیرت، احساس، خلوص اور بے نفسی کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ حضرت جب جیل گئے تھے تو جد وجہد آزادی کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ پورا ملک نشۂ آزادی میں چور ہو رہا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کی اسپرٹ ملک کے رگ و ریشے میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ خلافت کمیٹی زندہ و تابندہ تھی مگر جب رہا ہوئے تو ماحول بدل چکا تھا۔ تحریک خلافت دم توڑ رہی تھی، ملتِ اسلامیہ کو انہدامِ خلافت کا شدید دھکا لگ چکا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا خواب

---

[۱] مقالہ از مولینا ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی بحوالہ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، ص ۲۸۲۔

[۲] (ماہنامہ) الرشید ساہیوال پاکستان مدنی و اقبال نمبر، ص ۱۲۸۔

پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ مہاسبھا نے شدھی سنگھٹن اور مقابلے میں بعض مسلم جماعتوں نے تبلیغ و تنظیم کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ حکومت برطانیہ کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں برگ وبار لانے لگیں تھیں۔ ان تفصیلات کا تو نہ ان صفحات میں موقع ہے اور نہ یہ بیان اس جگہ مطلوب ہے۔ یہاں تو اتنا تذکرہ کرنا ہے کہ ایسے مایوس کن ماحول اور مشکل حالات میں حضرت کے عزم واستقلال اور ہمت وحوصلوں میں ذرہ برابر بھی تو کمزوری نہیں آئی۔ آپ نے ملک کے دور دراز بہت سے مقامات کا دورہ فرمایا، عوام سے اور پبلک سے ملاقاتیں کیں اور ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو بیدار کرنے میں اپنی پوری قوت خرچ کر دی۔ اُن سارے اسفار اور تقریروں کا ملنا بھی دشوار ہے اور تذکرہ بھی مشکل ہے مگر اس وقت کی سیاست اور حضرت کی جد وجہد کا کسی قدر حال اس خطبۂ صدارت سے معلوم ہوگا جو ۱۹۲۳ء میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس بمقام کوکناڈا دیا گیا۔ مصلحت بینی، عاقبت کوشی اور مداہنت کا تو حضرت کی زندگی میں گذر ہی کہاں تھا، مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ابھی ابھی جیل سے رہا ہوئے تھے، گورنمنٹ کی پالیسی اور عدالتوں کی بے انصافی پوری طرح پیشِ نظر تھی۔ پھر بھی للکار میں کچھ کمزوری اور آواز میں کوئی بھی تو نرمی نہیں آئی۔ اُسی قدر زور وشور کے ساتھ بلکہ کہیں زیادہ فیصلہ کن انداز میں حکومت کو پکارا اور قوم کو اُبھارا۔

"برطانیہ کی ناپاک پالیسی ہندوستانی فوجوں سے اپنی اغراض کے لیے مسلمان قوموں اور ان کے دار ودیار، مال ومنال اور عزت وآبرو پر ہاتھ اٹھواتی ہے، ان کو قتل کرواتی ہے، ان کو ہر طرح پامال کراتی ہے۔ اگر کوئی فوجی اس امر کو حلال کرے گا ـــــ تو وہ حسب احکام شرعیہ کافر ہو جائے گا۔ شرعی حیثیت سے گورنمنٹ برطانیہ اور کفار کی کسی قسم کی اعانت مسلمانوں پر حرام ہے اور حلال سمجھنے والوں کا ایمان خطرہ میں ہو جاتا ہے۔ اس سے نجات فقط ہندوستان کی مستقل آزادی میں ہو سکتی ہے۔

قرآن پاک کے بموجب ضروری اور فرض ہے کہ مذکورہ پالیسی کی بنیاد پر اس

گورنمنٹ سے مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی قوت کو فنا کیا جائے۔ اس کے عزم و ارادوں کو گھن لگا کر کھوکھلا کر دیا جائے۔ چونکہ گورنمنٹ برطانیہ کے جملہ لاف و گزاف نخوت و سطوت تعاظم و تکبر اور قوت و دبدبہ کا بڑا مدار ہندوستان کے غلام رکھنے پر ہے اس لیے جبر و نخوت کے اس سبب کو توڑ دینا ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے اور یہی اعلیٰ درجے کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی۔ یہی بات اس کے گھٹنے ٹکا دے گی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی اور سوراج انگلستان کی موت کے مرادف ہے۔ اس لیے سب سے بڑا اہم اور ضروری فرض یہ ہے کہ ہم پورے عزم و استقلال کے ساتھ اس ناپاک پالیسی کا مقابلہ کریں۔ خصوصاً جبکہ تمام قانونی کارروائیاں بے سود ہو چکی ہیں۔ نہایت زیادہ لازم ہے کہ گورنمنٹ کو مجبور کرتے ہوئے اس کے پرانے انسانیت سوز نجس رویہ کو چھوڑوائیں۔ اس کے ساتھ مقابلہ کرنا اپنا حقیقی نصب العین سمجھیں اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو، نہ خود چین سے بیٹھیں، نہ گورنمنٹ کو چین سے بیٹھنے دیں[1]۔

اس مضمون میں تفصیل بیان کرتے ہوئے آگے چل کر فرماتے ہیں :

"یوروپین اقوام عموماً اور برٹش حکومت خصوصاً مشرق کی نہایت سخت دشمن ہیں نہ مشرقیوں کو انسان سمجھتی ہیں اور نہ ان کے لیے انسانی اور ملکی حقوق کا استحقاق مانتی ہیں۔ وہ ان کے نزدیک حیوانات یا اس سے بھی بدتر ہیں۔ ہندوستان جیسے برّاعظم پر انگلش قوم نے ۱۶۰۰ء کی ابتداء سے تعلق پیدا کیا۔ اور عرصہ دراز تک تجارتی اشتغالات رکھتے ہوئے رفتہ رفتہ گھن کی طرح سیاسیات اور ہندوستان کی زندگی اور اس کی جملہ ضروریات اور محاصل میں مداخلت کی۔ یہاں تک کہ ۱۷۰۰ء سے ملک گیری شروع کر دی اور ۱۸۳۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو ہر حیثیت سے آدھ موا کر کے باقاعدہ اپنی حکومت کی طرف سے ہندوستان کی حاکم بن گئی اور ۱۸۵۸ء میں برٹش گورنمنٹ کے ایک نہایت زرّیں اور خوبصورت اعلان کے ساتھ بادشاہت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ہم اس

[1] حیات شیخ الاسلام، ص ۱۱۳

وقت نہ تفصیلی واقعات کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس کا موقع اور ضرورت ہے۔ فقط اتنا دکھلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں بھی اسلام کی بیخ کنی اور مشرقی اقوام کی توہین و تذلیل اور ان کے ضعیف و کمزور بنانے کے لیے وہی وحشی اور غیر مہذب حربے استعمال کیے گئے ہیں جو کسی مدعی تہذیب اور خادم انسانیت قوم و شخص کے لیے جائز نہیں۔ باہم حکام و رعایا اور اسی طرح باہم ہندوستان کی بسنے والی اقوام میں افتراق ڈلوایا گیا۔ ایک کو دوسرے پر مسلط کرا کر خانماں اور قوت و شوکت برباد کرائی گئی۔ اپنی جابرانہ حکومت اور سطوت جمائی گئی۔ طرح طرح کی بدعہدیاں عمل میں لائی گئیں۔ غیر واقعی سبز باغ دکھلائے گئے۔ ہندوستانیوں کو آپس میں لڑایا گیا۔ ان کی تجارت اور صنعت کو بند کرنے کی طرح طرح کی کوششیں عمل میں لائی گئیں [1]۔"

اس خطبے میں آگے چل کر قرآن پاک کی آیۃ پیش کی اور اس آیۃ سے اتحاد و اتفاق پر دلیل کی۔

"واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم

دشمنان اسلام کے لیے تم جس قدر بھی قوت اور سواریاں گھوڑوں وغیرہ کی ہو سکے تیار کر لو۔ تاکہ اس کے ذریعہ تم خدا کے اور اپنے دشمنوں کو ڈراتے رہو۔ (انفال)

یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ مسلمانان ہند کے لیے اتحاد ضروری ہے کیوں کہ وہ قوت جس کے ذریعہ ہم دشمن کو ڈرا سکتے ہیں اور اس کے پتھریلے دل و دماغ کو پگھلا سکتے ہیں۔ وہ اہل ہند کے لیے ظاہری حیثیت سے اتحاد ہندو مسلم اور صرف اتحاد ہندو مسلم ہے۔ اس لیے یہ اتحاد مذہبی حیثیت سے جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہوگا [2]۔

پورا خطبہ بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ جس میں ہندوستان کے حالات، انگریزوں کی پالیسیو اور ملک کی حالت زار کا بہت تفصیل سے نقشہ کھینچا گیا تھا۔ مگر پورے خطبہ کی اسپرٹ یہی تھی جو اوپر کے اقتباس میں آگئی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی

---

[1] [2] حیات شیخ الاسلام، ص ۱۰۰

کے لیے مسلمانوں نے کیسی جرأت اور بے جگری سے قاتل کی تلواروں کو چوم چوم لیا ہے اور پھانسی کے پھندوں کو گلے لگا لیا ہے۔ ایک بوریہ نشین درویش ایک بے سروسامان فقیر اور نہتا اور تنہا سپاہی حکومت برطانیہ جیسی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں اعلان کر رہا ہے کہ برطانیہ کی اعانت اور موالات مسلمانوں کے لیے شرعاً حرام ہے۔ اس موالات اور اعانت میں کوئی شرط نہیں ہے۔ چاہے جیسی بھی ہو اگر اعانت ہے تو حرام ہے۔ اور پھر اس حرام سے کوئی مستثنیٰ بھی نہیں ہے۔ کہیں کوئی نرمی یا رو رعایت نہیں ہے کوئی مولوی ہو مولینا ہو تعلقہ دار ہو نواب ہو لیڈر ہو ماہر تعلیم یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کا فاؤنڈر ہو۔ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہر چھوٹے بڑے پر یکساں لاگو ہو گا جو بھی اس کو حلال سمجھے گا وہ قابل مواخذہ ہو گا۔

دو جملوں میں یہ تاریخ بھی یاد دلا دی کہ انگریز فلاں فلاں سنہ میں آئے تھے، اور فلاں فلاں سنہ میں ملک کے بادشاہ بن بیٹھے۔ اور کس کس طرح مسلمانوں اور ہندوستانیوں پر مظالم کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی علاج بھی بتلایا کہ غلامی اور ذلت سے نجات پانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہی نہیں بلکہ فرض بھی ہے۔ یہ زمانہ وہی ہے جب شدھی سنگھٹن کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کمزور پڑ رہا تھا۔ چورا چوری کے مقام پر ہندوستانیوں نے جوش میں آ کر حکومت کے سپاہیوں کو قتل کرایا تھا تو گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی تھی اور عوام کی بڑی دل شکنی ہو رہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں حریت اور جاں بازی کا علم بلند رکھنا کون بتائے کہ کتنا بڑا اور عظیم کارنامہ تھا۔ زمانہ آفتاب پر جا ہے کتنی دھول اُڑائے مگر قدرت کا مسلمہ اصول ہے کہ وقت آتا ہے جب سونا دمک کر اور ہیرا چمک کر ہی رہتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ چاہے بھی تو مسلمانوں کے ان سنہرے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

دارالحدیث سلہٹ کے شیخ الحدیث

۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۸ء

حضرت کی گھر گرہستی، رہنے سہنے اور معاش و معیشت کا اصل انتظام اور اہتمام تو جب کبھی تھا اور جیسا بھی تھا، مدینے ہی میں تھا۔ ہندوستان میں تو جو وقت گزر رہا تھا مسافرت ہی کا تھا۔ اس پر دو سال تک قید اور جیل میں محبوس رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو دو چار ٹکے جمع کیے ہوں گے وہ بھی درہم برہم ہو گئے، کلکتہ کی ملازمت بھی گئی اور معاش کا ظاہری بہانہ بھی ختم ہوا۔ غیر مسلم کارکنان آزادی کے لیے جیل جانا اس اعتبار سے زیادہ مشکل نہ تھا کہ زمانۂ جیل میں قوم اور اس کے افراد و جماعتیں ان کے بال بچوں کو پھولوں کی سیج پر رکھتے تھے اور رہائی کے بعد ان کو ہر قسم کی آسانیاں اور بے فکریاں مہیا کرتے تھے۔ مسلمان ورکرس اور قائدین جیل جاتے تھے تو ان کا گھر بار لٹ جاتا تھا اور چھوٹتے تھے تو خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ جیل سے رہائی کے بعد بڑا مسئلہ حضرت کے سامنے معاش اور روزگار کا تھا۔ مگر سرگرمیاں اور جدوجہد تو ساری، قومی کاموں کے لیے وقف تھیں، ملازمت ملتی تو کیسے اور کہاں ملتی؟ پھر یہ کہ ہر قسم کی ملازمت بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ جو ملازمتیں اس زمانے میں معمولی معمولی آدمیوں کو بڑائی اور شان تک پہنچا دیتی تھیں، نام آوری اور شہرت دلا دیتی تھیں اور مادی اعتبار سے زمین سے آسمان تک پہنچا دیتی تھیں، ان کو تو حضرت حرام اور خارج از ایمان قرار دیتے تھے، اس قسم کی بعض پیش کش ہوئیں بھی جن کے بارے میں بہت سی روایتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک واقعہ تو حضرت ہی کی زبانی بیان کیا جاتا ہے:

"جب میں کراچی جیل سے چھوٹ کر آیا تو بنگال کونسل کے ایک ممبر نے مجھ سے کہا کہ چالیس ہزار روپیہ نقد اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں پانچ سو روپیہ ماہوار کی پروفیسری آپ کے لیے ہے، اس کو منظور فرما لیں۔ میں نے کہا، کام کیا کرنا ہوگا، ممبر صاحب نے کہا

پر کچھ نہیں صرف تحریکات میں خاموش رہیں۔ میں نے کہا حضرت شیخ الہندؒ جس راستے پر مجھے لگا گئے ہیں میں اس سے ہٹ نہیں سکتا۔[1]

راقم الحروف نے ڈھاکہ یونیورسٹی کی پیش کش کا تذکرہ کہیں اور بھی سُنا تھا مگر چالیس ہزار روپیہ نقد اور وہ بھی اُس زمانے میں جب چالیس ہزار روپے آج کے دس بارہ لاکھ کے برابر ہوتے تھے اور تحریکات میں خاموشی کی ایسی صاف صاف شرط اور وہ بھی کونسل کے ایک ذمہ دار کی زبان سے؟ یہ واقعہ کہیں اور سننے میں نہیں آیا۔ یہ بات حضرت کے مزاج کے بھی خلاف تھی کہ اپنے بارے میں کوئی ایسا واقعہ بیان فرماتے جس میں تفوق اور تعلی کا پہلو نکلتا ہو مگر پھر بھی ایسی پیش کش اُس زمانے کے لحاظ سے بالکل قرینِ قیاس ہے۔ سرسیّد کی تحریک سے لے کر انگریزوں کے زمانے کی انتہا تک ایسے ہزاروں مولوی مولینا علماء فضلاء مرشدین و واعظین مدرسین و مصنفین تھے جن کو حکومت برطانیہ نے یونیورسٹیوں، ریاستوں، وظیفوں، خطابوں علی گڑھ، حیدرآباد، انعامات اور ممبریوں کے ناموں سے خرید کر بالکل خاموش اور ساکت وجامد کر دیا تھا۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ۔ حضرت تو اس گروہ کے سردار تھے، راہِ حق کی ننگی تلوار تھے اور ۱۸۵۷ء کی جہادِ آزادی کے تنہا علم بردار تھے ان کو خاموش کرنے کے لیے تو گورنمنٹ منہ مانگی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ ایک روایت یہ بھی نظر سے گذری کہ حکومتِ مصر نے جامعہ ازہر کے شیخ الحدیث کی جگہ پیش کی اور معاوضہ میں ایک ہزار روپیہ (جو آج ۱۹۸۷ء میں ۲۵۔۳۰ ہزار کے برابر تو ہو ہی گا) اعلیٰ درجہ کا مکان اور سواری کے لیے موٹر اور ہر سال مصر سے ہندوستان تک آمدورفت کا کرایہ طے کیا تھا۔[2]

راقم الحروف نے ایسی بھی کسی پیش کش کا تذکرہ کسی اور ذریعے سے نہیں سُنا تاہم مستبعد یہ بھی ہرگز نہیں ہے۔ مصر میں بھی اس زمانے میں حکومت اسی برطانوی سامراج

---

[1] مقالہ مولینا منصور علی سنبھلی بحوالہ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، ص ۳۰۰
[2] ماہنامہ الرشید، مدنی واقبال نمبر، ساہیوال (پاکستان) شمارہ اکتوبر ۱۹۷۸ء

کی تھی۔ مشرق وسطیٰ میں حضرت کی مقبولیت و محبوبیت کے تذکرے پیچھے گذر ہی چکے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ بیشتر عرب ممالک میں اکثر با اختیار اور صاحب عزل و نصب افسران و کارکنان حضرت کے تلامذہ و شاگرد تھے۔ عرب ممالک میں آج بھی ہندوستان کے معمولی درجے کے علماء و فضلا ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ پیش کش ضرور ہوئی ہوگی اور حضرت نے بیک جنبشِ ابرو اس کو مسترد بھی کیا ہوگا مگر ان کی زندگی میں یہ واقعہ اس درجہ کا مستحق اور اہم نہ تھا کہ جس کا تذکرہ کبھی کیا جاتا یا سامنے آتا۔ بہرحال اس باب کا ایک واقعہ تو بالکل مستند اور محقّق ہے۔ قاضی ظہور الحسن صاحب سیوہاروی حضرت کے شاگرد، مرید اور مستفید نہیں تھے۔ فقط علم و فضل کے معترف اور دیانت و تقویٰ کے معتقد تھے۔ اُس زمانے کے حیدر آباد اور وہاں کے با اثر طبقے میں ان کے کچھ تعلقات تھے۔ حضرت پر وہ وقت تنگی ترشی کا تو تھا ہی مزید یہ کہ قرض کا بوجھ سر پر گراں ہو رہا تھا۔ قاضی صاحب مذکور نے کوشش کی کہ نظام حیدر آباد سے کچھ وظیفہ ہو جائے۔ یہ واقعہ انہی کی زبانی بہتر ہے۔

"ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ مولینا (حضرت رحمۃ اللہ علیہ) کچھ مقروض ہیں۔ میں نے حیدر آباد دکن میں نواب فخر یار جنگ معتمد محکمۂ فنانس اور چند با اختیار حکام سے ذکر کیا۔ اور یہ طے پایا کہ مولینا کو یہاں بُلایا جائے۔ اور سر اکبر حیدری وغیرہ وزراء سے ملایا جائے اور پھر اسی طرح تحریک کر کے ہزار پانچسو روپیہ مد خیرات و برات سے دلوایا جائے (ہزار پانچسو کو ایک مرتبہ پھر چالیس ورنہ پچاس سے ضرب دے کر پڑھیے گا) میں نے مولینا کو لکھا۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ مجھے اس ذلت کے ساتھ ایسی رقم کا لینا منظور نہیں ہے[1]۔" خیال رہے کہ حیدر آباد اُس زمانے میں وہ دروازہ تھا جس پر وقت کے بڑے بڑے اور ناک والے علما، مصنفین، ادبا، محققین، شعراء و مقررین کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ خود دیوبند کے متعدد علماء و صلحا، مولینا حافظ احمد صاحب ابن مولینا محمد قاسم صاحبؒ، مولینا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، مولینا اعزاز علی صاحب وغیرہ

---

[1] الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، ص ۲۸۲۔

رحمہم اللہ اس قدر افزائی سے مستفیدین کی فہرست میں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ پیش کش بھی حکومت وقت کے اشارے ہی سے ہوئی ہو۔ ایک مرتبہ راستہ کھل جاتا تو کیسی کیسی شاہانہ راحتیں اور آسائشیں ملتی رہتیں۔ یہ اس وقت کے وظیفہ خواروں کے رہن سہن سے خوب خوب نمایاں تھا، مگر حضرت کے توکل علی اللہ اور قناعت نے اس کا موقع ہی نہ آنے دیا۔

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سب جہاں رکھتے ہیں سر ہم واں قدم رکھتے نہیں

خیر! یہ تو پیش کشیں تھیں جو رد کی جاتی رہیں۔ مگر اسی دوران صوبہ آسام کے ضلع سلہٹ کے معتقدین اور مخلصین نے اصرار شروع کیا کہ وہاں درس حدیث کا آغاز کیا جائے۔ سلہٹ بلکہ آسام کے اس سارے ہی علاقے میں خدا ترسی، دین داری اور پابندیٔ سنت و شریعت کا ذوق بہت عام ہے۔ سلہٹ پورے آسام کا مرکزی مقام تھا۔ یوں تو حضرت کی شہرت پورے ہندوستان میں عام ہو چکی تھی مگر کلکتہ کے قیام کے دوران یہاں معتقدین اور مداحین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کا اصرار روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ خلافت کمیٹی کا کام یہاں بھی کافی زوروں پر رہ چکا تھا۔ یہی کچھی چنگاری اب بھی سلگ رہی تھی؛ انہی لوگوں کا یہ پروگرام اور اصرار تھا۔ کام بھی خدمتِ حدیث کا اور قومی خدمت گذاری کا بلکہ یوں کہیے کہ حضرت کے مشن کے عین موافق و مطابق تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ و استعانت کرکے اور اسی کا نام لے کر ۱۹۲۳ء میں سلہٹ رونق افروز ہو گئے۔ وہاں کی ملازمت، خدمات اور کاموں کی تفصیل حضرت خود ہی بیان کرتے ہیں:

"یہاں پر ایک بڑی جماعت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ ڈھاکہ سلہٹ وغیرہ سے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ سمجھ دار اور ذی استعداد ہیں انھوں نے عربی فنون میں استعداد بڑے درجہ تک حاصل کی ہے۔ بہت سے ان میں انگریزی زبان اور علوم عصریہ سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ان طلبہ کی طرح جو ان اطراف میں جاتے ہیں کند ذہن اور بے سمجھ یا کم شوق اور کم محنت

نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہندو بنگالیوں کی طرح جوڑ توڑ کے ماہر ہیں۔ ان کو مذہبی جوش اور اسلامی خیال اور ہمدردی بڑے پیمانے تک ہے۔ اس جماعت کا مدت سے شوق تھا کہ صحاح ستہ کی تکمیل کسی طرح ہوتی اور اپنے مذہبی فنون میں سے علم حدیث کا حظِ وافر نصیب ہوتا۔ اس غرض سے ان لوگوں نے اس خاص سلسلہ جنبانی کی صورت اختیار کی اور احقر کے پہنچنے پر متعدد اطراف سے جمع ہو ہو کر پہنچ گئے اور پہنچ رہے ہیں ان اطراف میں مسلمانوں کی آبادی بہت کثرت سے ہے۔ بعض بعض اضلاع میں تو ۹۰ فیصدی مسلمان ہیں اور باقی ہندو۔

جب احقر کا ارادہ اس طرف کا ہو رہا تھا تو دوسری جوانب سے علاوہ سابق مکاتبات کے طلب اور حاضری کا اشارہ ہوا۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب اور مولوی طاہر صاحب صاحبزادہ حضرت مہتمم صاحب نے دیوبند کے قیام اور مدرسہ کے تعلق پر بہت زور دیا۔ اور دہلی میرٹھ وغیرہ سے بھی زور دیا گیا مگر مختلف وجوہ سے میں نے یہاں ہی کے قیام کو ترجیح دی۔ قصد مصمم تھا کہ روانگی کے وقت کچھ دیر کے لیے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوں گا مگر طغیانی کے باعث چونکہ لائنیں ٹوٹ گئی تھیں اس لیے کوئی صورت حاضری کی نہ ہو سکی۔ یہاں سے تقاضے تھے۔ خطوط پر خطوط اور تار پر تار چلے آ رہے تھے، اس لیے مع اہلیہ کے یہاں چلا آیا۔ ان لوگوں نے ایک سو پچاس روپے ماہوار علاوہ مکان اور فرش و لوازمات مکان کے مقرر کیے ہیں۔ میں نے ان سے کوئی تقاضا تنخواہ میں کمی زیادتی کے بارے میں نہیں کیا۔ ممکن تھا کہ اگر میں اصرار کرتا تو اس سے زائد بھی دیتے مگر جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں کوئی تغیر کرنا اور دنیاوی طمع کو بڑھانا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ انھوں نے ۱۵ روپے ماہوار پر ایک وسیع مکان جس میں مردانہ و زنانہ حصے علٰحدہ علٰحدہ ہیں دونوں کی تعمیر اور مکانیت پختہ اور عمدہ ہے۔ صحن وسیع اور درخت تالاب ضروریات وغیرہ سب مکمل ہیں پہلے سے لے رکھا تھا۔ غرضکہ خدا کے فضل سے ظاہری آرام کی ہر قسم کی صورتیں مہیا ہیں۔ اسباق شروع کر دیے ہیں۔ ۲۱ ربیع الاول کو میں یہاں پہنچا ہوں۔ پہلے

ضروری معلوم ہوا کہ اصولِ حدیث کی کوئی کتاب پڑھا دی جائے تاکہ اصطلاحات سے ان کو پوری واقفیت ہو جائے چنانچہ گذشتہ جمعہ سے شرح نخبۃ الفکر شروع کرا دی ہے جو کہ تقریباً نصف ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ العزیز کل سے ترمذی شریف بھی شروع ہو جائے گی۔ تقریباً پانچ گھنٹہ روزانہ پڑھائی ہوگی۔ کچھ وقت قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کے لیے بھی خرچ کرنا ہوگا جس کے لیے اصول تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کا رسالہ الفوز الکبیر فی علوم التفسیر نخبۃ الفکر کے بعد شروع کرا دینے کا ارادہ ہے۔ میں اسی کے ساتھ کچھ نہ کچھ حصہ تحریک میں لیتا رہتا ہوں اور تقریریں کرتا رہتا ہوں[۱]۔"

بنگال اور خصوصاً آسام کے اس علاقے میں نہروں، تالابوں اور دریاؤں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ بارشوں اور سیلابوں نے تو اس ملک کو خاص طور پر تاک رکھا ہے۔ وہاں کی زندگی بھی مچھلی پانی اور چاول کی زندگی ہے۔ اس زمانے ۱۹۲۳ء میں روٹی یا گیہوں کا آٹا ڈھونڈھے نہیں ملتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے تک تو بڑی بات تھی، ایک محلہ سے دوسرے محلہ جانا ہو تو بعض اوقات ایک دو ندی نالے پانی میں گھس کر یا بانس کے خانہ ساز پلوں کے ذریعہ پار کرنے پڑتے تھے۔ وہاں کے باشندے کیا بچے کیا بوڑھے عورتیں مرد لڑکے لڑکیاں دن میں دو دو تین تین بار پانی میں غوطے لگاتے رہتے تھے۔ حضرت کے مذکورہ گھر میں بھی تالاب موجود تھا۔ ایسے ماحول میں قیام اور ترجیح صرف اس بنا پر تھی کہ یہاں کے لوگوں کو سچی طلب تھی اور خدمتِ دین کا بہتر موقع تھا۔ حضرت نے سلوک و معرفت تزکیہ و تصوف کی خدمات کا آغاز اور ابتدا تو پہلے ہی کر دی تھی، مدینہ طیبہ میں مالٹا سے واپسی پر اور کراچی سے رہائی پر بعض مخصوصین کی بیعت و تربیت کے واقعات موجود ہیں مگر اہل سلہٹ کے والہانہ تعلق ان کی دینی و مذہبی زندگی اور ان میں مریدین و مجاہدین اور خلفاء کی تعداد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عمومی اور اجتماعی طور پر اصلاح و تزکیہ کی مکمل خدمت کا کام یہیں سے شروع ہوا ہوگا۔

---

[۱] مکتوباتِ شیخ الاسلام، ج ۴، ص ۲۴۵

بہت بعد میں تو راقم الحروف نے خود بھی مشاہدہ کیا ہے۔ صحیح تو یاد نہیں غالباً ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء رہا ہوگا جب مجھے حضرت کی معیت میں تین چار بار سلہٹ جانے کا نادر موقع نصیب ہوا تھا ___ اس زمانے کی بات مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب حیات شیخ الاسلام میں لکھی ہے کہ اس ندی، نالوں، بارش پانی بِلوں اور کشتیوں کی دنیا میں حضرت میلوں سفر کر کے کبھی کبھی پیدل بھی قطع مسافت کر کے اندھیرے اُجالے دن رات گرمی سردی اور بارش پانی کی پروا کیے بغیر وعظ و تبلیغ اور رشد و ہدایت کی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کوئی جلسہ، اجتماع اور پروگرام ہی ہوتا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ شائقین و مخلصین کے اصرار پر شام کو سفر شروع ہوا، رات کو منزلِ مقصود پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بستی صرف ایک ہی گھر پر مشتمل ہے اور حاضرین صرف بیس تیس ہی نفر ہیں، گھر کے چاروں طرف تاحدِ نظر تالاب اور اس میں دھان کے کھیت ہیں، چنانچہ یہ بھی امکان نہیں کہ کچھ اور لوگ آتے ہوں گے مگر حضرت پوری بشاشت، دل جمعی اور انہماک کے ساتھ وعظ فرماتے نصیحت کرتے اور ذکر و شغل کی تلقین فرماتے۔ یہ راقم الحروف کا بھی کئی بار کا مشاہدہ ہے کہ حضرت حدیث رسول، کلام الٰہی اور اصولِ دین بیان کرنے کھڑے ہوتے تھے تو پورے انہماک و اہتمام کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ مجمع دس بیس پچاس کا ہو یا دس بیس ہزار کا، اثر انگیزی اور دل سوزی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

غالب وظیفہ، تو دعا گفتن است و بس

اس موقع پر مزید وضاحت اور استفادہ کے لیے مناسب ہے کہ سلہٹ کے قیام کے دوران لکھے گئے کچھ خطوط پر نظر ڈال لی جائے۔

محترم المقام زیدت عنایاتکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف۔
آپ کا والا نامہ محررہ ۱۲ ر رمضان المبارک۔ ۲۰ ر ذیقعدہ کو جب کہ میں تعطیل سے واپس ہوا، ملا۔ نہایت خوشی ہوئی۔ خوف تھا کہ غالباً آپ تاخیر جوابات

کی وجہ سے خفا ہو گئے ہوں گے اس لیے کوئی والا نامہ نہیں بھیجا۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ مانع نہ تھا۔

محترما! مضامین ضرور یہ بہت ہیں جن کی اشاعت کرنا ضروری ہے۔ نیز ملک میں دورہ کرنا۔ قوم کی تنظیم کرنا۔ ان کو بیدار کرنا نہایت ضروری ہے۔ مگر کیا کیا جائے قحط الرجال ہے۔ قوم مسلم ہر طرح کی کمزوری۔ مادی و روحانی، اخلاقی و جسمانی میں مبتلا ہے۔ اگر ملازمت نہ کی جائے تو پیٹ کس طرح پالا جائے۔ اور اگر ملازمت میں وقت صرف کیا جائے تو قومی کام کس طرح ہو۔ غرضیکہ عجب مخمصہ ہے۔ خداوند کریم ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ انشاء اللہ حسب ارشاد ایک جوڑا کھدر کے کپڑوں کا ڈاک میں ارسال کرتا ہوں۔

آپ میری زندگی کی داستان پوچھتے ہیں۔ مہربان من! میں ایک معمولی طالب علم ہوں۔ میری حالت معلوم کرنے سے کیا فائدہ؟ لائف ان لوگوں کی دیکھی جاتی ہے جن کو زمانہ نے کوئی خاص وقعت دی ہو۔ ان سے مذہب اور قوم کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہوا ہو۔ ہمارے جیسے ہزاروں آئے اور چلے گئے۔ ع

کہ بسیار کس چوں تو پرورد و کشت

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ ثمر نہ سایہ دارم ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را

محض امتثالِ حکم کی غرض سے کچھ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

جہاں تک مجھ کو والدین سے معلوم ہوا ہے۔ نسبی حیثیت سے ہمارے بزرگوں کا تعلق حضرت امام حسین شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ ضلع فیض آباد کے پاس موضع الہداد پور میں ہمارے اسلاف میں سے شاہ نور الحقؒ آباد ہوئے اور کفار کے قلعہ کو جس کے نشانات اب تک موجود ہیں فتح کر کے وہیں بود و باش اختیار کی۔ اسلاف اس زمانہ سے لے کر اب تک اسی قلعہ میں مدفون ہوتے رہے۔ یہ قلعہ کوئی بڑی عمارت نہ تھی بہت چھوٹا قلعہ تھا جس کو گڑھی کہا کرتے تھے۔ ہمارے والد مرحوم سید حبیب اللہ شاہ صاحب تحصیل سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۱۲۹۶ھ ہجری میں بماہ

شوال ۱۹ تاریخ شب سہ شنبہ گیارہ بجے میری پیدائش ہوئی۔ لڑکپن کا وہ زمانہ مجھ کو اچھی طرح
یاد نہیں رکھتا، مجھ پر کھیل رہا تھا کہ والد محترم تبدیل ہو کر گھر ہی میں آ گئے۔ جب مجھ کو ہوش و
حواس آیا تو میں نے اپنے آپ کو وطن مالوف موضع الہداد پور ضلع فیض آباد میں پایا۔
چار برس کی عمر میں مجھ کو احاطۂ تعلیم میں داخل کر دیا گیا۔ والدہ ماجدہ مرحومہ گھر میں قاعدہ
بغدادی اور اس کے بعد پارہ عم وغیرہ پڑھاتی تھیں اور اسی وقت سے اردو اسکول میں جس میں
والد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے اردو کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اسی طرح قرآن شریف
اور فارسی کی تعلیم گھر میں حاصل کرتا تھا، لکھنا پڑھنا، حساب، مساحت، جغرافیہ،
تاریخ، اقلیدس وغیرہ سکول میں پڑھتا تھا۔

میری عمر کا بارہواں سال تھا جب کہ میں سکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہ زمانہ ماہ
صفر ۱۳۰۹ھ کا تھا کہ یکایک والد صاحب مرحوم کو خیال ہوا کہ اس کو عربی تعلیم حاصل کرنے
کے لیے دارالعلوم دیوبند بھیج دینا چاہیے۔ وہاں پہلے سے میرے دو بڑے بھائی تعلیم پاتے
تھے۔ الغرض انھوں نے مجھے وہاں بھیج دیا اور میں نے وہاں پر عربی کی ابتدائی کتابیں شروع
کیں۔ ۱۳۰۹ ہجری سے شعبان ۱۳۱۶ ہجری تک میں وہاں ہی مقیم رہا۔ ایام تعطیل میں یا
دو سال کے بعد والدین مرحوم کی زیارت کو وطن آ جاتا تھا۔ باقی مکمل قیام دارالعلوم دیوبند
ہی میں رہا۔ ساڑھے ستره[1] برس کی تعلیم میں عربی علوم کی درسی کتابیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں کہ والد
صاحب مرحوم کو شوقِ زیارت مدینہ منورہ پیدا ہوا۔ آبائی زمین کو فروخت کر کے مصارف راہ
حرمین شریفین مہیا کیا۔ اور ارادہ کر لیا کہ شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانہ ہو جائیں۔ ہم پانچ
بھائی تھے جن میں تین متاہل تھے۔ والدین مرحومین اور ایک بہن اور ایک بھتیجا یہ بارہ
آدمیوں کا خاندان یہاں سے روانہ ہوا۔ پلیگ کی وجہ سے بمبئی کی بندرگاہ بند تھی اس
لیے فقط چاٹگام کی اجازت تھی چونکہ ہم اودھ کے رہنے والے تھے۔

اور ہم کو چاٹ گام میں بانتظار آگبوٹ حاجی ریزرویشن کیمپ میں تقریباً ایک
ماہ رہنا پڑا۔ شوال ۱۳۱۶ھ میں جہاز روانہ ہو کر ایک ماہ سے کچھ زائد میں جدہ پہنچا۔
دیوبند سے روانگی سے پہلے حضرت قطب العالم عارف باللہ مولانا رشید احمد صاحب

[1] اصل ماخذ میں "ساڑھے سات" غالباً سہواً لکھا گیا ہے۔

قدس اللہ اسرارہم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر طریقہ چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ میں بیعت ہوا مگر مولینا نے کچھ تلقین نہ فرمائی۔ بلکہ ارشاد کیا کہ چونکہ تو مکہ مکرمہ میں جا رہا ہے۔ وہاں حضرت مرشد العالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (جو کہ مولانا صاحب کے پیر و مرشد تھے) موجود ہیں ان سے تعلیم حاصل کر لینا۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ہجرت کی نیت نہ کرنا۔ تم کو وہاں سے واپس ہونا پڑے تو گنہ گاری کی نوبت نہ آئے۔ اور اسی قسم کی تاکید حضرت حاجی صاحبؒ موصوف نے مکہ معظمہ میں فرمائی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں میں سے سوائے والد صاحب مرحوم کے کسی نے نیتِ ہجرت نہیں کی۔ آپ اس سے بخوبی معلوم کر سکیں گے کہ جو لوگ میرے نام پر "مہاجر مدنی" لکھتے اور پڑھتے ہیں وہ غلط لکھتے ہیں۔ میں نے بارہا اس پر تنبیہ کی مگر لوگ نہیں مانتے۔ مکہ معظمہ میں ذیقعدہ کے وسط میں پہنچ کر بعد از طواف و سعی حضرت مرشد عالم حاجی صاحبؒ موصوف کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا اور پھر ہمیشہ خدمتِ اقدس میں حاضری کی نوبت آتی رہی۔ نہایت شفقت اور عنایت سے بندہ نوازی فرماتے رہے اور تعلیم سلوک بھی فرمائی۔ اور آخر ذوالحجہ میں ادائے حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ کو روانگی ہوئی۔ اور اوائل ۱۳۱۷ھ میں وہاں پہنچ گئے۔ سال بھر کے لیے مکان کرایہ پر کر لیا گیا اور والد صاحب نے جو کچھ نقد بعدِ مصارفِ سفر بچ گیا تھا حسبِ حصصِ شریعت ہم سبھوں میں تقسیم کر دیا اور فرمایا کہ میں تو یہاں رہنے اور یہیں مرنے کی نیت سے آیا ہوں۔

تم لوگوں کو اختیار ہے خواہ یہاں رہو خواہ ہندوستان چلے جاؤ۔ واپسی کے لیے یہ خرچ تمہارے لیے موجود ہے۔ ہم سبھوں نے وہاں کی اقامت کو ترجیح دی۔ وہاں پر ہم نے موجودہ سرمایہ سے دوکان کی اور مختلف وجوہ سے ناکام رہے۔ بالآخر میں نے اُجرت پر کتابت شروع کی۔ اور درس و تدریس کی بھی بنیاد ڈالی۔ چند ماہ کے بعد مکہ معظمہ میں حضرت مرشد عالم حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا وصال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم کے متعلق سلوک بھی شروع کیا۔ اور عرض داشتیں مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہم کی خدمت میں ارسال کرتا رہا۔ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ میں حسبِ ارشاد مولانا رحمۃ اللہ علیہ

تکمیل سلوک کی غرض سے بہ ہمراہی بڑے بھائی صاحب ہندوستان روانہ ہوا۔ اور حج سے فارغ ہو کر بادبانی جہازوں کے ذریعہ سے نکلا اور مسقط ہوتے ہوئے ماہ ربیع اول ۱۳۱۹ھ میں براہ کراچی گنگوہ شریف پہنچا اور وہاں سلوک طریقت کرتا رہا۔ حسب اجازت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز کچھ عرصہ قیام کر کے رمضان ۱۳۱۹ھ میں براہ پوربندر ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۹ھ میں مکہ معظمہ پہنچا اور حج سے فارغ ہو کر محرم ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچا۔ وہاں اولاً سات سال متواتر مقیم رہا۔ علمی مشاغل کے سوا اور کوئی مشغلہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ حرم محترم نبویؐ میں علوم عربیہ (حدیث، تفسیر وغیرہ) کی تدریس دیتا رہا۔ ۱۳۲۶ھ میں میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب مرحوم کی یہ رائے ہوئی کہ چونکہ ہماری آمدنی بہت کم ہے اور یہاں کی عورتوں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے تجھ کو ہندوستان جا کر اپنے رشتہ داروں میں نکاحِ ثانی کرنا چاہیے۔ حسب ارشاد ماہ ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ کی آخری تاریخوں میں وہاں سے روانہ ہو کر حج کرتا ہوا ۱۳۲۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند پہنچا۔ اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے یہاں دوبارہ حدیث شریف پڑھنا شروع کیا جس کی مدتوں سے آرزو تھی۔ اسی سال میری شادی بھی ہوئی اور پھر تین سال دیوبند میں مقیم رہا۔ حدیث شریف کی وہ کتابیں جو کہ مولانا مرحوم کے یہاں ہوتی تھیں ختم کرنے کے بعد مدرسہ میں تدریس حدیث وتفسیر کے لیے ملازم ہو گیا۔ حضرت والد صاحب مرحوم کے تقاضہ کی بناء پر شوال ۱۳۲۹ھ میں مدینہ منورہ کو براہ پورٹ سعید، حیفہ، حجاز ریلوے کے ذریعہ سے روانہ ہوا۔ اور ذی قعدہ سنہ مذکور میں وہاں پہنچا۔ اور دو سال یعنی ۱۳۳۰ھ اور ۱۳۳۱ھ وہاں مقیم رہا۔ (چونکہ یہاں شادی میں شرط یہ تھی کہ دو برس کے بعد اہل وعیال کو ہندوستان ایک مرتبہ لانا ہوگا) ۱۳۳۲ھ ماہ صفر میں براہ حجاز ریلوے حیفہ اور پورٹ سعید ہوتا ہوا، معہ اہلیہ بمبئی پہنچا۔ اور دیوبند وغیرہ میں چند دن قیام کر کے اسی سال ماہ ذی قعدہ یا شوال میں معہ اہلیہ حجاز روانہ ہو گیا۔ اور ابتدا ۱۳۳۳ھ میں مدینہ منورہ پہنچا۔ رمضان ۱۳۳۲ھ میں جنگ عمومی کا آغاز ہو گیا تھا مگر ٹرکی ذوالحجہ ۱۳۳۲ھ میں شامل ہوا۔ مدینہ منورہ میں حسب معمول

مشاغل تدریسیہ میں شامل رہا۔

حضرت استاذ علامہ مولانا شیخ الہندؒ ۳۳ھ میں بقصد حج و زیارت مکہ معظمہ تشریف لائے اور وہاں سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ پہنچے اور غریب خانہ پر فروکش ہوئے اور چند ماہ کے بعد ماہ جمادی الاولیٰ یا جمادی الثانیہ سنہ مذکورہ میں مکہ معظمہ میں اور پھر طائف تشریف فرما ہوئے۔ میرا اس سفر میں مولانا مذکورہ کی خدمت میں حاضر رہنا ضروری تھا اس لیے حاضر رہ کر وظیفہ خدمت گزاری ادا کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس سفر کی حالت اور جو کچھ طائف، مکہ معظمہ، جدہ، مصر، مالٹا وغیرہ میں گزرا مفصلاً "سفر نامہ اسیر مالٹا" میں مذکور ہے (مدینہ اخبار میں اس کا اشتہار طبع ہوا کرتا ہے اگر یہ رسالہ نظر سے نہ گزرا ہو تو منگا کر دیکھ لیجیے)۔ مالٹا سے واپسی پر تحریکات حاضرہ میں حصہ لیتے ہوئے کچھ دنوں مدرسہ عربیہ اسلامیہ امروہہ میں بوظیفہ صدر مدرسی کار تدریس انجام دینا پڑا۔ اور پھر حسب ارشاد حضرت شیخ الہندؒ کلکتہ کے مدرسہ واقعہ ناخدا مسجد میں جو کہ ان دنوں قائم کیا گیا تھا۔ چند دنوں بعہدہ پرنسپل کام کرتا رہا اور حسب شروط ملازمت چند ماہ وہاں کار تدریس سرانجام دے کر پھر تحریک میں سرگرمی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اسی عرصہ میں کراچی کا مقدمہ پیش آیا۔ دو برس کراچی اور سابرمتی جیل میں رہ کر پھر تقریباً ایک سال تحریک حاضرہ میں حصہ لیتا رہا، مگر ہندو مسلم اختلاف کی وجہ سے کامیابی کی کوئی صورت مفید نہ دیکھ کر سلہٹ میں دو سال کے لیے تدریس حدیث کی غرض سے ملازمت اختیار کر لی۔ بظاہر یہاں شعبان تک قیام ضروری ہے۔ آئندہ خدا جانے۔

یہ ہے ایک ناکارہ اور نالائق کی مختصر سی سرگزشت۔ جس سے کوئی فائدہ اور نتیجہ نہیں۔ اب اپنے سوالات کے جوابات سنیے:

ابن سعود اور اس کی جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حنبلی مذہب ہیں بمثل شوافع اور احناف کے ہم عقائد میں اسلاف اور ائمہ اہل سنت کے تابع ہیں۔ اور فروع میں امام احمد بن حنبلؒ کے تابع ہیں۔ وہاں کوئی خاص مذہب نہیں ہے۔ میری نظر سے چند رسالے یہاں گزرے ہیں جن میں بہت سی بحثیں میں نے دیکھی ہیں مگر تمام رسالوں کو

اور ان کے تمام حصوں کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری طرف جو جو باتیں خلافِ عقیدۂ اہلِ سنت والجماعت نسبت کی جاتی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ ہم جملہ امور میں طریق اہلِ سنت والجماعت کے پابند ہیں۔ البتہ بعض جزئیات میں ہم مخالفت کرتے ہیں۔ جن کے لیے ہمارے پاس کتاب وسنت اور اقوالِ فقہاء سے دلیلیں موجود ہیں۔ پوری تفصیل ان کے احوال کی وفدِ خلافت اور وفدِ جمعیۃ علماء کی واپسی پر معلوم ہوگی۔ اس لیے ہم کو انتظار کرنا ضروری ہے۔ ہمارے علم میں ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں آئی جس کی وجہ سے ابن سعود اور اس کے متبعین کی تکفیر کی جاسکے۔ اور نہ ہم کو کسی طریقہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت اور آپ کے نبی آخر الزماں ہونے کے منکر ہیں۔ بلکہ ان کے رسالوں سے اس کا اقرار معلوم ہوتا ہے۔ تکفیر اور لعنت کرنے والا خود کافر اور ملعون ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شخصِ مکفر واقع میں مستحقِ تکفیر ولعن نہ ہو۔ اس لیے اس پر جرأت کرنا نہایت بے عقلی کی بات ہے۔ جب تک ابن سعود خلافِ شریعت حکم نہیں کرتا اہلِ عرب کو اس کی اعانت کرنا ضروری ہے۔ اور اگر خلافِ شریعت حکم کرے تو ایسے وقت میں کسی کی بھی اطاعت ضروری نہیں۔

ساؤتھ افریقہ گورنمنٹ کی چیرہ دستیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ مگر یہ سب ہندوستان کی غلامی کا خمیازہ ہے۔ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائے ہر جگہ ہندوستانی حقارت اور ذلت ہی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ افسوس کہ ہندو قوم اور اس کے لیڈروں کو ذرا بھی احساس نہیں انھو نے اپنی دل تنگی اور بے عقلی سے تحریک آزادی ہند میں وہ رکاوٹیں پیدا کردی ہیں کہ اب عرصہ تک کے لیے آزادی ہند کا مسئلہ متاخر ہوگیا اور اگر یہی لیل ونہار رہے تو تمام ہندوستان روزانہ برباد ہوتا رہے گا۔ اور کوئی صورت خلاصی کی میسر نہیں ہوگی مسلمانوں نے ہندو قوم کی چیرہ دستیوں اور بے انصافانہ کارروائیوں پر برابر تین برس صبر کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ مگر اب مجبور ہیں کہ مدافعت کے لیے قدم اٹھائیں اور ترکی بترکی جواب دیں۔ گورنمنٹ خوشیاں منا رہی ہے۔ دونوں فریقوں کو کم وبیش جیل خانہ اذ

پھانسی پر لٹکا رہی ہے۔ مگر یہ ناعاقبت اندیش فرقہ وارانہ اختلاف اور غیر مفید جھگڑوں میں روزانہ قدم بڑھائے جارہے ہیں۔ اور ارادہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے بالکل ناپید کر دیا جائے، مسلمانوں کا خدا ان کا محافظ ہے۔ دشمن اگر قوی ست مہربان قوی تراست۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت چکّی کے پاٹ میں ہیں۔ ادھر گورنمنٹ ان کو ہر طرح پیس رہی ہے۔ ادھر ابنائے وطن، ہندو قوم ان کی جان و عزت، مال و مذہب سبھی کے دشمن بنے ہوئے جتھا بندی اور اجتماعی قوت کے ساتھ ہر قسم کی کارروائی کر رہی ہے۔ اور گوریلا وار کے طریقہ پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ عہدوں، مال اور قانون کے ذریعہ سے کورٹ میں بھی نقصان پہنچا رکھا ہے۔ شدھی اور سنگھٹن کے ذریعہ ہر قسم کا حملہ ہو رہا ہے۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی دستگیری فرمائے۔ واقفین اور پرسان حال سے سلام مسنون فرمادیں۔

حسین احمد غفرلہٗ

از خلافت آفس دار الحدیث

۲۷ رذی قعدہ ۱۳۴۴ھ (۸ر جون ۱۹۲۶ء)[1]

آپ نے یہ خط ملاحظہ فرمایا۔ اس موقع پر چند حقائق ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ تمام عمر قومی، ملکی اور دینی خدمات کے لیے وقف رہنے کے باوجود حضرت کبھی رزق حلال کے اسباب اور معاش کے ظاہری وسیلہ سے مستغنی نہیں رہے۔ اپنے مختصر حالات اس خط میں بھی اور خود نوشت سوانح میں بھی جیسے اور جس قدر لکھے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ ایک عام اور معمولی شخص کے حالات بھی اس سے کہیں زیادہ ہوں گے جو آپ نے اپنے حالات کے عنوان سے تحریر فرمائے ہیں اور وہ بھی امتثالاً للامر اور احباب و مخلصین کے اصرار سے مجبور ہی ہو کر لکھے ہیں۔ ورنہ اپنے بارے میں کبھی ایک لفظ اور ایک جملہ بھی کہنا پسند نہیں کیا۔ اصل میں اپنی ہستی کو کبھی قابلِ ذکر سمجھا ہی نہیں۔ ہندو مسلم اختلافات خصوصاً

---

[1] ماہنامہ الرشید، مدنی و اقبال نمبر، ساہیوال پاکستان، ص ۳۲۴

ہندو قوم کی دل تنگی، بے عقلی اور مسلم کشی سے حضرت بھی اُسی طرح دل گرفتہ و جگر سوختہ ہیں جیسے مسلم فرقہ پرست دعویٰ داران تھے مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ اتحاد کی کوششوں سے ناامید ہوجاتے، ہندو دشمنی پر آمادہ ہوجاتے یا فرقہ پرستی کی پالیسی اختیار کرلیتے۔
حجاز مقدس کی بے امنی، طوائف الملوکی اور قتل و غارت گری سے مجبور ہوکر جب مرحوم ملک عبدالعزیز آل سعود نے وہاں امن و استقرار اور حرمین شریفین میں اتحاد و استحکام قائم کیا تو ہندوستان کے بہت سے علماء ومخصوصین نے ان کی مخالفت، تنقید و تنقیص میں آوازیں اٹھائیں۔ مگر حضرت چونکہ وہاں رہ چکے تھے اور کسی درجے میں وہیں کے باشندے ہوچکے تھے اس لیے علی وجہ البصیرت ملک عبدالعزیز کی قدر و منزلت کا اعتراف کرتے ہیں اور اہلِ عرب کے لیے ان کی اعانت ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس خط میں شدھی اور سنگھٹن کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ تحریکیں ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے حکومتِ برطانیہ کی کارگر سکیمیں تھیں مگر اچھے اچھے ہندو لیڈر جو صاف دل و دماغ رکھنے والے مشہور تھے ان میں شریک ہوگئے تھے۔ مجبوراً جمعیۃ علماء اور دیوبند کو ان کے استیصال کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔ حضرت نے ان کی مخالفت میں ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ آپ کے ایک سفر کا حال مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے لکھا ہے۔

"جمیعۃ علماء اور اکابر دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگون کے صاحبِ خیر تاجروں نے اس (شدھی سنگھٹن کے) سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ بنایا۔ اور جمیعۃ علماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی۔ اُس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک حصّہ تھا۔ غالباً ۲۳ء یا ۲۴ء میں یہ وفد رنگون پہنچا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمیعۃ اس وفد کے ارکان تھے۔ مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب بھی وفد کے ساتھ تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ بہر حال یہ تینوں رنگون پہنچے تو وہاں کے انگریز گورنر یا کسی ماتحت حاکم نے ان سورتی تاجروں سے کہا کہ ان میں

مولانا حسین احمد صاحب بہت خطرناک اور حکومت برطانیہ کے خلاف ہیں۔ ان کو ہم یہاں تقریر کی اجازت نہیں دے سکتے۔ بہت اصرار کے بعد اس نے آخر اجازت دی کہ تقریر ہو جائے مگر شرط یہ ہے کہ گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہا جائے۔ ان حضرات نے یہ ذمہ داری لے بھی لی۔ اس کے بعد مولانا مدظلہم نے تفصیل بیان کی ہے کہ حضرت نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ اور سرے سے تقریر ہی پر تیار نہیں ہوئے مگر عوام کا بیحد اصرار آپ کے مواعظ اور تقریر سننے پر تھا، اس لیے آپ آمادہ ہو گئے اور دوران تقریر فرمایا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا ہے اور وہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر بھی آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے ان کے وعدے کا افسوس ہے مگر اب بہرحال مجھے اس کی لاج رکھنی ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ سے مجھے کیا شکایت ہے اور گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہندوستان کو اور ہندوستانیوں کو کس قدر تباہ و برباد کیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر یہ وعدہ نہ کرتے تو میں یہ بتاتا اور یہ سناتا مگر چونکہ ہمارے میزبان نے گورنر صاحب سے وعدہ کر لیا ہے اس لیے مجبوراً میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا۔"[1]

سلہٹ ہی سے لکھا ہوا ایک اور خط بھی اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس سے اس وقت کی سرگرمیوں، مشغولیتوں اور ملک کے مختلف بلکہ دور دراز مقامات کے پے در پے اسفار کا تذکرہ ہے۔ گویا عمر کے آخری حصے اور بیاسی برس کی عمر میں دوروں اور اسفار کی جو کثرت تھی اس کا سلسلہ اسی وقت سے اور چالیس بیالیس ہی برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ اس خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تمام مشاغل اور ساری ہی عدیم الفرصتی اور سرگرمیوں کے باوجود درس حدیث اور کارہائے مفوضہ میں کوئی کمزوری یا کوتاہی نہیں ہو رہی ہے۔

---

[1] ماہنامہ الفرقان [illegible] ماہ جنوری ۱۹۵۸ء

افسوس کہ ان خطوط کے مکتوب الیہم کا پتہ نہیں ہے کہ ان کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی۔

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘۔ مزاج مبارک

جناب کا والانامہ محررہ ۲۱ر دسمبر یہاں ۱۱ر جنوری کو پہنچا۔ میں ۱۳ر دسمبر سے یہاں سے روانہ ہو گیا تھا کیونکہ بلگام میں خلافت کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا۔ اس میں شرکت کے لیے مرکز ہی سے دعوت آئی تھی اور ضروری قرار دیا گیا تھا۔ راستے میں چند مقامات پر ضروری کاروبار تھے۔ غرضیکہ ۲۳ر دسمبر کو بمبئی ہوتا ہوا بلگام پہنچا۔ وہاں پر اجلاس ختم ہونے سے پہلے سالانہ اجلاس جمعیت علماء منعقدہ مرادآباد کی شرکت کے لیے مجبور کیا گیا۔ جو کہ ۱۱ر جنوری کو شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے پیارم پلیٹ۔ مدراس۔ بمبئی۔ سورت وغیرہ ہوتا ہوا مرادآباد پہنچا۔ وہاں سے فارغ ہو کر نواکھالی کے جلسوں میں شرکت کرتا ہوا ۲۵ر جنوری کو سلہٹ آیا تو جناب کا والانامہ ملا۔ علاوہ اس کے ستو یا اس سے زائد اور خطوط تھے جو کہ اس ڈیڑھ ماہ کی مدت میں جمع ہو گئے تھے۔ ان سبھوں کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ادھر تعلیمی سلسلہ جس کے لیے یہاں قیام ہے اس کو بھی انجام دینا ضروری ہے۔ بقیہ اوقات میں جواب لکھتا ہوں۔

محترما! اہل سلہٹ تقریباً ڈیڑھ سال سے زور دے رہے تھے کہ "صوبہ آسام اور بنگال میں باوجود دیگر مسلمانوں کی مردم شماری تقریباً تین کروڑ ہے۔ مگر تعلیمی حالت مسلمانوں کی بہت گری ہوئی ہے۔ مذہبی تعلیم میں بھی یہاں کے مسلمان بہت کمزور ہیں۔ خصوصاً علمِ حدیث کا چرچا اور واقفیت تو بے حد کمزور ہے۔ اس لیے تجھ کو لازم ہے کہ تو یہاں آکر کچھ دنوں قیام کر اور ایک دفعہ صحاح ستہ کی پوری تعلیم دے۔ پھر یہاں حدیث ہم جاری کر لیں گے۔ اگر تیرا آنا ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے ماہر فن کو منتخب کر۔

میں احمد آباد جیل سے باہر آنے پر تحریک کی کمزوری کی بناء پر اس میں مشغول تھا۔ مجھ کو فرصت نہ تھی میں اس مدت تک اس کو ٹلایا۔ بہت تلاش کیا مگر کوئی دوسرا شخص

بھی نہ ملا۔ آخر کار مجبور ہو کر دو سال کے وعدہ پر ماہِ اکتوبر سنہ حال کی ۲۰ تاریخ کو یہاں آگیا۔ خود دیوبند۔ دہلی وغیرہ کو اصرار تھا کہ وہاں قیام کیا جائے مگر اس وقت ضرورت قومی اہمیت دینا مناسب جان کر یہاں آیا تھا۔ اور اگر منظورِ الٰہی ہے تو اس وقت یہاں قیام کروں گا۔ تقریباً پانچ گھنٹہ روزانہ علم حدیث کا درس دیتا ہوں۔ باقی اوقات میں ضروریاتِ ذاتیہ۔ خطوط۔ ضروریاتِ دینیہ پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ابھی تک موجودہ خطوط کے جوابات سے فراغت نہیں ہوئی۔ اس لیے جناب کے والانامہ کا جواب نہ لکھ سکا۔ روزانہ تین چار۔ اور کبھی اس سے زیادہ خطوط آتے رہتے ہیں۔ ان کے جوابات کی وجہ سے نہایت ہی زیادہ عدیم الفرصتی رہتی ہے۔ مختلف خطوط میں مضامین یا فتوے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت رہتی ہے۔ حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ لوگوں سے نہ ملوں تاکہ ضروری کاروبار کو انجام دے سکوں۔ مگر اگر کوئی بمقتضائے محبت و عنایت آجاتا ہے تو وقت کا خون ہو جاتا ہے۔ عالی جناب نے جو امر مضمون کی نسبت تحریر فرمایا ہے اس کی اس قدر تفصیل ہے کہ بہت زیادہ وسعت ملنے پر اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ بہر حال میرا پختہ ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ فرصت ملنے پر میں اس کو اپنی طاقت اور قابلیت کے موافق قلم بند کروں گا۔ البتہ بالفعل اس قدر کار کی کثرت ہو گئی ہے کہ تاخیر ہوتے میں مجبوری ہے۔

محترما! دوسرے حضرات جن کے نام نامی آپ نے تحریر فرمائے ہیں ان بزرگوں کی بھی یہی حالت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ ملکی اور مذہبی ضروریات انجام دینا فقط معدودے چند ہستیوں کے ذمہ ہو گیا ہے۔ جن کو آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ حکومت ایسے لوگوں کی ضروریات پر متوجہ نہیں، بلکہ ان کی ضرر رسانی پر تلی ہوئی ہے۔ قوم خود ہی نہایت درجہ افلاس اور کمزوری میں ہے۔ اور پھر اس حالت میں وہ اپنی ہمت سے زیادہ قومی کاروبار کر رہی ہے۔ اس لیے بے چارے اپنی معاشی افکار میں مبتلا رہتے ہیں۔ شکایت کس طرح کی جائے۔ قوم کو بیدار کرنے کے طریقے بھی پوری طرح یقین

نہیں کیے جا سکتے۔

آنجناب کا پارسل بھی تین چار روز ہوئے، پہنچا۔ مجھ کو سخت محجوبیت ہے۔ میں خود منع کرنے والا تھا کہ وہ یہاں آ دھمکا۔ دیکھیے ایک معمولی قیمت کی چیز پر آپ نے فقط ڈاک خانے کے محصول میں ۱۲ر سے زیادہ خرچ کر ڈالا۔ اور ادھر مجھ کو بیرونی پارسل ہونے کی وجہ سے ۱۱ر دینا پڑا۔ اشیاء محمولہ اگرچہ معنوی حیثیت سے بہت زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔ مگر ظاہری حیثیت تو اس قدر نہیں رکھتیں کہ اس قدر انگریزوں کو نفع پہنچایا جاتا۔ بہر حال میں جناب کی اس عنایت کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ آئندہ کبھی ایسا خیال نہ فرمائیں۔ خدماتِ لائقہ سے مشرف فرماتے رہیں۔ میں ذرا سہولت و فرصت ہو جائے تو مضمون لکھنا شروع کروں گا انشاء اللہ! زیادہ بجز سلام مسنون۔ اور کیا عرض کروں۔ معزز اور محترم مسلمان بھائیوں کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔

فقط والسلام

حسین احمد غفرلہٗ

از سلہٹ خلافت آفس مورخہ ۱۴ر رجب ۱۳۴۴ھ

ایک تیسرا خط بھی دیکھتے چلیے۔ بعض حضرات کو یہ خیال تھا کہ حضرت نے اپنی زندگی میں تصنیف و تالیف کے لیے کچھ وقت نہیں دیا۔ اس کی وجہ حضرت ہی کی زبانی اس خط میں سُن لیجیے۔ ایک تذکرہ اس خط میں جزیرۃ العرب کی تقدیس و تطہیر کی احادیث کا ہے۔ اس موضوع سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت کی جمع کردہ یہ احادیث ماہنامہ الرشید مدنی و اقبال نمبر شائع کردہ مدرسہ رشیدیہ ساہیوال (پاکستان) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اس میں خاص بات حضرت کے وطنیت اور اسلامیت کے جذبے کی ہے۔ سو وہ صرف اسلامیت ہی کا یا وطنیت ہی کا نہیں بلکہ ملک و ملت دونوں کا ہے۔ اور اسی سلسلے میں سودیشی اور ملکی مصنوعات کی پابندی کا التزام ہے۔ یہ کوئی چلتی پھرتی بات نہیں ہے بلکہ وہی معاشی اور اقتصادی پالیسی ہے جس پر آج دنیا کے

بہت سے ملکوں کے اقتصادی ڈھانچہ کی تعمیر ہے۔ جن ملکوں کا کوئی معاشی نقشہ نہیں ہے، ان کے یہاں یہ اہتمام نہ پہلے تھا نہ اب ہے

محترم المقام زید عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج مبارک

کل آپ کا دوسرا کارڈ باعث سرفرازی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پہلے سے اس ارادہ میں تھا کہ جن مضامین کا جناب مطالعہ فرمارہے ہیں۔ ان کی نسبت کچھ لکھوں مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فرصت بالکل نہیں ملتی۔ اس وقت میرے سامنے میز پر تقریباً سو سے زائد خطوط، کارڈ اور لفافے پڑے ہوئے ہیں، جن کا جواب دینا ضروری ہے۔ کئی کئی مہینے گزر گئے جواب نہ دے سکا۔ روزانہ پانچ سات خطوط آتے رہتے ہیں۔ مضامین کے لکھنے کے مطالبے علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں بصیغہ تدریس قومی ملازم ہوں اس لیے تقریباً چار گھنٹہ روزانہ تدریس میں صرف کرنا ضروری ہے۔ پھر عربی اور خصوصاً علمِ حدیث کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں، دوسرے فنون وعلوم کی طرح نہیں کہ پروفیسر کو مطالعہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں تو کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹہ مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے طلبہ کے بھی خارجی اسباق ہیں۔ لوگ ملاقات کے لیے آکر روزانہ کچھ نہ کچھ وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے شخصی اشغال ضروریہ ہیں جن کی وجہ سے دو چار خطوں کا روزانہ لکھنا بھی دشوار ہوگیا ہے۔

آپ کا پارسل نامعلوم کس وجہ سے بیرنگ ہوگیا تھا۔ ڈاک والوں نے کہا کہ ممالک خارجہ سے آیا ہے۔ اس پر اس قدر ڈیوٹی زائد ہے۔ اس لیے انھوں نے اس پر گیارہ آنے یا اس سے کچھ کم یا زیادہ لیے تھے۔ معنوی حیثیت سے تو وہ بہت بیش قیمت تھا کہ اس میں خاکِ شفا اور دوسرے تبرکات تھے۔ مگر ظاہری حیثیت سے وہ اتنی قیمت نہ رکھتا تھا جتنی آپ نے ٹکٹوں پر اور میں نے ٹیکس پر خرچ کیا۔ میں نے

انھیں دنوں ایک عریضہ آپ کی خدمت میں پارسل بھیجنے، اور یہ کہ میں انشاء اللہ تو جب فرصت مضمون لکھنے کا قصد کروں گا۔ اس کی اطلاع کرنے کے لیے لکھا تھا مگر غلطی یہ ہوئی کہ ان لفافوں میں چند لفافے انگریزی پتہ لکھے ہوئے موجود تھے۔ میں انگریزی نہیں جانتا میں نے سمجھا کہ یہ پتے آپ کے یہاں کے لکھے ہوئے ہیں کسی دوسرے سے پڑھوایا بھی نہیں۔ اس میں سے ایک لفافہ لیکر اس میں خط رکھ کر بھیج دیا۔ اور تین مہینوں کے بعد وہ واپس آیا کہ مکتوب الیہ نہیں ملتا۔ مزید اطمینان کے لیے وہ بھی منسلک ہے۔

میں نے کتابوں سے احادیث متعلقہ ارض عرب کہ "وہاں یہود و نصاریٰ و غیر مسلم اقوام کو رہنے نہ دیا جائے" نکالیں اور ان کا ترجمہ کر کے فقط آپ کے لیے رکھا تھا۔ اور خیال قوی تھا کہ آیات وغیرہ لیتے ہوئے متعلقہ جزیرۃ العرب ایک مفصل مضمون لکھوں گا افسوس اور صد افسوس کہ باوجود کثرت اشتیاق اور حضور مضمون آج تک اتنی فرصت نہ مل سکی کہ اس کو قلم بند کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریر و تقریر کے ساتھ تدریس نہیں ہو سکتی مگر ہم اگر تدریس نہ کریں تو پھر دفع احتیاج و ضرورت کی کیا صورت ہو۔ اگر تدریس کے لیے قلیل وقت خرچ کیا جائے تو وہ اپنی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ آج میں اس امر سے مایوس ہو کر کہ مجھ کو مضمون لکھنے کی فرصت مل سکے گی۔ آپ کو احادیث متعلقہ جزیرۃ العرب بھیج رہا ہوں۔ اگر زندگی باقی ہوئی اور خدا کو منظور ہوا اور آپ کو ضرورت بھی محسوس ہوئی تو مضمون بھی لکھوں گا۔ ورنہ میری مجبوری ظاہر ہے۔ مجھ کو آپ کے سامنے شرمندگی بھی زیادہ ہے۔ مگر خداوند کریم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔" میں بصد ادب آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر آئندہ کسی پارسل وغیرہ کے ارسال کا قصد نہ فرمائیں۔ میں حتی الوسع غیر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ البتہ جو چیزیں ہندوستان میں تیار نہ ہو سکتی ہوں اور ان کی ضرورت بھی ہو۔ ان کو بقصد حاجت استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس سوائے گھڑی، عینک اور فاؤنٹین پن کے اور کوئی چیز غیر وطنی نہیں۔ فونٹین پن بھی سوائے سفر، دوسرے اوقات میں استعمال نہیں کرتا۔

آپ کے مرسل کا غذات وغیرہ غیر وطنی تھے۔ مجھ کو اسلامیت اور وطنیت کا سودا

سخت ہے۔ میں زیادہ ضروری سمجھ رہا ہوں کہ مسلمان اور اہل ہند کھدر کا استعمال کریں اور ولایتی چیزوں سے حتی الوسع گریز کریں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی خصوصاً مسلمان اس امر میں نہایت بزدل واقع ہوئے ہیں۔ آپ ایک دور دراز ملک میں ہیں۔ آپ کی اور ہماری حالت میں فرق ہے۔ خداوند کریم جلد وہ دن لائے کہ "وطن آزاد ہو۔ اسلام کا علم چاروں طرف لہراتا ہو اور صلیب سرنگوں ہو۔" خداوند کریم آپ کے اور ہمارے مقاصد بر لائے۔ آمین۔ والسلام!

حسین احمد غفرلہٗ

از سلہٹ خلافت آفس دارالحدیث ۵ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

سلہٹ کے قیام کی یہ مختصر مدت ۱۹۲۸ء میں ختم ہوگئی۔ یہاں آنے سے پہلے بھی دیوبند کے حضرات کی خواہش تھی کہ حضرت وہیں قیام فرمائیں۔ اور درمیان میں بھی یہ تحریک وتجویز جاری رہی حتیٰ کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حضرت کا دیوبند جانا دینی اور علمی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہی ہوگیا۔ سلہٹ کے عوام وخواص کو اس فراق سے بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے درخواست کی کہ یہ تعلق کسی نہ کسی ظاہری حیثیت میں بھی باقی رہنا چاہیے۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ رمضان شریف میں حضرت کا قیام ہر سال وہیں ہوگا۔ اس طرح رمضان شریف میں تشریف آوری کا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جب تک حالات نے مجبور نہیں کر دیا۔ بلا کسی خلل اور انقطاع کے جاری رہا۔ اس قیام کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ دیوبند کے قیام کی مجبوری اور وہاں تشریف آوری کے ذکر سے پہلے اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی اور سیاسی تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

بھتیجے کی شادی

مالٹا سے واپسی کے بعد حضرت کو اپنے بھتیجے مولانا وحید احمد کی شادی کا بڑا فکر

تھا۔ تعلیم و تربیت کی وجہ سے مولینا اپنے بچپن ہی سے حضرت کی نگرانی اور تربیت میں تھے۔ آخر میں والد ماجد مولینا صدیق احمد صاحب کی وفات، خاندان کی جلاوطنی اور اپنی اسارت مالٹا اور پھر ہندوستان ہی میں رہ پڑنے کی وجہ سے اب حضرت کے سوا کوئی ظاہری سہارا اور سرپرستی بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بچپن ہی سے والد کی سخت مزاجی اور گھر کے پر سکون ماحول سے محرومی اور دوسرے پے در پے حوادث و شدائد نے مولینا کے مزاج میں مایوسی، شدت احساس اور سریع الانفعال ہونے کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ مزید برآں اب ان کی عمر بھی کم و بیش تیس برس کی ہو گئی تھی، اس لیے حضرت کو ان کی شادی کا بہت خیال تھا۔ اس بارے میں اپنے کسی مخلص کو تحریر فرمایا کہ "مجھ کو وحید کی نسبت کی فکر ابتدا سے ہے۔ میں نے مالٹا سے واپسی کے بعد چاہا تھا کہ اول اس کے عقد کی فکر کروں، اس کے بعد اپنا انتظام کروں گا۔"[۱] اس وقت تک شرفا، کے طبقہ کی شادی بیاہ میں اس بات کا لحاظ باقی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو شادی اپنے ہی خاندانوں اور عزیزداروں میں کی جائے، چنانچہ حضرت نے اپنے گھرانوں پر نظر دوڑائی۔ دو ایک جگہ بات بھی ڈالی۔ لیکن خاندان کے تقریباً سارے ہی گھرانے متوسط الحال اور آسودہ زندگی سے بہرہ ور تھے۔ کس کی لڑکی بھاری تھی کہ ایک بے ماں باپ کے بے گھر بے در بے ٹھکانہ اور بے وطن لڑکے کے پلے باندھ دیتا۔ اس لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل سکا تھا۔ اتفاق سے حضرت کو ۱۳۴۲ھ میں رنگون کا سفر پیش آیا۔ وہاں سے واپسی پر رائے بریلی میں مدرسہ عربی والوں نے اپنے اجلاس میں شرکت کے لیے باصرار روک لیا۔ حضرت کو معلوم تھا کہ یہاں ان کے ماموں سید تصدق حسین صاحب مرحوم کی صاحبزادی رہتی ہیں جن کے شوہر منشی فاروق احمد صاحب پولیس میں ملازم تھے۔ چنانچہ پتہ لگا کر حضرت ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ موصوفہ نے مولینا وحید احمد کی خیر خبر دریافت کی تو حضرت نے فرمایا کہ کہیں ان کے رشتے کا انتظام کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ میرے ایک ہی لڑکی ہے اگر آپ چاہیں تو مجھے عذر

---

[۱] مکتوبات شیخ الاسلام: ج ۱، ص ۳۳۹

نہیں ہے۔ اس طرح اس مختصر سی ملاقات میں رشتہ طے ہوگیا۔ حضرت زندگی میں پہلی بار کسی اولاد کی شادی کر رہے تھے۔ یہ بھی خیال تھا کہ یتیم اور محروم بھتیجے کا دل میلا نہ ہو اور اس کو ارمان نہ رہ جائے کہ باپ دادا ہوتے تو شادی قاعدے سے ہوتی۔ یہ بھی سُنا ہے کہ مولینا کی پہلی نسبت اپنی ہی صاحبزادی زہرہ مرحومہ سے طے تھی جن کا انتقال مالٹا کی اسارت کے زمانے میں غریب الوطنی اور مسافرت میں ہوگیا تھا۔ بہرحال یہ وہ عوامل تھے کہ جن کی بنا پر یہ شادی مروجہ اہتمام و انتظام سے ہوئی۔ بارات دیوبند سے ضلع فیض آباد کے ایک گاؤں اونچے گاؤں میں گئی جو منشی سیّد فاروق احمد صاحب مرحوم و مغفور کا وطن تھا۔ باراتیوں میں دارالعلوم دیوبند کے بڑے بڑے علماء اور اساتذہ علامہ انور شاہ، اسیر مالٹا مولینا عزیر گل، مولینا محسن صاحب برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ، مولینا محمد عثمان صاحب نبیرۂ حضرت شیخ الہندؒ، مولینا سعید احمد صاحب نبیرۂ حضرت گنگوہی، مولینا محمد طاہر صاحب نبیرۂ حضرت مولینا محمد قاسم نانوتویؒ وغیرہ وغیرہ شریک تھے۔ گاؤں تک پہنچنے کا راستہ قصبہ ٹانڈہ ہوکر جاتا تھا اور یہی حضرت کا آبائی وطن تھا اس لیے بارات کی ترتیب ٹانڈہ ہی میں دی گئی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ حضرت کی ایماء سے یا لاعلمی میں مگر آپ کے والد ماجد مولینا سیّد حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ کے ایک معتقد و مسترشد جناب ریاست علی خاں صاحب مرحوم نے دوسری سواریوں کے ساتھ دو تین ہاتھیوں کا بھی انتظام کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اودھ کے زمیں دار گھرانوں کی باراتوں میں ہاتھی ضروری سمجھے جاتے تھے۔ رؤسا اور زمیں داروں کے دروازوں پر ہاتھی جھولتے تھے اور وہ لوگ نام آوری اور شہرت کے لیے مانگنے پر دے دیا کرتے تھے۔ شاید وہیں سے یہ مثل چلی تھی کہ "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔" مختصر یہ کہ یہ پہلی اور آخری شادی تھی جس کا حضرت نے کسی قدر اہتمام فرمایا اور اس کے بعد ساری شادیاں جن کی تفاصیل آگے آئیں گی مکمل سادگی اور خاموشی کے ساتھ انجام پائیں۔

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

حضرت کی دیوبند تشریف آوری کے حالات اور اسباب کے بیان سے پہلے ضروری ہے کہ دیوبند یا مدرسۂ دیوبند کی تعریف وتاریخ ذہن میں رکھی جائے۔

مغل بادشاہت کے زمانے میں دہلی علومِ شریعت اور اسلامی فلسفہ وتعلیم کا مرکز تھا۔ تمام ہندوستان میں اسی مرکز اور اس کے افکار وتعلیمات کے تحت دینی مدارس قائم تھے جن کے ذریعے صحیح اسلامی عقائد اور قرآن وسنّت کے علوم کی اشاعت وتبلیغ تمام ہندوستان میں بلکہ ایشیا میں جاری وساری تھی۔ مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ان مراکز علوم کی سرگرمیوں میں ضعف وکمزوری آتی گئی حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں جب ملک پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہوگیا تو دہلی کے مراکز بالکل ہی منتشر اور منہدم ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی پورے ملک سے صحیح اسلامی افکار وعلوم کی تبلیغ وترویج کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ صورتِ حال دینی احساس اور اسلامی دل ودماغ رکھنے والے عوام وخواص کے لیے بہت نازک اور فکر انگیز تھی۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کے قلب ودماغ آتشِ انتقام سے بھی دہک رہے تھے۔ انگریزوں نے ان کو حکومت وسلطنت سے محروم کردیا تھا۔ لاکھوں معصوم انسانوں کو ناقابل برداشت عذاب اور سزائیں دے کر شہید کردیا گیا۔ بستیاں ویران کردی تھیں اور گھر اُجاڑ دیے تھے۔ سیکڑوں سال کے قدیم مدارس معابد خانقاہیں اور مذہبی مراکز تباہ وبرباد کردیے تھے۔ ان حالات اور عوامل کے تحت دہلی سے قریب، تقریباً سوا سو میل کے فاصلے پر، شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ اس شاہراہ کے کنارے جو کلکتہ بلکہ ڈھاکہ سے پشاور تک چلی جاتی ہے اور اُس ریلوے لائن پر جس کو اب ناردرن ریلوے کہا جاتا ہے اور جو بمبئی سے پشاور تک جاتی ہے دیوبند نامی ایک چھوٹے سے زرخیز اور نشاط انگیز قصبہ میں چند صاحب فکر بزرگوں، حاجی سید عابد حسین مولینا ذوالفقار علی، مولینا مہتاب علی اور منشی فضل حق صاحب نے اللہ کا نام لے کر

بالکل بے سروسامانی کے عالم میں مدرسۂ دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ کہنے کو تو یہ ایک مدرسہ تھا اور ایسے مقام پر قائم ہوا تھا جس کی کل آبادی آس پاس کے گاؤں اور ملحقات ملا کر بھی پندرہ بیس ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی، مگر درحقیقت یہ ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں صحیح اسلامی عقائد اور شرعی احکام و قواعد کی تبلیغ ترویج اور اشاعت کا ایک مرکز بننے والا تھا۔ اس مرکز کے مقاصد میں ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کی تکمیل اور غیر ملکی تسلط سے ملک کی تحریر و آزادی بھی شامل تھی۔ اس باب میں حضرت شیخ الہندؒ کا بیان دیکھیے۔" میں (راوی) حضرت مولینا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا سیاسی مسلک کیا ہے؟ یہ پیغام سناتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہو گیا۔ اور فرمایا۔ حضرت الاستاذ مولینا نانوتوی نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"[1]۔

شیخ الہندؒ کی روایت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ آپ مدرسے کے پہلے شاگرد تھے بلکہ مولینا محمد قاسمؒ کے مقرب و مخصوص شاگرد اور جانشین اور ان کی علمی، فکری اور سیاسی روایتوں کے امین بھی تھے اور مولینا محمد قاسم مدرسۂ دیوبند کے وہ پہلے استاد تھے جن کے افکار، علوم اور تعلیمات پر مدرسہ کی پالیسی بنی۔ اس لیے شیخ الہندؒ کا قول مدرسہ کے سیاسی مقاصد اور بنیادوں کا آئینہ دار ہے۔ مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی تقریر میں ۱۹۶۴ء کے قومی جمہوری کنونشن میں کہا: "علمائے دین اس وقت بھی جنگ آزادی لڑ رہے تھے جب ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تشکیل عمل میں آئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہ نہ صرف شریک تھے بلکہ اس کی قیادت کر رہے تھے۔

[1] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۲۶۔

سیاست میں انھوں نے ہمیشہ انقلابی رویہ اختیار کیا ہے۔ پورا دیوبند اسکول آغاز ہی سے قومی اور انقلابی رہا ہے۔[1] تعلیمات اسلامی اور کتاب وسنت کے بارے میں بھی مدرسے کے مقاصد اور پالیسی کا تذکرہ مولانا محمد قاسم صاحب نے کیا ہے۔ "آجکل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہیں کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانۂ سابق کے وقت میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ہاں علوم نقلیہ کا یہ تنزل ہے کہ ایسا تنزل بھی کسی کا زمانہ میں نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آتا ہے اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز اُن علوم کی طرف جن سے علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے ضروری سمجھا گیا۔"[2] یہ تو متقدمین کے فرمودات تھے اس کے ساتھ ہی متاخرین کے خیالات بھی مدرسہ کے مقاصد اور پالیسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ "میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حق میں ازالۂ حیثیت عرفی کا جرم ہوگا اگر کہا جائے کہ دارالعلوم چند مخصوص کتابوں کے پڑھنے پڑھانے اور درس وتدریس کے ایک مرکز کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کے بانیوں کے حق میں کوئی ناانصافی نہیں ہو سکتی، ایسا کہنے والوں کو ان بزرگوں کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا جس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ محض ایک مدرسہ ہے تو حضرت شیخ الہندؒ تڑپ اٹھتے تھے ان کے نزدیک یہ (مدرسہ) اسلام کا ایک قلعہ، اُس (اسلام) کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاونی اور سلطنت مغلیہ کے گل ہونے والے چراغ کا بدل، بلکہ نعم البدل تھا۔"[3] یہ دنیائے اسلام کے مشہور عالم مصنف اور مبلغ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خیالات تھے۔ موصوف رسمی طور پر اُس مدرسہ دیوبند کے فارغ و فاضل بھی نہیں ہیں اور باضابطہ طور پر مستفید بھی نہیں ہیں جو دیوبند کی چہار دیواری میں درس وتدریس کا مرکز ہے، مگر جہاں تک دیوبند کے مدرسۂ فکر اور صحیح اسلامی عقائد و تعلیمات کی تربیت گاہ

---

[1] الجمعیۃ قومی جمہوری کنونشن نمبر، مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۲

[2] تقریر حضرت نانوتوی روداد مدرسہ اسلامی عربی سنہ ۱۲۹۰ھ

[3] از مولانا ابوالحسن علی ندوی بحوالہ الجمعیۃ دارالعلوم دیوبند نمبر ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء

کا تعلق ہے، مولانا انہی تعلیمات سے مستفید، انہی افکار کے مبلغ اور اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا مرحوم اپنے وقت میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم اور اپنے استاذ علامہ انور شاہ صاحب محدث دارالعلوم دیوبند کے صحیح جانشین تھے صحیح اسلامی عقائد کے سلسلے میں آپ کا ایک کارنامہ رہتی دنیا تک سونے کے حرفوں میں لکھا جائے گا کہ قانونی اور عرفی طور پر آپ ہی کی کوششوں سے قادیانیت و مرزائیت کو اسلام سے خارج ایک الگ مذہب قرار دیا گیا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں: "جو حقائق میری آنکھوں کے سامنے ہیں وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں علی رؤس الاشہاد یہ دعویٰ کروں کہ اگر سرزمین دیوبند سے علم و معرفت کا یہ چشمۂ صافیہ نہ بہہ نکلا ہوتا تو تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان سے قرآن و سنت کے علوم کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔"[1]

پروفیسر محمد مجیب نے اپنی انگریزی کتاب 'INDIAN MUSLIMS' میں لکھا ہے "۱۸۵۷ء کے فوراً بعد حاجی سید عابد حسین، مولانا مہتاب علی اور شیخ نہال احمد نے دیوبند کی جامع مسجد میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی جو دس برس کے اندر اندر ایک دارالعلوم یا دوسرے لفظوں میں ایک اعلیٰ علمی مرکز کے درجہ تک ترقی کر گیا۔ بنیادی طور پر اس دارالعلوم کی ترقی میں مولانا محمد قاسم کی عالی ہمتی اور قوتِ عمل کارفرما تھی جنہوں نے پورے مغربی یوپی میں ایسے مدارس کا ایک جال پھیلا دینے کا پروگرام بنایا تھا جو اس مرکز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا تیار کر سکیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرسہ قاسم العلوم مرادآباد اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ دونوں مراکز اپنی علمی و فکری جد و جہد میں دارالعلوم دیوبند ہی سے فیض اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ درحقیقت دارالعلوم دیوبند کا قیام برطانوی تہذیب و تمدن اور اس کی سیاست کے روز افزوں اثرات کے خلاف ایک اعلانِ جہاد تھا اور ان تمام ذہنی اور فکری

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ، دارالعلوم دیوبند نمبر، ۲۶ر مارچ ۱۹۸۰ء بحوالہ الرشید دارالعلوم نمبر

تحریکات کو سختی اور مضبوطی کے ساتھ نظر انداز کر دینے کے جذبے سے معمور تھا جو اس جد و جہد کی راہ میں حائل تھیں[1]۔"

مجیب صاحب نے مدرسۂ دیو بند کے فکری اور علمی مراکز میں صرف دو دینی مدارس کا تذکرہ کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان مدارس اور معابد کی تعداد کئی ہزار تک پہنچی ہے جو دیو بند مدرسۂ فکر کے پروگرام کے ماتحت قائم ہوئے۔ اس بارے میں آخری شہادت قاضی عدیل عباسی مرحوم کی بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"دارالعلوم دیوبند کے اکابرین بصیرت و فراست کے نتیجہ میں انگریزوں کو اپنا دشمن قرار دے کر خلافت اسلامیہ کی بقا و تحفظ اور ہندوستان کی آزادی کے لیے زمانۂ دراز سے عملی جد و جہد کر رہے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، ان کے پیر حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور ان کے سیکڑوں اعوان و انصار اسی دھن میں سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے[2]۔"

مدرسۂ دیو بند کے فکری، علمی اور عقائدی معماروں اور اولین اساتذہ میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا اسم گرامی سر فہرست ہے۔ آج سارے ہندوستان، پاکستان، برما، نیپال، بنگلہ دیش، افریقہ، امریکہ، انگلستان وغیرہ ممالک میں صحیح اسلامی عقائد اور دینی تحریکات دیو بند، اس کے اساتذہ اور خاص طور پر مولانا محمد قاسمؒ کے فیضانِ نظر کا نتیجہ ہیں۔ اسلام کے باطل اور گمراہ فرقوں کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے مگر دیو بند کے صحیح عقیدہ کے تذکرہ کے ضمن میں ایک اجمالی ذکر خارج از موضوع بھی نہیں ہے: "ترمذی شریف میں حدیث ہے۔ میری امت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخی ہیں۔ عرض کیا وہ کون ہے؟ فرمایا "ما انا علیہ واصحابی" جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔ اوکما قال (رواہ ترمذی)۔ اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری نے ۷۲ فرقے اس طرح شمار

---

[1] پروفیسر محمد مجیب "انڈین مسلمس" ص ۴۰۹

[2] تحریکِ خلافت، ص ۱۱۸

کرائے ہیں۔ معتزلہ ۲۰، روافض ۲۲، مرجیہ ۵، خوارج ۲۰، نجاریہ ۳، جبریہ ۱،
مشتبیہ ۱۔ ان سب فرقوں کے نام میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں اہل سنت والجماعت (فرقۂ ناجیہ) کے دس خصائص ذکر کیے ہیں، یہ سب (مندرجۂ ذیل) خصائص حلقۂ دیوبند کے ہیں۔

(۱) حضرات شیخین کو افضل جاننا یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یعنی فضیلت بترتیب خلافت۔
(۲) بزرگ جاننا جناب رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے دونوں دامادوں کو یعنی پہلے حضرت عثمانؓ کو اور پھر حضرت علیؓ کو۔
(۳) بزرگ جاننا دو قبلوں کو یعنی کعبۃ اللہ شریف کو اور بیت المقدس کو۔
(۴) موزوں پر مسح جائز ہے۔ (روافض کے نزدیک ناجائز ہے)۔
(۵) دو گواہی سے باز رہنا یعنی کسی پر گواہی نہ دے کہ وہ دوزخی ہے یا جنتی۔
(۶) صالح اور فاسق ہر دو امام کے پیچھے نماز پڑھنا۔
(۷) ہر دو تقدیر پر ایمان رکھنا۔
(۸) نیک و بد ہر دو جنازہ پر نماز پڑھنا۔
(۹) ہر دو فرض یعنی نماز اور زکوٰۃ کو برابر جاننا اور ادا کرنا۔
(۱۰) امیر کی فرماں برداری کرنا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ اس کے سب رسولوں پر اس کے سب فرشتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر ایمان لانا۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرنا۔ روزہ رکھنا۔ زکوٰۃ دینا۔ اگر استطاعت ہو تو حج کرنا۔ اور شریعت محمدی کے علاوہ کسی کی اتباع نہ کرنا۔[1]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام ہو جانے کے صرف نو سال بعد ۱۸۶۶ء میں ان حالات میں کہ ملک و قوم پر ایک غیر مسلم اور غیر ملکی طاقت کا مکمل تسلط اور

---

[1] از مقالہ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری بحوالہ الجمعیۃ دار العلوم دیوبند نمبر ۱۹۸۰ء ماہ مارچ۔

آہنی قبضہ جگر تک پیوست تھا۔ اور ذرا ذرا سے شبہ پر گھر برباد کردیے جاتے تھے اور گھر والے پھانسی پر چڑھادیے جاتے تھے۔ بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دی جاتی تھیں اور خاص طور پر ایسی فضا میں کہ مسلمانوں کا ایک طاقتور طبقہ اور افراد برطانیہ کی تائید و خدمت میں نیز عقائد اسلامی اور کتاب وسنت میں رخنہ اندازی میں حکومتِ برطانیہ کی امداد و اعانت کے بل بوتے پر مصروف و مامور تھے۔ ایسے انقلابی اور آزاد نیز قرآن وسنت کی تعلیمات کے احیا، کام کرنا قائم کرنا کسی طرح افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر سے کم نہیں تھا۔ گذشتہ سو سال میں دارالعلوم دیوبند نے اسلامی دنیا کی کیا خدمات کیں اور اس کے کیا ثمرات مرتب ہوئے۔ اس کے اعادہ کا یہاں موقع بھی نہیں ہے اور سالوں کے تحقیق و مطالعے کے بغیر یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ اس وقت تو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ تھا وہ دارالعلوم دیوبند جس کی صدارت تدریس اور مسندِ حدیث کے لیے حضرت سلہٹ کو خیر باد کہہ کر دیوبند جارہے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جانشینی کے لیے شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن مسند افروز ہوئے تھے۔ ان کے بعد محدث وقت علامہ انور شاہؒ شیخ الحدیث مقرر ہوئے تھے اور اب یہ منصب گرامی حضرت کے سپرد کیا جارہا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دیوبند تشریف آوری

سنہ ۱۹۲۸ء

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علوم و فنون کا خزانہ تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ، معانی و بیان، منطق، فلسفہ، شعر، ادب، غرض سارے ہی علوم متداولہ میں تو ماہر اور یکتائے زمانہ تھے ہی، بعض غیر متداولہ علوم ہیئت و جغرافیہ وغیرہ میں بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کا ذہن اتنا تیز اور فکر اتنی رسا تھی کہ دقیق سے دقیق اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل ایک نظر میں حل کر دیتے تھے۔ حافظہ ایسا قوی تھا کہ جو موضوع یا مسئلہ ایک بار نظر یا سماعت سے گذر جائے وہ ہمیشہ کے لیے پتھر کی لکیر بن جائے۔ حضرت مولینا اشرف علی تھانویؒ کی آپ کے بارے میں یہ رائے تھی کہ "انور شاہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل ہے۔" مولینا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آپ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "اگر تم مجھ سے پوچھو کہ تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ تقی الدین بن دقیق العید، سلطان العلماء عزّ الدین بن عبدالسلام رحمہم اللہ کو دیکھا تھا تو اگر میں تم سے ہاں کہہ دوں تو میں سچا ہوں کیونکہ میں نے انور شاہ کو دیکھا تھا۔ اور کیونکہ اگر انور شاہ اس دور میں ہوتے تو یہی ہوتے۔"[1] ایسے متبحر عالم اور بے مثل استاذ کی موجودگی میں دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور مقبولیت نے بہت ترقی حاصل کی تھی اور ملک کے گوشے گوشے سے بلکہ بعض باہر کے ممالک سے بھی طلباء اور تشنگانِ علوم شاہ صاحب سے استفادہ کے لیے دیوبند آرہے تھے۔ خواص اور اہل علم تو جانتے ہی تھے، عوام میں بھی آپ کے علم و فضل کی

---

[1] بینات کراچی۔ محدث عصر یوسف بنوری نمبر، ص ۱۳۴۔

شہرت تھی، مگر عین اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ شاہ صاحب کو مدرسے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب کو خود تو شاید کم مگر ان کے ہواخواہ اور مخلصین کو مدرسے کے مہتممین اور منتظمین سے اختلاف ہو گیا۔ بات معمولی تھی مگر بڑھتے بڑھتے رائی کا پہاڑ بن گیا۔ علامہ کے خدام کی رائے یہ تھی کہ مدرسے کے انتظامی معاملات میں حضرت علامہ کی رائے اور استمزاج بھی شامل رہے، مہتممین کا موقف یہ تھا کہ نظم و ضبط اور درس و تدریس دو الگ شعبے ہیں۔ مدرسین کو اہتمام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں فریق اپنے اپنے میدان میں ڈٹ گئے۔ پہلے تو بات چیت ہوئی۔ دلائل اور ثبوت پیش کیے گئے۔ پھر بات بحث و مباحثہ اور تکرار و گفتار تک بڑھی اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آپس کا معاملہ عوام میں اور گھر کی بات کوچہ و بازار میں پھیل گئی۔ الزام تراشی، نعرہ زنی، تہمت آرائی، اشتہار بازی، اخبار نویسی، ہرزہ سرائی غرض مقابلہ و مجادلہ کا کوئی داؤ پیچ ایسا نہ رہا کہ گھات لگا لگا کر اور سنبھل سنبھل کر آزمایا نہ گیا ہو۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب تلخ و تند، نرم گرم اور گفتنی ناگفتنی سارے ہی حربے ختم ہو گئے تو شاہ صاحب مع اپنے بہت سے شاگردوں کے دیوبند چھوڑ کر چلے گئے۔ شاگردوں میں دیوبند کے طلبا ہی نہیں بڑے بڑے علما، فضلا، اور اساتذہ تھے۔ مدرسہ دیوبند کے لیے یہ وقت معمولی نہیں بلکہ بہت نازک تھا اور چوٹ ہلکی نہیں بلکہ ضرب کاری تھی۔ یہ خطرہ حقیقت بن کر نظر آ رہا تھا کہ مدرسے کی اینٹ سے اینٹ بج کر ہی رہے گی۔ صدر مدرس اور پھر شاہ صاحب جیسے صدر مدرس اور شیخ حدیث، اساتذہ کرام، اور طلبا، کی ایک بڑی جماعت الگ ہوئی تو پورے ملک کے عوام و خواص میں بےچینی اور مدرسے کے خلاف اعتراضات و اختلافات کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت کی بڑی شخصیتیں مولینا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولینا محمد علی، مولینا حفظ الرحمٰن اور اس پایہ کے بہت سے اعیان، نیز اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی اور مضبوط جماعت تحریک خلافت شاہ صاحب کی ہمنوا تھی۔ ان حالات میں جیسی بھی بربادی ہو جاتی،

کم تھی اور جو کچھ بھی ہو جاتا متوقع تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت مدرسہ کا اہتمام مولانا حبیب الرحمن عثمانی جیسے صاحب فہم و فراست، مردم شناس اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک کے ہاتھوں میں تھا۔ آپ نے بلا کسی تاخیر اور تردد کے یہ فیصلہ کیا کہ اس نازک وقت میں مدرسہ کی گرتی ہوئی ساکھ اور ڈوبتے ہوئے نام کو کوئی ایسا ہی شخص بچا سکتا ہے جو اپنے وقت کا امام، تقویٰ اور شریعت و سنت میں علم اور خداقی العلم ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں معروف و محبوب ہو۔ ان صفات سے پوری طرح متصف ذات ہمارے حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تھی جس پر انہوں نے اپنے بڑوں چھوٹوں، عوام اور خواص سب نے اتفاق کیا۔ ادھر سلہٹ میں حضرت کی علمی، تبلیغی، روحانی اور ظاہری ترقیاں اور کامیابیاں دن بدن فزوں تر ہو رہی تھیں۔ عوام و خواص پروانہ وار عاشق اور فدا کار تھے۔ درس و تدریس کا حلقہ اور تشنگان معرفت و سلوک کی جماعت دن بدن بڑھتی ہی جاتی تھی۔ مگر جب دیوبند کی طرف سے صدر مدرسی اور مسند حدیث کی پیش کش کی گئی تو حضرت نے فیصلہ کیا کہ اب اس امانت کی ادائیگی کا وقت آ پہنچا ہے جو شیخ الہندؒ نے آپ کے سپرد کی تھی۔ دیوبند ہی میں رہ کر اس میدان کارزار میں جہاد ہو سکتا تھا جو مجاہدین شاملی آپ کے حوالے کر گئے تھے۔ تاہم چونکہ دیوبند اور اس کے اہتمام کے مزاج سے آپ پوری طرح واقف تھے۔ اپنے مشن اور جدو جہد آزادی کے تقاضے بھی آپ کے سامنے تھے نیز ہندوستان میں قیام کا مقصد بھی متعین اور مقرر تھا اس لیے آپ نے دارالعلوم کے اہتمام کے سامنے حسب ذیل شرائط رکھیں۔

(۱) سیاسی مسلک اور نظریات میں پوری آزادی ہوگی اور مدرسہ کو کسی اختلاف و اعتراض کا حق نہ ہوگا۔

(۲) سیاسی سرگرمیوں اور تحریکات آزادی میں شرکت پر مدرسہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

(۳) ہر ماہ ایک ہفتہ بلا کسی رخصت اور منظوری کے سفر ہو سکے گا اور اس کی تنخواہ

وضع نہ ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ[1]

خود مدرسہ کو بھی ایسے ہی صاحب عزیمت وجرأت، حامل شریعت وسنت مجاہد آزادی وسیاست کی ضرورت تھی۔ دیوبند والوں سے زیادہ حضرت کے مزاج، طبیعت اور نفسیات سے کون واقف ہوسکتا تھا۔ انھوں نے ہر پہلو پر غور کرکے ہی آپ کو یہ پیش کش کی ہوگی چنانچہ پورے انشراح وانبساط کے ساتھ یہ شرائط منظور کرلی گئیں اور حضرت ۱۹۲۷ء میں دیوبند کی مسند صدارت وحدیث پر تشریف لے آئے اور اس کے ساتھ وہ تمام خطرات، انتشار اور اضطراب جو وقتی طور پر پیدا ہوگیا تھا ختم ہوگیا اور موافقین ومخالفین کو جمیعت خاطر حاصل ہوگئی۔ ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولینا محمد منظور نعمانی مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے کہ "حضرۃ الاستاذ مولینا سید انور شاہ صاحبؒ نے دار العلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرمالیا۔ اس وقت دار العلوم کی صدارت تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولینا حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولینا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا[2] اس کے ساتھ ہی ایک اور فاضل گرامی مولینا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کی تحریر بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔" جب مولینا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم کے زمانہ میں دار العلوم دیوبند میں عظیم الشان اسٹرائک ہوئی اور مولینا انور شاہ صاحبؒ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور مولینا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ نے دار العلوم سے علیحدگی اختیار کرلی تو عرصہ تک اخبارات میں ان واقعات کا چرچا رہا۔ بعض اخبارات تو محض انہی مسائل پر بحث کے لیے نکالے گئے تھے۔ یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی یہ نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

---

[1] حیاتِ شیخ الاسلام، مولینا محمد میاں، ص ۱۳۶

[2] الفرقان لکھنؤ جنوری ۱۹۵۸ء بحوالہ شیخ الاسلام ایک سیاسی مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

ایک طرف مولینا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا اور دوسری طرف بعض اہل خیر نے ڈابھیل (گجرات) میں شاہ صاحب، ان کے رفقاء اور شاگردوں کو بلا کر ایک نئے علمی مرکز کی بنیاد رکھ دی۔[1]

اس موضوع پر مولینا عبد الحیٔ صاحبؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (والد ماجد مولینا علی میاں مدظلہم) کا بیان بھی قابل ملاحظہ ہے:

"۱۳۴۶ھ میں جب حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری نے دیوبند کی مسند شیخ الحدیث سے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ پر مولینا حسین احمد مدنیؒ کا انتخاب کیا گیا۔ آپ نے اسی قابلیت اور محدثانہ شان کے ساتھ تدریس حدیث کی خدمت کی انجام دی کہ دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور مرکزیت بھی باقی و ساری رہی اور مدرسہ پر عوام و خواص کا اعتماد برقرار رہا۔ تعلیم و تدریس کی خدمات کے ساتھ حضرت مدنیؒ سیاسی جدوجہد میں بھی اپنے بے مثال عزم و ہمت کے ساتھ رواں دواں رہے اور مسلمانوں میں غیرت و حمیت نیز عزت نفس کی روح بیدار کی۔"[2]

ظاہری اور سطحی نظر میں تو یہ منصب محض ایک صدر مدرس اور شیخ الحدیث کا تھا جس پر قدرت نے حضرت رحمۃ اللہ کو فائز و مامور فرما دیا تھا، مگر بنیادی اور حقیقی معنوں میں یہ وہ مقام تھا جس سے پورے ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں صحیح اسلامی اسپرٹ اور عقائد کی تبلیغ اور قیادت ہوتی تھی حکیم الاسلام مولینا قاری محمد طیب نے اس کے بارے میں لکھا ہے: "آپ (حضرت مولینا حسین احمد مدنی) کی شخصیت اس وقت دارالعلوم کے جس منصب پر فائز ہوئی وہ روایتی طور پر محض

[1] بینات کراچی، مولینا بنوری نمبر، ص ۱۴۲

[2] مولینا عبد الحیٔ۔ نزہۃ الخواطر۔ مطبوعہ حیدرآباد۔ ج ۸، ص ۱۱۷

مدرسی / صدر مدرسی کا عہدہ نہیں بلکہ ایک عمومی قیادت کا عہدہ رہا ہے جس کی طرف رجوع عام ہوتا رہا ہے اور جس کے لیے ہمیشہ ایسی ہی ممتاز شخصیتیں منتخب ہوتی رہی ہیں[1]۔''

دیوبند کے اسلامی، علمی، اخلاقی، روحانی اور سیاسی مرکز سے حضرتؒ نے ان تمام پہلوؤں سے جو خدمتیں انجام دیں اور جس طرح ملک و ملت کی قیادت فرمائی، اس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

[1] مکتوبات ج ۱ ص ۳۵

ہندوستان کا ماحول۔ حضرت کا سیاسی مسلک

۱۹۲۳ء تک ہندوستانی عوام کی سیاست میں استحکام اور ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا تھا۔ کانگریس تیز رفتاری کے ساتھ سرکاری اثرات اور حکومت کی ریشہ دوانیوں سے آزاد ہو رہی تھی، مگر مسلم لیگ آزادی اور حریت کی منزل کی جانب بڑھ جانے کے بعد آہستہ آہستہ پیچھے لوٹ رہی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سر جان سائمن کی سربراہی میں ہندوستان کا دستور یا دستوری اصلاحات بنانے کے لیے ایک کمیشن بھیجا۔ یہ ہندوستانی تاریخ میں سائمن کمیشن کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستانی عوام اور انجمنوں نے اس کمیشن کی سخت مخالفت کی۔ جہاں جہاں بھی اس کمیشن کے اجتماعات ہوئے ہندوستان نے اس کے خلاف مظاہرے کیے، کالی جھنڈیاں دکھائیں اور سائمن کمیشن گو بیک کے نعرے لگائے۔ برطانیہ نے اس بائیکاٹ کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، گرفتاریاں کیں، لاٹھی چارج کیا اور گولیاں چلائیں مگر نشۂ آزادی میں چور متوالوں نے اس تمام ظلم و ستم کو پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی۔ اس جگہ پر یہ بات خوب ذہن نشین کر لیجیے کہ سائمن کمیشن کی مخالفت اور بائیکاٹ کرنے والوں میں کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء، یہ تینوں جماعتیں برابر کی شریک تھیں۔ دسمبر میں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا جس میں کانگریس کا منزلِ مقصود مکمل قومی آزادی قرار پایا اور سائمن کمیشن سے بائیکاٹ کرنا پاس ہوا۔ اسی طرح پشاور میں جمعیۃ علماء نے بصدارت علامہ انور شاہؒ اور کلکتہ میں خلافت کانفرنس نے سائمن کمیشن سے بائیکاٹ کے ریزولیشن پاس کیے۔ اس بارے میں مسلم لیگ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ اور دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس کا اجلاس زیر صدارت سر مولوی محمد یعقوب منعقد ہوا اس میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ کی قرارداد پاس ہوئی۔[1]

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولانا طفیل احمد منگلوری مرحوم

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس مغالطہ کے لیے ملک کے مختلف مقامات پر دورے کیے اور یہ دلیل دی کہ ملک ہمارا ہے، مسائل ہمارے ہیں، عوام ہمارے ہیں اور قانونی اصلاحات انگریز اور برطانیہ بنائے، یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے[1]۔ یہ تو سب کچھ تھا مگر مسلم لیگ میں ایک بہت طاقتور گروپ سر محمد شفیع کا تھا جو شفیع لیگ کے سربراہ تھے۔ یہ لیگ برطانیہ کی وفادار اور سائمن کمیشن کی موافق تھی۔ دوسرے نسبتاً کمزور گروہ کی سربراہی مسٹر محمد علی جناح کے ہاتھ میں تھی جو ابھی تک کانگریس کے علی الاعلان مخالف نہ تھے۔ اور نیشنلسٹ خیالات کے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو آپ کو ہندو مسلم اتحاد کا پیغامبر کہا کرتی تھیں[2]۔ "دیکھنا یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں جناح صاحب ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لیے کس طرح کوشاں تھے۔ اس وقت گاندھی جی نے اپنی ساری توجہ اچھوت، غریبی اور نشہ آور اشیا کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کر دی تھی۔ کانگریس کی سیاست سیاسی لوگوں پر چھوڑ دی تھی چنانچہ کانگریس کے صدر مسٹر سری نواس آئینگر، پنڈت مدن موہن مالویہ اور پنڈت موتی لال نہرو گورنمنٹ کی مرکزی اسمبلی کے ممبر ہو گئے تھے۔ سی، آر، داس بھی بنگال لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے نامزد ہو گئے تھے مگر وہ ۱۹۲۵ء میں اچانک فوت ہو گئے۔ جناح صاحب بھی مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے مگر ان لوگوں نے محسوس کیا کہ بغیر اتحاد و اتفاق کے اسمبلی میں ان کی کوئی طاقت نہیں تھی۔ چنانچہ مولانا محمد علی، کانگریس کے سیاست دانوں اور بعض دوسرے مسلمانوں کی تائید سے جناح صاحب نے ۲۷-۱۹۲۶ء میں اتحاد کی پوری کوشش کی[3]۔"

اس بارے میں جناح صاحب کا مسلک معلوم کرنے کے لیے ایک اہم دستاویز بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے آپ نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ جس دن ہندو مسلمان آپس میں متحد ہو جائیں گے اسی دن ہندوستان

[1] حیات شیخ الاسلام از مولانا محمد میاں، ص
[2] ایٹ لائیوز۔ موہن راج گاندھی، ص
[3] ایضاً، ص ۱۳۰

کے ہاتھ میں ایک ڈومینین ذمہ دار حکومت آجائے گی۔"[1] جناح صاحب کی اس تقریر پر گاندھی جی نے کہا تھا۔ "میں مسٹر جناح کی تائید کرتا ہوں۔ ہندو مسلم اتحاد ہی کے معنی سوراج ہے۔"[2]

اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں آپ نے گورنمنٹ کے پلیٹ فارم سے اسمبلی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے نیشنلسٹ ہوں اور بعد میں بھی نیشنلسٹ ہوں اور آخر میں بھی نیشنلسٹ ہوں۔"[3]

انتخابات کا سوال بھی اختلافات کا ایک بڑا عنوان تھا۔ وہ افراد اور جماعتیں جو حکومت برطانیہ کے زیر اثر اور اس کے حاشیہ بردار تھے چاہے وہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہوں مگر جداگانہ انتخاب کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ بلوے اور فساد کرا رہے تھے۔ مگر مسٹر جناح ابھی تک مخلوط انتخاب ہی کے حامی تھے اور اس مقصد کے لیے آپس کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے آخری کوشش صرف کر رہے تھے۔ مگر پھر بھی اب وہ آہستہ آہستہ نیشنلزم سے، ہندو مسلم اتحاد سے اور کانگریس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یہ ہے اور دوسرے اسباب آئندہ باب میں آرہے ہیں۔

"گو قومی سیاست کے نئے دور میں جو ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا تھا جناح صاحب کا اثر عام طور پر ملک میں اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں بہت کم ہو گیا تھا، پھر بھی قریب قریب ہر پارٹی کے لوگوں کو ان کے حب وطن اور ان کی سیاسی سمجھ بوجھ پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۷ء میں جب تیس مسلمان لیڈروں نے جن میں مختلف سیاسی خیالات کے لوگ شامل تھے دہلی میں جمع ہو کر فرقہ وارانہ مسئلہ پر غور کیا تو جناح صاحب جلسے کے صدر بنائے گئے اور اس میں جو تجویزیں منظور کی گئیں وہ مجموعی طور پر ان کے نقطۂ نظر کے موافق تھیں، ان تجویزوں کا خلاصہ یہ ہے کہ

---

[1] بکرز بولیتھو جناح دی کریئٹر آف پاکستان، مطبوعہ لندن، ص ۹۵ [2] ایضاً، بحوالہ گاندھی اور جناح مؤلفہ مریم، ص ۳۷

[3] ایضاً، بحوالہ ماڈرن مسلم انڈیا از اکرام، ص ۳۶۳

ہندوستان کے آئندہ دستور میں :

(۱) آئین ساز مجلسوں کے لیے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ہوں گے مگر ہندو اور مسلمانوں کے لیے ایک مقرر تناسب کے اعتبار سے نشستیں محفوظ رکھی جائیں۔

(۲) سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے مسلم اکثریت کا ایک نیا صوبہ بنایا جائے۔

(۳) دو اور صوبوں کو جن میں مسلم اکثریت ہے یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کو سیاسی اصلاحات دی جائیں۔

(۴) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔

(۵) مسلم اکثریت کے سب سے بڑے صوبوں پنجاب اور بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے ہو۔ جہاں تک اور صوبوں کا تعلق ہے مسلم اکثریت کے صوبوں میں کونسلوں میں نمائندگی اور نشستوں کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں ہندوؤں کو وہی رعایتیں دی جائیں جو مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے صوبوں میں حاصل ہوں۔

انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس مدراس دسمبر ۱۹۲۷ء میں ان تجاویز کو منظور کر لیا۔ اور اس ریزولیشن نے جو اس سلسلے میں پاس ہوا اس بات کی بھی ضمانت دی کہ ہر فرقے کو مذہبی عقیدہ و عمل کی پوری آزادی ہوگی اور کوئی مسودۂ قانون جس کا اثر ایک خاص فرقہ پر پڑتا ہو مجلس قانون ساز میں اس وقت تک نہیں پیش ہو سکے گا جب تک اس فرقہ کے منتخب شدہ ممبروں میں سے تین چوتھائی اس کے پیش کیے جانے پر رضامند نہ ہو جائیں[۱]"

لیجیے ہندو مسلم مسئلہ کا حل بھی پیش کر دیا گیا۔ مخلوط انتخاب بھی طے کر دیا گیا۔ دستور سازی کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی دور کر دی گئی۔ اور پھر کانگریس نے یہ تجویزیں منظور بھی کر لیں اور اس میں یہ بھی اضافہ کر دیا کہ کسی فرقے کے دو تہائی ممبروں کی منظوری کے بغیر کوئی مسودہ پیش بھی نہ ہو سکے گا۔ اب تو کوئی قضیہ، اختلاف اور اعتراض رہا ہی نہیں۔

---

[۱] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں از ڈاکٹر عابد حسین، ص ۱۱۳

کامیابی سامنے بلکہ ہاتھ ہی میں آ گئی ہے۔ مگر یہ سیاست ہے، یہاں پل پل اور قدم قدم راستے، ارادے اور نیتیں داؤ پیچ بدلتی ہی رہتی ہیں۔ اوپر سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے، اندر بالکل دوسری چیز ہوتی ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

چنانچہ اس سب سے بڑی کوشش اور اتفاق و اتحاد کا حال بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ جناح صاحب کو شروع ہی سے اقلیتوں کا غم کھائے جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور ضمانت قانونی طور پر پہلے سے طے نہ ہو جائے گی تو ایک طرف تو وہ ہمیشہ خوف زدہ رہیں گی کہ ان کے حقوق پامال کر دیئے جائیں گے۔ دوسری طرف اکثریتی فرقہ جبر و زیادتی میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گا اس لیے اگر ابھی سے اقلیتوں کے حقوق محفوظ نہ کر دیئے گئے تو ملک میں طوائف الملوکی اور غارت گری پھیل جائے گی"[1] یہی نہیں بلکہ دوسرے مسلمان، اچھوت اور بعض دوسری جماعتیں بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ "ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے درمیان ایک معاہدۂ آزادی پہلے سے طے ہو جائے ورنہ یہ آزادی کو دبا دے گی"[2] مگر کانگریس، نیشنلسٹ گروپ اور گاندھی جی کا خیال اس کے خلاف تھا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اقلیتوں اور مسلمانوں کا مسئلہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ ہم جب چاہیں گے بیٹھ کر اسے طے کر لیں گے اصل سوال اور کام غیر ملکی طاقت سے ملک کو آزاد کرانے کا ہے۔ "آزادی مل جائے گی تو اُس کے آفتاب کی گرمی سے فرقہ وارانہ اختلافات کی چٹان خود بخود پگھل جائے گی"[3] یہ دھیان میں رہے کہ اختلاف صرف اسی نکتہ، اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت اور حفاظت کا تھا ورنہ آزادی، اتحاد اور مخلوط انتخاب پر کانگریس مسلم لیگ، ہندو مسلمان، گاندھی جی اور جناح صاحب سب متفق تھے۔ قصہ مختصر کہ کانگریس نے اسی اجلاس میں جس میں جناح صاحب کی دلی والی تجاویز کو منظور کیا گیا تھا، سائمن کمیشن کے مقابلے پر دستوری اصلاحات کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ جو تیار کی اور جس کا نام

---

[1] راج موہن گاندھی۔ ایٹ لائیوز۔ ص ۱۳۹ [2] ” ص ۱۴۲ [3] ” ص ۱۴۲

نہرو رپورٹ سے مشہور ہوا اس میں جناح صاحب کی تجویز کردہ اور کانگریس کی منظور کردہ بلکہ بزور تائید کردہ اصلاحات و تجاویز کو پورے طور سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ کانگریس نے تو یہ رپورٹ منظور کی ہی "مولانا ابو الکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری نے بھی اسے منظور کیا[1]۔ "البتہ مسلم جماعتوں میں مولانا شوکت علی صدر خلافت کمیٹی اور مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اپنے بیانات دیئے جن میں بعض امور سے اختلاف کیا گیا تھا۔ اسی طرح پر پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر سبھاس چندر بوس نے بھی مشروط طریقے پر نہرو رپورٹ کو منظور کیا[2]۔"

رپورٹ تیار ہونے اور کانگریس سے منظوری حاصل ہو جانے کے ایک سال بعد کلکتہ میں دسمبر ۱۹۲۸ء کو ایک آل پارٹیز کنونشن بلایا گیا جس میں نہرو رپورٹ کو عام منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ مسلمانوں کو اور خاص طور پر مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی کو توقع تھی کہ اس کنونشن میں کانگریس مسٹر جناح کی دہلی والی تجاویز کی تائید کرے گی۔ سر تیج بہادر سپرو نے کنونشن پر زور دیا کہ جناح صاحب کی تجاویز کے مطابق نہرو رپورٹ میں تبدیلی کر دی جائے کیونکہ "اگر یہ تجاویز نہ منظور کی گئیں تو ملک کو ایسی شدید چوٹ پہنچے گی کہ یہ زخم چوتھائی صدی تک مندمل نہ ہو سکے گا[3]۔" مگر دوسری پارٹیوں، ہندو مہاسبھا، سکھوں کی جماعت وغیرہ نے تو ان کی مخالفت کی ہی، کانگریس نے بھی ان کے سارے دلائل رد کر دیئے۔ مجمع میں بھی قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس میں ان پر ذاتی حملے بھی کیے گئے اور کہا گیا کہ مسٹر جناح کو مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں ہے۔ جناح صاحب کو اس واقعہ سے شدید صدمہ پہنچا اور وہ کنونشن سے واک آؤٹ کر گئے۔ اس موقع کا آنکھوں دیکھا حال جناح کے ایک پارسی دوست جمشید نوشیرواں جی بیان کرتے ہیں۔

"مسٹر جناح انگلینڈ سے لائے ہوئے نہایت اعلیٰ درجہ کے لباس میں بولنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنے دلائل پیش کیے۔ مگر ان کے تمام

---

[1] ایٹ لائیوز ص ۱۴۰۔ [2] روشن مستقبل ص ۲۹۲

[3] ایٹ لائیوز ص ۱۳۹ بحوالہ ماڈرن مسلم انڈیا اکرام ص ۳۶۶۔

مطالبات ایک ایک کر کے رد کر دیئے گئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہیں ان کو مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جناح صاحب کو اس حقارت آمیز برتاؤ کا بہت صدمہ ہوا اور وہ اپنے ہوٹل چلے گئے۔ دوسرے دن وہ بذریعہ ٹرین کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔ میں انھیں خدا حافظ کہنے کے لیے اسٹیشن گیا تو وہ اپنے فسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ پکڑے کھڑے تھے، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ جمشید! آج سے ہمارے راستے الگ ہوتے ہیں[1]

بعد میں گاندھی جی نے مسٹر جناح سے اپنی معذرت پیش کی کہ "میں تو مسلمانوں کے مطالبات منظور کرنے کو تیار تھا مگر سکھوں نے اعلان کر دیا کہ اگر نہرو رپورٹ میں کوئی تبدیلی کی گئی تو ہم اس کانفرنس سے الگ ہو جائیں گے"[2]

واقعات تو پہلے بھی پیش آتے ہی رہے تھے۔ اختلافات بھی ہوتے رہے تھے اور جھگڑے فساد بھی چلتے ہی رہے تھے مگر ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں یہ تصور پہلی مرتبہ سامنے آ رہا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں اور جڑیں ہل رہی تھیں۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "اس واقعہ سے ملک کی قسمت پر مہر لگ گئی اور ہندو سیاستدانوں کی تنگ نظری کا مقابلہ نہ ہی ہو سکا"[3]

اس کے دو ہی سال بعد سنہ ۱۹۳۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس زیر صدارت پنڈت جواہر لال نہرو لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ کامل آزادی کی تجویز پاس کی جائے اور نہرو رپورٹ کی قرارداد کو منسوخ کر کے کہا گیا کہ اسے دریائے راوی میں غرق کر دیا گیا[4] یہ خود تو غرق ہی ہو گئی مگر ملک کی تقسیم کا سنگِ بنیاد رکھ گئی۔

---

[1] ہکٹر بولیتھو۔ جناح، ص ۹۴
[2] " " ص ۹۴
[3] خلیق الزماں۔ شاہراہ پاکستان۔ ص ۹۸
[4] روشن مستقبل ص ۳۰۲

لڑاؤ اور حکومت کرو

برطانوی حکومت نے اپنے زمانے کی بالکل ہی ابتدا ہی میں یہ راز پالیا تھا کہ ہندوستان میں جاسوسوں، سازشوں اور رشوت کے زور پر قبضہ کیا اور باقی رکھا جاسکتا ہے۔ مگر ۱۹۰۰ء کے شروع ہوتے ہوتے ہندوستان کے عوام اس قدر بیدار ہوگئے تھے کہ حکومت برطانیہ کی چولیں ڈھیلی ہونی شروع ہوگئیں۔ تمام ہندوستانی چاہے کسی بھی مذہب اور فرقے کے ہوں آپس میں شیر وشکر کی طرح متحد ہوگئے۔ پورا ملک اپنائیت اور بھائی چارہ کی فضاء سے سرشار تھا۔ ہندو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے، مسلمان بھارت ماتا کی جے پکارتے تھے۔ ہندو عید بقرعید میں شریک ہوتے تھے، مسلمان دسہرہ اور رام نومی کے تیوہاروں میں جاتے تھے۔ ہندو مسلمانوں کو مندروں میں لے جاتے تھے، مسلمان ہندوؤں کو مسجد کے منبروں پر کھڑا کرتے تھے۔

"حسب تحریک آل انڈیا مسلم کانفرنس انجمن اسلامیہ نے، ۱۱ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو جامع مسجد میں دعا کا انتظام اور خلافت ڈے کے اظہارِ درد وغم کو عملی صورت میں لانے کے واسطے ۱۶ر اکتوبر کو بوقت ۵ بجے تمام ہندو مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا تو اس میں بڑی تعداد میں ہندو شریک ہوئے۔ چنانچہ ۱۷ر اکتوبر کو تمام ہندو مسلمانوں نے اپنے اپنے کاروبار اور دوکانیں بند رکھیں اور جب مجمع نے درود شریف اور استغفار کا ورد کیا اور سب ننگے سر بادیدۂ پرنم دعا کے لیے کھڑے ہوئے تو کثیر تعداد میں ہندو بھائی بھی شریک ہوئے۔ بابو ابھے چرن وکیل، جگدمبا پرشاد وکیل، نولکشور وکیل اور بہت سے معززین نے تحریکِ خلافت میں ہندوؤں کی شرکت کا یقین دلایا۔"[1]

"دوسری خلافت کانفرنس بمقام دلی زیر صدارت مولوی فضل الحق کے سلسلے میں ۲۴ر نومبر ۱۹۱۹ء کے متحدہ اجلاس کا حال اخبارات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے،

[1] تحریکِ خلافت بحوالۂ اخبار مشرق گورکھپور اشاعت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

شرکا میں گاندھی جی، سوامی شردھانند، پنڈت کرشن کانت مالویہ، ڈاکٹر ساورکر، مسٹر شنکر لال اور مسٹر موہن جی وغیرہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس میں گاندھی جی نے تقریر فرمائی جس میں آپ نے خلافت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اور کہا کہ اگر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندو ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس کے بعد حکیم اجمل خاں نے ایک تجویز پیش کی کہ جب تک خلافت کا مسئلہ حل نہ ہو مسلمانوں کے لیے جشن صلح میں شریک ہونا ناممکن ہے۔ سوامی شردھانند نے نہایت پُرزور تقریر میں اس کی تائید کی۔ سید حسین، شری کانت مالوی اور مسٹر موہن جی وغیرہ نے بھی پُرجوش تائیدی تقریریں کیں۔[1]

"رولٹ بل کے پاس ہونے پر گاندھی جی نے اوائل ۱۹۱۹ء میں ستیہ گرہ کی بنیاد ڈالی۔ ہر ممبر عہد کرتا تھا کہ اگر رولٹ بل ہم پر نافذ ہوا تو ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے۔ اپریل میں ایک دن ستیہ گرہ منائی گئی۔ تمام ملک میں ہڑتال کی گئی۔ ہڑتال کی وجہ سے جب بازاروں میں مجمع ہوا تو پولیس اور فوج نے عوام الناس کو منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی۔ اس وقت سوامی شردھانند جو گورو کل کانگڑی ہردوار کے بانی تھے، دلّی میں موجود تھے، انھوں نے جلسوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت ہندو مسلمانوں میں اتحاد کی ایسی زبردست لہر دوڑ رہی تھی کہ مسلمانوں نے سوامی شردھانند کو جامع مسجد کے ممبر پر چڑھا کر اُن سے تقریر کرائی۔ امرتسر میں مسلمان رام نومی کے جلسے میں شریک ہوئے۔ جس کے بعد سر مائیکل اوڈائر لفٹننٹ گورنر نے ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کسی نامعلوم جگہ پر بھیج دیا۔"[2]

آزادی کے نشے اور دلوں کی اس یگانگت نے حکومتِ برطانیہ کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں اور اس نے یہ سمجھ لیا کہ ہندوستان میں ان دو قوموں ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ہی حکومت کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اتفاق، اتحاد، ہم آہنگی اور یک جہتی جو

---

[1] تحریکِ خلافت بحوالہ اخبار مشرق گورکھپور اشاعت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

[2] روشن مستقبل۔ ص ۳۶۳

صدیوں کی تند و تیز ہواؤں کے مقابلے میں بھی ثابت قدم رہتی چلی آئی تھی چند ہی دنوں میں حکومت برطانیہ کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کا شکار ہوگئی۔ پوری تفصیلات اور طویل واقعات اور اقتباسات پیش کرنے کے لیے تو الگ ہی دفتر چاہیے۔ اس مختصر صحبت میں تو ہم چند مختصر ہی سے دلائل اور شواہد پیش کر سکتے ہیں۔ بہت پہلے سے انگریزوں نے اپنی عافیت کے بارے میں خطرہ محسوس کرنا اور اس کے علاج کی تلاش شروع کر دی تھی۔

ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

"لارڈ منٹو نے جو کرزن کے بعد وائسرائے ہو کر آئے تھے، تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی فرقہ وارانہ کشیدگی سے پورا فائدہ اُٹھایا اور مسلمانوں میں تفرقہ بندی کی تحریک کو فروغ دینے کے لیے فرقہ وارانہ نمائندگی کا کارگر نسخہ تجویز کیا۔ انھوں نے یہ دکھانے کے لیے کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ مسلمانوں کے مطالبے پر جاری کیا جا رہا ہے، بڑا اہتمام کیا۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچیولڈ کے ذریعے سے نواب محسن الملک کو جو سرسید کے جانشین تھے، خفیہ پیغام بھجوایا کہ وہ سربرآوردہ مسلمانوں کا ایک ڈیلی گیشن لے کر وائسرائے کے پاس آئیں اور اپنے فرقے کے لیے رعایتیں طلب کریں جن میں یہ دو مطالبے بھی شامل ہوں کہ مسلمانوں کو ملازمتوں اور کونسلوں میں معقول تعداد میں نامزدگی کے ذریعے لیا جائے۔ اور جہاں انتخاب ضروری ہو وہاں جداگانہ انتخابی حلقے رکھے جائیں جن میں مسلمان امیدوار صرف مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہو۔ چنانچہ بقول مولانا محمد علی کے یہ "فرمائشی تماشہ" شملے میں کیا گیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک ایک عرضداشت پر ملک کے مختلف حصوں سے چار ہزار مسلمانوں کے دستخط لے کر ۳۵ سربرآوردہ مسلمان زمینداروں، تعلقداروں اور وکیلوں کے ایک وفد کے ساتھ وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وائسرائے نے ان کی معروضات کو "ہمدردی" کے ساتھ سنا اور واثق وعدہ کیا کہ نئی تنظیم میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے مسلمانوں کا تحفظ کیا جائے گا۔ شملے کے سرکاری حلقوں میں اسے بجا طور پر ایک تاریخی اہمیت

کا واقعہ سمجھا گیا۔ وائسرائے کی بیوی کو کسی سرکاری افسر نے ایک خط میں لکھا:

"یور ایکسیلنسی کو اس مختصر سے عرصے میں یہ اطلاع دینی ضروری ہے کہ آج ایک بڑی بات ہوئی۔ ایک مدبرانہ کارنامہ۔ جس کا اثر ہندوستان پر اور تاریخ ہندوستان پر مدتوں تک رہے گا۔ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان کے چھ کروڑ تیس لاکھ انسانوں کو بغاوت کیش مخالفوں کی صف میں شامل ہونے سے روک لیا گیا۔" (واضح رہے کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ تیس لاکھ تھی)۔

اس واقعے کے تین مہینے کے اندر مسلمانوں کی ایک جداگانہ سیاسی انجمن قائم کرنے کا کام جو نواب وقار الملک اور دوسرے لیڈروں کی کوششوں کے باوجود کئی برس سے نہیں ہو سکا تھا، حکومت کے فیضان سے بآسانی انجام پا گیا۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں سرآوردہ مسلمانوں کے ایک جلسے میں جو نواب وقار الملک کی صدارت میں ہوا "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس طرح مسلم فرقہ پروری کی سیاسی تحریک جو سرسید کے ہاتھوں کامیاب نہیں ہوئی تھی، ان کے جانشینوں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔[1] ان اقتباسات میں ایک تذکرہ رہ گیا کہ اس سلسلے میں جناب آغا جان کی سرگرمیاں پیش پیش تھیں اور وہ مسلم لیگ کے ابتدائی دور میں بڑی مدت تک اس کے صدر رہے۔ یہ بھی ایک لمبی اور طویل کہانی ہے کہ آغا جان، سرسید اور ان کے ساتھی حکومت برطانیہ کی وفاداری اور اس کی پالیسیوں اور ملک میں اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے کس کس طرح حق نمک ادا کرتے رہے اور کس طرح سرسید کالج کی پرنسپلی کے لیے مسٹر بیک، مسٹر ماریسن اور مسٹر آرچیبولڈ جیسے انگریزوں کو انگلینڈ سے لائے اور ان لوگوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے کے لیے کس طریقے سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ کالج کے ہندوستانی اور مسلمان ذمہ داران اگر ان انگریزوں کی پالیسی اور سیاست سے ذرا اختلاف کرتے تھے تو ان کو ممبری اور کالج کی عہدہ داری سے استعفیٰ دینا پڑتا تھا۔ یہ سارے حقائق ڈھکے چھپے راز نہیں ہیں۔ اس زمانے کی تاریخ، ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ذرا غور کیا جائے

---

[1] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، ص ۹۰

اور انصاف پسند نظروں سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اگر برطانوی حکومت کی پالیسیاں بلکہ سازشیں دونوں قوموں کو لڑانے کے لیے کام میں نہ آتیں تو اختلاف کی خلیج اتنی وسیع نہیں تھی کہ اسے پاٹنا مشکل ہوتا۔ بہر حال اب معاملے کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالیے۔

"۱۹۱۸ء تک کے ان بلوؤں نے جو جنگ عظیم اور خلافت کے زمانے میں ہوئے تھے ہندو مسلم اتحاد کو توڑا نہیں تھا اور اس اتحاد کے پختہ ہو جانے پر ستیہ گرہ، ہجرت اور ترک موالات کی تحریکیں چلی تھیں۔ جب گورنمنٹ نے ہندو مسلمانوں کے مشترک جلسوں اور جلوسوں کو دبانا چاہا تو اس کے خلاف ہوتے ہوئے ہندو مسلمان اور بھی متحد ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ چورا چوری کے واقعے کے بعد ۱۹۲۳ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھے بلا کر گفتگو کی اور اس گفتگو کے بعد جو صیغۂ راز میں رہی، ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی شردھانند نے مسلمانوں کی شدھی کا کام شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی، جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی۔ شدھی اور سنگھٹن چونکہ کانگریسی لیڈروں کے ہاتھوں شروع ہوئی تھیں اس لیے ملک میں طرح طرح کی چہ می گوئیاں اور بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ میں میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کریں۔ اس پر اخبار البشیر اٹاوہ نے اعتراض کیا کہ اس خالص تعلیمی جلسے کے قواعد و مقاصد کے خلاف ایک سرکاری عہدہ دار نے ایک خالص مذہبی مسئلہ کیوں چھیڑا۔ اور اس پر اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ جو بالآخر صحیح نکلا کیونکہ اس کے بعد ہی فوراً ہندو مسلمانوں کی طرف سے ملک میں شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ ہو گیا اور پھر جو بلوے ہونے شروع ہوئے ہیں تو انہیں کوئی قوت روکنے والی نہ تھی[1]۔"

---

[1] روشن مستقبل، ص ۳۷۹

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے آخر میں ان تمام سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مقصد معلوم کرنا ضروری ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اخبارات سے پتہ چلا کہ مسٹر پلوڈن جج ممالک متحدہ نے اپنے ایک دوست کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "مدت سے ہندوستان کی صورت حال قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا دورہ کر چکے ہیں، جو برطانوی افسران کے بغیر نہیں مل سکتی۔ برطانوی افسر زیادہ عرصہ تک نہیں رہیں گے۔ سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندوستانیوں سے بھر دیئے گئے ہیں اور بھرے جا رہے ہیں کہ آئندہ چند سالوں میں ان میں ڈھونڈے سے بھی انگریز کا نام نہ ملے گا۔ میں ان حالات میں ہندوستان کے مسئلے کا ایک ہی حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمان دو حصوں میں تقسیم کرایا جائے۔ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے ۳۵ سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ہندوستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک دیا ہے۔ اب ہمیں مالیہ معاف کر دینا پڑا ہے تاکہ کاشتکار زندہ رہ سکیں۔ یہ ایک نہایت ہی یاس انگیز صورتِ حال ہے۔ اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روک دیا جائے اور قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے کر دیئے جائیں۔ اگر ہندوستانی کاروبار تجارت نہیں کرنے دیں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر تجارتی بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے[1]۔

ان حالات اور واقعات کے پیش نظر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ہندو مسلم تفرقہ کو ایک تیسری طاقت اور سیاست نیز سازش کا نتیجہ سمجھتے تھے، انھیں یقین تھا کہ اس اختلاف کے ذریعے سے برطانوی یا مغربی سامراج ایشیا میں اپنے استعماری پنجے گاڑے رکھنے کی تدبیر کر رہا ہے۔ اگر اس کی یہ چال کارگر ہو گئی اور ہندو مسلمان میں یک جہتی اور ہم آہنگی نہ پیدا ہو سکی تو مغربی طاقتوں کو ایشیا میں اپنا مرکز اور اڈہ برقرار رکھنے کا ذریعہ ہاتھ آجائے گا۔ اپنے اسی خیال اور نظریہ کے مطابق ان لوگوں نے اپنی ساری سیاسی جدوجہد ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی سالمیت اور آزادی کے لیے وقف کر دیں۔

[1] حیات شیخ الاسلام ص ۱۴۶ بحوالہ سنڈے گرافک و مدینہ بجنور ۲۱ راگست ۱۹۳۱ء

جمعیۃ علماء اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سرگرمیاں

گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند بنیادی طور پر ملک کی آزادی اور اہل ملک میں اتحاد و اتفاق کی حامی تھی۔ مگر ابھی تک اس کا قانونی رابطہ اور پالیسی میں اتفاق کانگریس کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ وہ بلاکسی شرط کے مکمل آزادی کی علمبردار تھی۔ اور حکومتِ برطانیہ کے ساتھ ہر قسم کے اشتراک اور اس سے کسی قسم کی رعایت حاصل کرنے کے خلاف تھی۔ یہ ان علمائے دین کی جماعت تھی جنھوں نے زندگی سکھ اور چین نیز دنیا کی راحتیں اور آرام سب کچھ قوم اور ملک کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ یہ برطانیہ کے ساتھ کانفرنسوں، اسمبلیوں اور ممبریوں کو نہ صرف یہ کہ غلط بلکہ قومی مصالح کے لیے ناجائز سمجھتے تھے۔ کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی آل پارٹیز کانفرنس اور اس قسم کی دوسری چھوٹی بڑی جماعتیں حکومتِ برطانیہ کے ساتھ مشورے بھی کرتے تھے، ان کی اسمبلیوں کے ممبر بھی بنتے تھے، وزارتیں بھی حاصل کرتے تھے، لندن کے سفر اور گول میز کانفرنسوں میں شرکت بھی کرتے تھے، وائسرائے کے مہمان بھی بنتے تھے اور بڑے بڑے انگریز عہدہ داروں اور افسران کے ساتھ پارٹیوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے ان کی سرگرمیوں کا نقشہ بڑے بلیغ انداز میں کھینچا تھا ؂

کام لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

مگر جمعیۃ علماء نے بہت دن پہلے اپنے چوتھے اجلاس بمقام لاہور ۱۹۲۵ء میں یہ تجویز پاس کی کہ حکومت برطانیہ کی کونسلوں کی ممبری حرام ہے[۱]۔ اور ۱۹۲۶ء میں اپنے اجلاس بمقام کلکتہ میں مکمل آزادی کا یہ ریزولیشن پاس کیا: "چونکہ برادرانِ وطن کے

[۱] روشن مستقبل: ص ۶۲

مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرائیں۔ البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اتحادِ عمل کیا جائے[1]۔

اس کے بعد ملک کی مختلف مسلم سیاسی جماعتوں نے جمیعۃ علماء کے اس مسلک سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی ایک متحدہ تنظیم نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کے نام سے قائم کی۔ لیکن اس کی سربراہی اور رہنمائی جمیعۃ علماء ہی کے ہاتھ میں رہی۔ کانگریس بڑی تیزی کے ساتھ مکمل آزادی کی طرف آ رہی تھی اس لیے جمیعۃ علماء اور نیشنلسٹ مسلمانوں میں بڑی حد تک فکری اور سیاسی ہم آہنگی مضبوط ہوتی گئی۔

"۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تیس دوسرے قوم پرور مسلمان لیڈروں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس قائم کی۔ اگرچہ ان کی سرگرمیوں کا اصل مرکز بدستور کانگریس کا کام رہا۔ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس اپنی کوئی مستقل جداگانہ تنظیم قائم نہیں کر سکی لیکن قوم پرور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں جمیعۃ علماء، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، مجلس احرار اور خان عبدالغفار خاں کی تنظیم کے لیے مشترک پلیٹ فارم کا کام دیتی رہی[2]۔"

تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے یہ ضرور دھیان میں رہے کہ جمیعۃ علماء کی جد و جہدِ آزادی اور دوسرے مسلمانوں کی سرگرمیاں اس وقت سے پہلے شروع ہو گئی تھیں جب کانگریس نے آزادی کا ریزولیشن پاس کیا۔ "۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کی رات تھی۔ جب گھڑیال نے آدھی رات کا گجر بجایا۔ اور پرانے سال نے نئے سال کے لیے جگہ خالی کرنے کو رخت باندھا تو آزادی اور اس کے لیے جد و جہد کا ریزولیشن کانگریس کے ہزارہا نمائندوں کے مجمع میں تقریباً اتفاق رائے سے پاس کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے مخالفت میں آواز اٹھائی مگر ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی[3]۔"

---

[1] روشن مستقبل، ص ۹۰۔ [2] ہندوستانی مسلمان، عابد حسین، ص ۱۴۷۔ [3] جواہر لال نہرو آٹو بائیوگرافی، ص ۲۰۱۔

تیسری گرفتاری جمیعۃ علماء اور کانگریس میں اتحادِ فکر

حضرت کی سیاسی سرگرمیوں کا اصل مرکز اور پلیٹ فارم شروع سے آخر تک جمیعۃ علماء ہی رہی۔ فکر اور پالیسی کے اتحاد کا موقع آیا تو حضرت کانگریس کے بھی ممبر ہوئے اور بعض دوسری جماعتوں کے مؤید و مددگار بھی رہے مگر اساسی اور اصولی طور پر نہ صرف یہ کہ جمیعۃ کے ممبر رہے بلکہ اپنی ابتدائی سیاسی زندگی کے وقت سے اس کی قیادت اور سرپرستی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ہرچند کہ علماء کرام کی یہ جماعت اپنے سیاسی نظریات کی بناء پر کانگریس سے کافی حد تک ہم آہنگ تھی مگر ان دونوں کے درمیان اختلاف رائے کے نکات بھی موجود تھے۔ ملک کی دوسری جماعتوں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی آل پارٹیز وغیرہ کی طرح کانگریس اور اس کے افراد بھی برطانوی ہندوستان کی اسمبلیوں کی ممبری قبول کرتے تھے، حکومت کے ساتھ مشورے اور میٹنگیں کرتے تھے، وزارتیں بناتے تھے، لندن کے سفر اور گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرتے تھے، وائسرائے کی اور دوسرے انگریز افسروں کی پارٹیوں میں حاضر ہوتے تھے۔ ان سرگرمیوں کا نقشہ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے بڑے بلیغ انداز میں کھینچا تھا۔ ؎ قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ، لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ۔ اس کے برخلاف جمیعۃ علماء اُن بے غرض، بے نفس اور بے خوف علماء کی جماعت تھی جنھوں نے زندگی کے سارے ہی سکھ چین، دنیا کی سب راحتیں و آرام اور گھر بار کے تمام عیش و عشرت غرض سب ہی کچھ ملک اور قوم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے تھے۔ یہ حضرات برطانیہ کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کو اُن کی کونسلوں کی ممبریوں کو اور ان کی حکومتوں کی وزارتوں کو نہ صرف بے فائدہ اور ضیاع وقت بلکہ قومی مصالح کے لئے ناجائز قرار دیتے تھے۔ جمیعۃ علماء ہند نے اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ لاہور میں یہ تجویز پاس کردی تھی کہ برطانیہ کی کونسلوں کی ممبری حرام ہے۔[1]

[1] روشن مستقبل، ص ۲۱۴

علماء کرام نے اب تک جو جدوجہد کی تھی، جو قربانیاں دی تھیں اور جو جہاد کیا تھا وہ محض لوجہ اللہ اور اپنے بل بوتے پر کیا تھا اور اس باب میں کسی کی تائید یا تنقید کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ آزادی وطن کے لئے اتحاد فکر کے باوجود جس موقع پر اور جہاں بھی ضرورت ہوئی ان لوگوں نے کانگریس سے کھل کر اختلاف کیا۔ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر ایک مدت تک جمعیۃ علماء اور کانگریس میں اختلاف رہا اور جمعیۃ کے صدر مفتی کفایت اللہ نے رپورٹ کے خلاف بیان دیا۔ ۱۹۲۸ء میں ایک مسودہ 'قانون شاردا ایکٹ' کے عنوان سے پیش ہوا جس کی رو سے نابالغ لڑکی کا نکاح خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اس قانون کا مقصد ہندو عورتوں کی حفاظت تھا جن کی شادیاں چار پانچ برس کی عمر میں ہو جاتی تھیں۔ پانچ چھ برس کا شوہر کبھی کبھی بچپن ہی میں داغ مفارقت دے کر چھ سات برس کی بچی کو بیوہ کر جاتا تھا۔ اور پھر اس بچی کو پہاڑ ایسی زندگی ایک ہندو بیوہ کے قانون کے رُو سے سسک سسک کر گذارنی پڑتی تھی۔ ہندو عورت کے لئے یہ بل مفید تھا مگر اسلامی شریعت میں اس بل سے بے جا دخل اندازی اور مخالفت ہوتی تھی۔ کانگریس نے اس کی حمایت کی مگر جمعیۃ علماء نے پوری قوت کے ساتھ مخالفت کی اور اس کے خلاف جلسے اور مظاہرے کئے، بعض امور میں کانگریس کی طرف سے کھل کر مسلمانوں کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ جمعیۃ علماء نے علی الاعلان ایسے معاملات پر نکتہ چینی کی اور کانگریس کے رویہ پر اظہار ناراضگی کیا۔ کانگریس برطانیہ کے ساتھ گفت و شنید اور اصلاحات کے مراحل میں تھی جب جمعیۃ علماء نے آزادی کامل کا مطالبہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ اگر ہندو مسلمانوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ نہیں کر سکتا تو مسلمانوں کو اپنا راستہ خود تلاش کرنا چاہیئے۔ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ نے اپنے اجلاس کلکتہ میں یہ ریزولیشن پاس کیا، "چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اس لئے مسلمان منظم ہو کر اپنے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرائیں۔ البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحاد عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے۔"[1]

---

[1] روشن مستقبل، ص ۲۵۰

جمیعۃ کی اس آواز پر ملک کی ساری ہی حریت پسند اسلامی جماعتوں نے لبیک کہا اور سب نے مل کر متحدہ فکر اور مقصد کے تحت پلیٹ فارم نیشنلسٹ مسلم تنظیم کے نام سے قائم کیا۔ اس تنظیم کی قیادت اور مرکزیت جمیعۃ علماء ہند ہی کی ذمہ داری رہی۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنی جس رائے کا اظہار کیا ہے راقم الحروف کے مشاہدے کے مطابق اس میں کسی قدر ترمیم ہونی چاہیئے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی کوئی دفتری اور ظاہری تنظیم بے شک نہیں تھی مگر معنوی طور پر اس میں شریک ساری ہی انجمنیں منظم اور متحد تھیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی سرگرمیاں کانگریس سے اس وقت ہم آہنگ ہوئیں جب اس نے ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تیس دوسرے قوم پرور مسلمان لیڈروں کے ساتھ مل کر نیشنلسٹ مسلم کانفرنس قائم کی۔ اگرچہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز بدستور کانگریس کا کام رہا۔ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس اپنی کوئی مستقل جداگانہ تنظیم نہیں قائم کرسکی۔ اور قوم پرور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں، جمیعۃ علماء، شیعہ پولیٹکل کانفرنس، مجلس احرار اور خان عبدالغفار خاں کی تنظیم کے لئے مشترک پلیٹ فارم کا کام دیتی رہی۔"[1]

اسی سال میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو رات کے ۱۲ بجے کانگریس نے آزادی کا ریزولیشن پاس کیا۔ یہ واقعہ ریزولیشن پیش کرنے اور اُسے پاس کرانے والے ہی کی زبانی سن لیجیے:

"۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کی رات کو جب گھڑیال نے آدھی رات کا گجر بجایا اور پرانے سال نے نئے سال کے لئے جگہ خالی کرنے کے لئے رختِ سفر باندھا اس وقت کانگریس کے ہزار ہا نمائندوں کے مجمع نے اتفاق رائے سے آزادی اور اس کے لئے جدوجہد کا ریزولیشن پاس کیا۔ کچھ لوگوں نے مخالفت میں بھی آواز اٹھانی چاہی۔ مگر وہ تعداد میں اتنے کم تھے کہ ان کی آواز دب کر رہ گئی۔"[2]

اس پالیسی اور مکمل آزادی کی سیاست پر گامزن دیکھ لینے کے بعد ہی جمیعۃ علماء اور

---

[1] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ ص ۱۴۷

[2] جواہر لال نہرو خود نوشت سوانح۔ ص ۲۰۱

نیشنلسٹ مسلمانوں نے کانگریس کے ساتھ مکمل اتحادِ عمل اختیار کیا۔ ورنہ اس سے پہلے بعض مسائل میں اختلاف و اعتراض کی نوبت آتی ہی رہتی تھی۔ جمعیۃ علماء نے ایک ریزولیشن کے ذریعہ یہ طے کیا کہ مسلمان جنگِ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش برابر کا حصہ لیں۔ یہ ریزولیشن جمعیۃ کے اجلاس امروہہ میں پاس ہوا اور اس اجلاس کے صدر حضرت رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اگرچہ اس وقت جمعیۃ کے مستقل صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب تھے مگر حضرت رحمۃ اللہ جنگِ آزادی کے میدانوں میں جمعیۃ کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی لئے یہ تاریخی فیصلہ آپ ہی کی زیرِ صدارت عمل میں آیا۔

۱۹۳۲ء میں دونوں جماعتیں کانگریس اور جمعیۃ علماء خلاف قانون قرار دی گئیں تو جمعیۃ علماء نے مجلسِ عاملہ کی جگہ جماعت کو متحرک رکھنے کے لئے ڈکٹیٹر مقرر کئے۔ ان میں تیسرے ڈکٹیٹر حضرت رحمۃ اللہ منتخب ہوئے۔ پہلے دو صاحبان حضرت مفتی صاحب صدر جمعیۃ اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ تھے۔ ڈکٹیٹر صاحبان مقررہ پروگرام کے مطابق جلسہ میں تحریک سول نافرمانی کی حمایت میں تقریر کرتے تھے اور مطبوعہ پمفلٹ تقسیم کرتے تھے۔ اور تقریر ختم ہوتے ہی گرفتار کر لئے جاتے تھے۔[1] چنانچہ اسی پروگرام کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ سول نافرمانی کے لئے دیوبند سے روانہ ہوئے تاکہ دہلی پہنچ کر نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کر سکیں۔ گورنمنٹ کی نگاہوں میں حضرت کی سول نافرمانی اور تقریر کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ آپ کی آواز پر لاکھوں مسلمان بلکہ ہندو بھی گرفتاری دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ اور صورت حالات حکومت کے قابو سے باہر ہو جائے گی۔ آپ کی محبوبیت، مقبولیت اور عظمت و عزیمت کا حکومت کئی بار مشاہدہ و تجربہ کر چکی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی ٹرین حضرت کو لے کر روانہ ہوئی۔ دوسرے یا تیسرے ہی اسٹیشن مظفر نگر پر مسلح گارڈ نے پوری گاڑی کا محاصرہ کر لیا۔ اُس وقت حضرت کے بیرون میں زخم یا پھنسیوں کی تکلیف تھی اور زیادہ دور چلنا متعذر تھا۔ مگر اسی حالت میں آپ

---

[1] حیات شیخ الاسلام۔ ص ۱۳۳

اپنے پروگرام کی تکمیل اور گرفتاری کے لئے میدانِ جہاد کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ افسران حکومت نے وارنٹ گرفتاری پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وارنٹ سہارن پور کی کلکٹری سے جاری ہوا ہے اور میں اس وقت اس کی حدود سے باہر ہوں اس لئے وارنٹ میرے اوپر تعمیل نہیں ہو سکتا۔ حکومت نے گرفتاری کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اسی وقت دوسرا وارنٹ جاری کرایا گیا اور حضرت کی گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ حضرت کی تیسری قید تھی جو صرف ایک یا ڈیڑھ ہفتہ جاری رہی۔

اب کانگریس، جمعیۃ علماء اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک پلیٹ فارم اور ایک مقصد پر جمع ہو جانے کے بعد تحریک آزادی کی روح جو اب تک بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی آزاد ہو کر ملک کی گلی گلی اور کوچے کوچے بلکہ ذرّہ ذرّہ میں کارفرما ہو گئی۔ اس جگہ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قافلہ آزادی کو اس منزل تک پہنچنے میں جس عزم و حوصلے اور قوت و ہمت نے سہارا اور روشنی دی وہ ملک کے سارے ہی بسنے والے عوام کا اتفاق و ہم آہنگی تھی اور ان بسنے والوں میں مختلف فرقوں اور مذاہب کے ماننے والے تھے جو ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ایک جماعت اور ایک ہی قوم کے افراد تھے۔ بہتر ہوگا کہ اس موقع پر ہم ہندوستانی قومیت کے مسئلہ اور تفصیل پر ایک نظر ڈالتے چلیں کیوں کہ یہ مسئلہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی مسلک کا ایک اہم جزو تھا۔

ہندوستانی قومیت کی بُنیادیں

ہندوستان میں رہنے والی مختلف نسلوں اور طبقات کے درمیان رواداری اور پاسداری کی تاریخ بہت پرانی اور اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ قصہ شہنشاہ بابر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جس نے اپنے ولی عہد کو مذہبی رواداری اور اتحاد و اتفاق کی وصیت کی تھی۔ اس کے بعد یہی پالیسی اکبر اعظم، اورنگ زیب اور شاہجہاں کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہوئی آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک پہنچی تھی جس نے ہندوستان کے سبھی فرقوں اور طبقات کو یکساں نظر سے دیکھا تھا۔ مگر اتنی طول و طویل تاریخ کا بیان اور تفصیل اور ان پر دلائل و شواہد تو مورخین ہی کے بس کی بات ہے ہم کو تو اپنے موضوع کی رعایت سے ضرورت کی حدود میں ہی ایک اچٹتی ہوئی نظر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کی تاریخ سے اپنے زمانے کے ماحول تک ڈال لینی ہے تاکہ اصحاب فکر و نظر کو کچھ گمشدہ کڑیوں اور بھولے ہوئے قصوں کی طرف توجہ دلا سکیں۔ مذکورہ جہاد آزادی میں جس طرح ہندوستان کی مختلف اقوام نے شانہ بشانہ اور شیر و شکر ہو کر ہم آہنگی اور یک جہتی کا ثبوت دیا وہ کسی شہادت اور وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن، بہادر شاہ ظفر نے بادشاہ ہونے کی حیثیت سے جس اتحاد و اتفاق کی پالیسی اختیار کی وہ اہمیت کے ساتھ غور کرنے کے لائق ہے، اس وقت کی سلطنت کا رجحان اس خبر سے ظاہر ہوتا ہے:

> "ہزار شکر اور لاکھ احسان ایزد منان کے۔ کہ روز مبارک عید قربان، شر شریران بد آئین اور فساد معاندین دین یعنی فریب فرنگیان بے دین سے بخیریت گزرا اور ہنود و اہل اسلام میں بھی بابت گاؤ کشی کسی طرح کا جھگڑا نہیں ہوا۔ دونوں گروہ آپس میں ہم چو شیر و شکر ملے رہے۔ یہ سب نتیجہ اقبال مندی ہمارے شہنشاہ دین پناہ خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ، اور احسن الرائے سقراط زماں و بقراط دوراں لقمانِ عصر و جالینوس دہر احترام الدولہ بہادر حکیم احسن اللہ خاں وزیر اعظم اس سلطنت کا ہے۔"[1]

[1] صادق الاخبار ہفتہ وار دہلی مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ بحوالہ ۱۸۵۶ء اخبار اور دستاویزیں از مکتبہ شاہراہ دہلی

شہنشاہ ہندوستان کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد کی کیا قیمت تھی، حکومت کے نزدیک کس طرح ملک کے سب ہی باشندے یکساں اور برابری کا درجہ رکھتے تھے اور عوام کیسے باہم شیر و شکر تھے، یہ سارے حقائق اخبار کی مذکورہ بالا خبر سے خوب خوب ظاہر ہوئے ہیں۔ ایک خاص نکتہ اس میں اور بھی محل نظر ہے۔ اس وقت تک ہندوؤں کے لئے اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ قوموں کا لفظ رائج نہیں تھا۔ بلکہ ان کو ملک کے دو الگ الگ گروہ کہا اور لکھا جاتا تھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کو الگ قوم سمجھنے اور کہنے کی سیاست بعد میں ایجاد ہوئی ہے۔ اسی ذیل میں بادشاہ سلامت کا ایک فرمان بھی توجہ کا مستحق ہے، تیس جولائی ۱۸۵۷ء کو شاہی عدالت سے ایک فرمان صادر ہوتا ہے:

> "حکم نامہ بنام جملہ افسران افسران پلٹن و رسالہ ہائے دروازہ ہائے شہر چونکہ حضور کو منظور نہیں ہے کہ شہر میں گاؤکشی ہونے پائے لہٰذا واسطے بندوبست اس امر کے سب کو اصدار حکم ہوتا ہے کہ تاریخ امروزہ سے تاریخ دہم ذی الحجہ ۲۱ سنہ جلوس روز شنبہ عید الفطر (کذا) تک کوئی قصاب مادہ گاؤ یا نر گاؤ شہر میں لانے پائے تاکہ یہ امر ظہور میں آوے۔ اور بندوبست بھی اس امر کا رکھو کہ کوئی شخص ایسا نہ کرنے پاوے۔ تاکید جانو۔ مرقوم ۸ ذی الحجہ ۲۱ سنہ جلوس (مطابق ۳۰ جولائی ۱۸۵۷ء) مہر کچہری سپہ سالار بہادر۔"[1]

میدان جنگ میں بہادر شاہ ظفر کا پلہ کمزور پڑ گیا تو برطانوی سامراج کھل ناچا۔ خوں ریزی، خون آشامی، ظلم اور انتقام اور وحشت و بربریت کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا جو ہندوستانی عوام پر آزمایا نہ گیا ہو۔ ان حالات کی تفصیلات بہت صبر آزما اور روح فرسا ہیں۔ لکھنے والے کا کلیجہ منہ کو آجائے اور پڑھنے والوں کی آنکھوں سے خون ٹپک پڑے۔ مختصر یہ کہ ان مصائب اور آلام کے ماحول میں سر سید احمد خاں نے جس عزم، ہمت، جانسوزی

---

[1] اٹھارہ سو ستاون کی دستاویزیں، ص ۲۷۳، مطبوعہ مکتبہ شاہراہ دہلی

اور بے غرضی کے ساتھ ملک کے باشندوں اور خصوصاً مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی و تعمیر کی خدمات انجام دیں اُن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کارناموں کا تذکرہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہیں۔ سید صاحب کے کچھ خیالات اور بعض کام ایسے ضرور ہیں کہ اُن پر اعتراضات کئے گئے اور اُن سے اختلاف کیا گیا۔

مگر اختلاف و اعتراض عظمتوں اور بڑائیوں کے لئے لازمی اور اہم اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر سید صاحب کے اخلاص، کارہائے نمایاں اور اصابت رائے سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ملکی معاملات میں رائے بہت صائب اور ان کا فیصلہ بڑا مستحکم ہوتا تھا۔ ہندو مسلم تعلقات و اتفاق اور متحدہ قومیت کے بارے میں سرسید کے خیالات اور فیصلہ بہت غور سے ملاحظہ فرمائیے:

"ملک پر جب ہم انسان کا لفظ اطلاق کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جس طرح انسان میں مختلف قویٰ اور مختلف اعضا ہیں جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے اسی طرح ملک میں بھی مختلف قومیں اور مختلف اشخاص ہیں جن پر ملک کی سرسبزی اور ترقی اور بھلائی کا بلکہ مختصر طور پر کہوں کہ ملک کی زندگی کا دارومدار ہے۔ پس! جو لوگ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگان ملک کی بھلائی کے لئے کوشش کریں، کیوں کہ جس طرح ایک انسان کی اس کے تمام قویٰ اور تمام اعضا کے صحیح و سالم رہے بغیر زندگی یا پوری تندرستی محال ہے اسی طرح ملک کے تمام باشندوں کی خوش حالی اور بہبودی کے بغیر ملک کی پوری زندگی یا پوری ترقی ناممکن ہے۔

اے میرے دوستو! تمہارے ملک میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں۔ جس طرح انسان میں بعض اعضائے رئیسہ ہیں اسی طرح ہندوستان کے لئے یہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس

کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کیا خوب کہا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دو حصّے ہیں اس کے دل کا خیال یا عقیدہ خدا کا حصّہ ہے۔ اور اس کے اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی اس کے ابنائے جنس کا حصّہ ہے۔ بس خدا کے حصّہ کو خدا پر چھوڑ دو اور جو تمہارا حصّہ ہے اس سے مطلب رکھو۔

اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے، ہندو اپنا ملک بھول گئے۔ اپنے دیس سے پردیسی بننے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا۔ اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا۔ اور یہ جانا کہ ہمالیہ اور بندھیاچل کے درمیان ہمارا ہی وطن ہے۔ ہم کو بھی اپنا وطن چھوڑے سیکڑوں برس ہو گئے۔ نہ وہاں کی آب و ہوا ہم کو یاد ہے نہ اُس ملک کی فضا کی خوبصورتی، نہ وہاں کے پھلوں کی تر و تازگی اور نہ میووں کی لذت، اور اپنے مقدس ریتیلے اور کنکریلے ملک کی برکت۔ ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اپنے سے پیش قدموں کی طرح ہم بھی اس ملک میں رہ پڑے۔ بس! اب ہندستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئی ہیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لی ہیں۔ یہاں تک ہم دونوں آپس میں مل کر ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اُردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔ بس! اگر ہم اُس حصّہ سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصّہ ہے قطع نظر کرلیں تو درحقیقت ہندستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت، ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں

برباد ہونے والے ہیں۔ افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔ اور آپس میں ان دونوں قوموں کے تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اُس مضرت اور نقصان میں وہ خود بھی شامل ہیں اور اپنے پاؤں پر کلھاڑی مارتے ہیں۔

اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دولھن کے مانند ہے، جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دولھن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کریں گے تو وہ کانی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو تو اس دولھن کو بھینگا بناؤ چاہو کانا۔

بے شک! انسانوں میں باہم کبھی کبھی رنج ہو جانا ایک قدرتی بات ہے، ہندو اور مسلمانوں پر موقوف نہیں ہے۔ آپس میں ہندو ہندوؤں میں مسلمان مسلمانوں میں بھائی بھائیوں میں، ماں بیٹیوں میں رنج ہو جاتا ہے مگر اس رنج کو قائم رکھنا اور بکائے جانا اور بڑھائے جانا انسان کی، ملک کی، قوم کی، خاندان کی پوری بدبختی ہے۔ کیا مبارک ہیں وہ لوگ جو معافی چاہتے ہیں اور اس گرہ کو کھولنے میں جو محبت میں اتفاق سے پڑگئی ہے، پیش قدمی کرتے ہیں اور اپنے بھائی یا ہموطن باہم قوم سے بے قصور ہونے پر بھی معافی چاہتے ہیں۔[1]

یہ اُن سرسید کا موقف ہے جو اپنی وفات کے ایک صدی بعد بھی قوم کی معاشی، ذہنی اور سیاسی تربیت کرتے رہے ہیں، انہی کے اوپر یہ الزام ہے کہ اُن کے خیالات اور پالیسی سے مسلم فرقہ پرستی کے بیج کی آبیاری ہوئی ہے۔ اور یہ اتہام بھی ہے کہ انھوں نے برطانوی سیاست کی موافقت اور تحریک آزادی کی مخالفت کی ہے۔ موقع ہوتا تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں،

---

[1] مجموعہ لکچرز سرسید۔ ص ۱۵۱

مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، فخر الدین علی احمد، مولانا ابو الکلام آزاد اور اُن جیسے ہزاروں دوسرے ہندوستانی ہیروؤں کا، جن کی علمی، ذہنی اور فکری تربیت سرسید کے افکار کی مرہون منت تھی، تفصیلی بیان اور ملک کے لئے ان کی خدمات کا پوری طرح تذکرہ کیا جاتا۔ مگر نہ تو اتنا وقت ہے نہ اس موضوع سے ہمارا کوئی تعلق ہے۔ ہمیں تو متحدہ قومیت کے بارے میں اس عظیم شخصیت کے خیالات اور رائے پیش کرنی مقصود تھی۔ کوئی کیسا ہی متعصب، فرقہ پرست اور تنگ نظر ہو مگر ان حقائق سے انکار اس کے لئے آسان نہ ہوگا۔ ہندوستان میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ مل جل کر تو رہتے ہی ہیں مختلف کلچر اور تہذیبیں ایک دوسرے سے متاثر تو ہوتی ہی ہیں، ملک کے سارے ہی باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک ہی فضا میں پروان چڑھتے ہی ہیں، ملک ہی کی تعمیر و ترقی پر اس کے باشندوں کی فلاح و بہبودی کا انحصار بھی ہے۔ ان دلائل اور سچائیوں سے کوئی چاہے بھی تو کیسے انکار کر سکتا ہے۔ اس پہلو پر بھی توجہ کیجیے کہ یہ تقریر آج بھی اتنی ہی دل نشیں اُسی قدر پُر اثر اور ویسی ہی نفع بخش ہے جیسی آج سے سو برس پہلے جب یہ کی گئی تھی تب تھی۔

متحدہ قومیت کے مسئلہ پر موصوف کا ایک صاف صاف اعلان بھی سنتے چلئے:

> "قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو! ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو بھی اس ملک کے رہنے والے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں کبھی جائیں۔"[1]

سرسید کے بعد متعدد مصلحین اور معماران قوم آئے جنھوں نے بالکل اسی نظریہ کی اشاعت و تعلیم دی۔ کسی قدر آگے چل کر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا اسم گرامی اس باب میں بہت

[1] روشن مستقبل، ص ۲۴۲ بحوالہ مجموعہ لکچرز

نمایاں اور مشہور ہوا۔ موصوف کی شاعری، ان کا فلسفہ، ان کا پیغام اصحاب علم اور اہل نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وطن اور اہل وطن کے درمیان اتفاق اتحاد اور قومیت کے بارے میں بھی آپ کا نظریہ اور مسلک آج بھی ہندوستان کے لئے قابل فخر اور لائق تقلید ہے، آپ نے ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ ذیل نظم ضرور ہی پڑھی یا سنی ہوگی۔ آج تو دنیا ہی اُلٹ گئی دماغ پلٹ گئے۔ مگر آج سے تیس پینتیس برس پہلے تک مشکل ہی سے کوئی ہندوستانی ایسا ہوگا جس نے یہ الہامی شعر نہ سنے ہوں۔ بہرحال ایک بار پھر مشام جان کو معطر کر لیجئے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو — اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

یہ بھی اُسی اتحاد و اتفاق اور متحدہ قومیت کا نغمہ بلکہ تبلیغ ہے، جس پر شہنشاہ ظفر اور سر سید نے ہندوستانی قومیت کی بنیاد رکھی ہے۔ جو اصحاب علم ڈاکٹر صاحب موصوف کے دینی خیالات سے واقف ہیں وہ آپ کے افکار اور پیغام کی قیمت سے بھی متعارف ہوں گے۔ اس موقع پر شاعر مشرق بلکہ حکیم مشرق کے کچھ اور بیش بہا خیالات بھی پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا — واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ملاحظہ فرمایئے۔ اتحاد، اتفاق، محبت اور صلح و آشتی اور سب سے بڑھ کر وطن پروری بلکہ وطن پرستی کا کیسا کیسا جذبہ ڈاکٹر صاحب کے پیغام سے پھوٹ پھوٹ کر نمایاں ہو رہا ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کا اسم گرامی کسی تعارف کا مرہون منت نہیں ہو سکتا جہاں بھی اور جب بھی کوئی آزادئ ہندوستان کی تاریخ پڑھے گا، لکھے گا یا معلوم کرے گا اس کی نگاہوں سے اس فقید المثال مجاہد کا نام اوجھل نہیں ہو سکتا جس نے ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے بھرے اجلاس میں آزادئ کامل کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"مہاتما گاندھی نے ناگپور کانگریس میں کہا تھا کہ اگر پنجاب اور خلافت کے مظالم کی گورنمنٹ نے تلافی نہیں کی تو مکمل آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اب جبکہ اس تجربہ میں ایک سال ضائع ہو گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ گاندھی جی اپنا وعدہ پورا کریں۔ پنجاب اور خلافت کے مظالم کا حل اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک برطانوی امپیریلزم کو تباہ نہ کیا جائے اور آزادئ کامل کی طرف قدم نہ بڑھایا جائے۔"[۱]

اس وقت کانگریس نے بھی اس تجویز کو رد کر دیا تھا اور پھر پورے دس برس بعد آزادی کی تجویز پاس کی۔ انہی مولانا حسرت نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ کے چودھویں اجلاس بمقام احمد آباد کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

"حضرات قبل اس کے کہ میں مسلم لیگ کی کمزوری کی وجوہات بیان کروں بہتر ہوگا کہ میں لیگ کے اغراض و مقاصد کا اعادہ کر دوں، جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہندوستانیوں کا ہر ایک باامن اور جائز طریقہ سے حصول سوراج۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر اقوام میں دوستی اور اتحاد کو ترقی دینا۔

---

[۱] مرقع اجتماعات احمد آباد۔ ص ۴۳

(۳) لیگ کا تیسرا مقصد ہندو مسلم اتحاد کو ترقی دینا ہے جو لیگ اور کانگریس کا متحدہ مقصد ہے۔[لہ]

مولینا حسرت موہانی کے بیان کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کی پالیسی بھی سامنے آگئی۔ آج کس کو یقین آئے گا کہ مسلم لیگ کبھی ایسی بھی رہی ہوگی ؎ ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔

یادش بخیر! مولانا محمد علی جوہر کا نام نامی تو آپ میں سے بہتوں نے سُنا ہوگا۔ ایک زمانہ میں ہندوستان کے بچے بچے کی زبان اور گلی گلی میں ان کا نام گونجتا تھا۔ کہیں کہیں تو اب بھی یہ آوازیں محفوظ ہوں گی:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اُترنا — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اگر اب تک نہیں سُنا تھا؟ تو آج سُن لیجے کہ یہ مولینا محمد علی وہ ہیں جنھوں نے ہندوستان کے ذرّے ذرّے میں آزادی کی روح بیدار کی تھی، گاندھی جی کو پورے ہندوستان میں روشناس اور مقبول کرایا تھا۔ اور انڈین نیشنل کانگریس کو ملک کی مضبوط ترین اور مکمل جماعت بناکر حب الوطنی، جہاد آزادی اور جراءت و بہادری کی مثال قائم کردی تھی۔ اسی خلافت کے میں جس کا ذکر ابھی آپ نے پڑھا اور جس کے مولینا صدر اور قائد تھے، گاندھی جی نے ۱۹۲۲ء

لہ " " ص ۱۶۷

میں اپنے اخبار ینگ انڈیا میں فرمایا:

"اگر میں پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک کے ساتھ حصہ لیتا۔ یہ خلافت ہی کی تحریک تھی جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔ اب میں پھر آسے سونے نہ دوں گا۔"[۱]

گاندھی جی کا یہ اعلان صرف تحریک خلافت کے متعلق تھا۔ اور یہ وہ تحریک تھی جس کی آبیاری محمد علی نے اپنی زندگی، صحت اور خون جگر کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر کی تھی۔ اب ذرا مولینا اور ان کے بھائی اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں گاندھی جی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"میں اپنے مسلمان بھائیوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں: میں خلافت کی تحریک میں اسے ایک مقدس معاملہ سمجھ کر شریک ہوا ہوں۔ میں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جد و جہد کی کیوں کہ ہندوستان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر ہم ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں گے تو یہ خدا سے انکار ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو علی برادران (مولینا محمد علی اور مولینا شوکت علی) کی گود میں ڈال دیا ہے۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ وہ سچے اور خداترس لوگ ہیں۔"[۲]

یہ گود میں ڈال دینے والی بات گاندھی جی ہی کی طرف سے نہیں تھی مولینا نے بھی اپنے کو ان کے سپرد کر دیا تھا۔ کیا کوئی بھائی اپنے بھائی کی اور بیٹا اپنے باپ کی وہ تابعداری کرے گا جو مولینا نے گاندھی جی کی کی:

"کراچی میں سزا پانے کے بعد جب مولانا راہ میں تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے تو انھوں نے کہا کہ میں تو جیل میں ہوں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میرے اوپر گاندھی جی کا حکم نافذ ہے۔"[۳]

آخر میں خلافت کی تحریک کی اہمیت اور مولینا محمد علی کے کارناموں کے بارے میں مولینا

---

[۱] تحریک خلافت، ص ۲۵۳ [۲] ایضاً، ص ۲۰۶ [۳] ایضاً، ص ۸۱

ابوالکلام کا حرف آخر فیصلہ بھی دیکھ لیجئے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ مولینا محمد علی نے کیسے روحِ آزادی بیدار کی گاندھی جی کو روشناس کرایا اور کانگریس کو تکمیل تک پہنچایا۔ مولانا آزاد نے فرمایا:

"تحریک خلافت کی اس کامیابی میں خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور ہنگامے کے ساتھ ہندوستان کے مسئلے کو زندہ کر دیا جو چالیس سال کی کوششوں سے ہندوستان کو نہیں ملا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک خلافت کے ساتھ ہندوستان کا مسئلہ پوری قوت کے ساتھ زندہ ہو گیا ہے۔"[۱]

پنڈت جواہر لال نہرو نے تحریک خلافت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا تذکرہ کئے بغیر یہ موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔ آپ نے اپنی سوانح میں لکھا ہے:

"عوام پر اس تحریک کا بڑا اثر ہوا، اس سے عوام میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے ایک بڑے بوجھ سے آزادی محسوس کی۔ ان میں آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے دماغوں سے خوف و دہشت کی کیفیت کو جھٹک دیا۔ اب وہ سینہ تان کر اور سر اٹھا کر چلنے لگے۔ ہندوستانی عوام دور دراز کے دیہاتوں اور گاؤں کے بازاروں تک میں مظالم پنجاب، کانگریس سوراج اور خلافت کی باتیں کرنے لگے۔ لیکن زیادہ تر دیہاتی علاقوں میں خلافت کے عجیب وغریب معنی سمجھے جاتے تھے۔ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ خلافت خلاف سے نکلی ہے جس کے معنی اُردو میں مخالفت کے ہیں، چنانچہ وہ تحریک خلافت کو برطانیہ کی مخالفت کی تحریک سمجھتے تھے۔"[۲]

یہ تفصیلات تو برسبیل تذکرہ پیش کرنی ضروری ہو گئی تھیں۔ اصل بات یہ کہنی تھی کہ متحدہ قومیت کے بارے میں رئیس الاحرار مولینا محمد علی کی پالیسی بھی پورے ملک کے مزاج اور ضمیر پر اثر انداز ہوئی۔ ایک قصہ سنیے:

"سہ پہر کو گاندھی جی اور علی برادران کی تشریف آوری تھی۔ مجمع بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ یکایک مولانا شوکت علی دور سے نظر آئے۔ میں نے ان کو

---

[۱] ۔ ۔ ص ۳۳۶ [۲] جواہر لال نہرو آٹو بایوگرافی۔ ص ۶۹

بھی پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے مجمع میں داخل ہوئے۔ سفید اون کی بالدار ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اس پر ہلال لگا ہوا تھا۔ ان کے بعد مولینا محمد علی اور گاندھی جی آکر ڈائس پر بیٹھ گئے۔ کسی صاحب نے تقریر شروع کردی۔ تو میں نے دیکھ کر مولینا محمد علی ایک پیالے میں چمچے سے کچھ کھا رہے ہیں۔ اور پھر یہی پیالہ اور چمچہ گاندھی جی کی طرف بڑھا دیا۔ جنھوں نے اسی چمچے سے کھایا۔ میرے بزرگوں نے بتایا کہ دونوں نے ایک ہی پیالہ میں سے کھا کر ہندو مسلمان اتحاد کی عملی تلقین کی ہے۔ مجمع بڑا تھا اس لئے میں دور بیٹھا تھا۔ تقریر کیا ہوئی یہ نہ سن سکا لیکن میں خوش تھا کہ ان رہنماؤں کی زیارت کرلی۔ اس کے دوسرے دن پھر مولینا محمد علی کی تقریر رکھی گئی۔ میں جلسہ سے بہت پہلے جلسہ گاہ میں پہنچ گیا تھا کہ مولینا محمد علی کو قریب سے بیٹھ کر دیکھوں۔ جلسہ مدرسہ کی مسجد کے صحن میں رکھا گیا تھا۔ جہاں ہندوؤں کو بلا روک ٹوک آنے کی اجازت تھی۔ ہندو مسلمانوں کی جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا بڑا حوصلہ افزا منظر دیکھنے میں آیا۔ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے تھے جیسے بھائی بھائی ہیں۔ مولانا آئے تو مسجد کے صحن میں ایک تخت پر کھڑے ہوکر تقریر کرنے لگے۔ ان کے ارد گرد ہندو بیٹھے تھے۔ تقریر کا کیا موضوع تھا یہ یاد نہیں۔ لیکن تخت پر وہ گھوم گھوم کر بول رہے تھے۔ جوش و خروش میں کبھی ان کا چہرہ سرخ ہوجاتا۔ کبھی معلوم ہوتا کہ وہ آگ برسا رہے ہیں۔ کبھی اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ تقریر کے دوران ہندو مسلمان مل کر محمد علی کی جے، گاندھی جی کی جے۔ سوراج کی جے کے نعرے لگاتے رہے۔"[1]

مولینا نے ہندو مسلم اتحاد، قومیت متحدہ اور قومی یک جہتی کی وہ روح ملک اور قوم میں بیدار کردی تھی کہ ان کا یہ کارنامہ تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

[1] محمد علی کی یاد میں" از صباح الدین عبد الرحمان۔ ص ۱۱۹

اس کی تفصیل کے لئے مولینا مرحوم کے حالات اور سوانح پر جو متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں ملاحظہ کی جائیں تو تھوڑے بہت حالات معلوم ہو جائیں گے۔ ہمارے موضوع کا مقصود تو مذکورہ بالا واقعہ ہے اور اس کے ساتھ ہی مولینا کے مندرجہ ذیل فرمان سے حل ہو جاتا ہے۔ مولینا نے اپنے اخبار ہمدرد میں ایک مضمون کے سلسلے میں لکھا:

> "ایک مسلمان قوم پرور اور محب وطن اس لئے ہے کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جوار کو تسلیم کیا ہے۔ جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی ترجیح دی وہ قومیت ختم کر کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"[1]

کوئی جغرافیائی دلیلیں دیتا ہے کوئی متحدہ قومیت کو ملکی اور سیاسی لازمہ بتاتا ہے۔ مولینا محمد علی نے مذہب اور دین کے راستے سے اس کی ضرورت کو ثابت کیا۔ اور ایک شرعی دلیل بھی دے ڈالی۔ اب اس میں شبہ بھی کیا رہ جاتا ہے۔

اس کے بعد ہمیں اس معاملے میں مسٹر محمد علی جناح کے موقف اور پالیسی کا تذکرہ کرنا ہے۔ مگر ان سے بہت پہلے ایک بزرگ کا تذکرہ ضروری تھا۔ غلطی ہوئی کہ ان کا اسم گرامی کسی قدر متاخر ہو گیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کا نام بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ آپ اپنے زمانے میں ملک کے "آفتاب ہی نہیں" ماہتاب بھی شمار ہوتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ سرسید کے تربیت یافتہ اور فیض یافتہ تھے۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کے سب سے پہلے جو سس تھے۔ ۱۹۱۷ء میں انڈیا کے سکریٹری آف اسٹیٹ کونسل کے ممبر تھے اور ۱۹۲۱ء میں کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر تھے ۱۹۲۱ء یا اس کے آس پاس انگلینڈ میں آپ کے ساتھیوں میں شستری اور بندو گھوش بھی تھے۔ مختصر یہ کہ علی گڑھ یونیورسٹی اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی سرگرمی میں صاحبزادہ صاحب سرسید کے بلاواسطہ جانشین تھے۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی قومیت کے بارے میں آپ کی رائے علی گڑھ تحریک کے قومی رجحان کا عکس ہے آپ فرماتے ہیں:

---

[1] محمد علی کی یاد میں، ص ۱۶۸

"میں ہمیشہ سے پورے اخلاص کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہوں، مگر اس اتحاد کے لئے دونوں فرقوں کی مخلصانہ اور ایماندارانہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی ساری سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز ہندوستان ہی کو قرار دیں۔ اور مادر وطن کے وفادار رہ کر ہندوؤں کے ساتھ شانہ بشانہ ہو کر ملک کی تعمیر میں مدد دیں۔ اسی طرح ہندوؤں کے لئے ضروری ہے کہ پوری ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کی علمی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی میں ساتھ دیں۔"[1]

مسٹر محمد علی جناح کے قومی خیالات کا، کانگریس میں ان کی خدمات کا اور گاندھی جی کے ساتھ ان کی رفاقت کا مختصر سا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے۔ اب ان کے تعارف کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے مگر اس باب میں موصوف کے نظریات اور ان کے بیان کی بڑی اہمیت ہے اس لئے ایک بار پھر ان کو تازہ کرتے چلیں تو اچھا ہے۔ جناح صاحب فرماتے ہیں:

"ماضی کو بھول جائیے۔ اور پورے عزم کے ساتھ بلالحاظ مذہب و ملت یہ سوچ کر کہ ہم سب ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔ اور ایک ہی ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہم سب کے حقوق یکساں ہیں۔ اس متحدہ اسپرٹ کے ساتھ کام کیجئے تو آپ کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہوگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اقلیت اکثریت ہندو مسلم قسم کے سارے سوالات اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ مذہبی اعتبار سے نہ سوچئے۔ وہ ہر شخص کا ذاتی اور انفرادی مسئلہ ہے۔ سیاسی اور ایک ہی ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے سوچئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ نہ ہندو ہندو رہ جائیں گے نہ مسلمان مسلمان رہ جائیں گے۔"[2]

آپ تعجب نہ کریں، یہ کسی دوسرے محمد علی جناح کے خیالات نہیں ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے سر ملک کو تقسیم کرنے کی ذمہ داری رکھی جاتی ہے۔ جن کو پاکستان کا خالق کہا جاتا ہے۔

---

[1] مسلم انڈیا۔ جون ۱۹۵۸ء۔ ص ۲۴۶

[2] ہکٹر بولیتھو۔ جناح۔ ص ۱۹۷

اور جن کو پاکستان کے بیشتر باشندے قائد اعظم کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اور ہاں یہ بھی خیال رکھیے کہ یہ الفاظ پاکستان کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھنے والے، مسلم لیگ کو مسلم فرقہ پرستی کی راہ پر لگانے والے اور مسٹر محمد علی جناح صاحب کو قائد اعظم بنانے والے چودھری خلیق الزماں نے نقل کئے ہیں اس لئے ان میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آیئے اب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ کیجئے۔ گاندھی جی اور جواہر لال کے خیالات، نظریات اور پالیسی متحدہ قومیت کے بارے میں پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔ گاندھی جی ہی کے نظریہ پر کانگریس نے متحدہ قومیت کی پالیسی اختیار کی تھی۔ اور جواہر لال ہی کے زیر اثر ہندوستان کا وہ کانسٹی ٹیوشن بنا جس میں ہندوستان میں ہر ملک کے رہنے والے سارے فرقوں کا برابری کے ساتھ حق تسلیم کیا گیا۔ اہمیت ان لوگوں کے نظریات، بیانات اور اقدامات کی ہے جن کو کھلے بندوں ہندو فرقہ واریت کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ سوامی شردھانند کی تعریف اور کسی قدر تاریخ تو گذشتہ اوراق میں کہیں گزر چکی ہے۔ اس جگہ اتنی بات اور یاد کر لیجئے کہ موصوف کی فرقہ واریت کا ہوا اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک مسلمان صاحب نے بستر مرگ پر ان کو قتل کر ڈالا اور غازی کا خطاب حاصل کیا۔ انہی سوامی جی کا بیان ملاحظہ ہو:

> ”گاؤکشی کے متعلق ہندوؤں کا طرزِ عمل مجھے ہرگز پسند نہیں آیا، میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں سال بھر میں تیس ہزار سے زیادہ گایوں کی قربانی نہیں کی جاتی۔ ایک مسلمان مذہباً یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک گائے کی قربانی سات مسلمانوں کو بہشت میں لے جائے گی۔ مگر تقریباً دس لاکھ گائیں اور بیل ہر سال فوجی چھاؤنیوں میں برطانوی افواج کے لئے ذبح کی جاتی ہیں۔ تقریباً ۱۵ لاکھ ہندوستان کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے اور چالیس لاکھ کے قریب بیف (گائے کے گوشت) اور چمڑے کی تجارت کے لئے ذبح ہوتی ہیں۔ پھر ان سب گائے کشیوں پر ایک ہندو کو کیوں نہیں اذیت پہنچتی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مسلمان قربانی کے جانوروں کی ایسی نمائش کرتے ہیں جو طیش انگیز ہوتی ہے، اور اس لیے ہندو چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ لیکن پچیس لاکھ گائیں اور بیل کھلے راستوں پر مذبح میں ہنکا کر لے جاتے ہیں۔ پھر ان لاکھوں گایوں کی

نمائش سے وہ کیوں برانگیختہ نہیں ہوتے! مسلمان اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی ثواب کا کام کر رہے ہیں، لیکن ہمارے ایک نادان بھائی کے کسی فعل نادانی پر ہمیں برانگیختہ ہونے کا کون سا موقع ہے۔ ہندوؤں کو اپنے بھائیوں کے لئے خدا سے دعا کرنی چاہیئے اور انھیں سمجھانا چاہیئے کہ انسانی جذبات اور نفسانی خواہشات کی قربانی نہ کہ خون اور گوشت کی قربانی، صرف خدا کے نزدیک مقبول ہو سکتی ہے۔ اور نفرت کے بجائے ہمیں ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ روش اختیار کی گئی تو نہ صرف ہندوؤں کو چڑھانے کا یہ طرز عمل ہمارے مسلمان بھائیوں کے دل سے نکل جائے گا بلکہ وہ سنجیدگی سے اس امر پر غور کریں گے کہ آیا گائے کی قربانی مذہبی حیثیت سے ضروری بھی ہے یا نہیں؟ تین چار سال سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایک بکرا دس روپیہ سے کم پر نہیں خریدا جا سکتا۔ مگر ایک گائے چوبیس روپیہ کو خریدی جانے میں سات آدمیوں کی طرف سے قربانی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ تمام ہندو گوشت کھانا قطعاً چھوڑ دیں۔ تب بکرے وغیرہ ارزاں ہو جائیں گے اور مسلمان اپنے بڑے بوڑھوں اور بچوں کو گائے کے دودھ سے جو ماں کے دودھ سے بڑھ کر ہے محروم نہ رکھ سکیں گے۔"[1]

شردھانند کے اس بیان پر تبصرہ غیر ضروری ہے۔ فراخ دل حضرات اس سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کریں گے کہ سوامی جی مذکور بڑی قیمت دے کر بھی ہندو مسلم اتحاد اور رواداری کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں تو ہم اس مسئلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان پیش کریں گے مگر اس سے پہلے ایک واقعہ ضرور سن لیجئے۔ ۱۹۲۴ء کا سال اور دسمبر کا مہینہ تھا۔ گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اکیس دن کے برت کا اعلان کیا۔ ہندوستان کے لیڈروں نے اس مقصد کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی۔ اور اس میں ان تمام طریقوں پر بحث کی گئی جن

---

[1] اردو ادب کی بازیافت، ج ۵، ص ۸۰، بحوالہ ماہنامہ زبان بانگر ول اکتوبر ۱۹۲۶ء

کے ذریعہ سے اتفاق واتحاد کی جڑیں مضبوط ہو سکتی تھیں:

"بڑا معرکہ اس دن ہوا جب گائے کی قربانی کا مسئلہ پیش ہوا۔ مسلمان سب خاموش رہے۔ پٹیل لنگوٹی پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی ہندو ہوں گائے میرے نزدیک بھی مقدس اور متبرک ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ گائے کے بارے میں ہم اپنا عقیدہ مسلمان بھائیوں پر زبردستی تھوپیں۔ البتہ اگر وہ خود برضا ورغبت ترک کر دیں تو بہتر ہے۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کھڑے ہوئے اور انھوں نے طنزیہ انداز میں تقریر شروع کی۔ اور کہا کہ میں ہندوؤں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آج ان میں ایک ہندو کا اضافہ ہوا ہے۔ کل مجھ سے پٹیل جی نے کہا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں اور آج کہہ رہے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے ایسی شستہ اُردو میں تقریر کی کہ ہم سب محو حیرت رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ درمیانی راستہ بہتر ہے۔ جہاں کہیں قربانی ہوتی ہو وہاں ہندو کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اور نہ قانونی جبر ڈالا جائے۔ لیکن جہاں نہیں ہوتی وہاں مسلمان نئے سرے سے گائے کی قربانی نہ کریں۔ کچھ اور تقریروں کے بعد مفتی کفایت اللہ نے بڑی مدلل تقریر کی اور ذبیحہ گاؤ اور قربانی گاؤ کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ مولینا محمد علی نے کہا کہ مسلمان کا ذبیحہ بالکل بند کر دیں۔ بحث ختم نہیں ہوئی۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پنڈت مالوی جی مولینا کفایت اللہ صاحب سے کہہ رہے تھے کہ مولینا ذرا غور کیجئے! اس پر نظر دوڑائیے کہ ہم ہندوؤں کے جذبات گئے کے بارے میں کیا ہیں؟ پھر بھی ہم اس پر راضی ہیں کہ جہاں گئے کی قربانی ہوتی ہے، ہو۔ اور اس پر بھی راضی ہیں کہ قانون سے کہیں روکا نہ جائے۔ جب ہم اس حد تک جھک رہے ہیں تو آپ بھی اپنی جگہ سے کچھ ہٹیئے۔ آخر اس میں آپ کو کیا قباحت ہے کہ آپ یہ تسلیم کرلیں کہ جہاں نہیں ہوتی ہے نہ ہو۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں آج تک گائے کی قربانی نہیں ہوتی صرف انہی جگہوں پر آپ برضا ورغبت آیندہ بھی نہ کریں۔ مفتی صاحب

پہلے تو اڑے۔ مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی۔ آخر کار مان گئے، اور پنڈت مالوی جی کی تجویز پاس ہوگئی۔"[1]

ولبھ بھائی پٹیل جیسے سیاسی شخص نے مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرلیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جیسے ہندو نے قربانی اور ذبیحہ گاؤ کی اجازت دے دی۔ مولانا محمد علی جیسے مسلمان نے گاؤکشی کو بالکل بند کردیا۔ یہ سارا ایثار، سارا اخلاص اور ساری قربانیاں صرف اس لئے تھیں کہ ملک میں اختلاف اور افتراق نہ ہونے پائے۔ اور اس کے باشندے دو قالبوں میں ایک جان بن کر رہ سکیں۔ اب اس باب کے ختم سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات بھی پڑھ لیجئے:

"حضرات! میں نے آپ کا اس قدر وقت دردیوار کی فکر میں لے لیا، حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لئے ہوسکتی ہیں، محض خواب وخیال ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی احوال بھی اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کرے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہوجائے تو میں سوراج سے دستبردار ہوجاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانی کا نقصان ہے۔"[2]

یہ تو اتحاد واتفاق کی بات تھی۔ اب ذرا متحدہ قومیت کے بارے میں مولانا کا موقف ملاحظہ کیجئے:

---

[1] تحریک خلافت، ص ۲۵۲ [2] خطبات آزاد، ص ۲۰۵

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ بحیثیت مسلمان کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی اور اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین اور بناوٹ کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔"

اسی مضمون کے سیاق میں مولینا نے کچھ تاریخی حقائق کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولینا نے یہ گہرہائے نایاب ہمارے اسی موضوع بلکہ اسی موقع کے لئے جمع فرمائے تھے:

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آرہا ہے جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔" دو چار سطر کے بعد فرماتے ہیں "ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے مگر اب وہ ہمارے

جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف نہیں جانا چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، جو کبھی پورا ہونے والا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات نہیں اُگ سکتے۔[1]

یہ تھیں قومی زندگی اور اتفاق، اتحاد اور رواداری کی وہ بنیادیں جن پر دو تین صدیوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد متحدہ قومیت کی تعمیر ہوئی۔ بری بھلی جیسی بھی ہے یہ تعمیر آج تک قائم ہے اور اسی پر ہندوستان کی ترقی، تعمیر اور مشترکہ کلچر اور تہذیب کا دار و مدار ہے۔ اس کے معماروں میں خاک و خون میں لوٹنے والے، قید و بند میں سسک سسک کر جان دینے والے، جلاوطنی اور گھر بار سے محرومی کا عذاب سہنے والے، جوان اولادوں کی لاشوں کو کاندھا دینے والے آنکھوں کے تاروں اور راج دلاروں کو اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مٹی میں ملتے دیکھنے والی، عین جوانی میں اپنے سہاگ کو لٹتے ہوئے دیکھنے والی اور کلکاریاں مارتے ہوئے کھانے کھیلنے پڑھنے لکھنے کے عین درمیان یتیمی کا داغ سہنے والے ہزاروں، لاکھوں کڑیل جوان، بانکے پہلوان، مادر وطن کے سپوت، بوڑھے باپ، ضعیف مائیں، نئی نویلی دلہنیں اور پھول ایسے پیارے بچے اور بچیاں سب ہی برابر کے شریک تھے۔ ان سب کی تفصیل اور فہرست تو اب ہندوستان کی لہلہاتی ہوئی مٹی اور چمکدار ذرّوں کے علاوہ کون بتلا سکتا ہے۔ ہمیں تو صرف سر سید احمد، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مسٹر محمد علی جناح، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ وغیرہ چند افراد کا تذکرہ منظور تھا۔ بلکہ در اصل حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا مسلک اس باب میں ذکر کرنا تھا جو اگلے باب میں آرہا ہے۔

---

[1] خطبات آزاد، ص ۳۰۰، ماخوذ از خطبۂ صدارت کانگریس رام گڑھ ۱۹۴۰ء

متحدہ قومیت حضرت کا موقف

حضرت کی پوری زندگی اور اس کا ایک ایک لمحہ اعلائے کلمۃ اللہ، اصلاح و تبلیغ، ارضائے باری تعالیٰ اور قرآن و حدیث کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ تعلیم و تربیت کا وقفہ، اسکول کے ایام، دیوبند کی طالب علمی، مدینہ طیبہ میں قیام، حرم نبوی میں درس حدیث، مالٹا کی اسارت، کراچی اور سابرمتی کی قید، سلہٹ کی زندگی اور دیوبند کی صدر مدرسی ان پورے زمانوں اور سارے مکانوں میں اصلی سیاسی دلچسپیوں، مصروفیتوں اور سرگرمیوں کی ایک جھلک بھی تو کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ دوسری بات تھی کہ حرمین شریفین، خلافت اسلامیہ، بیت المقدس، دنیائے اسلام، ہندوستان کی مسلم حکومت، غرض مسلمانان عالم کی مظلومیوں، محرومیوں، تباہیوں اور بربادیوں کے جو زخم حضرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، اپنی روح پر برداشت کئے تھے اور اپنے جسم و جان پر جھیلے تھے ان کا درد، کرب، بے چینی اور آنچ مسلسل ان کے دل و دماغ میں دہک رہی تھی۔ اپنے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ان سارے مصائب کا ذمہ دار وہ حکومت برطانیہ کو سمجھتے تھے۔ وہ وقت بھی ایسا تھا کہ استعمار اور سامراج کا سب سے بڑا مرکز بلکہ اس پالیسی کا لیڈر برطانیہ ہی تھا۔ اور ہندوستان، ترکی، فلسطین، حرمین شریفین اور سارے ہی دول اسلامیہ کے خلاف جو کارروائیاں اور سازشیں دنیا میں سرگرم عمل تھیں ان کی ابتدا بھی برطانیہ ہی سے ہوتی تھی اور سرپرستی بھی وہیں سے جاری رہتی تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر حضرت کے نزدیک اس امر کی شرعی حیثیت سے بڑی اہمیت تھی کہ جہاں تک ممکن ہو برطانیہ کی مخالفت کی جائے بلکہ اس کی طاقت و قوت کو ختم کیا جائے، یہ نکتہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ آپ کسی دوسری قوم اور خاص طور پر ہندو قوم کو اسلام اور مسلمان کا ایسا خطرناک دشمن نہیں سمجھتے تھے جتنا برطانیہ اور انگریزوں کو خیال کرتے تھے۔ انہی کی زبانی سنئے:

"ہند میں بالفعل اتنی طاقت نہیں ہے جتنی انگریز میں ہے۔ اس ۱۱

ماضی، مستقبل اور حال میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے۔ ہندو کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مستقبل قریب میں ایسا ہی یا اس سے زیادہ ہو جائے، مگر یہ امر مظنون اور موہوم ہے۔ اسی بنا پر ہمیشہ اکابر نے ہندوستان میں انگریز سے آزادی حاصل کرنا اور اس کے اقتدار کو ہٹانا ضروری سمجھا۔"[1]

انگریزی سامراج اور برطانیہ کی سیاستوں، تجارتوں اور سازشوں کی ضرب کاری سارے عالم اسلام پر تو پڑی ہی تھی مگر ہندوستان میں تو انھوں نے مسلمانوں کو بالکل ہی تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں آدمی بھی مسلمانوں ہی کے قتل ہوئے اور پھانسی پر لٹکے۔ علاقے اور جائدادیں بھی انہی کی ضبط ہوئیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت بھی انہی کی پامال ہوئی۔ روزی روزگار سے بھی وہی محروم ہوئے۔ عزت و آبرو بھی انہی کی لٹی اور سلطنت و شوکت بھی انہی کے ہاتھ سے گئی۔ ہندوستان کے جو سربرآوردہ حضرات برطانیہ اور انگریزوں کے ہوا خواہ اور حاشیہ بردار تھے ان کی تعداد اگرچہ کم تھی مگر اثر و نفوذ کے اعتبار سے ان کی آواز بھی حکومت نے ہر ہر طریقہ سے طاقت ور بنا دی تھی۔ ایسے لوگوں میں سب سے پہلے سرسید کا نام آتا ہے۔ ان کی سیکڑوں تقریروں اور تحریروں کا ذکر تو ناممکن ہے جن میں انھوں نے انگریزوں اور برطانیہ کی وفاداری، اطاعت شعاری اور مدح سرائی کی ہے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی پر اُن کی دو چار سطریں دل چسپی کا سبب ہوں گی:

"جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی میں ان کا طرف دار نہیں ہوں۔ میں اُن سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور ان کو حد سے زیادہ بُرا جانتا ہوں کیوں کہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں۔ نبیوں پر ایمان لائے ہیں۔ خدا کے دیے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس

[1] مکتوبات۔ ج ۲ ص ۱۳۱

رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پس اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرا وہاں مسلمانوں کا خون بھی گرنا چاہیئے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اُس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی نمک حرامی کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی اپنے مذہب کے بھی خلاف کیا۔"[۱]

نواب وقار الملک نہ صرف یہ کہ سرسید کے دست راست اور وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے بلکہ مسلم یونیورسٹی کے موسسین میں بھی تھے اور ملک کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ آپ نے ۱۳؍مارچ ۱۹۰۷ء کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طلباء سے فرمایا:

"ہماری تعداد بہ مقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس ہے۔ اب اگر کسی وقت خدانخواستہ ہندوستان میں انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا۔ اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا۔ اگر کوئی تدبیر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی ہندستان کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے، ہمارے حقوق کی حفاظت تبھی ہو سکتی ہے جبکہ ہم حکومت برطانیہ کی حفاظت پر کمربستہ رہیں۔ ہمارا وجود اور گورنمنٹ (برطانیہ) کا وجود لازم و ملزوم ہیں۔ انگریزوں کے بغیر ہم اس قوت اور آسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر مسلمان دل سے انگریزوں کے ساتھ ہیں تو انھیں ہندوستان سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ ان کو اس عمدہ خیال کی تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے تئیں مثل ایک فوج کے تصور کریں۔ اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کریں۔ اور اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہیں۔"[۲]

اسی نمونے کے سیکڑوں ہندو مسلمان، بڑے بڑے نام آور اور ذی اثر صاحبان برطانیہ کے طرفدار، بہی خواہ اور اطاعت گزار تھے۔ یہاں تک کہ بعض علماء، فضلاء اور مذہبی رہنما بھی برطانیہ اور اس کے ہواخواہوں کے ساتھ تھے۔ ایسے حضرات کی فہرست تو لمبی ہے

---

[۱] حیات جاوید، ص ۱۰۳
[۲] روشن مستقبل۔ ص ۳۳۰

مگر ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں کے دو بڑے اکابر' مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی زمرے میں شامل تھے۔ خلافت کی تحریک جس میں ملک کے ہندو مسلمانوں بوڑھوں اور جوانوں' عورتوں اور بچوں تک نے شرکت کی تھی۔ یہ حضرات اس کے بھی خلاف تھے۔ ہمارے حضرات نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"مولانا اشرف علی صاحب زید مجدہم کے خیال سے ان امور میں' میں ہی مخالف نہیں ہوں بلکہ حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز بھی خلاف تھے۔ خلافت کی تمام تحریک میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ شریک ہونا جد و جہد کرنا ضروری اور واجب سمجھتے تھے اور مولانا تھانوی اس کو فتنہ و فساد سمجھتے رہے ہیں۔ میں حضرت شیخ الہندؒ کا ادنیٰ خادم اور ان کی رائے کا متبع ہوں۔ باوجود اس اختلاف کے میں مولانا تھانوی کا دشمن نہیں ہوں۔ ان کی بے ادبی نہیں کرتا۔ ان کو بڑا اور بزرگ جانتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ مولانا اس امر میں غلطی پر ہیں۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہے۔"[1]

خیر! یہ تو وہ حضرات تھے جو سرے سے ہندوستان کی آزادی اور برطانیہ سے گلو خلاصی ہی کے خلاف تھے مگر وہ لوگ جو آزادی کے بڑے علم بردار اور قومی تحریکوں کے سردار تھے ان کی لڑائی بھی صرف آزادی کے سوال اور مسئلہ پر تھی۔ جہاں بھی اور جب بھی برطانیہ کی حکومت ان کو نرم و ملائم نظر آتی تھی ان کے اختلاف کی درازیں اور سوراخ بند ہونے لگتے تھے۔ یہ صرف ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اور خاص طور پر اکابر امت کی جماعت تھی جو برطانیہ سے کسی مرحلہ پر رشتۂ مصالحت کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان علمار کا کسی قدر تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے اور ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اسی جماعت کے سالار کارواں تھے۔ وہ دنیائے اسلام اور مسلمانان عالم کی زبوں حالی اور زیاں کاری کا ذمہ دار برطانوی سامراج ہی کو قرار

[1] مکتوبات۔ ج ۲ ص ۲۳۷

دیتے تھے۔ اس بارے میں حضرت ہی کے قلم سے ان کے خیالات ملاحظہ فرمایئے:

"جب سے اسلام نے ظہور کیا ہے انگریز نے برابر اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ کسی دوسری قوم نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ دو سو برس سے زیادہ عرصہ سے اسلام کو فنا کر رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی اسلامی طاقت کو فنا کیا" اس کے بعد حضرت نے ہندوستان میں برطانیہ کے معاشی، اقتصادی اور اخلاقی مظالم اور ۱۸۵۷ء کی انسانیت سوز حرکتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد فرمایا: "مگر اسی کے ساتھ عراق، شام، مصر، فلسطین، عرب، صومالی لینڈ مشرقی افریقہ، سوڈان، برما وغیرہ کے اسلامی عروج کو پامال کیا۔ خلافت عظمیٰ کو زیر و زبر کیا۔ حجاز، جدہ، مکہ اور مدینہ پر چڑھائی کی۔ چناق، قلعہ سمرنا، استنبول وغیرہ میں کیا کیا نہیں کیا۔ اور ان مقامات پر کیسی کیسی خون کی ندیاں بہائیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ یورپین طاقتوں میں اسلامی ممالک کو تقسیم کیا۔ طرابلس، صحرائے لیبیا، اور نہ سورگن وغیرہ اٹلی کو، ریف اسپین کو، الجیریا تیونس خاص مراکش وغیرہ فرانس کو، وسط ایشیا اور شمالی ایشیا کے ممالک بخارا، سمرقند، گرجستان، ازبکستان، داغستان، قرغستان وغیرہ روس کو برابر معاہدوں وغیرہ کے ذریعہ تقسیم کرتے رہے۔ ٹرکی سے بلگیریا، یونان، مقدونیہ رومانیہ، ہرسکٹ، البانیہ، سرویہ، مانٹینگرو، کویت، بلقان وغیرہ کو مجبور کر کے آزاد کراتے رہے اور اسلامی طاقت کو فنا کراتے رہے۔"[1]

یہ خوں چکاں داستان ہمہ وقت حضرت کے پیش نظر اور دل دماغ پر طاری رہتی تھی کہ یہ وہ ملک تھے جہاں اسلامی شوکت وعظمت کے نقارے بجتے تھے اور جن کے افق پر لا الہ الا اللہ کا جھنڈا لہرایا کرتا تھا۔ ہندوستان کی غلامی کو بھی وہ عالم اسلام کا زیاں تصور فرماتے تھے اور ان کا نقشہ یہ تھا کہ اگر برطانیہ ہندوستان سے نکل جائے گا تو نہ صرف یہ کہ سارے ہی اسلامی ممالک آزاد ہو جائیں گے بلکہ برطانوی سامراج کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ حضرت کو یقین تھا کہ

---

[1] مکتوبات۔ ج ۲ ص ۱۳۰

برطانیہ اور انگریز اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور ان کا قلع قمع کرنا مسلمانوں کا فرض اولین ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ:

"روئے زمین پر اور ہندوستان میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے۔ جتنا اس نے اسلام کو برباد کیا اور کر رہا ہے اور کرنے کی قوت رکھتا ہے، دنیا بھر میں کسی قوم اور کسی ملک نے نہیں کیا۔"[1]

اپنی تقریروں اور تحریروں میں حضرت پوری تفصیل اور مکمل دلائل کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ عالم اسلامی کے گلے میں طوق غلامی کا بڑا سبب ہندوستان کی غلامی ہے اور اسی بنا پر وہ انگریز کی مخالفت کو مقدس فریضہ گردانتے تھے اور ملک کی جدوجہد آزادی کو جہاد کا درجہ دیتے تھے۔ اجمالی طور پر حضرت کی پالیسی پر ایک نظر ڈال لیجئے:

"ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق، مصر، فلسطین، حجاز وغیرہ بھی انہی مصیبتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ اور افسوس یہ کہ ان تمام ممالک کی مصیبتیں صرف ہندوستان کی غلامی کے سبب سے ہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کا مذہبی اور دینی فرض ہے کہ اس ظالمانہ شاہنشاہیت کے بار گراں کو جلد از جلد ہندوستان سے ہٹا کر عدل و انصاف کی حکومت قائم کرے۔"[2]

اس مقام پر ایک منٹ ٹھہر کر غور کر لیجئے کہ یہ وہ مقصد تھا جس کے لیے حضرت نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور یہی وہ منزل تھی جس کے لیے تمام عمر سنگلاخ صحراؤں اور خارزار راہوں میں جادہ پیما رہے۔ دوسرے لیڈران، سیاسی جماعتیں اور ہندوستان کے اعیان جس جدوجہد کو تحریک آزادی ہندوستان جس جنگ کو سیاسی اور ملکی لڑائی اور جن قربانیوں اور سرفروشیوں کو لیلائے آزادی کے حضور نذرانہ قرار دیتے تھے۔ حضرت کے مسلک میں وہ ساری سرگرمیاں اور قربانیاں مذہبی اور دینی فریضہ تھیں۔ ایک ایسی جدوجہد جس کے ذریعہ حجاز مبارک، حرمین شریفین، بیت المقدس، عرب و مصر، خلافت اسلامیہ، ہندوستان اور خلافت

[1] مکتوبات۔ ج ۲ ص ۴۳۸ [2] مکتوبات۔ ج ۲ ص ۱۴۱

اسلامیہ بھی اسلامی طاقتوں کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہوں اور بیڑیاں کٹ رہی ہوں۔ وہ جہاد مقدس اور دینی فریضہ کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتی ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ حضرت کے نزدیک جہاد آزادیٔ ہند وہ معرکہ تھا جس کی راہ میں سر دینے والا شہید اور سر لینے والا غازی کے مناصب عالیہ کا مستحق تھا۔ اس کے لئے حضرت یہ دلیل دیتے تھے:

"(ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اگر مسلمان) کی جان بھی کام آجائے تو وہ سراسر سعادت اور نص حدیث کے بموجب شہادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله فهو شهيد او كما قال (ترمذی)

یعنی جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے خون کی یا دین کی یا اہل وعیال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔ (ترمذی)

سارے ہی ہندو مسلمان لیڈران اور عوام ہندوستان کی آزادی کے لیے کمربستہ و سربکف تھے۔ حضرت بھی اس رزم گاہ میں مردانہ وار صف آرا تھے۔ مگر آپ کی نیت بھی الگ تھی اور منزل بھی دوسروں سے جدا تھی۔ یہ بالکل الگ بات تھی کہ دونوں کی راہیں ایک تھیں۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے حضرت کے ان الفاظ پر غور کریں:

"چونکہ برٹش گورنمنٹ کے جملہ لاف وگزاف نخوت وسطوت، تحاکم وتکبر، قوت و دبدبہ وغیرہ کا بڑا مدار ہندوستان کا غلام ہونا ہے اس لیے اس باعث نخوت وتکبر کو توڑ دینا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہوگا۔ اور یہی اعلیٰ درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی۔ یہی بات اس کے گھٹنے لگا دے گی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی اور اُس کا سوراج انگلستان کی موت کا مرادف ہے۔"[1]

اس نکتہ کو ذہن میں تازہ رکھیے کہ یہ ساری سرگرمیاں اور معرکہ آرائیاں صرف اعلائے

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء کوکناڈا، بحوالہ حیات شیخ الاسلام ص ۱۱۲

کلمۃ الحق اور تبلیغ و اشاعت دین ہی کے لئے ہیں۔ حضرت اپنی تقریروں اور بیانات میں بار بار اس امر کا اعادہ فرماتے تھے۔ دین کی تبلیغ اور فریضہ اشاعت اسلام کی ادائیگی کے لئے حریت رائے، آزادی ضمیر اور فراغت بال بہت ضروری ہے۔ مظلوم و مقہور افراد اور جماعتیں نہ اپنی آواز بلند کر سکتی ہیں اور نہ ان کی دعوت و پیغام کی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ اگر مسلمان اپنی آزادی کے لئے مکمل جدو جہد نہیں کرتے وہ ایک بنیادی اور مقصدی فریضے کی ادائیگی سے قاصر رہیں گے۔ اس فرض کی ادائیگی کس درجہ اہم اور اس مقصد کا حصول کس قدر لازمی ہے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر" یعنی ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ آزادی وطن کی جدوجہد ہر مسلمان پر فرض ہے۔ آزادی وطن ہی آزادی ملت کا ذریعہ ہے۔ اور آزادی وطن ہی کے بعد اسلامی احکام نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ مظلوم و مقہور رہ کر غلامانہ زندگی پر قناعت کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من مات ولم یغزو ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق (مسلم) یعنی جس شخص نے زندگی بھر جہاد نہیں کیا، اور نہ ہی جہاد کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا اور اسی حالت میں مر گیا تو وہ ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مرا۔ اسلام اس لئے ہے کہ بلند و بالا ہو کر رہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ۔"[1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دراصل جہاد فی سبیل اللہ کا ایک شعبہ تھی۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھیے کہ اس سلسلے کا ہر قدم، عدم تعاون، ایجی ٹیشن، مظاہرے، قید و بند، تقریر و تحریر، ریزولیشن اور کانفرنسیں، بدیشی مال کا بائیکاٹ، گرفتاریاں اور قید و بند وغیرہ وغیرہ ساری ہی سرگرمیاں اور

---

[1] مکتوبات، ج ۲، ص ۱۳۶

مصائب و آلام اسی جہاد کی مختلف شکلیں اور اسی میدان کارزار کے متعدد مراحل تھے۔ میدان جنگ میں لاشیں بھی گرتی ہیں، خون کے فوارے بھی اُبلتے ہیں، سر بھی اُچھلتے ہیں اور زخمیوں کی چیخیں اور کراہیں بھی اُبھرتی ہیں نتیجہ ان تمام مظاہر کا ایک ہی ہوتا ہے چاہے اقدام و عمل ساری ہی فوج کا کتنا ہی مختلف ہو۔ ہندوستان کے جیالوں نے، سپوتوں نے، معصوم بچوں نے اور کڑیل جوانوں نے آزادی کی قربان گاہ پر کیسے کیسے اپنی اُمنگوں بھری جوانیوں اور اُبلتے ہوئے خون کے نذرانے پیش کئے۔ یہ بڑی خوں چکاں داستان ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ ملک کے ذرّے ذرّے پر ثبت ہے، دو چار حکایتیں راقم مؤلف کے ذہن میں تازہ ہیں۔ ایک واقعہ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مہینہ تو اب یاد نہیں مگر زمانہ ۱۹۴۲ء کا تھا۔ اور انگریزو ہندوستان سے نکل جاؤ، یعنی کوئٹ انڈیا کی تحریک زوروں پر تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مرادآباد جیل میں قید تھے۔ میں حضرت سے ملاقات کے لئے مرادآباد گیا ہوا تھا۔ ایک دن صبح سے خبریں گرم ہوئیں کہ کانگریس کا جلوس نکلے گا اور حکومت کی طرف سے سخت پابندی اور انتظامات ہیں کہ یہ جلوس نہ نکلنے پائے۔ کانگریس نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ یہ جلوس نکل کر رہے گا۔ سارے شہر میں بوڑھے جوان بچے بڑے ہندو مسلمان صبح ہی سے جلوس کے انتظامات میں اس طرح ذوق و شوق کے ساتھ مشغول تھے جیسے لوگ برات میں جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جلوس کی شکل میں اپنی منزل کی جانب گامزن ہوا۔ چند ہی قدموں کے بعد مسلح گارد نے سنگینوں کی نوک پر راستہ روکنا چاہا، مگر نشۂ آزادی کے متوالوں نے آناً فاناً میں سنگینوں کا یہ گھیرا ہوا میں اُڑا دیا۔ جلوس کا ریلا آگے بڑھا تو جوش و خروش بھی بیسیوں گنا بڑھ گیا۔ انقلاب زندہ باد، بھارت ماتا کی جے، نعرۂ تکبیر اور کوئٹ انڈیا کے نعروں سے زمین و آسمان گونج اُٹھے۔ میری عمر اس وقت چودہ پندرہ برس کی رہی ہوگی، تماشہ دیکھنے کے شوق میں مجمع کے درمیان پستے پساتے میں بھی آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ مجمع مقررہ منزل تک پہنچا تو اس کا نشہ بھی شباب تک پہنچ گیا۔ دو چار جوشیلے قسم کے نوجوان ایک اونچی جگہ پر چڑھ کر انقلابی نعرے اور تقریریں پیش کرنے لگے۔ نہ جانے کیوں اور کیسے۔ شاید تماشے کا نظارہ مکمل کرنے کے لئے میں بھی کاندھوں کاندھوں اچک کر اس پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔ تاحد نظر جوش و مستی میں چور انسانوں

کا سیلاب دیکھ کر مجھ پر ایک خمار آلود مدہوشی سی طاری ہوگئی۔ اسی عالم میں چشم زدن میں کسی نے پیچھے سے گھسیٹ کر مجھے قریب کی دکان میں دھکا دیا اور عین اسی لمحے آناً فاناً میں برطانیہ کی طاقت نے نہتے عوام پر سنگینوں کی باڑھ سے آگ اُگل دی، اور دیکھتے ہی دیکھتے مادر وطن کے کئی سپوتوں نے بھارت ماتا کی جے اور کلمۂ شہادت پڑھتے پڑھتے اپنے تازہ تازہ خون سے سرزمین وطن کو لالہ زار بنا دیا۔ ان تمام سرفروشیوں اور قربانیوں میں وطن اور اہل وطن کا جو بھی جذبہ رہا ہو مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نیت خالصتہً لوجہ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ ہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت بھی اسی میدان جہاد کا ایک قیمتی اور کارگر حربہ تھا۔ اس باب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بے شمار تقریروں اور خطبات میں سے دو ایک اقتباسات ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ دسمبر ۱۹۲۳ء میں جمعیۃ علماء کے پانچویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبے میں فرمایا:

"واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔ (اللہ رسول کے دشمنوں کے مقابلے میں جس قدر ہو سکے اور جتنی بھی طاقت اور سواریاں وغیرہ فراہم ہو سکیں وہ سب مہیا کر کے اللہ کے اور اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرو) یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ مسلمانان ہند کے لئے یہ اتحاد (ہندو مسلم) ضروری ہے۔ کیونکہ وہ قوت جس کے ذریعے ہم دشمن کو ڈرا سکتے ہیں اور اس کے پتھریلے دل و دماغ کو پگھلا سکتے ہیں وہ اہل ہند کے لئے ظاہری حیثیت سے اتحاد ہندو مسلم اور صرف اتحاد ہندو مسلم ہے۔ اس لئے یہ اتحاد مذہبی حیثیت سے فقط جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہوگا۔" [۱]

افکار خیالات اور تقاضے تو یہی تھے جن کی بنیادوں پر حضرتؒ متحدہ قومیت کے حامی تھے مگر انہی نظریات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا ملا جلا اور مشترک ماحول بھی آپ کے پیش نظر تھا جس میں افتراق، اختلاف، دشمنی اور عداوت کی کوئی گنجائش نہیں تھی قبل اس کے کہ اس بارے میں حضرتؒ کی رائے پیش کی جائے۔ اس موقع پر ایک خاص نکتہ ذہن میں

---

[۱] حیات شیخ الاسلام۔ ص ۱۱۸ (آیت شریفہ کا ترجمہ ناقل کا ہے۔)

محفوظ کرلیں کہ راقم مؤلف کے مشاہدے اور مطالعے کے مطابق حضرت کو اپنے وطن اور اہل وطن سے بہت محبت تھی۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے، کچھ تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا، یہاں تو حضرت کا ایک بیان ملاحظہ فرمایئے جس میں افکار و نظریات نہیں بلکہ سیدھے اور سادے الفاظ میں نفس واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"مسلمان تو ہندوؤں سے اس وقت سے ملے ہوئے ہیں جب سے کہ ہندوستان میں آکر آباد ہوئے ہیں اور میں تو اس وقت سے ملا ہوا ہوں جب سے کہ پیدا ہوا ہوں کیونکہ میری ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی اور یہاں ہی پرورش پائی۔ جب ایک ملک یا ایک شہر اور ایک آبادی میں رہیں گے تو ضرور ایک دوسرے کو دیکھے گا، ساتھ رہے گا، ساتھ چلے گا۔ معاملات لین دین اور ہر قسم کے خرید و فروخت اجارہ وکالت عاریت تعلیم و تعلم وغیرہ وغیرہ میں ایک دوسرے سے باتیں کرے گا۔ ہاتھ ملائے گا۔ لہٰذا ہم اور تمام مسلمان، جب تک ہندوستان میں ہیں ہندوؤں سے ملے ہوئے ہیں، بازاروں میں ملے ہوئے ہیں۔ مکانوں میں، ریلوں میں، ٹراموں میں، لاریوں میں، اسٹیمروں میں، اسٹیشنوں میں، کالجوں میں، ڈاک خانوں میں، تھانوں میں اور پولیس کے اداروں میں، کچہریوں میں، کونسلوں میں، اسمبلیوں میں، ہوٹلوں میں وغیرہ وغیرہ یہی بتلایئے ملنا کہاں اور کب نہیں ہے۔ آپ زمیندار ہیں آپ کے کاشت کار کیا ہندو نہیں ہیں؟ آپ تاجر ہیں، کیا آپ کے خریدار اور معاملے والے جن سے آپ کو خریدنا ہوتا ہے، ہندو نہیں ہوتے۔ آپ وکیل ہیں کیا آپ کے موکل یا آپ کے وہ حکام جن سے مقدمے کے معاملات میں تعلق ہے ہندو نہیں ہوتے؟ کیا ان سے ملنا نہیں پڑتا۔ آپ میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، لوکل بورڈ، کونسل، اسمبلی وغیرہ کے ممبر ہیں۔ کیا ہندو ممبران اور سکریٹری اور پریزیڈنٹ سے ملنا، بحث کرنا، انسانی تہذیب اور آداب کو بجالانا نہیں پڑتا ہے۔ پھر بتلایئے اور غور کیجئے کہ کون اس سے بچا ہے۔ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو گردن زدنی قرار دے دیجئے۔ میں ابتدائی عمر میں مڈل اسکول میں پڑھتا تھا تو ہندو طلبا، بھی ساتھ تھے۔ چنانچہ کئی سال تک متعدد کلاسوں میں ساتھ رہا اور

بعض کلاسوں کے مدرس بھی ہندو تھے ان سے پڑھنا ہوا۔" [1]

مذکورہ بالا اقتباس پڑھنے کے بعد ایک بات کا خیال رکھئے۔ ملنے کا مطلب ملاقات اور سلام ودعا نہیں بلکہ اپنے وسیع معنوں میں اشتراک عمل ہے۔ اور یہی حضرتؒ کا طریقہ اور نظریہ تھا کہ ہندوستان میں رہ کر ملک کی ساری ہی آبادی کے ساتھ بلا لحاظ مذہب و ملت اشتراک عمل ناگزیر ہے۔ اور یہی وہ بنیاد تھی جس پر حضرتؒ ہندوستان کے بھی بسنے والوں کو بلحاظ ہندوستان کے شہری ہونے کے ایک قوم سمجھتے تھے۔ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں ایک لمحہ ٹھہر کر اگر حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ کے خیالات و نظریات پر بھی چند سکنڈ غور کرلیں تو موضوع اور بھی زیادہ واضح ہوجائے گا۔ اس لئے کہ خدمت حدیث میں، تعلیم و تدریس میں، احیائے دین میں، سیاسی جدوجہد میں، قومی خدمات میں غرض عوامی زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے حضرتؒ انہی شیخ الہند کے متبع، خوشہ چین اور جانشین رہے ہیں۔ بار بار اس امر کا اظہار و اعلان فرماتے رہے کہ میں حضرت شیخ الہندؒ کا خادم اور متبع ہوں اور ان کے راستے سے ایک قدم نہیں ہٹ سکتا۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

حضرت شیخ الہندؒ کا فرمان سنیئے:

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنادیا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ

---

[1] مکتوبات، ج ۲، ص ۱۵۱

کے لئے ناممکن بنادے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بد اعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چوتھی قوم خواہ کتنی ہی طاقت ور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔"[1]

یہ وہ عوامل تھے اور یہی وہ ماحول اور تقاضے تھے جن کی بنا پر حضرت ہندوستان میں رہنے اور بسنے والی بھی قوموں کے درمیان اشتراک عمل لازمی اور ضروری سمجھتے تھے۔ اور اپنی سیاسی زندگی کی بالکل ابتدا سے ہر اس فرد اور جماعت کے مؤید و معاون تھے جو اس نظریئے کی حامی ہو۔ اور یہی وہ فکر اور اساس تھی جس پر متحدہ قومیت کی تعمیر قائم تھی۔ یہ بنیاد درمیان سے ہٹ جائے تو نفرت اور عداوت کی آگ پورے ملک بلکہ پوری انسانیت کو نگل لینے کے لئے دہک رہی تھی۔ اس نظریئے کی تعریف اور خلاصہ حضرتؒ سے سنیئے:

"اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے (عوام) مذہب و ملت کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی اختلاف رکھتے ہوں مگر ہندوستانی ہونے کا رشتہ ان سب کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔ اس رشتے کی بنا پر ان کے مفادات مشترک ہیں۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جو چیز ہندو کے لئے مفید ہے وہ مسلمان کے لئے بھی مفید ہے اور جو مسلمان کے لئے نقصان رساں ہے وہ لامحالہ ہندو کے لئے بھی نقصان رساں ہے۔ اسی رشتے کی بنا پر ان سب کا نیشن ایک اور ان کی قومیت متحدہ ہے۔"[2]

مذکورہ بالا مضامین سے متحدہ قومیت کی اہمیت اور اس بارے میں حضرتؒ کا مسلک

[1] نقش حیات۔ ج ۲ ص ۲۶۰ [2] رسالہ متحدہ قومیت اور اسلام از حضرت رحمۃ اللہ علیہ۔ ص ۵

واضح طور پر سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ اسی سلسلے میں کچھ آگے چل کر حضرتؒ فیصلہ کن بات کہہ کر موضوع کو ختم کر دیتے ہیں:

"اگرچہ پہلے مضمون سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا ہے مگر یہ بات صاف نہیں ہو سکی کہ متحدہ قومیت میرے نزدیک ایک اہم نظریہ ہے اور موجودہ احوال و ادوار میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں"۔ [1]

خوب دھیان رہے اور کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ یہ لفظ اپنے عام معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ مذکورہ بیانات میں بھی حضرتؒ نے بار بار اس کی وضاحت کر دی ہے اور دوسرے بے شمار مواقع پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس کا اعلان فرمایا ہے کہ اس لفظ متحدہ قومیت کا اطلاق اپنے خاص مفہوم 'ہندوستانی ہونے اور ایک ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت میں ہو رہا ہے۔ لیکن جہاں اور جب بھی مسلمانوں کے دین مذہب اور اسلامی تشخص و شعائر کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں ان کی حیثیت بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ پہلے اس مسئلے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کا فیصلہ سنئے:

"یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوش گوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری منظور ہو"۔ [2]

یہ تقریر نہیں بلکہ قوم اور ملک کے نام حضرت شیخ الہندؒ کا آخری پیغام تھا۔ اس تقریر کے آٹھ ہی دس روز کے بعد حضرت موصوف نے جانِ عزیز جانِ آفریں کے سپرد کی۔ اس اعتبار سے

---

[1] حسین احمد مدنی، متحدہ قومیت اور اسلام، مطبوعہ مجلس قاسم المعارف، دیوبند۔ [2] نقش حیات، ج ۲، ص ۲۶۰

لک کے اور اپنے چاہنے والوں کے لئے آپ کے یہ الفاظ وصیت کے درجے میں داخل ہو گئے۔ آپ کے جانشین حضرت مولینا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی پالیسی آخر دم تک انہی لائنوں اور خطوط پر عمل پیرا رہی۔ کوئی اس کو قبول کرے یا نہ کرے، اعتراف کرے یا نہ کرے اور عمل کرے یا نہ کرے تاریخی حقائق زمین و آسمان کے ذرّے ذرّے پر لوح و قلم سے پوری طرح بے نیاز ہو کر بھی ثبت ہو کر ہی رہتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے اس آخری پیغام اور اس مقصد کے لئے ہمارے حضرت کی مسلسل جدوجہد کے پچاس برس بعد جب ہندوستان کا کانسٹی ٹیوشن بنا تو اس میں اس بات کو قانونی اور کانسٹی ٹیوشنل درجہ دیا گیا کہ اسٹیٹ کو یہ حق کبھی نہیں ہو گا کہ وہ ملک کے رہنے والے کسی گروہ کے مذہبی امور میں سے کسی کو ہاتھ لگائے یا کسی فریق کی دلآزاری کرے اس سلسلے میں حضرتؒ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"ہماری مراد متحدہ قومیت سے اس جگہ وہی متحدہ قومیت ہے جس کی بنیاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی۔ یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندوستانی ایک قوم ہو جائیں۔ اور اس پردیسی قوم سے جو کہ دشمنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتے ہوئے سب کو فنا کر رہی ہے۔ جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں اور اس ظالم و بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ایک دوسرے کے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے، بلکہ تمام ہندوستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق اور اعمال میں آزاد رہیں۔ اپنے مذہبی رسم و رواج مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو، امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں۔ اپنے اپنے پرسنل لاء، کلچر اور تہذیب کو محفوظ رکھیں"[1]

[1] متحدہ قومیت اور اسلام۔ ص ۵۲

یہ نشر و اشاعت ماڈرن زبان والا نہیں ہے، جو پروپیگنڈہ کے معنی میں بولا جاتا ہے، حضرتؒ نے اس لفظ سے تبلیغ دین و اشاعت اسلام مراد لی ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور گفتگوؤں میں بڑی صراحت اور اعلان کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان کوئی کمزور جماعت نہیں جسے آسانی سے مغلوب کیا جاسکے۔ اس ملک میں اسلام کی اشاعت اور ترقی اُس وقت شروع ہوئی جب وہ صرف چند سو کی تعداد میں تھے۔ اور آج سے بہت زیادہ کمزور اور معمولی اقلیت میں تھے مگر تعلق مع اللہ اور اخلاص فی سبیل اللہ وہ طاقتیں ہیں جن کے ذریعے اس ملک کے چپے چپے اور روئے زمین کے ذرے ذرے پر اسلامی افکار، آثار، تہذیب اور تعلیمات کے نقوش ثبت ہیں۔ آج بھی دنیا اسی طرح اللہ کے نام اور اسلام کے پیغام کی پیاسی ہے مگر پیغامبروں میں وہ حرارتِ ایمانی اور جوشِ عمل مفقود ہے۔ حضرتؒ مسلمانوں کو اس ملک میں اقلیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ نقطۂ عددی اور کمیت کی کثرت کو طاقت نہیں خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایمان کا ایک ذرہ اور للّٰہیت کا ہلکا سا جذبہ بھی بڑے بڑے پہاڑوں کے جگر شق کردینے کے لئے کافی ہے۔ لو انزلنا ھذا القران علی جبلٍ لرایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ۔ سیاسی اعتبار سے آپ ہندوستان میں بسنے والی ساری ہی قوموں کو ملک پر برابر کا حقدار قرار دیتے تھے، اور تنظیمی و انتظامی ترتیبات کو قوموں کے حقوق میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ۷ر مارچ ۱۹۴۲ء کو جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گذشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کرکے ان کے متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ وابستہ کردیا ہے۔ برطانوی سیاست داں اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملات کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اور اسی بناء پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کررہی ہیں، جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں۔ یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں ہی تک محدود

نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ تمام اندیشے، وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے ہیں جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان عددی اقلیت میں ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے انھیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔"[1]

یہ تھا وہ نظریہ متحدہ قومیت جس کی تائید اور حمایت حضرت رحمۃ اللہ علیہ علی الاعلان کسی لومۃ لائم اور مخالفت و عداوت کا خیال کئے بغیر کرتے رہے۔ آپ اپنے اس نظریئے میں منفرد نہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے بے شمار ہندوستانی بلکہ تمام دنیا کی سیاسی، ملکی اور انتظامی وحدتیں اس کو تسلیم کرتی رہی ہیں اسلامی احکام نے ان غیر مسلموں کے جزیے اور ٹیکس معاف کر کے ان کو اپنی صفوں میں لا کر برابر سے کھڑا کر دیا تھا جو ملک کے دفاع میں یک جہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ شریک ہو گئے ہوں۔ گذشتہ صفحات میں گزرا ہے کہ ہندوستان میں سر سید احمد بلکہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے لے کر ڈاکٹر سر محمد اقبال، مسٹر محمد علی جناح، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی وغیرہ وغیرہ صدہا بلکہ ہزارہا مدبرین اس نظریئے کے علمبردار تھے۔ فرق صرف اتنا رہا کہ سیاسی مصالح اور نشیب و فراز کی رو میں وقت کے ساتھ بہت سے ہندو مسلم حضرات ہوا کے رُخ کے ریلے میں بہہ گئے اور حضرتؒ نے ایک بار جو مسلک و موقف اختیار کر لیا تھا اس پر ہزارہا خطرات، اختلافات اور اعتراضات کے

[1] حضرت مدنی، خطبۂ صدارت، لاہور، ۱۹۴۲ء

باوجود قائم اور ثابت قدم رہے اور یہ حضرت رحمۃ اللہ کا مزاج تھا کہ بلا سوچے سمجھے کوئی طریقہ اور راستہ اختیار نہیں فرماتے تھے۔ مگر جب کوئی فیصلہ کر لیتے تھے تو عداوت و ملامت، سب و شتم، طنز و تشنیع، دست درازیاں اور گستاخیاں تو معمولی حوادث تھے۔ پھانسی کا تختہ اور تلوار کی دھار بھی آپ کو استقلال، ثابت قدمی اور عزم راسخ کے راستے سے نہیں ہلا سکتی تھی۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین۔

> "کوئی چیز۔ گورنمنٹ کی ترغیب و تحریص۔ مسلم لیگ کی مخالفت۔ مخالف علماء کے حملے اور خود ان کی قوم کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی گالیاں۔ آزادیٔ ہند اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں جو انھوں نے پختہ اور پُرجوش عقیدہ قائم کیا تھا اس سے ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ پیدا ہو سکی"[1]

حضرت رحمۃ اللہ کا یہ مسلک صحیح تھا یا نہیں؟ اس کا فیصلہ تاریخ کی غیر جانب دار عدالت کرے گی۔ ہمارا موضوع تو صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے ماحول، حالات اور واقعات کے سیاق میں حضرتؒ کے نظریہ پر نظر ڈال لیں۔

---

[1] ڈاکٹر تارا چند: تاریخ تحریک آزادیٔ ہند، ج ۳، مطبوعہ ترقی اردو بیورو، دہلی، ص ۳۶۳

کانگریس میں شرکت - بدیشی مال کا بائیکاٹ

ہر چند کہ حضرت کی بنیادی سیاست جمعیتہ علماء ہند کی پالیسی کی تابع تھی۔ مگر چونکہ کانگریس اور جمعیتہ علماء میں بڑی حد تک اتحاد فکر و عمل تھا۔ اس لئے ملکی اصلاحات، سیاسی مطالبات اور آزادی کی تحریکات کی حد تک حضرت رحمۃ اللہ کانگریس کے دوش بدوش سرگرم عمل تھے۔ یہ اشتراک عمل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی زندگی سے اور جمعیتہ علماء ہند کی ابتداء سے کبھی کبھی وقتی اور جزوی اختلافات کے باوجود مسلسل جاری رہا تھا۔ ہمارے حضرتؒ مالٹا سے واپسی کے فوراً بعد کانگریس کے ممبر ہو گئے تھے اور اس کے بعد ساری ہی زندگی مختلف حیثیتوں میں صوبائی کانگریس کی سربراہی، کانفرنسوں کی صدارت، ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت وغیرہ کی شکل میں آخر تک تعاون و تائید جاری رہی۔ "میں کانگریس کا اس وقت سے ممبر ہوں جب سے کہ مالٹا سے ہندوستان آیا تھا"[1] حضرت پورے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مکمل اخلاص اور جاں فروشی کے ساتھ جدوجہد کرنے والی جماعت صرف انڈین نیشنل کانگریس ہی ہے۔ اور دوسری ساری جماعتیں انگریز اور برطانوی حکومت کی تابع اور فرماں بردار ہیں۔ آزادی کو حضرت ملک و ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا پہلا زینہ سمجھتے تھے اور اس راہ میں ہر فرد و جماعت سے اشتراک کے لئے تیار تھے۔ اگرچہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں آپ دنیا کے دوسرے مشاغل اور افکار سے قطع نظر کر کے صرف تدریس و تعلیم اور روحانی اور اصلاحی مشاغل میں مصروف تھے مگر اسی دوران قلب و دماغ میں انقلابی اور تشدد پسندانہ جذبات بھی پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مدینہ طیبہ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کبھی کبھی ہوتا رہتا تھا اور پیچھے گزر چکا ہے کہ وہیں ایک عوامی جلسے میں حضرتؒ نے اپنے سیاسی خیالات کا مکمل کر اعلان کیا تھا اور مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے تقریر کی تھی۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام - ج ۲ ص ۱۵۲

لیکن اس کے باوجود عملی سیاست میں مالٹا سے واپسی کے بعد ہی حصہ لیا۔ سیاسی زندگی کی ابتداء کے بارے میں حضرت نے لکھا ہے:

"پہلے میں انقلابی تشدد آمیز خیالات کے ساتھ موجودہ انگریزی اقتدار کا مخالف تھا۔ اور اسی بنا پر مالٹا میں ۴ برس کی قید ہوئی تھی۔ اور واپسی مالٹا کے بعد عدم تشدد کے ساتھ انگریزی اقتدار کا مخالف اور ہندوستان کی آزادی کا حامی ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء سے برابر سالانہ فیس ممبری انڈین نیشنل کانگریس اور جمعیۃ علماء میں ادا کرتا ہوں۔ خلافت کا بھی اسی وقت سے ممبر ہوں۔ مگر خلافت فنا ہوگئی اس لئے اس میں اب کوئی حصہ نہیں رکھتا اور میں ہر اس انقلابی جماعت میں شریک ہونے کو تیار ہوں جو انگریزی اقتدار کو ہندوستان سے ختم کرنے یا کمزور کرنے کی سچائی کے ساتھ کوشاں ہو۔"[1]

یہ باضابطہ شرکت اور ممبری کا معاملہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی عملی سرگرمیوں میں بھی پورے حوصلے اور عزم و ہمت کے ساتھ شرکت ہمیشہ جاری رہی۔ اس سلسلے میں مختلف مقامات پر اسفار، اجلاسوں میں شرکت، کانفرنسوں میں خطبات اور تقریریں کانگریس کمیٹیوں کی صدارتیں تواتر اور تسلسل کے ساتھ ہوتی رہتی تھیں۔ ان سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرتؒ نے فرمایا:

"میں ۲۵ برس سے کانگریس کا ممبر ہوں۔ جلسوں میں شریک ہوتا ہوں، تقریریں کرتا ہوں، فیس ممبری ادا کرتا ہوں، عہدوں کو قبول کرتا ہوں، جیل جاتا ہوں۔ اور اسی طرح اسی وقت سے جمعیۃ علماء کا بھی ممبر ہوں۔ ہاں کسی مذہبی و فرقہ واری غیر مسلم (ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، پہلوی) جماعت کا نہ ممبر ہوں نہ ان کے جلسوں وغیرہ میں شریک ہوتا ہوں۔"[2]

ایک اہم نکتہ اس جگہ قابل غور ہے۔ کانگریس میں یہ شرکت حضرت کے لئے فقط سیاسی یا عوامی سرگرمی نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی اور

---

[1] نقش حیات۔ ج ۲ ص ۱۵۲ [2] نقش حیات۔ ج ۲ ص ۱۵۳

حکومت برطانیہ کے استیصال کو آپ اسلام کی ترقی اور عالم اسلام کی گلو خلاصی کی طرف پہلا اور ضروری قدم خیال فرماتے تھے۔ اس اجمال کی کسی قدر تفصیل پچھلے اوراق میں گزر چکی ہے۔ حضرتؒ کا ذوق اور طبیعت ثانیہ یہ تھی کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر اقدام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی کے لئے وقف تھا اور اپنے اسی مزاج کی روشنی میں وہ کانگریس کو ملک و قوم، مسلمانوں اور عالم اسلام کے لئے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد جماعت قرار دیتے تھے، اور اس میں شرکت کو دینی ضرورت فرماتے تھے۔ اپنے اس مسلک کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بے شک میں کانگریس کا ممبر ہوں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ یہ ملک کی ایک مشترکہ جماعت ہے۔ اس میں ملک کا ہر باشندہ ممبر ہے اور ہو سکتا ہے۔ یہ ۱۸۸۵ء سے قائم ہے۔ آٹھ یا نو اس کے صدر مسلمان رہ چکے ہیں۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء ۱۹۲۰ء سے برابر اس میں شریک ہو کر کام کرنے کی ہدایت کرتی رہی ہیں۔ یہ خالص ہندوؤں کی جماعت نہیں ہے۔ ہندوؤں کی خالص ہندو مہا سبھا ہے، وہ صرف ہندوؤں کے فرقہ وارانہ حقوق کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ جس طرح مسلم لیگ خالص مسلمانوں کے حقوق کی ذمے دار ہے۔ جس طرح میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلوں اور اسمبلیوں میں مسلمان ملکی حقوق کی حفاظت وغیرہ کے لئے جاتے ہیں، اسی طرح کانگریس میں جانا اور تمام ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانا اور اس کے لئے جنگ بقدر طاقت کرنا ضروری ہے اور میں اس کو اس وقت جہاد اور افضل الجہاد سمجھتا ہوں۔"[1]

اس مسئلے میں ایک صاحب الرائے اور صائب الرائے عالم اور عالم اسلام کی ایک مقتدر شخصیت کی رائے بھی ملاحظہ فرمایئے جنھوں نے حضرت کے اس مسلک کی تائید فرمائی ہے۔ مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ:

"محب مکرم مولانا سید ابو الحسن علی الندوی زید مجدہٗ نے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے فرمایا کہ مولوی نجم الدین! میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام۔ ج ۴ ص ۳۳۷

ہے کہ ہندوستان میں اگر کوئی سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مثنیٰ تھا تو وہ حضرت
مولانا حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ حضرت
مدنی کا کانگریس کے اندر شرکت کرنا ان کے تہجد سے کم نہیں تھا۔[1]

اسی جد وجہد آزادی اور جذبہ جہاد کے راستے میں ایک محرک غیر ملکی مصنوعات کی مخالفت
اور ملک کی صنعت کی ترقی کا بھی پڑتا تھا۔ حضرت سال بہ سال کی اقتصادی رپورٹوں اور بیرونی
مال کی درآمد کی تفصیلات اور اعداد و شمار سے بڑے اہتمام کے ساتھ باخبر رہتے تھے۔ اس کے
ان مواقع کا علم بھی رکھتے تھے، جہاں ملکی مصنوعات کی ترقی اور فروغ پر حملہ کیا جاتا تھا۔ پبلک
جلسوں اور اجتماعات میں بیشتر تقریروں میں گھنٹوں یہ تفصیلات اور اعداد و شمار بیان فرماتے
تھے۔ اپنی سوانح نقش حیات میں بھی بڑے شرح و بسط کے ساتھ یہ مضمون تحریر فرمایا ہے۔
ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا جائے،
چنانچہ کھلے ہوئے احکامات صادر کئے گئے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرنے کی کوشش
کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار کرنے کو روکا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے
کے لئے ریشم بافوں کو جبراً کمپنی کے کارخانوں میں ملازم رکھ لیا گیا۔ اور دوسرے کسی
گاہک کی فرمائش پر کپڑا بننے کی ممانعت کردی گئی۔ ہندوستان کی ان صنعتوں کو
تباہ کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت دونوں یکساں آرزومند
تھے۔ اس کا اندازہ اس شرح محصول سے کیا جاسکتا ہے جو برطانیہ کے ساحل پر
ہندوستانی مال کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں اکثر ہندوستانی کپڑوں پر
۶۸ اور ۸۰ فیصدی محصول (کسٹم ڈیوٹی) لیا جاتا تھا۔"[2]

ہندوستانی صنعتوں اور ان کی اعلیٰ خصوصیات و امتیازات خصوصاً قالین بافی، جواہرات
تراشی، زرگری، طلائی و نقرئی ظروف سازی، عطر کشی، چرم سازی، لکڑی، پیتل اور دوسری
معدنی اشیاء پر نقش نگاری، پارچہ بافی و رنگکاری وغیرہ اور ان کے عروج و زوال کے بارے

[1] سیرت شیخ الاسلام۔ مولانا نجم الدین اصلاحی، ص ۱۳ [2] نقش حیات، ج ۱، ص ۲۴۳

یں جزئی جزئی تفصیلات حضرتؒ اپنی تقاریر میں بیان فرماتے تھے جنھیں سن کر ایک طرف فخرو مسرت کے احساسات موجزن ہوتے تھے تو دوسرے ہی لمحے دل رنج وصدمے سے چور ہو جاتا تھا۔ وہ تفصیلات تو تاریخی اور اقتصادی کتابوں ہی میں مل سکتی ہیں۔ ہمیں تو دو ایک ہی اقتباسات پر اکتفا کرنی پڑے گی اور وہ بھی اس لئے کہ اس مسئلے میں حضرتؒ کے موقف کی وضاحت ہو جائے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"داعیانِ خدمت انسانی اور دعویدارانِ تمدن و تہذیب نے مامون تجارت کی آڑ میں ایسے ایسے جابرانہ اور ظالمانہ قوانین ہندوستانی تجارت اور مصنوعات کو روکنے کے لئے بنائے کہ دنیا نے تجارت نے نہ کبھی دیکھے تھے نہ سُنے تھے۔ (انگلینڈ) میں ہندوستانی مصنوعات پر حکومت کی طرف سے نہایت بوجھل محصول (کسٹم ڈیوٹی) لگائے گئے۔ حالانکہ ہندوستان برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات برطانیہ میں قرار پا چکا تھا۔ ایسے ٹیکسز کی بنا پر لازم اور ضروری تھا کہ ہندوستانی مال انگلستان میں یک قلم بند ہو جاتا۔ اور ہندوستانی کاریگروں کی زندگی موت کے گھاٹ اُتر جاتی۔"

"ہنری سنٹ جارج ٹکر جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ ہندوستان میں بسر کیا تھا اور جو بعد واپسی انگلستان کمپنی کے ڈائرکٹروں میں داخل کرلئے گئے تھے۔ ۱۸۲۳ء میں مختصراً بیان کرتے ہیں۔ ہم نے ہندوستان سے کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں؛ اس کے ریشمی کپڑے اور وہ کپڑے جو ریشم اور سوت سے مل کر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے بالکل خالی کر دئے گئے ہیں اور حال میں کچھ ۷۰ فیصدی محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی ایجاد کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہو گئے ہیں بلکہ ہم اُلٹے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کر کے اب محض زراعتی ملک رہ گیا ہے۔"

"خلاصہ یہ کہ تامین تجارت کی غرض سے انگلستان نے پہلے ہندوستانی مصنوعات پر ۸۰ فیصدی اور اس سے بھی زیادہ محصول (کسٹم ڈیوٹی) لگاکر اور پھر قطعی ممانعت کر کے مہذب ڈاکہ ڈالا تھا۔ اور پھر جب (ان کے) ملوں اور کارخانوں کی پیداوار بہت زیادہ تیز ہوگئی اور دوسرے ممالک میں ان کی کھپت نہیں ہوسکی تو آزاد تجارت کے ڈھونگ سے ہندوستان میں اپنی مصنوعات ٹھونسنے کی غرض سے محصول درآمد کم کر کے ہندوستان کو مجبور کر دیا جس سے وہ خام مال تیار کرنے پر بے دست و پا ہوگیا اور دستکاری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مسٹر مانٹ گومری تاریخ نوآبادیات برطانیہ میں لکھتا ہے ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کو اپنی مصنوعات خریدنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس طریقے پر کہ ہمارے اونی مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا۔ سوتی مال پر ½۲ فیصدی محصول تھا۔ اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا۔ درآں حالیکہ اسی زمانے میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بالکل ہی بند ہو جائے۔"[1]

برطانیہ کی اس پالیسی اور ہندوستانی اقتصادیات پر ایسی ضرب کاری کے جواب میں ہندوستان نے بدیشی مال کا بائیکاٹ کر کے دیسی مصنوعات کو فروغ دینے کی تحریک چلائی۔ حضرت رحمۃ اللہ اس تحریک کے قائدین میں شمار ہوتے تھے۔ بہت ہی مجبوری ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا، حضرتؒ کسی قسم کا کوئی بدیشی مال، سامان یا چیز استعمال نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان فرش و فروش پر نہیں بیٹھتے تھے جن کے بارے میں یہ علم ہو جائے، کہ غیر ملکی صنعت ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی بدیشی چیز بھولے سے بھی گھر میں یا استعمال میں آجاتی تھی تو اندازہ ہوتے ہی اُسے ضائع کر دیتے تھے۔ اپنے متعلقین، متبعین، مریدین اور معتقدین کو اگر کوئی غیر ملکی چیز استعمال کرتے دیکھتے تھے تو ناگواری کا اظہار فرماتے تھے اور حتی الوسع اُسے تبدیل کرا دیتے تھے۔ کسی جنازے کا کفن غیر ملکی کپڑے کا ہوتا تو نماز تو پڑھ لیتے تھے مگر اس کی امامت نہیں

[1] نقش حیات، ج ۱ ص ۲۴۵

کراتے تھے۔ حضرتؒ کے ایک ماموں زاد بھائی سید خلیل احمد صاحب مرحوم کی وفات حُسنِ اتفاق سے اس زمانے میں ہوئی جب حضرتؒ ٹانڈہ میں موجود تھے۔ سید صاحب کو حضرتؒ سے عزیز داری اور رشتہ داری کا تعلق تو تھا ہی مگر دینی اور مذہبی پہلو سے بھی بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ مرحوم خود بھی بڑے پابند اوقات اور متقی انسان تھے۔ بدقسمتی سے ان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ دوسرے پس ماندگان کو اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ان کے کفن کے بارے میں حضرت کی رائے کی رعایت رکھی جاتی۔ غالباً ان کو اس کا علم بھی نہ تھا۔ چنانچہ جنازہ آیا تو غیر ملکی لٹھے کا استعمال تھا۔ حضرت نے امامت فرمانے سے انکار کردیا اور باوجود اصرار اور اعذار کے رضامند نہ ہوئے۔ البتہ نماز میں شرکت فرمائی۔ اس باب میں واقعات تو پچاسوں بلکہ سیکڑوں ہیں۔ مگر نمونے کے لئے ایک حکایت اور پیش خدمت ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولینا زکریا صاحب رحمۃ اللہ ململ اور لٹھے کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔ ہمارے حضرت میں اور ان میں بڑے اخلاص اور للہ فی اللہ کا تعلق تھا۔ شروع شروع میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں بدیشی کپڑے استعمال کرنے پر ٹوکا۔ شیخ نے پھر بھی یہ کپڑے نہ چھوڑے تو حضرتؒ نے کچھ زبانی افہام و تفہیم کی۔ مگر اس پر بھی جب شیخ نے اپنا طریقہ نہیں بدلا تو ہمارے حضرتؒ نے اپنا طور بدل لیا۔ اب جب بھی شیخ کو ولایتی کپڑے پہنے ہوئے دیکھتے بلا ایک لفظ کہے ہوئے اس کو چیر پھاڑ دیتے۔ شیخ الحدیث صاحب کے واقعات ان کے اپنے منفرد اسلوب میں زیادہ دلچسپ لگتے ہیں:

> "حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو کھدر سے تو عشق تھا اور ولایتی کپڑے سے نفرت تھی یہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے لیکن اس سیہ کار کے حال پر ایک مزید شفقت یہ تھی کہ میرے بدن پر جب بھی بدیسی کُرتہ دیکھتے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایسے زور سے چاک فرماتے تھے کہ نیچے تک وہ پھٹ جاتا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ کی حیات تک ڈر کے مارے کھدر کا میرے یہاں بہت ہی اہتمام رہا چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، نہ دن نہ رات اس لئے گرمی میں بھی کھدر کا کُرتہ جھک مار کر پہننا پڑتا تھا۔"[1]

---

[1] حضرت مولانا زکریا صاحب آپ بیتی ۵ ص ۹۵

اس بات کا اتنا اہتمام تھا کہ جلسوں اور کانفرنسوں میں بدلائل واضحہ یہ بات ثابت کیا کرتے تھے کہ برطانیہ نے تجارت ہی کے راستے ہندوستان پر قبضہ کیا ہے اور تجارت ہی کے ذریعے سے ہمارے ملک کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے ملک انگلستان پہنچا رہے ہیں۔ ایک تقریر آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ "ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' میں لکھتا ہے کہ ہمارا طرزِ حکومت اسپنج کی طرح دریائے گنگا سے دولت چوس کر دریائے ٹیمز کے کنارے لاکر نچوڑ دیتا ہے۔" اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ اگر ہندوستان اپنی ملکی مصنوعات کو فروغ دے اور غیر ملکی اشیاء کی خریداری بند کردے تو دنیا کی کوئی طاقت اس پر حکومت نہیں کرسکتی۔ حضرت کی ایک تنبیہ اور نصیحت ملاحظہ ہو:

"پھر میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ خبردار! خبردار! انگریزوں کی ادنیٰ درجے کی بھی حمایت، خیرخواہی اور مددگاری نہ کیجئے۔ یہ دنیا اور آخرت کا سوال ہے۔ ولایتی چیزوں خصوصاً کپڑوں سے خود رکئے اور دوسروں کو روکئے۔ اور جس قدر بھی ممکن ہو مسلمانوں میں اتحاد و تنظیم پیدا کیجئے اور گورنمنٹ برطانیہ کی قوت کو برباد کرنے کی کوشش کیجئے۔"[1]

باوجود اس اہتمام و اجتناب کے بعض چیزیں بوجہ مجبوری استعمال ہی کرنا پڑتی تھیں۔ دو سو سالہ غلامی نے ہندوستان کو بالکل مفلوج و ناکارہ کردیا تھا۔ روزمرہ کے استعمال کی ساری ہی چیزیں لالٹین، چھری، چاقو، قینچی، سوئی، بوتلیں، شیشیاں، فاؤنٹین پین، قلم کی نب، روشنائی، چشمہ، غرض اس نوعیت استعمال کی ساری ہی چیزیں ولایت ہی سے آتی تھیں۔ ان تمام اشیاء میں حضرتؒ صرف وہ چیزیں بمجبوری استعمال فرماتے تھے جن کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اپنی اس پالیسی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں حتی الوسع غیر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کرتا البتہ جو چیزیں ہندوستان میں تیار نہ ہوسکتی ہوں اور ان کی ضرورت بھی ہو ان کو بقدرِ حاجت

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۲۲۰

استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس سوائے گھڑی، عینک اور فاؤنٹین پین کے اور کوئی چیز غیر وطنی نہیں ہے۔ فاؤنٹن پین بھی سوائے سفر کے دوسرے اوقات میں استعمال نہیں کرتا۔ آپ کے مرسل کاغذات غیر وطنی تھے۔ مجھ کو اسلامیت اور وطنیت کا سودا سخت ہے۔ میں زیادہ ضروری سمجھ رہا ہوں کہ مسلمان اور اہلِ ہند کھدر کا استعمال کریں اور ولایتی چیزوں سے حتی الوسع گریز کریں"۔ [۱]

یہ وہ حربہ تھا جس نے ایک طرف تو ہندوستان کے باشندوں میں احساس زیاں اور جذبۂ آزادی بیدار کیا اور دوسری طرف برطانیہ کے مصالح اور مفادات پر فیصلہ کُن ضرب کاری لگائی جس کے نتیجے میں اس کو ہندوستان سے بوریا بستر گول کرنا پڑا۔

[۱] الرشید مدنی واقبال نمبر مطبوعہ ساہیوال پاکستان۔ ص ۳۴۳

معاندین و مخالفین

پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ مدینہ طیبہ میں حضرتؒ کے حاسدین و معاندین کی شروعات ہو چکی تھی اور اس کی وجہ صرف حضرتؒ کی مقبولیت و محبوبیت تھی۔ مالٹا سے واپسی کے بعد آپ کی شہرت و مقبولیت سیاسی، تبلیغی اور اصلاحی خدمات میں روز افزوں ترقی ہونے لگی اور اسی کے ساتھ مخالفین اور معترضین کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ حضرتؒ کی طبعی انکساری، خوش اخلاقی اور ہر کس و ناکس کی دلداری اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی، تدریسی، روحانی اور سیاسی مشاغل میں انتھک انہماک کے پیش نظریہ کہنا مشکل ہے کہ مخالفین کے حقد و حسد کے کیا اسباب تھے۔ مگر حالات کے مشاہدے و مطالعے سے جو نتائج اخذ ہو سکتے تھے ان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے لوگ تین چار گروپوں میں تقسیم تھے۔

پہلی جماعت مولوی احمد رضا خاں صاحب کے متبعین اور مریدین کی تھی جن کو عرف عام میں بریلوی جماعت کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مخالفت کی ابتدا جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزرا ہے مدینہ طیبہ ہی سے ہو گئی تھی۔ یہ لوگ پوری دیوبندی جماعت اور مسلک سے بغض و عناد رکھتے تھے اور چونکہ اس مسلک کے مقتدا اور جماعت کے سربراہ اپنے وقت میں حضرتؒ ہی تھے اور انھوں نے المستشرق الکاذب لکھ کر اس جماعت کے مسلک اور طریقہ کو نمایاں کیا تھا اس لئے ان کو حضرت سے خصوصی طور پر عناد تھا۔ یہ لوگ غلط، جھوٹے، نقلی اور بے بنیاد الزامات و اتہامات اور اعتراضات کی نشر و اشاعت بھی کرتے رہتے تھے اور جہاں تہاں موقع ملتا تھا عملی طور پر بھی فتنہ و فساد برپا کرتے رہتے تھے۔ ان کی جماعت حکومت برطانیہ کی تائید اور تحریک آزادی کی مخالفت میں بھی، بہت پیش پیش تھی۔ اس لئے کانگریس میں شرکت، ہندو مسلم اتحاد، صلح و رواداری اور جدوجہد آزادی بھی ان کے الزامات اور اتہامات کی فہرست میں شامل تھی۔ اور ان کو وہ مختلف عنوانات سے عوام کے سامنے پیش کرتے تھے۔ مگر اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس جماعت میں بعض افراد و احاد ایسے بھی تھے جو حضرت

کی عظمت، عزیمت اور مرتبت کے قائل اور معتقد تھے۔

دوسرا طاقتور گروہ زمینداروں، رئیسوں، نوابوں، جاگیرداروں، تعلقداروں اور خطاب یافتوں کا تھا۔ فطری طور پر ان کے حاشیہ بردار اور مصاحبین بھی ان کے ساتھ بلکہ ان سے بڑھ کر تھے۔ ان لوگوں کا عیش و عشرت، شان و شوکت، راگ و رنگ، رقص و سرود اور استحصال بالجبر حکومت برطانیہ کے دم قدم سے زندہ اور اسی کا عطا کردہ تھا۔ یہ لوگ تحریک آزادی کو کچلنے میں اپنا مال، دوست، سپاہی، پیادے، گماشتے، ملازمین اور مصلحین سب کچھ آخری حد تک استعمال کرتے تھے۔ حضرت کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ بہت شدید تھا۔ حکومت کی طرف سے بھی ان کو اشارہ اور حکم ملتا رہتا تھا کہ حضرت کے خلاف مختلف کارروائیاں کرتے رہیں۔ جلسوں میں، کانفرنسوں میں اور مجالس میں ان کے مقرر کردہ لوگ بین تقریر کے اور جلسوں کی کارروائیوں کے درمیان اُٹھ کر شور مچاتے تھے۔ ہلڑ بازی کرتے تھے اور اینٹ پتھر پھینکتے تھے۔ جس شہر اور مقام پر حضرت تشریف لے جاتے تھے وہاں مخالفت میں اشتہارات شائع کرواتے تھے پوسٹر لگاتے تھے اور عوام کو ورغلاتے اور بھڑکاتے تھے۔ حضرت کے معتقدین اور متبعین میں زیادہ تر عوام مزدور، کاریگر، صنعت کار، مدرسین، کسان اور معمولی دوکان دار اور ملازمین شامل تھے۔ ان کمزور لوگوں پر ان صاحب اثر و نفوذ حضرات کا پورا بس چلتا تھا۔ مقامی افسران، کلکٹر، ایس پی، تھانیدار، داروغہ وغیرہ وغیرہ اس طبقے کی پشت پناہی کرتے تھے۔ حضرت سے ان کو ایک ذاتی پرخاش یہ بھی تھی کہ ایک مولوی مولینا بوریہ نشین اور مسجد و خانقاہ کے مکین کی یہ حیثیت اور مجال ہوگئی کہ ہماری رعایا کے لوگ اور ہماری ریاستوں کے عوام اس کے اشاروں اور احکام پر قربان ہونے اور ہمارے مقابلے پر آنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کے وظیفہ خوار، تنخواہ دار اور ایجنٹ جو ان کے ذریعے سے دراصل گورنمنٹ برطانیہ کے ایجنٹ ہوتے تھے، ہر شہر اور ہر علاقے میں موجود رہتے تھے۔ دیوبند اور مدرسہ دیوبند بھی ان سے خالی اور پاک و صاف نہیں تھا اور یہ لوگ اپنی سرکاروں کی خوشنودی مزاج کے لئے اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ مدرسہ دیوبند کی سب سے بڑی اور بااختیار کمیٹی، مجلس شوریٰ میں بھی بعض ایسے

نواب جاگیردار اور خطاب یافتہ حضرات موجود اور اپنی ریشہ دوانیوں میں مشغول تھے، وہ طرز
درازیمہ یہ لوگ اس اہتمام کوشش میں مصروف رہے کہ مدرسۂ دیوبند سے حضرت کو
الگ کر دیا جائے۔

حضرت کے مخالفین کی تیسری جماعت حکومت کے عہدہ داران، بڑے بڑے
افسروں، بیرسٹروں اور تمدن انگریزی کے علم برداروں اور ان کے حاشیہ نشینوں پر مشتمل
تھی۔ یہ لوگ کسی درجے میں تو مجبور تھے اس لئے کہ ان کا حُبّ و بغض سرکار کے اشاروں
کے تابع تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس طبقے کے بیشتر افراد حضرت سے شخصی اور ذاتی بغض و
عناد رکھتے تھے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر تو یہ تھی کہ جس طبقہ، ماحول اور مکتب فکر سے تعلق
رکھتے تھے حضرت اسی کے استیصال کے لئے سرگرم عمل تھے۔ دوسرے اس معاملے میں
حضرت کے طرز عمل اور برتاؤ کا بھی بڑا دخل تھا۔ حضرت کا مزاج یہ تھا کہ چھوٹے بڑے، امیر فقیر،
محتاج غنی، عامی اور عالی غرض ہر شخص کے ساتھ یکساں کشادہ روی اور خوش اخلاقی سے ملتے
تھے اور ظاہری شان و شوکت اور دنیاوی اختیار و حیثیت کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی
معاملہ نہیں کرتے تھے۔ یہ مزاج صاحب جبر و اختیار لوگوں کے لئے اور وہ بھی حکومت برطانیہ
کے ساختہ و پرداختہ افراد کے لئے قابلِ قبول بلکہ قابلِ برداشت نہ تھا۔ حضرت وقتاً فوقتاً ان کو
علی الاعلان مخاطب کرتے تھے کہ برطانیہ کی وفاداری میں اپنے وطن، اہل وطن اور قوم کے ساتھ
غداری اور بے وفائی تمہارے لئے ننگ و عار ہے۔ حکومت برطانیہ تمہارے کندھوں پر بندوق
رکھ کر ہندوستان کو نشانہ بنا رہی ہے اور تمہارے ہاتھوں سے تمہارے ہی بھائیوں کو
تباہ کروا رہی ہے۔ انھوں نے بھی نوشتۂ دیوار پڑھ لیا تھا۔ اور تیزی کے ساتھ ایسے مامن
اور پناہ گاہ کی تلاش میں تھے جہاں یہ اپنے آقایان ولی نعمت کے پیر اکھڑ جانے کے بعد سر چھپا
سکیں۔ یہ دیکھتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ اور ان کی جماعت شب و روز علوم اسلامیہ اور افکار
دینیہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے۔ مدارس اسلامیہ کی ترقی اور افکار دینیہ کی ترویج
ان لوگوں کو سب سے زیادہ گراں تھی۔ اس سے ان کی زندگی پر بڑا اثر اور آزادی میں بہت
فرق پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ برملا حضرت کی شان میں تحقیر آمیز خیالات کا اظہار کرتے تھے اور علماء کے لئے

بڑے طنزیہ القاب "قل اعوذیئے" "سجدے کے بڑھئے" "بھراتی مُلّا" وغیرہ وغیرہ ایجاد کرتے تھے۔ شعراء اپنے اشعار میں تحقیر و استخفاف کرتے تھے۔ اور مضمون نگار طنزیہ مضامین لکھتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ اسی جماعت علماء کے مقتدا اور سربراہ تھے۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کے ہزاروں مدارس دینیہ و مکاتب اسلامیہ کے سرپرست تھے اس لئے قدرتی طور پر ان حضرات کے نشانوں کی زد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ حضرت ہی پر پڑتی تھی۔ ان کے ساتھ ہی علماء و فضلاء کا بھی ایک گروہ حضرت کی مخالفت میں شامل تھا۔ یہ وہ حضرات تھے جو ملک کی آزادی اور برطانوی حکومت کی مخالفت کو مسلمانوں کے لئے نقصان و خسران کا سبب خیال کرتے تھے یہ سمجھتے تھے کہ مسلم قوم کی حفاظت و بقا کے لئے انگریزوں کا وجود ضروری ہے، ان حضرات کو حضرت سے ذاتی عداوت و دشمنی نہیں تھی، مگر سیاسی مخالفت ضرور تھی اور وہ بعض اوقات اس قدر آگے بڑھ جاتی تھی کہ حدود و قیود سے تجاوز کر جاتی تھی۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ پر قابل شکر ہے کہ انھوں نے حضرت کے خلاف کبھی زبان طعن اور قلم تنقید دراز نہیں کیا۔ لیکن ان کی مخالفتوں کی زد گھوم پھر کر ہی سہی مگر حضرت کی ذات پر پڑتی تو تھی ہی۔

مختصر یہ کہ حضرت نے اپنی زندگی میں چالیس پچاس برس تک دن رات جس وقار اور عزیمت کے ساتھ یہ عداوتیں، طنز و تشنیع، ناگفتہ بہ کلمات اور مختلف قسم کی ناروا حرکات برداشت کیں اس کی بہترین تفسیر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ واذا مروا باللغو مروا کراما واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔ کسی بھی مخالفت، عداوت، سب و شتم، الزام تراشی اور ہلڑ بازی پر کبھی کسی زبانی یا عملی شکوہ و شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ خود تو حلم و بردباری اور صبر برداشت کا ثبوت دیتے ہی تھے مخلصین و متعلقین کو بھی صبر و شکر کی تاکید کرتے تھے۔

> اگر میں حق پر ہوں اور مخلصانہ مذہبی اور اسلامی خدمات کرتا ہوں تو غیروں اور اپنوں سے جو کچھ بھی اذیتیں پیش آئیں یا آ رہی ہیں ان کے لئے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور اعمال مشعل راہ ہیں۔ جو جو مصائب انبیائے کرام

اور اولیائے عظام اور مقدس علماء کو پیش آئے ہیں اُن کے سامنے ہمارے مصائب تو وہ بھی نسبت نہیں رکھتے جو ذرّے کو پہاڑ سے ہے۔ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل سے تو بشارت حاصل ہوتی ہے جس سے قبولیت عند اللہ کا پتہ چلتا ہے اور اگر خدانخواستہ میں غلط راستے پر ہوں اور معاذ اللہ ضلالت اور گمراہی میں پھنسا ہوا ہوں تو اس کا مستحق ہی ہوں۔"[1]

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۲، ص ۳۸۳

مالٹا سے رہائی کے بعد مدینہ طیبہ کا پہلا سفر

دیوبند میں مستقل قیام کے بعد اب حالات کے نشیب و فراز میں ظاہری طور پر کسی قدر سکون نظر آنے لگا تھا۔ مولانا وحید احمد کی شادی سے سبکدوشی ہوگئی تھی اور وہ مدرسۂ عزیزیہ بہار شریف ضلع پٹنہ میں ملازم بھی ہو گئے تھے۔ خود حضرت کے ایک صاحبزادے اسعد اب دو ڈھائی برس کے ہو گئے تھے اور عائلی زندگی کسی حد تک مطمئن محسوس ہونے لگی تھی، ہرچند کہ مدینہ طیبہ کی مستقل واپسی کا ارادہ ابھی نہیں کیا تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق اور ان گلیوں کی یاد شب و روز بے چین رکھتی تھی۔ بڑے بھائی مولانا سید احمد صاحب اور چھوٹے مولانا سید محمود احمد صاحب کا تقاضا اور اصرار بھی دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر بھتیجا بھی وقتاً فوقتاً چچا سے اصرار کرتا تھا۔ آخر ۱۹۳۱ء میں سفر حج کا ارادہ فرمایا۔ یہ مالٹا کی رہائی کے بعد پہلا حج تھا اور اس میں حضرتؒ، ان کی اہلیہ مرحومہ، ایک صاحبزادہ اسعد سلمہٗ، ایک خادمہ حجن شبراتن مرحومہ، مولانا وحید احمد مرحوم، ان کی اہلیہ مدظلہا، ایک تین برس کا لڑکا، اور ایک شیر خوار بچی، کُل آٹھ نفر شریک قافلہ تھے۔ اس سفر کے حالات خواب کی طرح یاد ہیں اور اکتفا، انہی تفاصیل پر کی جا سکتی ہے جو یاد ہیں۔ دیوبند سے بذریعہ ٹرین روانہ ہو کر پہلی منزل کراچی میں کی گئی۔ کراچی اس وقت ایک چھوٹا سا ساحلی شہر تھا۔ آبادی بہت ہوگی تو چار پانچ یا چھ لاکھ رہی ہوگی۔ شہر میں عام لوگوں کے لئے ٹرام چلتی تھی اور خاص خاص لوگ دو گھوڑوں کی گاڑی پر چلتے تھے جسے وکٹوریہ اور فٹن کہتے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا موٹریں بھی نظر آ جاتی تھیں جو یقیناً انگریز عہدہ داران کی ہوتی ہوں گی۔ اس وقت ہندوستانی خواتین چاہے کسی بھی طبقے یا جماعت سے تعلق رکھیں گھروں سے شاذ و نادر ہی نکلتی تھیں۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نکلنا ہی پڑتا تھا تو پردے اور حجاب کے بیسوں انتظامات ہوتے تھے انہی ضروریات کے لئے اس وقت کراچی کے صدر اور بندر روڈ پر ایسی ہی پردہ دار وکٹوریہ گاڑیاں اور فٹن

نظر آتی تھیں جو چاروں طرف سے بالکل بند ہوتی تھیں اور ہوا کے لئے ان میں ریل کے ڈبوں کی طرح ہوادار کھڑکیاں لگی ہوتی تھیں۔ ایسی ہی ایک گاڑی میں حضرت کا خاندان بندرگاہ تک پہنچا تھا۔ کراچی میں حضرت کا قیام محلہ کھڈہ مدرسہ عربیہ میں مولانا محمد صادق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر ہوا تھا۔ کراچی سے جدہ کا سفر دخانی جہاز کے ذریعے ہوا جس میں اوپر کے طبقے پر ایک سائے دار سائبان میں چاروں طرف تناتیں لگا کر قیام کی آرام دہ جگہ بنائی گئی تھی۔۔ بحری سفر کے دوران کھانے کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا جس کے لئے جملہ لوازمات وضروریات پہلے ہی سے ساتھ لے لی گئی تھیں۔ اس سفر کے دوران حضرت کا زیادہ تر وقت ذکر و شغل، عبادت و ریاضت اور تبلیغ و تذکیر میں خرچ ہوا۔ بارہ چودہ دن کے سفر کے بعد جہاز جدہ پہنچا تو کھلے سمندر میں لنگر انداز ہوا۔ اس وقت تک جدہ میں جہازوں کے ٹھہرنے کے لئے پلیٹ فارم نہیں بنے تھے۔ مسافر رسیوں سے بندھی ہوئی سیڑھیوں کے ذریعے اُترتے تھے، جو جہاز سے لٹکی رہتی تھیں۔ اور جہاز سے اُتر کر کشتی میں سوار ہوتے تھے جو ساحل تک پہنچاتی تھیں۔ مرد تو کسی نہ کسی طرح اس امتحان میں پورے اتر جاتے تھے مگر خواتین خاص طور پر بچوں والیاں اور بوڑھیاں جب ان ہلتی اور ڈگمگاتی ہوئی سیڑھیوں سے اُترتی تھیں اور پھر اس طرح کہ نیچے منہ کھولے سمندر لہریں مار رہا ہوتا تھا اور سامنے ڈولتی اور ہچکولے کھاتی ہوئی کشتیاں دل دہلائے دیتی تھیں اور آخری سیڑھی سے کشتی میں کسی قدر چھلانگ مار کر پہنچتی تھیں تو اللہ کی رحمت کاملہ سے امید ہے کہ حج کا آدھا ثواب تو اس پہلے ہی مرحلے پر مل جاتا ہوگا۔ حضرت کے استقبال کے لئے عام کشتی کے بجائے موٹر بوٹ پر اُن کے دونوں بھائی مولانا سید احمد صاحب اور مولانا محمود احمد صاحب اور نوعمر بھتیجے سید حبیب صاحب حاضر تھے۔ جدہ میں حضرت کا قیام چھوٹے بھائی سید محمود احمد صاحب کے یہاں ہوا جو حکومت حجاز کی ملازمت کے سلسلے میں جدہ ہی میں مقیم تھے۔ پہلے مدینہ طیبہ کی حاضری سے مشرف ہوئے۔ یہ سفر اس زمانے کی موٹر یا لاری میں ہوا جو آج کی طرح آرام دہ اور تیز رفتار نہیں تھی۔ یہ لاری دس دس بارہ بارہ میل پر کھڑی ہو کر ہانپنے لگتی تھی۔ پھر بڑی مشکل ایک دو ٹین پانی پلانے اور بیس پچیس راؤنڈ ہینڈل مارنے کے بعد ہلتی تھی۔ سڑک کا تو کیا ریگستان

میں ایک بھی نہیں ملتی تھی، ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد ریت کے جھکڑ نشان راہ کو سطح آب کی طرح سپاٹ کر دیتے تھے۔ بڑی بڑی مشکلوں سے یہ سفر دو دن میں طے ہوا۔ مدینہ طیبہ میں مولانا سید احمد صاحبؒ کا قائم کردہ مدرسہ باب جبرئیل سے ملا ہوا اور حرم پاک سے بالکل متصل تھا۔ اسی کے قریب حضرت موسّس مدرسہ کا گھر تھا، وہیں حضرت اور آپ کے قافلے کا قیام ہوا۔ یہاں قیام کے دوران زیادہ تر وقت حضرت حرم پاک میں گزارتے تھے۔ خوب یاد ہے کہ مواجہ شریف میں ساکت وصامت کھڑے ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں اور استغراق کی حالت طاری ہے، کئی گھنٹے اسی حالت میں گزر گئے، نہ لب ہلتے تھے نہ پیر بدلتے تھے۔ واپسی میں مکہ مکرمہ، منیٰ، عرفات اور مناسک حج کے لئے سفر اونٹوں پر طے ہوا۔ اونٹوں کی سواری قافلے والوں خصوصاً عورتوں اور بوڑھوں کے لئے تو بہت ہی اجر و ثواب کا باعث ہوتی ہوگی۔ سارے راستے جان پتے پر رکھی رہتی تھی کہ اب گرے اور تب گرے۔ اونٹ کی پشت پر دونوں طرف جھولے کی قسم کے کھٹولے لٹکا کر ان میں حجاج کرام کو اس طرح سوار کرایا جاتا تھا کہ دونوں طرف وزن برابر رہے۔ اس کے لئے پہلے اونٹ والا نظروں ہی نظروں میں سواریوں کو تول لیتا تھا۔ اور سوار ہو جانے کے بعد ترازو کے باٹوں کی طرح اِدھر اُدھر کر کے پلڑے برابر کرتا تھا۔ اتنی احتیاط کے باوجود راستہ چلتے ہوئے کئی بار خبردار کرتا تھا کہ فلاں طرف کا پلڑا جھک رہا ہے یا اُٹھ رہا ہے۔ جلدی وزن برابر کرو۔ اونٹ آگے قدم بڑھاتا تو معلوم ہوتا تھا کہ اب اٹھتے ہی چلے جائیں گے اور جب پاؤں زمین پر رکھتا تو ڈر لگتا تھا کہ زمین پر جا لگیں گے۔ اس طرح یہ قافلہ رواں دواں رہتا تھا۔ روحانی اور دینی اعتبار سے ان قافلوں کی بلندی اور علوئے شان کا کیا ٹھکانہ تھا مگر ظاہری طور پر ہر اونٹ کی نکیل اگلے والے کی دُم سے بندھی ہوتی تھی۔ اس طرح بیسوں پچاسوں دُموں اور نکیلوں کو باندھ کر ایک ایک میل لمبی قطار بن جاتی تھی۔ سب سے اگلے والے اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلانے کے لئے ایک ہی بدو (ساربان) پر اکتفا ہو جاتی تھی۔ دو ایک گارڈ اس پوری لائن کے آگے سے پیچھے تک چکر لگاتے رہتے تھے، مبادا کوئی نکیل کسی دُم سے کھل نہ جائے اور اس طرح کوئی ڈبہ اس ریل سے کٹ کر پٹڑی سے الگ نہ ہو جائے۔

قرآن پاک کے فیصلے قیامت تک کے لئے کس درجہ ناطق اور بصیرت افروز ہیں! سبحان اللہ افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ ایسے ہی ایک قافلے کے ذریعے حضرت کی جماعت عرفات پہنچی تو شدید گرمی تھی۔ زمین آگ اگل رہی تھی اور آسمان شعلے برسا رہا تھا۔ ہرچند کہ خیموں اور ٹینٹوں کا معقول انتظام تھا۔ کھانے اور پانی کا بھی وافر اہتمام تھا۔ مگر ان تپتے ہوئے خیموں میں کھانے پینے کا ہوش کس کو تھا۔ کسی کو کسی پل چین نہ پڑتا تھا۔ ایسی چنگاریاں برساتی ہوئی دھوپ میں حضرت دو تین گھنٹے یا شاید اس سے زیادہ جبل الرحمۃ پر اس طرح مصروف عبادت و مجاہدہ رہے جیسے کوئی فرحت بخش نسیم سحر سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

حج کے بعد بھائیوں نے بہت اصرار کیا کہ اب واپس نہ جایئے۔ اس وقت ملک عبدالعزیز آل سعود کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ حجاز میں چاروں طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ مالی ترقیوں، فراخ دستیوں اور مرفہ الحالی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ بھائیوں کا کہنا یہ تھا کہ جس خدمت کو درمیان میں چھوڑ کر جانا پڑا تھا اس کو اب پھر سے اختیار کیجئے اور جس گھر بار کو مجبوراً ترک کرنا پڑا تھا اس کو پھر آباد کیجئے۔ اب جب پورا خاندان، ایک ایک بچہ اور عورتیں مدینہ طیبہ آگئی ہیں تو واپسی کی کوئی وجہ اور ضرورت نہیں ہے۔ مگر حضرت کی دلیل یہ تھی کہ ہندوستان میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جہاد کی اور مسلمانوں کی دینی و روحانی ترقی کے لئے خدمات کی ضرورت شدید ہے۔ آج تن آسانی کے پیش نظر یہاں قیام کرلوں اور مشکلات سے فرار اختیار کرلوں تو کل اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجبور ہو کر بھائیوں نے کہا اگر آپ نہیں رکتے تو وحید کو چھوڑ دیجئے۔ مگر بھتیجے نے اس بار پھر چچا کی فرقت برداشت کرنے سے انکار کردیا اور پورا قافلہ ہندوستان واپس ہوگیا۔

جمعیۃ علماء اور مُسلم لیگ میں اشتراک و اختلاف

۱۹۳۰ء سے ہندوستانی عوام حکومت برطانیہ کی مخالفت میں دن بدن آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ اسی دوران گاندھی جی نے نمک کی ستیہ گرہ میں ڈانڈی کی طرف پیدل مارچ کیا۔ اس قانون شکنی میں نمک تو گاندھی جی نے دوچار تولے ہی بنایا ہوگا مگر اسی ذرا سی مقدار نے ملک اور قوم میں جوش اور جذبے کی لہر دوڑا دی اور آزادی کی تحریک کو پچاسوں برس آگے پہنچا دیا۔ آزادی کے اس قافلے میں کسی مذہب اور دھرم کی قید نہیں تھی۔ ہندوستان میں بسنے والی سبھی قومیں ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ اور عیسائی سبھی قدم سے قدم ملاکر منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ مسلمانوں میں مولینا حسین احمد مدنی، مولینا ابوالکلام آزاد، مولینا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسٹر جناح اور ان کے ساتھ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان کانگریس میں شریک تھے۔ جماعتی طور پر جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار، خدائی خدمت گار اور بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی کانگریس کی موید و معاون تھیں۔ مسلم لیگ جماعتی حیثیت سے اس سے الگ تھی مگر اس کے اندر جو دو کیمپ ہو گئے تھے ان میں سے ایک نے لیگ سے باہر نکل کر نیشنلسٹ پارٹی کی حیثیت سے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔[1] اسی دوران ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد مسلم لیگ کا اکیسواں سالانہ اجلاس ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں کانگریس سے مخالفت کا عنصر اور ذہن غالب رہا اور اسی رجحان کے ماتحت سر اقبال نے پہلی بار مسلمانوں کے لئے ایک الگ ہوم لینڈ کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۴۴، ۴۴

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر خود مختار رہے یا آزاد۔ مجھے صاف نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا ہی پڑے گی"[1]

اس تجویز کے بعد ڈاکٹر محمد اقبال صاحب انگلینڈ تشریف لے گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ موصوف سیاست میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لے رہے تھے اور مسٹر جناح کے ساتھ سیاسی مسائل میں خصوصاً مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کے بارے میں خط وکتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب انگلینڈ گئے تو وہاں ہندوستانیوں کے سامنے بھی اپنے خیالات پیش کرتے رہے۔ اس کے تین برس بعد برطانیہ میں مقیم ایک صاحب چودھری رحمت علی مرحوم نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ ہوم لینڈ کی اسکیم پیش کی جس کے لئے نہ صرف ہندوستانیوں ہی میں بلکہ انگریزوں اور حکومت کے ذمے داروں میں بھی انہوں نے میدان ہموار کرنے کا کام کیا۔ سب سے پہلے اس ہوم لینڈ کا نام پاکستان موصوف ہی نے تجویز کیا تھا۔ اس وقت تو ان دونوں حضرات کی تجاویز اور دلائل کو ہندوستانیوں اور مسلمانوں میں کوئی خاص قبولیت اور توجہ حاصل نہیں ہوئی۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ تقسیم ملک، مسلمانوں کے لئے ہوم لینڈ اور ہندو مسلم منافرت اور علحدگی کی بنیاد کا کام مکمل ہوگیا اور فرقہ پروری اور تحریک آزادی کے مخالفین کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ایک میدان ہاتھ آگیا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مطابق ملک میں عام انتخابات کا پروگرام سامنے آیا۔ اس ایکٹ کی رو سے صوبائی اسمبلیاں اور مرکزی کونسل منتخب ممبروں کے ماتحت رہنی قرار پائی تھی۔ لیکن آخری حکم گورنروں اور وائسرائے کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا۔ کانگریس کو یہ نامکمل اور نام کی حکومت منظور نہیں تھی اور اس نے الکشن میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ مسلم لیگ اس وقت تک بحیثیت جماعت کانگریس کی مخالف نہیں تھی۔ اپنی علحدہ تنظیم، پالیسی،

---

[1] چراغ راہ نظریۂ پاکستان نمبر، دسمبر ۱۹۶۰ء۔ مطبوعہ کراچی۔ ص ۹۹

اور قیادت کے باوجود ملک کی آزادی کے معاملے میں کانگریس کی مؤید تھی۔ کہیں کہیں سیاسی اور نظریاتی اختلافات رائے کے باوجود بھی تعاون اور اتحاد عمل برقرار تھا۔ کچھ بحث و مباحثہ اور تردد و توقف کے بعد جب کانگریس نے ۱۹۳۶ء کے الکشن میں حصہ لینا منظور کر لیا تو مسلم لیگ نے اس الکشن میں کانگریس اور دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل کا فیصلہ کیا۔

> "۱۰ اپریل کو بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس بصدارت سر وزیر حسن منعقد ہوا جس میں صدر اجلاس نے اپنے خطبے میں اس امر کو واضح کر دیا کہ کانگریس کے ذریعے اہل ہند کا قدم سوراج کی طرف نہیں بڑھا بلکہ جدید آئین میں گورنر کے اختیارات پہلے سے زیادہ قائم ہو گئے، مسلم لیگ کے ذریعے بھی مسلمانوں کو ان کے واجبی حقوق نہیں ملے اس لئے نہ صرف کانگریس اور مسلم لیگ کو بلکہ ملک کی جملہ سیاسی جماعتوں کو چاہیئے کہ حکومت خود اختیاری کے حصول، سخت قوانین کی منسوخی، تحریر و تقریر اور اخبارات کی آزادی، کاشت کاروں اور کاریگروں کے مالی حالات کی بہتری اور ابتدائی تعلیم کے اجراء کے لئے ایک متحدہ پروگرام بنا کر اس پر یکجائی عمل کریں۔"[1]

اس جذبے اور خیالات کے نتیجے میں کانگریس اور لیگ میں الکشنی اتحاد فکر و اتفاق کی راہیں کافی حد تک ہموار ہوئیں۔ مسلم لیگ نے اسی ذہن کے مطابق جمعیۃ علماء ہند کو بھی اشتراک عمل کی دعوت دی اور ایک ایسا پارلیمنٹری بورڈ بنانے کی تجویز کی جس میں ساری ہی مسلم جماعتیں خصوصاً جمعیۃ علماء بھی شریک ہو۔ اس مقصد کے لئے مارچ ۱۹۳۶ء میں دہلی میں مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء وغیرہ کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد ہوا جس میں کافی بحث و تمحیص کے بعد مسلم لیگ کے ایک معتمد نے یہ تجویز پیش کی کہ بجائے کسی نئے پارلیمنٹری بورڈ کے مسلم لیگ ہی کے بورڈ اور اسی کے ٹکٹ پر مسٹر جناح کی قیادت میں الکشن لڑا جائے۔" اس پر نواب اسماعیل خاں صاحب اور چودھری خلیق الزماں نے کہا کہ مسٹر جناح کا ماحول ایسا

---

[1] روشن مستقبل، ص ۲۵۴

ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔"[1] یہ دونوں صاحبان اس وقت صوبہ یوپی کے بڑے طاقتور لیڈر تھے۔ چودھری صاحب اپنی ذہانت، سرگرمی عمل اور قوت فیصلہ کی بدولت ہندو مسلمان دونوں میں مقبول و محبوب تھے اس کے علاوہ موصوف بیس برس تک کانگریس کے سرگرم ممبر رہے تھے اور اس وقت بھی کانگریسی حلقوں میں ان کا اثر تھا۔ نواب اسماعیل صاحب بھی اپنی شخصیت، رکھ رکھاؤ اور خوش اخلاقی کی وجہ سے صوبہ کے ممتاز افراد میں شمار ہوتے تھے۔

"ان دونوں کے اعتراض پر چودھری عبدالمتین صاحب نے فرمایا کہ جناح صاحب وعدہ کرتے ہیں کہ میں آزاد خیال امیدوار لانا چاہتا ہوں۔ اس پر کہا گیا کہ یہ ان کے قبضے کی بات نہیں ہے اور وہ اس جماعت کو چھوڑ نہیں سکتے اس بات کی مولینا شوکت علی نے بھی تائید کی اور اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔"[2]

آخر میں یہ طے کیا گیا کہ جناح صاحب سے براہ راست گفتگو کی جائے۔ اگر وہ آزاد خیال افراد اور افکار کو ساتھ لینے اور ان کے ساتھ کام کرنے پر رضامند ہیں اور مسلم لیگ بھی اس پالیسی سے اتفاق کرتی ہے تو نہ صرف الکشن کا بلکہ مسلم حلقوں کی حد تک ملک کی سیاسی پالیسی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

"چنانچہ دوسرے روز وقت مقررہ پر جلسہ ہوا، اس میں جو حضرات شریک ہوئے ان میں جو نام مجھے یاد پڑتے ہیں وہ تحریر کرتا ہوں۔ مولانا شوکت علی صاحب، جناح صاحب، چودھری عبدالمتین صاحب، نواب اسماعیل خاں صاحب، مولینا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولینا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولینا عبدالحامد صاحب، سید طفیل احمد صاحب منگلوری، سید محمد احمد صاحب کاظمی، مولینا منظور النبی صاحب، (مولینا) بشیر احمد (صاحب) سید ذاکر علی صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب، ان سب کی موجودگی میں گفتگو شروع ہوئی۔ معمولی بات چیت کے بعد بحث

[1] رسالہ مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ اور اس کا حل۔ از حضرت شیخ مدنیؒ [2] مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ۔

شروع ہوئی کہ آزاد خیال پارلیمنٹری بورڈ کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں اولاً جناح صاحب نے ایک مفصل تقریر فرمائی اور بڑی قوت سے ظاہر کیا کہ میں رجعت پسندوں سے تنگ آگیا ہوں اور میں ان کو بالکل علٰحدہ کر دینا چاہتا ہوں حتیٰ کہ خود جناح صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اس قسم کے رجعت پسند ہیں کہ میری پارٹی میں ہونے کے باوجود اسمبلی میں گورنمنٹ کی رائے دیتے ہیں۔ تب ان سے کہا گیا کہ جب مسلم لیگ میں اکثریت رجعت پسندوں کی ہے پھر کس طرح آزاد خیال بورڈ منتخب ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہاں چودھری عبدالمتین نے ممبران کونسل مسلم لیگ کی فہرست پیش کی اور اس میں غور کیا گیا کہ آزاد خیال آدمی کس قدر ہیں اور رجعت پسند کس قدر۔ بہت سے نام گنائے گئے۔ تین نام مجھ کو یاد ہیں جن کو ظاہر کر کے بحث کی گئی۔ سر محمد یعقوب صاحب، سر محمد یامین، مولوی منظہر الدین، خصوصیت سے جناح صاحب نے مولوی محمد یعقوب کو علٰحدہ کرنے کو کہا۔ بہر حال یہ گفتگو ہوتی رہی اور سوچا جاتا رہا کہ کیا طریقہ آزاد خیال بورڈ بنانے کا اختیار کیا جائے۔ تب یہ ظاہر کیا گیا کہ اول تو رجعت پسندوں کی جماعت وہاں زیادہ جائے گی نہیں۔ اور پھر یہ کہ آزاد خیال آدمیوں کے جانے کی پوری سعی کی جائے۔ تب یہ بتلایا گیا کہ اکثر آزاد خیال آدمی مسلم لیگ کے ممبر ایسے ہیں جو بمبئی جانے کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد کا اور مصارف کا اندازہ کیا گیا۔ اس پر جناح صاحب نے وعدہ کیا کہ ایسے حضرات کے لئے میں بمبئی جا کر ایک ہزار روپیہ بھیجوں گا۔ اس کے بعد خواہش تو سب بڑے آدمیوں کی تھی مگر تکلفاً کہنا پسند نہیں کرتے تھے کہ جناح صاحب سے وعدہ لیا جائے۔ چنانچہ میں اور مولٰینا عنایت اللہ صاحب قریب بیٹھے تھے۔ ان کے اشارے پر میں نے عرض کیا کہ اور حضرات تو کہنا نہیں چاہتے، میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میری پارٹی بمبئی میں زیادہ پہنچ گئی تب آپ کیا کریں گے؟ تو انھوں نے یہ فرمایا کہ اس وقت آپ لوگ یہ کوشش کیجئے کہ پارلیمنٹری بورڈ بنانے میں مجھ کو تنہا اختیارات دے دیے جائیں چونکہ دوسری پارٹی بھی مجھ سے مطمئن ہے وہ اس میں اختلاف نہیں کریں گے، تب میں نے عرض کیا

سے کہا کہ احتمال تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کو ہمارے ان جلسوں کی خبر ہوجائے اور وہ آپ پر اعتماد نہ کریں۔ لہٰذا ہم کو یہ بتلادیا جائے کہ اگر ہم یا آپ کسی طرح بھی اس میں کامیاب نہ ہوسکے کہ پارلیمنٹری بورڈ آزاد خیال منتخب ہو تو پھر آپ کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اس پر بہت جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اگر میں کسی طرح بھی اس پر قادر نہ ہوا تو مسلم لیگ کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ آجاؤں گا۔ اس پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا گیا اور سب حضرات نے فرمایا کہ ہم یہی چاہتے تھے اور پوری مسرت کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔"[1]

اس فیصلے، وعدہ وعید اور وضاحتوں کے موقعہ پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تائید و تصدیق شاید اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ بغیر حضرت کے فکری اور عملی اشتراک کے اس میدان میں کوئی جدوجہد آسان نہیں ہوسکے گی۔ چنانچہ:

"دو یا تین اجتماع کے بعد قرار پایا کہ حسین احمد کو بلایا جائے اور اس کو اس مفاہمت میں شریک کیا جائے۔ باوجودیکہ بعض رجعت پسندوں نے یہ کہا کہ سب کے ساتھ اشتراک عمل کرسکتے ہیں مگر حسین احمد کے ساتھ اشتراک نہیں کرسکتے مگر مجھ کو تار دے کر ملتان سے (جہاں میں بعض جلسوں میں شرکت کی غرض سے گیا ہوا تھا) بلایا گیا۔ دہلی پہنچنے پر اراکین جمیعتہ کا اجتماع مسٹر جناح کے کمرے میں جبکہ وہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کرایا گیا۔"[2]

بہتر ہے کہ یہ واقعہ چودھری خلیق الزماں کی زبانی بھی سن لیا جائے:

"مسٹر جناح سے مصالحت

متین چودھری نے مجھ سے یہ بھی درخواست کی کہ ہم لوگ جناح صاحب سے گفتگو سے پہلے انتخابات کے متعلق کوئی فیصلہ نہ دیں تو مناسب ہوگا۔ میں نے ان کی یہ رائے قبول کرلی کہ ہم پانچ آدمی یعنی میں خود، مولانا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ، مولانا

---

[1] مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ۔ بیان مولانا بشیر احمد کٹھوری [2] مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ

حسین احمد اور مولینا احمد سعید آج شام کو ۷ بجے مسٹر جناح سے ان کے ہوٹل میں ملیں گے۔"

"حسب وعدہ ہم لوگ مسٹر جناح سے ملے اور ان سے بہت دیر گفتگو کرتے رہے۔ مسٹر جناح نے ہم کو یقین دلایا کہ وہ مسلم لیگ کی زمینداروں اور تعلقداروں کی قیادت سے بہت غیر مطمئن ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے طبقے اور ذاتی مفاد کو مسلم قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں اور ہمیشہ برٹش سیاسی نظریات کو قطعیت کا درجہ دیتے ہیں اس لئے ان کی بڑی خواہش ہے کہ مسلم لیگ کو نئے سرے سے ایک جاندار ادارہ بنایا جائے۔"

"قبل اس کے کہ کوئی اور بولے میں نے جناح صاحب سے کہا کہ آپ کا خیال معقول ہے اور میں اس کو قبول کرتا ہوں مگر باوجود اس کے مولینا حسین احمد سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کہہ ڈالا کہ ہم لوگ تو کامل آزادی کے متمنی ہیں اور آپ کی مسلم لیگ اس کو قبول نہیں کرتی۔" [1]

ان یقین دہانیوں پر اعتماد کر کے مولانا احمد سعید صاحب کی تحریک پر مسٹر جناح کو پارلیمنٹری بورڈ بنانے کا مکمل اختیار دیا گیا جس کے مطابق موصوف نے آزاد خیال افراد پر مشتمل مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ منتخب کیا جس میں جمیتہ علماء کے دیگر افراد کے علاوہ مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمیتہ علماء ہند، مولینا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ اور ہمارے حضرت رحمتہ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ اس بورڈ نے جو الکشن مینی فیسٹو شائع کیا اس کا پروگرام قابل غور ہے۔

"تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے۔ ملک کی اقتصادی لوٹ کو روکا جائے گا۔ ملک کے گراں بار اخراجات کو گھٹایا جائے گا۔ فوج کے اخراجات گھٹا کر اسے قومی بنایا جائے گا۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے گی۔ سکہ و شرح تبادلہ کا خیال رکھا جائے گا۔ زرعی قرضوں کے بار کو گھٹایا جائے گا۔ ابتدائی تعلیم کو مفت کیا

---

[1] شاہراہ پاکستان۔ چودھری خلیق الزمان۔ مطبوعہ پاکستان۔ ص ۶۰۳

جائے گا، مسلمانوں کے مذہب اور زبان اور حروف کی حفاظت کی جائے گی، ملک میں رائے عامہ بیدار کی جائے گی۔“ [1]

اس مرحلے پر یہ تاریخی ریکارڈ قابل غور ہے کہ مسلم لیگ الکشن کمیٹی کا یہ منشور بالکل وہی تھا جو کانگریس کمیٹی یا کانگریس الکشن بورڈ کا تھا۔ اس طرح ان دونوں جماعتوں کے خیالات، پالیسی اور میدان عمل میں بڑی حد تک اتفاق و اتحاد ہو گیا۔ موقع بے موقع وقتی اور عارضی اختلافات کی گنجائش بھی کافی حد تک ختم ہو گئی۔ جمعیۃ علماء ہند بھی اس اتحاد فکر اور اشتراک میں برابر کی شریک ہو گئی۔ بہت دنوں بعد ان سب کیمپوں اور پلیٹ فارموں سے متحد و متفق نعرے بلند ہوئے۔ ہندوستان زندہ باد، انقلاب زندہ باد، بھارت ماتا کی جے، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔

اب تک مسلم لیگ، نوابوں، رئیسوں، جاگیرداروں، سروں اور خان بہادروں کی جماعت تھی جو بڑے بڑے محلوں، دیوان خانوں، ہوٹلوں اور کوٹھیوں تک محدود تھی۔ اس کی پالیسی، جدوجہد اور اغراض و مقاصد کا نقشہ اسی کے ایک بڑے لیڈر اور پاکستان کے بانیوں میں ایک ممبر چودھری خلیق الزماں کی زبانی سنیئے:

”مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی حالت ۱۹۳۶ء میں

مجھے یقین ہے کہ اگر مسلم لیگ اس وقت کوئی ذمے دار اور باوقار جماعت ہوتی تو جناح صاحب کو اس قسم کے سمجھوتوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ جس زمانے میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی اس وقت انگریز اپنی پوری قوت کے ساتھ ہندوستان میں اپنے پاؤں جمائے ہوئے تھا۔ اس لئے مسلم لیگ کا نظریہ شروع ہی سے یہ رہا کہ وہ صرف کانگریس کی مخالفت ہی کو اپنا سرمایۂ نجات بنائے رکھے۔ اور اس کے زعماء بھی یہ ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ اُسے ایک عوامی مسلم جماعت بنائیں۔ نہ اس کی صوبہ واری شاخیں تھیں نہ اس کی کثیر ممبر سازی تھی۔ جب دستور میں ممبری کے لئے شرط یہ ہو کہ ہر شخص ممبری کے لئے باقاعدہ درخواست دے جس پر دو مسلم لیگ والوں کے دستخط ہوں اور

[1] روشن مستقبل، ص ۲۲۵

وہ سالانہ چھ روپے چندہ بھی ادا کرے تو ان ضوابط کے ساتھ اس کے عوامی مسلم جماعت بننے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ اس کے سالانہ جلسے ضرور ہوتے تھے جس کا اس سال کے لئے ایک صدر منتخب ہوتا تھا اور کچھ خطاب یافتہ زمیندار اور تعلقدار اس صدر کی بارات میں شریک ہو جاتے تھے اور اس اجلاس کے لئے کسی شہر کے کسی بونسپل یا تھیٹر ہال میں دو تین دن کے لئے اجلاس کر لیا جاتا تھا۔ شہر کے عمائدین کارڈ دکھا کر اندر آتے تھے اور صدر، استقبالیہ صاحب جلسہ میں اس سال کے صدر مسلم لیگ کا قصیدہ زیادہ اور مسلم لیگ کے کاموں کا ذکر کم کرتے تھے۔ ان کی فرسٹ اور سکینڈ کلاس میں سفر کی صعوبتوں کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا جاتا تھا اور معذرت خواہی کی جاتی تھی کہ ان کی آسائش و آرام کا کماحقہٗ انتظام منتظمین کی طرف سے نہیں ہو سکا اور پان پر پان اور سگریٹ پر سگریٹ پی کر زعمائے لیگ اپنے کارنامے سُن کر خوش ہوتے تھے اور جلسے کے اختتام پر پلاؤ اور قورمہ کھا کر کچھ تجاویز پر لمبی لمبی تقریریں کر کے جس طرح مصیبتیں برداشت کر کے آئے تھے اسی طرح تکلیفیں برداشت کر کے واپس چلے جاتے تھے اور پھر سال بھر اپنی جماعت کی خبر نہ لیتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اخبارات میں ان کی تجاویز چھپ جاتی تھیں مگر اخبارات سے پہلے حکومت کو لیگ کے جلسوں کی ایک ایک منٹ کی کارروائی مخصوص ذرائع سے معلوم ہو جایا کرتی تھی۔ جب سے خلافت کمیٹی میدان میں آئی تھی یہ تمام مجہول سیاسی فضا ختم ہو گئی تھی۔ مگر جیسے ہی خلافت کا دور ختم ہوا مسلم لیگ پھر انہی نوابوں اور زمینداروں کی خانہ زاد لونڈی بن گئی۔" "جنھوں نے اپنی استعداد بھر یہ عقیدہ رکھ کر مسلم لیگ کی پرورش کی کہ برٹش گورنمنٹ کو مسلم لیگ سے ناراض یا دل برداشتہ نہ کیا جائے کیونکہ اسی میں اس کی خیریت ہے۔"[1]

اس ذہن، پالیسی اور طرزِ عمل کے لاتعداد واقعات اور مثالیں ملتی ہیں مگر چودھری صاحب کے بیان کے بعد کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مختصر یہ کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی

[1] شاہراہِ پاکستان۔ چودھری خلیق الزماں۔ مطبوعہ پاکستان۔ ص ۵۹۰

آواز گاؤں، دیہات، مزدور اور کسان تک پہنچ رہی تھی۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھی اس کے امیدواروں کے لئے اپیلیں ہوتی تھیں، عوامی مجمعوں میں بھی اس کا نام گونجتا تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا تھا کہ علماء کرام پورے اخلاص، عزم و ارادے کے ساتھ اس کے لئے میدان میں اتر پڑے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ کو انتھک جدوجہد اور مسلسل کام کا جو حوصلہ اللہ نے عطا فرمایا تھا اس کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔

دوسری بات یہ بھی کہ جماعتی فیصلوں اور مشترکہ پروگراموں کو جس تندہی، ذمہ داری اور لگن کے ساتھ حضرت پورا کرتے تھے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔ اس موقع پر بھی حضرت نے دن رات ایک کر دیئے۔ شہر شہر اور نگر نگر گھوم کر ایک ایک دن میں بارہ بارہ تقریریں کیں اور اجتماعات میں شرکت کی۔ مولانا ظفر احمد انصاری لکھتے ہیں:

"ان حالات میں ۱۹۳۶ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کو نئے عوامی قالب میں ڈھالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے لئے فضا ہموار کی۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے تنظیمی دورے کئے۔ کانگریس سے پھر سے گفتگوئیں ہونے لگیں اور ایسی فضا بنی کہ باہمی مفاہمت سے انتخابات لڑے جائیں۔ مولانا حسین احمد صاحب اور ان کے رفقاء جمعیۃ بھی لیگ کی حمایت پر کمربستہ ہوئے اور قائد اعظم کی حمایت میں تقریریں کیں۔"[1]

یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ مسٹر جناح نے لیگ کی عوامی قالب میں ڈھالنے اور کانگریس سے گفتگوئیں کرنے کا کیا بیڑہ اٹھایا اب یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ لیگ کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کرنے میں جمعیۃ علماء اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے وہ کون سا رول ادا کیا تھا جس کو مولانا ظفر احمد صاحب نے لیگ کی حمایت پر کمربستہ ہونے اور قائد اعظم کی حمایت میں تقریریں کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اس الکشن میں مسلم لیگ کو صوبہ یوپی میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے لیگ کو پورے ہندوستان میں کامیاب قرار دلوا دیا۔ ورنہ مسلم اقلیت والے صوبوں کا تو ذکر ہی کیا ہے مسلم اکثریت والے صوبوں میں بھی اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی

[1] چراغ راہ ۱۹۶۰ء۔ نظریہ پاکستان نمبر، ص ۲۳۱

کی حکومت بنی تھی جس کے وزیر اعلیٰ مسٹر سکندر حیات تھے۔ اس پارٹی کا لیگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت بنی تھی جس کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب تھے اور بنگال میں کرشک پارٹی کی حکومت بنی تھی جس کے وزیر اعلیٰ مسٹر اے کے فضل الحق تھے، بلوچستان اور سندھ میں کم و بیش یہی نتائج رہے تھے۔ مگر یوپی میں لیگ کی کامیابی اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ اس کو اسی فیصدی کامیابی نصیب ہوئی۔ یہی وہ صوبہ تھا جہاں لیگ کے سارے پلان اور تجویزیں و اسکیمیں تیار ہوتی تھیں۔ یہی مسلم لیگ کا قلعہ تھا اور وہ مسلم لیگ جس نے پاکستان بنوایا وہ تو پورے ہی طور پر یوپی ہی میں پروان چڑھی تھی "ہندوستان کی تاریخ کے سارے ہی محققین جانتے ہیں کہ یہ صوبہ یوپی ہی تھا جہاں سے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے"۔[1] اسی صوبے میں مسلم لیگ کو الکشن میں ایسی کامیابی ہوئی کہ اُسے نئی زندگی مل گئی۔ الکشن سے پہلے عوامی حلقوں میں لیگ کو بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اس کے ممبروں کی تعداد ہزاروں تک محدود تھی مگر اس کے بعد ہی اس کی آواز اور تعداد لاکھوں لاکھ پہنچ گئی۔ ۱۹۳۶ء کے الکشن کے بعد ایک سال سے کم ہی عرصے میں مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔[2]

مزید تحقیق کی جائے تو تاریخ اس حقیقت کی ببانگ دہل گواہی دے گی کہ لیگ کی یہ کامیابی مولانا حسین احمد مدنی اور ان کی جماعت جمیتہ علماء ہند کی انتھک اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ مولانا ابوالکلام نے لکھا ہے:

> "بمبئی میں مسلم لیگ نے کئی سیٹیں حاصل کیں مگر جو عظیم الشان کامیابی اس کو یوپی میں ہوئی وہ کہیں نہیں ہو سکی اور یوپی میں لیگ کی یہ کامیابی بنیادی طور پر جمیتہ علماء ہند کے تعاون کی مرہون منت تھی۔ جمیتہ نے لیگ کے ساتھ یہ سمجھ کر تعاون کیا تھا کہ الکشن کے بعد وہ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی"۔[3]

---

[1] انڈیا ونس فریڈم۔ مولانا آزاد۔ ص ۱۶۱
[2] ہکٹر بولیتھو سوانح جناح۔ ص ۱۱۸
[3] انڈیا ونس فریڈم۔ ص ۱۶۰

خود حضرت نے تحریر فرمایا ہے:

"ہم نے مسلم لیگ کے ساتھ پورا تعاون کیا اور تقریباً پونے دو مہینے کی رخصت بوضع تنخواہ دار العلوم دیوبند سے لی۔ اور اتنی جدوجہد کی کہ ایگریکلچرسٹ پارٹی اور دوسرے رجعت پسند امیدواروں کو شکست ہوئی اور تقریباً تیس یا اس سے زائد ممبر مسلم لیگ کے کامیاب ہوئے، جس پر چودھری خلیق الزماں نے مجھ کو ایک خط میں لکھا کہ آپ نے تیس برس کی مردہ لیگ کو از سر نو زندہ کر دیا۔"[۱]

اس الکشن کے نتیجے میں مسلم لیگ کے ساتھ کانگریس بھی زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی، مگر دونوں کامیابیوں میں فرق تھا۔ کانگریس اس پوزیشن میں آگئی تھی کہ وائسرائے نے اس کو گورنمنٹ بنانے کی دعوت دی۔ اس موقع پر کانگریس نے اس دعوت پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت لیا اور دوسرے معنوں میں اپنے استغنیٰ کا ثبوت دیا۔ یہ بھی سنا گیا کہ وہ گورنمنٹ بنانے کے حق میں نہیں ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے اشارتاً بھی انکار کر دیا تو مسلم لیگ اور دوسری پارٹیاں مل کر اپنی گورنمنٹ بنالیں گی، مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر راجہ سلیم پور کانگریس کے اس تردد و توقف کے دوران موقع کو غنیمت سمجھ کر بغیر مسلم لیگ کی منظوری کے عارضی طور پر چیف منسٹر ہو بھی گئے تھے۔ اسی دوران کانگریس کے حکومت بنانے کی دعوت منظور کرنے سے پہلے مسٹر محمد علی جناح نے گاندھی جی کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ تھوڑی سی بھی توجہ کرلیں تو ہندو مسلم اتحاد کا خواب اب بھی پوری طرح پورا ہو سکتا ہے اور اس طرح ملک کی تعمیر و ترقی کا راستہ کھل سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ قصہ دوسروں کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"۱۹۳۷ء میں جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ کانگریس کو بھاری اکثریت سے فتح حاصل ہوئی ہے اور وہ گورنمنٹ بنانے کی پیشکش کو قبول نہیں کر رہی ہے تو جناح صاحب نے گاندھی جی کو ایک خصوصی اور زبانی پیغام بھیجا۔ گاندھی جی نے اگرچہ کانگریس سے ضابطے کے اعتبار سے علیحدگی اختیار کر لی تھی مگر اصل میں کانگریس کے

---

[۱] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۴، ص ۲۰۶

رہنما وہی تھے۔ یہ پیغام مسٹر بی جی کھیر نے گاندھی جی کو پہنچایا۔ کھیر بمبئی میں اسمبلی کے لیڈر اور وزیر اعلیٰ بنائے جانے والے تھے۔ اس پیغام میں گاندھی جی سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی رہنمائی میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا ہموار کریں۔ اگرچہ مزید تفصیلات کا علم نہیں ہے مگر اس پیغام کے وقت کا تعین، پیغام رسانی کے لئے کھیر کا انتخاب اور بعد کے واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کے ساتھ جناح صاحب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لیگ اور کانگریس میں کوئی معاملہ طے ہوجائے اور صوبوں کے وزراء کے معاملے میں حصے مقرر ہوجائیں۔ مگر گاندھی جی نے جناح صاحب کو صاف جواب دے دیا اور لکھا کہ کھیر کے ذریعے آپ کا پیغام ملا۔ میری خواہش ہے کہ میں اس معاملے میں کچھ کرسکتا۔ مگر قطعاً مجبور ہوں، اتحاد کے بارے میں میرا ایمان آج بھی ہمیشہ کی طرح روشن ہے مگر مجھے اس کے لئے کوئی امید نظر نہیں آتی۔[لہ]

تواضع، اخلاص، مصالحت و مفاہمت کا صحیح اعتبار اسی وقت ہوتا ہے جب وہ صاحب اقتدار و اختیار افراد یا جماعت کی طرف سے پیش ہو۔ ع تواضع زگردن فرزاں نکوست۔ کانگریس کو پہلی بار اپنی قانونی طاقت کا اندازہ ہورہا تھا اور گورنمنٹ بنانے کا موقع مل رہا تھا۔ تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے اتحاد و اتفاق کی اسپرٹ کو زندہ رکھنا ہر قیمت پر ضروری تھا مگر اب حالات نے ایسا رُخ اختیار کرلیا تھا کہ گاندھی جی کو پہلی مرتبہ اتحاد کے لئے کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ اس باب کا ایک اور واقعہ مزید وضاحت اور دلچسپی کا سبب ہوگا۔

• بمبئی میں مسٹر ناریمان مقامی کانگریس کے ایک مانے ہوئے لیڈر تھے۔ کانگریس کے لئے جب بمبئی میں گورنمنٹ بنانے کا موقع آیا تو سابقہ خدمات اور ذاتی حیثیت کے اعتبار سے عام طور پر یہی توقع کی جارہی تھی کہ کانگریس مسٹر ناریمان ہی سے درخواست کرے گی کہ وہ گورنمنٹ بنائیں اور وزیر اعلیٰ کا عہدہ قبول کریں۔ لیکن چونکہ پٹیل اور ان کے ساتھی ناریمان سے خوش نہیں تھے اس لئے ان کے

لہ ایٹ لائیوز، ص ۱۵۵، بحوالہ لیڈرس کوریسپانڈنس ودم مسٹر جناح۔ تاج آفس بمبئی ص ۳۷

بجائے مسٹر بی جی کھیر کو بمبئی کا پہلا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ ناریمان پارسی تھے اور کھیر ہندو تھے اس لئے اس فیصلے پر عام طور پر خیال پیدا ہوگیا کہ ناریمان کو صرف فرقہ پرستی کی بنیاد پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ چاہے یہ خیال غلط فہمی ہی پر مبنی ہو مگر اسے غلط ثابت کرنا مشکل ہوگیا۔ فطری طور پر مسٹر ناریمان کو اس بات کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس وقت کانگریس کے صدر جواہر لال تھے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جواہر لال فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر ہیں اور یہ ناریمان کے معاملے میں انصاف کریں گے۔ اسی خوش فہمی کی بنا پر ناریمان نے اپنا معاملہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ پٹیل اور جواہر لال میں بہت سی باتوں میں اختلاف رہتا تھا مگر اس معاملے میں انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ پٹیل نے فرقہ پرورانہ ذہنیت سے کام لیا ہے اور انھوں نے بھی ناریمان کی عرضداشت کو نظر انداز کردیا اور ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ جواہر لال کے رویہ پر ناریمان کو سخت تعجب ہوا اور انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ یہ معاملہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ گاندھی جی نے پورے قضیے پر ٹھنڈے دل سے غور کرکے کہا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے ذریعے پٹیل کے خلاف الزامات کی تحقیقات کی جائے چونکہ ناریمان بھی پارسی تھے اس لئے پٹیل اور ان کے ساتھیوں نے یہ طے کیا کہ تحقیقات کسی پارسی ہی کے سپرد کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے مختلف طریقوں سے اس طرح اپنے اثرات کا استعمال کیا کہ مسئلہ کا اصل پہلو دب گیا اور اصل تحقیقات شروع ہونے سے پہلے ہی ناریمان غریب مقدمہ ہار گئے۔ اور پٹیل کے خلاف کوئی الزام نہیں لگایا گیا۔ اس واقعے سے بیچارے ناریمان کا دل ٹوٹ گیا اور ان کی سیاسی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہوکر رہ گئی۔[۱]

یوپی میں بھی جب کانگریس نے گورنمنٹ قبول کرلی اور صوبے کی حکومت کے لئے وزراء کے انتخاب کا وقت آیا تو باوجود سارے ناموافق جذبات کے مسلم لیگ کے کامیاب ممبران اسمبلی

---

[۱] انڈیا ونس فریڈم۔ ص ۱۵

میں سے ان کی تعداد کی مناسبت سے وزراء کو شامل کرنے کی مجبوری سامنے آئی۔ اصولی اور قانونی طور پر یہ بات کتنی بھی ضروری ہی سہی مگر ایک خاص قسم کے لوگوں کے لئے یہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی کہ مسلم لیگ کو بھی اختیارات اور حکومت میں شریک کیا جائے۔ چنانچہ بہت غور و خوض اور ادھیڑ بن کے بعد ولبھ بھائی پٹیل نے یہ تجویز سامنے رکھی کہ پہلے مسلم لیگ کے ممبرانِ اسمبلی کانگریس میں مل جائیں تب ہم ان کو وزارت میں لیں گے۔ یہ بات قابلِ عمل اور قبولیت کے لائق تھی یا نہیں یہ الگ بات ہے۔ اس قسم کا ذہن کانگریس کی طرف سے صرف سامنے ہی آنے پر لیگ اور اس کے حلقے پر بہت ناگوار اثر پڑا۔ راج موہن گاندھی کے الفاظ دیکھئے:

"جولائی میں کانگریس نے گورنمنٹ سے طول وطویل گفتگو کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ حکومت میں شریک ہوجائے۔ چنانچہ صوبہ بمبئی اور یوپی میں جہاں لیگ کو قابلِ ذکر کامیابی ہوئی تھی لیگ اور کانگریس کے درمیان اس بارے میں گفتگو شروع ہوئی کہ وزارتوں کی تقسیم کس طرح ہوکہ دونوں پارٹیوں کے پاس طاقت رہے۔ بمبئی میں مسٹر جناح اور کھیر میں ایک غیر رسمی اور مختصر گفتگو ہوئی اور یوپی میں مولانا ابوالکلام نے جن کو کانگریس نے نارتھ انڈیا کی وزارتیں بنانے کا کام سپرد کیا تھا، یوپی مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں سے بات کی۔ بمبئی والی گفتگو اس بنیاد پر فیل ہوگئی کہ ولبھ بھائی نے کانگریس کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ پہلے مسلم لیگ کے ممبران اسمبلی کانگریس اسمبلی پارٹی میں داخل ہوجائیں تب ہی وہ وزارت میں لئے جاسکیں گے۔" [۱]

"یوپی منسٹری میں شرکت کی جو گفتگو مسلم لیگ سے ہورہی تھی اس میں مسٹر جناح کا کوئی حصہ نہیں تھا اور اسی بنا پر جناح صاحب کی خواہش تھی کہ یہ گفتگو کامیاب نہ ہو اور خلیق الزماں اور ان کی مسلم لیگ کے ساتھ کانگریس کا کوئی پیکٹ نہ ہوسکے۔ مشترکہ گورنمنٹ بنانے یا کانگریس میں مل جانے کا مسئلہ یوپی میں بھی

---

[۱] ایٹ لائیوز، ص ۱۴۲

زیر بحث تھا۔ مگر جناح صاحب اس گفتگو کے خلاف تھے اس لئے کہ یہ بات چیت ان کے مشورے سے نہیں ہو رہی تھی۔"[1]

کولیشن اور شرکت کی بات اور تھی۔ جناح صاحب اسی بنیاد پر کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے مگر پٹیل کے کانگریس میں مل جانے والے مطالبے نے دونوں پارٹیوں کے درمیان تعلقات پر بڑا خراب اثر ڈالا۔ مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ کانگریس طاقت کے نشے میں توہین آمیز روش اختیار کر رہی ہے۔ تاہم ایک امید ابھی باقی تھی۔ الیکشن سے ان دونوں میں جو مفاہمت اور اشتراک عمل کی فضا پیدا ہو گئی اس کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ جیسے بھی ہو صوبوں کی حکومتوں میں مسلم لیگ کو اُس کا جائز حصّہ ضرور ملے گا۔ مگر وزارت کی تشکیل کا وقت آیا تو کانگریس نے ایک مسلم لیگی ممبر کا تو لیگ کو اختیار دیا دوسرے کے لئے یہ کہا کہ جس کو ہم چاہیں گے اُسے لیں گے۔ نام مسلم لیگ کے ممبر کا ہو اور انتخاب کا اختیار کانگریس کو ہو یہ بات مسلم لیگ کے لئے قابل قبول نہیں ہوئی۔ یو پی مسلم لیگ کا الکشن چودھری خلیق الزماں اور نواب محمد اسماعیل خاں نے لڑا تھا۔ اور بجا طور پر یہ دونوں منسٹری میں شمولیت کے امیدوار تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی چودھری خلیق الزماں کانگریس کے ساتھ اس قسم کا سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے جس میں مسلم لیگ کا وقار بھی باقی رہے۔ چودھری صاحب صوبے کے مسلم لیڈر اور ہندو مسلمانوں میں یکساں مقبول تھے۔ یو پی کی سیاست کا کوئی معاملہ بھی بغیر ان کے مشورے کے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ وہ بیس برس تک کانگریس کے ممبر اور صاحب رائے رکن رہے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ ۱۶ برس تک لکھنؤ کی اُس میونسپلٹی کے چیرمین رہے تھے جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ مگر گورنمنٹ بنانے اور صوبے کی حکومت میں مسلم لیگ کے وزراء کو شریک کرنے کے مرحلے پر کانگریس نے لیگ کو اپنے میں ضم کرنے کے ایسے شرائط پیش کئے جو کسی بھی جماعت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ تصویر کا صحیح رُخ اس تفصیل کو دیکھنے ہی سے سامنے آسکتا ہے جو چودھری صاحب نے اپنی کتاب شاہراہ پاکستان میں لکھی ہے۔ اس

[1] ایسٹ لائیوز۔ ص ۱۴۲

کے ساتھ ہی کانگریس نے مسلم لیگ کے دو وزراء لینے سے انکار کر کے دو دوسرے مسلم وزراء رفیع احمد قدوائی اور حافظ محمد ابراہیم کو وزارت میں شامل کر لیا۔ قدوائی صاحب اور حافظ جی کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل اس واقعے کا تذکرہ مولینا آزاد سے سنیئے:

"(الکشن کے بعد) جب میں یوپی کی وزارت بنانے کے لئے لکھنؤ پہنچا اس وقت چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں یوپی مسلم لیگ کے لیڈر تھے میں نے ان دونوں صاحبان سے بات چیت کی اُنھوں نے مجھے یقین دلایا کہ نہ صرف یہ کہ ہم کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے بلکہ اس کے پروگرام کی پوری طرح تائید کریں گے۔ قدرتی طور پر ان کو یہ توقع تھی کہ نئی وزارت میں مسلم لیگ کا بھی حصہ ہوگا۔ مقامی سیاست کچھ اس طرح کی تھی کہ ان میں سے کسی کو اکیلے نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یا تو دونوں ہی لئے جائیں ورنہ کوئی نہ ہو۔ چنانچہ مجھے امید تھی کہ یہ دونوں صاحبان وزارت میں لے لئے جائیں گے۔ اگر وزراء کی کل تعداد سات ہوگی تو دو مسلم لیگی ہوں گے اور باقی کانگریسی ہوں گے۔ اگر وزارت ۹ ممبروں پر مشتمل ہوئی تو کانگریس کی اکثریت مزید طاقت ور ہو جائے گی۔ میرے ساتھ مشورے کے بعد ایک تحریر تیار کی گئی کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی اور کانگریس کے پروگرام کی تائید کرے گی۔ نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں دونوں حضرات نے اس تحریر پر دستخط کئے۔ اس کے بعد چونکہ بہار کی گورنمنٹ بنانے کے لئے میری ضرورت تھی اس لئے میں پٹنہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد میں واپس الٰہ آباد پہنچا اور یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ جواہر لال نے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو یہ لکھا ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی وزارت میں لیا جا سکتا ہے اور یہ کہ وہ اپنا فیصلہ لکھ کر روانہ کریں کہ دونوں میں سے کس کو لیا جائے۔ مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ ان میں سے ایک بھی اکیلے گورنمنٹ میں آنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے معذرت کر دی کہ وہ اس پیش کش کو منظور نہیں کر سکتے۔

یہ ایک نازک صورت حال تھی اگر مسلم لیگ کے تعاون کی یہ پیشکش قبول کرلی جاتی تو عملی طور پر مسلم لیگ کانگریس میں مل جاتی۔ مگر جواہر لال کے اقدام نے یوپی مسلم لیگ کو زندگی کا ایک نیا موقع فراہم کردیا۔ ہندوستانی سیاست سے واقف بھی لوگ جانتے ہیں کہ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ یوپی ہی سے ہوئی ہے۔ مسٹر جناح نے اس صورت حال کا پورا پورا فائدہ اٹھایا' اور ایسے ایسے جارحانہ اقدامات کئے ہیں جنھوں نے آخرکار ملک کو "پاکستان" پہنچا کر دم لیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس معاملے میں پرشوتم داس ٹنڈن نے بڑا بنیادی پارٹ ادا کیا ہے اور جواہر لال کو اس اقدام کے لئے ہموار کیا ہے۔ میں نے ٹنڈن کے نظریات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور جواہر لال کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے موقف میں اصلاح کرلیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ لیگ کو وزارت میں نہ لے کر انھوں نے زبردست غلطی کی ہے۔ میں نے انھیں اس بات پر بھی خبردار کیا کہ ان کا یہ اقدام مسلم لیگ کو نئی زندگی حاصل کرنے کا موقع دے گا اور ملک کی آزادی کے راستے میں بڑی مشکلات کھڑی کردے گا۔ مگر جواہر لال نے میری ایک نہیں سُنی اور اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چھبیس ممبروں کی پارٹی کو وزارت میں صرف ایک ہی سیٹ دی جاسکتی ہے۔ جب میں نے ان کو اتنا سخت دیکھا تو واردھا جاکر پورا معاملہ گاندھی جی کے سامنے رکھا۔ انھوں نے میری تائید کی اور کہا کہ میں جواہر لال سے کہوں گا کہ وہ اپنے فیصلے میں ترمیم کریں۔ مگر جب جواہر لال نے اپنے طریقے سے انھیں سمجھایا تو وہ مان گئے۔ اور معاملہ کو صحیح طریقے سے حل نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ سلجھ نہیں سکا۔ مسٹر جناح نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور پوری مسلم لیگ کو کانگریس کا مخالف کردیا۔ الکشن کے بعد مسٹر جناح کے بہت سے حمایتی قریب قریب ان سے علٰحدہ ہوچکے تھے مگر اس واقعہ کے بعد وہ ان لوگوں کو ایک بار پھر اپنے گروپ میں ملا لینے پر قادر ہوگئے[1]۔

[1] انڈیا ونس فریڈم۔ مولانا ابوالکلام آزاد

دراصل کانگریس کو مسلم لیگ سے دو ہی ممبران وزارت میں لینے تھے۔ مگر ایک ممبر حافظ محمد ابراہیم کو وہ پہلے ہی طے کر چکی تھی۔ یہ بجنور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ صوبے میں اس الکشن سے پہلے ان کی کوئی سیاسی اہمیت تو نہیں تھی مگر بعض ترجیحات کی بنا پر جمعیۃ علماء اور اس کے اراکین کو ان کے شمول پر اصرار تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کی خصوصی تائید فرما رہے تھے۔ اور اسی بنیاد پر ان کو یوپی کی وزارت میں لے لیا گیا۔ اس پر مسلم لیگ نے اعتراض کیا کہ اگر حافظ جی کو وزارت میں آنا ہے تو لیگ سے استعفیٰ دے کر کانگریس کی طرف سے الکشن لڑیں اور کامیاب ہو جائیں تو وزارت میں آئیں۔ حافظ جی کو لیگ سے استعفیٰ دینا پڑا اور نگینہ ہی سے وہ کانگریس کے ٹکٹ پر لڑے۔ یہ الکشن تمام ہندوستان میں اہمیت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور جمعیۃ علماء نیز دیوبند کے لوگوں نے اس میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ مسلم لیگ کو یہ بات ناگوار گزری کہ باوجود اتحاد و اتفاق کے جمعیۃ علماء نے اس الکشن میں مسلم لیگ کی مخالفت کی۔ یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ حافظ جی کے ایک مؤید اور کارکن مولوی محمد نصیر صاحب فیض آبادی کو اسی دوران بے رحمی کے ساتھ چھرا گھونپ دیا گیا۔ موصوف کی زندگی ہی تھی جو وہ بچ گئے ورنہ حملہ آور نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ خوش قسمتی سے حافظ جی کامیاب ہو گئے اور مسلم لیگ کو شکست ہوئی۔ اس کامیابی پر دارالعلوم دیوبند میں حافظ جی کا ایسا استقبال کیا گیا جیسے کسی بڑے قومی ہیرو کا ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ حافظ جی تو وزیر ہو ہی گئے۔ اس کے بعد وہ مرکزی حکومت میں وزیر رہے اور جب بالکل ہی کمزور ہو گئے تو پنجاب کے گورنر بنا دیے گئے۔ مگر جیسا کہ مولانا آزاد نے فرمایا ہے ہندوستان کی سیاست سے واقف حضرات اس بات پر متفق ہیں اگر کانگریس اس موقع پر ذرا مساوات اور مصالحت سے کام لیتی تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ بعض اہل رائے حضرات کا خیال ہے کہ کانگریس کامیابی اور غرور کے نشے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مولوی طفیل احمد صاحب نے لکھا ہے:

> "اب ایک اور واقعہ پیش آیا کہ مجلس احرار نے اپریل ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں جو لکھنؤ میں ہوا مسٹر کرپلانی سکریٹری کانگریس کو مدعو کیا۔ انھوں نے جواب دیا

کہ وہ نہیں آسکتے اس لئے کہ وہ بیمار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر میں اچھا
بھی ہوتا تب بھی نہ آتا کیونکہ مجلس احرار ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ کانگریس والوں کو اپنی کامیابی پر اس قدر غرور ہو گیا تھا کہ انہیں اپنے ساتھیوں
کا دل دکھانے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا۔[1]

مختصر یہ کہ یہی وہ پہلا موقع تھا جب مسلم لیگ اور خاص طور پر چودھری خلیق الزماں نواب اسماعیل خاں وغیرہ کانگریس کی مخالفت میں کھل کر میدان میں آ گئے۔ مسلم لیگ کے افراد میں اندرونی طور پر جو کچھ اختلاف و انتشار تھا ان کو ختم کر کے اس کو ایک زبردست آل انڈیا جماعت بنا دیا گیا۔ یوپی لیگ والے کتنے بھی طاقت ور تھے مگر ایسے مضبوط نہیں تھے کہ آل انڈیا بنیادوں پر لیڈری کا بوجھ سنبھال سکیں۔ مسٹر جناح کی ذہانت، تیزی طبع، سیاسی سوجھ بوجھ اور قابلیت متفقہ طور پر مسلم تھی مگر مشکل یہ تھی کہ ان کو شمالی ہند میں اس وقت تک تعارف اور شہرت حاصل نہیں تھی۔ مسلم لیگ والے ان کو اپنا لیڈر بناتے بھی تو بعض مشکلات سامنے تھیں۔ وہ اپنی وضع قطع، تراش و خراش، زبان و بیان کے اعتبار سے یوپی، دہلی، بہار وغیرہ کے مسلمانوں کی لیڈری کے لئے فٹ نہ تھے اور مشکل یہ تھی کہ موصوف آسانی کے ساتھ اپنی وضع کو تبدیل کرنے پر بھی رضامند نہ تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس وقت جناح صاحب کی حیثیت کے بارے میں گذشتہ صفحات میں چودھری خلیق الزماں کا بیان گزر چکا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ بھی حقیقت کو مزید واضح کر رہا ہے۔ چودھری صاحب نے کانگریس سے مقابلے کا پلان پوری طرح تیار کر لیا اور اس پر عملدرآمد شروع کیا تو

> دسمبر ۱۹۳۶ء میں میں نے (چودھری خلیق الزماں نے) لکھنؤ میں مسٹر جناح کو دعوت دے کر بلایا کہ وہ جلد سے جلد چندہ کرانے میں ہماری مدد کریں۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں اس سلسلے میں ایک جلسہ کیا گیا جہاں مسلم لیگ سے عوام کی بے تعلقی کا یہ حال نظر آیا کہ شاید سو سے زائد آدمی اس جلسے میں نہ تھے۔ کل ۲۱ ہزار روپیہ چندہ

---

[1] طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ص ۳۰۰

کا اعلان ہوا۔ تین ہزار راجہ محمود آباد، تین ہزار راجہ سلیم پور (دونوں شیعہ)، تین ہزار میرے بہنوئی مسٹر وسیم کل ۲۱ ہزار روپئے ہوئے جن میں سے بالآخر تین ہزار وصول بھی نہیں ہوئے۔" [1]

یہ تو مسلم لیگ اور خاص طور پر جناح صاحب کی مقبولیت اور شہرت کا حال تھا۔ اس ساتھ ہی ان کے طرز زندگی کے بارے میں بھی بعض شہادتیں قابل غور ہیں۔ نواب شمس الحسن صاحب تیس چالیس برس تک مسلم لیگ کے سکریٹری رہے ہیں۔ وہ کچھ واقعات بیان کرتے ہیں:

"بدقسمتی سے مقامی لوگ ذاتی طور پر قائد اعظم سے واقف نہ تھے اور اسکی معقول وجہ بھی تھی۔ ان کی پیدائش کراچی کے دور دراز شہر کے ایک متوسط اور غیر معروف گھرانے میں ہوئی تھی جس میں تعلیم سے زیادہ تجارت وتبیع سمجھی جاتی تھی۔ اُن کے چچا نے جب پرائمری اسکول میں انھیں داخل کرایا تو ان کا نام محمد علی جناح بھائی لکھوایا، جو سندھ مدرسہ کراچی انجمن اسلام اسکول بمبئی اور چرچ مشن سوسائٹی ہائی اسکول کراچی میں برقرار رہا لیکن جب وہ انگلستان پہنچے تو انھیں اس کی (اپنے نام کی) بوالعجبی کا احساس ہوا۔ اور انھوں نے ایک عدالتی حکم کے ذریعے چودہ اپریل ۱۸۹۳ء میں اس نام کو منسوخ کرا کے ایم۔ اے جناح میں تبدیل کرالیا۔ اور ساتھ ہی تاریخ پیدائش ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء کے بجائے ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء منظور کرالی۔ اس سلسلے میں ایک بڑی عجیب بات شمس الحسن صاحب نے یہ بیان کی کہ قائد اعظم کے ہزارہا دستخطی خطوط، دستاویزات اور چیک ان کے ہاتھ سے گزرے مگر انھوں نے مدت العمر قائد اعظم کو اپنا نام محمد علی جناح لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ دوسروں سے بھی اپنے آپ کو ایم۔ اے جناح ہی کہہ کر متعارف کراتے تھے۔" [2]

یہ تو آپ بعد میں غور کیجئے گا کہ وہ کون سی بوالعجبی تھی جس کا جناح صاحب کو احساس

---

[1] شاہراہ پاکستان، ص ۶۰۹ [2] ماہنامہ اردو ڈائجسٹ مطبوعہ لاہور پاکستان، ص ۱۲۳، شمارہ اگست ۱۹۸۶ء

ہوا وہ کون سی علامتیں تھیں جنھیں سوجتن کر کے انھوں نے اپنے نام سے مٹا یا۔ اور وہ کون سے نام تھے جس سے وہ مدت العمر اجتناب کرتے رہے۔ سردست تو یہ دیکھئے کہ ان خیالات اور ان حالات میں مسٹر جناح کو یوپی اور دلی والوں کے سامنے کھڑا کرنا بڑا مشکل کام تھا، مگر مسلم لیگ والوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کوئی ترکیب نہیں چھوڑی جو آزمائی نہ ہو، لکھنؤ کے ایک جلسے میں جناح صاحب تشریف لائے، بانیان جلسہ نے آپ کے تعارف کے لئے اور پبلک کو جمع کرنے کے لئے جو اشتہار شائع کیا وہ قابل ملاحظہ ہے:

"مولانا محمد علی جناح کی عروس البلاد میں تشریف آوری

اہالیان شہر کو مبارک ہو کہ بطل جلیل مولانا محمد علی جن کی ہر تقاریر نے حکومت کے ایوانوں کو ہلاکر رکھ دیا ہے آپ کے یہاں پہلی مرتبہ رونق افروز ہو رہے ہیں۔"[لہ]

ہندوستان کے لوگ ہندو مسلمان چھوٹے بڑے مولانا محمد علی کے نام پر جان دیتے تھے۔ ہزاروں افراد تو مولانا محمد علی جناح اور مولانا محمد علی کے درمیان فرق بھی نہ کر سکے۔ اور جو لوگ کسی قدر سمجھے بھی ان کے لئے مولانا کا لفظ ہی دوڑ پڑنے کے لئے کافی ثابت ہوا:

"اب صورت حال یہ تھی کہ لوگ جوق در جوق آکر اُن کا (مسٹر جناح کا) نام دریافت کرتے تھے جو صحیح طور پر ہم کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وزیر حسن سب کو محمد علی بتادیتے تھے اور چونکہ اُس زمانے میں چوٹی کے تمام لیڈر مولانا کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے اس لئے اشتہاروں ہی میں نہیں بلکہ بعض اخباروں میں بھی انھیں مولانا محمد علی جناح لکھ دیا تھا۔"[ٹہ]

بڑی مشکل اُس وقت پیش آئی جب مولانا صاحب قبلہ بنفس نفیس عوام کے سامنے نمودار ہوئے تو لوگوں کو بیحد تعجب ہوا۔ وہ اس امید میں تھے کہ عبا و قبا میں نہ سہی مولانا صاحب اسلامی وضع قطع میں تو ضرور ہی ہوں گے۔

"لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ قائد اعظم ریل سے اُترے تو ہلکے بادامی

لہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ مطبوعہ لاہور پاکستان، ص ۱۲۳، شمارہ اگست ۱۹۸۰ء ٹہ " " "

رنگ کا بے داغ اور جو سوٹ کا سوٹ زیب تن کئے آسمانی رنگ کی ٹائی لگائے اور ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔ اور بقول شمس الحسن صاحب مولینا کے بجائے فرنگی نظر آرہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں کوئی انھیں پہچان نہ سکا اور وہ اسی انتظار ہی میں کھڑے رہ گئے کہ مولینا کی ایک جھلک کب نظر آئے اور وہ نعرہ تکبیر اللہ اکبر سے ان کا خیر مقدم کریں۔ ادھر منتظمین اجلاس اس گتھی کو حل کرنے کی فکر میں تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ ان کے لئے راتوں رات ایک شیروانی تیار کرائی جائے۔ لیکن جب یہ تجویز قائد اعظم کے سامنے رکھی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر یکسر انکار کردیا کہ جس لباس کا میں عمر بھر عادی نہیں اسے پہن کر میں خود کو بھی عجیب معلوم ہوں گا۔"

اس کے بعد کچھ اور تفصیلات ہیں اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ:

"قائد اعظم کے استقبال میں لکھنؤ کے عوام سے ناواقفیت کی بنا پر جو غلطی سرزد ہوگئی تھی اس کی ہم نے اس طرح تلافی کی کہ مسٹر ایم۔ اے جناح کو اگر مولانا نہیں تو کم ازکم محمد علی جناح ضرور بنادیا جس نام سے وہ آج تک مشہور ہیں۔"[1]

غرض اب مسلم لیگ اور خصوصاً یوپی کی مسلم لیگ چودھری صاحب وغیرہ نے یہ طے کرلیا کہ کسی حالت میں اور کبھی کانگریس کے ساتھ مفاہمت نہ ہوسکے گی اور جہاں تک ممکن ہو اس جماعت کی مخالفت کرنی ہے اس مقصد کے لئے ہر جائز ناجائز ذرائع استعمال کئے گئے اور جناح صاحب کو ان طریقوں سے یوپی وغیرہ میں مشہور و مقبول بنایا گیا۔ موصوف پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے، اب میدان ہموار پایا تو مہینوں کی منزل دنوں میں اور دنوں کی گھنٹوں میں طے ہونے لگی۔ اس موقع پر یہ نکتہ قابل غور ہے اور آگے آنے والے واقعات بھی یہ حقیقت ثابت کریں گے کہ پاکستان کے قیام، ہندو مسلم اختلافات کے نام اور کانگریس مسلم لیگ کے درمیان بغض و عناد میں سیاست اور فرقہ واریت سے کہیں زیادہ ذاتی اور شخصی مصلحت پسندی اور اقتدار و اختیار کی سیاست کا دخل تھا۔

[1] اردو ڈائجسٹ شمارہ اگست ۱۹۸۶ء مطبوعہ پاکستان

"اکثر سیاست دانوں کی اور دانش وروں کی متفقہ رائے ہے کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کو گورنمنٹ میں شریک نہ کرکے مسلمان قوم کا رُخ پاکستان کی طرف موڑ دیا۔ گاندھی جی کے پرائیویٹ سکریٹری اور سوانح نگار پیارے لال نے اس کو بہت بڑی سیاسی غلطی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کانگریس ہائی کمان نے مسلم لیگ کو الگ کرکے گاندھی جی کے بہترین فیصلے کے خلاف کیا۔ فرانک موریس کی رائے یہ ہے کہ اگر کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ ہوشیاری کا معاملہ کیا ہوتا تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ مسٹر پینڈرل مون ہندوستان میں آزادی کے بعد آئی سی ایس افسر رہے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پاکستان کی تخلیق کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔"[1]

کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کا رویّہ اور پالیسی بدلی تو جمعیۃ علماء اور مسلم لیگ میں بھی اختلافات ہو گئے۔ الکشن سے پہلے لیگ اور مسٹر جناح نے وعدے وعید کئے تھے ان پر جمعیۃ والوں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مکمل یقین ہو گیا تھا کہ اب ہمارے درمیان مقاصد کا کوئی اختلاف و افتراق نہیں رہ جائے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا طبعی اور مزاجی انداز یہ تھا کہ گفتگو میں، وعدوں میں اور معاہدوں میں داؤ پیچ بالکل نہیں جانتے تھے۔ اور مخاطب کی گفتگو اور یقین دہانی میں کبھی کوئی شک نہیں کرتے تھے۔ جمعیۃ علماء کے دوسرے اراکین بھی پوری طرح مخلص اور بے غرض تھے وہ کسی منصب، عہدے اور دنیاوی ترقی کے لئے سیاسی جدوجہد میں شریک نہیں تھے بلکہ محض الحب للہ والبغض للہ پر ان کا عمل تھا۔ مسلم لیگ کی یقین دہانی پر وہ کس درجہ مطمئن ہو گئے تھے! یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سنئے:

"مسلم لیگ کی ہائی کمان اور مسٹر جناح کے اعلانات اور مواعید نے جمعیۃ علماء کے اراکین کے قلوب کو جذب کر لیا۔ ان کو لیگ میں اپنی امیدوں کی جھلک نظر آئی اور یہ یقین ہو گیا کہ لیگ کی پالیسی اور طریق کار اب بدل گیا ہے

---

[1] ایٹ لائیوز، ص ۱۴۶ بحوالہ مہاتما گاندھی کا آخری دور، از پیارے لال

اور اب وہ اپنی گم کردہ متاع کو لیگ میں پا جائیں گے۔ اور مسلمانوں کو کم سے کم یہاں یک لایا جا سکے گا اور اسی ذریعے سے مسلم قوم کی بے حسی کو دور کیا جا سکے گا۔ یقیناً یہ اعلانات بتا رہے تھے کہ لیگ کا طریق کار اور پالیسی ہر دو بدل گئے ہیں۔ اور اب لیگ مردانہ وار ہندوستان اور مسلمانوں کے لئے میدان میں کود پڑی ہے، چنانچہ اسی بنا پر باوجود نصب العین کے اختلاف کے جمعیۃ کے بہت سے اراکین اس سے اشتراک عمل کے لئے تیار ہو گئے۔

علماء کو تحریک کے میدانوں میں کود پڑنے کے لئے ذاتی اغراض اور مالی و جاہی حاجات باعث نہیں ہوئی تھیں۔ اور نہ ان کو آزاد ہندوستان میں عہدہ ہائے حکومت حاصل ہونے کی امید تھی، ان کو اس میدان میں لانے والے اسلام اور ہندوستان کے وہ مصائب آلام ہیں جنھوں نے تمام ہندوستانی اقوام اور اسلامی دنیا کو زندہ درگور بنا دیا ہے وہ اخلاص اور للہیت کے ساتھ میدان عمل میں اترے تھے اور اسی لئے باوجود مسٹر محمد علی جناح کے صورتاً اور سیرۃً غیر مذہبی ہونے کے ان کے ساتھ اور انہی کی قیادت میں قومی اور ملکی خدمات انجام دینے کے لئے تیار ہوئے تھے۔[۱]

گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ ماحول میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی۔ الکشن سے پہلے والے جذبات، خیالات اور حالات الکشن کے بعد از سرتاپا بالکل بدل گئے اور نتیجے کے طور پر لیگ نے اپنی پالیسی کا دھارا مثبت سے منفی روانی کی طرف موڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب لیگ کے سامنے کانگریس کی مخالفت کے علاوہ کوئی مقصد اور ہدف باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جمعیۃ علماء کے لئے لیگ کی اس پالیسی کے ساتھ سازباز کرنا مشکل تھا۔ اس نے مسلم لیگ کو اس بدلی ہوئی سیاست کی طرف توجہ دلائی تو مسٹر جناح نے بڑا مایوس کن رویہ اختیار کیا۔ یہ حکایت بھی حضرت ہی کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

"الکشن کے بعد پارلیمنٹری بورڈ کی ورکنگ کمیٹی اور منتخب شدہ ممبروں کے ۱۳؍مارچ والے لکھنؤ کے پہلے ہی اجلاس میں مسٹر جناح نے انتہائی جدوجہد کی کہ

[۱] مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ اور اس کا حل۔ از حضرت رحمۃ اللہ علیہ

ایگریکلچرسٹ پارٹی کے اور انڈیپنڈنٹ پارٹی کے تمام کامیاب ممبران بحیثیت پارٹی کے
لیگ پارٹی میں شامل کرلئے جائیں حالانکہ الکشن سے پہلے وہ لوگ نہ صرف یہ کہ لیگ
کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے سے متنفر تھے بلکہ انھوں نے لیگ کی مخالفت اور اس کو
ناکامیاب بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیگ کے ورکرس کو ان کے
مقابلے میں بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ ان میں سے متعدد ہستیوں نے مسٹر جناح
کی اسکیم کو باشارۂ حکام برطانیہ ٹھکرا دیا تھا۔ حالانکہ مسٹر جناح نے مرکزی بورڈ میں ان
کا نام چن لیا تھا۔ مگر انھوں نے مخالفت کی تھی اور اپنی علحدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان
میں سے بہت سے ایسے تھے جن کی سیاسی زندگی بہت تیرہ و تار تھی۔“[1]

”جب مسٹر جناح سے کہا گیا کہ آپ نے تو یہ ظاہر فرمایا تھا کہ ہم رجعت پسند
اور خود غرض افراد کو سیاست کے میدان اور لیگ سے خارج کردیں گے اور ان
کے بجائے آزاد خیال، ترقی پسند اور مخلص لوگوں کو لیگ میں بھرتی کریں گے تو
مسٹر جناح نے فرمایا کہ وہ سیاسی وعدے تھے۔“[2]

اس واقعے کے بعد جمعیۃ اور مسلم لیگ میں اتحاد و اتفاق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ
گئی اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اکابر جمعیۃ علماء کے بارے میں اس قسم کے بیانات شروع
ہوئے جن میں ذاتی اہانت کا پہلو غالب ہوتا تھا۔ خاص طور پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف تنقید و
تنقیص کا ایک سلسلہ جاری کردیا گیا اور کوشش کی گئی کہ حضرت کی تخفیف و توہین کا کوئی موقع
ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

”جناح صاحب نے ایک تقریر کی جس میں کہا گیا کہ جمعیۃ علماء یا احرار کو
کانگریس میں داخلے کے مسئلے پر جبکہ یہ لوگ بورڈ میں داخل ہو چکے ہیں کوئی حق نہیں
ہے اور یہ ان کی انتہائی بے اصولی ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب نے کہا کہ ہم صرف
الکشن کے لئے داخل ہوئے تھے۔ اپنی پارٹیوں، عقیدوں اور نصب العین کو نہیں

---

[1] مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ
[2] ″ ″ ″ ″

چھوڑا تھا۔ ہم کو ہر وقت اس چیز کا اختیار ہے کہ ہم اپنی جمعیتوں کے لائحہ عمل پر غور کریں۔
اس پر جناح صاحب نے پھر اپنا جواب دہرایا اور مزید وضاحت سے تقریر فرمائی
جس کا ماحصل یہ تھا کہ جمیعۃ کو سیاست میں رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ
تقریر نہایت تلخ اور جمیعۃ کے لئے نہایت تذلیل کن تھی" لہ

لیگ کے اعتراضات اور اہانتوں کا نشانہ علماء اور جمیعۃ علماء تو تھی ہی مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ان کے حملوں کا رُخ بہت شدید ہوتا تھا۔ ان کی کسی قدر تفصیلات ہم اگلے صفحات میں بیان کریں گے، سردست موضوع کی مناسبت سے دو ایک واقعات پر اکتفا کرتے ہیں۔ منجملہ دوسرے اتہامات اور سب وشتم کے ارکان جمیعۃ پر حسابات میں بے احتیاطی اور روپئے لینے کا الزام بھی لگایا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ چودھری خلیق الزماں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"اس الکشن کے سلسلے میں پنڈت جواہر لال کا ایک خط رفیع احمد کے نام مسلم لیگ والوں کے ہاتھ لگ گیا جس میں مولینا حسین احمد کو روپیہ دینے کے متعلق ذکر تھا۔ اس کو مسلم لیگ والوں نے خوب خوب اچھالا تاکہ عوام یہ سمجھ لیں کہ نثار احمد شیروانی جن کی جمیعۃ علماء تائید کر رہی تھی، وہ دراصل کانگریسی نمائندے ہیں یہ تو واقعہ تھا کہ وہ کانگریسی نمائندے تھے۔ مگر مولینا حسین احمد کو روپیہ دینے کے معاملے میں ان پر الزام صحیح نہیں تھا۔ کیونکہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کبھی میں نے ان کو انتخابات کے دورے وغیرہ کے مصارف کے متعلق روپیہ دیا تو اس کا ایک ایک پیسے کا حساب انھوں نے مجھے دیا اور بقیہ رقم مجھے واپس کردی اس لئے میرا خیال ہے کہ جس روپئے کا ذکر تھا وہ انھیں الکشن کے مصارف کے متعلق دیا گیا ہوگا" ؎

یہ تو کبھی کبھی ہوا ہے کہ حضرت کو امانت و دیانت کی بنا پر کسی نے کوئی رقم کہیں

لہ مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ ؎ شاہراہ پاکستان۔ ص ۶۳۴

پہنچانے کے لئے دی اور حضرت نے پہنچادی مگر یہ راقم السطور کا ذاتی مشاہدہ و مطالعہ ہے کہ پبلک فنڈ کا کوئی پیسہ نہ حضرت نے کبھی اپنے پاس رکھا نہ اس کی کوئی ذمہ داری لی۔ مگر لیگ نے حضرت پر اس قسم کے اتہامات بھی لگائے اور اس کو ایک مستقل موضوع بناکر برسوں اچھالتے رہے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ان اختلافات کے بعد حضرت نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دیا۔ اس کے کافی دن بعد راجہ سلیم پور نے بھی اس بورڈ سے استعفیٰ پیش کیا۔ دونوں استعفے ایک ہی مجلس میں پیش ہوئے۔ راجہ سلیم پور کا استعفیٰ منظور کیا گیا اور حضرت کا بورڈ سے اخراج کیا گیا۔ حضرت لکھتے ہیں:

"صدر پارلیمنٹری بورڈ یوپی راجہ سلیم پور نے لیگ سے کھلی ہوئی غداری کی اور جاکر کیبنٹ میں وزارت پر فائز ہو گئے[1]۔ چاہیے یہ تھا کہ ان کا لیگ سے اخراج کیا جاتا مگر پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس میں جو کہ وزارت کے عرصے کے بعد منعقد ہوا تھا ان کا استعفیٰ پیش کیا جاتا ہے اور وہ قبول کر لیا جاتا ہے۔ کوئی کارروائی ان کے خلاف نہیں کی جاتی۔ اس کے برخلاف جبکہ میرا استعفیٰ مئی میں پیش ہو چکا تھا اگست میں بجائے اس کی قبولیت کے میرے اخراج کا اعلان کیا جاتا ہے۔"[2]

یہ برتاؤ ان مخلصانہ اور بے غرضانہ خدمات کے بعد تھا جنھوں نے مسلم لیگ کو نئی زندگی عطا کی تھی اور مسلم عوام سے متعارف کرایا تھا اور جس کا اعتراف مسلم لیگ کے لیڈران مختلف مواقع پر کرتے رہے تھے۔ پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ میں بھی منصف مزاج ممبروں کی طرف سے اصرار ہوا کہ جمعیۃ علماء کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کیا جانا چاہیے۔

"بعض ریزولیشنوں کے پاس کرتے وقت مسٹر ظہیر الدین فاروقی اور بعض دیگر اراکین نے کہا کہ جمعیۃ علماء نے ہماری مدد کی ہے اور ہم اس کی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں۔ اس بورڈ کو ان کے خیالات کا اندازہ کر کے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔"[3]

---

[1] راجہ سلیم پور اس بخت ویژ کے درمیان گورنر سے مل کر یوپی کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہو گئے تھے۔
[2] مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ [3]

اہلیہ کا انتقال اور چوتھی شادی

گوناگوں مشاغل اسفار اور تعلیمی و تدریسی مصروفیتوں کی وجہ سے حضرت گھر اور گھر والوں کے معاملات کے لئے اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے جیسے عام طور پر لوگ کرتے ہیں۔ سیاسی اور اصلاحی و تبلیغی اسفار تو عمر بھر جاری رہے مگر اس سال الکشن کی مصروفیات اور دورے معمول سے کہیں زیادہ ہوتے رہے۔ تیسری اہلیہ سال چھ مہینے سے علیل تھیں۔ اس زمانے میں بڑے چھوٹے ہر گھرانے کا یہ معمول تھا کہ جب تک ممکن ہوتا حکیم ہی کا علاج ہوتا تھا۔ چنانچہ کم و بیش سال بھر تک حضرت کی اہلیہ کا علاج بھی مقامی اطباء کی زیر نگرانی ہوا۔ مگر افاقے کی کوئی شکل نظر نہیں آئی۔ آخر مجبور ہو کر ان کو بغرض علاج دلی لے جایا گیا۔ جامع مسجد کے پاس عورتوں کا ایک مخصوص اسپتال ہے، اُس وقت اُس کا نام وکٹوریہ اسپتال تھا۔ اُسی کے ایک مخصوص کمرے میں مریضہ اور تیمارداروں کا قیام ہوا۔ اتنی فرصت تو حضرت کو نہ مل سکی کہ تیمارداری کے لئے مستقل دلی میں قیام کر سکتے مگر جب تک اہلیہ کا قیام وہاں رہا پابندی سے ہر ہفتے پرسش احوال اور تسکین و دلاسے دینے کے لئے جاتے رہے۔ اصل مرض تو اللہ جانے کیا تھا مگر پچاس پچپن برس کی کان میں پڑی ہوئی بات یاد آتی ہے کہ پیٹ میں ٹیومر ہو گیا تھا۔ آخر کار کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور مرحومہ عین عالم نوجوانی میں ۴ اور ۵ نومبر ۱۹۳۶ء کی درمیانی رات کو ایک نو برس کے صاحبزادے اسعد کو چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت نے اس حادثے کا ذکر اپنے ایک والا نامہ میں فرمایا ہے:

"نہایت افسوس کے ساتھ مطلع کرتا ہوں کہ ۱۸ ر ۱۹ ر شعبان ۱۳۵۵ھ چہارشنبہ ، پنجشنبہ کی درمیانی شب میں والدہ اسعد دہلی میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھ کو شب ہی میں تار ملا۔ دہلی پہنچا۔ جنازہ دیوبند لایا اور پنجشنبہ کی شام کو مرحومہ کو سپرد خاک

کیا گیا۔ دعائے مغفرت فرمائیں۔[1]

حضرت کی زندگی میں نہ مسرت کی کوئی قیمت تھی اور نہ صدمے کی کوئی اہمیت تھی کوئی بھی حالت ہو ان کے شب و روز یکساں صبر و شکر اور وقار کے ساتھ گزرتے تھے۔ مگر اس سانحہ پر حضرت کو بڑا صدمہ گزرا۔ مرحومہ بڑی وضعدار، مہماں نواز، پیکر اخلاص، وفا شعار اور متقی و پرہیزگار، صابر و شاکر بیوی تھیں۔ حضرت کی مزاج شناس تھیں اور ان کی ذات سے حضرت کے آستانے پر غیر معمولی برکت و رونق رہتی تھی۔ ان کی رخصتی کے ساتھ گھر کا پورا ماحول سونا ہو گیا۔ مذکورہ بالا والانامہ میں حضرت نے جو نہایت افسوس کے الفاظ لکھے ہیں یہ کوئی محاورے کے روزمرہ اور رسمی الفاظ نہیں ہیں۔ حضرت اس قسم کے الفاظ کے عادی نہیں تھے، دل پر جو بھی گزر جائے مگر زبان و قلم سے افسوس، صدمہ اور شکوہ آمیز کلمات کا استعمال کبھی نہیں کرتے تھے۔ یہ غیر معمولی تاثر ہی تھا کہ قلم سے افسوس کے الفاظ نکل گئے۔

حضرت اہلیہ مرحومہ کا جسد خاکی دیوبند لائے۔ اب خیال ہوتا ہے کہ تیس پینتیس برس پہلے یہ اہتمام اس لئے کیا ہوگا کہ قیامت تک کے لئے مرحومہ کو اپنے قدموں کی رفاقت سے آسودہ کر سکیں۔ رحمھم اللہ و برّد اللہ مضاجعھم

اس حادثے کے ایک ہفتے بعد حضرت دیوبند سے حسب معمول سلہٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں اپنے آبائی وطن ٹانڈہ میں دو ایک روز کے لئے قیام فرمایا اور اسی دوران اپنے چچا زاد بھائی کے یہاں چوتھا عقد مسنون ہوا۔ اس کی تفصیل حضرت سے سنیں:

> "میں شب میں ٹانڈہ پہنچا۔ وہاں میرے تائے زاد بھائی محمد بشیر صاحب کی لڑکی دو سال سے بیوہ تھی۔ اس کو نکاح کے دو تین سال بعد بیوگی کا منہ دیکھنا پڑ گیا تھا۔ صرف ایک بچی پیدا ہوئی تھی جو کہ تھوڑے ہی دنوں زندہ رہ کر راہیٔ ملک بقا ہو گئی تھی۔ اس بیوہ کے نکاح کا عرصہ سے جھگڑا چلا آتا تھا۔ مختلف مقامات پر اس کے نکاح کے لئے گفتگو ہوئی تھی مگر کوئی مناسب جگہ

---

[1] مکتوبات ج ۱، صفحہ ۱۳۴

ہاتھ نہ آئی تھی۔ میرے احباب نے بغیر میری منشاء اور تحریک کے اس میں تحریک شروع کر دی تھی۔ کیوں کہ بھائی محمد ظہیر صاحب جو کہ بھائی محمد بشیر کے بڑے بھائی ہوتے ہیں بطور تعزیت دیوبند گئے تھے۔ میں اس جگہ کو غیر مناسب نہیں سمجھتا تھا بالخصوص اس بنا پر کہ اپنے ہی گھر کا معاملہ تھا۔ اگرچہ اس وجہ سے کہ میں ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ رہا ہوں اور لڑکی کی عمر تقریباً بائیس سال ہے۔ عدم تناسب بھی تھا۔ مگر اتحاد خاندانی اور اس کی بیوگی اور کسی موزوں جگہ کا ہاتھ نہ آنا۔ کیوں کہ جن جگہوں سے اس کے رشتے آرہے تھے ان کی بیویاں موجود تھیں۔ مگر وہ اپنی بیویوں سے خوش نہ تھے وغیرہ امور اس کے متقاضی ہوئے کہ میں اس کو منظور کرلوں۔ میں نے استخارہ کیا۔ اس سے پہلے دیوبند میں اور دوسری جگہوں میں آٹھ نو جگہوں سے پیغام کنواری اور بیوہ لڑکیوں کے لئے آیا تھا مگر میں نے توقف کیا تھا۔ بہر حال صبح بروز دوشنبہ ۲۰ر شعبان کو میرے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا۔ لڑکے کے تائے نے یہ ظاہر کیا کہ گھر میں سب لوگ راضی ہیں۔ جب تو سلہٹ سے واپس ہو تو عقد کر کے ساتھ لیتے جانا۔ میں نے ان کو نشیب فراز پر متنبہ کیا۔ بالخصوص اپنی عمر کے متعلق۔ چونکہ وہ ہمارے خاندان میں مردوں میں سب سے زیادہ عمر والے ہیں۔ ہم بھائی ان کے سامنے بچے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں بخوبی واقف ہوں اور جملہ امور پر کافی غور کر چکا ہوں اور گھر میں بھی عورتوں مردوں نے کافی غور کرلیا ہے۔ تب میں نے کہا کہ اگر لڑکی اور اس کی ماں وغیرہ راضی ہیں تو کیوں نہ عقد ابھی کر دیا جائے۔ میں عقد کر دینے کے بعد اس وقت چلا جاؤں گا اور واپسی پر لیتا جاؤں گا۔ جو لوگ مجھ کو اپنی محبت کی وجہ سے مختلف مقامات سے پیغام دیتے اور تحریک کر رہے ہیں ان لوگوں کو مزید تکلیف کی حاجت نہ رہے گی۔ بہت سے جھگڑے بند ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا اس کا تذکرہ نہیں آیا ہے۔ میں مشورہ کر کے خبر دیتا ہوں۔ الحاصل انھوں نے مشورہ کر کے چھوہارے منگا کر اس مجمع میں جس

میں کچھ احباب ملنے کی غرض سے آئے تھے پھر فاطمی پر عقد کر دیا۔ اس کے بعد وحید اور اس کے خسر وغیرہ کا اصرار ہوا کہ ایک شب یہاں قیام کر لیا جائے، زیادہ اصرار پر بجز اس کے کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ یکم رمضان کو سہ شنبہ کو میں ٹانڈہ سے روانہ ہو گیا۔ جو حالت مشاہدہ ہوئی مجھ کو توی امید ہے کہ یہ عقد باعث طمانیت خاطر ہو گا۔"[1]

ایک مولینا اسعد صاحب کے علاوہ حضرت کی ساری سات اولادیں انہی چوتھی اہلیہ کے بطن سے تولد ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سات بچے حضرت کی ساٹھ برس کی عمر کے بعد کی اولادیں ہیں۔ بلکہ سب سے چھوٹے صاحبزادے اسجد سلمہٗ تو کم و بیش ۸۰ برس کی عمر میں تولد ہوئے تھے سلمہم اللہ۔ ان کی تفاصیل کتاب کے آخر میں آئے گی۔ جیسا کہ حضرت نے توقع کی تھی یہ اہلیہ حضرت کے لئے ہر طرح کے ظاہری و معنوی اطمینان اور راحت کا سبب ہوئیں۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۱۳۵

بھتیجے کی وفات

گذشتہ صفحات میں دو تین جگہ حضرت رحمۃ اللہ کے بھتیجے مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کا تذکرہ آچکا ہے۔ موصوف بچپن اور مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام ہی سے حضرت ہی کی شفقت اور تربیت کے سایے میں رہتے چلے آئے تھے اس لئے چچا ہی کو باپ کی جگہ جانتے اور مانتے تھے۔ حضرت کے اس وقت تک کوئی اولاد نہیں تھی اور چاروں بھائیوں کے درمیان یہ اکیلے لڑکے تھے اس لئے سبھی کی توجہ اور محبت کا مرکز تھے۔ مگر تعلیم و تربیت کی وجہ سے حضرت سے خصوصی قربت تھی۔ اسارت مالٹا کی گرفتاری کے وقت آپ نوعمر تھے۔ کچھ مخلصین نے آپ کی رہائی کے لئے تگ ودو کرنی چاہی مگر آپنے حضرت شیخ الہندؒ اور چچا سے الگ ہونا منظور نہ کیا اور برضا و رغبت طوق وسلاسل کو گلے لگالیا۔

مالٹا سے رہائی ہوئی تو مدینہ طیبہ میں مقیم چچاؤں نے واپسی کے لئے اصرار کیا مگر آپ نے چچا حضرت مولینا حسین احمد سے مفارقت گوارا نہیں کی۔ مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بھی چچاؤں نے روکنے کی بڑی خواہش کی مگر وہ حضرت سے الگ نہ ہوئے۔ حضرت رحمۃ اللہ بھی بھتیجے کو اولاد ہی کی طرح چاہتے اور رکھتے تھے۔ اپنی بے حد مصروفیتوں روز روز کے اسفار اور شب و روز کے تدریسی مشاغل کے باوجود ان کی تعلیم وتربیت دلداری اور ناز برداری سے کسی وقت غافل نہیں رہتے تھے۔ اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے حضرت سرتاپا مہر و محبت اور شفقت و مروت تھے۔ اعزہ اقربا، مسترشدین اور منتسبین میں ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ حضرت کو سب سے زیادہ خصوصیت میری ہی ذات سے ہے۔ مگر مولینا مرحوم سے حضرت کو جو تعلق تھا اس کی مثال ہزاروں چچاؤں میں تو مل نہیں سکتی۔ لاکھوں میں شاید مل جائے۔ سابرمتی جیل سے حضرت نے مولینا کو جو خطوط لکھے تھے ان میں سے دو خطوط ملاحظہ فرمائیے:

عزیزم وحید احمد سلمہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارے مزاج کی کیفیت عرصے سے معلوم نہیں معلوم ہوئی۔ نہ معلوم مدینہ منورہ سے کوئی خط آیا یا نہیں؟ وہاں کی کیا حالت ہے؟ حجاج بھی واپس آئے ہوں گے۔ ان کے ہمراہ بھی شاید خطوط آئے ہوں۔ بعض واقف حجاج بھی شاید ہوں گے جن سے مزید احوال کا بھی پتہ چل سکے گا۔ شیخ حسن عبدالجواد واپس گئے یا ابھی ہندوستان ہی میں ہیں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو کہاں ہیں؟ میں نے جو خطوط مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے لئے روانہ کئے تھے وہ تم نے روانہ کئے یا نہیں؟ اون کے جواب آنے پر بلا تاخیر تم ہمارے پاس روانہ کردو۔ خبردار! تم دیوبند کے کسی فتنہ وقضیہ میں شریک نہ ہونا۔ مولوی عزیز گل صاحب سے بھی نہ توڑنا۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ اعزہ کے احترام وتعظیم میں کمی نہ کرنا۔ ان دنوں جو قصہ سفرنامہ مالٹا کا مولوی مبین صاحب کے خلاف چل رہا ہے اور عزیزم محمد احمد نے اپنی بیوقوفی سے اس میں شرکت کی ہے ہرگز ہرگز تم ذرا بھی اس میں ملوث نہ ہونا۔ تم کو اپنے علمی مشغلے کے سوا کسی امر سے سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ مولوی مبین صاحب سے سابق تعلق میں ذرا بھی تغیر نہ ہونا چاہیئے سب سے چھوٹے بن کر رہو۔ اسی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ جناب مولٰینا حبیب الرحمٰن صاحب، جناب مفتی صاحب، جناب حکیم صاحب، جناب شاہ صاحب، مولٰینا مرتضیٰ حسن، سید اصغر حسین صاحب، مولٰینا شبیر احمد صاحب، مولٰینا عبدالسمیع صاحب، مولٰینا محمد ابراہیم صاحب، قاری عبدالوحید صاحب، منشی امداد الحق صاحب اور دیگر واقفین صاحبان کی خدمت میں سلام عرض کردو۔

مولوی محمد طاہر صاحب، مولوی سعید صاحب گنگوہی، اراکین جمعیۃ الطلباء ومحمودیہ وغیرہ حضرات سے بھی، مولوی عتیق، مولوی رحمت علی، صوفی محمود صاحب مولوی عبدالاحد صاحب سے سلام مسنون کہدو۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ صاحبزادیوں، مولوی رفیع، مولوی مسعود صاحب سے سلام عرض کردینا اور

خط، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، مستقل طور پر جیل کے پتے پر بھیجو۔ فقط (سابرمتی جیل احمد آباد گجرات) انگریزی میں ہو اور میرا نام اردو میں، مجھ کو مل جائیگا۔ (انشاء اللہ) رجسٹری ہرگز مت بھیجنا، بمشکل ملے گی۔ ہم کراچی والوں کو جو ماہوار خط لکھنے کا استحقاق تھا وہ منسوخ ہوگیا۔ اب تیسرے مہینے خط اور ملاقات کا حکم عام قیدیوں کے لئے آگیا ہے جن میں ہم بھی ہیں۔ ہم کو پولیٹیکل حقوق ملنے کا ریزرویشن اگرچہ اخیر جولائی میں بمبئی گورنمنٹ نے پاس اور منظور کرلیا ہے مگر ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے۔ مولوی عزیر گل صاحب، مہدی حسن صاحب اور ارکین خلافت سے میرا سلام کہدو۔ والسلام

حسین احمد غفرلہٗ از سابرمتی جیل۔

خط کا مضمون کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ جو اسمائے گرامی اس میں مذکور ہیں ان کا تعارف کرایا جائے تو اس کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مختصر فرصت میں اتنی گنجائش کہاں سے لائی جائے۔ سردست تو ایک دوسرا والانامہ دیکھ لیجئے اور پھر آگے کی بات سماعت فرمائیں:

مدرسہ عربیہ دیوبند عزیزم وحید احمد سلمہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں نے پہلے خط میں جو کہ ۵ ذی قعدہ کو لکھا تھا مگر بوجہ سنسر کے تاخیر ہوگئی۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے خطوط روانہ کرچکا ہوں۔ غالباً پہنچے ہوں گے ان کو بلا تاخیر روانہ کردو اور جو خطوط وہاں سے آئیں ان کو مع اپنے خط کے مستقل لفافے میں رکھ کر یہاں میرے پاس روانہ کردیا کرو۔ اب خطوط کا انتظام قدرے قابل اطمینان ہوگیا ہے۔ کچھ اوں بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تم کو خطوط وہاں سے پہنچا کریں گے۔ فیض آباد کھجوریں بھیجی گئیں یا نہیں؟ تم اب کیا کتابیں پڑھتے ہو شوق اور محنت سے جلد کتابیں ختم کرو۔ مولوی عزیر گل صاحب کے قصے میں خبردار فرق بند نہ ہونا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اعزہ و اقارب سے ہمیشہ نہایت خلوص اور ادب سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب کی خدمت میں بعد آداب فدویانہ و تسلیمات نیازمندانہ عرض ہے کہ آپ نے اپنے قدیم والانامہ میں

میری سوال کردہ چیزوں کا بھی جواب نہ دیا۔ خصوصاً بریلوی صاحب کی کیفیت کچھ تو ذکر کی ہوتی۔ مجھ کو اپنا خادم قدیم اور مخلص دعاگو تصور فرماتے رہیں۔ صاحبزادوں کی خدمت میں سلام عرض کردیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب، جناب مفتی صاحب، جناب حکیم صاحب، مولوی محسن صاحب، شاہ صاحب، مولوی شبیر احمد صاحب، مولوی ابراہیم صاحب بلیاوی، مولوی سراج احمد صاحب، مولوی عبدالسمیع صاحب، مولوی رحمت علی صاحب، مولوی عبدالاحد صاحب، مولوی طاہر صاحب، مولوی سعید صاحب گنگوہی اور اراکین جمعیۃ مع جناب قاری عبدالوحید صاحب و دیگر پرسان حال و واقفین کو سلام مسنون معروض ہو۔ منشی امداد الحق صاحب اور جملہ صاحبزادیوں اور مولوی محمد رفیع صاحب کو سلام مسنون عرض کردو۔

والسلام حسین احمد غفرلہٗ اگر مجھے خط لکھو تو میرا نام لفافہ پر اردو میں اور پتہ انگریزی میں۔

ایک مدت تک ہندوستان میں مسافرت اور غریب الوطنی کی حالت میں گزر کرنے کے بعد یہ نظر آیا کہ مستقبل قریب میں مدینہ طیبہ واپسی نہ ہوسکے گی۔ چنانچہ مولینا وحید احمد صاحب بہار شریف ضلع پٹنہ میں وقف بی بی صغریٰ اسٹیٹ کے مدرسہ عزیزیہ میں مدرس ہوگئے۔ اور حضرت نے ان کے لئے اپنے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں اپنی موروثی زمین پر نہایت اعلیٰ درجے کا وسیع شان دار اور آرام دہ مکان تنگی ترشی کی حالت میں قرض اُدھار لے کر تعمیر کرایا۔ ابھی اس مکان کی آبادی کو سال بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ مولینا وحید احمد صاحب بہار شریف سے بیمار ہوکر شعبان کی ۱۰ تاریخ کو ٹانڈہ پہنچے۔ دوا علاج حکیم ڈاکٹر کے لئے دوڑ دھوپ کی جانے لگی تو آپ نے مایوسی کا اظہار کیا کہ اب میرا آخری وقت ہے اور سختی سے منع کیا کہ دوا علاج بیکار ہے۔ تاہم جو کچھ بن پڑا دوا دارو کی گئی مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ دن بدن مرض بڑھتا ہی رہا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بذریعہ تار نزاکت حالات کی اطلاع دی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت دیوبند سے سلہٹ کے لئے روانہ ہوا کرتے تھے۔ یہ تار پاکر حضرت راستے میں لکھنؤ سے ڈاکٹر حکیم مولینا سید عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء کو لے کر ٹانڈہ پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب

طبیب حاذق ہونے کے علاوہ نہایت متقی پرہیزگار اور حضرت کے مخلص ارادتمند تھے۔ آپ نے پوری توجہ کے ساتھ معائنہ فرما کر دوائیں تجویز کیں اور کسی قدر اطمینان بھی دلایا۔ اس کے بعد حضرت اپنے اگلے سفر سلہٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مولینا محمد جلیل صاحب کیرانوی مدرس مدرسہ دیوبند حضرت کے ساتھ تھے، آپ نے یہ واقعہ بتلایا کہ کلکتہ پہنچ کر ایک رات قیام ہوا تو حضرت کی طبیعت میں بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں یہ کیفیت اتنی بڑھی کہ آدھی رات گئے ڈاکٹر بلوانا پڑا۔ اس نے ہر طرح معائنہ کر کے بتلایا کہ جسمانی طور پر کوئی ناسازی یا کمزوری نہیں ہے۔ کوئی وقتی تاثر ہے جو جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر صبح تک یہی کیفیت رہی اور رات بھر جاگ کر ٹہل ٹہل کر وقت گزرا۔ صبح کو آگے کے سفر کے لئے روانگی سے پہلے حضرت نے ارجنٹ تار دلوایا کہ وحید کی خیریت سے مطلع کرو۔ تار یکم رمضان کو صبح دس بجے ملا۔ اور مولینا کا رات کو ۱ بجے وصال ہو چکا تھا۔ تار پہنچا تو جسد خاکی کو آخری غسل دیا جا رہا تھا۔ غسل دینے والوں ہی میں سے ایک بزرگ مولینا عزیز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت تار کا جواب لکھا جو حضرت کو سلہٹ پہنچنے کے بعد ملا۔ حاضرین اور مسترشدین میں ایک بزرگ کو منتخب کیا گیا کہ وہ حضرت کو حادثہ کی اطلاع دیں۔ موصوف کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت تلاوت فرما رہے تھے۔ پانچ دس منٹ بعد تلاوت روک کر دریافت کیا کہ وحید کے بارے میں کوئی اطلاع آئی یا نہیں؟ حادثے کی اطلاع پائی تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر دوبارہ تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

یہی ہے سیر فقیروں کی اور یہی فریاد   زمیں پہ بیٹھ گئے سوئے آسماں دیکھا

یاد کر لیجئے کہ آج سے کم و بیش بیس برس پہلے بھی مالٹا کی قید کی حالت میں اس سے کہیں زیادہ جگر سوز سانحہ پیش آیا اور اس وقت بھی حضرت انا للہ پڑھ کر اسی طرح تلاوت میں مشغول ہو گئے تھے۔

رمضان شریف میں حضرت کو عبادت، ریاضت، تلاوت اور تراویح و تہجد کے علاوہ کسی دوسرے مشغلے یا گفتگو کا موقع نہیں ملتا تھا۔ مگر افطار اور رات کے کھانے کے وقت حاضرین سے کچھ شگفتہ باتیں کر لیتے تھے۔ مگر اس رمضان میں سارے مہینے حضرت نے

کسی سے کوئی بات کی نہ ہی خدام کو کسی گفتگو کی ہمت ہوئی۔ عید کے بعد واپسی میں جب ٹانڈہ تشریف فرما ہوئے تو اسٹیشن سے لانے والی سواری بجائے قیام گاہ کے سیدھے قبرستان پر روکی۔ اور دیر تک فاتحہ درود میں مصروف رہے۔ وہاں سے سیدھے مرحوم بھتیجے کے گھر تشریف لائے۔ حضرت کی آمد پر مرحوم کی بیوہ ایسی بیتاب اور بے قابو ہوئیں کہ آداب و سلام بھی مشکل ہی سے عرض کر سکیں اور اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ نکل پڑے۔ بہت دیر تک پورا گھر آہ و بکاسے معمور رہا۔ ایسے ماحول میں حضرت مکمل طور پر خاموش اور ساکت رہے۔ شدت تاثر سے چہرے پر سرخی کی جھلک نمودار ہوئی اور کیفیت متغیر ہوتی محسوس ہوئی مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا حتی کہ تسلی و تشفی کے کلمات بھی ارشاد نہیں فرمائے۔ زندگی بھر مصائب و آلام کے طوفان صرف دل ہی پر جھیلتے آئے تھے اور صبر و شکر کی ایک عدیم المثال روایت برقرار رکھی تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اندیشہ تھا کہ اگر ایک لفظ بھی بول دیں گے تو عمر بھر کی صبر و شکر کی یہ روایت کہیں ٹوٹ نہ جائے۔

حضرت نے مرحوم بھتیجے کے بال بچوں کی پرورش، تربیت اور کفالت کا بار جس فراخ حوصلگی اور شفقت کے ساتھ برداشت کیا اس کی مثال آج کی دنیا میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔ اپنی اولاد اور مرحوم کی اولاد میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اور یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ یتیم ہو چکے ہیں۔ ہر قسم کی تنگی ترشی برداشت کی بعض اوقات مقروض ہو گئے، مگر گھر کا پورا خرچ پورا کیا۔ ان کے تین لڑکوں اور دو لڑکیوں کی شادیاں پورے انتظام اور اہتمام سے انجام دیں۔ ہر چند کہ اسلامی سادگی اور سنت نبویؐ کی پابندیوں کا پورا خیال رکھا مگر شادیوں کی قدرتی رونق اور وضعداری میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ زیورات اور ملبوسات کا جتنا کچھ بھی انتظام اپنے بچوں کے لئے کیا ٹھیک وہی ان یتیم بچوں کے لئے بھی مہیا کیا۔ غرض جب تک جئے اپنی ذات کی حد تک ان کی دلداری اور ناز برداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بڑے صاحبزادے مولینا اسعد صاحب کی شادی کے سلسلے میں اہلیہ محترمہ کو جیل سے کچھ ہدایات لکھی تھیں اس کا ایک اقتباس اس بے مثال حسن سلوک کی یاد تازہ کرتا ہے:

"بنارس سے خط آیا ہے کہ وہاں سے ۲۳ جولائی کو کپڑے روانہ ہو گئے۔

ان تھانوں میں سے آدھا آدھا اُن دو جوڑوں کے لئے لو جو کہ اسعد کی بیوی کے
لئے بناؤ گی اور آدھا آدھا فریدہ کے لئے رکھ لو۔ اس کی شادی بھی انشاء اللہ وحید
کے بعد ہو جائے گی۔" [1]

یہ بنارسی کپڑے یا بنارسی پوت نئی نسل کی سمجھ میں بھی نہ آئے گی۔ ایک زمانہ تھا کہ
دنیا میں اس سے زیادہ قیمتی کوئی ملبوس نہیں تھا۔ اسی کی ایک قسم کمخواب سے رانیوں، شہزادیوں
اور راجکماریوں کے لباس تیار ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے تک شادیوں اور باراتوں میں اس کے
ایک دو جوڑے تو ضرور ہی دیے جاتے تھے۔ مگر اب تو اس کا نام بھی آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے۔

آخر میں ایک نادر اور بے مثال واقعہ حضرت کی شفقت اور وسعت قلب کا اور ملاحظہ کر لیجئے:
وصال سے کچھ دن پہلے حضرت نے خیال فرمایا کہ وحید کے لئے میں نے جو مکان تعمیر کرایا ہے اس
پر قانوناً اس کے بچوں کا کوئی حق نہیں بنتا۔ اس لئے کہ وہ موروثی جائداد پر تعمیر ہوا ہے اور بچے
شرعاً محروم الوراثت ہیں۔ چنانچہ حضرت نے وہ مکان بچوں کے نام ایک ہزار روپے میں بیچ کر دیا۔
رجسٹری تیار ہوئی اور اس پر دستخط کرنے لگے تو مرحوم کے بڑے لڑکے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ
جب یہ مکان تیار ہوا تو تیرے باپ نے کہا کہ اس میں چوکی، تخت، آئینے اور چوبی صندوق وغیرہ
رہنے ضروری ہیں۔ اس کی ضد پر میں نے یہ سامان اور کچھ دوسرا سامان پلنگ پیڑھے وغیرہ
کہیں باہر سے منگوائے ان پر کم و بیش ایک ہزار روپیہ لگ گیا تھا۔ اور آج تو نے پورا مکان
ایک ہزار میں لے لیا اور وہ بھی نہیں دیا۔ اُس مکان کو بنے ہوئے آج کچھ اوپر پچاس برس
ہو گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے ابھی پچھلے ہی برس بن کر تیار ہوا ہے۔ ایسی شاندار اور وسیع حویلی
بنوانی آج کے زمانے میں بڑے بڑے لوگوں کی طاقت سے بھی باہر ہے۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

---

[1] مکتوبات۔ ج ۴، ص ۳۱۳

حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر ڈاکٹر اقبال کی تنقید

مدرسہ دیوبند اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے اختلاف و انتشار کا واقعہ ناظرین بھولے نہ ہوں گے۔ اس موقع پر ملک کے بہت سے علماء اور معتقد حضرات شاہ صاحب کے موید تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاہ صاحب مدرسے سے قطع تعلق کرلیں گے تو دارالعلوم دیوبند کی وہ مقبولیت اور حیثیت باقی نہ رہے گی جو شاہ صاحب کی موجودگی میں ہے۔ مگر مدرسے میں حضرت کی تشریف آوری سے مدرسے کے فیض، مقبولیت اور شہرت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا تو شاہ صاحب کے مویدین کو ایک عرصے تک حضرتؒ سے گرانی رہی۔ اگرچہ مرورِ وقت کے ساتھ اس قضیہ کی تلخیاں دلوں سے محو ہوتی گئیں، پھر بھی معدودے چند حضرات ایسے تھے جن کو یہ واقعہ بھولا نہیں تھا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کو بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب سے ان کی علمیت، للہیت تقویٰ و بزرگی کی بنا پر بڑی عقیدت و ارادت تھی۔ مذکورہ بالا اختلاف کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے حضرت علامہ کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں کہ مدرسہ دیوبند سے قطع تعلق کے بعد شاہ صاحب لاہور تشریف فرما ہو کر یہیں سے اپنے تبحر علمی اور محدثانہ فیوض و برکات کے چشمے جاری کریں۔

ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا تصور سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی نے پیش کیا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں تازہ رہنی چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم محمد علی جناح صاحب سے بہت متاثر تھے اور ان کی قیادت سے انھیں بہت کچھ امیدیں تھیں۔

ان عوامل کے ساتھ بعض حقائق اور بھی تھے جن کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کو حضرت

کے سیاسی نظریات، خصوصاً متحدہ قومیت اور کانگریس میں شمولیت سے اختلاف و اعتراض تھا۔

ڈاکٹر اقبال صاحب شاعر بھی تھے، فلسفی اور بیرسٹر بھی تھے۔ اپنی فکر و نظر میں اسلام کا درد بھی رکھتے تھے اور ساتھ ہی اپنے وطن سے وسیع المشربی کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری کو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی قبولیت اور شہرت نصیب ہوئی، ہندوستان اور ہندوستان کی سبھی اقوام کے لیے اُن کے دل میں بھی وہی عزت اور وقعت تھی جس کو اتحاد قومیت کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ بچے بچے کی زبان پر ان کے یہ اشعار جاری تھے۔ آج بھی ترانۂ ہندی بیشتر تعلیمیافتہ حضرات کے لیے اجنبی نہ ہوگا۔ پوری نظم گذشتہ صفحات میں نقل ہو چکی ہے۔ دو تین شعر دوبارہ بھی پڑھ لیجئے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

غور فرمایئے اتفاق، اتحاد، حُب وطن اور متحدہ قومیت کا اس سے اچھا ترانہ اور اس سے زیادہ موثر پیغام اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اسی پر بس نہیں ہے، ہندوستان کی تعریف و توصیف اور وطن پروری کے اس سے کہیں بڑھ کر جذبات بھی دیکھئے، عنوان ہے "ہندوستانی بچوں کا گیت" نظم اس کی مستحق ہے کہ پوری نقل کی جائے۔ مگر اس وقت تو دو تین ہی بندوں پر اکتفا کیجئے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

لے مکتوبات، ج ۲، ص ۱۲۰

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا — نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا — جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

انصاف سے بتلایئے کوئی بڑے سے بڑا محب وطن اتفاق واتحاد کا علمبردار اور متحدہ قومیت کا دعویدار بھی اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وسیع المشرب بھی تھے۔ غیروں کے لیے بھی ان کے دل میں وہی عزت، وقعت اور احترام تھا جو اپنوں کے لیے تھا۔ راجندرجی کی شان میں قصیدہ مدحیہ فرماتے ہوئے تو قلم ہی توڑ دیا ہے:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے مقام — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

گاندھی جی کی منقبت میں بھی ان کے اشعار بہت بلند پایہ تھے۔ ہمیں وہ اشعار دستیاب نہیں ہو سکے، صرف مندرجہ ذیل حوالہ ملا ہے جو پیش ہے:

"علامہ اقبال نے گاندھی جی کی تعریف میں چھ اشعار لکھے جس میں انھیں مردِ پختہ کار وحق اندیش وباصفا سے مخاطب کیا۔ یہ اشعار ۱۳ / ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں چھپ چکے ہیں۔"[1]

آفتاب عالمتاب کے حضور ڈاکٹر صاحب نے جو اشعار پیش کیے ہیں وہ گائتری منتر کا ترجمہ ہیں۔ اس منتر کو ترجمے کے لیے منتخب کرنا اور پھر اس کو اپنے مجموعہ بانگ درا میں شامل کرنا ان کی وسعت قلب ونظر کی دلیل ہے اس کے دو اشعار آپ بھی پڑھ لیجئے:

---

[1] الرشید، مدنی واقبال نمبر، ساہیوال پاکستان، ص ۲۱۱

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے — چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہر محفل وجود کا ساماں طراز تو — یزداں ساکنان نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری — آزاد قید اول و آخر ضیا تری

بہتر ہے کہ اس موقع پر آفتاب کی رفعت کے بارے میں مسلمان، اسلام اور قرآن پاک کا فیصلہ بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے:

والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العلمین۔

(سورج، چاند اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابعدار ہیں۔ تخلیق اور فیصلے اسی کے ہاتھ میں ہیں، اس کی بڑی شان ہے)

اپنے ان خیالات وافکار کے باوجود ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے تین اشعار کی ایک تنقید میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ان کے معاندین، حاسدین، مخالفین اور معترضین نے جلسوں، نعروں اور اخباروں میں غدار، زرخرید، ملت فروش، بے دین وغیرہ وغیرہ عنوانات سے پندرہ سولہ برس کے عرصے میں پورا کیا۔ واقعہ یوں پیش آیا کہ:

"۸ر جنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں صدر بازار دہلی متصل پل بنگش زیر صدارت مولانا نورالدین صاحب جلسہ کیا گیا۔ اس میں میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی بیرونی ممالک اور غیر اقوام نیز اندرونی ملک میں آزادی کا تمہیدی مضمون شروع کیا تو کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں۔ اگلے روز "الامان" میں چھپا کر حسین احمد نے تقریر میں یہ کہا کہ قومیت وطن سے ہوتی ہے مذہب سے نہیں ہوتی اور اس پر شور و غوغا ہوا اس کے بعد الامان میں اور دیگر اخبارات میں سب و شتم چھاپا گیا۔"[1]

[1] مکتوبات شیخ الاسلام

ڈاکٹر صاحب نے حضرت کی اس تقریر کے بارے میں مسلم لیگی اخبارات الامان، احسان، زمیندار وغیرہ کی خبروں پر اعتماد کیا۔ دلّی ہی کے دوسرے اخبارات انصاری، تیج وغیرہ میں تقریر کی جو رپورٹیں شائع ہوئی تھیں وہ صحیح حقائق پر مبنی تھیں مگر جلدی میں پوری تحقیق نہ کر سکے اور تین شعروں کی ایک ہجو تحریر فرمادی:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ	ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار کی بنیاد ڈاکٹر صاحب نے خواجہ حافظ شیراز کی غزل پر رکھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم	ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

ناظرین یہ غزل دیوان حافظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ تنقید و اعتراض کا انداز، الفاظ، زمین، بحر و قوافی اور مزاج وہی ہے جو حافظ کے اس شعر کا ہے۔

معاندین و مخالفین تو پہلے ہی سے حضرت کو ہر قسم کی گفتنی ناگفتنی، سب وشتم، طعنہ و دشنام کا نشانہ بناتے رہتے تھے اب ان کو ایک ادبی، علمی اور فلسفیانہ گالی ہاتھ آگئی۔ پہلے تو شاید کچھ لحاظ ملاحظہ بھی کر لیتے ہوں گے مگر اب تو پکارے گلے صاف چلا چلا کر جو چاہتے تھے کہتے تھے اور شاعر اسلام، حکیم الامت اور دانائے راز کی یہ گوہر افشانی جھوم جھوم کر اور مست ہو ہو کر سنتے اور سناتے تھے۔ حضرت کے معتقدین، مسترشدین، مریدین اور تلامذہ نے یہ ہجو سنی تو ان کے قلوب غم و غصہ سے بھر گئے اور انھوں نے چاروں طرف سے انفرادی اور اجتماعی طور پر اظہار ناراضگی اور ناپسندیدگی کیا۔ بے شمار شعراء نے اسی بحر اور انہی ردیف و قوافی میں ڈاکٹر صاحب کے اشعار کے جوابات لکھے۔ حضرت سے عقیدت اور محبت رکھنے والے لاکھوں سے متجاوز تھے جو آپ کی شان میں ادنیٰ گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ان جوابات میں رطب و یابس،

تلخ و ترش اور نرم و گرم بھی قسم کے اشعار شامل ہو گئے تھے۔ حضرت کے ایک جاں نثار خادم اور مرید مولینا سید عزیز احمد صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کا ابھی پہلی رمضان ۱۴۰۹ھ میں بمقام دیوبند وصال ہوا ہے۔ ان کی جوابی نظم بڑی ترکی بہ ترکی جواب تھی۔ اس کا ایک شعر راقم الحروف کو آج تک یاد ہے:

نموش شاعرِ گستاخ قدر خوش بشناس زحد خویش گذشتن کمال بے ادبی است

غرض یہ کہ اتنی جوابی نظمیں کہی گئیں کہ عامی، معمولی اور تند و تیز قسم کے اشعار الگ کر دئے جائیں تو بھی معقول و مدلل جوابی قطعات و قصائد کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ کچھ خدام نے ان کو مجموعہ کی شکل میں طبع کرنے کا ارادہ کیا مگر حضرت کو علم ہو گیا اور آپ نے سختی کے ساتھ ممانعت و مخالفت کی۔ آج تو اگر مکمل تحقیق و تفتیش بھی کی جائے تو مشتے نمونہ از خروارے بھی مشکل ہی سے ہاتھ لگے گا۔ ایک جوابی نظم مولینا اقبال سہیل مرحوم کی دستیاب ہوئی ہے وہ ملاحظہ ہو:

معاندے کہ بشیخ الحدیث خردہ گرفت سبک بچشم فروز ایں سباب بے سببی است
بیان او ہمہ تخییل و بحث در تفسیر زبان او عجمی و کلام در عربی است
کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است دروغ گوئی و ایراد ایں چہ بوالعجبی است
درست گفت محدث کہ قوم از وطن است کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است
زبان طعن کشودی مگر نہ دانستی کہ فرق ملت و قوم از لطائفِ ادبی است
تفاوتے است فراواں میان ملت و قوم یکے ز کیش دگر کشوریت یا نسبی است
بملت ار چہ براہیمی است سرور ما ولے بہ قوم حجازی نسل مطلبی است
ز قوم خویش شمرد اہل کفر را بہ احد رسول پاک کہ ہاشمی و عربی است
خدائے گفت بقرآں بکل قوم ہاد ولے بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر پر از حکایت یا قوم مصحف عربی است
بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت کہ حبل دین قوی تر ز رشتۂ نسبی است

کسے کہ ملت اسلام نور سینۂ اوست
برادر است اگر زنگی است ور حلبی است

ولے بہ ہم وطناں در مصاف آزادی
مجاہدانہ تعاون جہاد حق طلبی است

سلوک رفق و مدارا بہ جار ذی القربیٰ
عمل بہ حکم الٰہی و اتباع نبی است

محبت وطن است از شعایر ایمان
ہمیں حدیث پیمبر عندیۃ با بلی است

تظرر نبودن و بادیدہ در در افتادن
دو گونہ شیوۂ بوجہلی است و بولہبی است

رموز حکمت ایماں ز فلسفی جستن
تلاش لذت عرفاں ز بادہ عنبی است

خموشی از سخن ناسزا گزیدہ تر است
کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بے ادبی است

بہ دیوبند گذر، گر نجات می طلبی
کہ دیو نفس سلح شور و دانش توجہی است

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبی را و ہم ز آل نبی است

اصحاب فکر و نظر و ارباب علم و فن اس کا اعتراف کریں گے کہ الفاظ و تراکیب اسالیب و فن شاعری قرآنی و شرعی دلائل و اقتباسات تاریخی و عرفی شواہد اور براہین کے اعتبار سے علامہ اقبال سہیل مرحوم کی مذکورہ نظم ڈاکٹر اقبال صاحب کا مسکت جواب ہے سب سے بڑا جواب یہ ہے کہ جس بنیاد پر سر اقبال نے ہجو فرمائی ہے وہ بات حضرت رحمۃ اللہ نے کہی ہی نہیں تھی ع کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است۔ دروغ گوئی الخ۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو مفصل جواب خود تحریر فرمایا اس کے کچھ اجزاء حاضر ہیں:

"کیا یہ انتہائی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملت اور قوم کو سر اقبال ایک قرار دے کر ملت کو وطنیت کی بنا پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیت کو بھی اس سے منزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی نہیں تو کیا ہے۔ زبان عرب اور مقام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے کون بے خبر ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیت کا کہا ہے ملت کا نہیں کہا ہے۔ دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملت کے معنی شریعت اور دین کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں۔ قاموس میں ہے الملۃ۔ بالکسر۔ الشریعۃ او الدین ــ القوم۔

الجماعة من الرجال والنساء معاً او الرجال خاصة اوتدخله النساء تبعیة۔[1]

اس باب میں مولینا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا مقالۂ محاکمہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخی اور علمی حیثیت سے مقالہ اس اہمیت کا حامل ہے کہ پورا ہی نقل کیا جائے مگر اپنی گنجائش اور موضوع کی رعایت سے ہم اس کی تلخیص پر اکتفا کرتے ہیں:

"جناب مولینا حسین احمد صاحب مدنی کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر اُن کی شخصی عزت واحترام، علمی فضل وکمال اور تقویٰ اور حسن نیت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جاسکتی۔

دلی کے بعض اخباروں میں مولینا کی تقریر کے ایک فقرہ کو جس طرح سیاق وسباق سے قطع کر کے اُچھالا گیا ہے، اور اس کے جو جو معنی پہنائے گئے، وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے، اور اسی لئے اُن کا اعتبار کر کے شاعر اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بُری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بنا پر تھی، صاف کہہ دوں کہ با وجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلقات ہونے کے میرے لئے بہت اندوہناک تھا، میں بے چین ہوگیا۔[2]

"صحیح و فصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں "ملت" کے ایک ہی معنی، اور وہ مذہب کے، ملت ابیکم ابراھیم (ج)[3]

"قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں۔ یہ قرآن پاک اور عربی محاورہ میں تین معنوں میں آیا ہے۔ مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے

---

[1] مکتوبات، ج ۲، ص ۱۲۵

[2] [3] اخبار مدینہ بجنور، ۱۳ اپریل ۱۹۳۸ء

ذالک بانھم قوم لا یعقلون (مائدہ) یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔
بانھم قوم لا یفقھون (توبہ) اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔
انکم قوم منکرون (حجر) تم انجان لوگ ہو۔

وغیرہ بہت سی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہو سکتا ہے۔"[1]

"ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور اُمت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں لیکن اپنے اس خیال کی قطعیت پر اصرار نہیں کر و فوق کل ذی علم علیم۔

"اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر، اس ملک کی کوئی مشترک سیاسی یا وطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطہ میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے اُن کے وطنی جذبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنھوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں، وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنھوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے:

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انھی کا بخشا ہوا ہے:

[1] اخبار مدینہ، بجنور، ۱۳؍ اپریل ۱۹۳۸ء

ہندی ہیں ہم، وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولینا کا یہ ارشاد کہ "قوم اوطان سے بنتی ہیں" قابلِ اعتراض نہیں، اس لئے کہ قدیم الایّام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے گئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اُس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، عرب، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا..... ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔"

مولینا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور نہ اس سے زیادہ اُن کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترک مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی "ملّت" ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا:[1]

"آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بشانہ رہتے ہیں اس سے ہمارے اُن کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہرحال پیدا ہوتی ہے۔ اس جامعیت کی تعبیر کے لئے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے۔ ملّت و امّت کے لفظ تو قطعاً نہیں ہیں۔ اور اب قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہئے، تو کیا اس کے لئے "جنسیت" کا لفظ بول سکتے

---

[1] اخبار مدینہ بجنور، اپریل ۱۹۳۸ء

ہیں! مگر ہونے سے پہلے قوم کے مفتیوں اور مفتیوں کی قوم سے بہر حال پوچھ لینا چاہیے۔
مجھے امید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا۔ اور ملت کے منتشر شیرازہ
کو ایک غلط روایت کی بنا پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمت عملی سے گریز کیا جائیگا۔[1]

یہ بحث جاری ہی تھی اور اللہ ہی جانے کہاں تک جاری رہتی مگر اچانک ان ارشادات کے فرمانے کے تین چار ماہ بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس کے بعد کچھ خوش فہم حضرات نے یہ مشہور کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا اور حضرت سے معافی مانگ لی تھی۔ دل چاہتا ہے کہ خدا کرے یہ بات صحیح ہو اور ظاہراً اعلاناً و بیاناً نہ سہی ڈاکٹر صاحب نے دل ہی دل میں اعتراف کرلیا ہو اور حضرت سے نہ سہی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی ہو تاکہ انما الاعمال بالنیات اللہ کے دربار میں بری الذمہ ہو گئے ہوں۔ اس لئے کہ تاریخی اور ظاہری طور پر اعتراف قصور اور رجوع کا جو معاملہ پیش آیا وہ اتنا صاف نہیں تھا جسے معافی کہا جا سکے۔ واقعہ یہ ہوا کہ دیوبند کے ایک فاضل و عالم مولانا عبدالرشید نسیم طالوت نے اس ناگوار قضیہ سے متاثر ہوکر حضرت رحمۃ اللہ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور ڈاکٹر صاحب کو بھی توجہ دلائی۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۶ فروری ۱۹۳۸ء

جناب من۔ مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے۔ ان میں سے بعض میں تو اصل معاملے کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے مگر بعض نے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں۔ چنانچہ آپ کے خط میں مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں۔ اس واسطے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لئے انتخاب کیا ہے۔ جواب انشاء اللہ اخبار "احسان" میں شائع ہوگا۔ میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں۔ فقط مخلص اقبال

[1] اخبار مدینہ بجنور، ۱۳ اپریل ۱۹۳۸ء

اس خط کے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب نے روزنامہ "احسان" لاہور میں ایک خط بغرض اشاعت روانہ کیا جس کو اخبار نے اپنی طرف سے سُرخی لگا کر مندرجہ ذیل انداز میں ۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع کیا:

"میں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت قبول کرنے کا مشورہ نہیں دیا" حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان۔

"مجھے اس اعتراف کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا" علامہ اقبال کا مکتوب۔

قومیت و وطنیت کے سلسلے میں ایک علمی بحث کا خوش گوار خاتمہ۔

جناب ایڈیٹر صاحب احسان لاہور　　　　السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولینا حسین احمد مدنی صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے، اس میں اس امر کی تصریح کر دی گئی تھی کہ اگر مولینا کا یہ ارشاد کہ "زمانۂ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں" محض برسبیل تذکرہ ہے تو اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اگر مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریہ وطنیت کا اختیار کریں تو دینی پہلو سے اس پر مجھ کو اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں، جو اخبار انصاری میں شائع ہوا مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

"لہٰذا ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے بجز رشتۂ اتحاد کے اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔"

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار احسان میں شائع ہوا ہے۔ لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا جس کی ایک

نقل انھوں نے مجھ کو بھی ارسال کر دی۔ اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:
"محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں اور اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے۔ اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کر لیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے سیاق و سباق پر نظر ڈال جائے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے، یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اس پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے سلسلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں، میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔ محمد اقبال[1]"

مذکورہ بالا اقتباسات اور توضیحات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کس درجے میں معافی تلافی کی ہے اور کہاں تک قال اقول کی بحث کی ہے۔ بہر حال اب تو دونوں ہی حضرات اس دربار میں پہنچ چکے ہیں جہاں قول و عمل اور نیتوں کے ذرّے ذرّے کا حساب دینا ہوگا اور اس میں کسی منطقی اور فلسفی بحث کی گنجائش نہ ہوگی۔ اس لئے اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ مجموعۂ اقبال میں یہ نظم جب تک چھپتی رہے گی حضرت کے اجر و ثواب و درجات میں لاکھوں

[1] مکتوبات شیخ الاسلام۔ ج ۳، ص ۱۴۰

گی اضافہ ہوتا رہے گا۔ آخر میں عظمت وعزیمت اور اخلاق حسنہ کی ایک مثال بطور عبرت و نصیحت سن لیجیے:

"ہماری انجمن اصلاح المسلمین کا جلسہ تھا جس رات مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کی تقریر تھی اسی دن مولینا کو جامع مسجد میرٹھ کے باہر کارسے اترتے وقت اطلاع دی گئی تھی کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کا انتقال ہوگیا۔ حضرت نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور رات کو جلسے میں تقریر سے پہلے اس حادثے کا دلدوز انداز میں تذکرہ فرمایا اور حاضرین سے کہا کہ سب ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کے لئے دعا کریں۔ چنانچہ مولانا کے ساتھ ہزاروں کے مجمع نے دعائے مغفرت کی۔ یہ بات غیر معمولی نہ ہوتی اگر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے حضرت مولینا کے خلاف قومیت کے مسئلے پر اتنے سخت الفاظ استعمال نہ کئے ہوتے"[1]

لاکھوں درود اور سلام سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے امت کو عفو و درگذر اور اخلاق عالیہ کے راستے پر چلایا۔ انی بعثت لاتمم مکارم اخلاقکم اور صدہزار رحمتیں ہوں ان امتیوں پر جنھوں نے اپنی زندگیاں سنت نبوی کے اتباع میں وقف کردیں۔

سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں

---

[1] رشید الوحیدی۔ مولینا حسین احمد حیات و کارنامے، مطبوعہ جمعیۃ بکڈپو دہلی۔ مقالہ مسعود حسن صدیقی "انڈین فارن سروس" ص ۲۵۴

جمعیۃ علماء ہند کی صدارت

شہرت اور عمل کے اعتبار سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اسی دن سے طبقہ علماء کے سرخیل اور صدر ہو گئے تھے جس دن آپ کے شیخ اور استاذ مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا وصال ہوا۔ قوم اور ملک نے ان دونوں بزرگوں کی جانشینی کے فرائض آپ کے سپرد کر دیے تھے۔ قومی مسائل، علمی ہوں یا تعلیمی، روحانی ہوں یا اخلاقی، سیاسی ہوں یا اجتماعی حضرت سے استصواب اور مشورے کے بغیر طے نہیں پاتے تھے مگر جمعیۃ علماء ہند کی قانونی اور رسمی صدارت ابھی تک حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذمے تھی۔ آپ تبحر علمی، تفقہ دینی اور فہم و فراست کے اعتبار سے جماعت کے ممتاز ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن مختلف عوارض اور امراض نے مفتی صاحب کو بہت خستہ و شکستہ کر دیا تھا۔ ادھر ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم نے ایسی تباہ کاریوں کا آغاز کیا کہ ہندوستان میں اجتماعی اور انفرادی زندگیاں انتہائی بھیانک مسائل کا شکار ہونے لگیں۔ اس جنگ کے ہولناک اور خوں آشام قصے ہزارہا ہزار صفحات لکھے جانے کے باوجود آج تک پورے نہیں ہوئے۔ پورے پورے ملک برباد ہو گئے تھے۔ چہل پہل اور زندگی سے بھرپور بستیاں نیست و نابود ہو گئی تھیں۔ بھرے پُرے بارونق شہر ہوا میں اُڑ گئے تھے۔ وہ جو سنتے ہیں کہ زمین شق ہو جائے گی، آسمان پھٹ پڑیں گے، سمندر اُبل پڑیں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے، پیڑ پودے، چرند پرند، انسان، حیوان سب پلک جھپکتے میں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس قیامت کا ہلکا اور حقیر ہی سا سہی مگر ایک نمونہ اس جنگ میں دیکھا جا چکا ہے۔ ایک خوفناک آواز آئی۔ کانوں کے پردے پھٹ گئے، کلیجے اچھل کر حلق میں آ گئے، اور چشم زدن میں مخلوق منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے معاً بعد ایک بجلی چمکی جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اس کی خوفناک چمک سے سرِ فلک

عمارتیں شجر حجر ٹیلے پہاڑیاں سب زمین میں دھنس گئیں۔ جنگ میں ایک طرف برطانیہ تھا دوسری طرف جرمنی تھا۔ ان قیامتوں اور آفتوں میں یہی دونوں یا ان کے طرفدار برباد ہوتے تو ٹھیک کی بات تھی۔ مگر ہندوستان مفت میں ان کے درمیان گھن کی طرح پس رہا تھا۔ جنگ سے دو روز پہلے ہندوستان کے بازاروں اور منڈیوں میں آسودگیوں اور زندگیوں کی فراوانی تھی۔ ایک روپیے کا نمبری ایک سیر گھی، چار آنے کی سیر بھر شکر اور سیر بھر اعلیٰ درجے کا بکری کا گوشت، دو پیسے کا نمبری سیر بھر بڑا گوشت، ڈھائی آنے کا ایک گز قمیص کا ڈوریہ، بارہ آنے کا ایک جوڑا جوتا اور زندگی کی ساری ہی ضرورتیں اسی حساب سے مل رہی تھیں۔ ریلیں وقت پر چلتی تھیں، مسافر لیٹ کر اور سو کر سفر پورا کرتے تھے۔ دوران سفر چور ڈاکو تو دور کی باتیں تھیں پرندہ پر نہیں مارتا تھا۔ سامان خریدتے بیچتے ہوئے دیکھا اور پرکھا اس وقت بھی جاتا تھا مگر ملاوٹ سڑاوٹ کا اس وقت تصور بھی نہیں تھا۔ رواج کے طور پر اتنا دیکھ لیتے تھے کہ سودا زیادہ پرانا اور بوسیدہ تو نہیں ہے۔ ایسے حالات میں اچانک جنگ چھڑی اور بازار میں زندگی کی ساری ہی ضروریات گراں نہیں بلکہ نابید ہوگئیں، اسی وقت زندگی میں پہلی بار سُنا کہ گھی سبزیوں سے بنایا جائے گا۔ روپیہ کاغذ کا چلے گا اور لوگ فوج میں بھرتی ہوں گے۔ ریلیں بند ہوگئیں، بازار اُجاڑ ہو گئے، آبادیاں تاریک ہوگئیں، بستیاں ویران ہوگئیں۔ قانون نکلا کہ بازاروں میں سڑکوں پر، گھروں میں اور سواریوں پر کہیں روشنی کی کرن نہ ہو۔ سارے ملک میں دہشتناک اندھیرا چھا گیا۔ ہندوستان کی ہر پیداوار کی جنگ میں ضرورت تھی۔ ہندوستانی نوجوان میدانِ جنگ میں زندہ دیوار بن کر کھڑے ہوسکتے تھے۔ برطانیہ کی جنگی ضرورتوں کے لئے ہندوستان کے جسم کا آخری قطرہ بلا کسی قیمت کے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے برطانیہ نے ہندوستان کو بھی جنگ میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ملک کی سیاسی جماعتوں بالخصوص کانگریس اور مسلم لیگ کو اعتماد میں لئے بغیر اور ان کی تائید کے بغیر ہندوستانی عوام برطانیہ کا ساتھ دینے اور جنگ میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ وائسرائے نے ان جماعتوں کو اس مسئلے پر گفتگو کی دعوت دی۔ گاندھی جی ذاتی طور پر برطانیہ کے طرفدار

تھے۔ انھوں نے وائسرائے سے کہا:

"میری ہمدردیاں انسانیت کی خاطر انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ ہیں۔ میں یہ خیال کر کے ڈر جاتا ہوں کہ لندن جو اب تک ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا تباہ ہو سکتا ہے۔ جب اُن کے سامنے میں نے پارلیمنٹ کی عمارت اور ویسٹ منسٹرا ے بے کی تباہی کا امکانی نقشہ پیش کیا تو میں رو دیا۔" [۱]

مگر ان جذبات کے باوجود انھوں نے جنگ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جنگ تو اُن کے نظریۂ حیات کے بالکل ہی خلاف تھی۔ وہ عدم تشدد کے پیغامبر تھے کانگریس نے بھی برطانیہ کی حمایت اور جنگ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ وہ کہتی تھی کہ پہلے یہ طے کر دیا جائے کہ جنگ کے بعد ہندوستان مکمل طور پر آزاد کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی ہندوستان برطانیہ کی مدد کر سکتا ہے۔ حمایت اور مدد کے لئے شرط مسلم لیگ نے بھی پیش کی۔ الکشن کے بعد کانگریس کے رویے اور اس کی سیاست سے مسلم لیگ بیزار تو ہو ہی چکی تھی۔ چنانچہ اب اسکی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ تھیں اور اس نے یہ شرط رکھی کہ کانگریسی گورنمنٹوں کے مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلائی جائے تاکہ وہ بھرپور حوصلے کے ساتھ برطانیہ کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں کانگریس کی شرط کے مقابلے میں برطانیہ کے لئے یہ شرط بہت آسان تھی۔ مسلم لیگ نے ان مظالم کی تفصیل مختلف رپورٹوں میں شائع کرائیں۔ یوپی سے پیرپور رپورٹ، بہار سے شریف رپورٹ اور بنگال سے مسٹر فضل الحق کی رپورٹیں اور پمفلٹ چھاپے گئے۔ کانگریس والوں نے اور صوبوں کے انگریز گورنروں نے ان میں لگائے گئے الزامات کو بے بنیاد اور بلا دلیل و ثبوت اتہامات پر مبنی قرار دیا۔ مگر جذباتی مقرروں اور ہنگامی سیاستوں میں تحقیق و تصدیق کا ہوش کسے رہ جاتا ہے۔ یہ رپورٹیں اپنا کام کر گئیں۔ ایک طرف تو برطانیہ کو کانگریس حکومتوں کو نظر انداز کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گئی۔ حکومت نے جنگ میں

[۱] چودھری خلیق الزماں۔ شاہراہ پاکستان۔ ص ۸۰۰

ہندوستان کی شرکت کا حکم جاری کیا تو کانگریس نے دسمبر ۱۹۳۹ء میں صوبائی حکومتوں سے استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر مسلم لیگ نے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کیا اور کانگریسی حکومتوں کے استعفیٰ پر ملک بھر میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منانے کا فیصلہ کیا۔

ملک میں یہ تاریک، خطرناک اور اُلجھے ہوئے حالات تھے جب مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کمزوری صحت کی بنا پر قیادت کے فرائض ادا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور جمیعۃ علماء ہند کے ذمّے داروں کے سامنے یہ سوال آیا کہ جماعت کی صدارت کے لیے ایک مسلمہ عالم، متفقہ شخصیت اور صاحب عظمت و عزیمت قائد کا انتخاب کیا جائے اور ملک کے تمام برگزیدہ اور چیدہ علماء کی متفقہ رائے سے حضرت کو جماعت کا صدر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ ۸، ۸ اور ۹ جون ۱۹۴۰ء کو جون پور میں جمیعۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت کے نام کا اعلان کیا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستانی عوام جنگ آزادی کے رہنماؤں کے اجلاس کئی کئی میل لمبی لائنیں بناکر نکالا کرتے تھے اور ان کی سواری کی گاڑیاں گھوڑوں اور بیلوں کے بجائے اپنے ہی ہاتھوں اور کاندھوں سے کھینچا کرتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ تو صرف جنگ آزادی ہی کے نہیں عوام کے روحانی اور دینی پیشوا اور مقتدا بھی تھے۔ اجلاس کے ذمّے داروں کو عام شہریوں کو اور شہر کے مسلمانوں کو کیسے کیسے ارمان استقبال کے اور کیسا کیسا جذبہ اظہار محبّت و عقیدت کا رہا ہوگا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ مکمل درویشانہ اور عالمانہ شان کے ساتھ ہر قسم کی تقریب اور استقبال سے بے نیاز اور مستغنی شام کو تین بجے کی ٹرین سے پہنچتے ہیں اور شدید گرمی اور دھوپ میں اسٹیشن سے قیام گاہ کی طرف پیدل روانہ ہوجاتے ہیں۔ ساتھی اور استقبال کے لئے آئے ہوئے عقیدت مند بھی پاپیادہ مشایعت کرتے ہیں، اس طرح علماء و فضلاء کی جماعت کا یہ جلوس فقیرانہ اور درویشانہ شان سے جلسہ گاہ تک پہنچتا ہے۔ اس اجلاس میں حضرت نے بڑے سائز کے چالیس صفحات کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کا ایک ایک لفظ درس عبرت و نصیحت ہے، پڑھنے ہی کے نہیں بار بار مطالعے اور غور و فکر کے قابل ہے مگر اتنی گنجائش کہاں سے لائی جائے کہ پورا خطبہ نقل کیا جائے۔ چیدہ چیدہ اقتباسات اور خلاصہ ہی پر

اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے دنیا کی بے ثباتی اور بے قیمتی کا نقشہ کھینچا۔ اس کے بعد ملک کی سیاسی اور اقتصادی ابتری کی تفصیل بیان کی کہ ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور عوام مظالم اور ناانصافیوں کے بوجھ کے نیچے پستے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انگریز مورخین اور سیاست دانوں کے بیانات سے یہ ثابت کیا کہ برطانوی اقتدار کا مقصد وحید یہ ہے کہ ہندوستان کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے مفلس اور کنگال بنا دیا جائے۔ ان تمام تمہیدات اور مقدمات کے بعد وقت کے سب سے اہم مسئلے، جنگ میں ہندوستان کی پالیسی کا اعلان کیا۔ کانگریس نے شرط لگائی تھی کہ حکومت ہماری بات مان لے تو ہم جنگ میں اس کی تائید کریں گے۔ مسلم لیگ نے بھی حمایت کے لئے مطالبات پیش کئے۔ مگر حضرت نے صاف صاف الفاظ میں بلا کسی شرط و قید برطانوی جنگی حکمت عملی کی مخالفت کا اعلان کیا اور عالم اسلام پر برطانیہ کے مظالم کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

"وہ ایک طرف تو آزادی کا راگ الاپ رہا ہے۔ دوسری طرف آزادی کے پروانوں، احرار اور کانگریسیوں کو جیل کی سلاخوں میں بند کر رہا ہے۔ ان کھلے ہوئے کارناموں اور مظالم کے بعد بھی اگر کوئی ہندوستانی اس کے دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو رہا ہے تو اس کی عقل اور سمجھ پر رونا چاہئے۔ ۱۸۵۷ء کے تجربات کثیرہ کیا کافی نہیں ہیں۔ لا یلدغ المومن من جحر مرتین۔ اسی گزشتہ جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے کس قدر وفاداری کی، کس قدر اپنا خون بہایا، کس قدر اپنا مال ضائع کیا۔ مگر صلہ کیا ملا؟ بجز خوش کن الفاظ اور ان کے ساتھ رولٹ بل جلیان والا باغ، مارشل لاء وغیرہ کے اور کیا چیز ہاتھ آئی؟ من جرب المجرب حلت بہ الندامہ۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ اس وقت برطانیہ کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اس کو اس کے مظالم سے روکا جائے تاکہ اس پر عذاب اور قہر الٰہی نہ نازل ہو جائے۔ حدیث شریف میں ہے انصر اخاک ظالما اور مظلوما قیل یا رسول اللہ کیف انصرہ ظالما قال تکفہ عن الظلم (اپنے ظالم بھائی کی بھی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ کسی نے پوچھا:

ظالم کی مدد کیسے کریں، فرمایا اس کو ظلم سے روکو)

آج بہت سے ناعاقبت اندیش کہتے ہیں کہ برطانیہ کی امداد و اعانت اس میں ہے کہ اس کو لڑنے کے لئے سپاہی اور ضروریات جنگ کے لئے مال و دولت دی جائے۔ ہمارے خیال میں باعتبار نصوص شرعیہ یہ لوگ برطانیہ کے سخت ترین دشمن ہیں اور اس کو اور اس کی قوم کو قعر جہنم میں جھونکنا چاہتے ہیں۔

برطانیہ کی امداد اس میں اور صرف اسی میں ہے کہ اس کو ان افعال شنیعہ سے روکا جائے۔ اگر خدانخواستہ برطانیہ کی امداد فوج، مال یا رسد وغیرہ سے کی گئی تو امداد کرنے والے اس کے تمام مظالم اور گناہوں میں شریک اور مؤید ہوں گے۔ وہ خلق خدا کو اور ستانا چاہتے ہیں۔ بے شک ایسے تمام لوگ خدا کے قہر عظیم کے مستحق ہوں گے اور سخت ترین پکڑ میں مبتلا کئے جائیں گے"۔[1]

یہ حقیقت ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ اعلانِ حق کو بلند کرنے کا یہ وقت جنگ عظیم والا زمانہ تھا۔ جرمنی کا ہر ہٹلر آندھی طوفان کی طرح برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو تہس نہس کر رہا تھا۔ اس کی توپیں لندن میں اور جاپان کے بم کلکتہ میں برس رہے تھے۔ برطانیہ کی جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ اس جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا اور اعلان کیا تھا کہ جو کوئی جنگی معاملات میں ہماری مخالفت کرے گا اپنی جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ ایسے خطرناک حالات اور ہولناک ماحول میں برطانیہ کی تائید، امداد و اعانت اور حمایت کے خلاف فتویٰ دینے کی جرات ایسے مجاہدین کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں افضل الجھاد کلمۃ الحق عند سلطانٍ جائر کے لئے وقف کر دی ہوں۔ اس بیان کے بعد سیاسی طور پر ملک اور عوام النّاس کے سامنے برطانوی جنگی پالیسی کے بارے میں جمعیۃ علماء ہند کے فیصلے کا واضح الفاظ میں اعلان کر دیا:

"اسی بنا پر میرٹھ کے جلسے میں جمعیۃ علماء ہند نے اپنا اعلان موجودہ جنگ کے متعلق

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء جون پور ۱۹۴۲ء از حضرت رحمۃ اللہ علیہ

صاف اور واضح الفاظ میں شائع کر دیا تھا جس کا حرف حرف صحیح اور قابلِ عمل ہے اور وہ یہ ہے، جمعیتہ علماء ہند کا نصب العین ہمیشہ سے مکمل آزادی رہا ہے اور وہ اس کو پانا شرعی، سیاسی اور اخلاقی حق سمجھتی ہے اور کوئی چیز جو اس حق کے راستے میں مزاحم ہو اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہے جمعیتہ علماء ہند کی مجلس عاملہ کسی نقطۂ نظر سے بحالات موجودہ جنگ میں برطانوی امپیریزم کی امداد کرنے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں پاتی۔[۱]

[۱] تاریخ جمعیتہ علماء ہند، ص ۹۳

لاہور ریزولیشن اور پاکستان کا اعلان

۱۹۴۰ء

پچھلے صفحات میں ڈاکٹر سر اقبال اور چودھری رحمت علی کی تجویز پاکستان اور تقسیم ملک کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ اب پورے دس برس بعد مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۴۰ء میں بمقام لاہور مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں اس تجویز کو ضابطے کی شکل میں منظور کیا۔ بہتر ہے کہ اصل تجویز اور پاکستان کی تصویر دیکھنے سے پہلے اس کے پس منظر پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ تاکہ اصل منظر واضح اور عیاں تر ہو جائے۔ چودھری رحمت علی کی تجویز چودھری خلیق الزماں کی زبانی سنیں:

"چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ایک اسکیم پاکستان کے نام سے تیار کی تھی جس میں انھوں نے لفظ پاکستان کے پی سے پنجاب، اے سے افغان، کے سے کشمیر، س سے سندھ اور تان سے بلوچستان رکھا۔ اور اسی سال ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ صدارت الٰہ آباد میں اپنا نظریہ تقسیم ہند کا پیش کیا۔ اور بعد ازاں ایک چار صفحے کا پمفلٹ "ابھی یا کبھی نہیں" (NOW OR NEVER) چودھری رحمت علی، محمد اسلم خاں اور شیخ محمد صادق کی طرف سے جنوری ۱۹۳۳ء میں کیمبرج میں تقسیم ہوا۔ جس میں انھوں نے اپیل کیا وہ تین کروڑ تیس لاکھ اپنے اسلامی بھائیوں کی طرف سے جو پاکستان میں بستے ہیں اُسے شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے اس میں یہ ظاہر کیا کہ پاکستان کے اجزاء ملحقہ صوبہ پنجاب، صوبۂ سرحد کشمیر اور صوبہ سندھ اور بلوچستان ہوں گے۔ ان حضرات نے اس میں یہ رائے بھی ظاہر کی کہ وہ آل انڈیا فیڈریشن کی تجویز کے جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں پاس ہوئی ہے بالکل خلاف ہیں۔ اس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستانی مسلمان ایک منفرد قومیت

ہیں جو ... کا وطن اپنی وسعت اور آبادی کے اعتبار سے فرانس کے برابر ہے اور وہ
اس کی ایک علٰحدہ قومی حیثیت کو تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔[۱]

یہ بعینہٖ وہی نقشہ تھا جس کی بنیاد پر دس سال بعد نوابزادہ لیاقت علی اور چودھری خلیق الزماں نے کانگریس کی مخالفت اور تقسیم ہندوستان کی پالیسی کا آغاز کیا اور جسکی قیادت جناح صاحب نے شروع کی۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے تک نہ اس مطالبے پر کسی نے توجہ کی نہ مسلم لیگ کی ملک میں کوئی اہمیت تھی۔ جناح صاحب نے جب یہ دیکھا کہ "۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے اپنے آپ کو گاندھی جی کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔"[۲] تو وہ بالکل مایوس ہوگئے اور ان کو اپنی سیاسی زندگی کے لئے کوئی پلیٹ فارم نظر آنے کی امید نہ رہی۔ چنانچہ انھوں نے انگلینڈ میں جا بسنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں اس قدر نا امید ہوگیا کہ میں نے انگلینڈ میں رہنے کا فیصلہ کرلیا اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل مجبور محسوس کیا۔"[۳]

"چنانچہ انھوں نے انگلینڈ جاکر ہیمپسٹڈ میں ایک تین منزلہ کوٹھی خریدی ان کی بہن فاطمہ جناح نے جو ان کے ساتھ تھیں گھر گرہستی کا انتظام سنبھال لیا ان کی تیرہ سالہ لڑکی رینا ایک انگلش بورڈنگ اسکول میں داخل ہوگئی جہاں سے وہ چھٹیوں میں باپ کے پاس آجاتی تھی۔ یہاں ان کی وکالت بھی کامیابی کے ساتھ چمک اٹھی۔ اتوار کے روز وہ انگلینڈ کے خوبصورت مناظر کی سیر کے لئے جاتے تھے اور یہاں ان کی زندگی ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ پرسکون ہوگئی تھی۔ لیکن انھوں نے ہندوستان سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑا۔ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے کچھ ہی پہلے وہ ہندوستان آئے اور کانگریسی مسلمانوں کو

---

[۱] چودھری خلیق الزماں۔ شاہراہ۔ پاکستان۔ ص ۸۰۲
[۲] ایٹ لائیوز۔ ص ۱۴۲
[۳]

ایک متحدہ مسلم جماعت میں شریک کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس مقصد میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے چودہ نکات پر بھی زور دیتے رہے اور یہ بھی کہتے رہے کہ ذاتی طور پر میں مشترکہ انتخاب کا قائل ہوں مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے گورنمنٹ کو وارننگ دی کہ اگر اس نے ہندوؤں کی مرضی کے مطابق کوئی دستور منظور کرلیا تو مسلمان اس دستور کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔

جولائی ۱۹۳۳ء میں سینتیس برس کے ایک صاحب جو اپنی نئی (دوسری) بیوی کے ساتھ انگلینڈ میں ہنی مون منانے گئے تھے جناح صاحب سے ملنے آئے۔ ان کا نام لیاقت علی خاں تھا اور یہی آیندہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہونے والے تھے۔ بیگم لیاقت علی خاں نے بتلایا کہ ان کے شوہر کو یہ یقین ہوگیا کہ جناح صاحب ہی وہ شخص ہیں جو مسلم لیگ اور مسلمانوں کو بچا سکتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی نے ان پر بہت زور دیا کہ وہ واپس ہندوستان چلیں مگر جناح صاحب نے کہا کہ میں ہمپسٹڈ میں بہت مطمئن ہوں۔ لیاقت علی صاحب اپنے اصرار پر جمے ہی رہے آخر کار جب ان دونوں کو یہ محسوس ہوا کہ جناح صاحب اب انگلینڈ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں گے تو ایک شاندار ڈنر کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ لوگ جایئے اور حالات کا مطالعہ کیجیے۔ ملک کے ہر ہر حصے کا اندازہ کیجیے اگر پھر آپ کی رائے یہی ہوتی ہے کہ میں واپس چلوں تو میں یہاں کی ساری آسائش تج کر واپس آجاؤں گا۔ یہ وعدہ لے کر لیاقت علی خاں ہندوستان واپس آئے اور یہاں سے پیغام بھیجا کہ واپس آجایئے۔ اس پر جناح صاحب نے اپنی کوٹھی فروخت کر ڈالی۔ سامان اونے پونے بیچ ڈالا اور اپنی بہن فاطمہ کو لے کر واپس آگئے۔ ان کا ایک پڑوسی بتلاتا تھا کہ اس طرح روانہ ہو رہے تھے جیسے کوئی شخص بڑے عظیم الشان مشن پر جا رہا ہو۔ ہندوستان پہنچ کر ۱۹۳۴ء میں وہ متفقہ طور پر مسلم لیگ کے دائمی صدر بنا دیے گئے۔[1]

---

[1] راج موہن گاندھی ایٹ لائیوز بحوالہ جناح وکٹر بولیتھو ص ۱۴۳

اب مسلم لیگ اور خاص طور پر مسٹر جناح کا کانگریس نیشنلسٹ مسلمانوں اور متحدہ قومیت کے نظریے سے براہ راست مقابلہ تھا۔ ان کی سیاست کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تسلیم کرائیں۔ اور اس کے لئے انھیں لازمی طور پر کانگریس کو خالص ہندو جماعت کہے جانے پر اصرار تھا۔ پہلے مقصد کے لئے جناح صاحب نے قانونی موشگافیوں کا سہارا لیا اور نہایت سمجھ داری اور ذہانت کے ساتھ سیاسی ذرائع استعمال کئے۔ برطانوی افراد اور حکومت کے حلقوں کو ان پر اعتماد تھا اور براہ راست اُن سے سیاسی اور اجتماعی روابط تھے۔ گورنمنٹ وقتاً فوقتاً مسلم لیگ کے لیڈران سے ملک کی سیاسی بساط پر بہت سی غیر متوقع اور اچانک صورتِ حالات کو دبانے کا کام لیتی رہتی تھی۔ اس لئے ہر سیاسی اقدام پر مسلم لیگ سے استمزاج ضروری سمجھتی تھی۔ علاوہ ازیں کانگریس کی پالیسی یہ تھی کہ آزادی کی راہ ہموار رکھنے کے لئے ہر اہم موڑ پر ملک کی سبھی سیاسی جماعتوں کی تائید و اعانت شریک رکھی جائے۔ اس طرح مسلم لیگ کو تحریک آزادی میں شرکت اور دخل اندازی کے مواقع حاصل تھے۔

> "لندن میں دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی تو گاندھی جی نے اس میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بھی شرکت کی دعوت دینے کی درخواست کی کیوں کہ وہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے سربراہ تھے مگر وائسرائے نے ڈاکٹر صاحب کو شریک کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر گاندھی جی نے کہا کانگریس ہندو نہیں بلکہ ہندوستانی جماعت ہے اس لئے کہ اس میں مولینا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری اور بہت سے دوسرے مسلمان شریک ہیں مگر مسٹر محمد علی جناح اور جناب سر آغا خاں نے کانگریس کو ہندوستانی جماعت ماننے سے انکار کر دیا۔"[۱]

۱۹۳۷ء کے بعد جب مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے تو گاندھی جی نے صلح کی کافی کوششوں کے بعد مسٹر جناح کو واردھا آنے اور بات کرنے کی دعوت

---

[۱] راج موہن گاندھی ایٹ لائیوز بحوالہ جناح وکٹر بولیتھو۔ ص ۱۴۳

دی مگر جناح صاحب نے وار دھا جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجے کے طور پر گاندھی جی نے خود جناح صاحب کے پاس جانے کا ارادہ کیا اور اس بات چیت میں مولینا آزاد کو بھی شریک رکھنا چاہا مگر جناح صاحب نے اس سے انکار کر دیا اور گاندھی جی کو تار دیا کہ میں آپ سے اکیلے ہی ملوں گا۔ گاندھی جی کے اس رویے نے جناح صاحب کے اعتماد کو بہت مضبوط کر دیا اور انھوں نے گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

"اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ آپ اعتراف کرتے ہیں کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک نمایندہ اور ذمہ دارانہ جماعت ہے اور دوسری طرف آپ سارے ملک کے ہندوؤں اور کانگریس کے نمایندہ ہیں۔ ہم آیندہ صرف اسی بنیاد پر بات چیت کریں گے۔"[1]

اس واقعہ نے اور مولینا سے ملنے سے انکار نے مسلمانوں میں جناح صاحب کی شخصیت کو بہت مشہور کر دیا اور مسلم لیگ والوں نے مختلف اسلوب اور پیرایۂ بیان میں اس کی شہرت کی کہ جناح صاحب کی شخصیت اس قدر اہم ہے کہ گاندھی جی کو ہر قیمت پر ان کے دروازے پر جانا ہی پڑا۔ اسی ریلے میں ایک اور اہم ترین واقعہ سامنے آیا جس نے جناح صاحب کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کا ایک اور موقع فراہم کر دیا۔

کانگریس اپنے اس مطالبے پر سختی سے قائم تھی کہ ایک ایسی قومی حکومت بنائی جائے جس میں سارے ہی ہندوستانی عوام کی نمایندگی ہو بحیثیت صدر کانگریس مولینا ابوالکلام آزاد نے جناح صاحب کو لکھا کہ کانگریس اس گورنمنٹ کی ترکیب و ترتیب میں آپ سے تعاون چاہتی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ حکومت میں سبھی پارٹیاں شامل ہوں گی۔ مسٹر جناح نے مولینا کے پیغام کا جو جواب دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے لکھا:

"میں تم سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ چاہے وہ خط و کتابت ہو یا اور کسی طریقہ سے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ کانگریس نے صدر بنا کر تم کو ایک شو بوائے بنایا

---

[1] ایٹ لائیوز۔ راج موہن گاندھی۔ ص ۱۲۹

ہے، کانگریس ایک ہندو جماعت ہے۔ اگر تم میں ذرا بھی جرأت اور احساس ہے تو
اور کانگریس سے استعفیٰ دو۔ آج تک تم مسلم لیگ کو شدید نقصان پہنچاتے رہے ہو
لیکن اب سمجھ لو کہ تم اہلِ اسلام ہو گئے ہو اور اب یہ فضول بحث بند کرو۔[1]

انگریزی زبان میں تو تم اور آپ کے لئے ایک ہی لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے اور کلام کے سیاق و مزاج سے یہ متعین ہوتا ہے کہ مخاطب میں مراد آپ ہے یا تم۔ جناح صاحب کے اس خط کا مزاج اس قسم کا تھا کہ اس میں "یو" کا ترجمہ تم ہی سے ہوتا ہے۔ مسلم لیگ اور اس کے حلقوں نے مذکورہ بالا جواب کو جناح صاحب کی تاریخ میں زریں الفاظ میں جگہ دی۔ اس کو حکمت و سیاست کا شہ پارہ قرار دیا اور برسوں تک بلکہ تقسیم ہندوستان کے دن تک اس پر شروح و حواشی کے اضافے کر کر کے بیان و اعلان کرتے رہے۔ یہ تمام واقعات ۱۹۳۶ء کے الکشن کے بعد پیش آرہے تھے جب لیگ نے از سر نو زندگی شروع کی تھی ورنہ اس سے پہلے عوام میں لیگ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس موضوع پر مفصل بیان پچھلے اوراق میں گزر چکا ہے۔ اب جناح صاحب پورے دعوے کے ساتھ اعلان کرنے لگے تھے کہ ہندوستان کی کسی پارٹی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملے میں دخل اندازی کرے،

"۱۹۳۶ء میں جناح صاحب نے کانگریس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی سنٹرل کمیٹی میں کسی مسلمان کو منتخب نہ کرے مگر سبھاش چندر بوس نے جواب دیا کہ کانگریس اپنے عقیدے سے منحرف نہیں ہو سکتی اور اپنے مسلمان ساتھیوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔"[2]

۱۹۳۶ء کے بعد اب مسلم لیگ کانگریس سے مقابلے کے لئے کھل کر میدان میں آگئی۔ مسلم لیگ کے سربرآوردہ حضرات میں مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں تو کئی برس سے مقابلے میں تھے اب چودھری خلیق الزماں بھی اس مقصد میں شریک ہو گئے تو ان کی طاقت اور تدبیروں میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چودھری صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے،

---

[1] ایٹ لائیوز۔ راج موہن گاندھی۔ ص ۱۵۵
[2] ایٹ لائیوز۔ راج موہن گاندھی۔ ص ۱۴۹

"۶ جولائی کو نواب اسماعیل خاں اور میں دونوں صبح کی گاڑی سے لکھنؤ پہنچ گئے اور ہم لوگ سیدھے پنتھ جی کے گھر گئے۔ جہاں مولینا اپنی صبح کی چائے پی رہے تھے۔ سلام اور دعا کے بعد میں نے جیب سے مولانا کا شرائط نامہ نکال کر ان کے ہاتھ میں دے دیا اور ان سے کہا کہ مولینا آپ کو معلوم ہے کہ یہ گفتگو میں مسلم قوم کی طرف سے کانگریس سے کر رہا تھا۔ اس میں میرا کوئی ذاتی سوال نہیں تھا اس لئے آپ کو سوچنا چاہیئے تھا کہ ان شرائط سے آپ پوری مسلم قوم کی توہین کر رہے ہیں بہر نوع کل میں اپنی پارٹی کو لے کر آپ کا مقابلہ کروں گا۔ کچھ آگے چل کر چودھری صاحب نے لکھا ہے۔ اپنی تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں نے کانگریس کی ہر تحریک میں پورا پورا ساتھ دیا تھا اور وزارتوں کے سلسلے میں میں نے مولینا کو یہاں تک لکھ کر دے دیا تھا کہ ملکی مسائل میں مسلم لیگی ممبر کانگریس کا گلے گلے ساتھ دیں گے۔"[1]

پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ مسلم لیگ مصر تھی کہ اس کے دو ممبر چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں یوپی کی وزارت میں لئے جائیں اور کانگریس ایک مسلمان ممبر اپنی طرف سے بھی شامل کرنے پر اڑی ہوئی تھی۔ اسی کو چودھری صاحب نے مسلم قوم کی طرف سے کانگریس سے گفتگو کہا ہے۔ مولینا اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح جواہر لال (کانگریس) مسلم لیگ کا یہ مطالبہ مان لیں یا پھر چودھری صاحب کسی درمیانی راستے پر صلح کر لیں۔ اسی موضوع پر انھوں نے چودھری صاحب کو خط لکھا تھا جس سے چودھری صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ مولینا کی کوششیں بارآور نہیں ہوسکیں اور کانگریس وزارت میں ان دونوں صاحبان کی شمولیت پر رضامند نہیں ہوئی۔ اسی کو انھوں نے پوری مسلم قوم کی توہین قرار دیا ہے۔ اس قضیے پر جو کچھ ہم لکھ چکے ہیں اس پر مزید اضافہ کرنے کے لئے کہاں سے گنجائش لائیں اور لیں بھی کسی طرح کوئی موقع نکالیں بھی تو اس تفصیل کا ہمارے موضوع سے تعلق کیا ہے؟ ہمیں تو یہاں پر صرف یہ بتلانا تھا کہ اگر کانگریس لیگ کے مطالبے کو اس طرح پس پشت نہ ڈال دیتی تو چودھری صاحب نے لکھ کر دے دیا تھا

---

[1] چودھری خلیق الزماں شاہراہ پاکستان، ص ۲۴۴

کہ ملکی مسائل میں مسلم لیگی ممبر کانگریس کا گلے گلے ساتھ دیں گے مگر بحالات موجودہ انھوں نے اپنی پارٹی (مسلم لیگ) کو لے کر کانگریس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مگر مقابلے کے لئے ان کے سامنے متعدد مشکلات تھیں۔ ان میں بڑی مشکل مسلمانوں پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جمعیۃ علما کے اثرات اور مقبولیت تھی۔ حضرت اور ان کی جماعت ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی تاسیس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کو حضرت کی مخالفت پر آمادہ کرنا آسان کام نہ تھا، چودھری صاحب کانگریس سے مقابلے کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوسری دقت یہ ہے کہ سارا قصہ یوپی سے شروع ہوتا ہے جو اقلیتی صوبہ ہے۔ معلوم نہیں مسلم اکثریتی صوبوں پر ان کا کیا رد عمل ہوگا۔ اگر ہم ان کو اپنی قربانیوں سے جگا نہ سکے تو ہماری لڑائی کانگریس جیسی جماعت سے کے دن کی؟ خود اپنے صوبہ میں جمعیۃ علماء سب سے زیادہ بااثر جماعت ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے سرفروش نوجوان کارکنوں کی ضرورت ہوگی"۔[1]

بہر حال چودھری صاحب میدان میں صف آرا ہو گئے اور اپنے روابط، تعلقات، ذہانت اور سیاسی تدابیر کے بل بوتے پر مارچ ۱۹۴۰ء میں بمقام لاہور پاکستان کا مندرجہ ذیل ریزولیشن پاس کرایا:

"آل انڈیا مسلم لیگ اپنی تجاویز، ۲۷ اگست ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کی تائید کرتے ہوئے بہ اصرار اعادہ کرتی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے آل انڈیا فیڈریشن کی اسکیم بالکل نامناسب اور ملک کے حالات کے اعتبار سے ناقابلِ عمل ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ پُرزور طریقے سے اپنا خیال ظاہر کرتی ہے کہ، گو ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کا برٹش گورنمنٹ کی طرف سے وائسرائے کا یہ بیان کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء مختلف پارٹیوں کے مشورے کے بعد دوبارہ زیرِ غور آئے گا، اطمینان بخش ہے۔ پھر بھی مسلم لیگ یہ

---

[1] شاہراہ پاکستان۔ ص ۶۴۵

واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جب تک تمام دستوری اسکیم پر از سر نو غور نہ کیا جائے گا جس میں مسلم لیگ کی مرضی اور قبولیت شریک نہ ہو، قابل تسلیم نہ ہوگا۔

تجویز ہوا کہ مسلم لیگ کی یہ غور شدہ رائے ہے کہ کوئی دستوری اسکیم ملک میں مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگی جو حسب ذیل بنیاد پر نہ قائم ہو یعنی وہ جغرافیائی ہمسائے (اقطاع یا اکائیاں) (یونٹ) ریجن یا زون حسب ضرورت اقطاع کے لین دین کے ساتھ اس طریقے سے شامل کئے جائیں کہ وہ تمام حصے جن میں عددی اعتبار سے مسلمان اکثریت میں ہوں جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے ہیں ان کو ملاکر آزاد اسٹیٹس بنائی جائیں جو خود مختار اور آزاد ہوں۔

یہ کہ مناسب، باا‌ثر اور قانونی تحفظات دستوری اقلیتوں کے لئے رکھے جائیں جس سے ان کے اپنے کلچرل، اقتصادی اور سیاسی مفادات محفوظ کئے جائیں اور دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اسی قسم کے تحفظات دستور میں ان کے لئے بھی رکھے جائیں۔"

اس تجویز میں اقلیتوں کے کلچرل، اقتصادی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کی بات قابل غور ہے۔ ہندوستان کے دستور کی حد تک ان تحفظات کا پورا پورا قانونی خیال رکھا گیا ہے مگر عملدرآمد ان قانونی قراردادوں پر کس حد تک کیا گیا؟ اس کے لئے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں، اچھوتوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پس ماندگی سے سوال کرنا پڑے گا۔

پاکستان اور حضرتؒ کا موقف

پاکستان اور تقسیم ہندوستان کا مطالبہ دو قومی نظریے پر مبنی تھا۔ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ حضرت ہندوستان میں بسنے والی تمام جماعتوں کو جنگ آزادی کی حد تک ایک قوم سمجھتے تھے اور ان میں تفریق، تقسیم اور اختلاف کے سخت خلاف تھے۔ اسی بنیاد پر وہ اور ہندوستان کے لاتعداد نیشنلسٹ اور حریت پسند مسلمان تقسیم ہندوستان اور پاکستان قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس سیاست کو نہ صرف ہندوستان بلکہ خاص طور پر مسلم قوم کے لئے سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور ہر اعتبار سے نقصان اور گھاٹے کا سودا سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دس بارہ کروڑ افراد کی ایک وحدت کسی بھی ملک میں مخالف سے مخالف ماحول میں بھی مغلوب اور کمتر ہوکر نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں میں خاص طور پر فطری جرأت، موروثی شجاعت، تاریخی شہامت، شوقِ شہادت اور عظمت و عزیمت جیسی صفات اور خصوصیات موجود ہیں۔ یہ اگر جادۂ مستقیم پر گامزن رہیں تو صرف ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں مظفر و منصور ہوکر رہ سکتے ہیں حضرت کا خیال تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کا منصوبہ اور سازش سامراجی سیاست اور برطانوی پالیسی نے تیار کی ہے۔ وہ تاریخی حوالوں اور مدلل شہادتوں کے ذریعے یہ بتلاتے تھے کہ اسلام دشمن طاقتیں اسی تقسیم اور تفرقہ اندازی کی سیاست کے ذریعے مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ہمیشہ ان کی جمعیت کو کمزور اور طاقت کو پارہ پارہ کرتی رہی ہیں۔

> "حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ مطالبۂ پاکستان کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سیاست نہ صرف یہ کہ مسلم قوم کی اجتماعیت اور وحدت کے لیے ایک خطرہ ثابت ہوگی بلکہ یہ اسی مقصد کے تحت انگریزی حکومت کی پیدا کردہ ایک سیاسی چال ہے۔ چنانچہ آپ نے پورے اخلاص اور یقین کے ساتھ اس نظریہ کی مخالفت کی اور پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو تقسیم کے نتائج سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں حضرت کو قدم قدم پر اپنوں اور بیگانوں کی ملامتوں، تنقیدوں، اعتراضات اور مخالفتوں

کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر آپ نے پورے صبر و استقامت کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کرکے سارے مصائب برداشت کیے اور جس چیز کو حق سمجھتے تھے وہ قوم کے سامنے پیش کی۔ لہ

حضرتؒ کا بیان ملاحظہ ہو:

"یہ برطانوی حکومت ہی ہے جس نے مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں کو برباد کر ڈالا ہے۔ شرعی قوانین کو نکال کر ان کی جگہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین جاری کر دئے ہیں۔ اسلامی عدالتوں اور قضا اور افتاء کو ختم کر ڈالا ہے۔ ان کو اقتصادی اور معاشی طور پر برباد کر ڈالا ہے۔ آج یکایک ان کے دلوں میں مسلمانوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کیسے پیدا ہو گئی۔ اور کیسے مسٹر ایمرے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ہندوستانی مسلمانوں کی حالت پر ملک معظم کی حکومت کی اس پریشانی کا اظہار ۱۹۴۲ء میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کر رہے ہیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ تو صحیح ہے کہ کانگریس ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے لیکن ہندوستان کی مشترکہ قومی زندگی کے اہم عناصر کانگریس کے اس دعویٰ کا انکار کرتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاست میں بولنے کا حق تنہا اسی کو ہے۔ یہ عناصر اپنا یہ حق ثابت کرتے ہیں کہ ان کو نہ صرف یہ کہ موثر اقلیت مانا جائے بلکہ ہندوستان کا دستور بنانے میں برابر کا حق دیا جائے ان میں سب سے زیادہ مضبوط نوے ملین افراد پر مشتمل مسلمانوں کی عظیم الشان قوم ہے جو شمال مشرقی اور شمال مغربی صوبوں میں تو اکثریت میں ہے مگر متحدہ ہندوستان میں اقلیت شمار ہوتی ہے۔

مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور تمدنی اعتبار سے مسلمانوں اور ان کے ہموطن ہندوؤں میں اتنا ہی گہرا فرق ہے جتنا یورپ کی کسی بھی دو قوموں میں ہوتا ہے۔ اکثریت کے بل بوتے پر جغرافیائی حدود کی بنیادوں پر منتخب کی ہوئی دستور ساز اسمبلی

لہ مولانا عبدالحئی: نزہۃ الخواطر، مطبوعہ حیدرآباد، ج ۸، ص ۱۹۰

میں بنائے ہوئے دستور میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ؎

برطانوی ذرائع ابلاغ کے دعووں کی اس قسم کی تقریروں، تجویزوں اور تائیدوں کی بنیاد پر ہندوستان کے اکثر مسلمانوں اور لیڈروں کو یقین تھا کہ اس تحریک کے پیچھے برطانوی سامراج کی مصلحت اور مفاد موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کو معاشی اور اقتصادی پہلو سے بھی تقسیم پر اعتراض تھا۔ وہ کہتے تھے کہ صدیوں کی محنت اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں نے صنعت، حرفت، تجارت، زراعت اور فنی کاریگری میں معاشی استحکام حاصل کیا ہے۔ بہت سے فنون مثلاً پارچہ بافی، چرم سازی، شیشہ گری، جواہر تراشی، نقشہ نویسی، باغبانی، ڈھلائی، سناری، نجاری وغیرہ وغیرہ میں مہارت، شہرت اور ایک مقام بنایا ہے جس میں کوئی دوسری قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور جو ہندوستان بھر میں اپنے مخصوص علاقوں اور مقامات کی نسبت ہی سے بکتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ اس بارے میں مولانا حفظ الرحمن صاحب نے فرمایا:

"پاکستانی اسکیم ایک جانب ہندو ہندوستان کے عظیم الشان رقبے میں مسلمانوں کو وہاں کے طبعی وسائل و ذخائر سے محروم کرنے کے سامان مہیا کرتی ہے اور دوسری طرف مسلم ہندوستان (پاکستان) میں انہی سرمایہ کار ہندوؤں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ بقول فاضل مذکور، پیدائشی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کو دل میں لئے چھوٹے چھوٹے کمپنیوں کی صورت میں مسلم ہندوستان کے معاشی اور طبعی ذخائر پر قابض ہو جائیں اور یورپ کے یہودی سرمایہ داروں کی طرح حکومت کے صلح و جنگ پر بالواسطہ مالک ہو جائیں اور پھر انگریزوں ہی سے رجوع کریں کہ وہ اس معاشی اور اقتصادی گتھی کو اپنے سرمائے سے حل کرنے کے لئے ہمارے اسی طرح آقا اور حاکم بنے رہیں جس طرح آج ہیں۔" ؎

لہ ضیاء الحسن فاروقی۔ دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان۔ ص ۱۰۷۔ بحوالہ مکاتیب شیخ الاسلام مرتبہ فرید الوحیدی
کہ تحریک پاکستان پر ایک نظر۔ مولانا حفظ الرحمن۔ ص ۲۳

سماجی اور اجتماعی اعتبار سے صدیوں کے رہن سہن، میل ملاپ اور معاشرت سے مسلمانوں کی ایک مخصوص تہذیب، تمدّن اور روایت پلی بڑھی تھی۔ اس کے حدود و قیود اور خد و خال کو لاتعداد گردشہائے روزگار، مخالفتوں، موافقتوں اور قربانیوں نے سنوارا تھا۔ خطرہ تھا کہ بستیاں اُجڑیں گی تو صدیوں کی ترقی یافتہ یہ تہذیب و معاشرت بھی مٹ جائے گی۔ اس کی دلیل ملاحظہ ہو:

"اگر ہم ہندوستان کے ایک حصّہ کو پاکستان بناکر ۔۔۔ ہندوستان سے جدا کرلیں گے تو اگرچہ ۔۔۔ ہندوستان (پاکستان) کی سرکاری زبان اُردو قرار پائے گی لیکن ۔۔۔ ہندوستان (بھارت) کی سرکاری زبان خالص ہندی اور رسم الخط دیوناگری ہوکر رہے گا۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ ہندو ریاستوں کے مسلمانوں کی طرح تقریباً تین کروڑ (اب دس کروڑ) مسلمان جو ہندو ہندوستان (بھارت) کے باشندے ہوں گے اُردو زبان سے بڑی حد تک بیگانہ ہوں گے اور چند خاص علمی حلقوں کے علاوہ یہ زبان ہندوؤں میں تو کیا مسلمانوں میں بھی مذہبی زبان "عربی" کی طرح تبرک کے طور پر بولی اور لکھی جائے گی۔ اس کا جو اثر ہماری تہذیب و تمدّن اور معاشرت پر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔"[1]

دینی، تبلیغی اور اسلامی میدانوں میں مسلمانوں نے ہندوستان جیسے عظیم ملک میں صدیوں کی سرفروشیوں، قربانیوں اور جاں نثاریوں کے ذریعے جو کامیابیاں حاصل کی تھیں اور جس کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے بسنے والوں پر اثر انداز ہوئے تھے وہ اسلامی تاریخ کا زرّین کارنامہ ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ ملک کی تقسیم سے ان سرگرمیوں اور تحریکوں پر بڑے خراب اثرات مرتب ہوں گے۔ اس موضوع پر جمعیۃ علماء ہند کا نکتۂ نظر مولانا حفظ الرحمٰن کی زبان سے سنیئے:

"جو حضرات اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوستان میں برٹش حکومت

---

[1] مولانا حفظ الرحمٰن۔ تحریک پاکستان

سے پہلے اور ہندو حکومتوں کے راج میں اسلام نے کس طرح اپنا پیغام پہنچایا اور یہاں کے باشندوں نے کس طرح اس کو قبول کیا نیز برٹش حکومت کے قیام کے بعد کس طرح یہاں کی مسلم آبادی دوچند ہوگئی اور جو حضرات اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ اسلام کی اس روز افزوں ترقی کے پیش نظر سیاسی اور مذہبی نکتۂ نگاہ سے کس طرح ہندوؤں میں آریہ سماج تحریک نے نشوونما پائی وہ بآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی برتری اور ترقی کا علاج پاکستان ہی کے ذریعے کیا گیا تو اس سے اسلامی تبلیغ کو بڑا دھکا اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔"[1]

ہندوستان میں اسلام کی ترقی کی تاریخ اور تبلیغ اسلام کے راستے میں تقسیم کے مضر اثرات بیان کرتے ہوئے حضرت فرماتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ اور فتح عرب کا پیش خیمہ ہے جس روز یہ تمام و کمال کو پہنچی اسی روز انا فتحنا الآیہ نازل ہوتی ہے جس پر حضرت عمر تعجب کرتے ہوئے استفسار فرماتے ہیں "او فتح ھو یا رسول اللہ"۔ آپس میں اختلاط کا ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا دلوں سے ہٹ اور ضد کا اٹھ جانا یہی امور تھے جنھوں نے افلاذ اکباد قریش کو کھینچ کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بنا کر مکہ سے مدینہ پہنچایا، حضرت خالد بن ولید عمر ابن العاص وغیرہ رضی اللہ عنہم اس طرح حلقہ بگوش اسلام بن گئے کہ قریش کی ہستی فنا ہوگئی۔ الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا ہے۔ اور تنافر باعث عناد اور ضد نیز عدم اطلاع علی المحاسن ہے۔ وہ اسلامی ترقی میں سدِ راہ ہے اور چونکہ اسلام تبلیغی مذہب ہے اس لئے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہو سکے غیر کو اپنے سے قریب

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام (۱) ص ۱۴۶

کرے نہ یہ کہ ان کو دور کرے۔ اسلام پدر شفیق ہے، مادر مہربان ہے، ناصح خیرخواہ ہے، جالب اقوام ہے، ہمدرد بنی نوع انسان ہے۔ اس کو غیروں کے ساتھ جزاء سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا پر کاربند ہونا شایان شان نہیں ہے۔" لہ

حضرت کا خیال تھا کہ علمی اور تعلیمی میدان میں بھی تقسیم سے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوگا اور ان کا ہزار سالہ ورثہ تباہ ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے علمی، تہذیبی، ثقافتی، دینی اور تاریخی مراکز و معابد جو ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں جن میں دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور دوسرے ہزاروں ایسے ہی اہم اور مرکزی ادارے شامل ہیں اور ان کے ساتھ ہی سیکڑوں بیش قیمت اور نادرالوجود کتب خانے اور دارالاشاعت مکتبہ دارالعلوم دیوبند، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، خدابخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی، نیز لاکھوں مسجدیں، درگاہیں اور خانقاہیں سب غیر مسلموں کے رحم و کرم پر رہ جائیں گی اور ان کو غیروں کے دست برد سے بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی صدیوں پرانی علمی، فکری، تعلیمی اور دینی بنیادیں ہل جائیں گی۔ اس موضوع پر حضرت دلائل واضحہ کے ساتھ گھنٹوں گفتگو اور تقریر فرماتے تھے کہ بزرگوں سے ملی ہوئی یہ وراثتیں اتنی قیمتی ہیں کہ مسلمانوں کو جان دے کر بھی ان کی حفاظت کرنی چاہیئے اور ان کو چھوڑ کر جانے کا خیال بھی نہ کرنا چاہیئے۔ ایک اہم حقیقت کی طرف حضرت مسلمانوں کو متوجہ کرتے تھے اور پورے دلائل کے ساتھ ثابت کرتے تھے کہ پاکستان کے دو علاقوں، مشرقی پاکستان اور مغربی علاقے کے درمیان اس قدر دوری ہے۔ آمدورفت، اتصالات و وسائل، رسل و رسائل اور نظم و ضبط کی اتنی مشکلات پیش آئیں گی۔ اور رہن سہن، زبان، تمدن اور ماحول میں ایسا اختلاف ہے کہ ان کا متحد ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ حضرت ہی کی زبان سے نمونے کے طور پر اس بارے میں چند جملے سن لیجئے:

لہ مکتوبات شیخ الاسلام (۱) ص ۱۴۶

"دونوں حصوں، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو الگ الگ بری، بحری اور فضائی فوج رکھنا پڑے گی اور مشرقی حصہ خاص طور پر ایک جزیرہ بن جائے گا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی میں تلخی بڑھے گی۔ مجموعی ہندوستان اور وفاقی حصوں میں مسلمان بے بس اقلیت ہوکر رہ جائیں گے۔ پنجاب اور بنگال دونوں کے اہم حصّے کاٹ دینے سے ان کی موجودہ اہمیت ختم ہو جائے گی، مالی بحران پیدا ہوگا اور پاکستان اس حالت میں محض الور بنجر علاقوں کا چوکیدار ہوکر رہ جائے گا اور پھر مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے ملانے کا کبھی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔"[۱] "اور موجودہ شکل میں یہ نقشہ تیس، چوبیس سال تک بھی بہ مشکل ہی قائم رہ سکے گا۔"[۲]

مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کے بارے میں یہ تذکرہ آچکا ہے کہ حضرت ان کو حکومت برطانیہ کی سازش سمجھتے تھے۔ آپ کی دلیل یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ کے موسسین، ذمہ داران اور لیڈران برطانوی حکومت کے پروردہ آوردہ، وظیفہ خواران، تربیت یافتگان، فرزندان دلبندگان، راجہ، مہاراجہ، خطاب یافتگان ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ بڑے اثر انداز اور مدلل طریقے سے اپنی اس رائے کو ثابت کرتے تھے۔ ان دلائل کو یکجا کرنا اگرچہ اب بیکار ہے مگر تاریخی اعتبار سے اتنا ہی اہم بھی ہے، لیکن کئی سالوں کے خطبات، تقاریر اور مضامین میں سے یہ اقتباسات جمع کرنا کافی وقت اور دقت طلب کام ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل چند دانوں سے ناظرین اُس خرمن کا پوری طرح نہ سہی کسی قدر اندازہ تو کر ہی لیں گے۔ مسلم لیگ کی بنیاد اور اس کے مقاصد کے بارے میں حضرت نے لکھا ہے کہ:

"مسٹر بیک، مسٹر ماریس اور مسٹر کلائیو کالون وغیرہ کی انتہائی انفرادی اور پھر مشترکہ میں اجتماعی مساعی اس کی شاہد عدل ہیں۔ جس کے ماتحت اوّلاً اسی سال میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کرائی گئی جس کا دوسرا نام اینٹی کانگریس

---

[۱] ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری: شیخ الاسلام۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ ایک سیاسی مطالعہ۔ ص ۱۵۲۔ مطبوعہ پاکستان۔
[۲]

تھا۔ اور پھر ۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا تشکیل کی گئی جس کے مقاصد حسب ذیل قرار دیے گئے۔

(۱) مسلمانوں کی رائیں انگریزوں اور گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(۲) عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا۔

(۳) ان تدابیر میں امداد دینا جو سلطنت برطانیہ کی حفاظت اور استحکام میں ممد ہوں۔ ہندوستان میں امن قائم رکھنا اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔

یہ مسٹر بیک اور مسٹر کالون وغیرہ کی انفرادی مساعی ہی کا نتیجہ تھا کہ سرسید جیسے تیز اور سخت سیاسی آدمی کے خیالات پر نہایت زہریلا اثر ڈالا گیا۔ اسباب بغاوت ہند کے لکھنے والے شخص کے عقائد اور ارادوں کو روزانہ اور پیہم مساعی نے بالکل ہی جامد، ڈرپوک اور انگریز پرست بنا دیا۔ انہی مساعی کی بنا پر ۱۹۰۰ء میں لارڈ میکڈانلڈ نے اُردو اور ناگری کا قضیہ اُٹھایا اور انہی وجوہ کی بنا پر ۱۹۰۶ء میں متعدد ذمہ داران برطانیہ کی کوششوں سے مسلم لیگ کی تشکیل شملہ کی چوٹیوں سے ظہور پذیر ہوئی اور آج تک اسی پالیسی پر گامزن ہے۔ اسی بنا پر بار بار امن سبھائیں قائم کرائی گئیں اور اسی بنا پر شدھی اور سنگٹھن کو میدان میں ٹھہرایا گیا۔[۱]

یہ ایک اجمالی بیان ہے جس سے ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ اپنی بصیرت و بصارت، مشاہدہ و مطالعہ کی بنیادوں پر حضرت کو یقین تھا کہ ہندوستان کی ساری فرقہ وارانہ تحریکیں اور تنظیمیں، شدھی سنگٹھن، ہندو مہاسبھا، محمڈن ایسوسی ایشن، مسلم لیگ وغیرہ تحریک آزادی کی مخالفت میں، برطانیہ کی تائید اور اشارے سے وجود میں آئی ہیں اور اسی ایک مقصد کے لئے سرگرم ہیں۔ حضرت نے اپنے بیان میں شملہ کی چوٹیوں کا جو ذکر کیا ہے آج کے قارئین بمشکل ہی سمجھیں گے کہ اس کا مطلب وائسرائے اور برطانوی حکومت کا دفتر ہے جو سال کے آدھے حصے تک شملہ میں رہا کرتا

۱؎ مکتوباتِ شیخ الاسلام، ص ۱۳۹

تھا۔ حضرت کا موقف سمجھنے کے لئے اس اجمال کی کسی قدر تفصیل پر بھی ایک نظر ڈال لینی ضروری ہے:

"اتفاق سے مسٹر آرچولڈ پرنسپل علی گڈھ کالج کے زمانے میں دفتری حکومت کو پھر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت بنائی جائے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بنگالیوں کی قوت توڑنے کے لئے لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے ۱۹۰۴ء میں اعلان کیا کہ ان کا ارادہ یہ ہے کہ کمشنری چٹاگانگ، ڈھاکہ اور میمن سنگھ کو صوبۂ بنگال سے نکال کر آسام میں شامل کر دیا جائے۔ اس کے خلاف بنگالیوں نے ہزار ہا جلسے کر ڈالے، اور لاکھوں دستخط کرا کے عرضداشتیں بھیجیں اور تمام ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس وقت نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ نے بھی فرمایا کہ یہ ایک وحشیانہ تجویز ہے۔ لارڈ کرزن اس مخالفت کو برداشت نہ کر سکے اور فروری ۱۹۰۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ہندوستانیوں کے متعلق یہ کہا کہ وہ سچے نہیں ہوتے اور سچ بولنا کبھی اُن کا نصب العین نہیں رہا ہے۔ اس پر بنگالیوں نے طوفان برپا کر دیا اور ایک عظیم الشان جلسے میں لارڈ کرزن اور ان کی پالیسی پر ملامت کی۔ یہ جلسہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو ہوا تھا اور اس پر لارڈ کرزن کو اس قدر اشتعال ہوا کہ وہ بذات خود ڈھاکہ پہنچے اور وہاں ایک جلسۂ عام میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تقسیم بنگالہ سے ان کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ بنگال گورنمنٹ کے بار کو ہلکا کیا جائے بلکہ ایک اسلامی صوبہ بنانا تھا جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو۔"[1]

حکومتِ برطانیہ، وائسرائے ہندوستان اور انگریز کو مسلمانوں سے کیسی ہمدردی تھی؟ اور مسلمانوں ہی کی کیوں؟ اسلام کی کیسی خیر خواہی تھی کہ وہ ایک الگ اسلامی صوبہ بنانا چاہتے تھے۔ جو کام مسلم لیگ نے ۱۹۴۷ء میں پورا کیا، برطانوی حکومت اور اس کے وائسرائے نے پچاس سال پہلے ہی اس کی ابتدا کر دی تھی۔ مگر کچھ افراد اور جماعتیں ایسی تھیں جنہیں برطانوی حکومت کی "ڈیوائڈ اینڈ رول" کی پالیسی سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ انہی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، اُسی

---

[1] مولوی طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۳۱۵

زمانے میں کلکتہ سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار نے کرزن کی اس تجویز کے مندرجہ ذیل مقاصد بیان کیے تھے:

(۱) بنگالیوں کی اجتماعی قوت کو کمزور کرنا۔

(۲) کلکتہ کی سیاسی برتری کو گرانا۔

(۳) مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی طاقت کو اس لئے بڑھانا تاکہ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا جاسکے۔[۱]

بہرحال ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگالہ کا اعلان ہو ہی گیا۔ مگر اس کے خلاف بنگالیوں نے وسیع پیمانے پر ولایتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کی اس وقت اگرچہ نواب زادہ عتیق اللہ خاں برادر حقیقی نواب سلیم اللہ خاں اور سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ کی طرف سے اس کے سکریٹری نواب امیر حسن خاں سی۔ آئی۔ ای نے تقسیم بنگالہ سے اختلاف کا اظہار کیا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ جب عام مسلمانوں کو یہ سمجھایا گیا کہ ان کی عظمت رفتہ واپس آجائے گی تو انھوں نے وہ سب کیا جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔[۲]

ٹھیک پچاس برس بعد بھی مسلمانوں کو یہی یقین دلایا گیا لیکن اب سامراجی سیاست کا زور کام کر چکا تھا۔ اور اب اسلامی صوبے سے آگے بڑھ کر اسلامی ملک کا نعرہ مسلمانوں کو دیا گیا۔ علاوہ ازیں اس مرتبہ مسلمانوں نے وہ سب کچھ بھی کیا جو کرنا چاہئے تھا اور وہ بھی کیا جو نہ کرنا چاہیے تھا۔ مختصر یہ کہ تقسیم بنگالہ کا کام پورا ہو چکا تو کارروائی آگے بڑھائی گئی۔ چند ہی مہینوں بعد:

"۱۸ جولائی ۱۹۰۶ء کو نواب حاجی اسماعیل خاں صاحب نے جو نینی تال میں تھے اور کام رس تھے، نواب محسن الملک بہادر آنریری سکریٹری کالج علی گڈھ کو ایک مسودہ تیار کر کے بھیجا کہ مسلمان بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ عام طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں علی گڈھ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ نے جو چھٹی

[۱] روشن مستقبل، ص ۳۱۵ [۲] روشن مستقبل، ص ۳۱۵

۱۰ راگست ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک مرحوم کو لکھی اور جو طبع ہو کر ممبران وفد کے پاس بھیجی گئی اس کے خلاصے سے معلوم ہوگا کہ علی گڈھ کالج کے پرنسپل تمام سیاسی جزئیات میں مسلمانوں کی کس طرح رہنمائی کیا کرتے تھے اور وہ علی گڈھ میں بمنزلہ گورنمنٹ کے ریزیڈنٹ کے ہوتے تھے۔ چٹھی کا خلاصہ یہ ہے جس کا ایک ایک لفظ توجہ کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہے: "کرنل ڈنلپ اسمتھ پرائیوٹ سکریٹری وائسرائے ہند اب مجھے لکھتے ہیں کہ حضور وائسرائے ہند مسلمانوں کا وفد منظور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور مجھے ہدایت کرتے ہیں کہ اس کے لئے ایک باضابطہ درخواست بھیجی جائے۔ اس کے متعلق حسب ذیل امور غور طلب ہیں۔ اوّل درخواست بھیجنے کا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک یہ کافی ہوگا کہ مسلمانوں کے کچھ نمایندے، اگرچہ ان کا انتخاب نہ ہوا ہو، درخواست پر دستخط کریں۔ دوسرا مسئلہ ممبران وفد کا ہے۔ یہ لوگ جملہ صوبجات کے نمایندہ ہوں۔ تیسرا مسئلہ ایڈریس کے مضمون کا ہے۔ اس کی نسبت یہ ہے کہ ایڈریس میں وفاداری کا اظہار کیا جائے۔ اس امر کا شکریہ ادا کیا جائے کہ طے شدہ پالیسی کے مطابق حکومت خود اختیاری کی طرف قدم اٹھایا جانے والا ہے جس کی رو سے ہندوستانیوں کے لئے عہدوں کے دروازے کھول دئے جائیں گے مگر اس سے یہ اندیشہ ظاہر کیا جائے کہ طریقۂ انتخاب جاری کرنے سے مسلمان اقلیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ امید ظاہر کی جائے کہ نامزدگی کا طریقہ جاری کرنے یا مذہبی عقائد کی بنیاد پر نیابت دینے میں مسلمانوں کی رائے کو مناسب اہمیت دی جائے گی۔ اس رائے کا اظہار کیا جائے کہ ہندوستان جیسے ملک میں یہ ضروری ہے کہ زمینداروں کی رائے کو اہمیت دی جائے۔ ذاتی طور پر میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی سب سے زیادہ عقلمندی اس بات میں ہوگی کہ وہ نامزدگی کے طریقے کی تائید کریں کیوں کہ ابھی انتخاب کا وقت نہیں آیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے لئے نہایت مشکل ہوگا کہ طریقۂ انتخاب جاری ہونے میں انھیں مناسب حصہ مل سکے۔ مگر میں اس تمام کارروائی میں پردے کے پیچھے رہنا چاہتا ہوں اور یہ تحریک تمہاری طرف سے ہونی چاہئے مگر آپ واقف ہیں کہ مسلمانوں کے فوائد کا میں کس قدر دل سے خواہاں ہوں اور اس کے لئے میں

نہایت خوشی سے ہر قسم کی امداد کروں گا۔ میں تمھارے لئے ایڈریس تیار کرنے یا اس پر تنقید کرنے کا کام کر سکتا ہوں۔ اگر وہ بمبئی میں تیار کی جائے تو میں اس کا مسودہ دیکھ سکتا ہوں کیوں کہ مجھے عمدہ الفاظ میں استدعا کرنے کا فن آتا ہے، مگر نواب صاحب! یاد رکھیے، اگر تھوڑے عرصے میں کوئی با اثر اور زبردست تحریک پیدا کرنی ہے تو ہمیں فی الواقع بہت جلدی کرنی چاہیے۔"[1]

پرنسپل علی گڈھ کالج کی اس اسکیم میں چند اہم باتیں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ انگریز اور ان کی حکومت ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی ملازمتیں، عہدے، نیابتیں اور ممبریاں دینا چاہتے ہیں اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ مذہبی عقائد کی بنا پر۔ اس اخلاص اور شفقت کی انتہا ملاحظہ کیجئے کہ یہ ساری مہربانیاں اور عطایا بالکل خاموشی اور پردے کے پیچھے سے ہوں گی جن کے بدلے میں کچھ عہد، وفاداریاں، انتخابات کی مخالفت اور مسلمانوں کے حقوق کے مطالبے اور تحریکوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئیں۔ آخر کار ایڈریس (درخواست) تیار ہوا۔ سربرآوردہ اور چیدہ مسلمانوں کے دستخط لئے گئے۔ لوگوں کو ساری اسکیم پڑھائی گئی، انتخاب و الکشن کی مخالفت سکھلائی گئی۔ مذہبی عقائد کی بنیادوں پر نامزدگیوں کے مفادات بتلائے گئے اور وفد بنایا گیا، آخری مرحلہ وفد کی لیڈری کا تھا اس کے لئے نظر انتخاب مسلمانوں کے سب سے بڑے ہمدرد اور حکومت کے سب سے بڑے وفادار سر آغا خاں کے علاوہ کس پر پڑ سکتی تھی، چنانچہ ستم رسیدہ اور مفلوک الحال مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے آپ کو لندن سے شملہ بلایا گیا۔ وفد کی اہمیت اور شان ملاحظہ کیجئے:

"اس وفد کی خبروں کا ہندوستان سے انگلستان تک یہ انتظام کیا گیا تھا کہ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا جاتا ہے اور اسی تاریخ کو لندن ٹائمز میں کئی کالموں کا ایک مضمون شائع ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی عقلمندی کی تعریف کی جاتی ہے کہ وہ یورپ کے نمونہ کی نیابتی مجلسوں (الکشن) کے

---

[1] روشن مستقبل۔ ص ۳۱۹

بھی فریفتہ نہ تھے۔ ہندوستان میں انگلستان کی طرح ایک قوم نہیں ہے، وہاں مختلف مذاہب ہیں:

"پھر دوسرے روز ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ٹائمز آف لندن میں ایک طویل مضمون شائع ہوتا ہے جس میں بنگال کے شورش پسند ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے اعتدال کی تعریف کی جاتی ہے کہ مسلمان سیاسی زندگی کے اہل معلوم ہوتے ہیں۔

انگلینڈ کے اخبار ویسٹرن پریس برسٹل میں لکھا گیا کہ اس وفد میں وہ مضبوط اور جنگجو اور دلاور فاتحین ہند قوموں کے لوگ تھے جو کانگریس میں تقریر کرنے والوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور انھیں کم مرتبہ سمجھتے ہیں وفد نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ گورنمنٹ کے لئے بہتر ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کی چیخ وپکار کی طرف زیادہ توجہ نہ کرے جو اپنی چرب زبانی اور ذاتی دعووں کی وجہ سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں۔ مسلمان ہندوؤں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کسی ایسی چیز کا وجود یہاں نہیں ہے جسے ہندوستانی قوم کہہ سکیں اور نہ ایسی چیز کا وجود ہوسکتا ہے۔"[1]

"سر آغاخان، نواب محسن الملک، پرنسپل آرچ بولڈ اور سب سے زیادہ لارڈ کرزن وائسرائے نے مسلمانوں کی کیسی خدمت کی۔ ایک ہی دن میں اس غدار اور قابل گردن زدنی قوم کو اس درجہ بام عروج پر پہنچا دیا کہ یہ بہادر، جنگجو، عقلمند، سیاسی زندگی کی اہل اور فاتح ہند قوم کہلائے جانے کی مستحق ہوگئی۔ خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ انگریز قوم اور حکومت برطانیہ کیسی کیسی نوازشیں، عنایتیں اور دلداریاں مسلم قوم اور اسلام کی کر رہی ہے اور بدلے میں صرف یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک سبق دل سے یاد کرلیں۔ ہندوستان میں ایک قوم نہیں ہے، یہاں مختلف قومیں رہتی ہیں۔ نہ یہاں ایک قوم ہے نہ آئندہ کبھی رہ سکتی ہے۔

اس درجہ اور اس معیار تک مسلمانوں کو عقلمند، سیاسی اور سمجھ دار بنا لینے

[1] روشن مستقبل، ص ۳۲۵ و ص ۳۲۶

کے بعد ان کے لئے ایک سیاسی انجمن اور پلیٹ فارم بنانے کی بھی فوری ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ ڈھاکہ میں منعقد ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ صدارت کے لئے اپنی مسلم قوم کے سب سے بڑے خیر خواہ اور گورنمنٹ برطانیہ کے سب سے مخلص وفادار سر آغا خاں سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہی آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ہوئے اور نواب وقار الملک سکریٹری منتخب کئے گئے۔ مسلم لیگ کے قیام کی خبریں جب انگلستان پہنچیں تو وہاں کے اخبار ٹائمز نے بقول سر سید رضا علی پریزیڈنٹ مسلم لیگ اجلاس بمبئی نے اس بات پر بغلیں بجائیں کہ مسلمانوں کی ایک مضبوط سیاسی انجمن قائم ہو جانے کے بعد اب ہندوستانیوں میں صلح باقی نہ رہے گی۔[1]

اس عظیم الشان کامیابی کے بعد نواب وقار الملک نے علی گڈھ کے طلبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی اور جس میں مسلمانوں کی سیاسی پالیسی اور آئندہ پروگرام کی تفصیل بیان کی اس کا کسی قدر حصہ ہم پیچھے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں مگر موضوع کی وضاحت کے لئے اس موقع وہ تقریر کچھ اور اضافے کے ساتھ دیکھ لینی چاہیے:

"ہندوستان میں ہماری تعداد بہ مقابلہ دوسری قوموں کے ایک خمس ہے۔ اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا۔ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا۔ اگر کوئی تدبیر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے۔ ہمارے حقوق کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب ہم گورنمنٹ برطانیہ کی حفاظت پر کمربستہ رہیں۔ ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم و ملزوم ہیں۔ انگریزوں کے بغیر ہم اس قوت و آسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر مسلمان دل سے

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل

انگریزوں کے ساتھ ہیں تو انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اپنے تئیں مثل ایک فوج کے تصور کریں اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کریں اور اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہیں۔ اور گورنمنٹ سے اپنے حقوق نہایت ادب اور متانت کے ساتھ طلب کریں نہ کہ اس طریقے سے جس پر ہمارے ابنائے وطن عامل ہے۔ اس سے میری مراد ایجی ٹیشن کا طریقہ ہے اس سلطنت کی حمایت کرنا تمھارا قومی فرض ہے۔ تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو۔ تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمھارے سر پر لہرا رہا ہے۔ تم فوج برطانیہ پر اگر ضرورت پڑے تو اپنی جانیں نثار کردو۔ اور انگریزی فوج کے ساتھ مل کر اسکے دشمنوں کے ساتھ کلاّ بہ کلاّ لڑو۔ تب تم اپنی قوم کیلئے باعث فخر ہوگے اور آئندہ نسلیں تمھاری شکرگزار ہوں گی اور تمھارا نام ہندوستان کی انگریزی حکومت کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائیگا۔"[1]

مسلم لیگ کے مذکورہ بالا مقاصد ملک کے مخلصین، علماء اور حریت پسند طبقے کے لئے قابلِ قبول نہیں تھے۔ مولینا شبلی نعمانی نے اس کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا وہ قابلِ توجہ ہے:

"ہم کو اپنا راستہ خود متعین کرنا چاہیئے۔ ہم کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ ہماری ضروریات ہندوؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی، اس لئے ہم کو ایک جدا پولیٹکل اسٹیج کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے اور وہ مسلم لیگ ہے۔ یہ عجیب الخلقت چیز کیا ہے؟ کیا یہ پالٹیکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں۔ اینٹی کانگریس ہے؟ نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈس ہے؟ ہاں سوانگ تو کچھ اسی قسم کا ہے۔

مسلم لیگ کا نظام ترکیبی کیا ہے؟ اور کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ سب سے پہلے اس کو دولت وجاہ کی تلاش ہے۔ اس کو اپنے صدر انجمن کے لئے، نیابت صدر کے

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام۔ ج ۲۔ ص ۱۵۵

لئے، سکریٹری شپ کے لئے، ارکان کے لئے، اضلاع کے عہدہ داران کے لئے وہ
مہرے درکار ہیں جن پر طلائی رنگ ہو۔ لیکن پولیٹیکل بساط میں ان مہروں کی کیا
قدر ہے؟ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار، ایک حاکم ایک دولت مند اپنی
فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے۔ ہندوؤں کے پاس زمینداری، دولت اور
خطاب کی کمی نہیں ہے۔ لیکن کیا انھوں نے تیس برس کی طویل مدت میں کسی بڑے
زمیندار یا تعلقدار کو پریزیڈنسی کا صدر نشین کیا؟ کیا ان کے پریزیڈنٹوں میں کسی کا
سر خطاب کے تاج سے آراستہ ہے؟[1]

مولینا شبلی نعمانی کے بارے میں یاد رکھیئے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو باوجود اپنے علم و فضل کے اُسی جماعت میں شریک تھے جو علی گڈھ سے برطانیہ کی وفاداری کی تبلیغ کر رہی تھی۔ سرسید کے دست راست بھی تھے اور ان کی تحریک کے سرگرم رکن بھی تھے، مگر باوجود اس کے مسلم لیگ کی ترکیب، تاسیس اور مقاصد کے بارے میں اپنے اختلافات کو نہ دبا سکے۔ اس پورے قصے کو مولینا ظفر علی خاں صاحب نے بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس موقع پر اس کا تذکرہ کچھ نہیں تو دلچسپی کا سبب تو ضرور ہی ہوگا:

سنتے ہیں کہ کرزن کے اشارے پہ سر آغا ظلمت کدۂ ہند کو آباد کریں گے
خسرو سے چھڑائیں گے اُدھر دامنِ شیریں شیریں کو اِدھر مائلِ فرہاد کریں گے
کہہ دو یہ سر آغا سے کہ اسلام کے فرزند خود اپنے خدا سے طلب امداد کریں گے
ہرگز نہ گدائی کے لئے جائیں گے لندن ترک آج سے یہ شیوۂ معتاد کریں گے
اللہ کے دربار سے جو فیصلہ ہوگا انگریز اُسی فیصلے پر صاد کریں گے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور تمام حُرّیت پسند افراد اور جماعتیں حکومت برطانیہ کے ان اطاعت گزار اور وفادار لوگوں اور انجمنوں کو مسلم قوم اور ہندوستان کے لئے ناقابل اعتبار اور ضرر رساں یقین کرتے تھے اس لئے کہ ان کی ساری سرگرمیوں اور پالیسیوں کا سارا مقصد صرف برطانیہ سے وفاداری اور فرماں برداری ہوتی تھی۔ حضرت مسلمانوں سے پوچھتے ہیں:

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام۔ ج ۲۔ ص ۱۵۳۔ بحوالۂ حیات شبلی

"(۱) کیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل میں نوابین، راجہ، مہاراجہ، سرکاری خطاب یافتگان، زمینداران، تعلقداران، پنشنرس، اور سرکار پرستوں کا غلبہ نہیں ہے؟

(۲) کیا یہ لوگ ہمیشہ سے سرکار پرست نہیں رہے ہیں؟

(۳) کیا لیگ نے انگریزوں ہی کی خاتوں کے پیٹ سے جنم نہیں لیا ہے؟

(۴) کیا لیگ کے بانی کمان اور اعلیٰ عہدہ داروں کو اسلام اور مذہب سے قریب کا تو کیا دور کا بھی کبھی واسطہ رہا ہے؟

(۵) کیا مسلم لیگ کے زعماء میں کلیت یا اکثریت مخلص اور غیور لوگوں کی ہے یا جاہ پرستوں اور وزارت و اقتدار پسندوں کی ہے؟"[۱]

ان سوالات کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی جانب سے مختلف بیانات اور اس کی پالیسی کے اعلانات کا تذکرہ فرماتے ہیں:

"زمیندار مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۴۱ء کے صفحہ ۹ کالم ۱ کو دیکھئے جس میں فرماتے ہیں ہم بہانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند اسلامی قومیت ہی نہیں بلکہ اس ملت عظیم کا ایک جزو ہیں جو بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی ہے۔ ترکی بھی اسی ملت کا ایک حصہ ہے، افغانستان و عراق بھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس جنگ میں یہ طاقتیں برطانیہ کے ساتھ ہیں اور ہم ہندوستانی مسلمان بھی (خواہ باہمی ہیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو) مگر اس وقت انگریزوں کے ساتھ ہیں اور ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم مسلم لیگی بھی اس ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح برطانیہ ہی کی فتح چاہتے ہیں اور انگلستان کو مظفر و منصور دیکھنا چاہتے ہیں۔"[۲]

پیچھے گزر چکا ہے اور آگے بھی اس کی تفاصیل آرہی ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کی جماعت اور ان کے متبعین کسی بھی عنوان سے انگریزوں، برطانوی سامراج اور ہندوستان پر غیر ملکی حکومت کو فاتح اور مظفر و منصور دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور دینی و مذہبی نکتۂ نظر سے ان کے ساتھ موالات کو حرام کہتے تھے۔ ایک دوسرا اعتراض حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اور جمعیۃ علما

[۱] مکتوبات، ج ۲، ص ۱۴۴ [۲] مکتوبات، ج ۲، ص ۱۵۲

کو یہ تھا کہ عام مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے مسلم لیگ اسلامی حکومت کا نام لیتی ہے مگر قانونی اور رسمی بیانات میں یہ اعلان نہیں ملتا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی۔ یہ حضرات کہتے تھے کہ پاکستان بنانے والے عناصر میں قادیانی' آغا خانی' بوہری' اثنا عشری اور دوسرے بہت سے عقیدے جماعتیں اور افراد شامل ہیں۔ ایسی صورت میں کسی ایک عقیدے کی حکومت اور دستور بنانا کس طرح ممکن ہو سکے گا اپنے اس خیال کا اظہار فرماتے ہوئے حضرت فرماتے ہیں :

"کراچی میں مسٹر جناح نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں ہندو مسلم اخبارات کے ایڈیٹرس شریک تھے۔ ایک اخبار نویس نے جناح صاحب سے دریافت کیا کہ وہ پاکستان کی ایسی تعریف کریں جس سے اس کا صحیح نقشہ واضح ہو سکے۔ جناح صاحب نے جواب دیا کہ مجھے اس وضاحت کے لئے کچھ وقت درکار ہے تاکہ میں پوری طرح اس کا مطالعہ کر سکوں۔ لیکن پریس نمائندوں کی طرف سے مسلسل مطالبہ رہا کہ وہ کچھ بتائیں کہ پاکستان کیا چیز ہوگی۔ جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو جناح صاحب نے کہا کہ جو رسالے اور مضامین اب تک پاکستان کی تائید میں شائع ہوئے ہیں ان کو پڑھ لو اس پر ایک مسلمان اخبار نویس نے کہا کہ میں نے وہ سب پڑھے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ سن کر جناح صاحب ناراض ہو گئے' اور کہا کہ وہ اس مسئلے پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔"[1]

پاکستان کا نقشہ کیا ہوگا؟ پاکستان کیا چیز ہوگی؟ اس کا دستور کیا ہوگا؟ اگر اس کا صاف اور سادہ جواب دینا منظور ہو تو یہ ایسا الجھا ہوا سوال نہیں ہے جس کے لئے وقت درکار ہو یا ناراضی کی صورت پیش آئے۔ دو لفظوں میں جواب دے دیجئے۔ جمہوری حکومت ہوگی' ڈکٹیٹر شپ ہوگی یا یہ کہ اسلامی حکومت ہوگی۔ مگر شبہ اور اعتراض کی بات یہ ہی تھی کہ اس قسم کے سوالوں کے جواب میں اسلامی حکومت کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر جب ذمے دار حضرات کی طرف سے صراحتاً اسلامی حکومت کی نفی ہو جائے تو پھر یقین اور اس

---

[1] حضرت مدنیؒ: پاکستان کیا ہے۔

کے نتیجے میں مخالفت میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔ یہ صراحت بھی ملاحظہ فرمائیے:

"شہباز لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء لکھتا ہے کہ مسلم لیگ کے ذمے دار سرکاری ترجمان "ڈان" کا بیان ہے کہ مسٹر جناح نے ہمیشہ کہا ہے کہ پاکستان کوئی دینی و مذہبی حکومت ہرگز نہیں ہوگی بلکہ خالصتاً ایک دُنیوی حکومت ہوگی۔ اور مسلمانوں کی حکومتِ الٰہیہ سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ "نمائندہ نیوز کرانیکل کو بیان دیتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا کہ پاکستان کی حکومت یورپین جمہوریت کے طرز پر ہوگی۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادی اور مردم شماری کی حیثیت سے رائے شماری کر کے فیصلہ صادر کریں گے۔ اور وزارتوں اور لیجسلیچر میں سب ذمے دار ہوں گے۔"[۱]

مسلم لیگ کی تحریروں، تقریروں اور بیانات میں اسلام کا نام ضرور لیا جاتا تھا مگر اس سے یہ صراحت نہیں ہوتی تھی کہ اس کا مقصد اور پروگرام اسلامی حکومت کا قیام ہے بلکہ بیان اس طرح دیا جاتا تھا کہ اسے ہے اور نہیں دونوں طرف استعمال کیا جاسکے۔ حضرت نے جناح صاحب کی ایک تقریر نقل کی ہے اُس سے ایسی ہی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جناح صاحب فرماتے ہیں:

"ہمارے لئے پاکستان کے معنی ہیں ہمارا تحفظ، ہماری تجارت اور ہمارا مستقبل۔ اور یہی واحد ذریعہ ہے جس سے ہماری آزادی متعین ہوسکتی ہے اور ہماری عزت اور اسلام کی شوکت برقرار رہ سکتی ہے۔

پاکستان کا دستور ملت اور عوام ہی بنا سکتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو تیار کریں اور اس کا اہتمام کریں کہ آپ ایسا دستور بنائیں جو آپ کے دلوں کی تمنا کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں بڑی غلط فہمی ہے اور بڑا اثر پیدا کر دیا گیا ہے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا وہ (پاکستان) اسلامی حکومت ہوگی؟ کیا یہ بے معنی سوال نہیں ہے؟ کیا ایسا سوال کرنا خود اپنے خلاف ملامت کا ووٹ پاس کرنا نہیں ہے؟"[۲]

---

[۱] حضرت مدنیؒ۔ پاکستان کیا ہے؟ مطبوعہ دہلی

[۲] ایضاً

سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بھی حضرت کو یہ اعتراض تھا کہ پاکستان خود مختار اور آزاد حیثیت برقرار نہیں رکھ سکے گا اور اسے اپنی بقا کے لئے غیر ملکوں اور خصوصاً اسلام دشمن طاقتوں کا دست نگر ہونا پڑے گا۔ اس کی خارجہ پالیسی تمام تر سامراجی ملکوں کے زیر اثر رہے گی۔ اس بارے میں حضرت کا ایک بیان حسب نمونہ کے طور پر درج ذیل ہے:

> غیر مسلموں کی منظم اور موثر اقلیت کے ساتھ مقابلہ وغیرہ پاکستان کے وہ داخلی مسائل ہوں گے جن سے حکومت عہدہ برآ نہ ہو سکے گی اور اپنی حالت کو سنبھالنے کے لئے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ مزید برآں یہ حکومت (پاکستان) اپنے وسائل کی تنگی اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کر سکے گی اس ملک کے دفاع کو دولت مشترکہ برطانیہ کے دفاع سے وابستہ کرنا پڑے گا۔ یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی۔ اور اس طرح یہ نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ کی سیاسی و اقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنی کمزوری اور بدحالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہوگی اور نہ یہ حکومت اسلامی دنیا میں کوئی موثر کردار ادا کر سکے گی بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا اور اس طرح ہندوستان سے برطانوی تسلط کے خاتمے کے باوجود براعظم پر اس کا اقتدار قائم رہے گا۔[1]

اس موقع پر ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اقتدار، اختیار اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے آج جو حیثیت و منصب امریکہ کو حاصل ہے، جس وقت حضرت مذکورہ بالا گفتگو فرما رہے ہیں

[1] مکتوبات شیخ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۲

یہ منصب برطانیہ کے پاس تھا۔ اس لئے اگر یہ حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ حضرتؒ کا مفہوم کسی خاص ملک کے بجائے پاکستان پر مغربی سامراج کا اقتدار و تسلط ہے اور مذکورہ اقتباس میں جہاں جہاں برطانیہ کا نام آیا ہے وہاں امریکہ پڑھ لیا جائے تو حضرتؒ کا اعتراض اور تنقید واضح ہوجاتی ہے۔ دینی اور مذہبی پہلو کے علاوہ یہ سیاسی اور اقتصادی کمزوریاں تھیں جن کو حضرتؒ پورے ملک ایشیا اور عالم اسلام کے لئے ایک خطرہ قرار دیتے تھے۔ حضرتؒ کا خیال تھا کہ سرمایہ دار طاقتیں اور مغربی استعمار و سامراج پاکستان کے راستے سے ایشیا کو اپنے اقتدار میں رکھنے کے لئے اڈا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ، پاکستان اور اس کے لیڈروں سے حضرت کا اختلاف انہی بنیادوں پر مبنی تھا۔ ورنہ اگر دیانت، امانت اور وضاحت کے ساتھ ذمے داران مسلم لیگ یہ اعلان کرتے اور اسے ثابت کرتے کہ پاکستان کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام اور عالم اسلامی کی ترقی و استحکام ہے تو حضرتؒ پورے عزم و ارادہ کے ساتھ اس تحریک میں شرکت کے لئے تیار تھے۔ بلکہ ایک بار اپنی صفائی قلب اور نیک نیتی کی بنا پر اس قسم کی یقین دہانیوں کے نتیجے میں مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ پورے جوش عمل کے ساتھ شریک بھی ہو چکے تھے۔ حضرت کے خلوص نیت کا اندازہ انہی کے الفاظ سے کیجئے:

> "اس زمانے میں پاکستان کی اسکیم زبان زد خاص و عام ہے۔ اگر اس کا مطلب حکومت علی منہاج النبوۃ ہے جس میں تمام احکام اسلامی، قوانین حدود و قصاص وغیرہ جاری ہوں، جن کو مسلم اکثریت والے صوبوں میں قائم کرنا ہے تو ماشاء اللہ نہایت مبارک اسکیم ہے۔ اس سے دنیا کا کوئی بھی مسلمان اختلاف نہیں کر سکتا نہ کوئی گفتگو کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا مقصد انگریزی حکومت (کی مقاصد برآری) کے لئے کوئی ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کو نام مسلم حکومت کا دیا جا سکے تو میرے نزدیک یہ اسکیم محض بزدلانہ اور سفیہانہ ہے۔"[1]

اسی ضمن میں حضرت کا ایک بڑا اعتراض، اختلاف اور خطرے کا اظہار یہ بھی تھا کہ

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء جونپور ۱۹۴۵ء بحوالہ ماثر شیخ الاسلام۔ ص ۲۶۱

اگر ہندوستان میں مسلم اقلیت کو غیر مسلم اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو ہندو یہاں ہندوستان میں رام راج، ہندو راشٹر اور ہندو مذہب کی حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کریںگے اور مسلمانوں کو مجبور کریں گے کہ وہ غیر اسلامی نظریات قبول کریں۔ حضرت کی ایک اور تقریر سنیے،

> "بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو یہ دھوکا دیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں خالص اسلامی حکومت بطرز خلفائے راشدین قائم کی جائے گی۔ یہ خواب تو نہایت شیریں ہے۔ کاش ایسا ہو۔ اگر ذمے داران مسلم لیگ اس کا اطمینان دلادیں تو ہم ارکین جمعیت سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ لوگ جن کو دین اور مذہب اسلام اور شعائر اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ نہ صورت اسلامی ہے نہ سیرت۔ وہ اسلامی حکومت قائم کریں گے اور اس کو بطرز خلفائے راشدین چلائیں گے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو کیا مسلم اقلیت والے صوبوں میں اس کا رد عمل نہ ہوگا کہ وہاں خالص ہندو راج اور رام راج قائم کیا جائے اور مسلمانوں کو ہندو بنانے کے سامان کر دئے جائیں۔"[1]

ایک خاص اور تاریخی حقیقت اور بھی قابلِ توجہ ہے اس کو ذہن نشین کر لیجیے۔ حضرت رح ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعصب کو ہندوستانی عوام کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی فرقہ پرستی اور تعصب کے خلاف بھی آواز اٹھاتے تھے اور ہندو فرقہ پروری کے خلاف بھی سینہ سپر ہوتے تھے انھیں ہندو فرقہ پرستی سے ایسی عداوت تھی جو شاید سیاسی افراد اور جماعتوں کو نہ ہوگی ملاحظہ ہو:

> "مولانا حسین احمد مدنی نے مولانا شوکت علی کو غالباً ۱۹۳۶ء میں حسب ذیل خط لکھا میں آں جناب کی توجہ ایک مسئلہ پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی، سیاسی اور وطنی نصب العین ہے اور ہر حیثیت سے ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم اپنے مذہب اور قوم کو ضروری

[1] خطبۂ صدارت سہارنپور جمعیۃ کانفرنس۔ مئی ۱۹۴۵ء

سمجھتے ہیں۔ بلکہ آزادی کو مذہب و قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہوجائے اور مسلمان فنا ہوجائیں تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ؟ جو مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں ہیں اور اکثریت بھی غیر معمولی ہے تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے یہی فرما رہے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقے کی سرزمین نہیں ہے یہاں جو بھی راج ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کئی کروڑ ہندو رضا کاروں کی ضرورت ہے۔ (خطبۂ صدارت ڈاکٹر مونجے سندھ) جو مظالم آئے دن دفتروں، شہروں اور ریاستوں میں کئے جارہے ہیں اور جس عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب ہندو دیوتا گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا اس کی بنا پر ہم کسی طرح بھی ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کرسکتے۔ بلاشبہ متحدہ قومیت عمدہ اور اعلیٰ چیز ہے اور حصول آزادی کے لئے کارآمد نسخہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہندو اکثریت نہایت تنگ دل ہے اور پھر ہم سے بدرجہا زیادہ منظم اور تعلیم یافتہ ہے۔ تعصب اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس حالت میں اقلیت، بالخصوص مسلم اقلیت کس طرح مطمئن ہوسکتی ہے۔ (بحوالہ سیاست ملیہ از محمد امین زبیری۔ ص ۲۰-۲۲)"[1]

یہ حضرت رحمۃ اللہ کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ اسی مسئلے پر مولینا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

"ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں ہندوؤں کی عام ذہنیت ہمیشہ سے تنگ نظری سے ملوث ہے اور وہ ناپ تول کی زندگی کے عادی ہونے کی وجہ سے سیاسیات میں بھی سخت تنگ دل واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں قوم پرور مسلمانوں اور فرقہ پرست مسلمانوں کے درمیان نیز پاکستانی اور غیر پاکستانی مسلمانوں کے درمیان کبھی بھی دو رائیں نہیں رہی ہیں۔"[2]

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ مولانا محمد علی کی یاد میں۔ ص ۲۷۶

[2] مولانا حفظ الرحمٰن۔ نظریۂ پاکستان پر ایک نظر

تعصب، تنگ نظری اور مسلم دشمنی کے جس جذبے اور ذہن سے فرقہ پرست مسلمانوں کو خطرہ اور اختلاف تھا بالکل وہی شبہات اور اعتراضات حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور قوم پرور مسلمانوں کو بھی تھے۔ فرق صرف سیاسی مزاج اور مسئلے کے حل کی تدابیر میں تھا۔ حضرت کی رائے یہ تھی کہ سارے ہندو اس ذہنیت سے مسموم نہیں ہیں۔ کچھ افراد، جماعتیں اور گروہ اپنے ذاتی مفادات کے لئے مسلم دشمنی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ اگر مسلمان بھی یہی ذہنیت اختیار کریں گے تو زہر رگ وپے میں سرایت کرتا چلا جائے گا۔ دوسرے حضرتؒ کی سیاست یہ بھی تھی کہ ہندو مسلم مسائل کا حل نفرت وعداوت میں نہیں مصالحت ومفاہمت میں اور تقسیم وافتراق میں نہیں بلکہ اتحاد واتفاق میں ہے۔ حضرتؒ کا خیال تھا کہ برعظیم کے مسلمان اگر افتراق وتقسیم کا شکار ہو گئے تو ان کی جڑیں ہل جائیں گی اور متحد ومربوط رہے تو کبھی کسی دشمن کی یہ مجال نہ ہو سکے گی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارا فرض ہے کہ ہم معاملات کو محض ہندو دشمنی ہی کی عینک سے نہ دیکھیں بلکہ پاکستان کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر کے فیصلہ کریں کہ کیا یہ پاکستانی حکومتیں ہمارے لئے باعثِ رحمت ہو سکیں گی، اپنے تحفظ کے قابل ہو سکیں گی، اور بین الاقوامی سیاست میں اپنا وقار قائم رکھ سکیں گی یا نہیں؟ دانائی کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے لئے مابقی زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کر کے ان کو متحدہ ہندوستانی وفاق میں شامل رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ملت اسلامیہ کی اس طرح تنظیم اور اصلاح کی جائے کہ وہ زندہ اور طاقتور قوم بن جائے۔"[1]

اتفاق واتحاد کا یہ پلان محض زبانی اور ذہنی نظریے تک محدود نہیں تھا بلکہ حضرتؒ نے اس کے دستور کے لئے ایک کانسٹی ٹیوشنل فارمولا پیش کیا تھا جس کو قوم پرور مسلمانوں نے مدنی فارمولا کے نام سے ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس فارمولے پر ایک اجمالی نظر

---

[1] حضرت مدنی نئی زندگی کتاب دوم، ص ۱۰، بحوالہ شیخ الاسلام ایک سیاسی مطالعہ۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ڈالنی ضروری ہے مگر اس سے پہلے حضرت مولینا حفظ الرحمٰن کا تعارف پڑھ لیجئے :

"مسلمانوں کے حقوق کے سلسلے میں قوم پرور مسلمان اور جمعیۃ علماء ہند کبھی ان کمیونل مسلمانوں سے پیچھے نہیں رہی ہے۔ اور جب کبھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ایسی تجاویز مرتب کیں۔ جن میں مسلمانوں کی بہتر سے بہتر حفاظت ہوتی ہے اور وہ ہندؤں کے مساوی ہوکر ہندوستان کی حکومت میں مساوی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے سہارن پور کے ۱۹۴۱ء والے فارمولے میں اس وقت کے پیش کردہ مسٹر جناح کے مطالبات سے زیادہ بہتر طریقے پر مسلمانوں کا معاملہ حل کیا تھا اور آج بھی جمعیۃ علماء ہند کا لاہور ریزولیشن مسلمانوں کے لئے کمیونل اور فرقہ وارانہ نکتہ نظر سے مسلم لیگ کے ریزولیشن (پاکستان) سے زیادہ مفید اور بہتر ہے۔ وہ اقوام ملک کے درمیان مذہبی اور قومی منافرت بھی نہیں پیدا کرتا اور اجنبی اقتدار کو یہ بھی موقع نہیں دیتا کہ وہ ملک کے حصے بخرے کر کے ہمیں اپنے اقتدار و استحکام کا آلۂ کار بنا لے۔"[1]

آخر میں وہ فارمولا بھی دیکھئے جو حضرتؒ نے اور قوم پرور مسلمانوں نے مسئلے کے حل کے لئے پیش کیا تھا:

"جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس بصدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ صدر جمعیۃ علماء ہند ۱۰ جنوری ۱۹۴۵ء کو دفتر جمعیۃ علماء ہند میں منعقد ہوا مجلس عاملہ نے تین دن کی بحث و تمحیص کے بعد ہندوستان کے موجودہ جمود و تعطل کو دور کرنے اور مسلمانانِ ہند کے آئینی درجے کو واضح کرنے کے لئے حسب ذیل فیصلہ کیا ہے :

(۱) ہمارا نصب العین آزادیٔ کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ اُن کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور

---

[1] مولینا حفظ الرحمٰن۔ تحریک پاکستان پر ایک نظر

تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی، وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور مرکزیت جس میں اپنی مخصوص ثقافت و تہذیب کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ ہوگی، یعنی مرکزی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ ایسی تشکیل میں باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی ایسی تجویز پر جو باہمی اتفاق سے طے ہو جائے، ممکن ہے۔

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵، مسلم ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰۔

(۲) مرکزی حکومت میں اگر بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ⅔ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں

کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف نہ ہونے میں مرکزی اکثریت مسلم ارکان کی ۳/۴ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا کوئی اور تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔[1]

یہ حضرت کے پیش کردہ فارمولے کا بنیادی خاکہ ہے۔ مکمل فارمولا اس کی تشریح در تشریح حواشی، بین السطور اور وضاحتوں کے ساتھ مل کر بنتا تھا۔ اب ان تمام تفصیلات و توضیحات سے نہ کوئی فائدہ ہے نہ اس کے اعادہ کی ضرورت ہے۔ تاہم اتنا تو تاریخی حقیقت کی حیثیت سے باقی ہی رہنا چاہیے کہ تقسیم ملک اور پاکستان کے مقابلے میں حضرت کی تجویز یہ تھی کہ برعظیم ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ نہ ہونے پائے بلکہ تنظیم اجتماع اور اصلاحات کے ذریعے اس میں روز افزوں ترقی کی کوششیں تیز تر ہوتی رہیں۔

"ایک مسلم اسکالر (عالم) کی حیثیت سے ان کا کامل یقین تھا کہ قرآن، کلام الٰہی اور حدیث کے ارشادات اور اعمال کا مجموعہ انسانی زندگی کے ہر دو پہلو کے لیے مکمل ہدایت و رہنمائی رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کلّی طور پر انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ صرف اعتقادات، عبادات اور اخلاقیات ہی کو اس کے زیر ہدایت نہ برتنا چاہیے بلکہ ان امور کو بھی، جن کا تعلق، سماج، اقتصادیات، سیاسیات اور کلچر کے معاملات سے ہے۔ روحانی اور دنیوی معاملات میں کوئی تصادم نہ ہونا چاہیے۔"[2]

یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ سیاسی، مذہبی اور تہذیبی انداز فکر تھا جس کے لئے مسلم لیگ نے حضرت کو تنقید و ملامت، سب و شتم، الزامات و اتہامات اور حملہ و ایذا رسانی کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ تفصیل ہم آیندہ صفحات میں پیش کر رہے ہیں۔

---

[1] تاریخ جمعیۃ علمائے ہند

[2] ڈاکٹر تارا چند۔ تاریخ تحریک آزادی ہند، ج ۲، ص ۴۴۶۔ مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

حضرت مولانا سیّد احمد کا وصال

حضرت رحمۃ اللہ کی تعلیم و تربیت پرورش اور پرداخت میں آپ کے بڑے بھائیوں کا بڑا ہاتھ تھا، وہی صاحبان آپ کو دیوبند لائے۔ انھوں نے ہی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی نظر کیمیائے اثر سے بہرہ ور کرایا۔ انہی کے ذریعے قطب الاقطاب مولانا رشید احمد کے دربار تک باریابی ہوئی۔ سو قسمتی سے سب سے بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب کا وصال عین عالمِ جوانی میں بہت پہلے ہو چکا تھا مگر منجھلے بھائی مولینا سید احمد صاحب ابھی تک بقیدِ حیات اور چھوٹے بھائیوں کے لئے شفقت و محبت کا گہوارہ تھے۔ یہی خاندان کی ہجرت کے محرک اور سبب تھے، انھوں ہی نے مدینہ طیبہ میں خاندان کی ذمّہ داریاں اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر حضرت کو تدریس و خدمات حدیث کے لئے فارغ رکھا تھا اور انہی کی انتھک جد وجہد سے مدرسۃ العلوم الشرعیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ قدرتی طور پر حضرت کو ان سے بہت محبت اور قربت تھی۔ رہتے تو ہندوستان میں تھے مگر ہر ہر قدم پر بڑے بھائی سے مشورہ اور اجازت لے کر ہی کسی کام میں آگے بڑھتے تھے۔ مولینا سید احمد صاحب اپنے طرز کے منفرد انسان تھے۔ عبادت ریاضت خدمت خلق اور تواضع و انکسار کے علاوہ صحیح معنوں میں زاہد انسان تھے اور ایسی زندگی کے نتیجے میں کمزوری اور امراض کا شکار رہتے تھے۔ انہی حالات میں ناسازگار واقعات اور حادثات بھی پیش آتے رہے اور مولینا کا کمزور جسم بیماریوں کی آماجگاہ بنتا گیا۔ آخر کار اگست ۱۹۴۰ء میں آخری بیماری، قلب کے عوارض کا حملہ ہوا۔ اس زمانے میں مدینہ طیبہ ایک محدود سی بستی تھی اور اس میں طبّی و ڈاکٹری سہولتیں بھی محدود ہی تھیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھائی کی بیماری اور اس کی تفصیلات کی اطلاع ملی تو بے چین ہو گئے اور فوراً مدینہ طیبہ روانگی کا ارادہ کیا مگر اس زمانے کے سفر میں اور پھر غیر ملکوں کے سمندر پار سفر میں آج کی طرح آسانیاں نہیں تھیں۔ ایک دو ماہ تو انتظامات اور کارروائیوں ہی کی نذر ہو گئے۔ مولینا سید احمد صاحب بھائی سے ملاقات کے لئے

بیتاب تھے۔ خط پہ خط اور تار پہ تار آ رہے تھے۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ مہینوں میں خط اور پندرہ بیس دن بعد تار پہنچتے تھے۔ غرض روانہ ہوتے ہوتے شوال کا مہینہ آگیا اور حضرت اپنے خاندان کے ساتھ آخر شوال ہی میں عازم سفر ہوسکے۔ ابھی کراچی ہی تک پہنچے تھے کہ اطلاع ملی کہ بھائی حسرت ملاقات دل ہی میں لئے راہی ملک بقا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل پر جو گزری ہوگی وہ تو گزری ہی مگر سفر جاری رہا۔ یہ بھی حضرت کا مخصوص مزاج اور ذوق تھا کہ شدتیں اور کلفتیں روزمرہ کے معمولات وطمانیت میں کوئی تبدیلی یا خلل نہیں پیدا کرسکتی تھیں۔ اس سفر کی مختصر سی روداد حضرت ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

> "میں ۴ ذیقعدہ کو جدہ پہنچا۔ کراچی سے عزیزم محمود کو تار دے چکا تھا۔ وہ اسی روز اپنی موٹر لاری لے کر جدہ پہنچ گئے اور کوشش کی کہ مجھ کو مع عائلہ کے کوشاں (حاجیوں کے ٹیکس) سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہ امر اس بنا پر مقبولیت کو پہنچ گیا کہ میں عرصہ دراز تک مدینہ منورہ میں رہ چکا ہوں۔ اگلے روز یعنی ۵ ذیقعدہ کو ہم مدینہ منورہ اسی لاری میں روانہ ہوگئے، ۲ ذی الحجہ تک مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ ۸ ذی الحجہ کو شب میں مکہ معظمہ پہنچنا ہوا۔ ۱۸ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر ۲۰ ذی الحجہ کو جدہ سے روانگی ہوئی آج بتاریخ ۲۸ ذی الحجہ بخیر وعافیت سب کراچی پہنچ گئے۔"[1]

مالٹا سے رہائی کے بعد یہ حضرت کا دوسرا حج تھا اور اس میں مدینہ طیبہ کے رفیق اور شاگرد رشید مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ مع اپنے خاندان کے شریک سفر تھے۔ اس سفر کی ایک خصوصیت قابل ذکر ہے کہ حضرت کے دل پر اس دوران بڑا جانکاہ صدمہ گزرا مگر جیسا کہ مذکورہ بالا تحریر سے واضح ہے کہ سفر کے دوران یا واپسی کے بعد تحریر بیان تذکرہ یا پرسش احوال کے جواب میں اس رنج و غم، عدم ملاقات یا حادثہ کا ادنیٰ اشارہ اور اظہار کسی سے کبھی نہیں فرمایا۔ پچھلے صفحات میں مولانا سید احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ گزر چکا ہے۔ (اسکنہم اللہ فسیح جناتہ)

---

[1] مکتوبات ج ۱ ص ۱۶۶

آل انڈیا جمیعۃ کانفرنس کی صدارت

دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں روز بروز بھیانک تر ہوتی جارہی تھیں۔ دنیا کے سارے ہی ملک موت کے دہانے پر کھڑے تھے۔ بڑی سلطنتیں برطانیہ، اٹلی، فرانس، جرمنی وغیرہ صدیوں کی ترقی یافتہ، آزاد اور مال دار حکومتیں تھیں بڑی بڑی جنگوں اور حملوں کو آسانی سے برداشت کرکے بھی اپنی جگہوں پر ثابت قدم تھیں ان کے مقابلے میں ہندوستان گزشتہ سو سال سے غلامی بیگار افلاس اور استحصال بالجبر کے عذاب سہتے سہتے زخموں سے چور ہوچکا تھا۔ اب اچانک جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آیا تو اس کی ہڈیوں میں گودا تک پگھل گیا۔ گاڑھے خون پسینے کی اگائی ہوئی پیداوار، چھاتی سے نکلی ہوئی معدنیات، اپنے مویشی چوپائے چرند پرند اور انسان و حیوان بجبر و کراہ دوسروں کے لئے قربان ہوتے دیکھ رہا تھا اور آہ تک کرنے سے مجبور تھا۔ کانگریس اور حریت پسند جماعتوں کے لیڈر جیل خانوں میں بند تھے۔ سبھاش چندر بوس سابق صدر کانگریس ملک بدر اور روپوش تھے۔ رنگون انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ کلکتہ جاپانیوں کی توپوں کے دہانے پر تھا۔ جاپانی ہوائی جہاز کلکتہ کے قریب تک آآکر داؤ لگا رہے تھے کہ بسم اللہ کہاں سے شروع کی جائے۔ رنگون کے بعد یہاں بھی بس صبح و شام لگی ہوئی تھی۔ کانگریس نے جنگ کے بارے میں برطانیہ کی حمایت سے صاف انکار کرکے اس کے خلاف کوئٹ انڈیا کی تحریک کا ارادہ کرلیا تھا۔ مگر مسلم لیگ نے برطانیہ کی مکمل حمایت اور ممکنہ خدمات کا وعدہ کرلیا تھا۔ "مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں قائد اعظم کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ حالات کا مطالعہ کرکے حکومت برطانیہ کو یقین دلا دیں کہ مسلمانان ہند اہتمام جنگ میں برطانیہ کی تائید اور اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔"[1] مسلم لیگ

---

[1] خواجہ رضی حیدر: قائد اعظم کے بہتّر سال، ص ۳۰۱

کا یہ اعلان اور وفاداری کی یقین دہانی واقعہ کے مطابق نہ تھی مسلمان برطانیہ کی تائید اور تعاون کے لئے تیار نہ تھے ہاں مسلم لیگ کی یہی پالیسی تھی اور اُس نے حق خدمت ادا کرنے میں پوری کوششیں صرف کیں۔ مسلم لیگ کو برطانیہ کی مکمل سرپرستی اور خوشنودی حاصل رہی لیکن حریت پسند جماعتوں اور افراد پر برطانیہ کے شدائد اور مظالم اور مقابلے میں ان کا عدم تعاون روز بروز فزوں ہوتا گیا۔ حکومت برطانیہ نے دیکھا کہ مٹھی بھر شر پرستوں کی تائید سے کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے تو ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے اعلان کیا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس کی سرکردگی میں برطانیہ کا ایک وفد ہندوستانی لیڈروں سے گفتگو کرنے کے لئے ہندوستان جانے والا ہے۔ ان حالات اور ایسی فضا میں جمعیۃ علماء ہند نے اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا کہ جنگ کے دوران ہندوستانی عوام کے الجھے ہوئے مسائل اور دھندلائے ہوئے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں کے موقف اور پالیسی کا اعلان کر سکے۔ چنانچہ ۲۰، ۲۱ اور ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس بصدارت حضرت شیخ الاسلام جانشین شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی لاہور میں منعقد ہوا۔ جمعیۃ علماء کا اجلاس؛ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت اور وہ بھی لاہور میں؛ جو حضرت رحمۃ اللہ کے مخالفین و معاندین کا مرکز تھا یہیں ڈاکٹر اقبال رہتے تھے جنھوں نے ابھی حضرت کی مخالفت میں ہجو لکھی تھی۔ یہیں پاکستان کی تجویز پیش اور پاس کی گئی تھی۔ بڑی دھمکیاں دی گئیں کہ خیریت چاہتے ہیں تو یہاں قدم نہ رکھیں۔ بڑا شور اٹھا کہ جان کا خطرہ ہے۔ حکومت کی طرف سے بھی پوری تیاری تھی کہ جنگ کے بارے میں برطانیہ کے خلاف ایک لفظ نہ بول پائیں مگر حضرت ان تمام خطرات سے بالکل بے خبر تھے یہ ان کی عادت اور طبیعت تھی کہ ایک ایک لمحہ اپنے مقاصد اور معمولات میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ تنقید، تبصرہ، مخالفت، عداوت وغیرہ کی طرف نہ صرف یہ کہ ادنیٰ توجہ نہیں کرتے تھے بلکہ اُن سے بالکل لاعلم رہتے تھے۔ اذا ھم القی بین عینیہ ھمہ ونکب عن ذکر العواقب جانبا۔ چنانچہ اجلاس کے مقررہ وقت پر مزاجی شان استغنا بے خوفی اور بے جگری کے ساتھ لاہور میں رونق افروز ہو گئے۔ یہ تفصیل مولانا محمد میاں کی زبانی سنیئے:

"اجلاس کے لئے شہر لاہور طے کیا گیا تھا جہاں چند روز مسلم لیگ کا اجلاس

عام ہوچکا تھا۔ اور گویا لاہور کے در و دیوار میں جمعیۃ علماء سے مخالفت کے کانٹے چبھ چکا تھا۔ مسئلہ متحدہ قومیت اور اقبال مرحوم کے اشعار مخالفین کے ہاتھ میں تھے اور جگہ جگہ سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں پر اشتعال انگیز زہریلے پوسٹر چسپاں تھے مگر خطرات و خدشات سے بھرے ہوئے شہر میں صدارت کے لئے وہ شیر دل رہنما منتخب ہوچکا تھا جو خندہ پیشانی اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرنے کا عادی تھا۔

خطبۂ صدارت شروع ہی ہوا تھا کہ پنڈال کی ایک جانب سے پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ جلسے کا بڑا حصہ درہم برہم ہوگیا اور اضطراب و انتشار کی لہر پنڈال کو تہ و بالا کرتی ہوئی اسٹیج تک پہنچی۔ مگر بہادر صدر بدستور اپنی جگہ پر خطبہ دے رہا تھا۔

صدر کے استقلال نے پورے مجمع کو استقلال و استقامت کی دعوت دی اور چند منٹ بعد ہیجان و اضطراب کی جگہ متانت اور سکون نے لے لی۔ پورے پنڈال پر خاموشی چھاگئی اور اطمینان کے ساتھ خطبۂ صدارت جاری رہا۔"[1]

حضرت نے اپنے خطبے میں سب سے پہلے قرآن وحدیث اور تاریخ عالم کے حوالوں سے اسلام کی ہمہ گیری، اسلامی نظام اور فیوض و برکات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"خدائی نظام یقیناً ہر قسم کے غل و غش اور تمام آلائشوں سے پاک ہوگا اس میں اغراض پرستی اور دوسروں کی اہانت و تذلیل کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ اس کے نظام میں حقیقی جمہوریت و شورائیت پائی جاتی ہے۔ اس میں ہر فرد انسانی سے وہ محبت و اُلفت بھری ہوگی جو کہ ان کے ماں باپ اور عزیز و اقارب میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اس میں کسی سے دشمنی و رقابت وغیرہ نہ ہوگی، اس میں اچھوت

---

[1] حیات شیخ الاسلام

برہمن اور شودر، سید اور شیخ بڑی ذات چھوٹی ذات وغیرہ کی کوئی تمیز نہ ہوگی ہاں فرق اس قدر ضرور ہوگا کہ نظام میں داخل ہونے والے مطیع وفرماں بردار مستحق اعزاز واکرام اور نظام سے گریز کرنے والے باغی ونافرمان خواہ وہ کسی بھی نسل اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس میں کسی جماعت یا قوم پر ظلم و تعدی گوارا نہیں کیا جائے گا۔ ان اللہ لا یحب الظلمین ومن یظلم منکم نذقہ عذابا کبیراً۔

اس کے برخلاف انسانوں کا بنایا ہوا نظام خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، نوجی ہو یا سیاسی، اقتصادی ہو یا تجارتی، حکمار وفلاسفہ کا بنایا ہوا ہو یا ارباب حکومت و سیاست کا، اگر خداوندی نظام کے زیر سایہ نہ ہوگا اور اس کی روشنی سے استفادہ نہ ہوگا تو اس میں ایسی خامیاں اور خود غرضیاں ہوں گی جن سے ہر قسم کے فتنہ وفساد، ظلم وعناد، ہلاکت وبربادی کا نشو ونما ہوگا۔ خواہ وہ نازی ازم ہو یا بالشوزم، نیشنل ازم ہو یا سوشل ازم فاسسٹزم ہو یا کوئی بھی ازم ہو۔ میرے محترم بزرگو! آج اسلام ازم ہی وہ خداوندی نظام ہے جس میں حقیقی جمہوریت اور سچی آمریت کو باحسن وجوہ جمع کر دیا گیا ہے اور جس میں ہر فرد بشر کے ساتھ انصاف وعدالت کی تاکید کی گئی ہے۔

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ (سورہ نساء)	لوگوں کے معاملات میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرو۔
یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ (مائدہ)	ایمان والو! عدل وانصاف کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہو۔ تعصب اور دشمنی کی بنا پر انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوڑو۔ ہمیشہ انصاف ہی کرو۔ یہی تقویٰ وپرہیزگاری ہے۔

ان آیتوں میں عدل وانصاف کا حکم صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں روئے زمین

کے تمام انسانوں کے لئے ہے اور یہ حکم ہے کہ تعصب اور دشمنی کی وجہ سے کسی قوم کے ساتھ عدل وانصاف کا راستہ نہیں چھوڑنا چاہئے، حق بات کو ہرگز نہ چھپایا جائے اور اغراض کا بندہ نہ ہونا چاہیئے۔" [1]

اس ذیل میں بڑی طویل بحث فرماتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ دنیا کے مصائب وآلام کا حل شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور اصل نظام مملکت حکومت الٰہیہ کا قیام ہی ہوسکتا ہے اور قرآن وحدیث کے دلائل سے واضح کیا کہ کسی قوم، کسی گروہ اور کسی جماعت کے لئے دشمنی اور عناد کو دل میں جگہ نہ دی جائے اور عدل وانصاف کا دامن نہ چھوڑا جائے۔

یاد کرلیجئے کہ حضرت ہندوستانی قومیت کے حامی اور متحدہ قومیت کے طرفدار تھے اور یہ بھی ذہن نشین کرلیجئے کہ اس پالیسی کو وہ احیائے کلمۃ اللہ اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا صرف ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد خطبے میں جنگ عظیم دوم کی ہولناکیوں اور تباہیوں کے ساتھ حضرت نے جنگ کے باب میں جمعیۃ علماء ہند کی پالیسی کا تذکرہ فرمایا:

"اسلام نے صرف خاص حالات میں اور خاص خاص شرائط کے ساتھ اجتماعی مقاصد کے لئے جنگ کی اجازت دی ہے۔ اگر کسی جدوجہد کے نتیجے میں خدا کی ایک فرماں بردار ملت کو دنیا کے کسی حصے میں خدائی احکام کے مطابق یا اس سے قریب تر کوئی اجتماعی نظام قائم کرنے کے مواقع حاصل کرنے ہوں تو اس کو اسلام کی تائید حاصل ہوسکتی ہے اور صرف اسی جدوجہد کو اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے اس کے بعد اگر کسی جنگ کا نتیجہ ایسی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے کہ حق کی راہ میں مزید مشکلات پیدا ہوجائیں اور حق پرستوں کی پابندیوں اور مجبوریوں میں مزید اضافہ ہوجائے تو اسلام کی شرعی زبان میں اس کو محض قتال فی سبیل الطاغوت کہا گیا ہے اس لئے جس وقت موجودہ جنگ کے

[1] خطبۂ صدارت لاہور جمعیۃ علماء کانفرنس

سطی مقاصد کا اعلان کیا گیا تو جمعیۃ علماء ہند نے مذہبی اور سیاسی نکتۂ نظر سے ان کا جائزہ لیا اور اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ایک مفصل تجویز کے ذریعے پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ اپنے فیصلے کا اعلان کردیا۔ (کہ موجودہ جنگ میں شرکت کے لئے ہندوستان کسی حالت میں تیار نہیں ہے) اور اب تک نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنے اس فیصلے پر قائم ہے۔"[1]

اس وقت کی ہندوستانی سیاست کے یہ اہم مسائل تھے جن کے بارے میں حضرت نے تاریخی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنا اور اپنی جماعت کے موقف کا پوری وضاحت اور دلائل کے ساتھ اعلان فرمایا کہ حکومت الٰہیہ کے علاوہ کوئی نظام انسانی مسائل کا حل نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے کسی ملک، کسی قوم اور کسی فرد کے ساتھ عناد و دشمنی کر کے عدل و انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اور موجودہ جنگ عظیم دوم میں برطانیہ کی حمایت و نصرت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد خطبے میں برطانیہ اور برطانوی حکومت کے سامراجی مزاج اور پالیسی کا تذکرہ ہے جس میں بڑے تفصیلی حوالے اور اقتباسات پیش کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ برطانیہ ہندوستان کے ساتھ غیر منصفانہ اور استحصال بالجبر کا معاملہ کر رہا ہے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ حکومت کی اس پالیسی کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستانیوں کو آزادی کی راہ میں ہر قسم کی قربانی اور جد و جہد کے لئے میدان میں صف آرا ہوجانا چاہیئے۔ پھر حضرت نے ہندوستان کے روایتی اور قدیم اتفاق و اتحاد کا تذکرہ کرتے ہوئے حوالوں کے ساتھ یہ حقیقت ثابت کی کہ ماضی میں ہندوستان میں مختلف طاقتوں اور ریاستوں کے ساتھ جھڑپیں بھی ہوئیں، جنگیں بھی ہوئیں مگر مذہبی عداوت و نفرت کبھی نہیں رہی اور صدیوں تک تمام ہندوستانی اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہتے رہے مگر برطانوی سیاست نے اپنا اقتدار قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ان میں افتراق و عناد پیدا کیا اور

---

[1] خطبۂ صدارت۔ لاہور

اس طرح اپنے اقتدار کی مدت دراز تر کر رہے ہیں۔ اس تفصیل کے بعد حضرت نے اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے لئے مضر ہے اور اس سے ان کے مسائل کا حل نہیں ہو سکتا ہے۔ اور جمہوری اور نیابتی طرز حکومت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطہ اتفاق و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے۔ ایک خاص نکتہ اس موقع پر قابل توجہ ہے کہ حضرت نے مخلوط انتخاب کی تائید اسی صورت میں کی ہے جب حکومت جمہوری اور نیابتی طرز کی ہو۔ یہ بالکل علٰحدہ بات تھی کہ حضرت سمجھتے تھے کہ بصورت موجودہ ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت کے سوا کسی طرز حکومت کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد حضرت نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کوئی سیاسی اقلیت نہیں ہیں، یہ ایک سیاسی حملہ ہے جو مسلمانوں پر انگریزوں اور قوموں کی صفوں سے کیا جا رہا ہے کہ انہیں اقلیت شمار کیا جاتا ہے۔ خود مسلمان بھی اس فریب میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کی تعمیر کا لازمی عنصر ہیں۔ ملک کے استحکام میں ان کا حصہ دوسروں سے بہت زیادہ ہے۔ یہاں ان کی تعداد لگ بھگ دس کروڑ ہے۔ "وہ یہاں پوری آزادی اور پوری تہذیبی و ثقافتی برتری کے ساتھ زندہ رہیں گے اور غیر کی غلامی پر عزت کی موت کو ترجیح دیں گے۔"[1]

آخر میں آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی مقام کے بارے میں تین نظریات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ پہلا نظریہ تو یہ ہے کہ مسلمان اکثریت کے ماتحت اور ان کے رحم و کرم پر زندہ رہیں۔ اس کے متعلق حضرت نے فرمایا کہ یہ محض ایک خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے فوری اور مفید تر بات یہ ہے کہ اس بات کو جلد از جلد دماغوں سے نکال دیا جائے۔

دوسرے نظریے کا تفصیلی تذکرہ کرکے حضرت نے کہا کہ یہ طبقہ اکثریت کے تصور اور اس کے عواقب و نتائج سے گھبرا کر تقسیم ہند اور اقلیت کے لئے علٰحدہ ہوم لینڈ کا مطالبہ

---

[1] خطبۂ صدارت۔ لاہور

کر رہا ہے اس میں بہت سے اشکالات اور خطرات ہیں۔ مسلمانوں کی وحدت منتشر ہو جائے گی اور ان کی طاقت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ تیسرے گروہ کا نظریہ ہے کہ سارے صوبے ایک وفاق اور مرکز کے ماتحت ہوں۔ مگر مرکز کے اختیارات محدود ہوں اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں۔

حضرت کی سیاسی زندگی اور نظریہ اس خطبے میں بڑے جامع اور مانع طریقے سے منعکس ہے۔ بڑے تفصیلی مضامین اور ایک عصر کی تاریخ اس مختصر سے خطبے میں پنہاں ہے پھر بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ۵۴ فل سکیپ سائز کا یہ مضمون ان صفحات میں نقل کر سکیں اس کے لئے ناظرین کو حضرت کے خطبات کی اشاعت کا انتظار کرنا پڑے گا۔

الٰہ آباد جیل

۱۹۴۲ء۔ ۱۹۴۴ء

سیاسی تحریک اور آزادی کی جدوجہد شباب پر پہنچ رہی تھی۔ برطانیہ کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ باہر سے جرمنی اور ہٹلر کا ریلا بڑھتا ہی آرہا تھا۔ جاپان آندھی طوفان کی طرح بڑھتا آرہا تھا اور ملک کے اندر مہینوں سے بغاوت کی تیاریاں تیزی پر تھیں۔ عوام نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ مکمل اور غیر مشروط آزادی سے کم کسی قیمت پر ہندوستان جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ان حالات سے گھبرا کر سراسیگی کے عالم میں گورنمنٹ نے ملک کے لیڈروں کی گرفتاری شروع کر دی تھی۔ اسی ضمن میں مہینوں سے حضرت کی گرفتاری کی خبریں بھی آرہی تھیں مگر حضرت کی سرگرمیوں اور حکومت کے خلاف جدوجہد میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ تقریریں، تحریریں، پکار اور للکاریں پورے جوش و خروش اور عزم و ہمت کے ساتھ جاری تھیں۔ اسی درمیان ۲۵؍ اپریل ۱۹۴۲ء کو مراد آباد کے قصبہ بچھراؤں میں ضلع جمعیۃ علماء کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد ہی ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ ہمیں طوقِ غلامی سے آزادی مل سکتی ہے۔ برطانیہ کی ناانصافیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا اور خود انگریز مورخین اور مدبرین کے حوالوں اور مقالوں سے ان پر دلیلیں قائم کیں۔ یہی مضامین آپ ہمیشہ بیان فرمایا کرتے تھے مگر اس بار حکومت گرفتاری کی گھات میں تھی۔ چنانچہ اسی تقریر کی بنا پر گرفتاری کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مگر حکومت کراچی کے مقدمہ کے موقع پر گرفتاری کا ماحول اور دشواریاں ابھی بھولی نہ تھی۔ اس لئے ایسے انتظامات کئے گئے کہ کسی کو کانوں کان گرفتاری کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۲۴؍ جون ۱۹۴۲ء کی رات کو ایک بجے صوبہ پنجاب کی ایک اتحاد کانفرنس میں شرکت کے لئے حضرت دیوبند سے جھنگ کے لئے روانہ ہوئے۔ گاڑی تیسرے اسٹیشن پر پہنچی تھی کہ پولیس آفیسر وارنٹ لئے ہوئے ڈبے میں

داخل ہوا اور جب گاڑی چل پڑی تو وارنٹ پیش کر دیا۔ اگلے اسٹیشن سہارن پور پر حضرت کو اتار لیا گیا اور پہلی ٹرین سے مراد آباد پہنچا دیا گیا۔ یہ خبر عام ہوئی تو مظاہرات، احتجاجات اور اجتماعات کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ نعرۂ تکبیر انقلاب اور آزادی کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ جلوس نکلے، جلسے ہوئے، تجویزیں آئیں، تقریریں ہوئیں غرض مہینوں تک گورنمنٹ کی نیندیں حرام رہیں۔ ان تمام سرگرمیوں سے حضرت رہا تو نہ ہو سکے اور نہ ملک فوری طور پر آزاد ہوا۔ مگر جذبۂ آزادی کی لہریں دسوں بیسوں گنا اونچی اٹھ گئیں۔ اس وقت کے مشہور اور مقبول انقلابی شاعر علامہ انور صابری کا ایک قطعہ آج تک کانوں میں گونج رہا ہے:

غلام آباد میں کیا فائدہ ہے کیف جینے کا　　نہ جینا ہے سلیقے کا نہ مرنا ہے قرینے کا
خدا شاہد ہے اب صحن چمن بھاتا نہیں جب سے　　قفس میں ہے مراد آباد کے بلبل مدینے کا

موقع کی مناسبت، دلوں کی درد انگیزی، شاعرانہ فن کاری اور اس پر علامہ صاحب کی کھنکھناتی ہوئی پرسوز آواز۔ اشعار سن کر ایک عظیم الشان مجمع میں لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ مراد آباد جیل میں حکومت نے حضرت پر مقدمہ چلایا۔ حافظ محمد ابراہیم جو آزادی کے بعد تاعمر وزیر رہے، ان کی سرگردگی میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے ایک پینل نے پیروی کی۔ یہ سب لوگ بڑے بیدار مغز اور قابل قانون داں تھے۔ گورنمنٹ کا دعویٰ بے جان تھا۔ جب سی آئی ڈی انسپکٹر محمود نے حلفیہ بیان کے بعد مقدمہ پیش کیا اور فاضل وکلا نے بحث کرتے ہوئے سوالات قائم کئے، تو حکومت کے وکیلوں اور گواہوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ادھر حضرت نے خود جو بیان برسر عدالت دیا وہ بھی اس قدر مدلل، مضبوط اور مسکت تھا کہ راتوں رات یہ خبر عام ہوگئی کہ حقائق کے پیش نظر خود جج کا رجحان یہ ہے کہ سزا نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ ایک اچٹتی سی نظر حضرت کے بیان پر ڈالتے چلیں:

"ہر شخص کو اپنے وطن سے قدرتی طور پر سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مجھ کو بھی ہے۔ تاریخ، جغرافیہ اور علم دین کے مطالعے، ہندوستان کے باہر آزاد ملکوں میں قیام اور غیر ملکی شخصیات سے تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں اپنے وطن کی قدر و منزلت اور محبت میرے دل میں دن بدن فزوں تر ہوتی چلی گئی۔ مالٹا کی

قید نے حریت پسندی اور آزادی کے جذبات میں بیش بہا اضافہ کیا۔ میں جب انڈیا واپس آیا اور میں نے اپنے وطن کو جلیاں والا باغ، رولٹ ایکٹ اور مارشل لا ایکٹ میں جکڑا ہوا پایا تو میرا دل غلامی اور غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت سے بھر گیا اور میں نے نان کوآپریشن اور نان وائلنس کی بنیادوں پر آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جس طرح انگریز، فرانسیسی، جرمن، جاپانی امریکن اور دنیا کی ہر قوم کو پیدائشی بنیاد پر آزاد رہنے کا حق ہے اسی طرح آزادی ہندوستان اور ہندوستانیوں کا پیدائشی حق ہے۔ اسی آزادی کی تبلیغ میں نے بھیراؤں کے اس جلسے میں کی تھی جس کی رپورٹ گورنمنٹ کو غلط طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ موجودہ جنگ عظیم کے نتیجے میں اور برطانوی حکومت کی خود غرضانہ اور غلط پالیسیوں کے سبب ہندوستان تباہی، فلاکت اور ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ یہ باتیں تخمینی اندازوں اور بے بنیاد دعوؤں کی بنیاد پر نہیں کہی تھیں، میرے پاس اس کے دلائل اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ اپنے وطن کی محبت، آزادیٔ وطن کی تمنا اور اس کی جدوجہد میں میں کسی ہندوستانی سے پیچھے نہیں ہوں۔ مذکورہ اسپیچ ملک کو متحد، منظم اور پُرامن رکھنے کے لئے دی گئی تھی۔ اس کو وہی لوگ قابل اعتراض کہہ سکتے ہیں جو ہندوستان میں ہمیشہ اختلاف و عناد باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ میں اتحاد کانفرنس ہی میں شرکت کے لئے جھنگ جا رہا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ حکومت کو اس اتحاد کی کوشش سے اختلاف ہوا فاضل مجسٹریٹ نے میری تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے کہا ہے کہ

آپ کی تقریر کے شروع حصے میں ایسے جملے استعمال کئے گئے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا سبب ہے اور آپ کی پوری تقریر سے انگریزی سرکار کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے اور میرے پاس اس کے دلائل موجود ہیں۔

(تلخیص) الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر مطبوعہ مکتبہ مدینہ۔ باغبانپورہ۔ گوجرانوالہ

اس بیان میں جرات، بے باکی، کلمۃ الحق عند سلطان جائر کے عناصر بیان سے ظاہر ہیں مگر ان کے علاوہ اس میں قانونی حیثیت سے ایسے مضبوط دلائل موجود تھے کہ جج اور جیوریز بھی متاثر اور قائل نظر آئے، مگر مقدمہ کا یہ سلسلہ تو محض خانہ پری کے لئے تھا۔ گورنمنٹ سزا کا فیصلہ مقدمہ سے پہلے کر چکی تھی۔ چنانچہ اسپیشل مجسٹریٹ درجہ اول مسٹر سرپواستو کو ۶ ماہ قید بامشقت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کا حکم سنانا ہی پڑا۔ مگر تاہم اس نے جیل میں حضرت کو اے کلاس میں رکھے جانے کی ہدایت کی۔ عام حالات میں تو اس سزا کی صرف اتنی سی حیثیت تھی کہ ہائی کورٹ میں اپیل کر کے ضمانت پر رہا کرا لیا جائے اور اپیل میں رہائی ہو جائے۔ مگر اس مقدمہ میں جہاں صرف گورنمنٹ ہی نہیں، برطانوی سامراج کی پالیسی مدعی ہو اور مدعا علیہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسا علمبردار جہاد ہو ان آسانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فیصلے کے فوراً بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جج کو خبردار کر دیا کہ اگر تم نے گورنمنٹ برطانیہ کے ایسے خطرناک دشمن کی ضمانت منظور کر لی تو گورنمنٹ فوراً ان کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ ۱۲۹ کے ماتحت گرفتار کر لے گی۔ گورنمنٹ کی پالیسی تو واضح ہی تھی مگر جماعت نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ گورنمنٹ کو گھر تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ چنانچہ اپیل دائر کی گئی اور ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء کو آصف علی بیرسٹر مرحوم مقدمہ کی پیروی کے لئے دلی سے تشریف لائے۔۔ موصوف تحریک آزادی کے صف اول کے رہنماؤں میں تو تھے ہی حضرت سے اخلاص اور ارادت بھی رکھتے تھے۔ مقدمہ کی پیشی ہوئی تو مسلسل چار گھنٹے تک ایسی مدلل، مکمل اور قانونی بحث کی کہ حکومت کے سارے دعووں کے تار و پود ہوا میں بکھر گئے۔ مقدمہ کا ڈھنگ اور عدالت کا رنگ دیکھتے ہوئے عوام کو خیال ہوا کہ آج نہیں تو اگلی پیشی پر تو ضرور ہی رہائی ہو جائے گی۔ جج نے بھی فیصلے کے لئے ۱۳ر اگست کی تاریخ دے دی۔ مگر اس تاریخ سے پہلے ہی کوئٹ انڈیا والی مشہور تحریک شروع ہو گئی۔ یہ بڑی یادگار اور فیصلہ کن تحریک تھی۔ یہی وہ نعرہ تھا جس نے برطانیہ کے قدموں کو ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے اکھاڑ دیا۔ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان کا بچہ بچہ مادر وطن کے قدموں میں جان کا نذرانہ لے کر حاضر ہو گیا۔ ان یادگار لمحات کی ایک آنکھوں دیکھی جھلک ملاحظہ کیجئے:

"۸ر اگست ۴۲ء کو بمبئی میں امام الہند مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس

کا تاریخی اجلاس شروع ہوا اور مردانہ جرأت وہمت کے ساتھ کوئٹ انڈیا کی تجویز بالاتفاق منظور کی گئی۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی تقریروں اور مولینا کے فیصلے نے دلوں کو جوش وجذبے سے معمور کردیا۔ برطانیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور فوراً کانگریس کو غیرقانونی جماعت قرار دے دیا گیا۔ پنڈت جواہر لال کی تقریر اس قدر جوش وجذبات سے پُر تھی کہ عوام کو اپنے اوپر قابو رکھنا مشکل ہوگیا، آدھی رات کے بعد کارروائی دوسری صبح کے لئے ملتوی ہوگئی۔ صبح سے پہلے ہی حکومت نے ٹیلیفون کے کنکشن کاٹ دئے اور کانگریس کے مولینا آزاد، گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے سارے ممبروں کو گرفتار کرلیا۔[1]

عوام نے حکومت کے دفتروں، ڈاک خانوں، اسٹیشنوں، تھانوں اور تحصیلوں پر دھاوا بول دیا۔ کچہریاں لوٹ لیں، عدالتوں میں آگ لگادی، ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں، مال گاڑیاں روک لیں، پل توڑ ڈالے، لوگ کفن باندھ کر گھروں سے نکلتے تھے اور لاشیں واپس آتی تھیں۔ جلوس نکلتے تھے، نعرے بلند ہوتے تھے انقلاب زندہ باد، شٰٔہ زندہ باد۔ حکومت جلوس روکتی تھی اور رائفلیں آگ اگلتی تھیں۔ وطن کی دھرتی تازہ اور لال خون سے مالامال ہورہی تھی۔ اب حضرت کی رہائی اور مقدمہ کی کارروائی کا سوال ہی ختم ہوگیا تھا۔ ملک کے سارے لیڈران کے ساتھ حضرت پر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ جاری ہوا۔ ادھر جمعیۃ علماء اور کانگریس کے لیڈر قیدیوں کی نئی کھیپ مولینا حفظ الرحمٰنؒ، حافظ محمد ابراہیم وغیرہ جیل میں پہنچ گئے۔ اور جنگل میں منگل ہوگیا۔ مگر حضرت کے مشاغل اور گوشہ نشینی جو ابتدائی زندگی سے جاری تھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ باہر کی دنیا میں تو کچھ علائق اور ہجوم خلائق مارج بھی ہوجاتا ہوگا۔ یہاں تو فرصت ہی فرصت تھی۔

اس جیل میں ایک مخصوص احاطہ تھا جس میں چار کوٹھریاں تھیں۔ پہلے ان میں پھانسی کے مجرم رکھے جاتے تھے۔ پھانسی کا تو نام ہی ہولناک ہوتا ہے۔ اس احاطہ اور خصوصاً کوٹھریوں

---

[1] اثر بن یحییٰ انصاری۔ مولینا آزاد ڈائری۔

ہیں بلا کی وحشت برستی تھی۔ جیل میں مشہور تھا کہ یہاں بدروحوں کا ڈیرا ہے۔ وارڈن اور ملازمین بھی اس طرف کا رخ کرتے گھبراتے اور کتراتے تھے۔ مگر یہی کمزوریاں حضرت کے لئے خوبیاں بن گئیں۔ رات دن بغیر کسی سرکاری مجبوری کے کوئی خلل انداز نہیں ہوتا تھا۔ ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

تین بجے رات کو تہجد و نوافل کے لئے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اول وقت میں فجر کی اذان دی جاتی تھی اور حضرت کے معمول کے مطابق جب خوب اُجالا پھیل جاتا تھا تب جماعت کھڑی ہوتی تھی۔ امامت حضرت ہی کراتے تھے اور طوال مفصل لمبی لمبی سورتیں قراءت فرماتے تھے۔ نماز کے بعد اپنی کوٹھری میں ورزش کرتے تھے۔ ورزش کا اہتمام حضرت کو عمر بھر رہا۔ جہاں تک راقم الحروف کو یاد ہے ستر برس کی عمر تک ورزش جاری رہی۔ اس کے بعد سب حضرات مل کر ناشتہ کرتے تھے۔ اس دوران مختلف علمی، روحانی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ چائے ناشتے سے فارغ ہوکر ۱۲ بجے تک قرآن پاک کی تلاوت، حفظ اور دور میں مشغول رہتے تھے۔ کھانے کے بعد حسب عادت قیلولہ فرماتے تھے۔ ظہر کے بعد قرآن پاک کی تفسیر و ترجمہ بیان فرماتے تھے۔ عصر کے بعد مغرب تک نوافل، ذکر اور عبادات و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ مغرب بعد اوابین، نوافل میں ڈیڑھ پارہ پڑھتے تھے پھر ساتھی قیدیوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ عشا بعد اپنی کوٹھری میں چلے جاتے تھے۔ اس جیل کے معمولات کا ایک دھندلا سا خاکہ حضرت نے خود بھی بیان فرمایا ہے:

"رات کو ہم ایک بارک میں بند کئے جاتے ہیں جس میں ہم اور تین خادم کل گیارہ بارہ آدمی ہوتے ہیں۔ سوا دس بجے تراویح کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ میں دو پارے سُناتا ہوں۔ اب دوسرا قرآن ہو رہا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے فارغ ہوتے ہیں پھر سو جاتے ہیں۔ ڈیڑھ اور کبھی دو بجے اُٹھتے ہیں۔ نوافل میں قاری عبداللہ صاحب مدرس مدرسہ شاہی مسجد (صدر کانگریس ضلع مراد آباد) دو پارے اور مولوی مہدی حسن صاحب دو پارے سُناتے ہیں۔ ان صاحبوں کا بھی

دوسرا قرآن ہو رہا ہے۔ اگر کچھ وقت باقی رہتا ہے تو حسب گنجائش میں بھی ایک یا دو پارے سناتا ہوں۔ ورنہ سحری کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر نماز صبح کے بعد اس بارک سے نکل کر قیام گاہ کے حجروں میں آجاتے ہیں اور کھلے کمروں میں سو جاتے ہیں۔ دس گیارہ بجے تک سونے کے بعد کتابوں کا مطالعہ، سیاسی مذاکرہ تصنیف و تالیف، کھانے پکانے اور اشیائے خورد و نوش کی فراہمی کا مشغلہ رہتا ہے۔ نمازوں، تلاوت قرآن اور دوسرے اشتغال بھی جاری ہیں۔ ۹ بجے شام کو بارک مذکور میں چلے جاتے ہیں۔ یہی روزانہ کا معمول ہے۔"[1]

خوش قسمتی سے راقم الحروف کو اس جیل میں حضرت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا حضرت نے فرمایا کہ میں یہاں بالکل آرام سے ہوں۔ دیکھو گھر کی راحت و آرام کے سامان مہیا ہیں۔ یہ جیل کے افسران میرا ہر طرح خیال رکھتے ہیں، تم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہئے اور خوش ہونا چاہئے کہ اس نے قید و بند جیسی سختیوں میں بھی ہمیں آرام سے رکھا ہے۔ اسی قسم کا ایک خط حضرت نے اپنے ایک مخلص خادم اسد اللہ خاں صاحب ساکن بگراسی ضلع بلند شہر کو بھی تحریر فرمایا تھا:

از مراد آباد جیل

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ نے جس ہمدردی اور جن جذبات کا مظاہرہ فرمایا ہے ان کے شکریہ سے میں قاصر ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہان میں فائز المرام فرمائے اور اپنی خوشنودی سے نوازے۔ میں بحمد اللہ بخیر و عافیت سے ہوں اور بہت زیادہ مطمئن اور شاد ہوں اور افضال خداوندی سے امیدوار ہوں کہ نتائج بہتر پیدا ہوں۔ ملاقات، اخبار اور ڈاک جب سے نئے لوگ گرفتار ہو رہے ہیں بالکل بند ہے۔ تنہائی جس قدر بھی مل جائے مطمئن و خرم رہتا ہوں۔ اجتماع میں وہ بات کہاں؟

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۱، ص ۳۲۲

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

جو فراغت یہاں ہے باہر کب نصیب ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رضیات کی توفیق عطا فرمائے اور راضی رہتا ہوا جس حالت میں رکھے اس پر شاکر رہنا فریضۂ عبودیت ہے۔ ہم کو اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے۔ آپ حضرات سے مستدعی ہوں کہ استقامت اور اسلاف کرام قدس اللہ اسرارہم کے قدم بقدم چلنے کی دعا کرتے رہیں گے۔ آپ میری طرف سے کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ آپ کا بار بار تکلیف کر کے آنا اور اپنے کاروبار میں حرج ڈالنا میری طبیعت پر بہت زیادہ بار ہوتا ہے۔ میں ایک گنہگار بندہ ہوں جو اپنے اسلاف کے لئے ننگ وعار ہے۔ اس کے لئے اس قدر تکلیف اٹھانا بیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۲۵ر شعبان ۱۳۶۰ھ

خط کا مضمون کسی شرح وحاشیہ کا محتاج نہیں ہے مگر ایک بات کہے بغیر دل نہیں مانتا کہ اللہ جس حال میں رکھے اس پر شاکر رہنے کا جو مضمون لکھا ہے اس کو بیاسی برس کی عمر تک بڑے شوق اور چاؤ سے حضرت نے نباہا ہے۔ اتنی لمبی عمر میں ایک مثال بھی ایسی نہیں مل سکتی کہ انتہائی شدید حالات میں بھی کسی لمحے طمانیت قلب میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ اور اسی طبیعت ثانیہ کے طفیل جیل کی صعوبتیں اور قید وبند کے شدائد حضرت کے لئے راحت واطمینان کا سبب بن گئے تھے اور یہ ادا اللہ تعالیٰ کو کیسی پسند ہے کہ جیل کے قیدی اور ملازمین تو تھے ہی افسران وذمہ داران بھی قانونی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے خدمت گزاری کے لئے حاضر رہتے تھے۔ ادھر مرادآباد کے عوام وخواص ضروریات کی فراہمی اور خطوط کی ترسیل کا مکمل اہتمام رکھتے تھے اور اس طرح حضرت کی عمر بھر کی عادت، دسترخوان کی وسعت اور مہمان داری، بخوبی نبھ رہی تھی، خانقاہ بھی جاری تھی، درس گاہ بھی قائم تھی اور حلقہ ہائے ذکر وشغل بھی قائم تھے۔ غالباً یہ بات حکومت برطانیہ کے لئے بھی تجسس اور فکر کا سبب بن گئی تھی کہ یہ کیسا قیدی ہے جس کے لئے جیلر اور سپرنٹنڈنٹ جیل سے لے کر وارڈن

اور سپاہی تک سب موم ہیں۔ کوئٹ انڈیا کی تحریک کے بعد سارے ہی لیڈران مرکزی جیلوں میں رکھے گئے، تو حضرت کے لئے بھی الہ آباد جیل میں منتقلی کے احکام آ گئے۔ قیدی منتقل کئے جاتے ہیں تو ان کو یا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی مگر حضرت کو مکمل پروگرام کی اطلاع مل گئی اور آپ نے حسب معمول لکھنؤ میں اپنے خصوصی مرید و مسترشد حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کو اور الہ آباد میں مولینا ابو الحسن حیدری صاحب کو تار دے دئے تھے۔ لکھنؤ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب اور بعض دوسرے معتقدین ملاقات کے لئے موجود تھے مگر الہ آباد میں مولینا حیدری کو تار ڈلیور نہیں کیا گیا۔ اس سفر کی مختصر سی روداد حضرت نے خود تحریر فرمائی ہے:

"محترم المقام جناب مولوی ابو الحسن حیدری صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف۔ غالباً آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ ۲۳ر جنوری بروز شنبہ مجھ کو مراد آباد جیل سے ٹرانسفر کر کے نینی (الہ آباد) جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔ میں ۲۴ر جنوری بروز یکشنبہ ایک بجے دن کی گاڑی سے یہاں پہنچا۔ راستے میں لکھنؤ اسٹیشن پر میں نے ڈاکٹر عبد العلی صاحب کو روپیہ دے کر کہا تھا کہ حیدری صاحب کو تار دے دیں کہ وہ مجھ سے اسٹیشن پر ملیں۔ کیوں کہ آپ سے ملاقات بھی کرنی تھی اور بعض ضروری باتیں بھی کرنی تھیں۔ مگر الہ آباد کے چھوٹے اسٹیشن پر بھی آپ نظر نہ آئے اور نہ بڑے جنکشن پر نظر آئے۔ حالانکہ اسٹیشن پر تقریباً دو گھنٹہ ٹھہرنا ہوا۔ بہر حال یہ قسمت تھی کہ آپ سے شرف نیاز حاصل نہیں ہوا اور پھر میں گھوڑے گاڑی میں بیٹھ کر ڈھائی بجے نینی جیل میں داخل ہوگیا۔"[1]

اس میں بعض معتقدین، شاگرد اور متبعین پہلے ہی سے موجود تھے جن میں مولینا شاہد فاخری صاحب، مولینا عبد الحئی صاحب، مولانا عبد القیوم صاحب لکھنوی، مولینا عبد الباری عباسی

[1] الجمعیۃ۔ شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۷۰۔

گورکھپوری، مولانا عبدالسمیع صاحب سلطان پوری وغیرہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کانگریسی ورکرس اور لیڈران پنڈت سیتارام شکل، گنیش شنکر ودیارتھی، لال بہادر شاستری (جو بعد میں وزیر اعظم ہوئے) وغیرہ بھی موجود تھے۔ ان سب حضرات کے لئے حضرت کی تشریف آوری سے ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہوگئی۔ کھانے پینے کی اشیاء کا اور ملازم باورچی کا انتظام تو گورنمنٹ ہی کی طرف سے تھا۔ باہر سے حضرت کے دو جاں نثار مریدین حاجی شیخ ولی محمد صاحب جونپوری اور مولانا ابوالحسن حیدری صاحب رسد پہنچاتے رہتے تھے۔ اس طرح خانقاہ اور لنگر خانہ یہاں بھی پوری رونق اور شان کے ساتھ جاری رہا۔ اس بارے میں جیل کے ایک ساتھی پنڈت سیتارام شکل کا بیان سنیے:

"بھائی بھائی کہتے بہتوں کو سنا ہے، لیکن برابری کا برتاؤ کرتے صرف مولانا حسین احمد کو دیکھا۔ کھانا پکاتے وقت باورچی باورچی رہتا تھا اور آپ مالک رہتے تھے، مگر کھانا کھاتے وقت باورچی اور مالک ایک ہوجاتے تھے۔ یہی نہیں، صرف ایک پاؤ گوشت مولانا کو ملتا تھا۔ لیکن کھانے کے وقت جو بھی آجاتا تھا وہ شریک طعام کرلیا جاتا تھا۔ جیل کی میعاد نہیں تھی۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ جیل میں کب تک رہنا پڑے گا لیکن اگر کوئی معمولی سی کلاس کا قیدی کھانے کے وقت آگیا تو اپنا اور اس کا کھانا ملاکر اس کو اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ تندرستی گرنے لگی تو میں نے جیل کے ڈاکٹر سے کہا کہ مولانا اپنا کھانا تقسیم کردیتے ہیں اس لئے تندرستی گرتی جارہی ہے۔ پہلے تو اس نے یہ کہا کہ میں کیا کروں؟ قاعدہ یہی ہے مولانا کو صرف پاؤ ہی بھر گوشت مل سکتا ہے۔ لیکن دوسرے دن آکر وزن کیا اور تندرستی گرتی دیکھ کر پاؤ بھر گوشت اور بڑھادیا۔ اس کے مطابق مولانا کا کھانا اور کھانے والے دونوں اور بڑھ گئے۔"[1]

سخی داتاؤں کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے کہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلاتے ہیں۔

---

[1] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر

حضرت فطری اور مزاجی اعتبار سے اسی قسم سے تعلق رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ساری ہی عمر حضرت کا یہ یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ والا مزاج پوری طرح نباہا۔ مذکورہ خط میں یہ بیان ہے کہ اشیائے خورد و نوش میں اضافہ کی طرف حکومت کو توجہ حضرت نے خود نہیں پنڈت جی نے دلائی۔ اس واقعہ پر یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیلوں کی ساری زندگی میں اپنی تکالیف کا کوئی شکوہ، کسی رعایت کی درخواست یا کسی ضرورت کی طلب حکومت سے افسران سے یا کسی سے کبھی نہیں کی۔ یہ تفصیل بھی پنڈت جی موصوف نے لکھی ہے:

"چونکہ سیاسی قیدی بہت سے چھوٹ گئے تھے اور بہت تھوڑے رہ گئے تھے اس لئے سب کی رائے یہ ہوئی کہ ہم سب سرکل نمبر ایک میں چلے جائیں تو سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور دن اچھی طرح کٹیں گے۔ تو مولانا صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ مگر میں جیل والوں سے استدعا نہیں کروں گا۔"

جیل کی سنگی دیواریں اور آہنی خوفناک پھاٹک دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں اور شیروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ کیسا ہی معزز اور خوددار انسان ہو جیل کے افسران کے سامنے کوئی نہ کوئی نرم بات اور عرضداشت زبان سے پھسل ہی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مشہور انقلابی شاعر علامہ انور صابری مرحوم بھی کوئٹ انڈیا کی تحریک میں گرفتار تھے اور اپنے آہنی عزم و ارادہ کے باوجود جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ قطعہ لکھ بھیجا تھا:

پلاؤ کی ضرورت ہے نہ قلیہ چاہتا ہوں میں
چنے چابے نہیں جاتے تو دلیا چاہتا ہوں میں
اگر قانون دسترخوان دے سکتا نہیں مجھ کو
تو سوکھی روٹیاں رکھنے کو ڈلیا چاہتا ہوں میں

مگر عام زندگی کی طرح جیل کے شدید سے شدید اوقات میں بھی حضرت کے پائے استقلال و عزم ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ ساتھیوں کا بیان ہے کہ چہرے کی دائمی بشاشت اور خندہ پیشانی میں سخت ذہنی اور جسمانی تکالیف کے وقت بھی فرق نہیں آتا تھا۔

سیاسی قیدیوں کو انتظار تھا کہ تحریک ختم ہی ہو گی اور اس کے ساتھ ہماری قید بھی ختم ہو گی۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے تحریک جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو لوگوں کے منہ لٹک گئے، اور دل بجھ گئے، مگر حضرت نے اس خبر کا استقبال اپنی قدرتی اور دائمی مسکراہٹ ہی کے ساتھ کیا۔ یہ قصہ بھی ایک قیدی ساتھی کی زبانی سنیے:

> مئی ۱۹۴۲ء کی بات ہے نینی الہ آباد جیل میں جب یہ خبر آئی کہ تحریک فیل ہو جانے کے باوجود مہاتما گاندھی نے اپنے ۸ اگست والے ریزولیشن کو واپس نہیں لیا تو بڑے بڑے دیش بھگتوں کے چہرے اداس ہو گئے، لیکن مولینا مدنی یہ خبر سُن کر مسکرائے اور فرمایا کہ گاندھی جی نے ٹھیک کیا۔ کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ کسی جیل میں میری قبر بن جائے گی۔[۱]

حضرت کے اپنے معمولات، ریاضتیں اور مجاہدات تو جاری رہے ہی جیل ہی سے مُریدین، مسترشدین اور معتقدین کی اصلاح و تربیت بھی معمولات کے مطابق توجہ روحانی اور اہتمام کے ساتھ جاری تھی۔ طالبین کی عرضداشتوں اور حضرت کے فرمودات کی ارسال و ترسیل حضرت کے مُرید و خلیفہ مولینا ابوالحسن حیدری کے ذریعے انجام پاتی تھی۔ مولینا موصوف فرماتے ہیں:

> اسارت کا زمانہ میرے لئے موجب رحمت تھا۔ جیل میں رہ کر بھی حضرت اقدس باطمینان اپنے متوسلین کی اصلاح و تربیت فرماتے رہتے تھے۔ روزانہ میرے پاس مریدین اور متوسلین کے متعدد خطوط آتے تھے ان کو میں حضرت اقدس کی خدمت میں بھیج دیتا تھا اور حضرت کے جوابات متعلقہ پتوں پر روانہ کر دیتا تھا۔ بعض بعض خطوط بڑے لمبے ہوتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اتنے طویل خط لکھنے کے لئے حضرت کہاں سے وقت نکالتے تھے اور پھر ایک دو نہیں روزانہ حضرت کم از کم دس قطعہ خط لکھتے تھے جن میں تصوف و روحانیت کے رموز و نکات ہوتے تھے۔[۲]

---

[۱] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، مطبوعہ پاکستان [۲] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر

اس موقع پر بطور نمونہ اس قسم کے ایک دو خط ملاحظہ فرمائیے :

نینی جیل

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بہت مدت دراز کے بعد والا نامہ ۵؍ ربیع الاوّل باعث سرفرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکر ادا کرتا ہوں ۔عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم اس گوشہ نشینی میں بفضلہٖ تعالیٰ بہت خیرات و برکات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رضا سے ہم کو آپ کو اور سب کو نوازے آمین۔ آپ کے علمی، تعلیمی اور تصنیفی مشاغل اور ان میں کامیابی سے بہت خوشی ہوئی اللّٰھم زد فزد ذکر سے اب مذکور کی جانب بڑھنا چاہیئے اور اسم سے مسمیٰ کی جانب قدم بڑھانا چاہیئے۔ یعنی تھوڑا سا وقت اب اس میں بھی خرچ کیجئے کہ ذات مقدسہ باری تعالیٰ عزّ وجل کی طرف دھیان کیا جائے اور آیت وھو معکم اینما کنتم کے مفہوم کے مطابق یہ تصور کیا جائے کہ وہ ذات جو کہ مصداق ھو کی آیت میں مذکور ہے بلاکیف وکم مُنَزّھا عن جمیع سمات النقص والزوال ومتّصفا بسائر المحامد والکمال وغایۃ الجمال والجلال ہر جگہ میرے ساتھ ہے اور اس کی معیت بھی کما یلیق بشانہٖ ہماری معیتوں سے بالاتر اور نرالی ہے اور تصور و دھیان کو جو واقعی ہے تقویت دیجئے اور وقت مقرر میں بھی دھیان دیجئے اس وقت میں ذکر قلبی یا انفاس کی طرف سے دھیان ہٹا لیجئے۔ قلب حسب عادت ذکر کرے تو مت روکئے، کرنے دیجئے۔ سانس حسب عادت جاری بالذکر ہونے دیجئے روکئے مت۔ مگر اس وقت آپ کی توجہ کا نصب العین آیت مذکورہ کا مفہوم اور مسمّیٰ لفظ ھو اور لفظ اللہ ہوا کرے۔ اس مرتبہ پر مداومت کیجئے اور ابتدا میں اگر کچھ ثقل پیش آئے تو تحمل کیجئے، رفتہ رفتہ آسانی اور سہولت ہوگی۔ مدرسہ محمدیہ میں کامیابی سے خوشی ہوئی۔ طوبیٰ لمن جعل اللہ مفتاحاً للخیر ومغلاقاً للشر فھنیئاً لکم۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مزید توفیق عطا فرمائے۔ اگر ممکن ہو تو کتاب صراط مستقیم مؤلفہ شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ جو درحقیقت ملفوظات

حضرت سید صاحب ہیں زیر مطالعہ رکھیئے۔ نیز امداد السلوک کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۹ ربیع الاول ۶۳ھ

خط کا مضمون کسی مزید شرح و وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ حضرت نے تعلیم تبلیغ اور تربیت کا فریضہ زندگی کے کسی لمحے اور مرحلے پر نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ایک دوسرا خط بھی بہت اہم اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے:

الہ آباد۔ نینی جیل

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تبلیغی خدمات انجام دینے اور اس کے لئے مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ہدایات حاصل کرنے کا مقصد نہایت مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور توفیق عطا فرمائے کہ آپ اس عظیم الشان خدمت کو بلکہ اپنی خاندانی روایات کو بخیر و خوبی انجام دیں۔ مولینا محمد الیاس صاحب کو علٰحدہ خط لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض آپ ضرورت ہی سمجھیں تو اس عریضہ کو ان کی خدمت میں پیش کردیں اور میرا سلام اور عریضہ استدعائے دعوات صالحہ انجام دیں، حزب البحر کی زکوٰۃ کا ارادہ بھی مبارک ہے، آپ کو اجازت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے۔ صاحبزادے کی سلامتی کی خبر سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بلند اقبال طویل العمر مرضی السیدہ والسریرہ کرے اور تمام آفات ارضی وسماوی سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ آمین۔ اہلیہ محترمہ کو پابند بنانا آپ کا اولین اور سب سے اہم فرض ہے۔ حسن تدبیر کے ساتھ پوری جدوجہد اس میں صرف کیجئے۔ میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو مقاصد دارین میں کامیاب کرے اور اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۱۱ صفر ۶۳ھ

اس گرفتاری اور قید میں وہ کراچی اور مالٹا والی بے فکری اور فراغت میسر نہیں تھی۔ اس وقت اہلیہ اور ایک بچے کی ذمہ داری تھی، وہ بھی بھرے گھروں میں تھے۔ مگر اس بار

خاندان بڑا تھا۔ تین چار بچے اور اہلیہ تو اپنے ہی تھے اور دوسرے مرحوم بھتیجے مولانا وحید احمد کے پانچ بچوں اور بیوہ کی پوری ذمّہ داری بھی حضرت ہی کے سر تھی۔ گرفتاری بھی معمولی اور محدود نہ تھی۔ ایک سزا پوری ہوتی تھی تو دوسری دفعہ لگ جاتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب رہائی ہوگی اور ہوگی بھی یا نہیں؟ مگر حضرت کو فطری طور پر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ تھا زندگی بھر کسی خطرے یا اندیشے سے آپ کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ گرفتاری کے تھوڑے ہی دنوں بعد خاندان کے انتظامات متوکلانہ انداز میں مکمل کر دئے۔ اہلیہ صاحبہ اور چھوٹے بچوں کو اُن کے میکے روانہ کروادیا۔ زیرِ تعلیم صاحبزادہ اور بھتیجے مرحوم کے لڑکوں کے قیام کا دیوبند میں اپنے خصوصی مخلص قاری اصغر علی صاحب کی نگرانی میں انتظام کردیا۔ جیل سے تحریر فرمایا:

> "متعلقین سب ٹانڈہ میں ہیں۔ اور اُن کا وہیں رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اسعد اور فرید انشاء اللہ دس بارہ شوال تک دیوبند پہنچ جائیں گے تاکہ تعلیمی مشاغل انجام دے سکیں[1]"

اخراجات کے لئے قرض کے انتظامات کئے اور قاری صاحب موصوف کو ترتیب وار پروگرام لکھا کہ فلاں فلاں صاحبان سے قرض لے کر اخراجات پورے کئے جائیں۔

مگر مریدین و معتقدین کی تعداد اس وقت بھی لاکھوں سے متجاوز تھی۔ ان میں بہت سے حضرات نے ہدایا اور نذرانوں کا اہتمام کیا، مگر حضرت کا عمر بھر معمول یہ تھا کہ ہر کس و ناکس کے ہدایا قبول نہیں فرماتے تھے۔ اس بار بھی قاری صاحب موصوف ہدیہ گزار خدام کی فہرست بھیجتے تھے اور منظوری کے بعد ہی وہ قبول ہوتے تھے۔ بعض بڑی رقوم کی واپسی ذاتی طور پر راقم الحروف کے علم میں ہے۔ خیر! یہ تو اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ اُس نے اپنی طرف سے سارے انتظامات مہیا فرمادئے۔ ورنہ حضرت نے قرض کا انتظام پورا کرلیا تھا اور ابتدائی دو چار مہینے قرض ہی پر گذارہ بھی ہوا تھا۔ حضرت کا بیان ملاحظہ کیجئے:

"پروردگار کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے خزانۂ غیب سے بلا وہم وگمان

---

[1] مکتوبات ج ۱ ص ۳۴۱

تمام مصارف کا انتظام کر دیا ہے۔ جو نظام میں نے قرض لینے کا بنایا تھا اس
کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور بغیر کسی استدعا کے تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں اور
ہوتی جا رہی ہیں۔ للہ الحمد والمنۃ"[1]

ضرورتیں تو چھوٹی بڑی ہر قسم ہی کی ہوتی ہیں۔ انہی ایام اسیری میں سترہ اٹھارہ برس کے صاحبزادے مولانا اسعد صاحب کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ اخراجات کا سوال تو اپنی جگہ پر تھا مگر گھر والوں کو یہ کسی طرح منظور نہ تھا کہ حضرت جیل میں بند ہوں اور لڑکے کے سر پر سہرا بندھے۔ مگر حضرت کا معمول اور مزاج یہ تھا اور اسی کی نصیحت و تبلیغ کرتے تھے کہ اگر کوئی خاص ہی مجبوری نہ پیش آجائے تو بچوں کی شادیاں بالغ ہوتے ہی کر دینی چاہیئے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"اولاد کی شادی بالغ ہوتے ہی کر دینا اشد ضروری ہے۔ جوڑے، جہیز، ولیمہ وغیرہ کے چکر میں نوجوان اولاد کو شادی سے روکنا اللہ تعالیٰ کے مواخذہ اور پکڑ کا باعث ہے۔"[2]

اس نصیحت کی تائید میں دو حدیثیں نقل فرمائیں کہ حضور نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اولاد کی نعمت عطا فرمائے تو ماں باپ کو چاہیئے کہ اس کا بہتر سے بہتر نام رکھیں اور اچھی تعلیم و تربیت کریں اور جب وہ بالغ ہو جائے تو فوراً شادی کر دیں۔ ورنہ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو اس کا گناہ ماں باپ کے سر جائے گا۔ (مشکوٰۃ شریف)

سنت اور احادیث نبویہ پر پابندی تو حضرت کی طبیعت ثانیہ تھی ہی، خاندانی روایت بھی یہی تھی کہ بالغ ہوتے ہی شادیاں کر دی جاتی تھیں۔ اس لئے جیل ہی سے حضرت نے شادی پر اصرار شروع کر دیا:

"میں چاہتا ہوں کہ عزیزانم اسعد اور فرید کی شادیاں جلد ہو جائیں تاریخ قاری (اصغر علی) صاحب مقرر فرمائیں گے اور نہایت سادگی سے اس کو

---

[1] مکتوبات، ج ۱، ص ۳۴۲
[2] مکتوبات، ج ۲، ص ۱۱۴

انجام دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو مجبوریاں نہ پیش آتیں تو اب تک کر چکا ہوتا۔"[1]

گھر والوں نے بہت التجا کی کہ اللہ وہ دن لائے کہ اپنے ہی مبارک ہاتھوں سے لڑکے کو دولہا بنائیں اور خود ہی نکاح پڑھائیں تب ہی شادی ہونی چاہئیے مگر اس پر راضی نہ ہوئے اور اہلیہ محترمہ کو تحریر فرمایا:

تم کو میرے نہ ہونے کا صدمہ نہ کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے اور اسی میں خیر ہوتی ہے۔ بندہ کو آقا اور وہ بھی ایسے رحیم و کریم آقا کا ہر حکم نہایت خوشی سے ماننا چاہیے۔ بالخصوص جب کہ ہمارے ایسے جیسے ہزاروں آدمی ایسی ہی بلاؤں میں مبتلا ہوں تم اطمینان اور سکون کے ساتھ وہاں کے کاروبار انجام دو۔ امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ قاری (اصغر علی) صاحب کو شفائے کامل جلد عطا فرمائے تو وہ فوراً دیوبند پہنچ جائیں گے اور ایسا نہ بھی ہوا تو وہاں مولینا اعزاز علی صاحب، مولوی محمد عثمان علی صاحب، منشی سید محمد شفیع صاحب کو تمام کام وہ سپرد کر آئے ہیں۔ یہ سب حضرات نہایت ہمدردی اور خیر خواہی سے اور جدوجہد سے تمام کام انجام دیں گے۔"[2]

نہ کوئی خاص انتظام ہوا نہ غیر معمولی تیاری اور خریداری عمل میں آئی۔ اوّل تو حضرت شادیوں، تقریبوں، ختنوں، عقیقوں اور بسم اللہ ہوں وغیرہ میں دھوم دھام اور ظاہر داریوں کے سخت خلاف تھے لیکن اگر کچھ ہوتا بھی تو جیل کی سلاخوں کے اندر سے کر بھی کیا سکتے تھے۔

اہلیہ محترمہ کو تحریر فرمایا:

"تم دریافت کرتی ہو کہ کن خاص عورتوں کو بلاؤں؟ تم کو خود اندازہ ہے مجھ کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک ممکن ہو اختصار اور سادگی کے ساتھ معاملہ کرو۔ راجو پور لے جانے کے لئے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ سوائے جوڑوں اور سہاگ پوڑے اور زیوروں کے اور کیا چیزیں جاتی ہیں؟ مجھ کو کچھ نہیں معلوم

[1] مکتوبات ج ۴، ص ۹۷ [2] مکتوبات ج ۴، ص ۳۱۲

وہیں دریافت کرلینا۔ مگر رسمی چیزیں کچھ نہ ہونی چاہئیں۔[1]

اس طرح دو چار جوڑوں اور دو ایک زیوروں کا انتظام کرلیا گیا تھا۔ اور یہی شادی کی کل تیاری تھی۔ کپڑوں کی کل کائنات بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

"بنارس سے خط آیا تھا۔ وہاں سے ۲۳ جولائی کو کپڑے روانہ ہوگئے۔

ان تھانوں میں سے آدھا آدھا ان دو جوڑوں کے لئے لو جو کہ اسعد کی بیوی کے لئے بنواؤگی اور آدھا آدھا فرید (کی بیوی) کے لئے رکھ لو۔ اس کی شادی بھی انشاء اللہ عید کے بعد ہوجائے گی۔"[2]

اس طرح مدرسہ دیوبند کے علماء فضلا اور طلباء پر مشتمل پندرہ بیس آدمیوں کی یہ بارات دیوبند کے قریب راجوپور کے لئے روانہ ہوئی۔ یہاں کے ایک بزرگ حاجی علی احمد صاحب مرحوم و مغفور مدینہ طیبہ جا بسے تھے۔ مولانا سید احمد صاحب کے وصال کے بعد ان کی بیوہ نے انہی حاجی احمد علی صاحب سے عقد ثانی کرلیا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لئے اپنے وطن آئے تو مولانا سید احمد صاحب کی صاحبزادی مرحومہ بھی ماں کے ساتھ آئیں۔ انہی صاحبزادی کے ساتھ مہر فاطمی پر حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح پڑھایا اور دوسرے دن دیوبند آکر ایک مختصر سا ولیمہ کردیا۔

اس شادی کے علاوہ ایک کثیر المصارف کام اس جیل کے زمانے میں یہ بھی انجام پایا کہ مولانا وحید احمد صاحب کے ایک بچے سید احمد سلمہٗ کے پیر پیدائشی طور پر ٹیڑھے تھے۔ اس کی پیدائش کے بعد ہی سے حضرت کو اس کے علاج کا فکر ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بھتیجے اور اپنے ایک مخلص ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ دو چار برس کی عمر ہوجائے تو ان پیروں کا آپریشن ہوسکتا ہے۔ اتفاق سے یہ وقت اس وقت آیا جب حضرت خود جیل میں تھے مگر وہیں سے بغیر ایک دن ضائع کئے ہوئے اپنے مخلصین اور خدام کو ہدایات بھیجیں اور سارے انتظامات کے ساتھ بچے کو بمبئی بھیج کر آپریشن مکمل اور

[1] مکتوبات، ج ۴، ص ۳۱۲ [2] مکتوبات، ج ۴، ص ۳۱۳

کامیاب کرایا۔

نظر بندی کی مدت طویل ہوتی گئی اور رہائی کے آثار نظر نہ آئے تو کچھ مخلصین نے قانونی چارہ جوئی کی کہ یہ نظر بندی خلاف قانون ہے۔ درخواست حاجی شیخ ولی محمد صاحب جونپوری مرحوم کے نام سے داخل کی گئی اور صوبائی مسلم لیگ کے لیڈر اور قابل و فاضل وکیل ظہیر الحسنین صاحب لاری نے اس کی پیروی کی۔ ان کا اور دوسرے قابل وکلاء کا خیال تھا کہ اس قانونی اعتراض کے نتیجے میں حضرت کی رہائی پچانوے فی صد یقینی ہے۔ مگر اس بنچ کے جج جسٹس اقبال احمد اور مسٹر السپ دونوں کمزور اور حکومت کے اشاروں اور ارادوں کے تابع تھے اور حکومت کسی حالت میں حضرت کو رہا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حضرت نے اس مقدمہ کے بارے میں تحریر فرمایا:

"مقدمہ کے بارے میں لاری صاحب کا بیان اخبار مدینہ میں آچکا ہے۔ جانب مخالف (حکومت) کی طرف سے اولاً مسٹر محمود سابق سب انسپکٹر پولیس کو بھیجا گیا۔ اور ان کا حلف نامہ داخل کیا گیا۔ اس کے بعد ہوم سکریٹری گورنمنٹ کا حلف نامہ داخل کیا گیا۔ بحث میں مسٹر محمود کے بیان کو کنڈم کر دیا گیا اور چیف جسٹس نے ہوم سکریٹری کے بیان پر فیصلہ دے دیا۔ ہر ایک کی نقل کا ترجمہ ارسال ہے۔ اس سے آپ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ لاری صاحب نے نہایت عمدہ بحث کی اور قانونی حیثیت سے سکریٹری کے حلف نامہ کو غیر قانونی ثابت کر دیا۔ کاش وہ کلکتہ یا لاہور کے قاضی القضاۃ یا فیڈرل کورٹ کے سامنے اپنی ابحاث کو پیش کرتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔"[1]

حلف ناموں اور فیصلے کا تذکرہ آہی گیا ہے تو ان پر ایک نظر بھی ڈال لیجئے:

"حلف نامہ مسٹر محمود سابق افسر انچارج پولیس اسٹیشن دیوبند

(۱) میں اس وقت رڑکی پولیس اسٹیشن کا افسر انچارج ہوں جو واقعات اس حلف نامہ میں درج ہیں ان سے پوری طرح واقف ہوں۔

---

[1] مکتوبات، ج ۴، ص ۸۹

(۲) یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص ہیں اور ان میں سے ایک ہیں جو تحریک ریشمی رومال کے بانی مبانی تھے۔
(۳) یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی سازش مذکور کے سلسلے میں عرب بھیج دیئے گئے تھے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے گرفتار کئے گئے اور مالٹا میں نظر بند کئے گئے تھے۔
(۴) یہ کہ بعد میں مولانا حسین احمد مدنی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور تحریک خلافت کے چلانے میں خاص حصہ لیا۔ اور وہ ایک امیدوار تھے عہدہ امیر الہند کے، تاکہ اس کے ذریعے جہاد کا فتویٰ دے سکیں اور ۲۲ء میں خلافت کمیٹی کی مجلس منتظمہ میں بھی منتخب ہوئے تھے۔
(۵) یہ کہ وہ علی برادران کے ساتھ مقدمہ کراچی میں بھی سزایاب ہوئے تھے۔
(۶) یہ کہ مولانا مدنی نے ۲۴ر ۵ء کو سہارن پور میں ایک آگ لگانے والی تقریر کی تھی اور خاص تعلق تھا جمعیۃ علماء ہند سے۔ اس کے ذریعے تبلیغ کرتے تھے۔ ولایتی مال کے بائیکاٹ کی جس میں انگریزی مال بھی شامل ہے اور کھدر کے کپڑے کی اشاعت کرتے تھے۔
(۷) یہ کہ مولانا مدنی نے مرادآباد میں ۱۹۲۶ء میں صوبہ جمعیۃ علماء کی صدارت کی اور صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہوئے۔
(۸) یہ کہ مولانا مدنی نے مئی ۳۰ء میں نوجوان بھارت سبھا سہارن پور کے جلسے میں شرکت کی اور گورنمنٹ کے خلاف بہت سخت تقریر کی۔
(۹) یہ کہ مولانا مدنی نے ۳۲ء میں مجلس احرار کے لئے چندہ کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے جو اس وقت دہلی میں غیر قانونی جماعت تھی اور ان کے اوپر ایک نوٹس اس امر کی تعمیل کی گئی کہ وہ دہلی میں داخل نہ ہوں۔ لیکن انھوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور جیل بھیجے گئے اور بعد میں اگست ۳۲ء میں رہا ہوئے۔
(۱۰) یہ کہ مولانا مدنی نے ۳۶ء، ۳۷ء میں عام انتخابات کے کانگریس امیدوار

کو کامیاب بنانے کی پوری اور انتہائی کوشش کی۔

(۱۱) یہ کہ مولینا مدنی نے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں ولایتی مال کے بائیکاٹ کی کوشش کی اور عوام سے اپیل کی کہ وہ آنے والی لڑائی میں اور بادشاہ کے جشن تاج پوشی میں شریک نہ ہوں۔

(۱۲) یہ کہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں مولانا مدنی کا داخلہ دہلی بذریعہ تحریری حکم چھ ماہ کے لئے روک دیا گیا۔

(۱۳) یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں ہری پورہ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی اور آل صوبہ کانگریس کمیٹی کے نائب صدر تھے۔

(۱۴) یہ کہ مولانا مدنی نے آزاد مسلم کانفرنس ۱۹۴۰ء جونپور کی صدارت کی اور اس میں انگریزوں کے خلاف بہت زبردست تقریر کی۔

(۱۵) یہ کہ مولانا مدنی نے اگرچہ گاندھی جی کے خاص حکم کے ماتحت ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لیا لیکن اس سال کانگریس مجلس منتظمہ کے ایک ممبر تھے۔

(۱۶) اپریل ۱۹۴۲ء میں دو تقریریں بچھرایوں اور سہارن پور میں بہت سخت کیں۔ اور بچھرایوں کی تقریر کے سلسلے میں ۲۴ر جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلایا گیا اور دفعہ ۲۶ قانون ہند کے ماتحت چھ ماہ کی سزا ہوئی۔

(۱۷) مولانا مدنی کا نام سنٹرل گورنمنٹ کی فہرست الف پر اور صوبائی گورنمنٹ کی فہرست الف پر درج ہے جو کہ کسی وقت تیار کی گئی تھی۔ اگست ۱۹۴۲ء کی عام گرفتاری سے قبل اس فہرست میں انھی لوگوں کا نام تھا جو خاص طور پر خطرناک سمجھے گئے تھے اور بعد میں پوری تحقیقات کے بعد دفعہ ۲۶ کے ماتحت گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا۔

حلف نامہ ہوم سکریٹری

میں ڈی۔ ایس۔ بیرن سکریٹری صوبہ یوپی ہوم ڈیپارٹمنٹ باحلف بیان

کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں۔

(۱) یہ کہ میں سکریٹری صوبہ متحدہ گورنمنٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ہوں اور حکم مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء ۶۷۵۳ سی این میں نے جاری کیا ہے۔

(۲) یہ کہ اس حکم کے جاری ہونے سے قبل مولانا حسین احمد مدنی کا معاملہ اور معاملوں کے ساتھ گورنر کے سامنے رکھا گیا تھا اور ان کی نظر بندی کا مذکورہ بالا حکم ہز ایکسیلنسی کے حکم کے مطابق ان کے معاملے پر غور کر کے جاری کیا گیا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کے سامنے اس بیان حلفی کی تصدیق ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی ہے۔

فیصلہ

ہائی کورٹ الٰہ آباد محکمہ فوجداری نگرانی الٰہ آباد ۱۰ نومبر ۱۹۴۳ء

باجلاس سر اقبال احمد چیف جسٹس اور آنریبل آلسپ صاحب مقدمہ ۵۰۰ ۱۹۴۳ء

بادشاہ سلامت! بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل نینی

بنام مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے شیخ ولی محمد

حکم

یہ درخواست ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۴۹۱ کے مطابق دی گئی ہے۔ اس میں یہ استدعا کی گئی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی جو کہ نینی جیل میں نظر بند ہیں رہا کئے جائیں۔ مولانا مدنی کو ۵ جولائی ۱۹۴۲ء کو قید کی سزا ہوئی تھی اور اپیل کے فیصلے کے مطابق جنوری ۱۹۴۳ء میں ان کی سزا پوری ہو جاتی۔ اسی درمیان میں ان پر دفعہ ۲۶ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے مطابق یہ حکم جاری کیا گیا کہ یہ نظر بند کئے جائیں۔ یہ حکم ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء کو جاری ہوا۔ جنوری ۱۹۴۳ء سے مولانا اس حکم کے مطابق نظر بند ہیں۔ دلیل یہ دی گئی ہے کہ حکم طریقے سے جاری نہیں ہوا ہے اور اس حکم کا کوئی قانونی اثر نہیں ہے۔ جہاں تک طریقے کا سوال ہے ہماری سمجھ میں اعتراض یہ ہے کہ حکم صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کی جاری کیا گیا ہے جب کہ وہ گورنر کی طرف سے ہونا

چاہیے تھا۔ ہماری سمجھ میں یہ اعتراض کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب کہ گورنر گورنمنٹ آف انڈیا کی دفعہ ۹۳ کے مطابق گورنمنٹ کے پورے اختیارات خود کام میں لا رہا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مولینا مدنی کی نظربندی کے مسئلے پر خود گورنر نے غور نہیں کیا، سرکار کے ہوم سکریٹری نے ایک حلفی بیان داخل کیا ہے کہ مولینا مدنی کی نظربندی کا حکم خود گورنر کی ہدایت سے جاری کیا گیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ معاملہ گورنر کے سامنے رکھا گیا تھا، اور انھوں نے اس پر غور کر کے حکم جاری کیا ہے۔ اس بیان حلفی کے رہتے ہوئے ہمارے لئے یہ کہنا ناممکن ہے کہ گورنر نے حکم جاری نہیں کیا۔ یہ کہا گیا ہے کہ مولینا کی نظربندی کا حکم گورنر نے جاری کیا ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن بیان حلفی میں یہ کہا گیا ہے کہ گورنر کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا اور ان ہی نے حکم جاری کیا ہے تو ہمیں مان لینا چاہئے کہ گورنر ہی نے یہ حکم جاری کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس درخواست میں کوئی زور نہیں ہے اور ہم اس کو خارج کرتے ہیں۔

درخواست دہندہ کے وکیل نے فیڈرل کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت طلب کی ہے لیکن چونکہ اس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی تشریح کا معاملہ نہیں ہے اس لئے ہم ایسی اجازت دینے سے انکار کرتے ہیں۔"[1]

الٰہ آباد جیل کے حالات میں ایک اہم واقعہ حضرت کے ساتھ جیل کے کسی افسر کی دست درازی اور گستاخی کا بھی ہے۔ یہ قصہ کئی حضرات نے بیان کیا ہے مگر ان حکایتوں میں جذبات، صدمات اور اضطراب بھی شامل ہے۔ اس لیے صحیح اور واقعی کہانی حضرت ہی کی زبان سے معلوم ہو سکتی ہے:

"جب سے میں یہاں (یعنی جیل) آیا ہوں اس واقعے کے پیش آنے تک نہ میں کسی افسر اعلیٰ سے یا اس کے نائب سے ملا ہوں نہ وہ مجھ سے ملے ہیں۔ انھوں نے

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۱، ص ۲۸۸

مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ میں نے دور سے دیکھا تھا مگر صورت شناس نہ تھا، حکام جیل بالخصوص وہ شخص جو کہ سابقہ جیلوں میں چھوٹے عہدوں سے بڑھا ہو مثل زبانیہ جہنم نہایت سخت اور بدخو، بدزبان، تندخو ہوتے ہیں، بالخصوص اینگلو انڈین۔
میں عصر کے بعد اوراد و وظائف میں عموماً مشغول رہتا ہوں اور کمرے ہی کے اندر رہتا ہوں، مغرب کی نماز کے وقت نکلتا ہوں اور کمرے کے باہر ہی کمبل وغیرہ بچھا کر ہم چند مسلمان بارک کے اندر ہی پنج وقتہ نماز باجماعت پڑھا کرتے ہیں بعض مسلمان دوسری بارکوں سے آجاتے ہیں اور جو کہ اسی بارک میں رہتے ہیں جس میں ہوں یعنی نمبر ۱ میں وہ عشاء اور فجر میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ مغرب کے فرض ادا کرنے کے بعد نوافل میں ڈیڑھ دو پارہ پڑھا کرتا ہوں۔ اس کے بعد بارک کے مسلمان ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور پھر عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں ہو جاتے ہیں۔ بارکوں کے دروازے گرمیوں میں آٹھ بجے کے بعد بند ہوا کرتے تھے۔ جاڑوں میں ساڑھے سات بجے سے بند ہونے لگتے تھے۔ شمار اور گنتی ہر بارک کے آدمیوں کی بارک ہی میں ہوا کرتی ہے۔ پولیٹکل قیدی اپنی اپنی جگہوں پر گنے جاتے ہیں۔ میں نماز میں مشغول ہوتا تھا گننے والے کمرے میں ہوتے ہوئے گن جاتے تھے۔ اور اب بھی وہی حال ہے۔

افسر اعلیٰ نے اہل سرکل ۵ کے جیلر سے کہا کہ تم اپنے سرکل کی بارکوں کو سات بجے بند کرو۔ اس نے بعض ذمہ دار اشخاص سے کہا کہ افسر کا حکم سات بجے بند کرنے کا ہے۔ سرکل ۱ والے جن میں دوسرے پولیٹکل قیدی ہیں ساڑھے سات بجے بند ہو جاتے ہیں تم بھی اُس وقت بند ہو جایا کرو۔ اس نے جواب دیا کہ ہم نے بعض مطالبات سپرنٹنڈنٹ کو بھیجے ہیں ان کا جواب اب تک نہیں آیا جب تک وہ پورے نہ ہو جائیں ہم اس مطالبے کو پورا نہیں کریں گے۔ مگر اس کی مجھ کو اور میرے رفقاء کو کوئی خبر نہ تھی۔ مجھ کو اور میرے رفقاء کو اس بند ہونے پر نہ کوئی اعتراض تھا اور نہ ان کے متعلق کوئی سوال پیدا ہوتا تھا، کیونکہ مغرب سے پہلے وہ

سب بارک میں آجاتے تھے اور صبح تک وہاں رہتے تھے اور بالخصوص میں تو عصر سے تقریباً بند ہی رہتا ہوں بلکہ دوسرے اوقات میں بھی کمرے سے باہر بلا ضرورت نہیں نکلتا۔

افسر اعلیٰ کو یہ جواب اس کا ناگوار گزرا اور اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے اپنی فورس لے کر ساڑھے چھ بجے جب کہ عین مغرب کا وقت تھا بلا خبر اور بلا نوٹس سرکل مدہ میں داخل ہوا اور سب سے پہلے ہماری بارک میں داخل ہوا کیونکہ مدا اسی کا ہے۔ اس نے بارک میں جو لوگ موجود تھے حکم دیا کہ بارک سے باہر آؤ اور دھکے دے کر لوگوں کو باہر نکلوایا۔

میرا کمرہ بارک کے مشرقی کنارے پر ہے۔ وہ پہلے مغربی کنارے پر گیا اور جو لوگ اس طرف کمروں میں یا باہر کمروں کے تھے دھکے دے کر باہر نکالا پھر مشرقی کنارے پر آیا۔ ہمارے رفقاء مغرب کی نماز کی تیاری کر رہے تھے، کمبل اور چادر بچھا رہے تھے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اُن سے جب کہا گیا کہ باہر نکل جاؤ تو انھوں نے کہا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، نماز پڑھ لیں جس میں صرف پانچ چھ منٹ لگیں گے۔ اس کے بعد نکل جائیں گے۔ چھوٹا افسر جو کہ یورپین تھا اس کو سن کر ساکت ہو گیا۔ اتنے میں افسر اعلیٰ (سپرنٹنڈنٹ، اینگلو انڈین) پہنچ اور اس نے مولینا عبد الباری صاحب گورکھ پوری کی بنیائن میں اوپر سے ہاتھ ڈال کر کھینچا اور زور سے کہا نکل جاؤ۔ دوسروں نے پھر ان کو دھکا دیا۔ اسی طرح مولینا عبد السمیع صاحب سلطان پوری کو دھکا دیا گیا اور مولوی ماجد صاحب بستوی کو مارنے کے لئے بھی ہاتھ اٹھایا گیا۔ یہ سب یکے بعد دیگرے باہر نکل گئے میں کمرے میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ مجھ کو ان معاملات کی کوئی خبر نہ تھی۔ شور و شغب سن کر میں کھڑا ہوا تو دیکھتا ہوں کہ کمرے کے دروازے پر سپرنٹنڈنٹ کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ وارڈر اور نمبردار وغیرہ ہیں۔ انھوں نے کہا نکل جاؤ۔ میں نے کہا اچھا جوتا پہن لوں۔ میں اس وقت چمڑے کا موزہ پہنے ہوئے تھا جو کہ سردیوں

میں پہنا کرتا ہوں، میں کھڑاؤں لینے کے لئے بڑھنا چاہتا تھا کہ مجھ کو دھکا دیا گیا۔ میں اس دروازے کی طرف جو کہ بارک سے نکلنے کا ہے، چلا ہی تھا کہ دوسرا دھکا دیا گیا۔ اس کی وجہ سے عمامہ سر پر سے گرنے لگا میں اس کو سنبھالنا چاہتا تھا کہ تیسرا دھکا دیا گیا، میں اس کو سنبھال نہ سکا وہ گر گیا۔ پھر میں ٹوپی سنبھالنے لگا تو چوتھا زور سے دھکا دیا گیا۔ یہ اس قدر زور سے دھکا دیا گیا تھا کہ ٹوپی بھی گر پڑی اور میں سنبھل نہ جاتا تو زمین پر گر پڑتا۔ بہرحال میں ننگے سر اور ننگے پاؤں وہی موزے پہنے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے دو منٹ بعد سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سب باہر آگئے۔ مجھ سے سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ آپ نے تو کمرے کو ہوٹل بنا رکھا ہے۔ میں نے کہا کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ بارک میں چلے جاؤ، ہم لوگ پھر ایک ایک کرکے داخل ہوگئے، اور گننے کے بعد بارک بند ہوگئی۔

صبح کو ہم چار آدمیوں نے عرضی لکھی کہ ہمارے ساتھ ایسا ایسا معاملہ کیا گیا ہے، ہمیں ہمارے مشیر قانونی لاری صاحب سے ملایا جائے تاکہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرسکیں۔ ۲ بجے ضلع بہرائچ کے سیاسی قیدی سردار جوگندر سنگھ آئے۔ وہ اس واقعہ پر بہت برہم تھے۔ انھوں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل وسط جیل کی چوکی تین مولانی میں آیا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کل کے واقعہ کا مجھے بہت افسوس ہے، میں مولانا مدنی کو پہچانتا نہیں تھا اُن کو بلا دو میں اُن سے معافی مانگوں گا۔ میں نے ان کو بہت لعنت ملامت کی ہے۔ میری رائے ہے کہ تو میرے ساتھ چل کر اُسے معافی دے دے۔ میں نے کہا یہ پوری جماعت کا مسئلہ ہے اس لئے آپ سب سے پوچھئے۔ انھوں نے ہر بارک سے چیدہ چیدہ لوگ بلائے اور سب سے مشورہ کیا۔ سب نے رائے دی کہ جب وہ معافی مانگ رہا ہے تو معافی دے دینی چاہیئے۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ جاکر اس سے کہہ دیجئے کہ حسین احمد نے معاف کردیا۔ مگر چیف وارڈر نے کہا کہ وہیں چل کر معافی دینی چاہیئے۔ میں چلا گیا۔ اس نے کہا کہ مجھے افسوس ہے اور میں معافی

چاہتا ہوں پھر میں چلا آیا۔[1]

یکم نومبر ۴۲ء کو یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ حضرت نے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی مگر رفتہ رفتہ پورے ملک میں خبر پھیل گئی اور غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حضرت نے تو معافی دے دی تھی مگر عوام اور معتقدین کے رنج و غم میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اور شہروں میں جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہو رہے تھے۔ اخبارات میں آرٹیکل لکھے گئے اور ریزولیوشن پاس کیے گئے۔ ۲۶ نومبر ۴۲ء کو تمام ہندوستان میں احتجاجی اجتماعات کیے گئے۔ ۳۰ نومبر کو اخبارات میں یوپی کے گورنر کا کمیونک شائع ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ متعلقہ نے معافی مانگ لی اور اب حضرت افسرانِ جیل سے مطمئن ہیں۔ اس پر بھی عوام کا مطالبہ جاری رہا کہ سپرنٹنڈنٹ کو قرار واقعی سزا دی جائے مگر آخر میں حضرت کا پیغام پہنچا کہ ہم نے معاف کر دیا ہے اس لئے اب کوئی مطالبہ نہیں ہونا چاہیے۔

جیل کے باہر بھی حضرت کے خلاف ایک کارروائی ہو رہی تھی۔ ایک عرصے سے حضرت کو مدرسہ دیوبند سے الگ کرنے بلکہ نکالنے کی سازشیں جاری تھیں۔ ان میں حکومت تو پیش پیش تھی ہی بعض علماء، فضلاء اور ذمے دارانِ مدرسہ بھی اس رجحان سے متاثر تھے۔ حکومت کے حاشیہ برداران، وظیفہ خواران اور فرزندان و دلبندان ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ حضرت کی موجودگی میں عظمت و عزیمت، مقبولیت و محبوبیت اور جرأت و شجاعت کے آگے کوئی وار اور کوئی چال کامیاب نہ ہوتی تھی۔ مگر گرفتاری کے بعد حکومت کی پالیسی دیکھ کر ان کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ جیل سے چھوٹتے چھوٹتے کچھ نہیں تو چار چھ برس تو گزر ہی جائیں گے۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور حملے کا پروگرام بنا لیا گیا تھا۔ حضرت عام زندگی میں ہمیشہ ہر قسم کی ریشہ دوانیوں سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے اور اب تو دست بستہ، پا بہ زنجیر جیل کی سلاخوں میں بند تھے۔ کسی قسم کی مقاومت یا دفاع کا بھی اندیشہ نہیں تھا۔ مخالف جماعت سرکاری حلقوں، بڑی شخصیتوں اور معروف علماء کرام پر مشتمل تھی مگر دفعتہ

---

[1] مکتوبات ج ۱، ص ۲۰۴

کے بھید اللہ ہی جانتا ہے، جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں، پلان تیار ہو گیا اور کہیں کہیں منہ میٹھا کرنے کرانے کے انتظامات بھی ہو گئے تو عین وقت پر معلوم نہیں کیا پیچ پڑا کہ حضرت پر تو کوئی حرف نہ آیا لیکن سارے حضرات کو مدرسہ سے الگ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیلات ہم علاحدہ باب میں جمعیۃ علماء اسلام کے عنوان میں پیش کریں گے۔

قصہ مختصر کہ ۱۹۴۳ء ختم ہوتے ہوتے ادھر تو کوئٹ انڈیا کی تحریک کمزور پڑنے لگی اور اُدھر جنگ کی صورت حالات کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی پالیسی بھی بدلنے لگی۔ اب کانگریسی اور سیاسی قیدی آہستہ آہستہ چھوڑے جانے لگے۔ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رہائی کی خبریں بھی سنی جانے لگیں۔ ایک دن ۲۰ر اگست ۱۹۴۳ء کو اچانک حضرت کو اطلاع دی گئی کہ آپ کو رہا کر دیا گیا اور اب جلد از جلد جیل سے باہر چلے جائیے۔ رہائی کے دن کا واقعہ حضرت ہی سے سنئے:

۹ رمضان المبارک، بروز شنبہ تقریباً ۳ بجے دن کو حکم پہنچا کر مجھ کو بلا شرط رہا کر دیا گیا اور ابھی روانگی ہے۔ چنانچہ منتشر اشیا کو جلد از جلد اٹھایا گیا اور تمام کارروائیاں انجام دے کر تقریباً ۶ بجے شام کو نینی جیل سے باہر آنا ہوا۔ یہ جگہ شہر الٰہ آباد سے تقریباً ۶ میل دور ہے۔ سواری کا انتظام کرنا پڑا جس کی وجہ سے کافی دیر ہو گئی۔ بعد از مغرب تقریباً آدھ گھنٹہ گزر جانے پر روانگی ہوئی۔ مولانا غلام حسین (ابوالحسن حیدری) موجود نہ تھے۔ ان کے صاحبزادے تانگہ لے کر پہنچے اور تقریباً ساڑھے نو یا دس بجے ہم ان کے مستقر پر پہنچ گئے۔ اسی وقت شب میں تار سے متعدد مقامات پر اطلاع دی۔ چنانچہ دہلی میں ناظم اعلیٰ صاحب اور حاجی صاحب کو اطلاع دے دی۔ مولانا (ابوالحسن حیدری) کے انتظار میں اور بعض احباب سے ملاقات وغیرہ کی غرض سے اتوار کو ٹھہرنا پڑا۔ آج بروز دوشنبہ ۱۰ بجے کی گاڑی سے روانہ ہو کر جونپور اتروں گا کیونکہ شیخ صاحب جونپوری بہت بیمار ہیں۔ وہاں چند گھنٹے ٹھہر کر دہرہ دون ایکسپریس سے ٹانڈہ جاؤں گا۔ پھر وہاں سے دو ایک دن بعد لکھنؤ مراد آباد ہوتا ہوا تقریباً ۱۴، ۱۵ر رمضان المبارک

کر یا اس سے پہلے دیوبند پہنچوں گا۔[1]

اس بار حضرت کل دو سال دو ماہ اور دو دن جیل میں رہے اور رہائی کے دس دن بعد مختلف جگہوں پر ہوتے ہوئے ۱۷ر رمضان شریف کو دیوبند تشریف فرما ہوئے۔ یہاں عدیم المثال استقبال جلوس اور تہنیتی جلسہ ہوا۔ اس کے بعد دو دن دیوبند میں قیام کرکے حسب معمول سلہٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔

---

[1] مکتوبات ج ۲، ص ۱۰۰

سلہٹ کی روانگی

۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۶ء

مزاجاً اور طبیعتاً حضرت رحمۃ اللہ بہت وضعدار اور تعلقات نواز تھے۔ جن لوگوں سے اور جن مقامات سے جتنا بھی تعلق ہو جاتا تھا اگر شریعت سنت اور تقویٰ کے پہلو سے کوئی قباحت مانع نہ آجاتی تھی تو اس تعلق کو ہر قیمت پر نبھاتے تھے۔ اس موضوع پر مضمون بہت طویل ہے مگر اس کا حضرت کے اخلاق، عادات اور سیرت کے باب میں مذکور ہونا مناسب ہے۔ یہاں ہمیں صرف سلہٹ میں حضرت کے قیام اور ہر سال وہاں کے سفر کے بارے میں عرض کرنا ہے کہ کون سی ایسی خصوصیت اور تعلق تھا جس کی بنا پر اتنے اہتمام اور پابندی سے وہاں جاتے تھے اور ایک ماہ مسلسل وہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دو ڈھائی سال بعد جیل سے چھوٹے تو رمضان کے دس ہی بارہ دن رہ گئے تھے مگر وہ بھی سلہٹ ہی میں گزارے۔ یہ قصہ ۱۹۲۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب حضرت نے دار الحدیث سلہٹ میں تدریس حدیث کی مسند کو رونق بخشی تھی۔ وہاں کے عوام و خواص نے حضرت سے اس قدر عقیدت، ارادت اور محبت کا برتاؤ کیا اور دینی اعتبار سے اتنا فیض حاصل کیا کہ جب تک وہاں رہے لوگ ہزاروں کی تعداد میں پروانہ وار فدا ہوتے رہے اور حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے رہے۔ مگر اچانک جب دیوبند کے حالات نے مجبور کیا اور حضرت نے سلہٹ سے واپسی کا ارادہ کیا تو نہ صرف ضلع سلہٹ کے بلکہ پورے صوبہ آسام کے لوگوں نے روکنے پر بہت زیادہ اصرار کیا اور عرض کیا کہ دیوبند کی مصالح اپنی جگہ ہیں لیکن آپ جہاں رہیں گے وہیں دیوبند اور مرکزیت پیدا ہو جائے گی۔ اس پورے علاقے میں آپ کے قیام کی وجہ سے ایک مرکزی شان پیدا ہو گئی ہے اور فیضان جاری ہو گیا ہے۔ آپ کے چلے جانے سے یہ سوتا خشک ہو جائے گا۔ بہت افہام و تفہیم کے بعد وہاں کے حضرات اس شرط پر راضی ہوئے کہ جیتے جی حضرت ہر سال رمضان شریف سلہٹ میں گزاریں گے جو آسام کا مرکزی شہر ہے۔ حضرت نے وعدہ کر لیا اور اس وعدے کو

آخر تک نباہا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگی حضرات کے ہاتھوں جب جان خطرے میں پڑ گئی اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوا۔ دیوبند کے تعلیمی سال کے اختتام پر ماہ شعبان کے آخر میں حضرت سلہٹ کے لئے روانہ ہوا کرتے تھے۔ اُدھر بخاری شریف کے ختم کا اہتمام ہوتا تھا اِدھر سفر کی تیاری جاری رہتی تھی۔ یہ ختم بھی بڑے انتظام اور شان سے ہوتا تھا۔ سارے سال تو درس میں احادیث پر علمی، روایتی اور درایتی تقریریں ہوتی تھیں۔ آدھی کتاب یعنی بخاری شریف کے پندرہ پارے ہوتے ہوتے تفصیلی مباحث ختم ہو جاتے تھے اور ساتھ ہی تعلیمی سال بھی انتہا کے قریب ہو جاتا تھا۔ مشکل سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ باقی رہ جاتا تھا جس میں اگلے پندرہ پاروں کی صرف قراۃ باقی رہ جاتی تھی۔ اِن کو ختم کرنے کے لئے حضرت دن اور رات کے سولہ اور اٹھارہ گھنٹوں تک دار الحدیث میں گزارتے تھے۔ آخر آخر میں تو یہ ہو جاتا تھا کہ فجر کے فوراً بعد ۹ بجے تک پھر دس بجے کے بعد ۱۲ بجے تک پھر ظہر سے لے کر عصر تک، مغرب سے عشاء تک اور عشاء سے ۱۲ بجے رات تک قراۃ حدیث ہوتی تھی۔ حدیث کے ڈھائی تین سو طالب علم ہوتے تھے اور وہ سارے ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں سے بھی صرف حضرت سے اجازت حدیث کے حصول کے لئے آتے تھے۔ یوں تو شروع ہی سے ختم بخاری کے موقع پر بہت سے مقامی حضرات آخری سبق میں حاضر ہو جاتے تھے مگر آخری دس سالوں میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ دور دراز سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس دعا میں شرکت اور ختم بخاری شریف کی برکت سے فیضیاب ہونے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ یہ سب حضرت ہی کے مہمان ہوتے تھے اور کئی کئی دیگیں کھانوں کی دن بھر چڑھتی اور اترتی رہتی تھیں۔ اُدھر تو دولت خانے پر اندر باہر ہجوم اتنا کہ کہیں بیٹھنے کی جگہ مشکل، ادھر بہت سے مہمانان کرام حضرت سے خصوصی توجہ اور گفتگو کے بھی طالب ہوتے تھے دوسری طرف اسباق کی مسلسل رفتار تیسرے سفر کی تیاریوں کی مشغولیت اور سب پر مستزاد یہ کہ مہمان لمحہ بہ لمحہ سیلاب کی طرح بڑھے آتے تھے۔ دار الحدیث کا پورا ہال پانچ چھ سو افراد سے بھر جاتا تو برآمدے میں اتنے ہی افراد کے لئے انتظام ہوتا وہ بھی بھر جاتا تو راہداریوں میں اور پھر سیڑھیوں پر اور آخر میں نوبت نیچے کے میدانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ اور خدا خدا کر کے آخری سبق شروع ہوتا۔ اب

حضرت خود قرأت فرماتے۔ جیسے جیسے کتاب اختتام کے قریب ہوتی طالبین حدیث کے قلوب سوز و گداز سے معمور ہوتے جاتے۔ آج طالب علمی کا زمانہ‘ اساتذہ کرام کی صحبتیں‘ حضرت شیخ کی خدمت میں چوبیس گھنٹے کی حاضری کی نعمتیں اور دار العلوم دیوبند کی سدابہار اور علمی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہوتی ہے۔ نہ جانے یہ دولتیں پھر کبھی نصیب ہوں یا نہیں اور خدا ہی جانے کہ ہم سے خدمت حدیث شریف اور تدریس دین کا فریضہ کما حقہٗ ادا ہو سکے یا نہ ہو۔ شروع میں صرف آنسو جاری ہوتے پھر سسکیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں شروع ہوتیں اور جب حضرت سوز و گداز سے بھرپور آواز میں آخری حدیث شریف قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان ختم کرتے تھے تو مہمانان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رونے کی آوازیں پھوٹ پڑتی تھیں۔ اس کے فوراً بعد حضرت ایک مختصر سی تقریر میں طلبائے کرام کو حدیث شریف کی روایت کی اجازت دیتے تھے کہ جیسے میرے اساتذہ اور شیوخ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے مجھے روایت حدیث کی اجازت دی تھی اسی ضابطے کے مطابق میں آج آپ کو اجازت دیتا ہوں‘ اس کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے اور ابتدائی دو چار جملے‘ الحمد للہ۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ جہراً ادا کرتے تھے اس کے بعد کم و بیش بیس منٹ آدھ گھنٹے تک سراً دعا کرتے تھے جس میں سارے ہزار ڈیڑھ ہزار حاضرین شریک ہوتے تھے اور ماحول پر ایسا تاثر اور مقبولیت طاری ہوتی تھی کہ ہر ہر فرد بے اختیار ہو جاتا تھا اور ایک گھنٹے تک آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوتی رہتی تھیں۔ دعا کے بعد حضرت اُن سیکڑوں بوتلوں‘ شیشیوں اور ظروف پر دم کرتے تھے جن میں معتقدین و مریدین اور طلبا و علما پانی بھر کر لاتے تھے کہ ایسی مقبولیت اور نزول رحمت کے موقع پر پھونک ڈلوالیں۔ ختم بخاری شریف عموماً رات کو ایک دو بجے ہوتا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد حضرت سلہٹ کے لئے مع جمیع اہل خانہ‘ قاری اصغر علی صاحب اور مولانا محمد جلیل صاحب رحمہم اللہ کے بذریعہ کار اور لاری روانہ ہو جاتے تھے۔ سہارن پور اسٹیشن پر جہاں سے حضرت کو ٹرین پکڑنی ہوتی تھی۔ سیکڑوں مشتاقان زیارت کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ یہاں سے روانہ ہو کر ایک یا دو دن کے لئے حسب گنجائش وطن

مالوف ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں قیام فرماکر وہاں سے سیدھے کلکتہ پہنچتے تھے جہاں ایک یا دو دن حسب ضرورت وگنجائش قیام فرماتے تھے، کلکتہ سے سلہٹ کے لئے روانہ ہوتے تھے۔ وہاں کے لوگ بڑی بے چینی اور شوق سے تشریف آوری کا انتظار کرتے تھے اور آمد پر پچاسوں حضرات سلہٹ سے بہت پہلے ایک جنکشن اسٹیشن 'کلاوڑہ' پر پیشوائی کے لئے حاضر رہتے تھے۔ سلہٹ ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع استقبال کے لئے موجود رہتا تھا۔ وہاں حضرت اپنے ایک مخلص داروغہ عبدالستار صاحب مرحوم کے مکان پر قیام فرماتے تھے۔ عموماً رمضان شریف کی پہلی تاریخ کو یا ایک آدھ روز پہلے پہنچتے تھے۔ اور پہنچتے ہی بلا ادنیٰ تاخیر کے اپنے معمولات میں مشغول ہوجاتے تھے۔ قیام گاہ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک مسجد جو نئی سڑک کی مسجد کہلاتی تھی اس میں نمازیں اور تراویح اور اعتکاف ادا کرتے تھے۔ عصر سے پہلے اس مسجد میں تشریف فرما ہوجاتے تھے۔ عصر بعد ایک گوشے میں مولانا محمد جلیل صاحب اور قاری اصغر علی صاحب کو قرآن پاک سناتے تھے۔ اس میں بہت سے حضرات شریک رہتے تھے۔ افطار سے دو چار منٹ پہلے یہ دور ختم ہوتا تھا اور وہیں افطار کا دسترخوان لگ جاتا تھا۔ افطار ہمیشہ نہایت مختصر، ایک دو قاشیں کسی پھل انناس، پپیتے یا آم کی۔ ایک دو گھونٹ کسی لیموں، تخم بالنگا یا بادام کے شربت کے اور ایک ہی دو لقمے کسی کھانے حلوہ، پڈنگ، چنے یا پھلکیوں کے تناول فرماتے تھے۔ نماز خود ہی پڑھاتے تھے اور مغرب بعد فوراً دعوت میں تشریف لے جاتے تھے۔ یہ دعوتیں مہینوں پہلے سے طے شدہ اور مرتب ہوتی تھیں اور ان میں سارے ہمراہی، اہل خانہ، میزبان اور بہت سے خدام مدعو ہوتے تھے جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ یوں تو جو صاحبان بھی حضرت کو مدعو کرتے تھے دیدۂ و دل فرش راہ کردیتے تھے مگر جو شوق، اہتمام، اقسام و انواع کی نعمتیں سلہٹ کی ان دعوتوں میں دیکھیں شاہی دسترخوانوں پر بھی دعوتیں کھائیں مگر وہ بات پھر نظر نہ آئی۔ کھانے کے باب میں حضرت کی ایک عادت اور طبیعت ثانیہ تھی جو پلیٹ یا ڈش سامنے ہوتی تھی صرف اسی میں سے کھاتے تھے۔ دور کی ڈشوں میں چاہے کچھ ہو ہاتھ بڑھا کر نہیں لیتے تھے، دوسرے یہ کہ نہ کبھی کسی اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کی زیادہ تعریف کرتے تھے نہ کسی کمزوری کا اظہار کرتے تھے حتیٰ کہ کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ

فلاں چیز میں نمک نہیں ہے یا اتنا زیادہ ہے کہ لقمہ اتارنا مشکل ہے۔ بس خاموشی سے کھا لیتے تھے۔ مگر قاری اصغر علی صاحب اور مولانا جلیل صاحب کھانا گفتگو اور کھانے کے دوران میں بھی کچھ شگفتہ باتیں اور کچھ پُر لطف حکایتیں بیان کرتے تھے جن میں حضرت بھی بشاشت کے ساتھ حصہ لیتے تھے اور اسی ضمن میں قاری صاحب اور مولانا صاحب بعض کھانوں کی قدر افزائی اور تاریخ بھی بیان فرماتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف یہی وقت ایسا ہوتا تھا جس میں عبادت سے ہٹ کر کچھ آپس داری اور پاسداری کی باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد نماز تراویح ہوتی تھی جس میں حضرت ڈیڑھ پارہ سناتے تھے۔ تراویح کے بعد حضرت مختصر سی تقریر فرماتے تھے اور پھر قیام گاہ پر استراحت فرماتے تھے۔ ۲ بجے تہجد کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے جس میں مولانا جلیل صاحب ایک پارہ پڑھتے تھے۔ سحری کے بعد نماز فجر اور اس کے بعد دس یا گیارہ بجے تک آرام فرماتے تھے۔ پھر ظہر اور اس کے بعد عصر تک نمازیں، تلاوت کلام پاک اور وظائف جاری رہتے تھے۔ بیس تاریخ سے اسی مسجد میں اعتکاف کرتے تھے اور حضرت کے ساتھ سیکڑوں معتقدین و مریدین اعتکاف میں شریک ہوتے تھے۔ مسجد کے وسیع احاطے میں ایک طرف ہوٹل کھل جاتا تھا اور پوری مسجد بھر جاتی تھی۔ آپ مغرب بعد افطار کر کے طالبین حق کو داخل سلسلہ فرماتے تھے جن کی تعداد سیکڑوں اور آخر میں ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔ وصال سے کچھ پہلے جب تقسیم ہند کی وجہ سے سلہٹ کے قریب ہندوستانی علاقے میں رمضان گذارنے لگے تھے تو مرید ہونے والوں کی تعداد روزانہ پانچ پانچ اور چھ چھ ہزار ہونے لگی تھی اور داخل سلسلہ کرنے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس باب میں بہت سے اضافے ہوئے ہوں گے مگر یہاں صرف وہ حالات بیان ہوئے ہیں جو راقم الحروف نے خود مشاہدہ و مطالعہ کئے تھے۔

جنگ کا اختتام-آزادی کے آثار

یوں تو ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہر سال ہر مہینہ اور ہر دن جنگ آزادی کے واقعات، حادثات اور یادگاروں سے معمور ہے مگر ۱۹۴۲ء کی تحریک کے بعد جس کو 'ہندوستان سے نکل جاؤ' کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ملک کا بچّہ بچّہ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آگ اور خون کے میدان میں کود پڑا تھا۔ اُدھر جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ برما اور سنگاپور کے جاپانی جنگی محاذ پر ہندوستانی فوجوں کے ایک بڑے حصے نے برطانیہ سے بغاوت کر کے آزاد ہند فوج بنالی تھی جس کے کمانڈر انچیف سبھاش چندر بوس مقرر کئے گئے تھے۔ اس کے جرنیلوں میں جنرل شاہنواز، کیپٹن ڈھلن اور سہگل وغیرہ کے نام ہندوستان کی گلی گلی میں گونج رہے تھے۔ جاپان اس آزاد ہند فوج کی تائید و نصرت کر رہا تھا۔ سبھاش چندر بوس رنگون میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر حاضر ہوئے۔ پھولوں کی چادر چڑھاکر نذر گذارنی حلف وفاداری لیا اور قسم کھاکر عہد کیا کہ ہندوستان کو آزاد کراؤں گا یا جان دے دوں گا۔ اس کارروائی کا برطانیہ پر تو بہت بُرا اثر پڑا مگر ہندوستانی عوام کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اسی درمیان ۶؍ جون ۱۹۴۴ء کو اتحادی یعنی برطانیہ وغیرہ کی فوجوں نے نارمنڈی کے مقام پر جرمن فوجوں پر بڑا فیصلہ کن حملہ کیا۔ کہتے ہیں کہ یہ اس جنگ کی سب سے بھرپور لڑائی تھی۔ اس میں جرمنی کو زبردست شکست ہوئی اور اس کی پانچ لاکھ فوج تباہ و برباد ہوگئی اور اس کے بعد ہی سے جرمنی کا زور دن بدن گھٹتا ہی چلا گیا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے جنگ کے شروع ہی میں اپنی سیاسی چالوں، فوجی تبدیلیوں اور جنگی داؤ پیچ کے بھروسے پر دو انگلیوں سے انگریزی کا حرف وی بنا کر دنیا کو دکھلایا تھا کہ وکٹری ہماری ہی ہوگی۔ جنگ کی صورت حال ایسی تھی کہ برطانیہ کی فتح کی یہ علامت دنیا کو مذاق معلوم ہوتی تھی مگر آخر کار ۲۸؍ اپریل ۱۹۴۵ء کو اٹلی کا مرد آہن اور ہٹلر کا ساتھی مسولینی گرفتار ہو گیا۔ اس کے ساتھ

بھی اتحادی فوجیں برلن کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ اب ہٹلر کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے برلن کے فوجی ہیڈ کوارٹر کے ایک تہ خانے میں اپنے تین چار اعلیٰ کمانڈروں کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ مجھے گولی مارو اور میری لاش کو پٹرول چھڑک کر آگ لگادو اور پھر تم سب بھی خودکشی کرلو۔ فضا میں ہٹلر کا آخری حکم گونجا۔ ایک، دو، تین، فائر اور گولیوں کی باڑھ نے اس کے جسم کو چھلنی کرڈالا۔ اس کے بعد جرمنی کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس طرح چرچل کی فتح کی علامت کامیاب ہوکر ہی رہی۔ لیکن اس فتح کے ساتھ ہی برطانیہ کی عظمت اور اقبال کا آفتاب بھی ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ انگریز قوم نے چرچل کو بیک بینی و دوگوش وزارت عظمیٰ کے منصب سے نکال پھینکا۔ یہ فتح کوئی کارنامہ نہ تھی۔ اور نہ یہ حکمت عمل کوئی کامیابی تھی۔ برطانیہ کھنڈر بن چکا تھا۔ دنیا کے چار کروڑ انسان اس جنگ نے نگل لئے تھے اور پانچ کروڑ عمر بھر کے لئے لولے لنگڑے ہوگئے تھے[1] اور برطانوی سامراج ہمیشہ کے لئے راہیِ ملکِ عدم ہوچکا تھا۔ بہرحال نام ہی کی ہی مگر اس محاذ پر اتحادیوں کو فتح ہو ہی گئی تھی۔ لیکن ابھی ایک بڑی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ جاپان کا زور ابھی نہیں گھٹا تھا۔ یہ فوجیں گوشت پوست کی نہیں لوہے پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ پیچھے ہٹنے، بھاگنے اور پسپا ہونے کے الفاظ ان کی لغت میں موجود ہی نہیں تھے۔ یا اپنے کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرتے تھے یا موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ جو مرنے کے لئے تیار ہو جائے وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔ ان کی بے جگری، بہادری اور خون خواری کے سیکڑوں قصے اس زمانے میں زبان زد خاص و عام تھے۔ اتحادیوں کا ایک فولادی جہاز جاپان پر حملے کے لئے روانہ ہوا۔ جاپانی ہوائی جہازوں نے اسے بیچ سمندر میں آلیا۔ سیکڑوں نشانے باندھے، بیسوں گولے مارے مگر موٹی فولادی چادر سے بنے ہوئے اس جہاز پر خراش تک نہ آئی اور وہ لمحہ بہ لمحہ جاپان کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ جاپانی کمانڈروں نے سر جوڑ کر مشورہ کیا اور اعلان کیا کہ دشمن کی اس کارروائی کی کاٹ کے لئے دو انسانی جانوں کی ضرورت ہے۔ دو نوعمر و نوخیز

---

[1] انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا، باب جنگ عظیم دوم

جاپانی دوشیزاؤں نے اپنی جانیں پیش کیں اور ایک ہوائی جہاز کے ذریعے اس جنگی بحری جہاز کی طرف روانہ ہوئیں اور اس کے اوپر پہنچ کر اپنے نازک جسموں سے بم باندھ کر دونوں لڑکیاں جہاز کی دونوں چمنیوں میں کود گئیں۔ انجن کے قلب میں پہنچ کر وہ دونوں بم پھٹے اور جہاز کے پرخچے اڑ گئے۔ اگر کچھ دن جاپانیوں کا یہی رنگ باقی رہ جاتا تو اتحادی جیتی ہوئی بازی ہار چلے تھے۔ مگر اچانک امریکیوں نے اپنا آخری قیامت خیز ہلاکت اور درندگی و بربریت کا شاہکار ہتھیار استعمال کیا اور ۱۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کی ایک ہنستی کھیلتی آبادی اور زندگی سے بھرپور شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا اور دوسرے دن ایک دوسرے شہر ناگاساکی کو بھی اسی بم کا نشانہ بنایا۔ یہ بم اتنے ہلاکت خیز، زہریلے اور خوفناک تھے کہ بیسوں میل کی دوری پر پھیلے ہوئے یہ دونوں شہر چشم زدن میں جل کر راکھ ہو گئے۔ اور اب جاپان نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ بہرحال جرمن اور جاپان تو ہار ہی گئے، مگر برطانیہ بھی اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہ رہا اور اس کا گذارہ مشکل ہو گیا۔ امریکہ اور بعض دوسرے یورپین ممالک اس پر بہت پہلے سے زور دے رہے تھے کہ ہندوستان کو آزاد کرو۔ ادھر ہندوستان میں اس کے خلاف کھلی بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ ۱۴ اپریل ۱۹۴۴ء کو دھولیہ کے چند نوجوانوں نے حکومت کی ایک کار روک لی، ڈرائیور اور پولیس کے محافظ سپاہی کو گولی مار دی اور پانچ لاکھ روپے چھین لئے۔ حکومت نے مجرمین کو پکڑنے کی لاکھ کوششیں کیں، آس پاس کی آبادیوں اور دیہاتوں کے لوگوں کو پکڑ کر ہر طرح کی سختیاں کیں اور مارنے والوں کا پتہ نشان معلوم کرنا چاہا مگر عوام نے کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہ دیا۔ اسی تاریخ کو بمبئی میں جنگی ضروریات سے بھرے ہوئے ایک جہاز میں آگ لگ گئی، کروڑوں روپے کا سامان چشم زدن میں جل کر راکھ ہو گیا[۱]۔ حکومت نے سر پٹک لیا مگر آتشزدگی کے اسباب کا ابتدائی اندازہ بھی نہ لگ سکا۔ آخر آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پولیس اور فوج کے سپاہیوں نے انگریز کمانڈرس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور علی الاعلان ملکی و قومی معاملات میں دلچسپی لینے لگی۔

ان حالات اور ایسے ماحول میں جمعیۃ علماء ہند کا چودھواں سالانہ اجلاس جونپور میں

---

[۱] یحییٰ ابن اختر انصاری، مولانا آزاد کی ڈائری

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اپنے وقت اور ہندوستان کے سیاسی ماحول کے اعتبار سے یہ اجلاس نہایت فیصلہ کن، اہم اور تاریخی اجلاس تھا۔ اس میں جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کے علاوہ ہندوستان بھر کے حریت پسند اور نیشنلسٹ لیڈران شریک ہوئے تھے اور بعض نے بڑی معرکۃ الآرا تقریریں بھی کی تھیں۔ اس میں حضرت نے اڑتالیس صفحے کا بڑا مبسوط اور پُر مغز خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اپنے مشتملات، سیاسی معلومات اور فیصلہ کن بیانات کے پیش نظر یہ خطبہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس اہمیت کا مستحق ہے کہ شروع سے آخر تک نقل کیا جائے مگر وقت اور گنجائش کی قلت ایک بار پھر مانع نگارش ہے تاہم بعض چیدہ چیدہ اقتباسات سے اصل موضوع کا کچھ تو اندازہ ہو ہی جائیگا۔

ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی بدحالی کا تذکرہ کرتے ہوئے اور زبردستی جنگ عظیم میں اسے داخل کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

"ایسے ناتواں، نیم مُردہ اور جاں بلب ملک کو ان سخت دل اور بے رحم آقاؤں نے ۱۹۳۹ء کی جنگ عمومی میں بغیر اس کی رضامندی کے دھکیل دیا تھا۔ اس نے شور مچایا کہ مجھ کو کسی لڑائی اور صلح سے کیا غرض ہے۔ میں نہ جرمن کا دوست یا دشمن ہوں نہ امریکہ کا، میں خود غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ مجھ کو صرف آزادی کی ضرورت ہے، مگر اس کی ایک نہ سنی گئی اور جنگ کی مخالفت کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ مقدمے چلائے گئے، جرمانے کئے گئے اور جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا اور لاکھوں بے قصوروں کو اس کا نشانہ بنایا گیا۔ آرمی بل پاس کیا گیا جس کی رو سے فوج کی بھرتی سے روکنا جرم قرار پایا۔ ڈاک تار پر سنسر بٹھا دیا گیا۔ پریس کی آزادی ختم کردی گئی۔ ملوں اور کارخانوں پر قبضہ کر کے ان کی پیداوار صرف جنگی ضروریات کے لئے مخصوص کر دی گئیں۔ ملک کی زرعی پیداوار پر قبضہ کر کے عوام کو اُن سے محروم کر دیا گیا۔ ریلوں اور انجنوں پر کنٹرول کر کے انہیں فوجی نقل و حرکت کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔"

یہ چند سطریں صرف نمونے کے طور پر نقل کی گئی ہیں۔ حضرت نے آٹھ نو صفحات میں اعداد و

شمار کے ساتھ ضروریات زندگی کی فہرست اور وہ مقداریں پیش کی ہیں جو ہندوستان سے جنگی ضروریات کے لئے بجبر واکراہ وصول کر کے جنگی رسد کے لئے روانہ کی جاتی رہی تھیں یہ ساری تفاصیل تاریخی اعتبار سے بڑی قیمتی مستندات ہیں۔ اسی ذیل میں حضرت نے قحط بنگال کی دلخراش تصویر کھینچی اور بتلایا کہ مختلف مشاہدین نے قحط میں مرنے والوں کی الگ الگ تعداد بتلائی ہے۔ وزیر ہند اٹھارہ لاکھ تہتر ہزار سات سو انچاس موتیں بتلاتے ہیں لیکن ڈاکٹر جی سی رائے صدر میڈیکل ریلیف کا اندازہ تیس لاکھ موتوں کا ہے۔ کئی اخباروں نے تِتّیے لاکھ افراد کی موت بیان کی ہے۔ یہ ساری تباہی حکومت برطانیہ کی سنگ دلی اور ظلم کا نتیجہ تھی۔

برطانیہ کی ان پالیسیوں کا بڑے شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ:

> "آزادی کی جدوجہد ہر ہندوستانی کے لئے انتہائی ضروری ہے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی عقلاً، شرعاً اور انسانیتہً فرض ہے۔ غلامی کی حالت میں انسان کا مذہب محفوظ رہتا ہے نہ زندگی، نہ امن باقی رہتا ہے نہ رفاہیت و خوشی ہی رہتی ہے۔"

علماء اور جمعیۃ علماء کی خدمات کے تذکرے میں بیان کیا کہ جمعیۃ علماء کی خدمات کا میدان مسلمانوں کے مذہبی امور کی تنظیم و تبلیغ ہے ساتھ ہی ہم کانگریس کے ساتھ جدوجہد آزادی میں بھی برابر کے شریک ہیں مگر نہ اس کے تابع ہیں نہ اس میں ضم ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں کانگریس سول نافرمانی کر رہی تھی، جمعیۃ بھی اپنے علٰحدہ پروگرام کے مطابق اس میدان میں صف آرا تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے سول نافرمانی کی تحریک میں مالی امداد دینی چاہی تو جمعیۃ علماء نے صاف انکار کر دیا کہ ہم اپنے فریضے کی ادائیگی کے لئے مسلمانوں ہی کی امداد سے کام چلائیں گے۔ اسی کے ساتھ خطبے میں کانگریس کی مختصر تاریخ کی طرف اشارہ کر کے حضرت نے یہ بتلایا ہے کہ آزادی کے لئے سینہ سپر اس جماعت کی ترکیب اور تاریخ میں کسی طرح مسلمان دوسری قوموں سے پیچھے نہیں تھے۔ چنانچہ ملک کی آزادی اور ترقی آپس کے اتحاد

واتفاق ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر ہندو تنگ دل یا مسلم دشمن ہیں تو حسن اخلاق، مروت، حسن معاملہ اور اخوت کے ذریعے ہم انھیں مخلص دوست بنا سکتے ہیں اگرچہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب الگ الگ ہیں مگر ہمارا اور اس کا ہر ہر قدم پر اشتراک قائم و دائم ہے، ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے مل کر رہے ہیں۔ یہ صرف برطانوی رجعت پسندانہ پالیسی تھی جس نے ہمارے درمیان منافرت پیدا کر دی ہے اور اسی پالیسی کے ماتحت سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی الگ حکومت قائم کی جائے گی، وہ پاکستان ہوگا اور اس میں خلفائے راشدین کے طرز کی حکومت قائم کی جائے گی۔ تعجب ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی صورت سیرت غیر اسلامی اور غیر شرعی ہیں اور جن کو مذہب اسلام اور شعائر اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے وہ حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے طرز کی حکومت قائم کریں گے۔ یہ خواب تو بہت شیریں ہے۔ کاش ایسا ہی ہو۔ اگر ذمہ داران لیگ اس کا اطمینان دلادیں تو ہم ارکین جمعیۃ سب سے پہلے لبیک کہنے کو تیار ہیں۔ افسوس ہے کہ محض اشارات پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ بغیر پورا خطبہ سامنے آئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس زمانے کے ویسے ماحول اور حالات میں علی الاعلان اسٹیج پر کھڑے ہوکر آزادی اور جہاد کا نعرہ بلند کرنا معمولی دل و جگر کا کام نہیں تھا۔ جب کبھی جنگِ آزادی کی حکایتیں اور داستانیں سامنے آئیں گی تو ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں بے شمار مجاہدین علماء کی فہرست میں حضرت مولینا حسین احمد مدنی کا نام تابناک سنہری حرفوں میں نمایاں ہوگا۔ صرف نوّے برس کے عرصے میں جس قوم اور حکومت نے چالبازیوں، ریشہ دوانیوں، مظالم اور سازشوں کے ذریعے اپنے آہنی پنجے ہندوستان کی رگ رگ میں پیوست کر دئے تھے، اب اس کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ خود اپنے ملک میں برطانیہ کو دن کی روشنی میں اندھیرے نظر آرہے تھے۔ دنیا کی دوسری برطانوی مقبوضات میں اس کی طاقت ختم ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں عوام ہی نے نہیں بلکہ فوج نے، پولیس نے، سرکاری افسروں اور ملازموں نے بغاوت کے جھنڈے اٹھالئے تھے۔ جس سلطنت پر چوبیس گھنٹے مسلسل سورج طلوع رہتا تھا اب وہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو رہا تھا۔ بیسوں برس سے یا اور زیادہ عرصے سے ہم سنتے تھے کہ حضرتؒ فجر کی

نماز میں بڑی دل سوزی، دردمندی اور بھرائی ہوئی آواز میں یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اللھم اھدنا فیمن ھدیت وعافنا فیمن عافیت وتولنا فیمن تولیت وبارک لنا فیما اعطیت وقنا شر ماقضیت الخ صبح کا جھٹپٹا، دھندلکے کا سناٹا، نماز باجماعت کی صفیں اور اس میں حضرت کی تاثیر اور التجا میں ڈوبی ہوئی آواز سن کر کلیجے دہل جاتے تھے اور یقین ہو جاتا تھا کہ رحم لانے کے لئے اس آہ کو بادل ہٹ کر ضرور ہی راہ دیتے ہوں گے اور یہ دعا ضرور عرش الٰہی تک پہنچتی ہوگی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے برطانیہ کی تدمر دیار ہو ہی گئی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ایسی افرا تفری پھیلی کہ برطانیہ نے جنگ کے فاتح چرچل ہی کو نہیں اس کی پوری کنزرویٹو پارٹی کو حکومت سے نکال باہر کیا۔ اب برطانیہ جان بچا کر ہندوستان سے بھاگنا چاہتا تھا۔ خطرہ تھا کہ عزت و آبرو لے کر اگر فوراً نکل نہ گئے تو شاید کوئی انگریز زندہ سلامت واپس نہ جانے پائے۔ چنانچہ نئی لیبر پارٹی کی حکومت نے ہندوستانی لیڈروں اور بالخصوص کانگریس اور مسلم لیگ کے ذمے داروں کی ایک میٹنگ بلائی جس میں وائسرائے لارڈ ویول نے کھلے دل اور شاید اخلاص کے ساتھ کہا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے مگر جب تک جنگ کے الجھے ہوئے مسائل مکمل طور پر حل نہیں ہو جاتے اس وقت تک ہمارے لئے یہ بات آسان نہیں ہے کہ ہم پورے ضوابط و قواعد کے ساتھ حکومت آپ کے حوالے کر دیں۔ اس لئے میں یہ پیش کش کرتا ہوں کہ وائسرائے کونسل کے سارے ممبران ہندوستانی عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوں اور پورے اختیارات کے ساتھ نظام حکومت چلائیں۔ پھر جیسے ہی جنگ کے مسائل حل ہو جائیں اور برطانیہ کا بوجھ اس طرف سے ہلکا ہو۔ ہندوستان کی حکومت باضابطہ طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے۔ مسلم لیگ اور خصوصاً مسٹر محمد علی جناح نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور پیش بینی کی بدولت شروع ہی میں بلکہ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ برطانیہ ہندوستان کو آزاد کر دینے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ میٹنگ کے شروع ہی میں مسلم لیگ نے اختلاف و اعتراض کا ماحول پیدا کر دیا۔ کانگریس نے وائسرائے کی تجاویز کو منظور کیا اور مسلم لیگ نے یہ شرط لگائی کہ کانگریس اپنے ممبروں میں کسی مسلمان کو منتخب نہ کرے۔ کانگریس ایک قومی جماعت تھی، ہندوستان کی

ساری ہی قومیں اس میں شریک تھیں یہی اس کی طاقت اور امتیاز تھا۔ چنانچہ حکومت کے لئے اس کے منتخب کردہ ممبروں میں تین مسلم، عیسائی اور پارسی اور صرف دو ہندو تھے۔ یہ حکایت مولانا آزاد سے سنیئے:

"کانگریس نے اپنے ممبروں کی جو فہرست وائسرائے کو پیش کی وہ اس بات کا بین ثبوت تھی کہ کانگریس صحیح معنوں میں ایک قومی جماعت تھی۔ ہندو جو ملک کی سب سے بڑی اکثریت تھی، وہ چاہتے تو کانگریس کے اس انتخاب پر اعتراض کر سکتے تھے مگر ان کی اس خوبی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہوا کہ کانگریس کے پانچ ممبران، تین ممبران مسلمان، پارسی اور عیسائی تھے۔ ہندو مہاسبھا نے کانگریس کے اس فیصلے سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہا مگر ملک کے عوام کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مسلم لیگ بھی ہندو مہاسبھا کی صف میں کھڑی تھی اور مسلمان ممبر کی شمولیت سے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

آج دس برس کے بعد بھی مجھے حیرت ہے کہ مسلم لیگ کی اس پالیسی کا کیا مطلب تھا؟ کانگریس اور مسلم لیگ کے پانچ ناموں کے علاوہ لارڈ ویول نے بھی حکومت برطانیہ کی طرف سے چار ممبر نامزد کئے تھے۔ ان میں ایک سکھ تھا دو شیڈول کاسٹ تھے اور چوتھے پنجاب کے چیف منسٹر خضر حیات خاں تھے۔ جناح صاحب کو اس پر شدید اعتراض ہوا کہ حکومت میں دو ایسے بھی مسلمان ممبر ہوں جس میں ان کی مرضی اور انتخاب کا دخل نہ ہو۔ خضر حیات خاں اس مسئلے میں میرے پاس آئے میں نے انھیں یقین دلایا کہ کانگریس کو آپ کے نام پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے اس معاملے میں لارڈ ویول سے بھی بات کرلی۔ اگر جناح صاحب کی مخالفت اور اعتراض کی وجہ سے یہ کانفرنس فیل نہ ہوجاتی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ وائسرائے کی چودہ ممبروں کی کونسل میں مسلمانوں کی تعداد سات ہوتی۔ درآں حالانکہ مسلمان ملک کی آبادی کا صرف پچیس فی صدی حصہ ہیں۔ اس واقعہ سے جہاں کانگریس کی فراخدلی کا

اندازہ ہوتا ہے وہیں مسلم لیگ کی بیوقوفی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہیئے تھا مگر ہوا یہ کہ اس کی مخالفت کی وجہ سے مسلمان متحدہ ہندوستان کی حکومت میں ایک طاقت ور حیثیت حاصل کرنے سے محروم ہوگیا اور یہ کانفرنس صرف مسلم لیگ کی انتہا پسندانہ پالیسی کی وجہ سے فیل ہوگئی۔"[1]

حکومت برطانیہ اگر آزادی کے مسئلے میں سنجیدہ ہوتی تو مسلم لیگ کی شرط کی معقولیت اور عدم معقولیت پر غور کرکے کوئی فیصلہ کرتی۔ مگر مسلم لیگ کی شرط سامنے آتے ہی اُس نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کردیا۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے پریس کانفرنس میں حکومت برطانیہ کو بھی مسئلۂ آزادی کو نظر انداز کرنے کا ذمّے دار ٹھہرایا۔ آپ فرماتے ہیں:

"اس صورت حال سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کانفرنس کی ناکامی کی ذمّے داری مسلم لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ لیگ کے انکار کے باوجود وائسرائے کی ذمّے داری تھی کہ وہ فیصلہ کریں کہ آگے بڑھا جائے یا نہیں؟ مگر وائسرائے نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے قدم آگے نہ بڑھائیں، چنانچہ اس سلسلے میں مجھے پھر کہنا پڑتا ہے کہ برطانوی حکومت کو اس فرقہ وارانہ صورت حال کی ذمّے داری سے بری الذمہ نہیں کہا جاسکتا۔"[2]

"اس کانفرنس میں کانگریس نے جو موقف اختیار کیا اس کو میں بالکل صحیح سمجھتا ہوں، ہم نے مسٹر جناح کے مطالبات مان لینے کی امکانی کوشش کی لیکن ہم ان کا یہ دعویٰ ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی مسلم لیگ کی وزارت نہیں بنی ہے۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت ہے۔ بنگال میں گورنر رول ہے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت ہے۔ سندھ

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۱۵ [2] ایضاً ، ایضاً

میں سر غلام حسین کی وزارت کانگریس کے سہارے پر قائم ہے۔ یہی حال آسام کا ہے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کا دعویٰ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا بڑا حصہ مسلم لیگ سے الگ ہے۔[1]

مختصر یہ کہ حکومت برطانیہ کو آخری تدبیر و سیاست کا موقع مل گیا اور اس نے ۱۹۴۵ء میں جنرل الکشن کا اعلان کر دیا۔ اس الکشن میں واحد نمائندگی ثابت کرنے اور تقسیم نیز پاکستان کے حصول کے لئے مسلم لیگ کو ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دینا پڑا اور اس کے ساتھ ہر طرح کے سیاسی داؤ پیچ کھیلنے پڑے۔ ان میں سے مشتے نمونہ از خروارے ہم اگلے ابواب میں پیش کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی مسلم لیگ کی کامیابی کی پوزیشن بھی دے رہے ہیں۔

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۱۵

مسلم لیگی جمعیۃ علماء

ابھی دس برس پہلے ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ نے الکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے جمعیۃ علماء ہند کی تائید و تصدیق کی درخواست کی تھی اور اس کے لئے مسٹر محمد علی جناح نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت سے ہر قسم کے عہد و بیان کئے تھے۔ اب پھر وہی مرحلہ درپیش تھا۔ اس مرتبہ بازی بالکل آخری اور فیصلہ کن تھی۔ مگر جمعیۃ علماء ہند اب کسی دام میں آنے کے لئے تیار نہ تھی، مسلم لیگ کی رجعت پسند پالیسی بھی اظہر من الشمس ہو چکی تھی۔ ایسے نازک مرحلے پر مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے بڑا کامیاب سیاسی کھیل کھیلا اور ایک مسلم لیگی جمعیۃ علماء بنا کر کھڑی کر دی۔ عام مسلمان ان حقائق سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ علمائے دین کے مقابلے میں مسٹر جناح، چودھری خلیق الزماں اور راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ کے ساتھ آنے پر کسی طرح تیار نہ تھے، اس لئے مسلم لیگ کے لئے یہ ضروری تھا کہ جس طرح بھی ہو کچھ علماء کو اپنے راستے پر لگایا جائے۔ چنانچہ ایک کامیاب اسکیم کے ذریعے یہ کام انجام دیا گیا۔

مسلم لیگ کی پالیسی چلانے والوں میں مولینا ظفر احمد انصاری نے اس مرحلے کا بیان اس طرح کیا ہے:

> "لیگ کے مقابلے میں زیادہ موثر مخالفت کانگریس کے زیر اثر علماء کے ایک گروہ کی طرف سے ہو رہی تھی اور کانگریس کی اس مخالفت کا توڑ اگر کوئی کر سکتا تھا تو وہ خود علماء ہی تھے اس لئے جو لوگ لیگ سے وابستہ تھے ان کی قدرتاً یہ خواہش تھی کہ علماء زیادہ سے زیادہ لیگ میں شامل ہوں اور جمعیۃ علماء ہند کے پروپیگنڈے کا کافی و شافی جواب دیں۔ چونکہ عوام کا ایک بڑا طبقہ علماء کے زیر اثر تھا اور ان کی بات کو بڑا وزن دیتا تھا اس لئے یہ ضرورت بہت بڑھ گئی کہ کانگریسی علماء کے طلسم کو توڑا جائے اور ان کے زہر کا تریاق مہیا کیا جائے۔"[1]

یہ بالکل علٰحدہ بحث ہے کہ شیخ الاسلام مولینا حسین احمد مدنی، مولینا ابوالکلام آزاد،

---

[1] چراغ راہ کراچی، نظریۂ پاکستان نمبر، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۳۴

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب، امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب رحمہم اللہ وغیرہ صدہا علمائے دین و مقتدایانِ شرع متین جنھوں نے قرآن و سنت کی خدمت میں اپنی زندگیوں کا ایک ایک لمحہ قربان کر دیا تھا اور اصلاح امت کے لئے اپنی ہڈیاں تک گھلادی تھیں۔ یہ کانگریسی علماء تھے یا صحیح معنوں میں علمائے حق تھے اور اس جماعت کی فراست و عقل اور لائحۂ عمل زہر تھا یا تریاق تھا، یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس کا فیصلہ وقت خود کر رہا ہے یا آیندہ کرے گا۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس موقع پر اگر مسلم لیگ کو اپنی اسکیم کے لئے کچھ علمائے کرام نہ مل جاتے تو الکشن میں کامیابی بہت مشکل تھی، سوء اتفاق سے اس کو جماعت علماء ہی سے بعض حضرات مل گئے جو مختلف اسباب کی بنیاد پر حضرت سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس فرصت کو ان لوگوں نے غنیمت سمجھا اور مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے۔ ان کی بڑی تعداد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء اور مریدین پر مشتمل تھی۔ ہندوستان کی ملکی سیاست میں مولانا تھانوی کا موقف آزادی پسند جماعتوں اور افراد سے مختلف تھا۔ تحریکِ خلافت جس نے وقتی طور پر ہی سہی تمام ہندوستانیوں کو متحد کر دیا تھا۔ مولانا کے نزدیک نہ صرف فتنہ و فساد بلکہ شرعی طور پر حرام تھی۔[۱] جمعیۃ علماء ہند سے بھی مولانا کا یہی اختلاف تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا موصوف اور حضرت مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماء رحمہا اللہ کے کچھ تاریخی سوال و جواب بھی قارئین کی نظر میں رہیں:

س: جمعیۃ علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے؟ اور کانگریس سے علٰحدگی میں کیا ضرر ہے؟

ج: نہ صرف جمعیۃ علماء ہند بلکہ ہندوستان کی تمام مقتدر جماعتوں کا نصب العین یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے ہندوستان کو آزاد اور خود مختار بنایا جائے۔ اور اس کے لئے

[۱] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۲، ص ۳۳۷

یہ مسئلہ بھی متفق علیہ ہے کہ جب تک ہندوستان کی تمام قومیں متحد ہو کر انگریزی حکومت سے آزادی کا مطالبہ نہ کریں گی، بظاہر اسباب کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ اس لئے آزادی کی خاطر جمیۃ علماء، کانگریس کی شرکت کو ضروری سمجھتی ہے۔ اور چونکہ انگریزی حکومت سے مسلمانوں کی مرکزیت اور اسلامی حکومت کو ضرر پہنچ رہا ہے اور پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ انگریزی اقتدار کو جہاں تک ہو سکے کمزور کرنے کی سعی کریں۔

س : کانگریس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی اور غیر منظم اور غیر مشروط طریقے پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لئے کانگریس براہ راست امیدوار کھڑے کرتی ہے اس سے اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

ج : کانگریس ایک مشترک جماعت ہے، مسلمان اپنے مذہب پر پختہ رہتے ہوئے بھی کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اسلام سے بے تعلقی غیر کانگریسی مسلمانوں میں جو مغربی تعلیم اور یورپین تہذیب کے دلدادہ ہے بہت زیادہ ہیں، کانگریسی مسلمان اسلام سے اس قدر بے تعلق نہیں ہیں جس قدر یورپین کے دلدادہ غیر کانگریسی مسلمان ہیں۔

س : مسلم لیگ سے جمیۃ علماء کو کیوں اختلاف ہے۔ جب کہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کی تحصیل ہے۔ جیسا کہ اس سال لکھنؤ میں اس نے اعلان کیا ہے۔

ج : اس لئے کہ مسلم لیگ کی اکثریت انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت کا سایہ سمجھتی ہے۔ اور انگریزوں کے دامن میں پناہ لینا چاہتی ہے اور انگریزی شہنشاہیت کی حمایت کرتی ہے اور انگریزی اقتدار کی بنیاد مضبوط کرتی ہے اور سرمایہ داروں کی نہ صرف حامی ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم رکھنا چاہتی ہے، قوم کے لئے کوئی ٹھوس کام نہیں کرتی بلکہ مسلم لیگ کی رکنیت اور عہدہ داری کو حصول مناصب جلیلہ کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ آزادی کامل کا اعلان تو کر دیا اور یہ بھی اقرار ہے کہ تنہا مسلمان آزادی کامل حاصل نہیں کر سکتے

اس کے باوجود آزادئ کامل حاصل کرنے کے طریقے، ہندو مسلم اتحاد کو اختیار نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں ہم اس زبانی اعلان کو محض ابلہ فریبی نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں؟

س: اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں ہے کہ جمیعۃ علماء اس میں شریک ہوکر اسے مفاسد و منکرات سے پاک کردے۔

ج: مسلم لیگ میں شریک ہوکر اسے منکرات سے خالی کردینا تجربے سے ناممکن ثابت ہوا ہے۔

س: کیا مسلم لیگ اور جمیعۃ علماء کے تصادم سے تشتت اور افتراق پیدا نہیں ہوتا ہے۔ جمیعۃ علماء نے اس کے انسداد کی کیا صورت اختیار کی ہے؟

ج: ضرور ہوتا ہے مگر اس کی ذمے داری صرف لیگ پر ہے۔ وہ مسلمان عوام کو علمائے دین کے خلاف بھڑکاتی ہے اور آپس میں لڑاتی ہے۔ آپ مسلم لیگ کے قائد اعظم کی ذہنیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ابھی حال میں انھوں نے مسلم لیگیوں کو جمیعۃ علماء کے جلسے میں شرکت سے منع کرنے کے لئے اخباروں میں اعلان شائع کیا۔

س: کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کا انجام حکومت مشترکہ ہے جس میں عنصر کفر غالب ہوگا اور عنصر اسلام مغلوب ہوگا۔ ایسی حکومت یقیناً اسلامی نہ ہوگی تو اس کے لئے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے ذمے کس دلیل سے واجب ہے۔ کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے ہیں اور مسلمانوں پر بازاروں میں، دیہاتوں میں اور سرکاری محکموں میں جو مظالم برپا کرنے لگے ہیں جمیعۃ علماء نے اس کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لئے کوئی قدم اٹھایا یا نہیں؟

ج: لیکن کیا مسلم لیگ خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کی سعی کررہی ہے؟ وہ بھی تو اسی مشترکہ حکومت کے اصول کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ گول میز کانفرنس میں تسلیم کرچکی ہے۔ اگر ہندو انگریز کو نکالنا نہیں چاہتے تو پھر جمیعۃ علماء ان کے ساتھ اشتراکِ عمل نہیں کرے گی۔ یہ اشتراک صرف آزادی کے لئے ہے۔

س: کانگریس وزارتوں نے زمینداروں کی آراضی کو کاشت کاروں کی مملوک بنادینے کی تجویز سوچی ہے جو یقیناً ظلم ہے۔ جو لوگ کانگریس میں شریک ہیں اس ظلم میں شریک ہیں

کیا جمعیۃ علماء نے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر کی؟

ج: جمعیۃ علماء ہر خلاف شرع قانون کے خلاف انتہائی جدوجہد کر رہی ہے اور کر چکی ہے اور کرے گی۔ ابھی حال میں اس کی کارروائی دیکھئے کہ اس نے کانگریسی حکومت سے کس قدر اجتناب کیا ہے۔ مدحِ صحابہ کے قضیے میں جمعیۃ کا طرزِ عمل آپ کے سامنے ہے۔ مگر مسلم لیگ کی تائید و حمایت سے جو خلاف شرع قوانین روزانہ اسمبلی میں پاس ہوتے ہیں ان کو بھی سامنے رکھئے تو صحیح طور پر فرق واضح ہو سکے گا۔

س: کانگریس میں بندے ماترم کا گیت مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کی سلامی ہے۔ کیا ان افعال میں شرکت گناہ نہیں ہے؟ اگر ہے تو جمعیۃ نے اس کے خلاف کیا احتجاج کیا؟

ج: کانگریس نے بندے ماترم گیت کے قابل اعتراض بند اس میں سے الگ کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتی ہے، وہ ایک فوجی عمل ہے۔ اس میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر وہ مشرکانہ عمل نہیں ہے۔

س: صدر کانگریس اشتراکیت کے حامی اور مذہب و خدا کے دشمن ہیں اور ان کے خلاف تقریر کرتے ہیں۔ جمعیۃ علماء نے ان کے خلاف احتجاج کیا یا نہیں؟ اور مسلمانوں کو ان کی تعلیم سے روکا یا نہیں؟

ج: صدر کانگریس کی شخصی رائے سے کانگریس کو الزام دینا معقول بات نہیں ہے۔

س: کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی پوری حفاظت ہوگی۔ جب کہ کانگریس اور اس کے ارکان مذہب اور حقوق کا نام لینا جرم اور فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمعیۃ علماء نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مذہب اور سیاست کے تحفظ میں اس وقت تک کون سا کام کیا ہے؟

ج: مسلمان اپنے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کر سکتے ہیں نہ کہ کانگریس اور انگریزوں کے وعدوں سے۔

س : جمعیۃ علماء نے اچھوت اقوام میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہیں؟

ج : یہ سوال اس جماعت سے اور اس کے علماء سے کیا جانا چاہیے جو سو فی صدی مسلمانوں کی نمایندگی کی دعویدار ہے۔[1]

مولانا تھانوی کے حلقہ میں خود دیوبند اور مدرسہ دارالعلوم کے مدرسین و منتظمین کی ایک جماعت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مخالفت اور معاندت کے جذبات رکھتی تھی اور نتیجے کے طور پر ہر اس خیال اور فکر کی مخالف تھی جس کا انتساب حضرت کی طرف ہو۔ اسی بنا پر جمعیۃ علماء کی بھی سخت مخالف تھی۔ حضرت شیخ الہند کے اہم اور خاص شاگرد نیز صحیح مسلم شریف کی شرح الملہم کے مصنف حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ[2] متبحر عالم بے مثل خطیب اور مقرر تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن پر نہایت فاضلانہ حواشی بھی تحریر فرمائے تھے جو موصوف کی بالغ نظری اور تبحر علمی کے شاہد ہیں ایک طویل عرصے تک وہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم رہے اور جمعیۃ علماء ہند کے عمائدین میں شریک رہے لیکن انھیں ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بعض وجوہ کی بنا پر وہ قربت نہ تھی جیسی ایک ہی مسلک کے دو بزرگوں میں ہونی چاہیے۔ دیوبند جیسے مرکزی ادارے کے صدر مہتمم ہونے کی وجہ سے مولانا موصوف کو مدرسہ میں سب سے با اختیار اور ملک میں سب سے زیادہ محبوب ہونا چاہیے تھا مگر آپ نہایت نازک مزاج، بہت کم آمیز اور خلوت نشین تھے قدرتی طور پر ہمارے حضرتؒ مدرسہ میں اور ملک میں غیر معمولی مقبولیت اور محبوبیت کے مالک تھے۔ حضرت کے انداز رکھ رکھاؤ اور لباس و پوشاک میں نہ کوئی تشخت تھی نہ عالمانہ اور فاضلانہ تکلف و تصنع تھا۔ نہ گفتگو اور تخاطب میں کوئی مولویانہ اور مولانانہ رعب وداب تھا مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی شان، وقار اور دلآویزی عطا ہوئی تھی کہ ان کے سامنے بڑی سے بڑی شخصیت ماند پڑ جاتی تھی۔ یہ درویشانہ شان اور فقیرانہ آن بان مدرسہ دارالعلوم

---

[1] خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے سوالات اور مفتی کفایت اللہ کے جوابات، عصر جدید، مدینہ، بجنور، ۸ فروری ۱۹۴۶ء ماخوذ از مکتوبات، ج ۲، ص ۱۴۹ [2] مولانا عثمانی حضرت (تھانوی) کے خلیفہ خاص تھے۔ حکیم الامت از مولانا عبدالماجد دریابادی، ص ۲۳۱

کے معاملات میں بہت سے لوگوں کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔ تیسرے درجے کے اختیارات کے بارے میں مولینا محمد طیب صاحب مہتمم مدرسہ کی ذات مولانا شبیر احمد صاحب کے اقتدار کے راستے میں ہمیشہ سدراہ رہی۔ دیوبند کے مقتدر لوگوں میں مولینا محمد طاہر صاحب مرحوم کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں۔ آپ مولینا محمد قاسم صاحب کے پوتے مولینا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ بظاہر تو موصوف مدرسہ میں ناظم کتب خانہ کے عہدے پر مامور تھے مگر درحقیقت معاملات مدرسہ کے ہر پہلو پر اثر انداز تھے۔ موصوف کو حضرت سے کوئی خاص اختلاف تو نہیں تھا مگر ایک ذاتی مسئلہ میں ان کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے شکوہ تھا۔ جب مسلم لیگ کا زور ہوا تو وہ کھل کر حضرت کے مخالف ہو گئے۔

مولوی مفتی محمد شفیع صاحب مدرسہ کے مفتی تھے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ قدرتی طور پر موصوف حضرت کی سیاسی جدوجہد کو پسند نہیں کرتے تھے اور مسلم لیگ کے موید و مددگار تھے۔ آپ نے ایک مفصل فتویٰ کانگریس میں شرکت کی حرمت اور مسلم لیگ کی تائید و نصرت میں لکھا اور اس کو اپنے تجارتی کتب خانہ دار الاشاعت دیوبند سے شائع کیا۔ اس کا نام "وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین" رکھا۔ اس کے آخر میں خلاصہ کے طور پر آپ نے پاکستان کی شرعی حیثیت واضح کی اور فتویٰ دیا کہ مسلم لیگ میں شرکت لازمی اور کانگریس میں شرکت حرام ہے۔ اس فتویٰ کی تصدیق و تائید مفتی جمیل احمد تھانوی دار الافتاء خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون اور محمد شبیر علی۔ ناظم خانقاہ نے اس عبارت کے ساتھ کی "یہ مضمون بالکل صحیح ہے گویا حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملۃ امام تھانوی کے ارشادات کی شرح و توضیح ہے اسی وجہ سے اس کو تھانہ بھون کا فتویٰ بھی کہا گیا۔"[1]

یہ بڑا طویل قصہ ہے کہ مفتی صاحب موصوف نے کیسی شدت سے نظریۂ پاکستان کی حمایت اور تحریک آزادی کی مخالفت کی۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بصیرت کی بنا پر اپنی رائے اور تائید کا اعلان کیا ہوگا مگر دینی و مذہبی فرضیت اور وجوب مفتی صاحب ہی نے

---

[1] کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فتویٰ از مفتی محمد شفیع صاحب بحوالہ آثر شیخ الاسلام، ص ۲۹۵

مقرر کیا۔ ان تین حضرات کے علاوہ مدرسہ دیوبند میں چھوٹے بڑے ملازمین و مدرسین اور ان کے ساتھ مجلسِ شوریٰ کے بعض خان بہادر و فلاں جنگ وغیرہ بھی شامل تھے۔ خود مدرسے کے مہتمم مولینا محمد طیب صاحبؒ بھی حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے ممتاز خلفاء میں تھے اور اپنے طبعی رجحان کے اعتبار سے اسی جماعت کے ہمنوا اور نظریۂ پاکستان کے موید تھے مگر مدرسہ کی سب سے بڑی ذمہ دار شخصیت ہونے کی وجہ سے موصوف مدرسہ کی مصلحت اور مفاد کا خیال مقدم رکھتے تھے اور علی الاعلان کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ایک وجہ آپ کے غیر جانب دار ہونے کی یہ بھی تھی مدرسہ کے اہتمام کے بارے میں صدر مہتمم اور مہتمم کے درمیان ایک مسلسل اور خاموش عدم تعاون اور اختلاف رہا کرتا تھا اور آپ کے لئے مکمل طور پر صدر مہتمم کی جماعت میں شرکت مشکل تھی۔ مختصر یہ کہ خود دیوبند میں ایسے لوگ تھے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف سرگرم رہتے تھے۔ ملک اور بیرون ملک میں حضرت کی مقبولیت اور مدرسہ دیوبند میں حضرت کی ناگزیر ضرورت کی وجہ سے ان کا بس تو چل نہیں سکتا تھا مگر یہ کبھی اپنے اس مقصد سے غافل نہیں ہوتے تھے کہ کس طرح مدرسہ سے حضرت کو الگ کردیا جائے۔ انہی احوال اور ماحول میں قدرت کی طرف سے ایک ایسا موقع میسر آگیا کہ ان کے مقاصد کے لئے راستہ صاف ہوگیا اور یہ حضرت کی ۱۹۴۲ء کی گرفتاری کا موقع تھا۔ اب ان کو اطمینان ہوگیا کہ جیل کی چہار دیواری میں محبوس و مجبور حضرت رحمۃ اللہ کی علٰحدگی میں اب کون سی دقت اور رکاوٹ پیش آسکتی ہے۔ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد یہ اسکیم بنائی گئی کہ سب سے پہلے ان طلباء کو مدرسہ سے الگ کیا جائے جن کے بارے میں یہ شبہ ہو کہ یہ راستوں میں رکاوٹ بن سکیں گے۔ اس کے بعد حضرت کے معتقدین اور سربرآوردہ اساتذہ اور ملازمین کو نکالا جائے اور سب سے آخر میں حضرت کی علٰحدگی عمل میں آئے۔ اس پروگرام کے مطابق چاروں طرف سے پیش بندیاں کرنے کے بعد اس جرم میں کہ طلباء نے حضرت رحمۃ اللہ کی گرفتاری پر مضطرب ہوکر حکومت برطانیہ کے خلاف جلسے اور جلوس منعقد کئے، منتخب اور مؤثر طلباء کی ایک بڑی تعداد کو مدرسہ سے نکال دیا گیا۔ حضرت اپنے مزاج اور دینی مقاصد کے پیش نظر طلباء دین کے ساتھ نہایت شفقت، رعایت اور درگذر کے ساتھ پیش آتے تھے۔ تعلیم و تعلم، اسلامی شعائر اور شرعی کوتاہیوں میں تو کبھی کبھی کسی قدر تنبیہ و فہمائش کردیتے تھے مگر

طالب علم کو دینی تربیت اور تعلیم سے محروم کر دینا کسی طرح گوارا نہیں کرتے تھے۔ جیل میں یہ اطلاع ملی تو مولینا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کو تحریر فرمایا:

"اس مرتبہ جب یہ معلوم ہوا کہ آپ دونوں حضرات نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تقریباً اسّی طلبہ مدرسہ سے بالکل خارج کر دئے جائیں تو مجھ کو سخت صدمہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جس قدر بھی ممکن ہو لوگوں کو مسلمان اور صحیح العقیدہ مسلمان بنانا فرض ہے اور حسب فرمانِ نبوی علیہ السلام فاستوصوبھم خیراً ممکن سے ممکن درجہ تک طلبہ کو راہ راست پر لائیں تاکہ یہ نوجوان پڑھ لکھ اپنی حالت بھی درست کریں اور مسلمانوں کی حالت بھی درست کریں اور اسلام کے سچے مبلغ بنیں۔ اخراج کرنا اس نعمت عظمیٰ سے محروم کر دینا ہے اور ہمارے یہاں کی انتہائی سزا ہے جس سے بہت سے خطرات ہیں۔"[1]

اس کے علاوہ براہ راست مجلس شوریٰ کے بعض ممبران کو بھی اس قسم کے خطوط تحریر فرمائے جن میں ان کے ساتھ رعایت و شفقت کا برتاؤ کرنے پر زور دیا:

"جو فیصلہ جناب نے ابتدائی شعبان میں امتحان بند کر کے مطبخ یک قلم موقوف کر کے چالیس طلبہ کو نکال دینے اور اکثر کو سند فضیلت سے بالکل محروم کر دینے کا کیا ہے وہ نہایت تعجب خیز ہے۔ اگر یہ معاملہ انتقاماً تھا جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو معاملہ نہایت عجیب و غریب ہے۔ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں اور اسکولوں اور مدرسوں میں باوجود انتہائی شورشوں اور سخت سے سخت تشددات کے نہ ان کے کارکنوں نے ایسی کارروائی کی اور نہ گورنمنٹ نے اتنی مداخلت کی جتنی آپ نے کی ہے۔ حالانکہ دارالعلوم آزاد تھا اور گورنمنٹ کا دست نگر نہ تھا اور نہ ہے پھر اس قدر ڈوریت اور اظہار وفاداری کے کیا معنی ہیں جو حدود عقل سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ طلباء نے جلسے جلوس بے شک کئے۔ ادارۂ اہتمام نے روکا تو نہیں رُکے۔ اس سے زیادہ ان کا کیا جرم تھا۔ کیا اسی کی وجہ سے یہ دور دور سے آئے ہوئے طلبائے

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲

علم دینی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے محروم کئے جارہے ہیں۔ پھر جب کہ ملک کی فضا اس قدر مسموم ہورہی ہے کہ ملک کے وہ نوجوان طلبہ جن کی ساری امیدیں گورنمنٹ کی غلامی سے بندھی ہوئی ہیں، وہ ملک کے لیڈران کی گرفتاری پر اپنے آپے سے باہر ہوگئے۔ (حالانکہ ان لیڈران کا ان سے کوئی خاص تعلق نہ تھا اور تھا تو بہت دور کا تھا پھر بھی) انھوں نے سردھڑ کی بازی لگادی اور تقریباً ایک ہزار یا اس سے زیادہ طلباء پروانہ وار جاں بحق ہوگئے اور کئی ہزار زخمی ہوئے تو اگر گورنمنٹ کے اس شرمناک رویہ پر جو اس نے استبداد کے طریقے پر دارالعلوم کے طلباء کے ایک نالائق خادم پر جاری کئے۔ وہ کچھ مظاہرہ کر بیٹھے تو وہ اس قدر موجب غیظ وغضب وانتقام کیوں قرار دئے گئے۔"[1]

طلبائے کرام کے بعد نمبر مدرسین اور ملازمین کا تھا۔ اس کے لئے ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ خبریں گرم ہوئیں کہ فلاں فلاں حضرات کے نام نوٹس جاری کئے جارہے ہیں مگر عین وقت پر جیل سے حضرت کے خطوط موصول ہوئے جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ مدرسہ کی بقا اور اس کی ترقی کی کوششیں کی جائیں۔ اگر طلباء اور مدرسین کو نکال دیا گیا تو اس سے ایک مرکزی ادارہ کو نقصان پہنچے گا۔ اس سلسلے کا ایک خط قابلِ ملاحظہ ہے:

"جن پانچ اشخاص، منشی سید محمد شفیع صاحب، مولوی عبدالوحید صاحب، مولوی محمود گل صاحب، مولوی سلطان الحق صاحب، مولوی محمد عثمان صاحب کی برطرفی کا فیصلہ کرنا چاہئے تھا (حالانکہ یہ پہلی قسط تھی، مشہور تو یہ ہے کہ ۲۶ آدمیوں کو برطرف کرنا چاہیے تھا اور ڈابھیل کے مدرسین بلائے گئے تھے اور دوسرے ملازمین کو بھی روکا گیا تھا۔ مجلس شوریٰ کے بعد تمھارا یہاں تقرر کیا جائے گا۔ واللہ اعلم) ان سب کی مولانا طیب صاحب سے صفائی کرادیجئے۔ انھوں نے صدر صاحب (مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی) سے طلبہ کے اخراج کے وقت فرمایا تھا کہ جو لوگ اصل اصول

---

[1] مکتوبات ج ۱، ص ۳۴۵

فساد ہیں ان کو نکالیئے۔ صدر صاحب نے فرمایا کہ ان کی رپورٹ اور سلیس پیش کرو
میں ابھی نکالوں گا۔ بہرحال ان لوگوں کی صفائی مولینا طیب صاحب سے کرا دیجئے۔
یہ مدرسین و ملازمین (حکومت برطانیہ کے خلاف) فقط جذبات ہی تو رکھتے ہیں۔ اہل
حل و عقد کی تشدد آمیز کارروائیوں سے ڈر کر علانیہ تو تحریکات میں حصہ نہیں لیتے تاہم
ان کو اصل اصول فساد کہتے ہیں۔ اصل اصول فساد تو حسین احمد ہے جو تحریکات میں
علانیہ حصہ لیتا ہے۔ اس کو نکالنا چاہیے۔[1]

مختصر یہ کہ وقت سے پہلے ہی روک تھام کی گئی اس لئے مدرسین کا اخراج رک گیا،
مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی علٰحدگی کے سارے انتظامات کرلئے گئے۔ مجلس شوریٰ کی میٹنگ
میں یہ مسئلہ پیش کیا جانا تھا۔ اس کیلئے زمین ہموار کرلی گئی تھی اور یقین ہوگیا تھا کہ اس اجلاس
میں حضرت کے خلاف فیصلہ ہوجائے گا۔ معتقدین اور مخلصین کے لئے یہ بڑا سخت وقت تھا۔ سارے
ہی حضرات کو یقین تھا کہ اب دیوبند سے نکلنا طے ہے۔ اس موقع پر حضرت رحمۃ اللہ نے حضرت
شیخ الہند کے نواسہ مولینا محمد عثمان کے نام ایک خط تحریر فرمایا:

"ہم کو دار العلوم سے نکالا جائے ہم خوش ہیں۔ رکھا جائے ہم خوش ہیں۔
رزق کا کفیل دار العلوم نہیں، اللہ تعالیٰ ہے۔ عزیزم! ان احوال کی وجہ سے پریشان
نہ ہو۔ واقعات اور حقیقت کو تاریخ وار قلمبند رکھو۔ اور صبر جمیل اختیار کرو۔ زبان بند
رکھو اور آنکھوں سے دیکھو مگر کچھ نہ بولو، دیکھو قدرت کیا کرتی ہے۔ وہ بے نیاز اور
بے پروا بھی ہے اور سب سے زیادہ رحمت در رحمت والا بھی ہے۔ اس کا ظاہری
ہاتھ بھی ہے اور خفیہ ہاتھ بھی، کچھ فکر مت کرو، کسی کو مت ستاؤ۔ واللّٰہ معکم
اینما کنتم۔ اگر واقعات اور افواہات ستایا کریں تو حضرت رحمۃ اللہ کی زندگی
یاد کرو اور اگر اس پر بھی قلبی سکون نہ حاصل ہو تو مزار پر جاکر تھوڑی دیر بیٹھ کر
ایک دو پارے پڑھ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگوں کو بخش دیا کرو۔ یہی

[1] مکتوبات، ج ۱، ص ۳۴۱

بات مولانا محمد جلیل صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب سے بھی کہہ دو۔ اگر مولانا نافع گل صاحب آجائیں تو ان سے بھی یہی کہہ دو۔ یہی میری استدعا مولانا سلطان الحق صاحب اور منشی شفیع صاحب سے بھی ہے۔"[1]

اس موقع پر مدرسہ کے وہ ذمہ داران اور مدرسین جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ تھے انھیں یقین ہوگیا کہ اب دارالعلوم سے ہماری خدمات منقطع ہورہی ہیں۔ حضرت نے بھی اپنے معتمد خصوصی قاری اصغر علی صاحب مرحوم لکھا کہ میری علٰحدگی کا حکم آجانے کے بعد مدرسہ کا مکان خالی کردیا جائے۔ سامان ٹانڈہ پہنچا دیا جائے۔ زیر تعلیم بچوں کو مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد میں داخل کرادیا جائے۔ جیسے جیسے مجلس شوریٰ کے اجلاس کی تاریخیں قریب آتی گئیں ان تھانوی اور مسلم لیگی حضرات کی سرگرمیوں اور حوصلوں میں تیزی آتی گئی۔ اور اسی نسبت سے حضرت کے خدام کے استقلال، استغنیٰ اور صبر و شکر کے جذبات میں اضافہ ہوتا رہا۔ حضرت ان حضرات کو اعتماد علی النفس اور توکل علی اللہ کی تاکید لکھتے ہیں:

"جو کچھ احوال ان مبارک مہینوں میں وہاں پیش آرہے ہیں ان کے متعلق اطلاعات ملیں۔ آپ حضرات اپنے فرائض پر مستقل رہیں۔ افواہوں سے متاثر نہ ہوں۔ بڑوں کا ادب و احترام بجالائیں۔ تقادیر کی نیرنگیاں اگر خلاف طبع ظاہر ہوں تو صبر و شکر کریں، رازق صرف اللہ ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے سامان پیدا کردے گا۔

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔ اخلاص اور للّٰہیت کو ہر موقع پر ملحوظ رکھیے اور جہاں تک ممکن ہو علوم دینیہ اور دارالعلوم کی خدمت میں بہتری کی کوشش کیجیے۔ مظلوم ہونا ظالم ہونے سے بہتر ہے۔ جو حضرات کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا انتظام کیا ہے کہ مولانا حسین احمد اپنی قید کی مدت پوری کرکے بھی آزاد نہ ہوں گے تو آپ کو اس پر خوش ہونا چاہیئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ایسا

---

[1] مکتوبات، ج ۲، ص ۴۳

ہی ہو اتھا۔ میں تو اپنی کو ناکارہ و نالائق غلام ہوں۔ اگر ایسے حالات رونما ہوئے
ہیں تو شکر کی بات ہے اور کیا تعجب ہے کہ کہیں وہی انقلاب نہ پیش آجائے جو
حضرت رحمۃ اللہ (شیخ الہند مولینا محمود حسن) کی مخالفت اور ایذا رسانی کرنے والوں
پر آیا تھا۔[1]

مکتوب کی آخری دو سطریں غور کے قابل ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں من عادی لی ولیاً فقد آذنتہ بالحرب اور اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ۔ حضرت پر زندگی بھر صادق رہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی ایسا واقعہ پیش آیا کہ دیکھنے اور سننے والے حیران و مبہوت رہ گئے۔ اجلاس شروع ہونے تک ماحول میں گرمی، اضطراب اور بے چینی نظر آتی رہی۔ مگر مجلس شوریٰ ختم ہوئی اور اس کے فیصلے اور قراردادیں سامنے آئیں تو حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ صدارت اہتمام کا عہدہ بالکل ختم کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی صدر مہتمم بھی برخاست کر دیئے گئے تھے۔ مولینا شبیر احمد صاحب الگ ہوئے تو ان کی پارٹی کے بھی چھوٹے بڑے حضرات کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ خود استعفی دے دیں۔ اس طرح ایک مولینا محمد طیب صاحب مہتمم مدرسہ کو چھوڑ کر پوری تھانوی اور مسلم لیگی جماعت بیک قلم مدرسہ سے الگ ہوگئی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع فیصلے کے اسباب کیا تھے مگر اس وقت جو قیاسات اور اندازے سامنے آئے وہ یہ تھے کہ مہتمم اور صدر مہتمم کے درمیان عرصہ دراز سے جو سرد جنگ جاری رہتی تھی۔ اس میں حضرت دونوں حضرات کے درمیان مصالحت و موافقت کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت کی گرفتاری کے بعد درمیانی رابطے کی کوئی شکل باقی نہ رہی اور ریشہ دوانیاں تیز تر ہوگئیں۔ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بھی ایک باوقار ذات ایسی موجود رہتی تھی کہ کسی کو حدود و قیود سے تجاوز کا موقع نہ ملتا تھا۔ اس بار اجلاس سے پہلے سرگرمیاں اور کارروائیاں بڑھیں تو مولینا شبیر احمد صاحب اس اطمینان میں رہے کہ تیاریاں حضرت

---

[1] مکتوبات، ج ۱، ص ۲۳۰

مدنی کی مخالفت میں ہو رہی ہیں۔ مگر نتیجہ سامنے آیا تو پتہ چلا کہ معاملہ کچھ اور تھا۔ کہ امی نماید کجی می زند۔ حضرت نے اس واقعہ کا تذکرہ مختصر طور پر فرمایا ہے:

"سب کو معلوم ہے کہ علامہ عثمانی دار العلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔ جناب مولانا محمد طاہر صاحب کی سالہا سال کی آرزو کے مطابق دفتر اہتمام (مہتمم) کی تحریک پر مولانا عہدۂ صدارت سے الگ کئے گئے۔ مجلس شوریٰ میں عہدۂ صدارت کی تخفیف کی تحریک اور تائید جن بزرگوں نے کی ان میں سے ایک آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے۔ دوسرے دیوبند مسلم لیگ کے صدر تھے مگر اخباروں میں نام مولانا مدنی اور کانگریس کا بدنام کیا گیا۔"[1]

یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت جیل میں محبوس تھے اور اس کے علاوہ آپ کا کوئی دخل اس انقلاب میں نہیں تھا۔ مگر قدیم مخالفت اور معاصرت کو اب کھل کر سامنے آنے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ دار العلوم کا میدان تو ہاتھ سے نکل ہی چکا تھا۔ اب تلاش عداوت و معاندت کی تسکین کے لئے کسی نئے عنوان اور رزمگاہ کی تھی۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ تھا کہ جب مسلم لیگ کو اپنی الکشنی تدابیر کے لئے چند علمائے کرام کی تلاش تھی، چنانچہ مولینا ظفر احمد صاحب تھانوی، مولینا ظفر احمد صاحب انصاری وغیرہ نے باہر سے اور مولانا محمد طاہر صاحب وغیرہ نے دیوبند سے اس قسم کی اسکیمیں بنانی شروع کیں کہ ایسے کچھ علماء کو جمع کیا جائے جن سے مقصد پورا ہو۔ رفتہ رفتہ یہ اطلاعات شائع ہونے لگیں کہ حضرت مولینا شبیر احمد صاحب جمعیۃ علماء ہند کی مخالفت کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں۔ اس درمیان میں حضرت رحمۃ اللہ رہا ہو کر تشریف لا چکے تھے، آپ کا دل صاف تھا اور مدرسہ کی کارروائی میں آپ کا کوئی حصہ بھی نہ تھا۔ جمعیۃ سے اختلاف کی خبریں سُن کر حضرت مولینا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولینا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمہما اللہ نے علامہ عثمانی سے ملاقات مفاہمت کا پروگرام بنایا۔ حسن اتفاق سے اس ملاقات میں حضرت مفتی کفایت اللہ

[1] حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ، رسالہ کشف حقیقت، ص ۴۸

صاحب اور مولینا احمد سعید صاحب اور مولینا عبدالحنان صاحب ہزاروی بھی بغرض ملاقات وعیادت شریک ہو گئے۔ یہ ملاقات اور گفتگو بالکل نجی اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور مجلس میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ کوئی دوسرا شخص موجود بھی نہ تھا حضرت مولینا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی تک (کسی نئی جماعت) کی صدارت کے قبول اور عدم قبول کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اس گفتگو میں مختلف امور کا تذکرہ آیا، مگر نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں جن میں نہ کوئی مناظرانہ طرز تھا نہ اثر ڈالنے اور دبانے کا کوئی پہلو تھا نہ کسی ادب و احترام میں کوئی کوتاہی تھی۔ تمام طریقہ احباب کی دوستانہ اور خصوصی گفتگو کا تھا، اور ہر امر میں پرائیویٹ ابحاث کی شان تھی اور یہی وجہ ہوئی کہ اس تمام گفتگو یا اس کے کسی حصے کو جمیعۃ کے کسی رکن نے نہ کسی اخبار، رسالہ یا اشتہار میں شائع کیا نہ دوسرے احباب سے تذکرہ کیا"[1]

جمیعۃ علماء ہند کے حضرات نے مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی سے صفائی اور مفاہمت کے اقدامات کئے تو مسلم لیگ نے فوراً ایک نئی مسلم لیگی جمیعۃ علماء اسلام کی بناء ڈالی اور مختلف قسم کے وعدے وعید اور عہد و پیمان کر کے مولینا شبیر احمد صاحب کو اس کا صدر بنالیا۔ حضرت مولینا عثمانی فطری طور پر نازک طبع، کمزور مزاج اور گوشہ نشین شخص تھے۔ پہلے پہلے تو جمیعۃ علماء اسلام کے دو ایک جلسوں میں شریک ہوئے اس کے بعد دوسرے حضرات علماء ان کے بیغامات اور خطبات صدارت لے کر جانے لگے۔ ان کے بھتیجے مولینا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی ایک گفتگو ملاحظہ فرمائیے:

"مولینا عتیق الرحمٰن نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے مولینا عثمانی سے فرمایا کہ آپ تو گوشہ نشین تھے، کسی تحریک میں حصہ نہیں لیتے تھے، آپ کو کس چیز نے مجبور کیا کہ آج آپ تحریر شائع کرتے ہیں، شہروں میں تقریریں کرنے جاتے ہیں۔ مولینا عثمانی

---

[1] حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ، کشف حقیقت، ص ۲۲

نے فرمایا کہ میں پاکستان کو مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتا ہوں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ ان ایام میں بہت سے ضروری اور مفید مسائل مسلمانوں کے متعلق پیش کئے گئے ہیں مگر شدید سے شدید ضرورت میں بھی آپ زاویہ سے باہر نہیں نکلے آج کون سی ضرورت ایسی پیش آگئی جو کہ آپ کو در بدر لئے پھرتی ہے۔ ابھی قریبی زمانہ میں مجھ کو آپ سے گفتگو کرنے کی نوبت آئی تھی اور پاکستان کا مسئلہ بھی سامنے آیا تھا تو آپ نے مولانا آزاد سبحانی پر عدم اعتماد کا اظہار فرمایا تھا اور ذکر کیا تھا کہ جو تحریر آپ سے مانگی گئی تھی آپ اس کے دینے پر رضامند نہیں ہوئے تھے مولانا عثمانی نے اس پر سکوت فرمایا تھا۔"

اس سکوت کی وجہ بہت معقول تھی۔ آج سے پہلے حضرت علامہ پاکستان کے نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کے فارمولے ۴۵ مسلمان، ۴۵ ہندو اور ۱۰ دوسری قوموں پر مشتمل پارلیمنٹ کو ہندوستان کے مسئلے کا سب سے بہتر اور آخری حل یقین کرتے تھے۔ اخبار مدینہ کا ایک بیان ہے:

"حضرت عثمانی صاحب کو حیرت غالباً اس وجہ سے ہوئی ہوگی کہ خود موصوف نے جب کہ جمعیۃ کے فارمولے پر اطلاع پائی تھی تو اس کی تعریف میں نہایت زوردار کلمات تحریر فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ "مسلمانوں کے اطمینان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عمدہ چیز نہیں ہے۔" یہ تحریر جمعیۃ کے ریکارڈ میں آج بھی موجود ہے۔ غالباً جب علامہ صاحب اپنی غلط بیانی پر مفتی صاحب کو ساکت وصامت دیکھتے ہیں تو دل ہی دل میں شرماکر حیرت کا اظہار کرتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید اور خیال کرتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب سمجھ گئے ہیں کہ حضرت عثمانی کا جمعیۃ علماء اسلام اور لیگ کی حمایت میں قدم اٹھانا حق پرستی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی دوسرا ہی ہاتھ کام کر رہا ہے۔"[۵]

مذکورہ بالا اقتباس میں حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب کے سکوت اور

---

۵ کشف حقیقت

خاموشی کا تذکرہ آیا ہے۔ بہتر ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کی زبانی اس سکوت کی تفصیل بھی دیکھ لیں:

"مفتی (کفایت اللہ) نے اس گفتگو میں قطعاً حصہ نہیں لیا جب انھوں نے دیکھا کہ گفتگو کا رُخ ذاتی شکایات اور دوسرے معاملات سے متعلق غم و غصہ پر مبنی ہے اور بحث میں جگہ جگہ وہی جذبہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے اور تحقیق حق کو غلط طریقے سے الجھایا جا رہا ہے تو یقیناً ان صورتوں میں جو کہ مکالمہ میں مذکور ہیں مفتی صاحب کو بولنا نہیں چاہیے تھا۔"[1]

اس ذاتی رنجش اور بنیاد کا خود حضرت علامہ نے بھی اپنی گفتگو میں اقرار کیا اور فرمایا کہ "گفتگو کرنے والی جماعت نے عرصے سے مجھے نظر انداز کر رکھا ہے۔ پس اگر میں نے کوئی دوسری راہ اختیار کرلی ہے تو آپ کیوں مجھے اپنا سمجھ کر تبادلۂ خیالات کرنے آئے ہیں؟ میں تو آپ کے لئے اچھوت ہو چکا تھا۔"[2] خوب دھیان رہے کہ مقصد اس تفصیل کا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے پیش نظر اصولی اور با مقصد اختلافات کم اور ذاتی گروہ بندی کے جذبات زیادہ موجزن تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ذمے داروں کے سامنے تو صرف الکشنی داؤ پیچ ہی تھے ورنہ ان کے حلقے میں ان مولویوں اور مولاناؤں کی ایسی اہمیت کہاں تھی۔ جناح صاحب نے ان مقاصد میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے ایک مخلص کو تحریر فرمایا: "ہم بڑی حد تک اپنی قوم کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور رجعت پسند عناصر سے پاک کر چکے ہیں۔ ہم نے کسی حد تک اس خاص طبقے کے اثر کو زائل کر دیا ہے جو مولوی مولانا کہلاتے ہیں۔"[3]

حضرت علامہ نے جمیعۃ علماء اسلام کے جلسے میں جو دیوبند میں ڈاک خانے کے سامنے میدان میں منعقد ہوا خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ راقم الحروف حسب عادت پہلے والے ذوق و شوق سے حضرت کی تقریر سننے کے لئے حاضر ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مسلم لیگ کی یا مسلم لیگی جمیعۃ علماء کی طرفداری کے لئے "تاریخی، تہذیبی اور دینی" کچھ بھی دلائل حضرت کے سامنے نہیں تھے۔ بعض

---

[1] [2] کشف حقیقت [3] منظور الحق صدیقی، مآثر الاجداد، مطبوعہ المکتبۃ السلفیہ، لاہور پاکستان، ص ۴۰۴

خاص خاص جملے تو آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں فرمایا کہ " ہندوؤں کے ساتھ ہمارا اتحاد کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارا کھانا الگ ان کا کھانا الگ، ہمارا لوٹا الگ ان کا لوٹا الگ، ان کے سر پر چوٹی ہے ہمارا سر صاف ہے۔ وہ دھوتی پہنتے ہیں ہم پاجامہ پہنتے ہیں۔ میں عمر دراز سے دوراہے پر کھڑا تھا۔ مسٹر جناح نے مجھے راستے پر لگا دیا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ مسٹر جناح نے مجھے روشنی دکھلادی۔

یہ تمام واقعات، حضرت کے ساتھ ان حضرات کا مغائرانہ رویہ، گرفتاری کے زمانے میں حضرت کے نکالنے کی سازشیں اور سرگرمیاں، مسلم لیگ کی اعانت و نصرت میں فتوے اور بیانات کی تیاریاں اور پھر جمعیۃ علماء اسلام کی جولانیاں سب راقم الحروف کی نظروں کے سامنے گزری ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے اور معافی مانگ کے ان واقعات کو اس لئے ذکر کیا کہ جمعیۃ علماء اسلام کے بزرگوں کا برصغیر کے مسلمانوں کی قسمت بنانے یا بگاڑنے میں سب سے بڑا حصہ ہے۔

مسلم لیگی دشنام طرازیاں اور دست درازیاں

مختلف الکشنی سیاستوں اور تدبیروں میں ایک پالیسی یہ بھی تھی کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف بہت تحمل پروپیگنڈہ کیا گیا اور اس میں گفتنی کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں ناگفتنیاں بھی کہی گئیں۔ ویسے تو بھی نیشنلسٹ لیڈروں اور علماء کے خلاف دشنام طرازیاں اور الزام تراشیاں کی گئیں مگر اس تنظیم کے صدر اور مسلمان قوم میں سب سے زیادہ محترم، مقتدر اور مقبول ہونے کے سبب ہمارے حضرت رحمۃ اللہ کو خصوصی نشانہ بنایا گیا۔ جلسوں، اجتماعات، تقریبات، اخبارات، اشتہارات وغیرہ وغیرہ کے ذریعے کوئی دشنام اور اتہام ایسا نہ تھا جو حضرت پر آزمایا نہ گیا ہو۔ ہندوؤں کا زرخرید غلام، ضمیر فروش، مسلم دشمن، منافق، غدار، کافر، کانگریس کا ایجنٹ وغیرہ وغیرہ سیکڑوں گالیاں روزانہ برسرعام اور اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ عوام تو عام طور پر زیادہ غور و فکر کے عادی نہیں ہوتے مگر مسلم لیگی لیڈران بھی ان سے پیچھے نہیں تھے۔

"۱۶؍مارچ ۱۹۴۵ء کو مسٹر جناح نے کوئٹہ کی ایک تقریر میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو کانگریس کا زرخرید خیمہ بردار کہتے ہوئے کرشچین نژاد فتویٰ دیا کہ یہ مسلمان ہی نہیں ہیں..."[1]

"مسٹر جناح نے بی بی سی کے نمایندے کے سامنے مولانا آزاد اور مولانا مدنی کو انگریزی کی سب سے بڑی گالی دی اور کہا کہ ہر قوم میں کوئزلنگ ہوا کرتے ہیں اور یہ کہا کہ آپ کے لاؤ ہاہا کہاں ہیں؟"[2]

"آئی آئی چندریگر نے ۱۰ستمبر ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں کہا کہ قوم پرور جماعتیں کانگریس کے اشاروں پر ناچنے والی طوائفیں ہیں۔"[3]

لیڈروں اور ذمہ داروں کی ایسی کھلی ہوئی گالیوں سے عوام اور نوجوان مسلم لیگیوں کو اس راستے پر گرین سگنل ملتے رہتے تھے اور وہ اپنی چیرہ دستیوں اور سب و شتم میں حدود

لہ تہ تہ مولانا محمد میاں، حیات شیخ الاسلام، ص ۲۱۰

سے آگے گزر جاتے تھے۔

"۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن سے گفتگو کے بعد مولانا آزاد شملہ سے کلکتہ کے لئے جس ٹرین سے روانہ ہوئے مسلم لیگ کے کچھ لیڈران بھی اسی ٹرین سے ہم سفر ہو گئے۔ ان لیگی لیڈروں نے روانگی سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو فون کردیا کہ مولانا اسی ٹرین سے ہم سفر ہیں جس سے شرارت پسند طلبار کا ایک انبوہ کثیر قبل از وقت علی گڑھ اسٹیشن پر آدھمکا۔ ان شریف زادوں نے اپنی تہذیب کا پوری طرح ننگا ناچ ناچ کر مظاہرہ کیا جب گاڑی چلنے لگتی تو زنجیر کھینچ دی جاتی۔ اس طرح متواتر ایک گھنٹے تک گاڑی لیٹ کرتے رہے۔ فحش گالیوں کے ساتھ انتہا یہ کی کہ پتلون کی بٹنیں کھول اپنی شرافت کا اظہار انتہائی دیدہ دلیری اور بے حیائی کے ساتھ کرتے رہے۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسلم لیگی لیڈر یہ تمام ناشائستہ حرکتیں دیکھتے اور خوش ہوتے رہے۔"[1]

اور یہ مسلم لیگی لیڈر جو طلبائے عزیز کی ان کارروائیوں پر اظہار پسندیدگی اور شاباشی دے رہے تھے یہ کیبنٹ مشن کے ملاقات کے بعد واپس آرہے تھے۔ شاید ناظرین کو معلوم نہ ہو کہ اس موقع پر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبران شملہ میں تشریف فرما تھے۔ دوسرے دن مسلم لیگ کے آرگن ڈان نے بھی اس واقعہ پر بہادر طلبار کی ہمت افزائی کی۔ اس نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا: "جہاں تک اس سلوک کا تعلق ہے جو لیگی لیڈروں کی جانب سے مولینا کے ساتھ ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ گلدستہ کے مقابلے میں تو ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے جو شو بوائے کا کام کرتے ہیں۔"[2]

کئی مقامات پر حضرت پر دست درازی کی گئی اور چونکہ حضرت کی جانب سے کوئی بچاؤ نہیں کیا گیا اور نہ خدام کو حضرت نے دفاع کی اجازت دی اس لئے کئی موقعوں پر صدمات اور تکلیفیں پہنچیں۔ ان سارے واقعات کا احاطہ اس موقع پر مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ تاہم دو تین واقعات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

---

[1] مولانا آزاد ڈائری مؤلفہ یحییٰ ابن اثر انصاری دھولیہ، ص ۳۱۹
[2] مولانا محمد میاں حیات شیخ الاسلام، ص ۳۱۳

محمد طیب صاحب کا مکتوب بنام محمد میاں عفی عنہٗ

مولنٰا المحترم السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

حضرت اقدس بعد مغرب سید پور کے لئے روانہ ہوئے وہاں مسلم لیگیوں کے ایک جم غفیر نے حضرت اور ان کے رفقاء کو گھیر لیا اور راستہ روک دیا۔ بمشکل تمام پلیٹ فارم سے باہر نکلے۔ لیگی بلوائی کسی صورت سے حضرت کو آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ سیاہ جھنڈیاں لئے ہوئے مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اکثر غنڈے شراب کے نشے میں مست تھے۔ ایک لیگی نے حضرت مدنی مدظلہٗ العالی کے سر سے ٹوپی اُتار لی۔ لیگیوں نے (حضرت کے) رفقائے سفر کو پوری سرگرمی سے گھونسوں اور مکّوں سے زدوکوب کیا۔ گاڑی بان کو زخمی کر دیا۔ پولیس کو خبر دی گئی لیکن وہ منزل مقصود یعنی اس گاؤں تک پہنچانے کی ذمہ داری نہیں لے سکی۔ اس لئے آگے بڑھنا لیگیوں نے ناممکن کر دیا۔ شب بھر اسٹیشن ہی واپس ہو کر قیام فرمایا۔ صبح کو واپس کٹھیار تشریف لائے۔ یہاں کا واقعہ اپنی نوعیت میں سب سے شرمناک اور افسوسناک ہے۔ لیگیوں نے جن میں شہر کے غنڈوں کے علاوہ اسکول کے طلبہ زیادہ تھے۔ ایک گھڑے میں کیچڑ گھولا اور ایک ہار بوسیدہ جوتوں کا اور ایک شہد کا چھتہ نالی کی غلاظت میں ڈبو کر لائے۔ سیاہ جھنڈیاں دکھا کر مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ حضرت بھاگلپور جانے والی گاڑی میں سکنڈ کلاس کے ڈبے میں تشریف فرما تھے۔ ڈبّے کے پاس آکر نہایت فحش اور گندی گالیاں اور نعرے لگا لگا کر شور مچا رہے تھے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کے بعد چھ سطروں میں ان گندہ اور فحش الفاظ کو نقل کر کے تحریر کیا گیا ہے کہ نقل کفر کفر نباشد۔ مگر ہمارے خیال میں نقل کفر کفر نہیں ہے تو خلاف تہذیب و متانت ضرور ہے علاوہ ازیں یہ بھی نہیں ہے کہ جو کفر نہ ہو اس پر لامحالہ عمل ہو لہٰذا ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ نقل کفر کے بعد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت شیخ کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے اور رفقاء کو جواب دینے سے منع فرما دیا تھا۔

محمد طیب مورخہ ۹ ۵/۱۲ ۶"

اس بیان کے بعد ٹرین چھوٹ جانے اور شہر میں نقص امن کی وجہ سے حضرت کے پولیس کی حفاظت میں رات بھر پولیس اسٹیشن میں رہنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک واقعہ مولانا کفیل احمد صاحب استاذ تفسیر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی زبانی سنیئے:

"حضرت مولانا ریاض الدین صاحب سید پوری جو کہ حضرت شیخ مدظلہٗ کے میزبان اور سید پور لانے کے باعث تھے وہ کلکتہ تشریف لائے ہوئے ہیں، موصوف نے راقم الحروف کو نماز جمعہ سے قبل نمازیان مسجد کولوٹولہ کی موجودگی میں اپنی درد بھری داستان سنائی کہ حضرت مدنی اپنے خادم احسان الحق صاحب مرحوم کی تعزیت میں قصبہ سونار تشریف لائے ہوئے تھے اور میری درخواست پر شام کا کھانا تناول فرمانے کے لئے سید پور اسٹیشن پر اُترے تھے۔ افسوس کہ ممدوح کو میرے غریب خانے تک پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دفعتاً تقریباً سات سو لوگوں کا انبوہ لیگی نعرے لگاتا ہوا آدھمکا اور حضرت کو عریاں دشنام دہی شروع کردی۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں، ڈنڈے اور چھریاں تھیں۔ بدتمیزی سے نام لے کر قتل کردو، مارڈالو، ٹکڑے ٹکڑے کرڈالو۔ یہ غدار ہے، ایسا ہے ویسا ہے۔ جو کچھ منہ میں آرہا تھا بکواس کر رہے تھے۔ ہم بنا بر استقبال صرف دس پندرہ آدمی تھے اور اس میں برابر زیادتی ہو رہی تھی، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تین ہزار غنڈے سید پور درکناپ اور مضافات سے جمع ہو گئے، اور پھر حسین احمدؒ بن حسین کے سامنے کربلا کا منظر آگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مار دھاڑ شروع کردی اور ہم چند لوگ جو شیخ مدظلہٗ کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے کچھ مضروب اور کچھ مجروح ہو رہے تھے اور خدا جانے ہمارے اندر فرشتے آگئے تھے یا کیا بات تھی کہ بے انتہا قوت ہمارے اندر پیدا ہوگئی تھی اور ہم بنیان مرصوص ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں ایک فرعون بے سامان نے اپنی فرعونیت کا شدید ترین مظاہرہ کیا۔ حضرت شیخ کو زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی۔ بیدردی سے گریبان پکڑا اور سخت مدافعت کے باوجود کلاہ مبارک سر سے اتاری اور بیہودہ کلمات بکتے ہوئے پاؤں کے نیچے روندی اور پھر اس کو جلا دیا۔[1]

۱۔ مولانا محمد میاں، حیات شیخ الاسلام

ان تفصیلات کے بعد مولینا محمد میاں نے یہ واقعات لکھے ہیں کہ جن لوگوں نے حضرت کے ساتھ دست درازی کی اور ان کو زدوکوب کرنا چاہا قدرت نے ان کو زیادہ مہلت نہیں دی اور دو چار دس کے اندر ہی اندر ان کے ساتھ جل کر اور ڈوب کر مرجانے کے حادثات پیش آئے یہ معاملات اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان کے ہیں ان پر ہم کیا حکم لگا سکتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق تو صرف ان واقعات سے ہے اور ساتھ ہی ہمیں اس کا مکمل یقین ہے کہ حضرت نے ان کے حق میں بدخواہی ہرگز نہیں کی ہوگی۔ یہ واقعات بنگال اور بنگالی مسلمانوں یا دوسرے لفظوں میں مستقبل میں ہونے والے مشرقی پاکستان کے تھے۔ لگے ہاتھوں ایک دو واقعات نمونے کے طور پر پنجاب اور ہونے والے مغربی پاکستان کے بھی ملاحظہ فرمائیں:

"تقسیم سے چند ماہ پیشتر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں شیخ الاسلام حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے پنجاب تشریف لائے۔ مختلف شہروں میں رونق افروز ہوئے۔ مقصد سفر پورا کرنے کے بعد لاہور سے میل پر سوار ہوئے اسی گاڑی سے مشہور مسلم لیگی لیڈر راجہ غضنفر علی خاں کے سفر کا پروگرام تھا۔ اتفاقاً اس کا سفر ملتوی ہوگیا لیکن پروگرام کے مطابق ہر اسٹیشن پر مسلم لیگی کارکن استقبال کے لئے موجود تھے جب گاڑی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو مسلم لیگی کارکن راجہ غضنفر علی خاں کو تلاش کرنے لگے۔ ریلوے گارڈ نے کارکنوں کو بتایا کہ راجہ صاحب کا پروگرام ملتوی ہوگیا ہے۔ وہ اس گاڑی میں سفر نہیں کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی اس نے شرارتاً بتلایا کہ اس گاڑی کے فلاں ڈبے میں مولینا حسین احمد مدنی سفر کر رہے ہیں۔ اس پر وہ تمام مسلم لیگی کارکن اس ڈبے کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے اور حضرت کے خلاف نعرے بازی اور ہلڑبازی شروع کردی۔ اور حضرت پر ٹماٹر وغیرہ پھینکنے لگے۔ اتفاقاً امرت سر کا ایک نوجوان عبدالرشید اپنا مال بک کرانے کی غرض سے اسٹیشن پر آیا ہوا تھا۔ اس نے ایک ڈبے کے پاس ہجوم دیکھ کر معلوم کیا کہ ایک بزرگ کے ساتھ لوگ نہایت بدتمیزی کر رہے ہیں۔ وہ حضرت مدنی کو جانتا بھی نہیں تھا۔ عبدالرشید نہایت صحت مند نوجوان تھا۔ اس نے جان پر

کھیل کر حضرت مدنی کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ مجمع ڈبے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ عبدالرشید ڈبے کے پائدان پر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مسلم لیگی مجمع اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کو بے دریغ زدوکوب کیا حتیٰ کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ لیکن اس مردِ مجاہد نے حضرت مدنی کی طرف ہجوم کو بڑھنے نہیں دیا۔ حتیٰ کہ گاڑی چل پڑی اور وہ پلیٹ فارم پار کرنے کے بعد گاڑی سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ جب گاڑی جالندھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو یہاں کے مسلم لیگی کارکن بھی راجہ غضنفر علی خاں کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ گاڑی رُکتے ہی گارڈ نے انھیں راجہ صاحب کے پروگرام کی اور حضرت مدنی کی موجودگی کی خبر دی جس پر وہ مجمع حضرت کے ڈبے میں پہنچا اور وہی طوفان بدتمیزی شروع کر دیا۔ اس مجمع کے ساتھ تین نوجوان شمس الحق عرف شمّی، فضل محمد اور فتح محمد تھے۔ یہ دونوں جالندھر کے محلہ پُرانی بکھری اور شمس الحق محلہ عالی کا رہنے والا تھا۔ انھوں نے حضرت اقدس کی توہین میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گالیاں دیں، گندی چیزیں پھینکیں، حضرت کا عمامہ چھینا، ٹوپی اُتار پھینکی، ریش مبارک نوچی اور شمّی نے دست درازی بھی کی۔ حضرت مدنی صبرِ جمیل کی صورت مجسّم بنے بیٹھے رہے۔ مگر حضرت کے ساتھ جو خادم تھے وہ صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکے اور مزاحمت کا ارادہ کیا تو حضرت نے انھیں منع کر دیا کہ تم خاموش رہو۔ اگر برداشت نہیں کر سکتے تو دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اتنے میں گاڑی چل دی۔[1]

یہ دو چار نمونے مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ورنہ خطوط، اخبارات، تقریروں، تحریروں، اشتہاروں اور پوسٹروں کے ذریعے گالیوں، تہمتوں اور طعنوں کی جو بوچھاڑ روز روز نئے نئے عنوانوں کے ساتھ برسائی جاتی تھی وہ سب سپردِ قلم کی جائے تو پوری

[1] ماہنامہ الرشید، مدنی و اقبال نمبر، بابتہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۹ء، ساہیوال پاکستان، ص ۳۱۲

کتاب بن جائے۔ یہ وہ واقعات ہیں جو علمائے وقت، صلحائے اُمّت اور تابعین رسول کے ساتھ پیش آئے اور مرورِ ایام کے باوجود تاریخ نے انہیں یاد رکھا۔ صدہا واقعات عام نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے ہوئے ایسے بھی ہیں جن میں ان مجاہدین نے پاکستان اور مسلم لیگ کی مخالفت کرنے والوں کے گھر اُجاڑ دیئے۔ حقّہ پانی بند کر دیا۔ رشتے ٹوٹ گئے اور طلاقیں ہو گئیں اور کہیں کہیں جان سے مار ڈالنے کے واقعات بھی پیش آئے مگر وہ، جو کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ یہ سب الکشنی تدبیریں اور انتخابی داؤ پیچ تھے جو اسلام کے نام پر کھیلے گئے۔

الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی، کیبنٹ مشن پلان

۱۹۴۵ء ۔ ۱۹۴۶ء

اسلامی حکومت کا اعلان، مسلم لیگ میں مسلم کا عنوان، پاکستان کا نام، شرعی اور فقہی فتاویٰ، قرآن وحدیث کے احکامات اور ان سب پر مستزاد علمائے کرام ومفتیان عظام حکیم الامت، شیخ الاسلام، مفسر قرآن وغیرہ وغیرہ القاب وآداب کی طرف سے اپیلیں، ان تمام عوامل نے مسلمانوں کے دل ودماغ اور فکر ونظر پر اتنی کثرت اور ایسی شدت کے ساتھ ہجوم کیا کہ وہ ان خوش آیند نعروں میں محصور ومسحور ہوکر رہ گئے۔ سیاسی اور مذہبی طور پر نتیجہ کچھ بھی ہوا ہو مگر اسلامی جذبات کے پیش نظر کون ایسا مسلمان ہوگا جو اسلامی شریعت، اسلم حکومت اور قرآن وسنت جیسے عنوانات سنتا اور مخالفت کرتا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں اور جمعیۃ علماء نے اپنی والی پوری ہی کوشش کرڈالی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جہاں تک پہنچ سکے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ کارکن اور رضاکار گاؤں گاؤں اور شہر شہر پہنچے اور مسلمانوں کو بتلایا کہ یہ سب اقتدار کی جنگ ہے۔ سیاسی کاریگری اور اسلام وشریعت کے پردے میں سامراجی بازی گری ہے۔ مگر مسلمان پاکستان کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور الکشن میں مسلم لیگ کی فتح ہوکر ہی رہی۔ مگر یہ فتح بھی ایک تاریخی نیرنگی شمار ہونے کے قابل ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"بنگال میں مسلم لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی اور اس کی وزارت قائم ہوئی۔ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور وہاں کانگریسی حکومت قائم ہوئی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو ایسی اکثریت نہیں حاصل ہوئی کہ وزارت بناسکے۔ چنانچہ حکومت یونینسٹ پارٹی کے ہاتھ میں رہی۔ سندھ میں بھی مسلم لیگ کو اکثریت نہیں حاصل ہوئی اور اس کی گورنمنٹ نہیں بن سکی۔ یہ حال ان صوبوں کا تھا جہاں مسلم اکثریت تھی اور جن کا پاکستان بننا تھا۔ اصل کامیابی لیگ کو

ئہ انڈیا ونس فریڈم

اُن صوبوں یوپی، بہار وغیرہ میں حاصل ہوئی جو مسلم اقلیت کے صوبے تھے لیکن وزارت تو کانگریس ہی کو بنانی تھی۔ مولینا آزاد نے کوشش کی کہ حکومت میں مسلم لیگ کو بھی شریک کر لیا جائے مختلف صوبوں کے مسلم لیگی ممبران اس کے لئے تیار بھی تھے مگر مسٹر جناح نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔ اس وقت اگر لیگ مفاہمت کے لئے تیار ہو جاتی تو ابہام و تفہیم کے راستے کھل سکتے تھے۔ چودھری خلیق الزماں نے اس مسئلہ پر لکھا ہے:

"ان وجوہات کی بنا پر راجہ صاحب سلیم پور کی صدارت میں یہ طے ہوا کہ مسلم لیگ اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کرے۔ ایک نقطۂ نظر سے یہ اچھا ہی ہوا کہ رفیع احمد قدوائی کانگریس کی منسٹری میں آ گئے۔ ورنہ شاید مسلم لیگ اور کانگریس میں صلح ہو جاتی جو بالآخر مسلم مفاد کے لئے زہر ثابت ہوتی۔ مسلم اور کانگریس میں مصالحت کی گفتگو کا نتیجہ اگر مسلم لیگ کی منسٹری میں ختم ہوتا تو اس صلح کے بعد پاکستان کے لئے دروازہ مسدود ہو جاتا۔"[1]

یہ نکتہ خاص طور پر دماغ میں رہے کہ مسلم لیگ مصالحت و مفاہمت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ مسٹر جناح صاحب بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ اس بات کی نگرانی کر رہے تھے کہ کسی صوبے میں کوئی مسلم لیگی ممبر کانگریس سے بات نہ کرنے پائے۔ مولینا آزاد کا بیان سنیئے:

"میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہمیں وزارتیں بناتے ہوئے مسلم لیگ کے بارے میں فراخ حوصلگی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ جہاں بھی مسلم لیگی ممبران اسمبلی میں کامیاب ہوئے تھے وہاں میں نے ان کو وزارت میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ ان صوبوں میں کیا جہاں مکمل طور پر کامیاب تھی اور ان میں بھی جہاں کانگریس کی غالب اکثریت تھی۔ بہت سے صوبوں میں خاص طور پر بہار، آسام اور پنجاب میں مسلم لیگی ممبران اس کے لئے برضا و رغبت تیار تھے، مگر مسٹر جناح نے ان کو کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے سے روک دیا۔"[2]

---

[1] شاہراہ پاکستان، ص ۱۳۶، از چودھری خلیق الزماں   [2] انڈیا ونس فریڈم، صفحہ ۱۲۸

بہر حال صوبائی حکومتوں کی تشکیل کے بعد برطانوی حکومت نے ہندوستانی مسئلے کے حل بلکہ آزادی کو بروئے کار لانے کے لئے ہاؤس آف لارڈس کا ایک وفد ہندوستان بھیجا طے کیا جو مختلف سیاسی پارٹیوں کو کسی ایک لائحۂ عمل پر متفق کرنے کا فرض انجام دے۔ چنانچہ لارڈ پتھک لارنس سکریٹری آف اسٹیٹس فار انڈیا، سر اسٹیفورڈ کرپس پریزیڈنٹ بورڈ آف ٹریڈ اور مسٹر اے۔ وی الگزینڈر دی فرسٹ لارڈ آف ایڈمیرالیٹی۔ ان تین افراد پر مشتمل یہ مشن ۱۹۴۶ء کے مارچ میں ہندوستان پہنچا اور لارڈ ویول وائسرائے ہندوستان کے ساتھ مل کر ہندوستانی لیڈروں سے شملہ میں مصروف گفتگو ہوا۔ بحث میں سب سے اہم موضوع فرقہ وارانہ مسئلہ تھا جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر اور اس سے زیادہ اپنی جماعتی پالیسی کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کا اعلان ہوتے ہی اور آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرست مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔ کانگریس اس بات پر تیار تھی کہ جیسے بھی ہو آزادی کا اعلان ہو جائے۔ چنانچہ کافی بحث وتمحیص اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ تک غور وخوض کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے آزاد ہندوستان کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا جس میں مسلمانوں کے حقوق کا حل پیش کیا گیا تھا۔ اس اسکیم میں یہ طے کیا گیا تھا کہ ہر صوبہ اپنے نظام حکومت میں تین محکموں کے علاوہ پوری طرح آزاد رہے گا۔ صرف تین وزارتیں دفاع، مواصلات اور امور خارجہ مرکز کے ماتحت ہوں گے۔ ان کے علاوہ کچھ اور محکمے بھی ایسے تھے جن کو صوبے اپنی صوابدید کے مطابق مرکز کے حوالے کر سکتے تھے۔ مولانا کی تجویز پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے غور وخوض کے بعد یہ رائے دی کہ یہ اقلیتوں کے اطمینان اور ان کی حفاظت کے لئے بہترین تجویز ہے اور کانگریس اسے منظور کرتی ہے۔ اس مرحلے کے بعد یہ تجویز کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کی گئی اور اُس نے بھی اسے منظور کیا اور ساتھ ہی اظہار پسندیدگی کیا۔ مگر مسلم لیگ نے تقسیم اور پاکستان کے علاوہ کسی حل کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا آزاد نے بحیثیت صدر کانگریس وفد سے کہا کہ مسلم لیگ کے علاوہ دوسری مسلم جماعتوں کے نظریات پر بھی کیبنٹ مشن کو غور کرنا چاہئے۔ اس پروگرام کے ماتحت مشن نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کی حضرت نے مشن کے سامنے اپنا یعنی نیشنلسٹ مسلمانوں کا یا جمعیۃ علماء کا فارمولا پیش کیا۔

بہتر ہے کہ یہ تاریخی فارمولا کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش نظر رہے

(۱) ہندوستان کا دستور حکومت وفاقی اصول پر مرتب کیا جائے۔

(۲) تمام صوبے یا وفاقی وحدتیں مکمل طور پر آزاد ہوں اور غیر مصرحہ اختیارات انہی کو حاصل ہوں۔

(۳) وفاقی مرکز کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں۔

(۴) وفاقی وحدتوں کے لئے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے۔

(۵) وفاق کی تشکیل ایسے اصولوں پر کی جائے جس میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کا تحفظ اس طرح کیا جائے جو مسلمانوں کے لئے قابل اطمینان ہو۔ جمیعۃ علماء کی رائے میں یہ اطمینان ذیل کے اصولوں سے کسی اصول پر وفاقی حکومت کی تشکیل سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱) مرکزی ایوان میں نمائندگی کا تناسب یہ ہو:

ہندو	مسلمان	دیگر اقلیتیں
۴۵	۴۵	۱۰

جمیعۃ علماء نے اس دفعہ کی روح کو بطور اصول پیش نظر رکھا ہے۔

(ب) اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان مرکزی کی ⅔ اکثریت اپنے مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی آزادی کے خلاف قرار دے تو قانوناً وہ بل ایوان میں زیر بحث نہ آسکے۔

(ج) ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جو مرکز اور صوبوں کے تنازعات، صوبوں کے باہمی نزاعات اور ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کر سکے اور جس میں مسلم غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو۔ سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کا اختیار مسلم اور غیر مسلم صوبوں کی ایک ایسی کمیٹی کو دیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ارکان کی تعداد مساوی ہو۔

(د) یا اس کے علاوہ کوئی اور اصول جو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے کیا جائے۔"[1]

مشن کے ارکان نے اس فارمولے کو تفصیل اور دلچسپی کے ساتھ سنا۔ ساتھ ہی ساتھ وضاحت اور تشریح کے لئے سوالات اور گفتگو بھی کی۔ مولینا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء نے اس ملاقات کے بارے میں لکھا ہے:

"۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک وزارتی مشن کے ارکان سے ملاقات ہوئی۔ مشن نے جمعیۃ کے فارمولے سے خاص دل چسپی لی جتّی کو مقررہ وقت آدھے گھنٹے کے بجائے سوا گھنٹے تک گفتگو جاری رہی۔ مشن کے ارکان فارمولے کے مضمرات اور اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سوالات کرتے رہے اور ان کے جوابات پر مسرت و اطمینان کا اظہار کرتے رہے۔ اس فارمولے کے ساتھ وزارتی مشن کی دل چسپی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تقریباً ایک ماہ بعد یعنی ۱۶/مئی کو مشن نے خود جو فارمولا پیش کیا، کہا جاتا ہے کہ وہ بجنسہٖ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا تھا۔"[2]

پاکستان کا مطالبہ مشن کے ارکان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان ایک کمزور ریاست ثابت ہوگی جو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ مولینا آزاد کا بیان ہے:

"مسلم لیگ کے لیڈر ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے صوبوں پر مشتمل علیحدہ ریاست کے بارے میں مبہم اور غیر واضح طور پر بات کرتے تھے۔ کیبنٹ مشن اس مطالبے کو منظور کرنے پر تیار نہ تھا۔"

"اس نے صفائی کے ساتھ غیر مبہم الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ ملک کی تقسیم اور ایک علیحدہ ریاست کے قیام کی تائید نہیں کر سکتا۔ لارڈ پیتھک لارنس

---

[1] خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند کانفرنس سہارنپور، مئی ۱۹۴۵ء

[2] مولینا محمد میاں، حیات شیخ الاسلام، ص ۲۴۳

اور سر اسٹیفورڈ کرپس نے بار بار کہا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کیسے قائم اور ثابت قدم رہ سکتا ہے۔[1]

بہتر یہ ہے کہ اس موقع کی تفصیل مولینا آزاد کے بجائے جناب ابوالحسن اصفہانی سے سنی جائے۔ موصوف جناب جناح کے بڑے معتمد، مخلص پیرو کار اور سیاسی شاگرد تھے۔ جناح صاحب ان کو بیٹا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں :

"برطانوی لیبر کیبنٹ کے تینوں ارکان سے ہماری گفتگو بہت دلچسپ رہی۔ سر اسٹیفورڈ کرپس برابر ایک متحد ہندوستان جس میں مسلمانوں کے لئے مناسب تحفظات ہوں کے نظریئے کی تائید کرتے رہے۔ وہ بہت قابل اور قائل طریقے سے یہ استدلال کرتے رہے کہ اگر ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان بنا دیا گیا تو نئی ریاست پاکستان زندہ رہنے کے قابل نہ ہوگی اور اپنی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصے بعد مصائب میں گرفتار ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ وقت ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور اس مقصد کے لئے کیبنٹ مشن کی تائید و حمایت سے کانگریس اور دیگر ہندو لیڈروں کے ساتھ معاملہ طے کرلیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور ہندوستان کو تقسیم کر دیا گیا اور پھر پاکستان کے زندہ رہنے کی صلاحیت غیر یقینی ثابت ہوئی تو ہندوستان پاکستان کو اپنی شرائط ہی پر واپس لینے کو تیار ہوگا اور اس طرح ملک میں مسلمانوں کی حالت بہت افسوسناک ہو جائے گی۔"

"مسٹر اے۔ وی الگزینڈر بہت کم بولے اور وہ بھی محض دفاع کے نقطۂ نظر سے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ برطانیہ کے ماہرین دفاع کی متفقہ رائے یہ ہے کہ تقسیم ہند سے ہندوستان کے دونوں ملکوں بالخصوص پاکستان کے لئے دفاع کا ایک سنگین مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ پاکستان کے دفاع کا مسئلہ ایک

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۴۵ و ۱۵۰

تیزی بھی کھیر ہوگا اور اس میں بکثرت ایسی دشواریاں پیش آئیں گی جن پر قابو پانا ممکن نہ ہوگا اور مشرقی پاکستان کو کسی جارحیت کے خلاف دفاع تو تقریباً ایک ناممکن بات ہوگی۔ اسٹیفورڈ کرپس یا پیتھک لارنس نے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کہ کس نے، ایک مزید اپیل یہ دی تھی کہ آپ کو ایک ایسی ریاست کی ضروریات پوری کرنے کے لئے جو ترقی کی خواہاں ہے ایک اقتصادی کمزوری ورثے میں ملے گی اور قدرتی وسائل میں بھی آپ ہندوؤں سے بہت پیچھے ہوں گے۔[1]

مسلم لیگ اور بالخصوص مسٹر جناح پر کوئی دلیل اور کوئی منطق کارگر نہیں ہوئی اور وہ پاکستان سے کم کسی پیش کش پر رضامند نہیں ہوئے۔ اس کانفرنس کے موقع پر جہاں انھوں نے مخالف موافق بھی افراد اور جماعتوں سے گفتگو کی وہیں مولینا ابوالکلام آزاد کے ساتھ آخری بغض وعناد کا ایک بار پھر مظاہرہ کیا اور مصافحہ کرنے سے انکار کردیا۔ یاد ہوگا کہ اس سے پہلے بھی ایک بار موصوف نے مولانا کو شوپوائے کہہ کر کسی قسم کی گفتگو کرنے سے انکار کردیا تھا۔ نفرت و عداوت کے ان جذبات کا اثر سیاسی گفتگو اور مفاہمت پر بھی پڑ رہا تھا۔ کیبنٹ مشن کے ارکان حیران تھے کہ لیگ ہندوؤں کے خلاف بولنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی جب کہ کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ لارڈ ویول نے ان مجالس کے بارے میں کہا:

> جناح ایک گھنٹے تک ہندو مسلم اختلافات اور ہندوستان کی تاریخ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور سوالات کے جوابات دئے۔ جب اُن سے پاکستان کے حدود اربعہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ مسلم لیگ کے دو کرتا دھرتا ذمے داران اپنے ان لیڈر سے کچھ بہتر ہی ثابت ہوئے۔ ۱۰ر اپریل کو مسٹر حسین شہید سہروردی آئے۔ ویول لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو ہمیشہ ایک ناقابل، خود رائے اور غیر معتدل خیالات کا حامل سمجھا ہے۔ وہ

[1] ابوالحسن اصفہانی، قائداعظم جیسا میں انھیں جانتا ہوں، ص ۱۵۸، مطبوعہ پاکستان۔

باتیں بہت کرتے ہیں اور انھوں نے مشن پر اپنا خراب امپریشن چھوڑا۔ مسلم لیگی لیڈروں نے بڑی لمبی تقریریں کیں اور بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے مگر ساری گفتگوؤں کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ ہندوؤں سے نفرت تھی۔ مسلم اقلیت کے صوبوں سے چار دوسرے ممبران، بمبئی سے آئی آئی چندریگر، یوپی سے خلیق الزماں سی پی سے سید عبدالرؤف شاہ اور مدراس سے محمد اسماعیل آئے۔ مگر یہ لوگ بالکل ہی غیر موثر ثابت ہوئے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ پاکستان بن جانے سے مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت ہوگی۔ چندریگر اور خلیق الزماں نے اس بارے میں خاص طور پر بڑی بڑی باتیں کیں مگر ہندوؤں سے نفرت اور عداوت والی بے بنیاد بات کے علاوہ کوئی معقول دلیل نہیں دے سکے۔ صرف چند رسمی اصطلاحات بیلنس آف پاور، پرسٹیج اور نفسیاتی اثر وغیرہ الفاظ کا استعمال کرتے رہے۔[1]

مشن کے ارکان ہندوستانی لیڈران اور کانگریس مسلم لیگ کے ممبران دو ڈھائی ماہ تک رات دن ان بحثوں اور میٹنگوں میں لگے رہے۔ وائسرائے ہندوستان لارڈ ویول کے لئے اتنی طویل مدت تک مسلسل دارالسلطنت دلّی سے غائب رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ دلّی میں موسم اس قدر شدید تھا کہ آگ برس رہی تھی۔ مجبوراً یہ پورا قافلہ دلّی آیا تو پتھک لارنس ایک دن گرمی کی شدّت کی وجہ سے بیہوش ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وائسرائے کے محل میں تو کسی قدر ایر کنڈیشننگ کا انتظام تھا مگر مشن کی رہائش گاہ پر گرمی سے بچاؤ کے لئے ایسے انتظامات نہیں تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کانفرنسوں اور میٹنگوں سے مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ مجبور ہو کر مشن نے ہندوستان کے کانسٹی ٹیوشن کے لئے خود اپنی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز کے بارے میں مولانا آزاد انڈیا ونس فریڈیم میں فرماتے ہیں: "چونکہ کیبنٹ مشن پلان اپنے مفہوم کے اعتبار سے تین گروپوں کے اضافے کے ساتھ

---

[1] ایم۔ جے۔ اکبر: جواہر لال ص ۳۰۳

میرے پیش کردہ پلان اور تجاویز کے موافق تھا اس لئے ہم نے سوچا کہ ہمیں (کانگریس کو) یہ پلان منظور کرلینا چاہیے۔"

"کیبنٹ مشن پلان میں تین محکمے، دفاع، مواصلات اور وزارت خارجہ مرکزی حکومت کے ماتحت رکھے گئے، اور باقی محکمے صوبوں کی ماتحتی یا ان کی صوابدید کے ماتحت رکھے گئے۔ اس کے علاوہ تمام صوبے تین گروپوں میں بانٹ دئے گئے۔

گروپ اے ہندو اکثریت کے صوبے

" بی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان

" سی بنگال اور آسام

پیراگراف نمبر ۱۰ (ہ) کے مطابق صوبوں کی گروہ بندی میں آزادی ہونی چاہیے۔ ان کی اپنی عاملہ اور قانون ساز مجلسیں ہوں گی اور ہر صوبہ ان صوبائی محکموں کا انتخاب کرے گا جنھیں وہ مشترک رکھنا چاہتا ہے۔

پیراگراف نمبر ۱۹ (ہ) کی رو سے یہ سیکشن ان صوبوں کے لئے، جو ہر سیکشن میں شامل ہوں گے آئین بنانے کا کام شروع کریں گے اور یہ بھی فیصلہ کریں گے کہ آیا ان صوبوں کے لئے کوئی مشترکہ آئین بنانا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر بنایا جائے تو گروپ کن صوبائی محکموں سے سروکار رکھیں گے؟ صوبوں کے گروپوں سے نکل جانے کا اختیار ذیلی مشن (۸) کی شرائط کی رو سے دیا گیا تھا جو حسب ذیل تھیں۔ جوں ہی نئے آئینی احکامات پر عمل ہونا شروع ہوگا کسی صوبے کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی اس گروپ سے نکل آئے جس میں اُسے رکھا گیا ہے۔"[1]

کانگریس نے مشن کا یہ پلان آسانی سے منظور کرلیا۔ مگر مسلم لیگ نے اس کے بارے میں اور خاص کر اس کی تشریح و توضیح کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اس کے سامنے بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ اس نے مسلمانوں اور بالخصوص اپنی پارٹی کے طرفدار عوام کو پاکستان کے نام پر ایسے جوش وخروش میں مبتلا کردیا تھا کہ کسی بھی دوسری متبادل تجویز سامنے لانے یا

---

[1] قائد اعظم اصفہانی بحوالہ ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، از وی پی مینن۔

منظور کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مسلم عوام پارٹی سے یا کم از کم قیادت سے تو ضرور ہی روگردانی کریں گے۔ مگر کیبنٹ مشن کے پلان میں ہر قوم، صوبے، اقلیت اور اکثریت کے مفادات کا ایسا تحفظ پیش کیا گیا تھا کہ اُسے رد کر دینا بھی آسان نہ تھا۔ اس لئے مسلم لیگ کے سامنے بڑا ٹیڑھا سوال آ پڑا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی تھی کہ سرکار برطانیہ جس نے ساری ہی عمر مسلم لیگ کو سہارا دیا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس سے مقابلہ و مخالفت کراتی رہی تھی اب بیچ دھارے میں پہنچ کر ساتھ چھوڑ رہی تھی اور پاکستان کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے پلان پر زور دے رہی تھی۔ مسلم لیگ نے سرکار برطانیہ سے مقابلے کا اَن کانسٹی ٹیوشنل کام کبھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اُس نے پلان پر بہت غور و خوض کیا اور ہر ہر پہلو سے دامن بچانے کی کوشش کی مگر آخر میں پلان کی منظوری پر دستخط کر ہی دیے۔ یہ واقعہ بھی مسٹر جناح کے سیاسی شاگرد ابوالحسن اصفہانی صاحب سے سنیئے:

> مجھے اس وقت کی وہ کشیدہ فضا یاد ہے کہ جب کیبنٹ مشن کے دفتر سے قائد اعظم کے سکریٹری کو ایک سر بمہر لفافہ دیا گیا۔ اس میں جو تجاویز ملفوف تھیں انھیں قائد اعظم نے ایک دفعہ پڑھا اور پھر دوسری دفعہ ان پر سرسری نظر ڈالی اور بعد ازاں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ ارکان مجلس نے خط کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا اور پھر اس مضمون پر مباحثہ شروع ہوا۔ اتفاق رائے اس پر تھا کہ مشن نے ہمیں ایک بڑی اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ ہمیں یہ اختیار دیا گیا تھا کہ یا تو ہم مشن کی پیش کش کو جس کے بارے میں ہم کو بتایا گیا تھا کہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی، منظور کر لیں یا ان کی تجاویز کو یکسر رد کر دیں اور اس طرح مشن کی ناکامی کے جو نتائج پیدا ہوں ان کی ذمّے داری اپنے سر لے لیں۔ ہم برابر بحث کرتے رہے۔ رد کرنے کی موافق اور مخالف باتوں پر غور کیا گیا اور دوبارہ غور کیا گیا چونکہ کسی ترمیم کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا ہمارے موقف کی حمایت میں کچھ بھی نہ کہا جا سکتا تھا۔ مجلس عاملہ کے آخری اجلاس کے اختتام سے ذرا پہلے یہ فیصلہ کیا

گیا کہ ان تجاویز کو منظور کر لیا جائے۔ اگرچہ اس سے ہمارے مطالبات اور خواہشات زیادہ حد تک پوری نہ ہوتی تھیں لیکن آخری فیصلہ صدر پر چھوڑ دیا۔[۱]

مسلم لیگ کی جانب سے پلان کی منظوری معمولی بات نہیں تھی بلکہ ہندوستان کے سارے ہی مسائل کا حل تھی، چنانچہ کانفرنس کے جتنے ارکان تھے سب ہی نے اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ مولانا آزاد نے اس موقع کے بارے میں لکھا کہ:

"مسلم لیگ کی کونسل تین دن تک اس پلان پر بحث کرتی رہی۔ آخری دن مسٹر جناح اس نتیجے پر پہنچے کہ اقلیت کے مسئلے کے حل کے لئے اس سے بہتر کوئی حل ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے مسلم لیگ کونسل سے کہا کہ اقلیتوں کے لئے بہتر سے بہتر جو رعایتیں حاصل کی جا سکتی ہیں وہ اس پلان میں موجود ہیں اس لئے میرا مشورہ ہے کہ کونسل متفقہ طور پر اسے منظور کرے۔"[۲]

اس فیصلے پر پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کی جدوجہد آزادی کی سو سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے عوام نے متفقہ طور پر آزادی کی قرارداد پر دستخط کئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فرقہ وارانہ کشیدگی، نفرت اور عداوت ہمیشہ کے لئے دفن کی جارہی تھی۔ دو سو سال کے طویل اور جانکاہ عرصے کے بعد ملک ایک بار پھر زندگی اور آزادی کی سانس لینے کے لئے بیدار ہو رہا تھا۔ مگر عین وقت پر جبکہ بام تک پہنچنے میں دو چار ہی ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا، اچانک کمند ٹوٹ گئی۔ یہ ساری خوشیاں اطمینان اور امیدیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد پورے ملک کو آگ، خون اور زخم و کراہ کے سمندر میں ڈوبنا تھا اور اسی کے لئے یہ ساری تیاریاں کی جارہی تھیں۔ یہ وقتی اتفاق اور منظوری درحقیقت ایک سراب ثابت ہوئی اور مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو منظوری کے بعد نامنظور کر دیا۔ اس کی تفصیل اور اسباب ہم آئندہ ابواب میں پیش کر رہے ہیں۔

---

[۱] اصفہانی قائد اعظم، ص ۳۰۲ [۲] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۵۰

ڈائرکٹ ایکشن

۴۷-۱۹۴۶ء

کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان اس کے تمام حدود وقیود اور شرائط کے ساتھ منظور کیا تھا اور اسی بنیاد پر مسلم لیگ نے بھی اُسے منظور کیا تھا، مگر چند ہی دنوں کے بعد کانگریس کی طرف سے ایسا بیان شائع ہوا جس نے مسلم لیگ کی پالیسی میں تبدیلی کردی۔ کانگریس نے جب مشن کی تجاویز منظور کی تھیں اس وقت اس کے صدر مولینا ابوالکلام آزاد تھے۔ اور اس کے فوراً بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور اُن کی جگہ پنڈت جواہر لال نہرو صدر مقرر ہوئے۔ پریس والوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا کانگریس پلان کے شرائط اور وضاحتوں کی پوری طرح پابندی کرے گی؟ پنڈت جی نے جواب دیا کہ اگرچہ کانگریس نے مشن کی تجاویز منظور کرلی ہیں مگر ان پر عملدرآمد میں کانگریس آزاد ہوگی۔ قدرتی طور پر مسلم لیگ کو بھی اپنی آزادی برقرار رکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ یہ قصہ مولینا آزاد کی زبانی سنیے:

"۱۰ر جولائی کو جواہر لال نے پریس کانفرنس میں ایک بیان دیا۔ عام حالات میں یہ بیان سرسری طور پر نظروں سے گزر جاتا اور کوئی اس پر دھیان بھی نہ دیتا۔ مگر اس وقت کے نفرت اور شکوک وشبہات والے ماحول میں اس کے بڑے خراب اثرات مرتب ہوئے۔ بعض نمایندوں نے پنڈت جواہر لال سے پوچھا کہ کیا کانگریس نے اس پلان کو اور انٹرم گورنمنٹ میں شرکت کو بجنسہٖ منظور کرلیا ہے۔ جواہر لال نے جواب دیا کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں مکمل آزاد رہ کر شریک ہوگی، اس پر کوئی پابندی نہ ہوگی اور جیسے حالات ہوں گے انہی کے مطابق آزادی کے ساتھ عمل کرے گی۔ اس پر پریس کے نمایندوں نے پوچھا کہ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ کیبنٹ مشن پلان میں تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ جواہر لال نے پوری ذمّے داری کے ساتھ جواب دیا کہ کانگریس نے دستور ساز اسمبلی میں صرف شرکت منظور کی ہے اور وہ ضروری سمجھتی ہے کہ کیبنٹ مشن

میں کسی ترمیم و تبدیلی کے لئے آزاد رہے۔ میں اس حقیقت کے اظہار کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جواہر لال کا یہ بیان بالکل غلط تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ کانگریس اپنی مرضی سے پلان میں ترمیم کے لئے آزاد تھی۔ درحقیقت ہم نے اس بنا پر اتفاق رائے کیا تھا کہ مرکزی حکومت فیڈرل ہوگی۔ اس میں تین محکمے سنٹرل گورنمنٹ کے اختیار میں ہوں گے باقی محکمے صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہوں گے۔ اس کے علاوہ تین گروپ اے بی اور سی ہوں گے جن میں متعلقہ صوبوں کو شامل رہنا پڑے گا اس میں کسی پارٹی یا کانگریس کو بغیر دوسری پارٹیوں کی مرضی کے کسی ترمیم کی اجازت نہ ہوگی۔[1]

پنڈت جی کے اس بیان سے صورت حال یکسر بدل گئی۔ مسٹر جناح نے فوراً اعلان کیا کہ صدر کانگریس کے اس بیان کے بعد مسلم لیگ کو بھی اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔ اس نے کیبنٹ مشن پلان کو اس یقین کے بعد منظور کیا تھا کہ ہندوستان کا دستور اسی پلان کے مطابق بنایا جائے گا۔ مگر صدر کانگریس نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر کانگریس جب چاہے اس فارمولے میں تبدیلی کرسکتی ہے۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ اقلیتیں پورے طور پر اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائیں گی۔ جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ اس بیان کی رو سے کانگریس اپنے فیصلے اور پلان کی منظوری سے پھر گئی ہے مگر مسلم لیگ ابھی تک اپنے فیصلے پر قائم ہے، اس لئے وائسرائے کا فرض ہے کہ اپنے پلان کے مطابق مسلم لیگ کو کیبنٹ بنانے اور حکومت کی تشکیل کی دعوت دے۔ قانونی طور پر مسلم لیگ کا یہ مطالبہ کتنا بھی صحیح تھا مگر وائسرائے بغیر کانگریس کی شرکت کے گورنمنٹ نہیں بنا سکتا تھا۔ چنانچہ ۲۹ جولائی کو مسلم لیگ کونسل نے کیبنٹ مشن کے پلان کو نامنظور کردیا اور مطالبۂ پاکستان کو دہراتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ مسلم لیگ کے لئے اب یہی ایک راستہ باقی ہے۔

کانگریس کہتی تھی کہ ہر صوبے کو اپنے گروپ تبدیل کردینے کا ہر وقت حق ہے مگر مسلم لیگ کا کہنا یہ تھا کہ دستور بن جانے اور صوبوں کے اپنے اپنے گروپوں میں منتقل ہوجانے کے بعد ہی

---

[1] انڈیا ونس فریڈم / ص ۱۵۵

صوبے اس معاملے پر غور کرسکتے ہیں۔ مولٰینا آزاد کا بیان ملاحظہ ہو:

"کیبنٹ مشن نے کہا کہ اس مسئلہ میں مسلم لیگ کی تشریح و تفسیر صحیح ہے مسٹر جناح کی دلیل یہ تھی۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات اور طاقت کی تقسیم اور اس گروپ بندی کی بنیاد ہی پر انھوں نے مسلم لیگ کو پلان کی منظوری پر آمادہ کیا تھا مگر آسام کے کانگریسی اس کو نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم شروع ہی سے گروپوں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ آخر کار گاندھی جی نے ان کی پوری طرح تائید کردی۔ مگر ایمان داری کے ساتھ مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس بارے میں مسٹر جناح کی رائے اور دلیل وزن دار تھی۔"[1]

آسام کے کانگریسی لیڈروں کو یہ اعتراض تھا کہ بنگال میں تو مسلم اکثریت ہے ہی اگر آسام کو بھی بنگال کے ساتھ گروپ سی میں رکھ دیا گیا تو اس پورے گروپ میں مسلم اکثریت ہوجائے گی۔ گاندھی جی نے پہلے پلان کو منظور کر لیا تھا اور اس کی تعریف و توصیف بیان کر رہے تھے مگر آسام کے کانگریسیوں نے یہ نکتہ بیان کیا تو وہ بھی آسام والوں کے ساتھ ہو گئے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں:

"کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے بنیادی طور پر کیبنٹ پلان منظور کیا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ دونوں دستور ساز اسمبلی میں شرکت پر متفق تھے جہاں تک کانگریس کا تعلق تھا وہ اب بھی مشن کے پلان کی تائید میں تھی۔ مگر آسام کے چند لیڈروں نے گروپ سی کی تشکیل کے بارے میں اعتراض کیا کہ اگر آسام و بنگال دونوں کو ملا دیا گیا تو پورا علاقہ مسلمانوں کی ماتحتی میں آجائے گا۔ یہ اعتراض کیبنٹ مشن کے اعلان کے فوراً بعد اٹھایا گیا تھا۔ گاندھی نے بنیادی طور پر پلان کو منظور کر لیا تھا اور کہا تھا کہ اس تجویز میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ اس کمزور ملک کو بغیر کسی کمزوری اور نقصان کے متحد کردیں گے۔ چار دن تک پلان پر غور و خوض کرنے کے بعد گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں لکھا کہ مجھے یقین ہے کہ برٹش گورنمنٹ

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۴۷

موجودہ حالات میں اس سے بہتر تجویز نہیں پیش کر سکتی تھی۔" مگر آگے چل کر گاندھی جی نے اپنا نظریہ بدل دیا اور آسام کے چیف منسٹر گوپی ناتھ باردولی کے ساتھ ہو گئے۔ جواہر لال نے اس بارے میں مجھ سے (مولانا آزاد سے) اتفاق کیا کہ آسام کے کانگریسیوں کا یہ خوف ناانصافی پر مبنی ہے۔ انھوں نے آسام کے لیڈروں کو سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر اب جبکہ گاندھی جی بھی ان کے ساتھ ہو گئے تھے انھوں نے کسی کی نہ سنی۔[1]

اب کانگریس کی پالیسی میں اچانک تبدیلی اور پنڈت جی کے بیان کے بعد مسلم لیگ نے بھی پلان کو نامنظور کر دیا تو صورت حال کانگریس کے لئے پریشان کن ہو گئی۔ اب تک تو ملک کی تقسیم کا سارا الزام مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے سر تھا۔ اب ساری ذمے داری کانگریس کے سر آ رہی تھی۔ وہ نہ تو صدر کانگریس کے بیان کی مخالفت کر سکتی تھی اور نہ اسکیم کی ناکامی کا الزام اپنے سر لینا چاہتی تھی۔ بہت غور اور بحث و مباحثے کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ ریزولیشن پاس کیا کہ:

"ہمیں بہت افسوس ہے کہ مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ایسے وقت میں جب ملک آزاد ہونے جا رہا ہے۔ ہندوستان کے عوام اور لیڈروں میں اتحاد و تعاون کی بڑی ضرورت ہے تاکہ ملک کے اقتصادی اور سیاسی مسائل کا بہتر سے بہتر حل نکل سکے۔ کانگریس کمیٹی محسوس کرتی ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نکتہائے نظر اور مقاصد میں فرق ہے۔ مگر پھر بھی یہ کمیٹی ان سب پارٹیوں سے اشتراک عمل کی اپیل کرتی ہے جو ملک کی آزادی اور فلاح و بہبود کی خواہاں ہیں۔ مسلم لیگ کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ اپنے ۲۶ مئی کے بیان میں کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو مشروط طور پر منظور کیا ہے۔ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ اگرچہ اس نے بیان کی ساری تجاویز کو منظور نہیں کیا ہے مگر اسکیم کو مکمل طور پر

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۶۲

منظور کیا ہے۔ کمیٹی سمجھتی ہے کہ صوبوں کی آزادی بنیادی چیز ہے اور ہر صوبہ اس فیصلے میں آزاد ہے کہ وہ کسی گروپ میں شامل ہو یا نہ ہو۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی امید کرتی ہے کہ ملک کی اور اپنی فلاح و بہبودی کے لئے مسلم لیگ اس پلان میں ضرور شریک ہوگی۔"[1]

وائسرائے نے بھی کوشش کی کہ مسلم لیگ کیبنٹ پلان میں شریک ہو مگر ساتھ ہی وہ مسلم لیگ کے دلائل کو صحیح سمجھتے رہے۔ جس نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ ابھی تو حکومت ہندوستان کے ہاتھوں میں نہیں آئی ہے۔ ابھی سے یہ حال ہے تو آئندہ اقلیت کا کیا حال ہوگا۔ مسٹر جناح کے انکار کا ایک پہلو اور بھی قابل غور ہے۔ ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب میں اس انکار کا پس منظر لکھا ہے کہ مشن کا پلان منظور کر لینے کے بعد جناح صاحب بے حد مطمئن اور خوش نظر آئے۔ مرزا صاحب نے پوچھا کہ آج آپ بہت مطمئن نظر آرہے ہیں تو جناح صاحب نے جواب دیا کہ دو ڈھائی مہینے تک بحث و مباحثہ کے بعد میں بالکل تھک گیا تھا۔ نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ اب اس پلان کو منظور کر کے جھگڑے سے نجات مل گئی ہے اور ذمّے داری کا بوجھ دماغ سے اُتر گیا تو میں بڑی راحت محسوس کر رہا ہوں۔ مگر جناح صاحب کا یہ اطمینان اور بشاشت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اصفہانی صاحب لکھتے ہیں:

> "اب جبکہ پانسہ پھینکا جا چکا ہے اور فیصلہ کر چکنے کے بعد اسے پیتھک لارنس کو بھیج دیا گیا ہے تو میں فکر سے ایسی آزادی محسوس کر رہا ہوں جیسے کہ طالب علم کو پرچہ امتحان کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔" "لیکن ابھی دن ختم نہیں ہوا تھا کہ انھیں پھر فکر لاحق ہوگیا۔ انھیں اس کا یقین تھا کہ منظور کر لینے کا فیصلہ ٹھیک تھا لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ اس کے بدل یعنی رد کر دینے کے نتائج بہت سنگین ہو سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید دوبارہ غور کرنے کے بعد وہ تجویز کو نامنظور کر دیتے۔ لیکن اب وقت نہ رہا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کی اطلاع بھی دی جا چکی تھی۔"

---

[1] انڈیا ونس فریڈیم، ص ۱۶۷

اب جو کچھ وہ کرسکتے تھے وہ یہ تھا کہ اس کی امید کریں کہ کانگریس کی مجلس عاملہ یا تو تجویز کو رد کردے گی یا ایسی ترمیمات کا مطالبہ کرے گی اور اسے ایسے معنی پہنائے گی کہ جس سے ان کی منظوری کی کوئی اہمیت نہ رہے گی۔[1]

اسی درمیان میں تاریخ کا رخ موڑ دینے والا ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ جناح صاحب کے ڈاکٹر نے انھیں بتلایا کہ وہ بڑے خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اور زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہ سکتے ہیں:

"مئی ۱۹۴۶ء کو جناح صاحب شملہ میں تھے ان پر برانکائٹس کا زبردست حملہ ہوا۔ ان کی بہن انھیں لے کر بمبئی روانہ ہوگئیں۔ راستے میں ان کی حالت اتنی بگڑی کہ فاطمہ نے ڈاکٹر پٹیل (جے۔ایل۔پٹیل) کو ارجنٹ کال کی۔ بمبئی سے باہر ہی ڈاکٹر پٹیل ٹرین میں آگئے اور جناح کو ٹرین سے اتار کر ایک اسپتال میں داخل کردیا۔ اسی درمیان میں ڈاکٹر پٹیل نے جناح کے پھیپھڑوں کا ایکس رے لیا اور اپنے دوست اور مریض کو بتلایا کہ وہ کس مہلک بیماری میں گرفتار ہیں۔ اگر انھوں نے تناؤ سے بچنے کی کوشش نہ کی، آرام کا پورا خیال نہ رکھا اور شراب اور سگریٹ کو نہیں چھوڑا تو شاید ایک دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں۔ جناح کو بخوبی معلوم تھا کہ اگر ان کی بیماری کی خبر ہندوؤں کو معلوم ہوگئی تو اُن کا سیاسی محاذ بدل جائے گا۔ وہ جناح کی موت کا انتظار کرلیں گے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے نرم دل لیڈروں کو اس طرح متاثر کرلیں گے کہ پاکستان کا خواب ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے کہا تھا بڑی تیز رفتاری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت جتنی تیزی سے موت جناح کی طرف بڑھ رہی تھی اس سے زیادہ تیزی سے جناح اپنے خواب کی طرف بھاگ رہے تھے یا بھاگنا چاہتے تھے۔"[2]

اب جناح صاحب کے پاس کام زیادہ اور وقت کم تھا۔ مشن پلان منظور کرلینے سے

---

[1] اصفہانی، قائد اعظم جیسا کہ میں جانتا ہوں، ص ۲۰۳ [2] لیری کولنس۔ آدھی رات کی آزادی۔ ص ۹۸

بعض حلقوں میں یہ شبہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ وہ پاکستان کی جگہ متحدہ ہندوستان کی کسی تجویز کو بھی مان سکتے ہیں اس لئے مزید تاخیر میں یہ خیال بھی تھا کہ کہیں ساکھ نہ بگڑ جائے۔ ان حالات میں موصوف نے فوری اقدام کا فیصلہ کیا۔ اس اقدام کا ایک پہلو تو کانسٹی ٹیوشنل طریقوں پر جدوجہد تھی، دوسرا اقدام ان کانسٹی ٹیوشنل ایکشن تھا۔ قانونی اور دستوری تدابیر کا تذکرہ ہم اگلے صفحات میں کریں گے۔ سردست غیر دستوری سرگرمی کا حال پیش کرتے ہیں جس کے بڑے دور رس اثرات برصغیر کی قسمت پر مرتب ہوئے ہیں۔

مسلم لیگ نے اپنے یوم تاسیس سے لے کر ۱۹۴۶ء تک سیاسی میدان میں بڑی بڑی جدوجہد اور سرگرمیاں دکھلائی تھیں مگر وہ ساری کی ساری جلسوں، جلوسوں، تحریروں، تقریروں، تجویزوں، نعروں، ایڈریسوں، ہاروں، گجروں، کرسیوں، ممبریوں، وزارتوں اور خطابوں سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ مسٹر جناح نہایت ضابطے قاعدے کے قانونی انسان تھے اور کسی ان کانسٹی ٹیوشنل اقدام کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلم لیگ اور جناح صاحب عملی میدان میں اور وہ بھی غیر دستوری شکل میں قدم رکھ رہے تھے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مسلم لیگ نے اپنی جماعت کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو ڈائرکٹ ایکشن کریں۔ اس ایکشن کا کوئی واضح پروگرام تو اُس نے نہیں بتایا مگر تقریروں، دعووں اور للکاروں سے مسلم لیگی عوام پروگرام کا اشارہ پا گئے۔ مثال کے طور پر چند اعلانات ملاحظہ ہوں:

"ہم ہلاکو اور چنگیز خاں کے خونی باب کی پھر سے تقلید کریں گے۔ ہم بہترین حالات کی امید کرتے ہیں مگر بدترین حالات کے لئے تیار ہیں۔ ہمیں پاکستان بنانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" (مسٹر جناح بحوالہ ڈان، ۱۰ر اپریل ۱۹۴۶ء)

"ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ ہماری تاریخ اور ہماری پالیسی میں ایک انقلابی قدم ہے اور پاکستان کو جنگ کے لئے تیار رہنا ہے۔" (ڈان، ۱۵ر اگست ۱۹۴۶ء)

کلکتہ مسلم لیگ نے پوسٹر چسپاں کرائے۔ آل انڈیا یوم نعرۂ پاکستان۔ دس کروڑ مسلمانوں کی لام بندی۔ مسلم لیگ کا انقلابی اقدام۔ نعرۂ جہاد پر لبیک کہو۔ ملت اسلامیہ

کی لام بندی کا اعلان کرو اور اپنے دورِ جدید کا فاتحانہ آغاز کرو۔ مسلمانو! نئی شان سے اٹھو اور دنیا کو انقلاب سے حیران کردو۔" ——— (بحوالہ علمائے حق' مولانا آزاد ڈائری ص ۳۸۹)

"ڈائرکٹ ایکشن کے ذریعے پاکستان حاصل کریں گے۔" (ڈان یکم اگست ۱۹۴۶ء)

"مسلمانوں کو ایک زبردست جنگ کرنی ہے۔" (۱۰ اگست ۱۹۴۶ء)

"پاکستان نہ ماننے والے کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بنگالی سب کچھ کرگزرنے کے لئے تیار ہیں۔" (حسین شہید سہروردی وزیر اعلیٰ بنگال)[۱]

اس ڈائرکٹ ایکشن کے لئے مسلم لیگ کے سامنے پورے ہندوستان میں صرف بنگال ہی کا میدان ہموار تھا جہاں مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کے وزیر اعلیٰ نے علی الاعلان کہہ بھی دیا تھا کہ مسلم لیگی صاحبان جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ چنانچہ بنگال کی حکومت نے ڈائرکٹ ایکشن کے دن ۱۶ اگست کو عام تعطیل کا اعلان کردیا۔ صوبہ کی کانگریس پارٹی نے لیگی حکومت سے درخواست کی کہ تعطیل منسوخ کردی جائے ورنہ فساد اور بلوے کا اندیشہ ہے۔ مگر حکومت نے کوئی توجہ نہ کی اور اس طرح عوام کو اس چھٹی کے پردے میں وحشت، درندگی اور بربریت کے لئے کھلی چھٹی مل گئی۔ اس دن کلکتہ میں بلوؤں اور خاک و خون کا طوفان پھٹ پڑا۔ پہلے ہی دن سیکڑوں انسان ذبح کردیے گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے اور کروڑوں کی جائدادیں، مکانات اور املاک تباہ و برباد کی گئیں۔ "اس چھٹی کی وجہ سے اچانک حملہ ہوا اور ہندوؤں کی اتنی لاشیں بچھ گئیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتی تھیں"[۲]۔ مسلمانوں کے غول کے غول ہندو محلوں پر حملے کررہے تھے۔ معصوم اور بے گناہ انسان بڑی بے رحمی اور بربریت کے ساتھ ذبح کئے جارہے تھے۔ ان میں بوڑھے، کمزور اور بے سہارا مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے، لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ انسانوں کی عزتیں، ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں اور ملک کی آبرو پیروں تلے روندی جارہی تھی۔ اللہ اکبر، مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان پائندہ باد، قائدِ اعظم زندہ باد کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ ہندو غنڈے

---

[۱] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۱۳۷ [۲] آدھی رات کی آزادی ص ۱۵۷

مسلمان علاقوں پر گدھوں کی طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے، خاک و خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، انسان انسان کا خون پی رہا تھا۔ جے بجرنگ بلی کی، ہر ہر مہادیو، جے کالی مائی کی۔ یہ نعرے لگائے جا رہے تھے۔ حکومت اور اس کے ذمے دار تماشہ دیکھ رہے تھے کیونکہ یہی تو ڈائرکٹ ایکشن تھا جس کے لئے مہینوں سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مرتے ہوئے، زخم کھاتے ہوئے اور دم توڑتے ہوئے آدمی پولیس کی دہائی دیتے تھے اور پولیس سنی اَن سنی کر رہی تھی۔ اس کو حکومت کا حکم تھا کہ صرف دیکھتے رہو۔ فساد کو دبانے کی کوشش نہ کرو۔ مولانا آزاد نے حکومت کی پالیسی کا ذکر کیا ہے:

> "مجھے ایرپورٹ جانا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں ڈم ڈم ایرپورٹ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ کافی مقدار میں پولیس اور فوج ٹرکوں میں لدی ہوئی کھڑی ہے۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگ امن و امان قائم کرنے کے لئے کوشش کیوں نہیں کر رہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو یہی حکم ہے کہ تیار کھڑے رہو اور کوئی عملی اقدام نہ کرو۔"[1]

اس پالیسی کے نتیجے میں پورے شہر کلکتہ بلکہ پورے بنگال میں ایک ہفتے تک بلوائیوں، فسادیوں اور غنڈوں کا راج رہا اور انھوں نے جس طرح چاہا ظلم و بربریت کا ناچ ناچا۔ ان حالات پر ایک رپورٹ سنیئے:

> "مسلمان مسلم لیگ کی للکار سُن کر باہر نکلے تھے۔ مسلم لیگ نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو ڈائرکٹ ایکشن کا دن مقرر کیا تھا تاکہ انگریزوں اور کانگریس پارٹی کے سامنے یہ ثابت کیا جا سکے کہ مسلمان پاکستان لے کر رہیں گے اور ضروری ہوا تو اس کے لئے کسی ڈائرکٹ ایکشن سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ مسلمانوں کی ٹولیوں نے جہاں بھی پایا ہندوؤں کو مار ڈالا اور لاشیں شہر کے کھُلے نالوں میں پھینک دیں۔ پولیس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلد ہی شہر کے درجنوں مقامات پر دھوئیں کے ستون

---

[1] انڈیا ونس فریڈیم، ص ۱۶۵

آسمان کی طرف سر اٹھانے لگے۔ ہندوؤں کی بستیاں خاک ہو رہی تھیں، بازاروں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ہندو کیوں دیکھے رہتے، ان کی ٹولیوں نے بھی اپنی جھونپڑ پٹی سے نکلنا اور موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ کلکتہ نے اپنی تاریخ میں اتنے بڑے بڑے پیمانے پر بلوے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انسان انسانیت کو بھول کر خونخوار جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ ہگلی ندی کتنی لاشوں کو بہا کر سمندر کے اندر لے گئی؟ اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں بھی ڈراؤنی اور بھیانک لاشوں سے اٹی پڑی تھیں۔ جو لوگ کمزور اور مجبور تھے ہر جگہ انہی پر زیادہ ظلم ڈھایا گیا۔ جب قتل عام ہوا تو شہر پر گدھوں نے قبضہ کر لیا۔"[1] "شہر میں بیس ہزار لوگ قتل ہوئے تھے"[2] "۱۶ اگست سے ۱۹ اگست تک بلوہ روکنے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور ہزاروں انسان قتل کر دیئے گئے۔ ہزاروں مکان لوٹے اور جلائے گئے، چار دن تک خوں ریزی، قتل اور زیادتیاں ہوتی رہیں، چھ سات ہزار آدمیوں کا خون ہوا۔ تین دن تک سڑکوں پر لاشیں پڑی رہیں۔ تین ہزار سے زیادہ لاشیں جا بجا سے ہٹائی گئیں۔ بہت سی لاشیں زمین دوز نالوں میں ڈال دی گئیں جن کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔"[3]

یہ خونریزی اور تباہی بہت جلد کلکتہ سے نواکھالی منتقل ہو گئی جہاں ہندو آبادی صرف بیس فیصدی تھی۔ شاید نفیر جہاد پاکستان کے لیے نواکھالی کا میدان کلکتہ سے زیادہ ہموار تھا۔

"بابو راجندر پرشاد اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں، 'نواکھالی اور تری پورہ کے ضلعوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ہندوؤں پر حملہ کر دیا گیا۔ بہت سے ہندو مارے گئے، اور ہندو آبادی کے گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بنا لیے گئے۔ بیشتر عورتوں کے ساتھ جبراً شادی کر لی گئی۔ بہت سی بھگا کر

---

[1] آدھی رات کی آزادی، ص ۴۰ [2] ماؤنٹ بیٹن این آفیشیل آٹو بائیگرافی، ص ۳۵۳
[3] مولانا آزاد ڈائری، ص ۳۹۰

کہیں سے کہیں کر دی گئیں۔ ان واقعات کا حاصل یہ نکلا کہ ہندوؤں میں جذبۂ انتقام سرایت کر گیا۔ ادھر مسلم لیگ کے لیڈر اور اخبارات روزانہ زہر اُگلتے رہتے تھے اور ہندوؤں کو جنگ کے لیے للکارتے تھے۔[1]

کلکتہ اور نواکھالی کی لاقانونیت اور بربریت کا ردعمل فوراً ہی بہار میں شروع ہوا۔ یہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو فرقہ پرستی اور تعصب کو سنہرا موقع ہاتھ لگا تھا۔ ان کے حملے مسلمان آبادیوں پر بڑی پلاننگ اور تنظیم کے ساتھ ہونے لگے۔ انتظام یہ ہوتا تھا کہ دور دراز علاقوں سے اجنبی فسادی جتھے بلائے جاتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ حملے کے دوران ظالموں کے دل میں جان پہچان اور صدیوں کے رہن سہن کی وجہ سے مروّت اور نرمی آجائے۔ کلکتہ میں مسلم لیگ کی حکومت تھی تو بہار میں کانگریس کی بادشاہت تھی۔ وہاں مسلم حکومت نے بلوہ فساد کرایا تو یہاں کانگریس حکومت خاموش تماشائی بنی رہی۔ بہادر اور ملک کے سپوت حملوں کے لیے گاؤں بھی وہ منتخب کرتے تھے جہاں مسلم آبادی پانچ سات یا دس فی صدی ہوتی تھی۔ دس دس پندرہ پندرہ ہزار ظالموں کے منظم مسلح اور صف بند جتھے جیکارے لگاتے، سنکھ بجاتے اور بھجن گاتے ہوئے بستیوں اور گاؤوں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور نہتے بے قصور اور کمزور مسلمانوں کو چن چن کر برچھیوں، بھالوں اور چھروں سے ذبح کرتے تھے۔ بہت سے جیالے، متوالے اور نشۂ مستی میں غرق بہادر عورتوں اور بچوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے تھے اور پھر تڑپنے سسکنے اور زندہ جل کر مرنے کا تماشہ دیکھتے تھے۔ درجنوں عبادت گاہیں شہید کر ڈالی گئیں۔ سیکڑوں عورتوں اور کنواریوں نے کنوؤں میں کود کر اپنی عزت و آبرو بچائی۔ لاتعداد معصوم اور ننھے بچوں کو درختوں، کھمبوں اور دیواروں پر کیلوں میں گاڑ کر اور لٹکا کر تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ ان مظالم کی داستانیں تاریخ کے سینوں میں یقیناً محفوظ رہیں گی اور کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا کہ خاک و خون میں آلودہ یہ کہانیاں اپنی اصلی اور بھیانک صورتوں میں نمودار ہوں گی مگر سردست ان کی تفصیل و تحقیق ہمارے لئے آسان نہیں ہے۔ تاہم دو چار مناظر تو دیکھتے ہی چلیں:

"گاندھی جی بہار تشریف لائے۔ یہاں پر انھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے

[1] مولانا آزاد کی ڈائری، ص ۳۹۳

ہندو جاتی کی امن پسندی، صلح جوئی اور غیر تشدد پسندی کے متعلق ان کے بہت سے مفروضات کی کایا پلٹ دی۔ یہاں پر وسیع و عریض علاقوں میں مسلمانوں کا نام و نشان بھی مٹ گیا تھا۔ گھر لٹ چکے تھے، مسجدیں ویران پڑی تھیں، کنویں مسلمان عورتوں کی لاشوں سے اٹا اٹ بھرے پڑے تھے۔ کئی جگہ ننھے منے بچوں کے ڈھانچے اب تک موجود تھے جنھیں لوہے کے کیل گاڑ کر درختوں اور دیواروں کے ساتھ ٹانگ دیا گیا تھا۔ یہ روح فرسا نظارے دیکھ کر گاندھی جی کو غالباً زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندو قوم اتنی نرم دل، امن پسند اور غیر متشدد نہیں ہے جتنا وہ سمجھتے اور پرچار کرتے رہے ہیں۔ گاندھی جی کے ساتھی سکریٹری اور سوانح نگار پیارے لال نے اپنی کتاب "مہاتما گاندھی دی فرسٹ فیز" میں بڑے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہار کی خون ریزی دیکھ کر گاندھی جی کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور متحدہ ہندوستان کے متعلق ان کا دیرینہ خواب ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا"۔[1]

ہندوستان کے مشہور شاعر کلیم عاجز انہی بستیوں میں سے ایک "تیلہاڑہ" کے باشندے تھے جس کے ایک ایک باشندے کو چن چن کر مارا گیا ہے۔ ان کا بھی پورا خاندان ماں، بھائی، بہنیں اور سب لوگ بستی والوں کے ساتھ شہید ہوئے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اُن مظالم اور مذابح کی تفصیل بڑے دردناک اور دلدوز انداز میں لکھی ہے۔ اُن کا غم اور اُن کے زخم ہمارے قلم و بیان کی حدود میں کہاں سما سکتے ہیں، پھر بھی ایک مثال پیش خدمت ہے:

> "وہاں (تیلہاڑہ میں) دو روز تک ہجوم نے بستی کو گھیر رکھا تھا۔ ییکنگر سرائے تھانہ قریب تھا۔ پولیس وہاں موجود تھی۔ کیا وجہ تھی؟ ممکن ہے ملٹری نے حکم نہ مانا ہو۔ تیلہاڑہ تک ملٹری نہیں جا سکی۔ چند گھنٹے بھی پہلے چلی جاتی تو بستی بچ جاتی۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جو ملٹری لے کر وہاں پہنچا۔ مسجد کے

---

[1] قدرت اللہ شہاب سکریٹری صدر ایوب پاکستان "شہاب نامہ" ص ۱۸۱

پاس بہت سی لاشیں پڑی تھیں۔ بات ختم ہوگئی تھی۔ کام ختم ہو چکا تھا، کچھ زخمی بھاگے آرہے تھے۔ ایک مکان کی دیوار پر ایک شخص کھڑا ہوا کسی کو بھالے سے مار رہا تھا۔ میں نے اپنے ریوالور سے پہلی فائرنگ کی، وہ گرا۔ بستی کے اندر فوجی نے دھاوا کیا۔ مکانات جل رہے تھے۔ لاشیں ادھر اُدھر پڑی تھیں۔[1]

بہار سے چل کر یہی آگ یوپی پہنچی۔ گنگا کے کنارے مشہور تیرتھ استھان گڈھ مکتیشر میں ہر سال بڑا میلہ لگتا ہے۔ لاکھوں یاتری اشنان کرنے، پاپ دھونے اور پوتر ہونے کے لئے حاضری دیتے ہیں۔ گڈھ مکتیشر میں خاصی آبادی مسلمانوں کی بھی ہے جو ہزاروں کی تعداد میں دوکانیں رکھنے، خوانچے لگانے اور رونق دیکھنے کے لئے ہر سال میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہاں حملے اور قتل و غارت کی منظم تیاری کی گئی تھی قصبہ کے لوگ تو محلے اور گھر جانتے پہچانتے تھے مگر باہر کے یاتریوں کی نشاندہی کے لئے مسلمان محلوں، مکانوں اور دوکانوں پر مخصوص قسم کی علامتیں لگادی گئیں۔ میلے والوں کے پہلے ہی ریلے میں مسلمانوں پر حملہ ہوا اور ایک ہی دو دن کے اندر قصبے کے سارے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ زندہ جلانے، کنوؤں میں ڈھکیلنے، عصمت دری کرنے اور دودھ پیتے بچوں کو ہوا میں اچھال کر برچھی بھالوں میں پرو لینے کے نئے نئے طریقے آزمائے گئے۔ قصبے کے ایک مشہور کانگریسی بابو نورالدین شہید کے خاندان کے ایک ایک فرد کو بڑی بے رحمی سے ذبح کیا گیا تھا۔ فساد کی اطلاع ملی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ دوسرے ہی دن بہ نفس نفیس وہاں پہنچے۔ راقم السطور بھی حضرت کے ہمرکاب تھا وہاں پہنچ کر جھلسے ہوئے مکانوں، جلی ہوئی لاشوں اور ماحول سے برستی ہوئی عبرتوں اور حسرتوں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر بھی اتنا تو ہوا کہ شہداکی لاشوں اور ہڈیوں کی راکھ کے ڈھیر پر ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ چند آنسوؤں کا نذرانہ چڑھانے کا موقع مل گیا۔ اس فساد سے دو دن پہلے، ۲۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو کانگریس کے سالانہ اجلاس میرٹھ میں ولبھ بھائی پٹیل نے بنگال کے فساد کی خبریں سن کر کہا تھا کہ "تلوار کا جواب تلوار سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ غنڈوں اور فسادیوں سے مقابلہ کرو اور لڑائی کے لئے تیار رہو"[2] اس کے بعد ہی گڈھ مکتیشر سے یہ آگ بھڑکی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ یوپی کا کتنا بڑا علاقہ اس کی لپیٹ میں آجاتا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے موقع پر پہنچ جانے سے اس کے شعلوں پر پانی پڑ گیا اور جیسے جیسے

---

[1] کلکٹر کا بیان ماخوذ از ڈاکٹر کلیم "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" ص ۲۶۷ [2] اثر یحییٰ انصاری، مولانا آزاد ڈائری، ص ۲۹۹

اخبارات میں ان کے جانے اور تاثرات کی خبریں عام ہوتی گئیں یہ آگ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔

ان تمام قتل گاہوں کلکتہ، نواکھالی، بہار، یوپی وغیرہ میں کنوؤں میں ڈوب کر جان دینے والوں گڑھوں اور سوراخوں میں پھینکے جانے والوں، دریاؤں اور تالابوں میں ڈبوئے جانے والوں اور زندہ جلائے جانے والوں کا حساب وکتاب اور اعداد و شمار تو تاریخ کبھی نہیں بتلا سکے گی مگر جو لاشیں سڑکوں، چوراہوں، گذرگاہوں اور میدانوں میں پڑی ہوئی ملی ہیں صرف انہی کا حساب پچاسوں ہزار تک پہنچتا ہے۔ ملک کی تاریخ میں ہندوستانیوں کے درمیان یہ پہلا مکمل، منظم اور ایسا تباہ کن فساد تھا اس پر ایک رپورٹ ملاحظہ ہو:

"ہندوستان کے شہروں میں ہندو مسلم فساد کوئی نئی یا عجیب چیز نہ تھی۔ لیکن جس پیمانے پر (ڈائرکٹ ایکشن کے موقع پر) کلکتہ میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ دونوں فرقوں یا گروہوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ دراصل یہ دو قوموں کی جنگ تھی۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ دو قومی نظریہ بساطِ سیاست سے نکل کر میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا اور کلکتہ کے اس قتل عام نے مستقبل کے نقشے پر بڑے گہرے اور دوررس اثرات مرتب کیے۔"[1]

مستقبل کے نقشے پر گہرے اور دوررس اثرات کی طرف اشارہ بڑے پتے کی بات ہے۔ دراصل اس قتل عام کے بعد ہی کانگریسی حلقوں کے دماغ میں پہلی بار یہ خیال پیدا ہوا کہ اب ہندو مسلم اتحاد کے پیچھے بھاگنا بیکار رہے۔ بہتر ہے کہ مسلم لیگ کو پاکستان دے کر جھگڑا ختم کر دیا جائے۔" وہ سمجھے تھے کہ پاکستان پانچ سات سال سے زیادہ نہیں چل پائے گا۔ جناح صاحب کی طرح ولبھ بھائی پٹیل کو بھی جلدی تھی۔ ان پر دو بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تیسرا اور آخری دورہ پڑنے سے پہلے وہ کچھ دیکھ لیں۔[2]

---

[1] قدرت اللہ شہاب سکریٹری صدر ایوب پاکستان، شہاب نامہ، ۲۷۹ [2] آدھی رات کی آزادی، ص ۱۰۳

انٹرم گورنمنٹ

۱۲ر اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو کو انٹرم گورنمنٹ بنانے کی دعوت دی تاکہ مشن پلان کو بروئے کار لانے کے لئے دستور سازی کا کام مکمل ہو جائے اور اس کے بعد انٹرم گورنمنٹ کی جگہ مستقل حکومت قائم ہو جائے۔ اگرچہ یہ تفصیل ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی مگر اصل تصویر کا پس منظر واضح کرنے کے لئے اس کا مختصر سا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کانگریس نے مسلم لیگ کو بھی اس عبوری حکومت میں شرکت کی دعوت دی مگر لیگ نے شرکت سے انکار کر دیا۔ کانگریس اور وائسرائے نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ مسلم لیگ شرکت پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ بڑی تگ و دو اور بحث و تمحیص کے بعد وہ راضی ہو گئی۔ اب مسلم لیگ کے سامنے اپنے ان ممبران کے انتخاب کا سوال سامنے آیا جن کو وزارت میں شامل ہونا تھا۔ پارٹی میں پوزیشن اور ذاتی صلاحیت و قابلیت کی بنا پر لیگ کے حلقوں میں اور باہر بھی یہ عام خیال بلکہ یقین تھا کہ چودھری خلیق الزماں، خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل کو ضرور منتخب کیا جائے گا۔ مگر جناح صاحب کو مسلم لیگ کونسل نے پورا اختیار دے دیا کہ جس کو چاہیں نامزد کریں اور انھوں نے مسٹر آئی آئی چندریگر، عبد الرب نشتر، راجہ غضنفر علی ایسے اشخاص کو چنا جو غیر معروف لوگ تھے۔ اب کانگریس کے سامنے لیگ کے ممبران میں وزارتیں تقسیم کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ لیگ کا مطالبہ تھا کہ اُسے وزارت داخلہ ضرور دی جائے۔ مگر ولبھ بھائی پٹیل بھی اسی وزارت کے طلب گار تھے۔ گورنمنٹ اور کانگریس کے بعض حلقوں نے کوشش کی کہ پٹیل صاحب لیگ کے حق میں اس وزارت سے دستبردار ہو جائیں مگر موصوف نے صاف کہہ دیا کہ وزارت میں رہوں گا تو ہوم منسٹری لوں گا ورنہ ممبری سے نام کٹا لوں گا۔ پٹیل کانگریس میں بڑی طاقت رکھتے تھے اس لئے کہ وہ گاندھی جی کو بہت عزیز تھے۔ گاندھی جی نے انھیں سردار کا خطاب دیا تھا۔

اس لئے ان کے روٹھ جانے سے بڑی اُلجھنوں کا خطرہ تھا۔ اس لئے کانگریس نے بہت غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ لیگ کو ایک اہم وزارت فنانس دے دی جائے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ رفیع احمد قدوائی نے یہ تجویز پیش کی اور ان کا خیال تھا کہ یا تو لیگ یہ محکمہ قبول کرنے سے انکار کر دے گی یا اس میں فیل ہو جائے گی۔ دونوں حالتوں میں فتح کانگریس ہی کی ہوگی۔ ولبھ بھائی پٹیل یہ تجویز سن کر اچھل پڑے کہ مسلم لیگ فنانس کو نبھانے کے قابل نہیں ہے۔ چنانچہ لازمی طور پر وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔ وائسرائے نے جب مسٹر جناح کو بتایا کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں کو فنانس کی وزارت سونپی جارہی ہے تو انھیں بھی شبہ ہوا کہ خاں صاحب پشتینی نواب ہیں، حساب کتاب کا کام یہ کر بھی پائیں گے یا نہیں؟ مگر چودھری محمد علی نے جو حکومت برطانیہ کے فنانس سکریٹری تھے۔ جناح صاحب کو یقین دلایا کہ یہ وزارت مسلم لیگ کے لئے نعمت غیر مترقبہ اور اس کی فتح کا پیش خیمہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور یہ پیش کش فوراً قبول کرلیں۔ چنانچہ لیگ نے وزارتوں اور لیاقت علی خاں صاحب نے فنانس کا قلم دان سنبھالا۔ کانگریس اور پٹیل صاحب اس انتظار میں رہے کہ کب اور کس دن اس وزارت کی الجھنوں میں فیل ہو کر مسلم لیگ استعفیٰ دیتی ہے مگر نتیجہ برعکس نظر آیا۔ بجائے فیل ہونے کے لیاقت علی خاں نے فنانس پر ایسا کنٹرول کیا کہ ساری ہی وزارتیں اس ایک منسٹری کے رحم و کرم پر منحصر ہو کر رہ گئیں۔ کہنے کو تو پٹیل صاحب وزیر داخلہ تھے مگر فنانس کی منظوری کے بغیر ایک چپراسی بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ کہاں تو ان کی یہ شان تھی کہ بمبئی میں جی ایم ناریمان جیسے مخلص، قدیم کانگریسی اور مانے ہوئے نیشنلسٹ کو صرف اس لئے گرادیا "تاکہ اپنے لڑکے کے ایک دوست سی۔ ایچ بھابھا کو اس کی ناقابلیت کے باوجود وزیر بنوا دیں" اور کہاں اب مرکزی وزیر داخلہ ہونے کے باوجود ایک معمولی ملازم رکھنے کے لئے بھی انھیں سوچنا پڑتا تھا۔ بحیثیت وزیر داخلہ وہ عزل و نصب کے متعلق جتنے بھی احکامات صادر کرتے تھے وہ یا تو رد کر دئے جاتے تھے یا ان میں ترمیم کر دی جاتی

---

[1] انڈیا ونس فریڈم

بھی۔ سیاسی لوگوں میں اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پٹیل صاحب کا جب کسی سے اختلاف
ہوتا تھا تو گاندھی جی ان کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے تھے مگر یہاں گاندھی جی کی بھی کچھ
نہیں چل رہی تھی۔ اس طرح دونوں پارٹیوں میں شدید مقابلہ و مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ ہوتے
ہوتے بجٹ کا موقع پیش آیا۔ لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا وہ اپنے عنوان کے اعتبار
سے کانگریس کے اصولوں اور کانگریسی لیڈروں کے بیانات اور اعلانات کے مطابق تھا۔
شروع میں کانگریسی ممبروں نے اس کی تائید ہی کی۔ مگر جب خاں صاحب نے تفصیلات پیش
کیں تو کانگریسیوں کو بہت غصہ اور ناراضگی ہوئی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ کھل کر مخالفت بھی
نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بجٹ ان کے پروگرام سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی کے بالکل مطابق
تھا۔ لیکن اندر ہی اندر عملی طور پر اس کی زد براہ راست سرمایہ داروں، مل مالکوں اور کروڑپتی،
ارب پتی پونجی پتیوں پر پڑ رہی تھی جن کی اکثریت ہندو تھی۔ اس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ
ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ان لوگوں کی تحقیقات و تفصیلات مرتب کرے گا جو ٹیکس نہیں
دیتے تھے۔ اور نئے نئے ٹیکس بھی لگائے گئے تھے جو سرمایہ داروں کو مفلس کر کے اقتصادیات
اور صنعت کاری پر اثر انداز ہوتے تھے۔ کانگریس میں کچھ لوگ سرمایہ دارانہ ذہنیت سے
ہمدردی رکھتے تھے، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ اندازہ کر رہے تھے کہ یہ بجٹ ملک کی اقتصادیات
کے بجائے صرف سیاسی مقاصد کی بنیادوں پر بنایا گیا ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور راج گوپال
اچاریہ اس کے خاص طور پر مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے
نہیں بلکہ صنعت کاروں اور تاجروں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ راجہ جی
نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ بجٹ فرقہ وارانہ ذہن سے بنایا گیا ہے۔ اس ماحول اور ذہنیت نے
برطانوی گورنمنٹ، کانگریس اور وائسرائے وغیرہ سب کو متحدہ ہندوستان کی آزادی سے
بالکل مایوس کر دیا۔ مسٹر جناح کو اپنی محدود زندگی کے پیش نظر اور ولبھ بھائی پٹیل کو
دل کے دوروں کی وجہ سے تو جلدی تھی ہی، برطانیہ بھی ممکنہ عجلت سے ہندوستان سے دامن
چھڑانا چاہتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ہندوستان کے سیاسی، اقتصادی اور انتظامی حالات
اس قدر بھیانک اور خطرناک ہو گئے تھے کہ جیسے جیسے تاخیر ہو رہی تھی، برطانیہ کا قرضہ، خرچ اور

نقصان بڑھتا ہی جارہا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ لیبر گورنمنٹ کو خطرہ تھا کہ کسی دن بھی چرچل اور ان کی کنزرویٹو پارٹی کا داؤ چل گیا تو ہندوستان کا پھندا پھر گلے میں پڑا رہ جائے گا، چنانچہ مسٹر اٹیلی نے وائسرائے پر زور دیا کہ جس حالت میں بھی ہو جلد از جلد ایک تاریخ مقرر کر کے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرو۔ وائسرائے کہتے تھے کہ بغیر امن و امان اور مختلف ہندوستانی فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے آزادی کا اعلان بہت خطرناک ہوگا۔ ہندوستان میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور لوگ ایک دوسرے کو کھا جائیں گے۔ ایسی حالت میں آزادی ایک بین الاقوامی بددیانتی اور بے انصافی ہوگی جس کے لئے تاریخ برطانیہ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ لیبر گورنمنٹ نے ویول کی بات نہیں مانی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ میں ظلم و بربریت کے اس محضر نامہ پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اس لئے وائسرائی سے استعفیٰ دیتا ہوں۔

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

۱۹۴۷ء

"ملک معظم کی حکومت کا خاص مقصد یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو برطانوی کامن ویلتھ میں رہتے ہوئے برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کی ایک متحدہ حکومت بنائی جائے۔ کسی بھی پارٹی کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ آپ کا پلان منظور ہی کرلے۔ مسائل کو گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے حل کیا جائے۔ ہندوستانی فوج کو متحد رکھ کر ملک کے دفاع کو آل انڈیا بنیادوں پر منظم کیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو ملک کو متحد رکھا جائے لیکن اگر یہ نہ ہوسکے تو تباہ شدہ کھنڈرات میں سے جتنا زیادہ سے زیادہ ممکن ہو بچانے کی کوشش کی جائے۔ مختصر یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو برطانیہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے"[1]

حکومت برطانیہ کی یہ ہدایات اور احکامات لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے ہندوستان کی حیثیت سے ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ گذشتہ سو سال کے اندر کتنے ہی وائسرائے ہندوستان میں آئے مگر ان سب کا مقصد ہندوستان کی رگوں سے خون نچوڑنا اور برطانیہ کے آہنی پنجے اور گرفت مضبوط کرنا ہوتا تھا۔ یہ پہلا وائسرائے تھا جو لٹے پٹے زخم خوردہ اور خون آلودہ ہندوستان سے جان چھڑانے آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس پروگرام میں لیبر پارٹی کی طرف سے خیر سگالی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ ہوسکتا ہے یہی جذبہ ہو۔ مولانا آزاد بھی اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی کچھ حقائق بھی ان کے قلم سے اُبل پڑتے ہیں۔ اب جب برطانیہ ہندوستان سے جا ہی رہا تھا تو اس کی آخری کوشش یہ تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو برطانیہ کے زیادہ سے زیادہ مفادات اور اثرات ہندوستان میں قائم اور دائم رکھے جائیں اور ملک کی تقسیم اور پاکستان کا قیام اس کا بہترین

---

[1] ماؤنٹ بیٹن، اے آفیشیل بائیوگرافی، از فلپ زیگر، مطبوعہ کولنس لندن، ص ۳۵۹

ذریعہ تھا، پاکستان سیاسی، اقتصادی اور دفاعی حیثیت سے کمزور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سامراجی طاقتوں کے سہارے کا محتاج رہے گا اور اس طرح ان طاقتوں کو ایشیا میں دخل اندازی اور منفعت اندوزی کی سہولتیں حاصل رہیں گی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ڈیول اور کیبنٹ مشن پلان کو نظر انداز کر کے اس پالیسی کو سامنے رکھا۔ حکایت مولینا آزاد کی زبانی:

"لیبر پارٹی نے کیسے کیبنٹ مشن پلان کی جگہ تقسیم کا پلان رکھ دیا؟ اس مسئلے پر غور کر کے میں اس تکلیف دہ نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لیبر گورنمنٹ نے ہندوستان کے بجائے برطانیہ کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ لیبر پارٹی نے ہمیشہ کانگریس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھا تھا اور اس کے لیڈروں نے بارہا صاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ لیکن تقسیم کے مطالبے کے سامنے لیبر پارٹی کا جھک جانا میری رائے میں مسلم لیگ کی طرفداری کے بجائے برطانیہ کے مفاد کے تحفظ کی غرض سے تھا۔ اگر ہندوستان کیبنٹ مشن پلان کے مطابق آزاد اور متحد رہتا تو برطانیہ کے لئے ہندوستان کے اقتصادی اور صنعتی میدان میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے مواقع بہت کم ہوجاتے لیکن مسلم لیگ کے ماتحت جو حکومت ہوگی وہ برطانیہ کو مستقل اور مسلسل مواقع فراہم کرتی رہیگی"[1]

اس باب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رائے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گی جو انھوں نے اس سے پہلے ہی بہت مدلل طریقے سے ظاہر فرمائی تھی:

"ہندوستان کی یہ تقسیم صرف برطانوی مفاد کی خاطر کی گئی ہے۔ کیوں کہ ہندو برطانوی مصنوعات اور اس کی تجارت کا مقاطعہ کر رہا تھا اور اس اسکیم کو حسب استطاعت زیادہ موثر بنانا چاہتا تھا" "۱۹۳۱ء میں مسلم نمائندوں کے لندن جانے سے پہلے یا بعد میں کوئی خفیہ بیٹھک ہوا ہے یا ہونا قرار پایا ہے جس میں مسلم نمائندوں کی طرف سے اطمینان حاصل کرلیا گیا ہے کہ وہ مسلم ہندوستان (پاکستان) میں برطانوی مصنوعات اور تجارت کو برقرار رکھیں گے اور اپنی ساحلی بندرگاہوں

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۰۹

کراچی اور کلکتہ کو برطانیہ کی تجارت گاہ بنادیں گے۔[1][2]

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچ کر اپنی مہم کا آغاز کیا تو ملک کے ہر طبقے اور گروہ سے ملاقات کا پروگرام بنایا مگر بہت جلد انھیں اندازہ ہوگیا کہ اتنے بڑے ملک میں گنتی کے دو چار ہی افراد ایسے ہیں جن کے ہاتھ میں چالیس کروڑ افراد کی باگ ڈور ہے اور انھی کو قابو میں کر کے سارا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔

"انھوں نے ہندوستان کے سارے ہی طبقوں کے نمایندوں سے ملاقات کا پروگرام بنایا جن میں عیسائی، پارسی، ہندو، مسلمان، تاجر، دانشور اور سیاسی لیڈر بھی لوگ شامل تھے مگر انھوں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ اصل طاقت کن لوگوں کے ہاتھوں میں اور کن عناصر پر انھیں اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوؤں میں گاندھی، جواہر لال اور کانگریس کے باس پٹیل کو پکڑنا چاہیئے اور مسلمانوں میں صرف جناح فیصلہ کن شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تھوڑی بہت توجہ جناح کے دست راست لیاقت علی خاں کی طرف بھی مبذول رکھی جائے۔"[3]

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق وائسرائے نے اپنے طرزِ عمل اور طریقۂ فکر سے یہ اعلان کردیا کہ مسلمانوں کے مسئلے کا انحصار جناح صاحب اور مسلم لیگ ہی پر ہے۔ گذشتہ بیس برس سے جناح صاحب اسی پوزیشن کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ اب وائسرائے یا دوسرے لفظوں میں حکومت برطانیہ کے رجحان کا اندازہ کرلینے کے بعد جناح صاحب کے اختیار و اقتدار کی وسعتیں آخری حدوں تک پہنچ گئیں اور شاید اسی سرشاری میں انھوں نے وائسرائے کے ساتھ ملاقاتوں، مشوروں اور گفتگوؤں میں کسی قدر بے نیازی اور شانداری کا برتاؤ کیا۔ وائسرائے آخر وائسرائے تھا یہ رویہ اسے گراں گزرا اور اس کے نتیجے میں پاکستان

---

[1] اُس وقت تک مسلم لیگ کلکتہ کو پاکستان میں شامل قرار دیتی تھی۔ [2] حضرت رحمۃ اللہ علیہ "پاکستان کیا ہے؟"

[3] فلپ زیگلر۔ ماؤنٹ بیٹن، ص ۳۶۷

کے فریم کو کسی قدر کمزوریوں کا شکار ہونا پڑا۔ اس رویہ کی تفصیل ملاحظہ ہو:

"ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح کو ڈنر پر مدعو کیا، مگر اس ملاقات سے وائسرائے کو خوشی نہیں ہوئی۔ انھوں نے متحدہ ہندوستان کے بارے میں طویل گفتگو کی اور دلائل دئے مگر جناح صاحب نے نہ صرف یہ کہ بات کا کوئی جواب دیا بلکہ ان کے انداز سے یہ ظاہر ہوا کہ نہ وہ کچھ سُن رہے ہیں نہ سننا چاہتے ہیں۔ اس طرز عمل سے ماؤنٹ بیٹن کے اس یقین کو ٹھیس پہنچی کہ ہر شخص معقولیت پسند بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے اس ملاقات سے پہلے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک ایسا شخص جس میں احساس ذمے داری کا ایسا فقدان ہو کیسے اتنی بڑی حیثیت حاصل کرسکتا ہے۔"[1]

تاریخ کے صفحات اس تلخ حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ماؤنٹ بیٹن بالکل آخری لمحات میں تقسیم کے وقت 'لین دین کے وقت' بانٹنے اور الگ ہونے کے وقت مسلم لیگ کی بہ نسبت کانگریس سے زیادہ قریب اور زیر اثر ہو گئے تھے۔ اس کے بہت سے اسباب رہے ہوں گے مگر یہ واقعہ بھی قابلِ غور ہے کہ جناح صاحب جس طرزِ تخاطب اور برتاؤ کا معاملہ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے ساتھ کرتے تھے وہی انھوں نے وائسرائے کے ساتھ بھی کیا، مگر اتفاق سے اس کے بار پانسہ اُلٹا پڑ گیا۔

"جناح صاحب نے وائسرائے کے ساتھ فراخ دلی کا ثبوت نہیں دیا اور اس کی نیت پر شبہ کیا۔ انھوں نے وائسرائے کو ایک تحریر بھیجی۔ اس میں جس طرح ان کو مخاطب کیا گیا تھا لارڈ اسے کہتے ہیں کہ ایسا خط میں اپنے بادشاہ سے بھی نہیں قبول کرسکتا تھا۔ اور میں خود کسی قلی کو بھی اس طرح نہیں مخاطب کرسکتا تھا۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ کی بہ نسبت کانگریس سے زیادہ قریب ہو گئے۔"[2]

مسلم لیگ سے گفتگوئیں تو فقط رسمی کارروائی تھی۔ اصل مسئلہ کانگریس کو تقسیم پر

---

[1] فلپ زیگلر، ماؤنٹ بیٹن، ص ۳۶۸

[2] فلپ زیگلر، ماؤنٹ بیٹن، ص ۲۹۴

راضی کرنے کا تھا۔ کانگریس اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر متحدہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کی علمبردار رہی تھی۔ ماؤنٹ جانتے تھے کہ کانگریس کو تقسیم کے پلان پر آمادہ کرنا کافی مشکل ہوگا۔ مگر اس مرتبہ انھوں نے محسوس کیا کہ کچھ کانگریسی اس ذہن سے سوچنے لگے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے یہ مہم ولبھ بھائی پٹیل سے شروع کی۔ ان کے بارے میں وائسرائے کا خیال تھا کہ یہی کانگریس کے باس ہیں۔ اگر انھوں نے تقسیم منظور کرلیا تو پوری جماعت قابو میں آجائے گی۔ وائسرائے کا مطالعہ یہ تھا "پٹیل کانگریس پارٹی کے باس ہیں جو بہت سخت' بے لحاظ اور طاقت کے سامنے ہیں"۔ وائسرائے نے ایک واقعہ بیان کیا کہ

"پٹیل نے ایک میمورنڈم جاری کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے لہجے پر اعتراض کیا۔ اس پر پٹیل کو سخت غصہ آیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بھی اسی لہجے میں ان سے کہا کہ یا تو تم گورنمنٹ سے نکلو ورنہ میں استعفیٰ دیتا ہوں"۔

پٹیل جانتے تھے کہ وائسرائے کے استعفیٰ کے جو کچھ بھی نتائج ہوں مگر کم ازکم ان کو تو وزارت داخلہ سے ہاتھ دھونا ہی پڑے گا۔ چنانچہ جیسے ہی پٹیل نے محسوس کیا کہ وائسرائے سنجیدہ ہیں وہ فوراً جھک گئے"[1]۔

گذشتہ اوراق میں گزرچکا ہے کہ کچھ اپنے مزاج اور کچھ دوسرے عوامل مثلاً انٹیریم گورنمنٹ وغیرہ کے تجربات نے ولبھ بھائی پٹیل کو ملک کی تقسیم پر مطمئن کردیا تھا اور وہ مسلم سیاست اور مسلم لیگ سے چھٹکارا پانے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہوگئے تھے۔ مولینا آزاد نے لکھا ہے کہ

"اس کش مکش کے نتیجے میں انٹیرم گورنمنٹ کی مرکزی حکومت بیکار ہوکر رہ گئی تھی اس لئے کہ کونسل کے ممبر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تھے۔ فنانس کی انچارج مسلم لیگ تھی اور اسی کے ہاتھ میں حکومت کی چابی تھی۔ یہ صورت حال صرف سردار پٹیل کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ جنھوں نے وزارت داخلہ کے لالچ میں فنانس کا محکمہ مسلم لیگ

---

[1] فلپ زیگلر، ماؤنٹ بیٹن، ص ۳۷۰

کو پیش کر دیا تھا۔ اس وزارت میں بعض بڑے قابل اور تجربہ کار مسلم افسران موجود تھے
جنھوں نے لیاقت علی خاں کو ہر قسم کی مدد دی۔ انہی افسروں کے مشوروں سے کانگریسی
وزیروں کے ہر پروگرام کو لیاقت علی خاں آسانی کے ساتھ رد کر دیتے تھے یا ان میں
تاخیر کر دیتے تھے۔ اب سردار پٹیل کو اندازہ ہوا کہ اگرچہ وہ وزیر داخلہ تھے مگر لیاقت علی
خاں کی منظوری کے بغیر وہ ایک چپراسی کا بھی تقرر نہیں کر سکتے تھے۔[1]

یہ فیصلہ تو تاریخ کے اساتذہ وطلباء ہی کے ذمے ہے کہ انٹرم گورنمنٹ کس پارٹی
نے فیل کی مگر واقعات یہ ہیں کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے
کی سیاست میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مولینا آزاد کانگریس کی
پالیسی بیان کرتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ فنانس کا محکمہ سب سے زیادہ اہم تھا لیکن اس
کے ساتھ ہی یہ ایک فنی اور ٹیکنیکی معلومات سے متعلق موضوع تھا۔ لیگ کے پاس کوئی
ایسا قابل آدمی نہ تھا جو اسے چلا سکے۔ قدوائی (کانگریس) کا خیال تھا کہ یا تو مسلم لیگ
اس وزارت کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی یا اسے چلا نہ سکے گی۔ دونوں صورتوں
میں جیت کانگریس ہی کی ہوگی"[2]

یہاں تک تو امیدیں بہت خوش آیند تھیں مگر بعد کے واقعات نے کانگریس کے اس
گروپ کو بہت برافروختہ کر دیا اور "انھوں نے (پٹیل نے) صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر مسلم
لیگ سے چھٹکارا مل جائے تو ہم ہندوستان کے ایک ہی حصے پر قناعت کرنے کو تیار ہیں"[3]
ماؤنٹ بیٹن نہایت ذہین، مردم شناس اور سرگرم انسان تھے۔ انھوں نے حالات کا مطالعہ
کر کے اور ہوا کا رخ پہچان کر اپنے مشن کا آغاز ولبھ بھائی پٹیل سے کیا اور بٹوارے کی اسکیم ان
کے سامنے رکھی۔ پٹیل تو پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے چنانچہ انھوں نے گرمجوشی کے ساتھ بٹوارے
کی اسکیم منظور کر لی۔

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۵۷ [2] ،، ،، ،، [3] ،، ،، ص ۱۹۹

"ماؤنٹ بیٹن نے مسئلہ کو ایک نئی شکل دے دی اور کانگریس و مسلم لیگ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ انھوں نے پاکستان کے حق میں دلائل دیتے ہوئے گورنمنٹ کے کانگریسی ممبران کے دماغوں میں یہ بیج بونا شروع کیا۔"

"جیسے ہی ماؤنٹ بیٹن نے یہ تجویز پیش کی انھوں نے دیکھا کہ سردار پٹیل اس کے لئے پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سردار پٹیل ماؤنٹ بیٹن کے آنے سے بھی پہلے پچاس فیصدی کی حد تک تقسیم کے لئے تیار تھے۔"

"یہ حقیقت تاریخی طور پر ریکارڈ کیے جانے کی مستحق ہے کہ ہندستان میں پہلا آدمی جو ماؤنٹ بیٹن کے پلان، تقسیم ہند پر متفق ہوا وہ سردار پٹیل ہے۔"[1]

پٹیل کی طرف سے مطمئن ہو کر ماؤنٹ بیٹن جواہر لال کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر وہ اپنے ذہن، مزاج اور سیاسی پس منظر میں کسی طرح بھی ملک کا بٹوارہ منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھے مگر ماؤنٹ بیٹن ہار ماننے والے آدمی نہ تھے۔ وہ منظم اور مرتب طریقے سے اپنی کوششوں میں لگے رہے۔ سب سے پہلے انھوں نے کرشنا مینن کو استعمال کیا۔ مینن صاحب بیسوں برس سے نہرو کے قریبی معتمدین میں شمار ہوتے تھے اور آدمی کو شیشے میں اُتارنے کا فن جانتے تھے۔ ان کی سیاسی بازی گری، اقتدار پسندی اور اعتماد کی نااہلیت کے قصے مولانا آزاد، غلپ زنگر اور تھائی کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن کی بیوی نے بھی جواہر لال کو آمادہ کرنے میں بڑا کام کیا۔ موصوفہ قابل، ذہین، موثر اور تیز طرار تو تھیں ہی ساتھ ہی ساتھ حسین اور جاذب نظر بھی تھیں۔ جواہر لال کے ساتھ ان کے تعلقات کی تفصیلات بڑی دلچسپ اور طویل ہیں۔ جو صاحبان یہ رنگین داستان پڑھنا ہی چاہیں وہ پنڈت جی کے پرائیویٹ سکریٹری ایم۔ او۔ متھائی، لیری کولنس، غلپ زیگر وغیرہ کی کتابیں، نہرو کے وقت کی یادداشتیں، آدھی رات کی آزادی اور ماؤنٹ بیٹن کی آفیشیل سوانح عمری وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔ ہمیں یا ہمارے موضوع کو

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۹۷

تو اس داستان سے صرف اتنا تعلق ہے کہ جواہرلال پر ان مختلف خارجی عوامل کا ایسا دباؤ ڈلوایا گیا کہ آخر کار انھوں نے بھی تقسیم کو منظور ہی کر لیا۔ اس بارے میں مولینا آزاد کی رائے ایک تاریخی شہادت ہے:

"سردار پٹیل کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن جواہرلال کی طرف متوجہ ہوئے۔ شروع میں جواہرلال نے بٹوارے کی شدید مخالفت کی لیکن ماؤنٹ بیٹن اپنی کوشش میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ جواہرلال آہستہ آہستہ ہموار ہوتے گئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے ایک ہی مہینے کے اندر جواہرلال جو تقسیم کے سخت مخالف تھے اب اگر اس کے مؤید نہیں ہوئے تھے تو رضامند تو ہو ہی گئے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جواہرلال ماؤنٹ بیٹن سے کس طرح متاثر ہو گئے۔ وہ اصولی آدمی ہیں مگر ساتھ ہی جذباتی بھی ہیں اور آسانی سے لوگوں کے کہے میں آجاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن ان کے اندر اس تبدیلی کی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ انتہائی ذہین تھیں بلکہ بے حد دلکش اور دوست نواز بھی تھیں"[1]

ان دونوں صاحبان پٹیل اور پنڈت نہرو کی منظوری کے بعد کانگریس ورکنگ کے بٹوارے کی منظوری لینا کوئی اہم مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم گاندھی جی کے سامنے یہ تجویز پیش کرنی اور ان کی منظوری کا مسئلہ ضرور باقی تھا۔ ابھی تک کسی نہ کسی درجہ میں یہ خوش فہمی باقی تھی کہ وہ تقسیم کو منظور نہ کریں گے اس لئے کہ وہ بار بار یہ وارننگ دے چکے تھے کہ پاکستان میری لاش پر سے گزر کر ہی بن سکے گا۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کی سالمیت کے لئے اگر ہندوستان کی حکومت مسلم لیگ کو دینی پڑے تو مجھے اور کانگریس کو اس میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔

"ماؤنٹ بیٹن نے دیکھا کہ گاندھی جی متحدہ ہندوستان کی حمایت میں ثابت قدم

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۹۹

ہیں اور تقسیم ملک کے ہر اقدام کی سختی کے ساتھ مخالفت کریں گے۔ انھوں نے (گاندھی جی نے) پہلی اپریل کو یہ پلان پیش کیا کہ جناح کو عبوری طور پر مرکزی حکومت کی تشکیل کی دعوت دی جائے۔ اگر اس طرح ملک کی سالمیت برقرار رہ سکے تو کانگریس کو مسلم لیگی حکومت منظور کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔[1]

گاندھی جی کی اس مضبوط اور مخلصانہ پالیسی کے بعد فطری طور پر یہ یقین پختہ ہوگیا تھا کہ پٹیل اور نہرو کے ہموار ہو جانے کے بعد بھی کانگریس ملک کا بٹوارہ منظور نہ کرے گی اور گاندھی جی اس راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ مگر آخر میں یہ یقین بھی بہت کمزور اور محض خوش فہمی پر مبنی نکلا۔ پٹیل سے اس مسئلہ پر پہلی ہی بار گفتگو کے بعد گاندھی جی نے صاف کہہ دیا کہ اب تقسیم کے علاوہ مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ ہندوستانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا، اہم اور خون آشام فیصلہ بھی مولینا آزاد کی زبانی بہتر ہے:

"ہم منتظر تھے کہ گاندھی جی ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے لئے دہلی آئیں گے چنانچہ ۳۱ مارچ کو وہ پہنچ گئے۔ فوراً ہی میں اُن سے ملنے گیا۔ انھوں نے پہلی بات جو مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ اب تقسیم ایک خطرہ بن چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولبھ بھائی پٹیل اور یہاں تک کہ جواہر لال نے بھی ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ یوں تو میں ہمیشہ سے تقسیم کا مخالف رہا ہوں مگر جتنی شدت سے آج اس کے خلاف ہوں اتنا اس سے پہلے کبھی نہیں رہا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ جواہر لال اور پٹیل نے بھی ہار مان لی ہے اور بقول آپ کے ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ اب میری ساری امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں اگر آپ تقسیم کی مخالفت میں ثابت قدم رہے تو اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے لیکن اگر آپ بھی اس پر رضامند ہو گئے تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میری رضامندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کانگریس تقسیم کو منظور

---

[1] ماؤنٹ بیٹن، ص ۳۶۵

کرنا چاہتی ہے تو یہ میری لاش پر سے گزر کر ہی ممکن ہو سکے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک کسی حالت میں تقسیم کو منظور نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے تین ملاقاتیں کیں۔ پھر سردار پٹیل نے تنہائی میں دو گھنٹے تک گاندھی جی سے بات کی۔ یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ اس رازداری میں کیا باتیں ہوئیں مگر اس کے بعد جب میں گاندھی جی سے ملا تو یہ دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا کہ گاندھی جی بھی بدل گئے تھے۔ اگرچہ ابھی تک علی الاعلان تقسیم کی تائید نہیں کر رہے تھے مگر اب پہلے جیسی شدت کے ساتھ اس کی مخالفت میں بھی نہیں بول رہے تھے۔ جس چیز سے مجھے اس سے بھی زیادہ صدمہ اور حیرت ہوئی وہ یہ تھی کہ اب پاکستان اور بٹوارے کے حق میں وہی دلائل دے رہے تھے جو اس سے پہلے پٹیل نے دیئے تھے۔ میں نے دو گھنٹے تک ان کے سامنے دلیلیں دیں مگر انھیں قائل نہ کر سکا۔ آخر میں ناامید ہو کر میں نے کہا کہ جب آپ نے بھی یہ نظریہ تسلیم کر لیا تو اب ہندوستان کو تباہی سے نہیں بچایا جا سکتا۔ انھوں نے اس کا تو کوئی جواب نہ دیا مگر یہ کہا کہ میں نے تو پہلے ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم مسٹر جناح کو گورنمنٹ بنانے اور اس کے وزراء کے انتخاب کی دعوت دیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے یہ تجویز ماؤنٹ بیٹن کے سامنے بھی رکھی تھی۔ وہ اس نظریے سے بہت متاثر بھی ہوئے تھے۔ میں یہ واقعات جانتا تھا چنانچہ دوسرے دن جب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا تو انھوں نے کہا کہ اگر کانگریس گاندھی جی کی اس تجویز کو مان لے تو اب بھی تقسیم سے بچایا جا سکتا ہے اس لئے کہ کانگریس کی طرف سے یہ پیش کش مسلم لیگ اور جناح کو مطمئن کر دے گی۔ مگر بدقسمتی سے جواہر لال اور سردار پٹیل نے تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور گاندھی جی پر زور دیا کہ وہ اس تجویز کو واپس لے لیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ درحقیقت تقسیم اب ناگزیر ہو گئی ہے۔ اب تو سوال اس بات کا ہے کہ تقسیم کی شکل کیا ہو۔ چنانچہ اب گاندھی جی کے حلقوں میں دن رات تقسیم کی شکل اور

اس کے طریق کار پر بات چیت ہونے لگی۔[1]

اس کے فوراً بعد آل انڈیا کانگریس نے بھی تقسیم کی تجویز پر مہر تصدیق ثبت کردی اور اب ہندوستان کو کاٹنے ملک کو بانٹنے اور ہندو مسلمانوں کو الگ الگ کرنے کی تیاریاں زور و شور کے ساتھ شروع ہوگئیں۔ مسلم لیگ اور اس کے لیڈران کرام خاص طور پر مسٹر محمد علی جناح خوش، مطمئن اور کامران تھے کہ ان کا پاکستان دلی اور سہارن پور سے لے کر پشاور اور کراچی تک اُدھر آسنسول، بردوان اور کلکتہ سے لے کر چاٹگام تک کے طویل و عریض ملک پر مشتمل ہوگا۔ ان کی خوشی اور فتحمندی بے جا بھی نہیں تھی۔ اس طرف کلکتہ، آسنسول، ہاوڑہ وغیرہ کا صنعتی علاقہ، اس کی اربوں، کھربوں روپئے کی مالیت کی جاری و ساری ٹیکسٹائل، کاٹن، جوٹ، اسٹیل، پیپر، ربر، لیدر وغیرہ وغیرہ کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں چھوٹی بڑی فیکٹریاں، دنیا کے تجارتی علاقوں سے رابطہ رکھنے والی اربوں کھربوں کا مال برآمد کرنے والی کلکتہ کی بین الاقوامی بندرگاہ، بنگال کا زرخیز ملک اور دوسری طرف سونا اگلنے والی پنجاب کی سرسبز زمین، لدھیانہ، امرت سر، کشمیر، شملہ وغیرہ وغیرہ کے لامحدود خزانے جس ملک کے قبضے میں آرہے تھے اس کے قبضے میں آدھا نہ سہی ایک تہائی ہندوستان اور ملک کے متعدد قیمتی ترین علاقوں میں سے دو چار تو ضرور ہی آرہے تھے مگر قسمت کی خوبی دیکھئے کہ عین اس وقت جب فاصلہ صرف دو ہی چار ہاتھ کا باقی رہ گیا تو کمند بالکل بیچ سے ٹوٹ گئی، اور کانگریس اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح کے سامنے یہ سوال پیش کردیا کہ جن بنیادوں پر آپ ہندوستان کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں ٹھیک انہی اصولوں اور بنیادوں پر پنجاب اور بنگال بھی تقسیم ہونا چاہیے۔ کوئی غیر سیاسی سیدھا اور سادہ انسان ہوتا تو صاف صاف کہتا کہ آپ لوگ آپ اچھا بیوقوف بنا رہے ہیں۔ بنگال کا قلب، اس کی رگوں میں رواں دواں زندگی اور گوشت پوست تو آپ لے لے رہے ہیں اور اس کا انجر پنجر آئے دن کے طوفانوں، سیلابوں اور سائکلونوں کی زد پر رکھے ہوئے دلدلی اور تہہ آب علاقے ہمیں دے رہے ہیں۔ پنجاب کا زرخیز ترین حصہ، صنعتی علاقہ اور بہترین سرزمین آپ اپنی طرف لگا ہے

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۰۱/۴۴

ہیں اور ریگستانی، خشک، بنجر علاقہ ہمارے حصے میں ڈال رہے ہیں۔ کشمیر اپنے نشانے پر رکھ رہے ہیں اور سرحد جہاں کے پچاس فی صدی عوام بھی ہمارے ساتھ نہیں ہیں، ہمارے دردِسر کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے جس پاکستان کو ہم نے لولا لنگڑا اور کٹا پھٹا کہہ کر رد کر دیا تھا وہی آپ پھر ہمارے سر ڈال رہے ہیں۔ مگر لیڈروں کا نکتہ نظر بڑی سیاسی اہمیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ جناح صاحب اتنی جلدی اور شوق میں تھے کہ بلا کسی رد و قدح کے یہی پاکستان منظور کر لیا۔ ماؤنٹ بیٹن تو کہتے ہیں کہ کانگریس والوں کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اگر پورا پنجاب اور بنگال بھی پاکستان سے علٰحدہ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تو جناح صاحب اتنی جلدی اور جوش میں تھے کہ وہ بھی منظور کر لیتے۔ ایک بیان ملاحظہ کیجئے:

"۱۰ اپریل کو جناح صاحب سے ملاقات کے دوران وائسرائے نے ایک مختلف طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے تقسیم کے بارے میں جناح کی معقولیت کو تسلیم کیا مگر ساتھ ہی یہ کہا کہ یہی اصول پنجاب اور بنگال جیسے دو عظیم صوبوں پر بھی لاگو ہوتے ہیں جہاں ہندو مسلمانوں کی تعداد کم و بیش برابر ہے۔ اگر انڈیا تقسیم ہوتا ہے تو ان دونوں صوبوں کو تقسیم ہونا چاہیئے۔ یہ سن کر جناح بہت گھبرائے انھوں نے جواب دیا کہ پنجاب اور بنگال اپنی وحدت کی وجہ سے بڑی قیمت رکھتے ہیں۔ ان کی تقسیم سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کمزور ہو جائے گا بلکہ ان دونوں صوبوں کی پُرسکون زندگی بھی برباد ہو جائے گی۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب کی دلیل انھی پر چسپاں کر دی اور کہا کہ آپ نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ جناح سمجھ گئے کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہی کی دلیل کی بنا پر ہندوستان کو بھی تقسیم نہیں ہونا چاہیے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اندازہ لگا لیا کہ اگر جناح صاحب کو یقین ہو گیا کہ پورا پنجاب اور پورا بنگال ملنا مشکل ہے تو وہ ان دونوں صوبوں کی تقسیم پر رضامند ہو جائیں گے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے وہ پورا پنجاب و بنگال دونوں صوبے قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔"[1]

[1] ماؤنٹ بیٹن، ص ۳۶۸

ماؤنٹ بیٹن نے اس کمزوری کا اندازہ کرلینے کے بعد ہی پنجاب و بنگال کی تقسیم کا سوال اُٹھایا تھا ورنہ وہ خود بھی سمجھتے تھے کہ بہترین پنجاب اور قیمتی ترین بنگال الگ کرلینے کے بعد کون پاکستان قبول کر سکتا ہے۔ انہی پیش بینیوں کی بنیاد پر انھوں نے کانگریس سے منع کیا تھا کہ ابھی اس موقع پر بنگال و پنجاب کی تقسیم کا سوال نہ کریں، میں خود ہی مناسب موقع پر یہ مسئلہ اُٹھاؤں گا۔[1]

یہ ایک طویل کہانی ہے کہ مسلم لیگ اور مسلمان اپنے لیڈر کی تمام تر سیاسی بصیرتوں کے بعد بھی کس طرح قدم قدم پر سیاسی کامیابیاں حاصل کرتے گئے، کیسے پاکستان حاصل کیا اور پھر کس دل سے بنگال و پنجاب کی تقسیم پر تیار ہوئے اور آخر میں کس سادگی سے ریڈکلف کی حدبندی کو آنکھ بند کر کے گلے لگانا پڑا۔ یہ تفاصیل جاننے کے لئے قارئین کو مفصل تاریخوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مختصر یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ پنجاب و بنگال کی تقسیم کا بھی فیصلہ ہوگیا اور سب سے آخر میں یہ مطالبہ سامنے آیا کہ صوبہ سرحد میں جہاں کانگریس کی اکثریت اور حکومت تھی اور ضلع سلہٹ میں جس میں مسلم اکثریت تھی استصواب رائے عامہ کرایا جائے کہ یہ پاکستان سے ملنا چاہتے ہیں یا ہندوستان سے۔ جناح صاحب اس استصواب پر بھی رضامند ہوگئے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر صوبہ سرحد اور سلہٹ کا طویل اور تفصیلی دورہ کیا اور وہاں کے عوام کو مسئلہ کی اہمیت اور نتائج کی سنگینی سے وضاحت کے ساتھ مطلع کیا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی مقبولیت اور اس کے ساتھ ہی آزادی کے جذبات کی جڑیں پہلے ہی سے کافی مضبوط تھیں۔ حضرت کی تقریروں اور بیانات نے وہاں کے عوام کے خیالات اور سیاسی رجحانات اور بھی پختہ کردئے۔ مگر ساتھ مسلم لیگ کے پروپیگنڈے اور منظم تدابیر کا بھی کافی اثر ہوا۔ اس کے جلسوں اور مجمعوں میں جہاں کانگریس کی دوسری برائیاں بیان کی جاتی تھیں وہیں قرآن پاک کے جلے اور پھٹے ہوئے اوراق بھی دکھائے جاتے تھے جو کلکتہ میں جلائے گئے،

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۰۵

تھے عوام کو ان کی مذہبی کتاب کی یہ حالت خصوصاً مسلمانوں کو قرآن پاک کی ایسی اہانت دکھلائی جائے تو ان پر ایسی جذباتی کیفیت طاری ہو جائے گی کہ ان کے لئے اصل حقیقت تک پہنچنا اور کس نے جلائے ؟ کیوں جلائے ؟ اس قسم کے سوالات خارج از بحث ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ صوبہ سرحد کے کانگریسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب وہاں عوام اور خواص میں بہت نامقبول تھے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی وجہ سے لوگ کانگریس سے بھی نالاں تھے۔ چنانچہ استصواب کا نتیجہ نکلا کہ پاکستان کو ۵۰٫۴۹ فی صدی ووٹ ملے معلوم نہیں عرف عام میں اسے جیت کہتے ہیں یا ہار سمجھتے ہیں مگر قانونی فیصلہ تو یہی ہوا کہ انہی چند پوائنٹس کی وجہ سے صوبہ سرحد پاکستان میں چلا گیا اور آخر کار ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہندوستان کا باضابطہ اعلان ہو گیا۔ سلہٹ میں عوام نے حضرت کی بات نہیں سنی اور بھاری اکثریت نے پاکستان کی طرف جانے کا فیصلہ کیا مگر آخر کار پچیس برس کے بعد ان کو اپنا فیصلہ بدلنا ہی پڑا۔

ان تمام حالات اور واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پاکستان صرف مسلم لیگ اور مسٹر محمد علی جناح ہی نے نہیں بنوایا تھا بلکہ اس میں کانگریس کے بعض صاحب اثر حضرات بھی برابر کے شریک تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور ان کے بعض ساتھی بھی اسی درجہ میں دو قومی نظریے کے حامی تھے۔ "مجھے حیرت اور صدمہ ہوا جب پٹیل نے میری بات کے جواب میں کہا کہ چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کر لیا جائے"[۱] "یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ولبھ بھائی پٹیل ہندوستان کی تقسیم کے مؤسس تھے"[۲] ہندوستان کے بٹوارے، پاکستان کے مطالبے اور دو قومی نظریے کے بارے میں مسٹر محمد علی جناح بھی اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ "تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ملک کے بٹوارے کا الزام ان کے سر رکھا جاتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے پاکستان قبول کیا وہ سردار پٹیل تھے"[۳]

---

[۱] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۹۸ [۲] انڈیا ونس فریڈم [۳] انڈیا ونس فریڈم

ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کی تجویز ملک کے سارے لیڈروں کے سامنے رکھی اور کہا کہ کل تک آپ لوگ اپنا فیصلہ مجھے بھجوادیں۔ دوسرے دن

"کانگریس نے اپنا فیصلہ بھجوادیا کہ اسے ملک کے بٹوارے کی تجویز منظور ہے۔ سکھوں کی منظوری بھی وائسرائے کو حاصل ہو چکی تھی۔ معاملہ اگر اٹکا تو کہاں؟ محمد علی جناح پر۔ (وہ خاموش تھے) معلوم ہوتا تھا کہ جناح کا بھی آج مون برت ہے۔ برسہا برس سے جناح نے جو خواب دیکھے تھے ان کے پورے ہونے میں اب صرف اتنی دیر تھی کہ وہ زبان سے "ہاں" کہہ دیں۔ لیکن نہ جانے وہ کون سی پُر اسرار وجہ تھی جس کی بنا پر وہ تقسیم کی اس تجویز پر ہاں نہیں کہہ پائے تھے ان کی ساری عمر نہیں کہتے گزری تھی۔ اور "نہیں" ان کے دماغ میں اس حد تک بیٹھ چکی تھی کہ اب جب سب کچھ ان کے حق میں تھا تو جناح کے ہونٹوں سے ہاں نہیں نکل رہی تھی۔ ان کا ایک ہی کہنا تھا کہ جب تک تقسیم کے اس مسودے پر مسلم لیگ کونسل میں غور نہیں ہوتا میں اکیلا اس کو منظور نہیں کر سکتا اور کونسل کے اراکین کو دہلی بلانے کے لئے کم از کم ایک ہفتے کا وقت چاہیئے، اس وقت تک جناح صاحب کے ساتھ جتنے بھی مذاکرات ہوئے تھے ان میں وائسرائے کو ہمیشہ مایوسی ہوئی تھی۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا جناح پاکستان جو چاہتے تھے وہ ان کو دیا جا رہا تھا۔ کانگریس نے اسے مان لیا تھا۔ سکھوں نے اُسے حلق سے نیچے اُتار لیا تھا۔ عین وقت پر جناح کی طرف سے اڑنگا ڈالنے کا کیا مطلب تھا؟"[۱]

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مسٹر جناح صاحب پاکستان اور تقسیم ملک کا مطالبہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے سودے بازی کے طور پر استعمال کر رہے تھے[۲] یہ حقیقت ذہن نشین کر لینے اور تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ کر دینے کی مستحق ہے کہ تقسیم ملک اور ہندو مسلم دو قومی نظریے

---

[۱] لیری کولنس، آدھی رات کی آزادی، ص ۱۳۱ [۲] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۹۷

کا بے غرض مخلصانہ اور مردانہ وار مقابلہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں صرف جمعیۃ علماء ہند نے کیا۔ اُدھر کانگریس مسلم لیگ اور برطانیہ گورنمنٹ کے درمیان بٹوارے کی کھچڑی پک رہی تھی اور تقسیم کے اعلان کی تیاریاں ہورہی تھیں ادھر۔ ۱؍مئی ۱۹۴۲ء کو اپنے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں جمعیۃ علماء تقسیم اور دو قومی نظریے سے بیزاری اور اس کے خطرناک نتائج کا پوری وضاحت کے ساتھ اعلان کررہی تھی۔ خوب یاد کرلیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی "اتقو فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللّٰہ" صرف امت ہی کے لئے نہیں، بلکہ پوری نوع انسانی کے لئے قیامت تک مشعل ہدایت ہے۔

انسانی درندے، خون کے دریا، لاشوں کے انبار

آزادی کا فیصلہ ہوگیا۔ زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ ہندوستان کے لئے یہ خوشی کا موقع تھا مگر اس خوشی میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ہندوستان کا دل رو رہا تھا۔ ملک کٹ رہا تھا۔ صدیوں کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ ساتھ مرنے جینے، ہنسنے رونے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہندوستانی آج بٹ رہے تھے۔ گاندھی جی نے کہا:

"کل سے ہم انگریزوں سے آزاد ہوجائیں گے۔ لیکن آج آدھی رات کو ہندوستان کے ٹکڑے ہونے والے ہیں۔ کل کا دن خوشی کا ہوگا مگر اتنے ہی دکھ کا بھی ہوگا۔ یہ آزادی ہم کو ایک بڑی ذمے داری سونپ رہی ہے۔ ہمیں بصیرت اور اخوت کا دامن نہیں چھوڑنا ہے۔ اگر اس کی حفاظت کلکتہ میں ہوگئی (جہاں گاندھی جی اس وقت مقیم تھے) تو مجھے سارے ملک میں انسانیت جاگ اُٹھے گی۔ آزادی جس طرح آئی ہے اس سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے آزادی کے دن میں برت رکھوں گا، چرخہ کاتوں گا ملک کی بھلائی کے لئے دعا کروں گا۔ آپ لوگ اس میں میرا ساتھ دیں، برت رکھیں اور دعا کریں"[1]

اس آزادی کے ساتھ ملک کی آدھی آبادی خوف، دہشت، بھوک اور موت کے اندھیروں میں دفن ہوگئی۔ مادرِ وطن کی چھاتی پر آرے چلنے لگے۔ دھرتی کا کلیجہ پھٹ گیا، سامان اور انسان بٹنے لگے، تقسیم کی دیوار کھنچنے لگی۔ ولبھ بھائی پٹیل کو یہ خوش فہمی تھی کہ "پاکستان زیادہ دیر نہیں چل سکے گا اور بہت جلد ہندوستان میں مل جائے گا اور اس نئی ریاست سے مسلم لیگ کو تلخ سبق ملے گا"[2]

---

[1] آدھی رات کی آزادی، ص ۱۶۸ [2] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۲۵

دنیا میں بڑی بڑی تقسیمیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے ملکوں کی ہجرتیں ہوئی ہیں، بستیوں، علاقوں اور آبادیوں کے بٹوارے بھی ہوئے ہیں مگر اتنی بڑی ہجرت ایسی دل سوز تبادلۂ آبادی اور ایسا انسانیت کش بٹوارہ شاید اس سے پہلے کبھی نہ پیش آیا ہو۔ گذشتہ پانچ سو سالوں کے دوران ہندوستان میں کتنی بلندیاں، کیسی ترقیاں اور بھرپور آبادیاں معرض وجود میں آئی تھیں۔ ان سب کو ایک ایک کر کے تقسیم کرنا تھا۔ بینک، ان میں جمع شدہ رقومات، ڈاک کا حساب کتاب، منی آرڈرس، بیمے، ٹکٹ، لفافے، کارڈ، حکومتوں کے ریکارڈس اور دستاویزات، دنیا کی تیسری بڑی ریلیں اور ان کے انتظامات، دوائیں، ہسپتال، یونیورسٹیاں، ملازمین، طالب علم، اساتذہ، مریض، ڈاکٹرس، غرض بے شمار، لاتعداد اور چھوٹی بڑی لاکھوں چیزیں تھیں جنھیں چیر پھاڑ کر اور کاٹ چھانٹ کر بانٹنا تھا۔ قانونی اعتبار سے تو یہ سب تقسیم ہی کے تحت آئے گا مگر جب کبھی ان کی حکایتیں لکھی جائیں گی تو ہر لفظ سے بربادیوں اور تباہیوں کی داستانیں بنیں گی۔ تقسیم کا کام ریڈکلف کی حد بندی لائن کے اعلان سے مکمل ہوا۔ اس کے فوراً بعد وہ آگ جس کا آغاز کلکتہ، نواکھالی، بہار اور گڈھ مکتیشر سے ہوا تھا اس کے شعلے بھڑک کر آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہندوؤں اور سکھوں کو پاکستان کہلائے جانے والے علاقوں سے نکالنے، لوٹنے، مارنے اور برباد کرنے اور انسانیت کو ذبح کرنے کا آغاز اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد کے نعروں سے ہوا۔ ہندوستانی علاقوں میں بجرنگ بلی کی جے، ہر ہر مہادیو، بھارت ماتا کی جے کی آوازوں کے ساتھ مسلمان بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور معصوموں کو ذبح کرنے، زندہ جلانے اور کچل ڈالنے کا کام شروع ہوا۔ دنیا میں ایسے مجرمین اور جرائم کی روک تھام، پولیس اور فوج ہی کیا کرتی ہے۔ مگر قوم کے ان لیڈروں نے فوج اور پولیس کو بھی ہندو فوج اور مسلم فوج بنا دیا تھا۔ چنانچہ امن کے یہ محافظ ظلم و بربریت کے علمبردار بن گئے تھے۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر فوج تقسیم نہ ہوتی تو آزادی کے فوراً بعد جو خون کی ندیاں بہی ہیں وہ نہ بہتیں مگر مجھے نہایت افسوس ہے کہ میرے ساتھیوں نے میرا ساتھ نہ دیا اور فوج کو متحد رکھنے کی سخت مخالفت کی۔ اس بات کا مجھے اور بھی افسوس ہوا کہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد جو بڑے امن پسند اور نرم دل انسان ہیں انھوں نے بھی فوج کے اتحاد کی مخالفت کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے نہایت افسوس کے ساتھ کہا کہ ہندوستانی فوج مسلمانوں کے قتل میں شریک ہونا چاہتی تھی مگر انگریز افسران نے بڑی مشکل سے اسے روکا۔[1]

انسان کی حیوانیت اور دل کی قساوت کے جیسے مناظر اس موقع پر نظر آئے۔ تاریخ انسانی نے شاید ہی کبھی دیکھے ہوں۔ بہت سے لوگ ایسے ملے جنھیں یہ حادثات دیکھ کر ہندوؤں سے، مسلمانوں سے، سکھوں سے اور انسان سے نفرت ہوگئی۔

"سکھوں کی ٹولیاں چاروں طرف گھوم رہی تھیں جو مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑتی تھیں جیسے لاشوں پر گدھ۔ مسلمانوں کے محلے اور گاؤں تباہ ہو رہے تھے۔ یہ سکھ اپنے پیچھے ایک خاص نشانی چھوڑ جاتے تھے جب وہ کسی مسلمان مرد کو قتل کرتے تھے تو اس کا عضو تناسل کاٹ کر اس کے منہ میں بھر دیتے تھے۔ ایک شام لاہور کے کافی ہاؤس کے سامنے مسلمان غنڈے جمع تھے، اچانک سامنے سے ایک سائکل سوار گزرا اس نے ان کی طرف پیتل کا ایک برتن پھینکا۔ ایسے برتن عموماً دودھ لے جانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں جس طرف وہ برتن لڑھکتا تھا لوگ کود کر پناہ کے لئے اِدھر اُدھر دبک جاتے تھے۔ سب کو یہی اندیشہ تھا کہ اس میں بارود ہے اور زبردست دھماکا ہوگا جب ایسا نہ ہوا تو ایک آدمی نے اسے کھول کر دیکھا۔ اسے دیکھنا بھی کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ امرت سر کے سکھوں نے لاہور کے مسلمانوں کو تحفہ بھیجا تھا اس برتن میں مسلمانوں کے ختنہ کئے ہوئے سیکڑوں اعضائے تناسل بھرے ہوئے تھے۔ ادھر لاہور میں قتل، آتش زنی، عصمت دری اور لوٹ مار کے واقعات اس قدر بہیمانہ انداز میں ہو رہے تھے کہ اچانک ایک انگریز افسر نے

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۲۰

لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ سارا شہر خودکشی پر آمادہ ہے۔ پنجاب کی طرح لاہور کی پولیس میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ ہندوؤں کی حفاظت سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ امرتسر کی حالت لاہور سے زیادہ خراب تھی۔ بازاروں اور گلیوں میں لوگ برسرِعام قتل ہو رہے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر ستم ڈھانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ کسی مسلمان کو دیکھتے ہی وہ پیچھے سے آتے اور اچانک اس کے منہ پر تیزاب ڈال دیتے۔"[1]

امرت سر، لدھیانہ، جالندھر، انبالہ غرض پورے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہندو اور سکھ مسلمان بستیوں اور گاؤں میں کھڑی ہوئی فصلوں، گھروں اور بستیوں کو تیل چھڑک کر آگ لگا دیتے تھے پھر تلواریں، برچھیاں اور خنجر لے کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جلتے ہوئے گھروں سے کھلیانوں اور بستیوں سے جو لوگ آگ سے بھاگ کر نکلتے تھے اگر بچے ہوتے تو انھیں نیزوں پر چھید لیتے تھے۔ بوڑھے ہوتے تو تلواروں سے ذبح کرتے اور جوانوں کو خنجروں سے قتل کرتے تھے۔ حکومت نے سکھوں کو کرپان، تلوار اور خنجر رکھنے کی قانونی آسانی دے رکھی تھی۔ عورتوں کو ننگا کر کے پریڈ کراتے تھے اور پھر برسرِراہ زنا کرتے تھے۔ کوئی عورت یا لڑکی پسند آجاتی تو اُسے گھر میں ڈال لیتے تھے۔ اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ بالکل یہی ظلم اور یہی ہتھیا چار سرحد کے اس پار پاکستانی لوگ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ ۱۵ اگست کی دوپہر کو لاہور سے آنے والی نمبر دس ڈاؤن ایکسپریس امرت سر پہنچی۔ ساری کھڑکیاں کھلی تھیں مگر اندر ایک آدمی بھی نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے ڈبے کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اس ٹرین میں مسافروں کے بجائے ان کی لاشیں تھیں۔ لاشوں کے درمیان کچھ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے زخمی بھی تھے مگر ایسے زخمی جو بلک بلک کر موت کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ایک عورت اپنے شوہر اور بچوں کی لاشوں کے درمیان گم سم بیٹھی تھی۔ ایک بوڑھا اپنے بیٹوں، بہوؤں، لڑکی، داماد اور بیوی

---

[1] آدھی رات کی آزادی، ص ۱۵۵

کے سر اپنی گود میں لئے بیٹھا تھا۔ ایک بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے لپٹا ہوا تھا۔ ٹرین کے پچھلے حصے پر بڑے بڑے سفید حرفوں میں لکھا تھا "یہ ٹرین ہم نہرو اور پٹیل کے نام آزادی کی سوغات کے طور پر بھیج رہے ہیں۔" مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے قافلے پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ جن کھیتوں میں، گاؤں میں اور گھروں میں یہ صدیوں سے رہتے آئے تھے جہاں ان کی بادشاہت تھی، جہاں ان کی عزت و آبرو اور زندگی پلی بڑھی تھی وہ گھر اور گاؤں انھیں چھوڑنا پڑ رہا تھا، ناخن سے گوشت جدا ہو رہا تھا۔ ابھی کل تک ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانا ہوتا تھا چند میل کا سفر ہوتا تھا تو دنیا بھر کا سامان، راحت و آرام کا انتظام ساتھ ہوتا تھا۔ گاڑیاں اور سواریاں ہم رکاب ہوتی تھیں۔ آج ایک نامعلوم منزل کی طرف ہمیشہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے سواریاں اور گاڑیاں تو کجا مٹھی بھر دانے اور ایک گھونٹ پانی بھی ساتھ نہ تھا۔ بیس ہزار بیماروں، کمزوروں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر مشتمل انسانوں کا پیدل قافلہ چیونٹیوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ اس قسم کے نجانے کتنے قافلے پورے مشرقی پنجاب میں اپنی جان بچانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے پیروں میں زخم ہو گئے تھے جسم خشک ہو گئے تھے اور جان لبوں پر آ گئی تھی۔ کتنے بیمار راہ میں گر گئے۔ کتنے کمزور اور ضعیف بیماریوں کی نذر ہو گئے، کتنی حاملہ عورتوں کے وضع حمل ہوئے۔ دوا علاج پرہیز، غذا تو خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ ان جاں بلب مظلوموں کو ایک دو منٹ ٹھہر کر دم لینے کی بھی فرصت نہیں نصیب تھی۔ جو بے حال ہو کر بیٹھ گیا۔ بے دم ہو کر گر گیا اور خستہ و شکستہ ہو کر رہ گیا اس کو ماں باپ شوہر بھائی بہن اور قافلے والے اسی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ہر فرلانگ دو فرلانگ، میل دو میل اور منزل دو منزل پر بجرنگ بلی کی جے اور واہگورو کی فتح کے نعرے بلند ہوتے اور انسان نما درندے جتنوں کو قتل کر سکتے، زخمی کر سکتے، آبرو ریزی کر سکتے تھے کرتے اور باقی ماندہ زخمی قافلہ پھر گھسٹنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جو تمام عمر ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے اور آخر میں صدر جمہوریہ بنے تھے اپنا ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ موصوف دلی سے کشمیر جا رہے تھے۔ گاڑی لدھیانہ پہنچی تو ڈبے میں کچھ مسلح اشخاص گھس آئے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر اکھڑی اکھڑی باتیں

کرنے لگے۔ اس کے آگے کی کہانی خود ڈاکٹر صاحب ہی کی زبانی سنئے:

"ایک اسٹیشن پر پاس کے ایک ڈبے سے ایک مسلمان واقف میرے پاس آئے۔ وہ جالندھر جارہے تھے۔ بندۂ خدا اس قدر پیے ہوئے تھا کہ باتوں سے وحشت ہورہی تھی۔ مگر وہ میرے پاس آبیٹھے۔ جب معلوم ہوا کہ کشمیر جارہا ہوں تو بولے کہ جالندھر سے آگے کیسے جاؤ گے، جالندھر میں اُتر لینا۔ ایک ہندو مسافر نے کہا کہ اگر آپ کشمیر جانا چاہتے ہیں تو لدھیانہ میں گاڑی بدل لیں۔ چنانچہ میں لدھیانہ میں اتر گیا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جاکر پوچھا تو اس نے بڑی بے پروائی سے کہا کہ فیروزپور کی طرف سے کشمیر جانے والی گاڑی آج سے بند ہے۔ جالندھر چلے جاؤ وہاں تمھارا "انتظام" ہوجائے گا۔ میں مایوس ہوکر اسی ٹرین سے جالندھر پہنچا۔ دیکھا تو پلیٹ فارم بالکل خالی نظر آیا اور اس پر فوج کے سپاہی نظر آئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے کچھ فاصلے پر پانچ سات آدمی جمع ہوگئے، کچھ پہلوان نما بڑی بڑی مونچھیں، پنجابی وضع کی لنگیاں باندھے اور ننگے سر۔ چند منٹ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا پھر میری طرف بڑھ کر چلے ہم سامان لے چلیں۔ میرے منع کرنے پر ان کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا سامان اٹھاؤ اس پر میرے مسلمان رفیق نے جن پر ابھی نشہ کسی درجے میں باقی تھا سردار کو ایک چانٹا رسید کیا اس نے چاقو نکال لیا اور دو آدمیوں نے اپنی بندوقیں ان کے سینے پر تان دیں سردار نے مجھ سے کہا جتنا روپیہ ہے دے دو، میں نے کہا روپیہ تو بکس میں ہے اس نے کہا کہ بکس تو ہم پہلے ہی بھیج چکے ہیں۔ یہ باتیں ہورہی تھیں اور قدم آہستہ آہستہ مقتل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اتنے میں ایک ہندو صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس قطار سے گھسیٹتے ہوئے چلاکر کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کہاں جارہے ہیں باہر تو قیامت برپا ہے۔ آپ ادھر آئیے۔ مجھے لے کر اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں آئے، وہ سکھ تھا ان ہندو دوست نے اس سے بتایا کہ یہ فلاں آدمی ہیں مگر اس بندۂ خدا نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کندن لال کپور نے مجھے

آفس کی کرسی پر بٹھادیا اور خود باہر چلے گئے۔ ان کے نکلتے ہی دو سکھ ملنگ دو دھاری تلوار لئے ہوئے آفس کے دروازے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے، اور مجھے اشارہ کرتے رہے کہ باہر آجاؤ۔ مگر میں بیٹھا رہا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ کپور صاحب کسی سکھ فوجی افسر سے گھبرا گھبرا کر باتیں کر رہے ہیں پھر یہ دونوں دفتر میں آئے۔ افسر نے مجھ سے کہا ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ آیئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب یہ اس کام کو باضابطہ طور پر انجام دینے کے لئے آئے ہیں۔ مگر افسر کے دو چار الفاظ سُن کر اطمینان ہوا کہ یہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہمیں جیپ میں بٹھا کر چلے، باہر سیکڑوں مسلح آدمی جمع تھے۔ ٹرکوں پر لکڑیاں ساتھ تھیں تاکہ زیادہ گندگی نہ پھیلے، ہاتھ کے ہاتھ جلاتے جائیں۔ جگہ جگہ انگاروں کے ڈھیر تھے۔ ایک مجمع ہماری طرف بڑھا۔ ہمارے مہربان سکھ فوجی افسر کیپٹن گردھیان نے اپنی اسٹن گن سنبھال لی اور مجمع سے کہا خبردار! اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔ وہ لوگ رُک گئے، مگر ان کے سردار نے گفتگو جاری رکھی اور کہا آپ انھیں لینے کیوں آئے؟ انھوں نے کہا میں لینے نہیں آیا۔ میں ایک دوسرے کام سے آیا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ کون ہیں تو میں نے انھیں اپنے ساتھ لے لیا۔ اس نے کہا انھیں ہمارے حوالے کیجئے۔ کیپٹن نے کہا تمھیں شرم نہیں آتی تم سکھ ہو کر ایک سکھ سے کہتے ہو کہ ان شریف آدمیوں کو دھکا دے دو۔ یہ گفتگو کرتے کرتے وہ ہمیں مسٹر بیدی سشن جج جالندھر کے گھر لائے۔ بیدی صاحب مجھے جانتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ بھی آئے تھے اور تفصیل سے سب کام دیکھے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ڈاکٹر صاحب آپ یہیں ٹھہریئے۔ گردھیان سنگھ نے کہا بیدی صاحب دوستی تو ٹھیک ہے مگر کیا آپ کے پاس حفاظت کا سامان ہے؟ انھوں نے کہا میرے پاس فوج کا ایک دستہ ہے۔ بیدی صاحب کی چھت سے عجیب ہولناک مناظر دیکھے، ہر طرف جلتے ہوئے مکان، جلتی ہوئی کوٹھیاں۔ وہ دل میں شرمندہ تھے مگر ساتھ ہی مجبور بھی تھے۔ پاس کی کوٹھی میں ایک ڈپٹی

سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، پرسوں ہی لاہور سے آیا تھا اس کا بھائی وہاں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا تھا اور یہاں بالکل مادر زاد ننگا پہنچا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے چارج لیا اور اب ان جلتے ہوئے مکانات اور کوٹھیوں کو ایسے دیکھتا تھا جیسے کوئی پھلجھڑیاں اور آتشبازیاں چھوٹتے دیکھتا ہے۔ بیدی نے میری واپسی کا انتظام کر دیا۔ ہماری ٹرین اُن لوگوں سے بھری ہوئی تھی جو لاہور اور مغربی پاکستان سے لٹتے اور کٹتے سے کسی طرح بچ کر نکل بھاگے تھے، ان کی باتیں سن کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ کسی کا لڑکا مارا گیا، کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کی بہن کو اغوا کر لیا گیا، کسی کی بیوی کو بھگا لے گئے، کسی کی بہو بیٹی غائب کر دی۔ میں سنتا تھا اور حیرت کرتا تھا کہ یہ لوگ مجھے کیسے چھوڑے دے رہے ہیں۔ دوران گفتگو ان لوگوں سے معلوم ہوا کہ لاہور میں پروفیسر برج ناراین کو قتل کر دیا گیا، یہ معاشیات کے مشہور پروفیسر تھے اور پاکستان کے حامی تھے۔ خدا خدا کر کے میں اور ملازم خیریت سے دہلی پہنچے۔[1]

حکومت نے اس علاقے میں بقائے امن کے لئے پولیس اور فوج بھی بھیجی تھی مگر وہ ہندو تھی، وہ مظلوموں، زخمیوں اور معصوموں کی مدد کے لئے نہیں بلکہ قاتلوں، ظالموں اور درندوں کا ساتھ دینے کے لئے آئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں مسلمان قتل کئے جا رہے تھے، مغربی پنجاب میں ہندو مارے جا رہے تھے۔ لاہور کی نالیوں میں انسانی خون بہہ رہا تھا۔ لائل پور کی نہر کا پانی ہندوؤں اور سکھوں کے خون سے لال ہو رہا تھا۔

لاہور کے پاگل خانے کے ہندو سکھ مریضوں نے اپنے ڈاکٹروں سے گڑگڑا کر التجا کی کہ ہمیں ہندوستان بھجوا دیا جائے ورنہ مسلمان ہمیں قتل کر دیں گے۔ ڈاکٹروں نے کہا کیسی دیوانے پن کی باتیں کرتے ہو۔ کیا کوئی پاگلوں کو بھی قتل کر سکتا ہے؟ لیکن ڈاکٹروں کا خیال غلط نکلا۔ مسلمان بہادروں نے پاگل مریضوں کو بھی ذبح کر ڈالا۔[2]

[1] ضیاء الحسن فاروقی، شہید جستجو، ص ۲۵۲ [2] آدھی رات کی آزادی، ص ۹۱ - ۱۸۸

سیالکوٹ کے قریب ایک گاؤں میں پریم سنگھ نامی ایک ساہوکار کے گھر کو مسلمانوں نے گھیر لیا۔ پریم سنگھ بندوق لے کر چھت پر چڑھ گیا اور فائر کرنے لگا مگر اس کی بیوی اور لڑکیوں کو یقین تھا کہ یہ بندوق اور گولیاں چار منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتیں۔ اپنی عزت بچانے کے لئے چھ لڑکیوں اور ان کی ماں نے اپنے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگالی۔ دونوں طرف ایسے بے شمار واقعات پیش آئے کہ لڑکیوں اور عورتوں نے آگ میں جل کر، پھانسی لگا کر، کنوؤں میں کود کر اور مختلف طریقوں سے خودکشی کر کے اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کی۔ چودہ سالہ لڑکا محمد یعقوب امرت سر کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ جب سکھوں نے گاؤں پر حملہ کیا تو وہ کسی طرح بچ نکلا۔ بعد میں اس نے بتلایا کہ سکھوں نے عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں، ڈری ہوئی عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑی گئیں۔ عصمت دری اور آبرو ریزی سے بچانے کے لئے گاؤں والوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا۔ ہندو سکھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیا۔ لاشوں کو کتوں اور چیل کوؤں کے لئے دان کر دیا۔ محمد یعقوب کے گاؤں کی ہزاروں کی آبادی میں صرف پچاس نفر زندہ بچے۔ سکھوں نے اس غارت گری، عصمت دری اور ظلم میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ پنجاب کی سی آئی ڈی پولیس کے سربراہ مسٹر سیوج نے اطلاع دی کہ سکھوں کی ایک انتہا پسند جماعت اور ہندوستان کے سب سے بڑے مسلم دشمن گروپ آر ایس ایس نے مل کر ایک خطرناک سازش کا منصوبہ بنایا ہے۔ سکھ جو زیادہ منظم، تربیت یافتہ ہیں اور ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت رکھتے ہیں اور آر ایس ایس جو مسلمانوں کے کٹر دشمن ہیں دونوں مل کر دلی سے پاکستان کی طرف مہاجرین کو لے جانے والی ریل گاڑیوں کو تباہ کریں گے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے سکھوں کا ایک خفیہ اجلاس طلب کیا اور اس میں اعلان کیا کہ سکھ آر ایس ایس کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو خون سے نہلا دیں اور ہندوستان سے ان کا نام و نشان مٹا دیں۔ گیارہ اور بارہ اگست کی رات کو پاکستان جانے والی پہلی خصوصی ٹرین جو افسران، ملازمان، ریکارڈس اور دستاویزات لے کر پاکستان سکریٹریٹ کا افتتاح کرنے جارہی تھی گڈر یار یلوے اسٹیشن پر مع مسافروں کے مکمل طور پر تباہ کر دی گئی اور ماسٹر تارا سنگھ کے پروگرام کا پہلا راؤنڈ کامیابی کے ساتھ پورا ہوا۔ امرت سر میں برہنہ عورتوں کے جلوس نکالے گئے، پنجاب کی سکھ ریاست پٹیالہ

نے مسلم آبادی کو برباد کرنے میں اپنی ریاستی طاقت اور ہتھیار کا آزادانہ استعمال کیا۔ یوں تو پورا مشرقی پنجاب اور اس کے باشندے ظلم و بربریت میں ایک دوسرے سے آگے تھے مگر سکھوں اور ریاست پٹیالہ کی درندگی اور خون آشامی کا بیان زبان و قلم کی رسائی سے باہر ہے۔ ایک گواہی ذہن نشین کرتے چلئے :

"ہیسٹنگ (چیف آف دی آرمی اسٹاف آف انڈیا) کو یقین تھا کہ اگر اس ظلم و بربریت پر قابو پانا ہے تو سکھوں کے خلاف سخت کارروائی کرنی ضروری ہے، انہیں اس بات پر خاص طور پر غصہ آیا کہ گورنمنٹ نے سکھوں کے اوپر سے تلوار اور کرپان لے کر چلنے کی پابندی کو ختم کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس اقدام سے ثابت ہوتا ہے کہ سکھوں کے خلاف جس قدر سخت اقدام کرنا ضروری ہے گورنمنٹ وہ نہیں کر رہی ہے، ماؤنٹ بیٹن کو یقین تھا کہ سکھوں نے اس قتل عام اور ظلم و بربریت کو پھیلانے میں سب سے بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔"[1]

"مکولی کے سینی ٹوریم میں ہندو ڈاکٹروں نے مسلمان مریضوں کو اچانک سینی ٹوریم سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ان میں ایسے مریض بھی تھے جن کا صرف ایک ہی پھیپھڑا کام کر رہا تھا اور ایسے بھی تھے جن کا تازہ تازہ آپریشن ہوا تھا۔ لیکن ان کو سینی ٹوریم چھوڑ کر پیدل پاکستان کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ پاکستان کے بابا لال آشرم میں بھی سادھو رہتے تھے ان کی زندگی پر امن تھی یوگ اور مراقبہ میں گزرتی تھی زعفرانی کپڑے پہن کر اپنے مقدس سفید گھوڑوں کو آگے آگے کر کے منتر پڑھتے ہوئے وہ ہندوستان کو روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد مسلمانوں نے اس بے ضرر آشرم کو آگ لگا دی۔"[2]

مسلمان ناچتے اور کودتے ہوئے، جھنڈے لہراتے ہوئے، بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہے تھے۔ ابھی لاہور اور مغربی پنجاب سے اجڑے ہوئے شرنارتھی دلی نہیں پہنچے تھے۔ قدم قدم پر نعرے بلند

---

[1] ماؤنٹ بیٹن، ص ۲۰۹ [2] آدھی رات کی آزادی، ص ۱۹۵

ہو رہے تھے "ہنس کے لیا ہے پاکستان لڑ کے لیں گے ہندوستان"، پنجاب کے شرنارتھی اور دلّی کے مہاجرین اپنے نئے وطن ہندوستان یا پاکستان کی طرف اور اصل میں موت کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں بے گھر بے در لوگ اسٹیشنوں پر گاڑیوں کے انتظار میں مکھیوں کی طرح بھنبھنار ہے تھے۔ گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی یہ بدقسمت اس پر ٹوٹ پڑتے تھے جس طرح گڑ کی ڈلی بھنبھناتی ہوئی مکھیوں میں دب جاتی ہے اسی طرح ٹرین آدمیوں کے ہجوم میں چھپ جاتی تھی اور اس میں روئی کے گٹھوں کی طرح انسان اوپر نیچے پیک ہو جاتے تھے پھر دروازوں سے لٹکنے، چھتوں پر سوار ہونے اور ڈبّوں کے درمیان بمپروں پر چپکنے کی باری آتی تھی۔ راستے میں حملہ آور جتھے ان کے انتظار میں رہتے تھے۔ گاڑیوں کو روکنے کے بہت طریقے تھے لائن پر پتھر کی چٹان، درختوں کے تنے اور اینٹوں کے انبار بہت آسان اور کامیاب رکاوٹیں تھیں مگر ان سے بھی اچھا طریقہ یہ تھا کہ مسلمان ٹرین کو ہندو ڈرائیور اور ہندو گاڑیوں کو مسلمان ڈرائیور مناسب موقع پر روک دیتے تھے، ورنہ ٹرین میں چھپے ہوئے سکھ اور آر ایس ایس زنجیر کھینچ لیتے تھے اور پھر حملہ آور درندوں، وحشی کتوں اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ کسی طرف سے ست سری آکال کی آواز آتی، کہیں اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا اور کبھی بجرنگ بلی کی جے گونجتی۔ درندے سمجھتے تھے کہ ہم ہندو ہیں، سکھ ہیں اور مسلمان ہیں۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں — نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لاحول ولا قوۃ الا باللہ — شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں[1]

شملہ سے ایک ٹرین دلّی کے لئے روانہ ہوئی۔ اس میں وائسرائے ہاؤس کے ہندو ملازم بھی سفر کر رہے تھے۔ ٹرین میں سفر کرنے والے وائسرائے ہاؤس کے مسلمان ملازمین پر سکھوں کا حملہ ہوا۔ ہندو ملازمین نے سکھوں کا ساتھ دے کر اپنے ان ساتھیوں کو ذبح کر ڈالا جن کے ساتھ وہ برسہا برس سے کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتے تھے۔ ان مظالم اور درندگیوں پر دونوں طرف کے لیڈروں کے بھی کلیجے کانپ اٹھے مگر ایک شخص ایسا بھی تھا جو مطمئن اور

---

[1] پیارے صاحب رشید لکھنوی

پُرسکون تھا۔ یہ ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ یہ واقعات سُن کر انھوں نے کہا "ارے یہ تو ہونا ہی تھا"[1]
ایک سڑک پر دو آدمی اپنی راہ چلے جا رہے تھے۔ اچانک گلی میں سے چھ ہندو نکل کر چلائے
مسلمان! مسلمان! پکڑو! مارو! وہ ہندو سترہ اٹھارہ برس کے چھوکرے تھے۔ انھوں
نے ان راہ گیروں کو دبوچ لیا اور انھیں ننگا کر کے دیکھا تو واقعی ان کے مسلمانی تھی۔ لڑکوں
نے ان کو باندھ کر ندی میں ڈھکیلا اور سلاخیں مار مار کر قتل کر ڈالا۔ ندی کا پانی تھوڑی دیر کے
لئے کچھ لال ہو گیا۔ ہندو لڑکوں نے فتح کا نعرہ لگایا۔ ندی کنارے کچھ دھرماتما بڑے اطمینان
سے پوجا پاٹ میں مصروف رہے اور کچھ عورتیں پوری لطف اندوزی کے ساتھ اشنان کرتی
رہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ دھرماتماؤں اور عورتوں نے لڑکوں کے نعروں کے جواب میں کالی مائی
کی جے نہیں پکاری۔ لاہور شہر جس میں کچھ ہی دن پہلے چھ لاکھ ہندو سکھ رہتے تھے اب وہاں صرف
ایک ہزار ہندو باقی تھے اور وہ بھی وہ لوگ جو اپنے فرائض منصبی کی ادائگی کے لئے پاکستانی
حکومت کی ذمّہ داری میں تھے۔ یہی حال پاکستان کے دوسرے علاقوں کا بھی تھا۔ پھر بھی
مار پیٹ کر پورے پاکستان میں دس بیس ہزار ہندو تو رہ ہی گئے تھے مگر ہندوستانی پنجاب
میں لاہور سے لے کر انبالہ تک اور پانی پت کرنال گوڑ گاؤں تک ایک مسلمان بھی نہیں بچا
تھا، یا تو چن چن کر قتل کر دئے گئے تھے یا پاکستان ڈھکیل دئے گئے تھے۔ اس کے آگے
سہارن پور اور دلی کی باری تھی۔ مگر یہاں سکھوں کی آبادی نہیں تھی اور ہندوؤں کا ایک طبقہ
انسانیت نواز اور صلح پسند تھا اس کے علاوہ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنا وطن
نہیں چھوڑیں گے اور اپنی سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنا دیں گے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ
ان کے معتقدین و متبعین اور ان کی جماعت جمعیۃ علماء ہند نے جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر خون کے
دریا کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور فسادیوں کے سامنے دیوار بن کر ڈٹ گئے۔ اگر قربانی اور
سرفروشی کا یہ حوصلہ بیدار نہ ہو جاتا تو دلی، سہارن پور، مظفر نگر، مراد آباد، علی گڑھ، بلند شہر اور میرٹھ
تک مسلمانوں کے مکمل صفایا ہونے میں کسر نہیں رہ گئی تھی۔ یہ قصہ اور تاریخی کردار ہم اس کے بعد

---

[1] آدھی رات کی آزادی، ص ۱۰۱

پیش کریں گے۔ سردست دلی کے حالات اور تفاصیل پر ایک نظر ڈال لینی مناسب ہے۔ بہوؤں بیٹیوں کے اغوا اور عصمت دری کی داستانیں اتنی کثیر الوقوع اور دلخراش ہیں کہ معمولی دل و جگر کے انسان انھیں سن بھی نہیں سکتے۔ جالندھر کے کسی گاؤں میں مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے جمع کیا گیا تو ان میں سے سولہ سترہ سال کی ایک بچی زینب ادھیڑ عمر کے ایک سیدھے سادے سکھ کے پیروں سے لپٹ گئی کہ مجھے بچالو۔ بوٹا سنگھ نے قاتلوں ظالموں کو پندرہ سو روپیے دے کر اُسے خرید لیا۔ زینب کو ہندو سکھوں نے بہت مارا پیٹا تھا اس کی عزت لوٹی تھی اور آبرو ریزی کی تھی۔ اس سے تیس برس بڑے بوٹا سنگھ نے اُسے ایسا ٹوٹ کر چاہا اور پیار دیا کہ اس بوڑھے سکھ کے آگے وہ دین دنیا کو بھول گئی۔ وہ اس سے نہ صرف یہ کہ محبت کرتا تھا بلکہ جنت کی حور کی طرح مقدس جانتا تھا۔ ان کے دو بچیاں پیدا ہوئیں اور ان کی محبت روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ادھر دونوں حکومتوں نے معاہدہ کیا کہ دونوں طرف سے اغوا شدہ لڑکیوں اور عورتوں کو واپس کیا جائے، بوٹا سنگھ کے بھائی برادروں کو یہ پریشانی ہوئی کہ زینب کی وجہ سے اس کی جائداد سے محرومی ہو رہی تھی۔ انھوں نے حکومت کو زینب کی موجودگی کی اطلاع کردی۔ سپاہی پیادے اُسے پکڑنے آئے تو بوٹا سنگھ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ وہ رویا پیٹا، افسروں کے آگے ہاتھ جوڑے اور پیر پکڑے۔ زینب نے بھی بوٹا سنگھ کو چھوڑ کر جانے سے انکار کردیا۔ مگر افسران مجبور تھے۔ معاہدہ میں یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ لڑکی انکار بھی کرے تب بھی اسے زبردستی واپس کیا جائے۔ مجبوراً زینب رو کر، ہلکان ہوکر اور پچھاڑیں کھاکر بوٹا سنگھ سے جدا ہوئی اور چلتے چلتے قسم کھاکر وعدہ کیا کہ میں جلد ہی واپس آجاؤں گی۔ بوٹا سنگھ نے پاکستان کا ویزا مانگا جو نامنظور ہوگیا۔ اس پر اُس نے جامع مسجد دہلی میں جاکر قبول اسلام کیا اور جمیل احمد ہوگیا۔ اب پھر اس نے پاکستان ہجرت کرنے کی اجازت مانگی مگر وہ بھی نامنظور ہوگئی۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہوگیا۔ اس کی چھوٹی دودھ پیتی بچی تو ماں کے ساتھ تھی مگر بڑی بچی اس کے ساتھ ہی گئی۔ وہاں پہنچ کر مہینوں حیران و پریشان بے دانہ پانی مارے مارے پھرنے کے بعد زینب کے گاؤں کا پتہ چلا۔ مگر وہ غم نصیب جب کوچۂ محبوب میں پہنچا تو پتہ چلا کہ زینب کی شادی ہوچکی ہے۔ گاؤں والوں نے اسے بہت مارا پیٹا اور غیر قانونی داخلے کے الزام میں پولیس کے حوالے

کر دیا۔ جمیل احمد نے گڑ گڑا کر عدالت سے درخواست کی کہ وہ مسلمان ہے اور زینب اُس کی جائز قانونی بیوی ہے اگر وہ اُسے نہ ملی تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک دفعہ اُسے زینب سے ملا دیا جائے "اگر وہ اس کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہوئی تو عدالت کو اختیار ہے۔ عدالت نے زینب کو حاضر کیا۔ وہ ڈری سہمی خوفزدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف اپنے شکاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ عدالت نے کڑک دار اور رعب دار آواز میں اُس سے پوچھا کہ کیا وہ جمیل احمد کے ساتھ جانا چاہتی ہے؟ زینب نے انکار کر دیا۔ جمیل نے کلیجہ تھام کر کہا آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ بچی کو اپنے ساتھ رکھو۔ مگر زینب کے دوسرے شوہر اور رشتہ داروں نے بچی کو اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن جمیل احمد بچی کو سینے سے لپٹائے ہوئے سامنے سے آتی ہوئی ٹرین کے آگے کود گیا۔ بچی چیخ کر بھاگی اور بچ گئی، جمیل احمد کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا، اس کے سامان سے وصیت نامہ نکلا کہ اُسے زینب کے گاؤں میں دفن کیا جائے مگر جنازہ وہاں پہنچا تو گاؤں والوں نے دفن کی اجازت نہ دی۔ آخر جنازہ واپس لایا گیا اور لاہور میں دفنایا گیا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

کئی ماہ بعد عورتوں نے اس واقعہ پر زینب کے تاثرات معلوم کئے تو اُس نے کہا کہ بوٹا سنگھ کے یہاں میں مجبور تھی اور چھوٹے سے راج کی رانی بن کر رہتی تھی۔ یہاں ایک معمولی بیوی اور گھر کی خادمہ ہوں۔ حکایت بہت طویل، مفصل اور عبرتناک ہے، اس پر ناول لکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں اتنی ہی گنجائش تھی کہ صرف پلاٹ پیش کر دیا جائے۔ اسی قسم کا واقعہ ایک اعلیٰ خاندان کی صاحبزادی مسعودہ بیگم کا پیش آیا تھا جن کا مقدمہ سہارنپور میں بہت مشہور ہوا تھا، ان کو بھی ایک سکھ نے اغوا کر لیا تھا اور ان کے بچے بھی ہو گئے تھے۔ مقدمہ میں فیصلہ اس بات پر ٹھہرا کہ اگر مسعودہ بیگم انکار کر دیں کہ یہ بچے ان کے نہیں ہیں تو عدالت ان کو سکھ کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ لوگوں کو اور ان کے سکھ دعوے دار کو یقین تھا کہ سال بھر سے اپنے جگر کے ٹکڑوں کے دیدار کو ترستی ہوئی ماں جب بچوں کو دیکھے گی تو بیتاب ہو کر کلیجے سے لگا لے گی

اور دو چار بے اختیار حرکتیں اور تاثرات ایسے ضرور صادر ہو جائیں گے جو قانونی ثبوت بن سکیں مگر تاریخ پر جب بچے عدالت میں آئے تو مسودہ نے ان کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی اور عدالت کے سوال پر یہ کہا کہ یہ بچے میرے نہیں ہیں۔ عورت کے بچے تو وہ ہوتے ہیں جو اس کی رضامندی سے پیدا ہوں۔ اس طرح وہ سکھ سے تو بچ ہی گئیں مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد زندگی کی قید سے بھی چھوٹ گئیں۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعہ۔

ایک لڑائی سیاسی سطح پر لیڈروں کے درمیان بھی جاری تھی۔ پاکستان کو دفاتر سکریٹریٹ اور اس کے لوازمات بالکل شروع سے تیار کرنے تھے۔ ملک کے خزانے کا جو پیسہ تقسیم ہوا اس میں ہندوستان نے پاکستان کے حصے کا پچپن کروڑ روپیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کو ایک ایک پیسے کی پریشانی تھی۔ حکومت پاکستان نے ہندوستان سے سامان لانے کے لئے بی۔ او۔ اے۔ سی کا ایک ہوائی جہاز کرائے پر لیا اور کرایہ ادا کرنے کے لئے جو چیک کاٹا وہ بنک نے واپس کر دیا اس لئے کہ حکومت پاکستان کے اکاؤنٹ میں پیسہ نہیں تھا۔ اس بے سروسامانی میں حکومت ہندوستان نے اس کا حصہ اور وہ بھی پچپن کروڑ روپیہ روک لیا تو پاکستان کو شدید مشکلات پیش آئیں۔ یہی رکاوٹیں دوسری ضروریات، آلات اور مشینوں کی تقسیم میں بھی پیش آرہی تھیں، "گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس چھ پریس تھے، جب تقسیم کا وقت آیا تو سردار پٹیل نے صفائی سے انکار کر دیا کہ ان میں سے ایک بھی کراچی نہیں جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے مسئلہ کی نزاکت دیکھتے ہوئے، بہت سمجھایا مگر پٹیل نے ضد پکڑ لی"[1]۔ تقسیم کے معاہدے کے مطابق پاکستان کو ایک لاکھ ستر ہزار ٹن فوجی اسباب اور سازوسامان ملنا چاہئے تھا مگر صرف چھ ہزار ٹن ملا۔ اسلحہ جات سے لدی ہوئی تین سو ٹرینیں پاکستان پہنچنی چاہئے تھیں مگر صرف تین ٹرینیں پہنچیں۔ پاکستان کے افسران نے جب ان ٹرینوں کو کھولا تو ان کے اندر سے پانچ ہزار جوڑے جوتے، نرسوں کی پوشاکیں اور پانچ ہزار ایسی رائفلیں نکلیں جن کی مرمت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لکڑی کے بہت سے بکس تھے جن میں اینٹیں اور جراثیم مارنے والی دوائیں بھری ہوئی تھیں"[2]۔ آخر میں مسٹر محمد علی جناح اسپیشل ہوائی جہاز کے ذریعے ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے روانہ ہو گئے اور

---

[1] ماؤنٹ بیٹن، ص ۲۹۶ [2] آدھی رات کی آزادی۔ ص ۱۹۴

ہندوستان میں اپنے متبعین کو آخری پیغام دے گئے کہ وہ ہندوستان کے وفادار رہیں۔ اب ان تمام لوگوں کو جو سات سال سے پاکستان کے لئے جوش و خروش سے لبریز تھے اندازہ ہوا کہ وہ بیچ دھارے میں پھنسے رہ گئے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کو بیوقوف بنایا گیا تھا کہ جب پاکستان بن جائے گا تو مسلمان چاہے اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں ہر حالت میں پاکستانی شمار ہوں گے اور ان کو اپنا مستقبل متعین کرنے کا پورا اختیار ہوگا اب جبکہ اکثریت کے صوبے انڈیا سے الگ ہو گئے، پنجاب اور بنگال بھی تقسیم ہو گئے اور جناح صاحب انھیں چھوڑ کر چلے گئے، تب انھیں اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا کہ انھیں پاکستان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ ان کا سب کچھ برباد ہو گیا اور مزید یہ کہ انھوں نے اپنی غیر معقول حرکتوں سے ہندوؤں میں نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکا دی۔"[1]

تاریخ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرے گی کہ اس نازک ترین وقت میں حضرت کی قیادت میں جمعیۃ علماء ہند نے قیام امن کے لئے، ہندوستانی مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت میں اور ملک کا وقار بلند کر دینے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مردانہ وار لپکتے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود گئے، اور موت کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔ گاندھی جی کو حقائق سے آگاہ کیا، ان کو پل پل کی خبریں اور آر ایس ایس کی سازشوں سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے مرن برت رکھا، جس کے نتیجے میں ایک بار پھر پورے ملک میں امن، صلح اور بھائی چارگی کی فضا پیدا ہو گئی اور آر ایس ایس اور فرقہ پرست افراد کے دل میں گاندھی جی کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی جسے انھوں نے گاندھی جی کے خون سے بجھایا۔ یہ کہانی اگلے باب میں۔

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۰۲

دلّی میں آگ

جو اُٹھا تھا شعلۂ شور و شر اُسے اپنے خوں سے بجھا دیا

آگ جو لاہور اور امرت سر سے چلی تھی وہ جالندھر، لدھیانہ اور راستے کے سارے علاقوں کو خاک اور راکھ کرتی ہوئی دلّی پہنچ رہی تھی۔ ابھی تک وہاں امن تھا۔ خبریں اور افواہیں تو ہر پل پہنچ رہی تھیں مگر شعلے ابھی نہیں بھڑکے تھے۔ بہر حال وقت کے تیور تو بدل ہی چکے تھے، جیسے جیسے مغربی پنجاب سے شرنارتھی دلّی پہنچ رہے تھے ویسے ہی ویسے ماحول تیزی سے زہر آلود ہو رہا تھا۔ آنے والوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے ان کو لوٹ کر، اجاڑ کر اور برباد کر کے بے گھر کر دیا، ان کی لاکھ کی حیثیت خاک ہو گئی۔ اب ان کو سر چھپانے کو چھت اور پیٹ بھرنے کو روٹی نصیب نہ تھی اور یہی مسلمان یہاں ہندوستان میں آرام کے ساتھ اپنے اپنے گھروں میں اطمینان و آسودگی کی زندگی گزار رہے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ جذبۂ انتقام سے پاگل ہو گئے۔ مسلمانوں پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے، بدقسمتی سے مسلمانوں کو بچانے والا کوئی نہ تھا اور قاتلوں کو ہوا دینے والے بھرے پڑے تھے۔ اکالی دل، جن سنگھ اور آر ایس ایس والوں کو سنہ اموقع ملا تھا۔ پولیس اور حکومت طرفدار تھی۔ کناٹ پلیس، سبزی منڈی، لودھی کالونی اور پہاڑ گنج وغیرہ علاقوں میں ان لوگوں نے قتل، لوٹ، غارتگری اور آتش زنی کا کام نہایت منظم طریقے سے شروع کیا۔ اگر ان لوگوں سے کوئی کسر باقی رہ جاتی تھی تو پولیس اور فوج کے لوگ اس کو بہتر طریقے سے پوری کر دیتے تھے۔ پرانی دلّی میں سکھوں کے جتھے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے، چھپے ہوئے اور گھروں میں گھسے ہوئے خوفزدہ مسلمان بچنے کی امید میں نعرہ کا جواب دیتے تھے۔ سکھ اور جن سنگھی آواز کی سمت سے ان کو ڈھونڈ نکالتے تھے اور پھر زندہ درگور کر دیتے تھے۔ عورتوں کو نکال کر لے جاتے اور زندہ جلا دیتے تھے۔ عام اعلان کر دیا تھا کہ اگر کوئی ہندو سکھ کسی مسلمان کو پناہ دے گا تو اس کو بھی یہی سزائیں دی جائیں گی۔ اس راجدھانی میں لاقانونیت کی حکومت تھی۔ مسلم لیگیوں کو چاروں طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

ابھی کل تک وہ نعرہ لگا رہے تھے "ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑکے لیں گے ہندوستان"[1] مگر چند ہی گھنٹوں کے بعد ان کی آنکھ کھلی تو روشنی کی ایک کرن بھی ان کے سامنے نہ تھی۔ ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ جس کے لئے انھوں نے اپنے ہموطنوں، پڑوسیوں اور صدیوں کے دکھ درد کے ساتھیوں سے منہ موڑا تھا اور دشمنی مول لے لی تھی وہ پاکستان اور وہ قائد اعظم ان کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یہ پیغام دے جائیں گے کہ میں تو جا رہا ہوں تم لوگ ہندوستان کے وفادار رہنا۔ اگر انھیں اتنی بربادیوں کے بعد بھی وفادار ہی رہنا تھا تو پہلے ہی عزت و آبرو کے ساتھ وفادار رہتے تو ان کا کچھ بھی تو نہ جاتا۔

"تقسیم کے بعد سب سے نازک پوزیشن مسلم لیگ کے ان لیڈروں کی ہوئی جو ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ جناح پاکستان روانہ ہو گئے تھے اور مسلم لیگیوں اور ان کے لیڈروں کے لئے یہ پیغام چھوڑ گئے تھے کہ اب ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے وہ لوگ ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہیں۔ وہ بڑی نازک اور ناامیدی کی حالت میں تھے، ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ان میں سے بہت سے ۱۴؍اگست کے بعد میرے پاس آئے اور کہا کہ جناح نے ہمیں دھوکا دیا اور بیچ دھارے میں لاکر چھوڑ دیا۔ ان کی باتوں سے میں سمجھا کہ ان لوگوں نے اپنے ذہن میں پاکستان کا ایسا نقشہ بنا رکھا تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اگر مسلم اکثریت کے صوبے الگ ہو جائیں گے تو لازمی طور پر مسلم اقلیت کے صوبے ہندوستان میں رہیں گے مگر ان مسلم لیگیوں کو اس طرح بے وقوف بنایا گیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمان چاہے جہاں رہیں گے انھیں الگ قوم سمجھ لیا جائے گا اور ان کو مکمل آزادی ہوگی کہ جیسے چاہیں اپنا مستقبل بنائیں۔"[2]

گاندھی جی دلّی کی خبریں سُن کر بے چین ہو گئے اور کلکتہ سے دلّی کے لئے روانہ ہو گئے۔ مگر دلّی اسٹیشن پر اترنا ناممکن نہیں تو اتنا مشکل ضرور ہو گیا تھا کہ جو مسافر بھی وہاں پہنچتا تھا اُسے

---

[1] آدھی رات کی آزادی [2] انڈیا ونس فریڈم، ص ۱۲۷

موت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں سکھ اور ہندو کرپانیں، تلواریں اور ہتھیار سجائے ہوئے گھوم رہے تھے۔ کسی پر مسلمان ہونے کا شبہ بھی ہو جاتا تو چشم زدن میں اُسے خاک وخون میں نہلا دیا جاتا تھا۔ گاندھی جی کو ایک منزل پہلے شاہدرہ ریلوے اسٹیشن پر اتارا گیا، پھر بھی انھیں صورتِ حال کا اندازہ ہو کر ہی رہا۔ میلوں کی مسافت میں راستے کے دونوں طرف مسلمانوں کی لاشیں، اعضاء اور جلی ہوئی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ اعلیٰ خاندانوں کے لوگ بڑی حیثیتوں کے رئیس اور صاحبِ حیثیت افراد بدن پر چیتھڑے لگائے پناہ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ گاندھی جی سے کئی جگہ فریادیوں نے دُہائی دی۔ حکومت تو کانگریس ہی کی تھی مگر کانگریس کی پوری طاقت ولبھ بھائی پٹیل، پرشوتم داس ٹنڈن اور اس قسم کے افراد کے ہاتھوں میں تھی۔ "کانگریس میں ایک جماعت ایسے افراد کی بھی تھی جو اپنے کو ظاہر تو نیشنلسٹ ہی کرتے تھے مگر حقیقت میں پکّے فرقہ پرست تھے۔ وہ لوگ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ کانگریس چاہے جو کہے مگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں[1]"

گاندھی جی نے کانگریس کے لیڈروں کو بلایا اور ولبھ بھائی پٹیل سے پوچھا کہ تم اس قتلِ عام کو روکنے کے لئے کیا کر رہے ہو۔ پٹیل نے جواب دیا کہ آپ کو جو خبریں مل رہی ہیں وہ بہت مبالغہ آمیز ہیں۔ وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے کہا کہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ مسلمان اتنے خوفزدہ ہوں اور ایسی شکایتیں کریں[2]"

دراصل پٹیل صاحب گاندھی جی سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ جمیعۃ علماء کے حضرات اکابر آپ کے سامنے جو رپورٹ پیش کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ مگر گاندھی جی نے انھیں جواب دیا کہ میں کہیں غیر ملک میں نہیں رہتا بلکہ دہلی ہی میں موجود ہوں اور اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ اپنی ہی آنکھوں کو کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے بار بار کہا کہ پٹیل کا طرزِ عمل درست نہیں ہے اور ان کو فساد کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر پٹیل صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۱۵ [2] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۳۲

"مجھے خوب یاد ہے کہ ہم تینوں (جواہر لال، مولانا آزاد اور پٹیل) گاندھی جی کے پاس بیٹھے تھے، جواہر لال نے بڑی دردمندی سے شکایت کی کہ وہ دلّی کی صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہاں مسلمان شہری کتوں اور بلیوں کی طرح قتل کئے جا رہے ہیں۔ وہ مجبور اور بے بس ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ان کا ضمیر انھیں چین نہیں لینے دیتا کہ وہ قوم کو اس بھیانک صورتِ حال کا کیا جواب دیں۔ انھوں نے بار بار اپنے دکھ درد کا اظہار کیا تو سردار پٹیل نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا کہ جواہر لال کی شکایت پورے طور پر غیر معقول ہے۔ کہیں کہیں اکّا دکّا واقعات ہو رہے ہیں مگر حکومت مسلمانوں کی جان و مال حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اس سے کچھ زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

کانگریسی لیڈروں میں ایک گروپ پٹیل ہی کے ساتھ تھا اور اس کو کسی طرح یہ گوارا نہیں تھا کہ مسلمانوں کی حفاظت کے لئے کوئی انتظام کیا جائے۔ "کانگریس کے پرانے لیڈر پٹیل اور راجندر پرشاد وغیرہ ہندو مہاسبھا کے لیڈر شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں کانگریسی نظریات کے مقابلے میں ہندو اکثریت کے مفادات کو پیش نظر رکھتے تھے وہ مسلمانوں کو پاکستان کے ہندوؤں کے بدلے میں یرغمال بنا کر رکھنا چاہتے تھے انھوں نے اس تجویز پر نہرو سے اختلاف کیا کہ مسلمانوں کے لئے کچھ محفوظ علاقے مخصوص کر دئے جائیں۔"[2] "پرشوتم داس ٹنڈن، پٹیل اور کچھ دوسرے لیڈروں نے نہرو کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ پاکستان سے صاف صاف یہ کہہ دیا جائے کہ وہاں سے جتنے ہندو ہندوستان میں آئیں گے ہم اتنے ہی مسلمان پاکستان میں ڈھکیل دیں گے۔"[3]

راجندر پرشاد بھی پٹیل کی طرح ایک معمولی درجے کے وکیل تھے۔ کانگریس میں دوسرے لیڈر بھی کانگریس میں آنے سے پہلے معمولی درجے کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے مگر پھر بھی

[1] انڈیا ونس فریڈم
[2] ایم جے اکبر، نہرو میکنگ آف انڈیا، ص ۴۴۳، بحوالہ گوپال بائیگرافی آف نہرو۔
[3] ایم جے اکبر، نہرو میکنگ آف انڈیا۔

ان میں بیشتر کی کچھ نہ کچھ حیثیت تو تھی ہی مگر ان دونوں کی تو ساری شخصیت از سرتا پا گاندھی جی ہی کی مرہونِ منت تھی۔ "راجندر پرشاد اپنی وکالت میں مشغول تھے۔ ان کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ مظہر الحق اور حسن امام وغیرہ کی موجودگی میں ان کی کوئی حیثیت ہو سکتی ہے۔ جب گاندھی جی بہار آئے تو انھوں نے دیکھا کہ صوبے کی سیاست مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، میں نے قابلِ اعتماد ذرائع سے سنا کہ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے بڑے بڑے ہندوؤں کو گاندھی جی سے ملایا ان لوگوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر لیڈر شپ ایک ہندو کو دے دی جائے تو بہار کے ہندو آپ کی نان کوآپریشن تحریک میں شریک ہو جائیں گے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ لیڈری تو میرے ہاتھ میں نہیں ہے کہ کسی کو تحفتاً دے دوں لیکن اگر کوئی قابل اور مخلص ہندو سامنے آئے تو میں اس کی مدد کروں گا۔ اس پر راجندر پرشاد کا نام پیش کیا گیا اور چند ہی سالوں میں وہ گاندھی جی کی کوششوں سے آل انڈیا لیڈر بن گئے"[1] انہی راجندر پرشاد نے (عین قتل و خون کے وقت)، ۱۸ ستمبر کو لکھا کہ مسلمانوں کو بچانے کے لیے ملٹری لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، اس سے حکومت ہندوؤں میں غیر مقبول ہو جائے گی"[2]

شرنارتھی ہندو اور سکھوں کی کیا شکایت کی جا سکتی تھی۔ یہاں تو حکومت، اس کے وزیر اور اعلیٰ ذمہ داران ہی مسلمانوں کو اکھاڑنے، بھگانے اور برباد کرنے کی سازشیں کر رہے تھے، ان حالات میں مسلمانوں کی حفاظت کی طرف سے بالکل ہی مایوسی ہو گئی۔ پنڈت جواہر لال، مولانا آزاد اور جمعیۃ علما نے یہ پروگرام بنایا کہ فوری طور پر کوئی پناہ گاہ اور رہائشی کیمپ مخصوص کر دیا جائے اور بعد میں مسلمانوں کو اپنے گھروں پر واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ پرانا قلعہ اور بعض دوسری جگہیں پناہ گزینوں کے لئے کیمپ مقرر ہوئے۔ وہاں کھلے میدان، کھنڈرات اور کوڑوں کے ڈھیر ان لوگوں کی پناہ گاہیں بنیں۔ ان میں بچے، بوڑھے، مریض، عورتیں، زچائیں، حاملائیں، عورت مرد سبھی یکجا تھے۔ دو ہی تین روز میں گندگی اور تعفن کا ایسا ماحول پیدا ہو گیا کہ اچھا بھلا آدمی چلا جائے تو بیمار ہو جائے۔ لوگ بیمار ہونے، سسکنے اور مرنے لگے۔

---

[1] انڈیا ونس فریڈم [2] نہرو میکنگ آف انڈیا، ص ۴۵۵

انھوں نے گڑگڑا کر درخواست کی کہ ہمیں ہمارے گھر نہیں بھیجا جا سکتا تو پاکستان ہی بھیج دیا جائے بہت سے ذمہ داران اسی انتظار میں تھے، فوراً اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کیا گیا، لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ان میں ٹھونسے گئے، اور آدھے تہے راستے میں قتل سے بچ گئے، وہ لٹے پٹے زخمی گھائل پاکستان پہنچ گئے۔

گاندھی جی کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو ان کی بات کی کوئی پروا نہیں رہ گئی تھی وہ بار بار پٹیل سے کہتے تھے کہ میں اپنی آنکھوں سے دلی کے مسلمانوں کی تباہی دیکھ رہا ہوں اور تم جو میرے اپنے آدمی ہو اور امن و امان کے ذمہ دار ہو، کوئی کارروائی نہیں کر رہے ہو۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو" انھوں نے سوچا کہ مسلمانوں پر حملوں کا کوئی جواز پیدا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ذمہ داروں کے سامنے انھوں نے یہ قصہ پیش کیا کہ مسلمانوں کے گھروں سے بڑے خطرناک ہتھیار برآمد ہوئے ہیں جو انھوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کے لئے جمع کئے تھے اگر ہندو اور سکھ ان پر حملہ نہ کردیتے تو مسلمان انھیں تباہ کردیتے۔ یہ ہتھیار یہاں برابر کے کمرے میں موجود ہیں، آپ لوگ چاہیں تو دیکھ لیں۔ ریلیف کمیٹی کے لوگوں نے ان ہتھیاروں کو دیکھا وہاں درجنوں سبزی کاٹنے کی باورچی خانے کی زنگ آلود چھریاں، قلم تراش چاقو، بغیر دستہ کی معمولی چھریاں، پائپ کے پرانے ٹکڑے اور لوہے کی سلاخیں رکھی تھیں جن کو سردار پٹیل خطرناک ہتھیار بتلا رہے تھے"[1]

ایک تو یہ صورت حال تھی دوسرے گاندھی جی اس پر مصر تھے کہ پاکستان کا پچپن کروڑ روپیہ اس کو بلا تاخیر ادا کرنا چاہیئے۔ وہ کہتے تھے کہ "یہ روپیہ روکنا غلط ہے، بے ایمانی ہے، اخلاق کے خلاف ہے اور بین الاقوامی وعدہ خلافی ہے"[2] جب بالکل ہی مایوسی ہوگئی تو انھوں نے اپنا آخری ہتھیار استعمال کیا اور ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کی صبح ۱۱ بجے یہ اعلان کردیا کہ جب تک مسلمانوں کے جان و مال کی ضمانت نہیں ہوتی اور ہندوستان پاکستان کے پچپن کروڑ روپئے ادا نہیں کرتا اور معاہدوں کی لفظ بہ لفظ پابندی نہیں کرتا اُس وقت تک میں برت نہیں کھولوں گا۔ یا

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۴۳ [2] آدھی رات کی آزادی، ص ۲۴۵

حالات ٹھیک ہوں گے یا میں اپنی جان دے دوں گا۔ اس خبر پر آر ایس ایس کے لاکھوں ممبر غصے سے بے قابو ہو گئے۔ پونہ میں ایک اخبار 'ہندو راشٹر' کے ایڈیٹر ناتھورام گوڈسے نے اپنی تقریر میں کہا گاندھی جی نے یقین دلایا تھا کہ ملک کے بٹوارے سے پہلے میرے جسم کا بھی بٹوارہ ہوگا۔ ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ گاندھی جی کا جسم صحیح سلامت ہے۔ ہندو شرنارتھی بھوکے مر رہے ہیں گاندھی جی کو مسلمانوں کی خدمت سے فرصت نہیں ہے۔ گاندھی کی اہنسا نے ہندوؤں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے ہیں۔ گدھ ہماری مادرِ وطن کا گوشت نوچ رہے ہیں۔ سرِعام ہندو عورتوں کی عزت لوٹی جا رہی ہے اور کانگریس کے ہیجڑے آنکھ کھول کر دیکھتے بھی نہیں۔ مادرِ وطن کب تک یہ ظلم برداشت کرے گی؟"[۱]

یہ نوجوان آر ایس ایس کے لیڈر ویر ساورکر کا پیرو تھا اور اس کے ساتھ ایک بڑی جماعت تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو تباہ کرنا اور ہندو قومیت کو ترقی دینا تھا۔ اس کے گروپ میں مدن لال پاہوا، ڈگمبر بگڑے، نارائن آپٹے وغیرہ شامل تھے۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کو بچانے اور پاکستان کی رقم کی ادائگی کے لئے قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تو ان لوگوں کے غیظ وغضب کی انتہا نہ رہی۔ گوڈسے نے آپٹے سے کہا "مسلمان قاتلوں اور عزت لوٹنے والوں کو ان کی رقم بلا شرط اور بغیر تاخیر دے دی جائے۔ اس کے لئے یہ بڈھا اپنی جان داؤ پر لگا رہا ہے یہ خالص بلیک میلنگ ہے۔ حیدر آباد میں چھاپے مارنے سے پہلے اور جناح کو مارنے سے پہلے اب ہمیں گاندھی کو ختم کرنا ہوگا۔ اپنی تمام طاقت اور اپنے تمام وسائل و اسباب ہمیں اب اس مقصد میں لگا دینے ہیں۔"[۲]

گاندھی جی کے برت نے یکایک پورے ملک کی آنکھیں کھول دیں۔ سیدھے سادے عوام تو پہلے بھی اس ہتیا چار میں دل سے شریک نہیں تھے مگر جیسے جیسے گاندھی جی کی حالت کمزور ہوتی گئی ویسے ہی ویسے وہ لوگ بھی جو ملک کی تقسیم اور شرنارتھیوں کی تباہی و بربادی کی وجہ سے فسادیوں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے پیچھے ہٹنے لگے۔ خود شرنارتھیوں کے گروپ اور جتھے

---

[۱] آدھی رات کی آزادی۔ ص ۲۴۲ [۲] ایضاً

کانگریس کے لیڈروں سے ملنے لگے کہ ہم سے جو چاہو وعدہ لے لو مگر گاندھی جی کی جان بچالو۔" حیرت کی بات یہ تھی کہ سب سے زیادہ ہمدردی پاکستان نے ظاہر کی۔ لاہور سے تار کے ذریعہ گاندھی جی کو اطلاع دی گئی کہ یہاں ہر آدمی کی زبان پر ایک ہی سوال ہے کہ گاندھی جی کی زندگی کیسے بچائی جائے۔ پاکستان کی ساری مسجدوں میں گاندھی جی کی زندگی کیلئے دعائیں کی جارہی ہیں۔"[1]

برت کے تیسرے دن پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعہ کے میدان میں لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں امن کی اپیل کی۔ گاندھی جی کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر ہم نے گاندھی جی کو کھو دیا تو ہم ہندوستان کی روح سے محروم ہو جائیں گے۔ مجمع نے نعرہ لگایا گاندھی جی امر رہیں۔ مہاتما گاندھی کی جے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا لوگوں کا سیلاب گاندھی جی سے ملنے کے لئے برلا ہاؤس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ مگر اسی ہندوستان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ہر حالت میں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا تھا اور انسانیت سے ہمدردی رکھنے والے مجرم گاندھی جی کو کسی حالت میں معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ "ہندوستان میں بہت لوگ ایسے تھے جن کو گاندھی جی سے ایسی نفرت تھی جتنی ساورکر کو تھی۔ اس سے ملنے کے لئے ساورکر سدن میں وہ لوگ آئے جن کی زبردست خواہش تھی کہ گاندھی جی مرجائیں اور وہی نہیں بلکہ اُن سے پہلے دو افراد اور بھی وہاں آچکے تھے۔ ناتھورام گوڈسے نارائن آپٹے اور ڈگمبر بگڑے سے پہلے وشنو کرکرے نے مدن لال پاہوا کو دیر ساورکر کے سامنے پیش کیا۔ یہ پنجابی نوجوان ہمارا بہت حوصلہ مند کارکن ہے، اس ملاقات کے بعد ڈگمبر بگڑے ہندو مہا سبھا کے عام مہمان خانے میں رات گزارنے چلا گیا۔"[2]

گاندھی جی کے برت پر سب سے زیادہ غصہ ولبھ بھائی پٹیل کو آیا۔ اس سے پہلے تک کوئی ایسی رکاوٹ نہیں پیش آئی تھی جو مسلمانوں کے قتل و بربادی کے راستے میں روڑا بن سکے گورنمنٹ کے سامنے ہندوؤں، سکھوں اور شرناتھیوں نیز پولیس اور فوج کے مظالم کی جو

---

[1] آدھی رات کی آزادی

[2] آدھی رات کی آزادی، ص ۲۵۵

بھی شکایت پیش کی جاتی تھی ان کو آسانی کے ساتھ ٹالا جاسکتا تھا۔" نہ صرف یہ کہ پٹیل مسلمانوں کی حفاظت میں ناکام رہے تھے بلکہ ان کے سامنے مظالم کی جو داستان پیش کی جاتی تھی ان کو وہ بڑی بے پروائی کے ساتھ ٹال جاتے تھے۔[1]

فوج، پولیس اور گورنمنٹ کی بیوروکریسی کانگریس کے ہاتھ میں اور کانگریس ولبھ بھائی پٹیل اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مگر گاندھی جی کے برت سے سارا کھیل ہی بگڑا جارہا تھا۔

"ایک طریقے سے یہ برت پٹیل کے طرز عمل کے خلاف ہو رہا تھا اور پٹیل اس کو جانتے تھے۔ برت کے پہلے دن میں (مولانا آزاد) جواہر لال اور پٹیل گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے دن پٹیل بمبئی جانے کے لئے تیار تھے اور گاندھی جی سے رسمی طور پر بات کرنے آئے تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ وہ بلا وجہ برت رکھ رہے ہیں اور اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔ ان کے اس برت سے سردار پٹیل کے خلاف الزام کا راستہ ہموار ہوگا۔ انھوں نے تلخ کلامی کے ساتھ کہا کہ گاندھی جی کے رویے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پٹیل ہی مسلمانوں کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ اس پر گاندھی جی نے اپنے مخصوص، پرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں کہا میں چین میں نہیں بلکہ دہلی ہی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے کان اور آنکھیں ابھی سلامت ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اور جو کچھ سن رہا ہوں اس پر اعتبار نہ کروں۔ اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے تو نہ میں آپ کو قائل کر سکتا ہوں نہ آپ مجھے۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں، وہ میرے گوشت پوست ہیں اور میں اُن کا۔ اگر وہ غصے میں اندھے ہو گئے ہیں تو میں ان کو کوئی الزام نہیں دیتا۔ مگر خود اپنی جان دے کر اس کا کفارہ ادا کروں گا۔ اس طرح مجھے امید ہے کہ میرا کفارہ سچائی کو پہچاننے کے لئے ان کی آنکھیں کھول دے گا۔ اس پر

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۳۵

پٹیل جھنجھلا کر گاندھی جی سے سختی اور درشتگی کے ساتھ بات کرنے لگے۔ گاندھی جی کے ساتھ ان کے اس برتاؤ پر جواہر لال کو اور مجھے بہت صدمہ ہوا اور ہم خاموش نہ رہ سکے۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے اُن سے کہا دلبھ بھائی! شاید تمھیں اندازہ نہ ہو لیکن ہمیں یہ بات بہت سختی سے محسوس ہو رہی ہے کہ تمھارا طرز کلام کس قدر توہین آمیز ہے اور تم نے گاندھی جی کو کس قدر تکلیف پہنچائی ہے۔ پٹیل ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر جانے لگے۔ میں نے ان کو روکا اور کہا تم اپنا پروگرام ملتوی کر دو۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت کیا ہو جائے۔ اس لئے جب تک گاندھی جی کا برت جاری ہے تم دلّی سے نہ جاؤ۔ پٹیل نے چیخ کر جواب دیا میرے ٹھہرنے سے کیا فائدہ؟ گاندھی جی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ ساری دنیا میں ہندوؤں کا منہ کالا کر کے رہیں گے۔ ان کے اس رویئے کے ساتھ میرا رکنا بے کار ہے، میں اپنا پروگرام نہیں بدل سکتا اور بمبئی ضرور جاؤں گا۔"[1]

بہر حال ہندوستان انہی لوگوں کا نام تو تھا نہیں۔ اور نہ گاندھی جی کی شخصیت اتنی غیر اہم اور سستی تھی کہ دو چار دس بیس آدمیوں کی بنیاد پر پورا ملک ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا۔ منٹ منٹ پر ان کی صحت کے بارے میں بلیٹین شائع ہو رہے تھے اور گھنٹے گھنٹے پر آل انڈیا ریڈیو انھیں اناؤنس کر رہا تھا۔ گاؤں گاؤں اور بستی بستی گاندھی جی کی جان بچاؤ کمیٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ ڈاک خانوں میں لفافوں، کارڈوں اور مراسلات پر مہریں لگ رہی تھیں "فرقہ وارانہ امن قائم رکھیں، گاندھی جی کی جان بچائیں"۔ جگہ جگہ پرارتھنا سبھائیں منعقد ہو رہی تھیں اور اس میں ان کی زندگی کے لئے دعائیں ہو رہی تھیں۔ مسجدوں میں دعائیں کی جا رہی تھیں۔ پورا ملک پیار محبت صلح و آشتی کی آواز پر اکٹھا ہو گیا تھا۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے، اُجڑے ہوئے شرنارتھی، بیوائیں، یتیم برلا ہاؤس کی طرف چل رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے "ہم بھی برت رکھیں گے۔ ہم بھی باپو کے ساتھ مریں گے"۔ آل انڈیا ریڈیو نے آخری بلیٹین شائع کیا "ہم ملک کو

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۲۵

بتادینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ آخری حد آگئی ہے جس کے بعد اگر برت جاری رہا تو وہ کسی بڑے المیے کی طرف جائے گا۔"

شام کو گاندھی جی کے سکریٹری پیارے لال نے اُن سے کہا کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے آپ کی شرطوں کو مان لیا ہے اور منظوری پر دستخط کردیے ہیں۔ سب لوگ امن وامان کا وعدہ اور عہد کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے پھر پوچھا "کیا ساری ہی جماعتوں نے دستخط کردیے ہیں، کوئی جماعت رہ تو نہیں گئی ہے؟" پیارے لال نے جواب دیا "دو جماعتیں ہندو مہا سبھا اور آر ایس ایس رہ گئی ہیں۔ وہ یقین دلاتی ہیں کہ کل تک دستخط کردیں گی۔ اب آپ برت توڑ دیجیے" "نہیں! ہرگز نہیں!" گاندھی جی نے جواب دیا "مجھے جلد بازی میں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں اس وقت تک برت نہیں توڑوں گا جب تک سب سے زیادہ سخت دل والے بھی نرم نہ ہوجائیں" فوراً ہندو مہا سبھا اور آر ایس ایس والے بلائے گئے۔ گاندھی جی اپنی دری پر بے ہوش پڑے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کو ہوش میں لایا گیا۔ ان کے چاروں طرف ہندوستان کے وزیر، پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین، اخباروں کے نمایندے، ہندوستان کے ہر قسم کے لیڈر جمع تھے۔ صرف ایک ولبھ بھائی پٹیل غیر حاضر تھے۔ پیارے لال نے اُن سے کہا سب جماعتوں کے دستخط ہوگئے ہیں۔ گاندھی جی نے کچھ کہا جو کسی کو سنائی نہیں دیا۔ ان کی پوتی منو نے اپنا کان اُن کے منہ سے لگادیا۔ وہ کہہ رہے تھے "میں صرف دلّی کے امن وامان سے مطمئن نہیں ہوں گا۔ میں یہ ضمانت چاہتا ہوں کہ سارے ہندوستان میں سُکھ، شانتی، بھائی چارہ اور رواداری ہو۔ ایک ایک کرکے سارے لیڈروں نے گھٹنے ٹیک کر عہد کیا کہ وہ سارے ہندوستان میں امن چین رکھیں گے۔ گاندھی جی نے کہا اب میں برت توڑنے کے لئے تیار ہوں۔ ایشور کی مرضی پوری ہی ہونی چاہیے۔ آیئے سب مل کر ایشور سے امن، سلامتی اور پریم و آشتی کے لئے پرارتھنا کریں۔

قرآن پاک کی آیتیں، گیتا کے اشلوک اور بائبل کے کلمات پڑھے گئے۔ مولانا آزاد نے جذبات سے بھرپور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سنترے کے رس کا گلاس گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگادیا۔ اور برت ختم ہوا۔ ایک اہم تاریخی واقعہ ذہن میں محفوظ کرلیجیے۔ برت کھولنے سے پہلے جب ساری ہی باتیں پوری ہوگئیں تو سب سے آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ جمعیۃ علماء کے مولانا صاحبان کہاں

ہیں۔ جمعیۃ کے ارکان مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید اور دوسرے بہت سے جنھوں نے روزانہ گاندھی جی کو پل پل کی رپورٹ دی تھی اور دلی کے قتل عام کے سارے ہی مناظر ان کو اپنی آنکھوں سے دکھلائے تھے، آگے آئے۔ گاندھی جی نے اُن سے پوچھا کر کیا آپ مطمئن ہیں اور برت ان کے اطمینان دلانے کے بعد ہی کھولا۔ اب تمام ملک میں امن وچین کی بارش ہوگئی، مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پاکستان کو اس کے حصے کے پچپن کروڑ روپے اور بقیہ سامان مل گیا، مرتے ہوئے لوگ جی گئے، اور گرے ہوئے انسان اٹھ پڑے۔ ڈرے سہمے عوام مطمئن ہو گئے۔ پورے ملک میں امن و آشتی اور بھائی چارے کی فضا پھیل گئی۔ گاندھی جی نے معجزہ کر دکھایا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ اس امن و انسانیت کے واپس آجانے سے ان کی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔

> "پٹیل خوش نہیں تھے، ان کا برتاؤ گاندھی جی کے ساتھ بہت خشک اور فارمل تھا، وہ گاندھی جی کے اس اقدام سے جس کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں میں امن کا احساس پیدا کر دیا تھا، پسند نہیں کرتے تھے۔ اس ذہنیت میں پٹیل اکیلے ہی نہیں تھے، ہندوؤں کی ایک جماعت اس وقت سے گاندھی جی کے خلاف ہوگئی تھی جب پونہ سے رہائی کے بعد انھوں نے جناح سے بات چیت کی تھی۔ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ کے زیر اثر ہندوؤں کی ایک جماعت صاف کہتی تھی کہ گاندھی جی ہندوؤں کی مخالفت میں مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا کی مخالفت کے لئے بھی ایک منظم گروپ تیار کیا تھا اور کہتے تھے کہ پرارتھنا سبھا میں ہم قرآن اور بائبل نہیں پڑھنے دیں گے۔"[1]

برت کے بعد جب گاندھی جی میں کسی قدر طاقت آگئی اور وہ اپنی سبھا میں آنے لگے تو ایک دن گاندھی جی کو گولی مارنے کے ارادے سے ڈگمبر بگڑے سبھا میں شریک ہو گیا مگر

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۷۹

عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اُدھر اسکیم کے مطابق پنجابی شرنارتھی مدن لال پاہوا نے بم کے فلیتے میں آگ لگا دی۔ دوسری طرف ناتھورام گوڈسے کا اشارہ پاکر گوپال گوڈسے نے اپنا دستی بم بھی پھینک دیا۔ اچانک دھماکے سے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور چیخ و پکار کی آوازیں فضا میں گونج گئیں۔ ایک عورت نے مدن لال کو فلیتہ جلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اُس نے اسے پکڑوا دیا۔ پولیس نے تحقیق کی تو اُس نے ساری تفصیل، سازش کا نقشہ، گوڈسے کے اخبار کا نام ساور کر سدن میں قیام اور میٹنگ وغیرہ سب کچھ بتلا دیا۔ مگر ناتھورام اور دوسرے ساتھیوں کے نام نہیں بتلائے یا شاید پولیس اور سی آئی ڈی نے ان کے نام جاننے نہیں چاہے۔ دلّی کے سی آئی ڈی افسر مسٹر ڈی جے سنجیوا اس قسم کی تحقیقات اپنے اسسٹنٹ مسٹر مہرا پر چھوڑ دیا کرتے تھے مگر اس بم کیس اور مدن لال پاہوا سے تفتیش کے معاملے کو انھوں نے خاص طور پر اپنے ہاتھ میں لیا اور مہرا کو فون کیا کہ مدن لال کے معاملے میں آپ پریشان نہ ہوں، یہ کیس میں خود دیکھ لوں گا۔ چنانچہ دلی سی آئی ڈی اور پولیس اس معاملے میں پریشان نہیں ہوئے۔ انھوں نے جتنی باتیں جان لی تھیں اُن سے وہ ناتھورام گوڈسے اور نارائن آپٹے تک پہنچ سکتے تھے اس کے باوجود پولیس نے جس طرح کام کیا اسے جان کر تیس سال گزرنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ جو ہوا وہ کیسے ہوا۔[1]

مدن لال سے دوبارہ تحقیقات ہوئی۔ اس بار اس نے کچھ نہیں چھپایا، سب کچھ صاف صاف بتا دیا مگر جس وقت سے ڈی جے سنجیوا نے کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا اُس وقت سے پولیس کی کارروائی میں اتنی ڈھیل ہو گئی تھی جو کسی حالت میں قابل معافی نہیں ہو سکتی۔ مدن کے بیان سے یقینی طور پر سارے آدمیوں کی شناخت ہو سکتی تھی۔ "غضب یہ کہ انھوں نے پونہ پولیس کو بھی فون نہیں کیا؟ ڈی آئی جی آف سی آئی ڈی پونہ کی فائلوں میں گوڈسے، آپٹے اور کرکرے کے بارے میں ساری معلومات اور ان کے فوٹو موجود تھے مگر سنجیوا اور رانا نے ایسی سرد مہری دکھائی جیسے وہ معاملے کو پوری سست رفتاری سے آگے بڑھانا

---

[1] آدھی رات کی آزادی، ص ۴۷۹

چاہتے تھے۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بمبئی کے تھانہ اسٹیشن پر وہ چاروں خفیہ طور پر ملے۔ ناتھورام گوڈسے نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا "گاندھی کو گولی میں ماروں گا۔ ایک شخص کو تو قربانی دینی ہی پڑے گی"۔ اس دن کے بعد گوڈسے اور آپٹے ہوائی جہاز سے گاندھی جی کو قتل کرنے کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو جب گاندھی پرار تھنا سبھا میں پہنچے تو ناتھورام نے اپنے پستول کی تین گولیاں اُن کے بیمار، کمزور اور لرزتے ہوئے جسم میں اُتار دیں۔ گاندھی جی نے ہاتھ جوڑ کر اُسے نمسکار کیا اور رام رام کرتے ہوئے بے جان ہو کر گر پڑے۔ جس دن اُن پر بم پھینکا گیا تھا اُسی دن ماؤنٹ بیٹن اور اُن کی بیوی نے بچ جانے پر مبارکباد دی تھی۔ گاندھی جی نے کہا مبارک باد؟ کس چیز کی مبارک باد؟ میں نے کون سا بڑا کام کیا ہے؟ مبارک باد کے قابل تو میں اُس دن ہوں گا جس دن قاتل مجھے گولی کا نشانہ بنادے اور میں اسے نمسکار کر کے دعا دیتا ہوا مر جاؤں اور اُسے معاف کر دوں، آج انھوں نے یہی کر کے دکھا دیا۔ اور آج اُن کی روح دنیا کی سب سے بڑی مبارک باد کی مستحق ہے۔ دو ہی چار روز کے بعد گاندھی جی دلّی سے پاکستان تک اور پھر پورے پاکستان کی، امن اور بھائی چارہ کا پیغام دینے کے واسطے پیدل یاترا کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور جناح صاحب نے انھیں پاکستان آنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

اس پورے افسانے میں ظلم و فسادات کی داستانوں میں جہاں ایک ایک لفظ دل ہلا دیتا ہے اور کلیجے کو دہلا دیتا ہے وہیں ایک حقیقت اور بڑی حقیقت اُمیدوں کی شمع بھی روشن کر رہی ہے اور گھور اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن بھی جھلملا رہی ہے۔ اُن تمام قاتلوں میں، درندوں میں، بھیڑیوں اور راکھشسوں میں جنھوں نے انسانیت کو قدموں تلے روندا ظلم اور بربریت کی تاریخ بنائی اور انسان کشی کا ریکارڈ قائم کیا، ایسے انسان بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ہندو ہو کر اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا اور مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی اور مسلمان ہوتے ہوئے اپنے سر ہتھیلی پر رکھے اور ہندوؤں کی جان بچائی۔ صحیح تعداد معلوم کی جائے تو یہ اُجالا نظر آئے گا کہ ملک میں ناتھوراموں، ساورکروں، مدن لالوں وغیرہ کی تعداد اتنی نہیں ہے جتنی نہروؤں، سُندر لالوں، سی آر داسوں، بھولا بھائی ڈیسائیوں

وغیرہ وغیرہ کی ہے۔ گاندھی جی کا قتل لاکھ دل شکن اور روح فرسا سہی مگر عیسیٰ مسیح تو صلیب ہی پر چڑھے ہوئے سجتے ہیں اور انسانیت کا رنگ حسین کے خون ہی سے نکھرتا ہے۔ اس غمناک موقع پر ہزاروں مرثیے لکھے گئے اور نظمیں تصنیف کی گئیں۔ ان سب میں علامہ اقبال سہیل کی نظم اپنے تاثر اور فن کے اعتبار سے نہایت ممتاز اور منفرد ہے۔ جی چاہتا ہے کہ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے یہ تاریخی فن پارہ بھی پیش کر دیا جائے۔

وہ حدیث روح پیام جاں جسے سُن کے ہم نے بھلا دیا
وہ حریم غیب کا ارمغاں جسے پا کے ہم نے گنوا دیا

وہ خمیدہ قد خم ماہ نو وہ نظر فریب خنک سی ضو
وہ نگاہِ برق عمل کی لو جسے حسرتوں نے بجھا دیا

اُسے اتباعِ مسیح نے وہ عجیب دشت شفا دیا
جو گرے تھے اُن کو اٹھا دیا جو مرے تھے اُن کو جلا دیا

وہ کتاب صلح کا سرورق کہ مٹائی کشمکشِ فرق
وہ قتیل خنجر صبر و حق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بدھ و کرشن کا جانشیں ہمہ تن عمل ہمہ تن یقیں
وہ تبسم سحر آفریں کہ چمن لبوں سے کھلا دیا

وہ برنگ آئینہ صاف دل وہ فروغ فطرت آب و گِل
کہ جہادِ نفس نے متصل اُسے اور حُسن جلا دیا

وہ جلال شیوۂ سادگی وہ جمال صورت زندگی
وہ زلال چشمۂ آگہی کہ زمانے بھر کو جگا دیا

تری شان کون گھٹا سکے اُسے خود خدا نے بڑھا دیا
کہ تجھے بقائے دوام دی تجھے منصبِ شُہدا دیا

جو اُٹھا تھا شعلۂ شور و شر اُسے اپنے خوں سے بجھا دیا
جو پڑا تھا پردہ نگاہوں پر اُسے آپ اُٹھ کے اُٹھا دیا

تری خامشی وہ زبان تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا
تنِ فاقہ کش میں وہ جان تھی کہ حصارِ کبر ہلا دیا
وطنِ عزیز کو شان دی اسے قیدِ غم سے چھڑا دیا
رہِ اتحاد میں جان دی، جو کہا وہ کر کے دکھا دیا
یہ عروسِ کشورِ ہند تھی ہمہ بے کسی ہمہ بے دلی
اُسے تونے غازۂ خرّمی ترے خوں نے رنگ حنا دیا
تجھے مسجدوں نے صدائیں دیں کہ ترے کرم سے اماں ملی
تجھے مندروں نے دعائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا
یہ کمال پیرویٔ علی یہ فراخ حوصلگی تری
کہ خود اپنے دشمن جاں کو بھی وہی ارمغان دُعا دیا
تجھے بے کسی نے پناہ دی تجھے مشکلات نے راہ دی
تجھے بجلیوں نے پناہ دی تجھے تلخیوں نے مزا دیا
یہی دھرم ہے یہی اصل دیں کہ ہو قول سچ تو عمل سہیں
حق و اہلِ حق پہ رہے یقیں یہ پیام سب کو سُنا دیا
ہمہ روشنی تری ذات تھی ہمہ سوز تیری حیات تھی
تری روح شمع تھی گل ہوئی ترے تن کو پھول بنا دیا
ترا فیض دہر میں عام ہو یہ غبار اُٹھ کے غمام ہو
تری خاک تیرا پیام ہو یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا

تاریخی اور لافانی کردار

اس حقیقت سے پردہ کبھی نہیں اُٹھ سکے گا کہ اس بٹوارے کے مظالم میں کتنے معصوموں کی جانیں تباہ ہوئیں۔ اتنی بڑی ہجرت کے نتیجے میں ان اعداد و شمار کے سارے ذرائع ختم ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ دس لاکھ انسان قتل کئے گئے، مگر جن لوگوں نے صحیح اعداد و شمار حاصل کرنے کی امکانی کوشش کی ہے ان میں سے کسی نے اتنی بڑی تعداد کا نام نہیں لیا۔ جی ڈی کھوسلہ چار سے پانچ لاکھ قتل بتلاتے ہیں۔ آئن اسٹیفن کے نزدیک پانچ لاکھ انسان مارے گئے ہیں۔ ہمفرے ٹریولین صرف دو لاکھ پچاس ہزار مقتول بتلاتے ہیں۔ پنجاب کے پہلے گورنر چندو لال ترویدی دو لاکھ پچاس ہزار انسانوں کا قتل شمار کرتے ہیں۔ ان سب اعداد و شمار میں غالباً سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تعداد پنڈرل لون نے بتلائی ہے جو دو لاکھ ہے[1]۔ ایک تخمینہ یہ بھی ہے کہ پانچ لاکھ انسان مارے گئے اور ایک کروڑ افراد بے گھر، بے در اور بے آسرا ہوگئے[2]۔ یہ قتل و غارت گری تو فقط افتتاحی تقریب کے وقت کی ہے۔ اس کے بعد سے آج پینتالیس برس تک ہندو مسلمان، بنگالی، پنجابی، سندھی، مہاجر، پٹھان اور بہاری وغیرہ وغیرہ کے نام سے جو خونخواری اور درندگی جاری ہے اس کے اعداد و شمار بھی جمع کر لئے جائیں تو دو چار لاکھ کی تعداد اس خانے میں بھی آئے گی۔ کم و بیش ایک ملین آدمیوں کے خون اور جان کی تباہی اسی فرقہ پرستی، نفرت اور عداوت کا نتیجہ تھی جس کی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مخالفت کی تھی۔ اب حضرت کم و بیش پچھتر برس کے ہوگئے تھے، اس کے ساتھ ہی ابتدائے عمر سے لے کر آج تک کی مسلسل اور انتھک جدوجہد نے جسم و جان کو پارہ پارہ اور ہڈیوں کو پگھلا دیا تھا۔ گذشتہ دس سال سے ملک اور ملت کی بے راہ روی اور تقسیم کے ساتھ انسانیت

---

[1] ماؤنٹ بیٹن، ص ۲۴۷ [2] ایم جے اکبر، رائٹ آفٹر رائٹ، ص ۲۰

کی قتل گاہ نے بالکل ہی خستہ و شکستہ کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ حیات مستعار کے دن بھی بس گنے چنے ہی رہ گئے تھے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھہر کر دم لینے اور کہیں بیٹھ کر سانس لینے کا شدید اور طبعی تقاضہ قدم قدم پر راستہ روکتا تھا۔ مگر اچانک ظلم اور وحشت کا یہ حملہ ہوا تو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر جوان عزم و ہمت کے ساتھ حضرتؒ نے ایک نئی جد و جہد کا آغاز کر دیا۔ ہندوستانی مسلمان اس وقت موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ سہارے ٹوٹ چکے تھے اور بھروسے دغا دے گئے تھے۔ گورنمنٹ میں جہاں کچھ لوگ ان کی پشت پناہی کے حق میں تھے وہیں بہت سے ان کو فنا کرنے کی تدبیریں بھی سوچ رہے تھے۔ شرنارتھیوں اور فسادیوں کا ریلا پنجاب سے طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا تھا۔ آر ایس ایس اور جن سنگھ کے جتھے اس کے استقبال کے لئے اور شعلوں کو ہوا دینے کے لئے قدم قدم پر تیار بیٹھے تھے۔ سہارن پور پنجاب کی طرف سے صوبہ یوپی کا پہلا ضلع تھا۔ یہاں اسٹیشن سے لے کر شہر تک چپے چپے پر لٹے پٹے اور جذبۂ انتقام سے بھرپور شرنارتھی بھرے پڑے تھے۔ ماحول بالکل تیار تھا کہ یہاں بھی مشرقی پنجاب کا تجربہ دُہرایا جائے۔ یہاں اگر مسلمان اجڑ جاتے تو پورے صوبے میں ان کے قدم اکھڑ جاتے۔ ٹھیک یہی پوزیشن دلّی کی بھی تھی۔ یہاں مسلمانوں کے جمے رہنے کا مطلب پورے ہندوستان میں اُن کی بقاء اور ثابت قدمی تھی۔ اگر وہاں سے مسلمان اُکھڑ جاتے تو پھر پورے ملک میں انھیں پناہ نہ ملتی اور یہی مخالفین کا پروگرام تھا۔ ایسے نازک وقت میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حکمتِ عملی اور عزم جواں نے ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو حوصلہ دیا اور دلوں کو عزت نفس اور شوق شہادت سے معمور کر دیا۔ سراسیمہ و حیران مسلمانوں نے اپنے وطن میں ثابت قدم رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ جو ہجرت کے لئے تیار تھے انھوں نے بستر کھول دئے، جو لوگ سواریوں کا انتظار کر رہے تھے وہ گھروں کو لوٹ آئے اور پورے عزم و ارادے کے ساتھ ہر ہر شہر میں۔ دلی اور سہارن پور میں اہم مقامات اور محلوں کے ناکوں پر دیوار بن کر ڈٹ گئے۔

آمد و رفت کے وسائل معدوم تھے، راستے مسدود تھے، قدم قدم پر حملوں اور غارتگری کے خطرات تھے، مگر ہر رکاوٹ کو نظر انداز کر کے اُسی آگ کی بارش سے گزر کر حضرتؒ دیوبند

سے دلی پہنچے۔ پنڈت جواہرلال اور گاندھی جی نے اس پر نہایت اندیشے اور قلق کا اظہار کیا کہ ایسے حالات میں آپ بلا کسی حفاظتی انتظام کے تشریف لائے۔ آیندہ کے لئے براہ کرم جب بھی سفر کرنا ہو تو اطلاع کرادیں تاکہ سرکاری فوجی ٹرک لانے اور پھر واپس پہنچانے کے لئے پہنچ جایا کرے۔[1]

حضرتؒ نے جمیعۃ علماء کے بچے کھچے ساتھیوں اور رہنماؤں، مولینا حفظ الرحمن، مولینا احمد سعید، مولینا ابوالکلام آزاد، مولینا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولینا محمد میاں صاحب رحمہم اللہ کو جمع کیا اور اپنی نئی جدوجہد اور نیا پروگرام ان کے سامنے رکھا۔ اور اس طرح پوری جماعت اپنی جان ہتھیلیوں پر لئے ہوئے اللہ پر بھروسہ کرکے ایک نئے سفر پر گامزن ہوگئی۔ عام حالات میں حضرتؒ کے مزاج میں اس قدر تواضع اور فروتنی تھی کہ بہت سے خدام، مریدین، مسترشدین اور تلامذہ حضرت کے اس مزاج اور برتاؤ سے ناجائز فائدہ اٹھالیتے تھے اور عجب نفس نیز بر خود غلط فہمی میں مبتلا ہوجایا کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھی مخصوص حالات میں یہ تواضع اور منکسر مزاجی اسی درجے کے وقار، رعب اور دبدبہ میں تبدیل ہوجایا کرتی تھی۔ تقسیم کے بعد غیر منصفانہ رویوں پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت کا یہی معمول ہوگیا تھا۔ جو بات کرتے دلائل و شواہد کے ساتھ اور جو اقدام کرتے تھے فیصلہ کن انداز میں کرتے تھے۔ سہارن پور اور دلی کے بارے میں پنڈت جواہرلال اور پنڈت گوبند ولبھ پنت وزیر اعلیٰ یوپی سے حضرت نے اسی فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ حکومت چاہے اور مسلمانوں کی حفاظت کا اور امن و امان کا انتظام نہ ہو اگر آپ لوگ کوئی انتظام نہیں کرسکتے تو مجھ سے صاف صاف کہہ دیجئے۔ میں ان کی حفاظت اور زندگی کے انتظامات خود کرلوں گا۔

> "۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران آپ نے پنڈت پنت وزیر اعلیٰ یوپی سے سخت غضب ناک لہجے میں باز پرس کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہیں تو دارالعلوم کی حفاظت کے لئے فوج بھیج دی جائے۔ اس پر حضرت مدنی نے سخت غصے میں فرمایا کہ دارالعلوم تو

---

[1] مولینا زکریا شیخ الحدیث آپ بیتی نمبر ۵ ص ۲۲

خدا کا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ آپ سہارن پور کی خبر لیجئے۔ اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارے میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا شبہ ہے تو مجھے اجازت دیجئے، میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کریں۔[1]

افہام و تفہیم، انتظار و برداشت اور اتمام حجت کے بعد جب حضرت اس درجہ پر پہنچ جاتے تھے تو اس کا نظر انداز کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ وزیر اعلیٰ نے بلا کسی تاخیر کے سہارن پور کے کلکٹر کا تبادلہ کیا اور معلوم نہیں کہاں سے ایک کلکٹر رامیشور دیال کو فون کر کے بلایا کہ وہ سہارن پور کا چارج لے۔ رامیشور دیال دیکھنے میں بالکل عامی معمولی اور گاؤں کا کسان معلوم ہوتا تھا۔ ٹخنوں کو چھوتی ہوئی دھوتی، سفید کھدر کا لمبا کوٹ، سر پر پگڑی اور پاؤں میں ہندوستانی جوتے، یہ اس کا حلیہ تھا۔ اُس نے وزیر اعلیٰ سے کہا کہ سہارن پور کا انتظام معمولی بات نہیں ہے۔ وہاں ساٹھ ہزار خانماں برباد شرنارتھی پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے دل و دماغ اور جسم زخموں اور صدمات سے چور ہیں۔ ایسے میں موقع پرستوں کی بن آئی ہے۔ وہ جھوٹ اور سچ اتہامات لگا کر، قصے گڑھ کر اور افسانے بنا کر شرنارتھیوں کو بھی استعمال کر رہے ہیں اور حکومت سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر آپ مجھے بھیجنا ہی چاہتے ہیں تو میں ایک بات کا اطمینان چاہتا ہوں۔ میرے کاموں میں اور اقدامات میں دخل نہ دیا جائے۔ کسی کانگریسی یا غیر کانگریسی نیتا اور لیڈر کی کوئی بات میرے خلاف سنی نہیں جائے گی اور اگر میں کسی نیتا کو بند کر دوں گا تو مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔ اس یقین دہانی کے بعد وہ سہارن پور آئے اور ایک ہفتہ کے اندر اندر قتل و غارت گری کا وہ سیلاب جو پاکستان اور مشرقی پنجاب سے چڑھا ہوا آرہا تھا سہارن پور پہنچ کر رک گیا اور مسلمانوں کے قدم جم گئے، جیسا کہ گزر چکا ہے دلّی کے لئے حضرت پہلے ہی جمعیۃ علماء کے ذمہ داران کے ساتھ میٹنگ کر کے قیام امن کا نقشہ بنا چکے تھے۔ ۴، ستمبر ۱۹۴۷ء کو شاہجہانی مسجد فتحپوری میں عین نماز کے وقت بم کا گولہ پھٹا، مسلمانوں کی سراسیمگی اور دہشت آخری حدوں تک پہنچ گئی۔ مگر جمعیۃ علماء کے ذمہ داروں،

---

[1] حکایت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، ماخوذ از شیخ الاسلام۔ ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں وغیرہ نے اس کے فوراً بعد والی نماز میں پورے اطمینان، توکل علی اللہ اور وقار کے ساتھ جماعت کی نماز قائم کی۔ اگر یہ ایک جماعت قضا ہو جاتی تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مسجد کو پھر اذان کی آواز نصیب ہوتی یا نہیں؟ حضرت رحمۃ اللہ اور ان کے متبعین جمعیۃ علماء ہند کے علمائے کرام جو کچھ کرتے تھے محض اخلاص، ادائیگی فرض اور رضائے باری تعالیٰ کے لئے کرتے تھے۔ اپنے کاموں اور سرفروشیوں کے لئے آسانیوں موٹروں، گاڑیوں اور ساز و سامان کی بات تو بہت بڑی تھی، ان اللہ کے بندوں کے پاس تو رہنے کے لئے قاعدے کے گھر بھی نہیں تھے۔ بڑھاپے، کمزوری اور بے سرو سامانی کی حالت میں مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید، مولانا لقاء اللہ پانی پتی، مفتی عتیق الرحمٰن اور انبالہ کے عبدالغفار خاں وغیرہ وغیرہ دلی کے گلی کوچوں میں جان ہتھیلیوں پر رکھے مارے مارے پھرتے تھے اور جہاں بھی حملوں اور فسادات کا اندیشہ نظر آتا تھا بلا خوف و خطر مردانہ وار آگ کے شعلوں میں کود جاتے تھے، فسادیوں اور قاتلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارتے تھے، مسلمان فدا کاروں اور جماعتوں کی مورچہ بندی کراتے تھے اور حکومت کا گریبان پکڑ کر قیام امن کی کارروائیوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس وقت دلی کے کمشنر صاحبزادہ خورشید احمد خاں نبیرۂ صاحبزادۂ آفتاب احمد خاں تھے، مگر مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت اور حدودِ اختیارات صفر کے برابر تھے۔ ان کا نائب ایک سکھ رندھاوا تھا۔ وہ پکا فرقہ پرست اور ولبھ بھائی پٹیل کا دست راست تھا۔ ایک دن مولانا حفظ الرحمٰن نے اس سے صورت حال کی وضاحت کی اور کہا کہ دلی ایڈمنسٹریشن کا یہ طرز عمل مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور کانگریس کے نظریات اور پالیسیوں کے بالکل خلاف ہے۔ اس نے پوری صفائی کے ساتھ جواب دیا "ہمارا تعلق سردار پٹیل سے ہے اور وہ ہمارے طرز عمل سے بالکل مطمئن ہیں"[1]۔ ایک طرف تو حضرت نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو دلی میں جمانے اور برقرار رکھنے کے لئے دن و رات ایک کر دئے۔ اور دوسری طرف پورے ملک میں مسلمانوں کا حوصلہ برقرار رکھنے، ان میں خود اعتمادی

---

[1] مولانا محمد میاں ماخوذ از الجمعیۃ مجاہد ملت نمبر

عزم و ہمت بیدار کرنے میں راتوں کی نیند اور دن کا آرام قربان کر دیا۔ راتیں سجدہ ریزی اور الحاح وزاری میں اور دن ملک کے گوشے گوشے کی جادہ پیمائی اور بے قراری کی نذر ہو گئے۔ میوات کا علاقہ دلی سے بالکل متصل ہے۔ وہاں بھی فسادیوں کی یلغار خطرے کی حد تک پہنچ گئی تھی مگر مسلمانوں نے ہمت کی اور اپنا وطن چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جمعیۃ علماء نے وہاں گھاسیڑہ کے مقام پر ان کا مورال اونچا کرنے اور حوصلہ برقرار رکھنے کی غرض سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا اس میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو بھی شریک کیا گیا اور گاندھی جی کی آمد کا خاص اہتمام کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے تو کچھ قابل اطمینان باتیں نہیں کیں مگر گاندھی جی نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ میواتی بھارت کی ریڑھ کی ہڈی اور ملک کا گاڑھا خون ہیں۔ میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وطن کا گاڑھا خون اس کے بدن سے نکال دیا جائے۔ گاندھی جی نے اپنے خاص ورکروں کو اس علاقے میں صلح و آشتی اور امن و تحفظ کے کام پر مقرر کیا۔ ونوبا بھاوے نے اس علاقے کے دورے کئے اور جو مسلمان خوف و دہشت کی وجہ سے ہندو ہو گئے تھے انہیں از سر نو مسلمان کیا اور ان کی چوٹیاں کٹوائیں۔[1]

جمعیۃ علماء نے ہندوستان کے مشہور مزارات اور درگاہوں کی حفاظت اور رونق بڑھانے کے لئے مخصوص اور مہتم بالشان انتظامات کئے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سرہند شریف اور اس سے ملحقہ بستی بسی پٹھانان ریاست پٹیالہ میں واقع تھی۔ اس ریاست نے مسلمانوں کی تباہی و ہلاکت کے لئے جو رول ادا کیا اس کا ہلکا سا تذکرہ گذشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔ جمعیۃ علماء نے بار بار ذمہ دار اور شیر دل علماء کرام کے وفود سرہند شریف بھیجے۔ اور وہاں کے رہنے والوں خدام اور سجادہ نشین صاحب کی ہر ممکن خدمت اور ہمت افزائی کی۔ چنانچہ وہ درگاہ آج بھی آباد اور سرسبز و شاداب ہے۔ اجمیر شریف چاروں طرف سے ہندوؤں سے گھرا ہوا تھا۔ وہاں پر دہشت گردی اور خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ مسلمان بھاری تعداد میں روز بروز پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ جمعیۃ علماء نے عین وقت پر اپنی پوری طاقت حضرت خواجہ غریب نواز کے آستانے کی

---

[1] الجمعیۃ: مجاہد ملت نمبر

طرف مرکوز کردی۔ اور وہاں کے باشندوں اور خدام کی ہمت اور حوصلہ افزائی کے ساتھ ہر قسم کی کمک پہنچائی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسلک دیوبند کے مقتدا، اور جماعت اہل سنت کے امام تھے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ درگاہ کی زیارت کے لئے شدِّ رحال فرماتے مگر کسی سفر سے واپسی میں بر سر راہ اجمیر شریف میں قیام فرمایا اور درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں کے ضابطوں اور روایات کے مطابق وہاں کے خدام نے حضرت کے سر مبارک پر دستارِ خلافت باندھی۔ اس حاضری کا بہت گہرا اور دیرپا فائدہ ہوا آج وہاں کے فیوض و برکات دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ جاری و ساری ہیں۔ دلّی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہٗ کی درگاہ ایسے خطرے میں گھر گئی تھی کہ ذرا غفلت ہو جاتی تو یہ عظیم الشان خانقاہ ہمیشہ کے لئے سطح زمین سے نیست و نابود ہو جاتی۔ قصبہ مہرولی جہاں یہ درگاہ واقع ہے وہاں ایک مسلمان بھی باقی نہیں رہا تھا۔ خاص درگاہ اور خانقاہ میں ہزاروں شرنارتھی قبضہ کئے پڑے تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور دلّی ایڈمنسٹریشن نے بار بار توجہ دلانے کے باوجود کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ آخر میں گاندھی جی کے سامنے پوری صورت حال رکھی گئی اور انھوں نے برت توڑنے کی شرطوں میں یہ شرط بھی رکھی کہ قطب صاحب کی درگاہ مکمل طور پر خالی اور آباد کرائی جائے۔ چنانچہ وہ واگزار ہوئی۔ اس کے فوراً بعد جمعیۃ علماء نے وہاں کے عرس کا انتظام کیا اور زیادہ سے زیادہ زائرین کی حاضری کا اہتمام کیا اور گاندھی جی کی وہاں حاضری کا اعلان کیا۔ اس موقع پر ایک لطیفہ پیش آیا۔ گاندھی جی اپنی پوتیوں منو اور آبھا کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر چلا کرتے تھے۔ اسی حالت میں حجرے کے دروازے پر پہنچے۔ تو مزار کے دربانوں نے لڑکیوں کے داخلے پر اعتراض کیا۔ مولانا احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ نے دیکھا کہ مہینوں کے انتظامات، دن رات کی تگ و دو اور ہزار ہا روپیوں کے اخراجات کے بعد اب جبکہ صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں تو ذرا سی بات کے لئے سارا کھیل بگڑا جا رہا ہے، جلدی سے آگے بڑھے اور حاجبوں سے فرمایا کہ آپ لوگ کیسے روک رہے ہیں۔ ارے یہ تو گاندھی جی کی بیساکھیاں ہیں جن کے بغیر وہ چل ہی نہیں سکتے۔ المحذوراتُ تُباحُ عند الضرورات۔ مولانا کی شکل و شمائل کا رعب داب، دل میں اتر جانے والا اسلوب کلام، اور ماحول کی سحر آفرینی، جب تک وہ لوگ سنبھلیں اور غور کریں مجمع آگے بڑھ گیا اور گاندھی جی مع اپنی بیساکھیوں کے مزار

پر حاضر ہو گئے۔ اس عرس کے انعقاد، گاندھی جی کی اس میں شرکت اور اس کے نتیجے میں درگاہ کی بازیابی کے اطمینان بخش اثرات دلّی پر تو مرتب ہوتے ہی ساتھ ہی سارے ہندوستان پر صلح و آشتی کی لہریں موجزن ہو گئیں۔ ہر چند کہ درگاہوں، مزاروں، عرسوں اور رسمی فاتحوں کے لئے انتظامات، اہتمام اور شرکت حضرت رحمۃ اللہ علیہ، جماعت دیوبند اور مسلک کے خلاف ہے مگر اس وقت مسئلہ ان درگاہوں، محرم کے جلسوں اور تعزیوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے استقرار اور استقلال کا تھا جس کے لئے ان بزرگوں نے سارے جزوی اختلافات ایک طرف رکھ دئے تھے۔

ذرا سانس لینے کا موقع ملا تو جمعیۃ علماء نے لکھنؤ میں ایک آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع اس سے پہلے شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ یہی وہ کانفرنس تھی جس کے بعد ہندوستان کے افق پر مسلمانوں کے عزائم، ارادوں اور جسارت و عزیمت کا پرچم بلند ہوا۔ اس میں جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمن صاحب نے فرمایا:

> "مسلمان ناانصافی اور ناحق بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ خوف و ہراس، بزدلی اور کم ہمتی کو دل سے نکال دو اور یہاں عہد کر کے جاؤ کہ ہر ظلم اور ہر ناانصافی کا ڈٹ کر مقابلہ کرو گے۔ ہم نے جس طرح مسلم فرقہ واریت کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح جن سنگھ، ہندو مہاسبھا، آر ایس ایس اور ہندو فرقہ واریت کو بھی پیروں سے کچل کر دم لیں گے۔ کانگریس اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ ضمیر کی فضا اور ملک کی یکجہتی کے لئے اپنی آخری کوششیں صرف کر دے۔"[1]

مولانا حفظ الرحمن صاحب کو حق تعالیٰ نے ایک امتیازی صفت یہ بھی عطا فرمائی تھی کہ مسائل پر ان کے تجزیئے اور دلائل کو رد کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ان کی تقریر اور بحث کے مقابلے میں بڑے سے بڑے مقابل کو قائل اور ساکت ہونا پڑتا تھا۔ اس وصف کے ساتھ

---

[1] الجمعیۃ مجاہد ملت نمبر، ص ۲۳۶

اخلاص، جرأت، ذہانت اور علم بھی قدرت نے وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا۔ ایسا انسان مخالفین کے لئے دو دھاری تلوار ثابت ہوتا ہے۔ مولینا موصوف کے ساتھ مولینا احمد سعید صاحب کی رہنمائی بھی شامل تھی۔ وہ سحبان الہند مشہور تھے، ان کی زبان بیان اور پیرایۂ اظہار میں جو مٹھاس، شگفتگی اور دل نوازی تھی وہ تو اپنی جگہ پر تھی اس وقت مستزاد یہ تھا کہ ان کا دل دُکھا ہوا اور جذبات اور احساسات مجروح تھے۔ جب وہ دلی ایڈمنسٹریشن کی زیادتیوں اور مسلمانوں کی حالت زار کا تذکرہ کرتے تھے تو سننے والوں کو ضبط کا یارا نہ رہتا تھا۔ گاندھی جی بڑے اہتمام سے روزانہ ان کی رپورٹیں اور مشاہدات سنتے تھے۔ اور اس معاملے میں ان کے علاوہ کسی کا اعتبار نہ کرتے تھے۔ تاریخ کے صفحات اس کی گواہی دیں گے کہ یہ انھی نیشنلسٹ مسلمانوں کا دل گردہ تھا، حضرت رحمۃ اللہ اور ان کی جماعت کی سرفروشی تھی اور جمعیۃ علماء کی فہم و فراست اور عظمت و عزیمت تھی کہ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال، چودھری برہم پرکاش، برج موہن، شریمتی سبھدرا جوشی، مس مردولا سارا بائی اور سیکڑوں دوسرے منصف مزاج اور سیکولر مزاج والے کانگریسی مسلمانوں کی آبادی اور حفاظت کے لئے جی جان سے تیار ہو گئے تھے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمان ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے تھے مگر چند اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنھوں نے سر سے کفن باندھ کر اپنے قدموں اور عزائم کو ثابت و قائم رکھا۔

مولینا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے دہلی میں عارضی قیام اختیار کیا اور لدھیانہ میں اپنے مکان کی بازیابی کا مطالبہ جاری رکھا۔ جلد یا بدیر ان کا مکان واپس ملا اور کئی مسجدیں خالی کرائی گئیں اور اس طرح مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی آبادکاری دوبارہ شروع ہوئی۔ مولینا ثناء اللہ صاحب عثمانی پانی پت میں بلاخوف و ہراس قائم و دائم رہے اور کسی قیمت پر پانی پت چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ آج وہاں مسلمان موجود ہیں۔ عبدالغفار خاں صاحب پوری بے خوفی اور عزیمت کے ساتھ انبالہ میں مقیم رہے اور ہر قسم کی مشکلات اور خطرات کو اپنی جان پر جھیل کر مسلمانوں کا استحقاق ثابت کیا۔ آج وہاں دوسروں کے ساتھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ میوات میں وہاں کی ریاستوں بھرت پور، الور اور خاص جماعتوں نے طے کر لیا تھا کہ ایک ایک مسلمان کو اکھاڑ پھینکیں گے۔ مگر جمعیۃ علماء نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا کر انھیں وہاں ثابت قدم رکھا۔ حضرت

نے اس بڑھاپے، ضعف اور عمر کے آخری حصّے میں اپنی طاقت اور ہمت کی آخری رمق اس کارِ عظیم کے لئے قربان کردی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق اور حیثیت کمزور نہ ہونے پائے۔

دلّی میں جماعت تبلیغ کا مرکز واقع ہے جہاں ہزاروں مبلغین ہر لمحہ موجود رہتے تھے اور وہیں نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے دلی کے اُجڑے ہوئے مہاجرین کے قافلے اسپیشل ٹرینوں کے ذریعے روزانہ پاکستان کے لئے یا راستے میں شہید ہونے کے لئے روانہ ہوا کرتے تھے۔ بہت سے مخلص اور با اثر لوگ جماعت کے امیر مولانا محمد یوسف صاحب پر زور دیتے تھے کہ اپنی جماعت کے ساتھ پاکستان روانہ ہوجائیں۔ یہ واقعات مولانا ذکریا صاحب کی زبان میں زیادہ دلچسپ ہیں :

"یہ مسئلہ بھی تین چار ماہ تک بہت ہی معرکۃ الآراء رہا کہ پاکستان جانے والے احباب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر بہت ہی شدید اصرار کرتے تھے۔ بعض اکابر تو روزانہ پچیس تیس ہوائی جہاز کے ٹکٹ لے کر آتے تھے کہ مولانا محمد یوسف کو مع ان کے گھر والوں کے لے کر جائیں۔ ان کا اصرار تھا کہ مسلمان بکثرت وہاں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس لئے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا وہاں جانا ان کی دینی اصلاح کے لئے بہت ضروری ہے۔ نیز اس وقت یہاں کی جو متزلزل حالت تھی اور یوپی اور دہلی کا جو انخلاء ہو رہا تھا اس کی وجہ سے یہاں دینی کام کی اُمیدیں کم معلوم ہوتی ہیں۔ مگر حضرت مولانا یوسف صاحب کا ایک ہی جواب تھا کہ اگر بھائی جی (مولانا ذکریا صاحب) تشریف لے جاویں گے تو میں بھی جاؤں گا ورنہ نہیں۔"[۵]

تبلیغی جماعت کے اس مرکز سے ہندوستان اور دلّی میں رہ جانے والے مسلمانوں کو بڑی ڈھارس اور تقویت تھی۔ اگر اس وقت مولانا محمد یوسف صاحب رختِ سفر باندھ لیتے تو لاکھوں مسلمان چشم زدن میں دلّی اور یوپی سے اُکھڑ جاتے۔

اپنے وقت کے مشہور بزرگ حضرت مولانا عبد القادر صاحبؒ رائے پور ضلع سہارنپور میں دریائے جمنا کے قریب نہر جمن مشرقی کے کنارے اپنی خانقاہ میں رونق افروز تھے، آس پاس کی

---

۵ آپ بیتی، مولانا ذکریا صاحب نمبر ۵، ص ۱۹

صدہا بستیوں کے ہزاروں مسلمان آپ کے مرید اور معتقد تھے' خانقاہ میں رات دن سیکڑوں سالکین اور زاہدین کا مجمع رہتا تھا۔ جمنا کے ایک کنارے پر مشرقی پنجاب تھا جہاں سے مسلمانوں کا صفایا ہوچکا تھا۔ دوسرے کنارے پر ضلع سہارن پور کی سرحد تھی جہاں مسلمان کثیر تعداد میں آباد تھے اور اسی خانقاہ سے اپنے حوصلوں' عزائم اور ہمت کے لئے طاقت اور غذا حاصل کرتے تھے۔ مولینا عبدالقادر اصلاً مغربی پنجاب ہی کے رہنے والے تھے اور اپنے پیر و مرشد مولینا عبدالرحیم صاحب کے بعد ان کی گدی نشینی کی وجہ سے رائے پور میں رہ رہے تھے۔ ان کے مریدین میں بڑی تعداد مشرقی اور مغربی پنجاب کے لوگوں پر مشتمل تھی جو ہر ہر طریقے سے اُن پر زور ڈال رہی تھی کہ پاکستان ہجرت کر چلیں اور سفر کی ساری ضروریات مہیا کرنے میں مصروف تھے مگر مولینا موصوف فرماتے تھے کہ میری رائے اور سفر حضرت مولینا مدنی اور حضرت مولینا زکریا صاحب پر موقوف ہے اور میں انہی کے ساتھ ہوں۔ پھر حضرت مدنیؒ سے فرمایا:

"حضرت! اپنے سے تعلق رکھنے والے تو سارے مشرقی اور مغربی پنجاب کے تھے اور حضرت قدس سرہٗ (اعلیٰ حضرت رائے پوری) کے متعلقین بھی زیادہ تر انہی دو جگہوں کے تھے۔ مشرقی تو سارا مغربی کی طرف منتقل ہوگیا۔ ان سب حضرات کا بہت اصرار ہورہا ہے کہ میں بھی پاکستان چلا جاؤں اور میرا تو مکان بھی مغربی پاکستان میں ہے اور ان مظلومین کی دلداری بھی اسی میں ہے مگر میں نے آپ دونوں کے مشورے پر اپنا جانا معلق کر رکھا ہے۔"[1]

مولینا یوسف صاحب حضرت مولینا زکریا صاحب کے تابع تھے اور مولینا عبدالقادر صاحب ہمارے حضرت اور حضرت مولینا زکریا صاحب پر انحصار کئے ہوئے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اگر ایسے موقع پر ہندوستان سے ترک سکونت فرماتے تو مدینہ طیبہ جاتے جہاں حضرت کے شایانِ شان استقبال کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ اپنا ذاتی' وسیع اور آرام دہ گھر موجود تھا۔ بھائی بھتیجوں متعقدین اور تلامذہ کی ایک جماعت چشم براہ تھی بلکہ اصرار کررہی تھی کہ اب ہندوستان میں قیام کی کوئی وجہ باقی نہیں ہے۔ اور مدینہ طیبہ میں دینی اور علمی تعلیمی خدمات کے لئے حضرتؒ کی

---

[1] آپ بیتی' ص ۲۰

بہت ضرورت ہے۔ سعودی حکومت علماء، صلحاء اور اتقیاء کی خدمت اور پذیرائی کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ حضرت اس کے حسنِ انتظام، امن و امان اور کتاب و سنت کی خدمات کے معترف و مداح بھی تھے۔ حضرت کے ان خیالات کا تذکرہ ہم آگے کسی باب میں پیش کر رہے ہیں، حضرت کے خاندان اور اس کی دینی و علمی خدمات کی سعودی حکومت کی نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ ایک اشارہ ہوجاتا تو ہر قسم کی سہولتیں اور راحتیں مہیا ہوسکتی تھیں۔ اس موقع پر یہ بھی یاد کر لیجئے کہ مالٹا سے آنے کے بعد بمبئی ہی سے حضرت کی طبیعت میں مدینہ کی واپسی کا تقاضہ شروع ہوگیا تھا اور اس کے بعد سے آج تک کم و بیش چالیس برس تک یہ آتشِ شوق تیز تر ہی ہوتی گئی تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ پیر و مرشد اور استاذ جو بارِ امانت سپرد کر گئے تھے اس کا حق ادا ہوجائے اور ان کے حکم کی تعمیل ہوجائے۔ یہ ماحول تھا اور حالات تھے جن میں حضرت مولانا زکریا صاحب اور مولانا عبد القادر صاحب نے حضرت سے ہجرت کے بارے میں مشورہ کیا اور اس حقیقت کا اظہار بھی کیا کہ اب ہمیں یہاں رہنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔ حضرت نے فیصلہ کن انداز میں وضاحت اور صفائی کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ میں کسی کو روکتا نہیں ہوں، مگر خود مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا اور انہی کے ساتھ مرنے جینے کا فیصلہ کرتا ہوں یہ حکایت بھی مولانا زکریا صاحب ہی کی زبان سے سنیے:

"حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری نے فرمایا کہ یہاں تو پھر بھی اللہ کا فضل ہے۔ اہل اللہ موجود ہیں مگر وہاں اللہ اللہ کرنے والوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا ہے، کچھ شہید ہوگئے کچھ اجڑ گئے۔ اور تقریباً حضرت کی گفتگو کا رخ یہ تھا کہ وہاں قیام ضروری ہے۔ اس سب کو سن کر حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ ہماری اسکیم تو فیل ہوگئی۔ اگر ہماری تجویز مان لیتے تو یہ کشت و خون ہوتا نہ تبادلۂ آبادی کی نوبت آتی۔ اب میں تو کسی کو جانے سے روکتا نہیں۔ اگرچہ میرا وطن مدینہ ہے اور محمود (برادرِ خورد) وہاں بلانے پر اصرار بھی کر رہا ہے۔ مگر میں ہندوستانی مسلمانوں کو اس بے سروسامانی اور دہشت و قتل و غارت گری میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ جسے اپنی جان و مال، عزت و آبرو، دین و دنیا

یہاں کے مسلمانوں پر قربان کرنی ہو وہ یہاں ٹھہرے اور جس کو تحمل نہ ہو وہ ضرور چلا جائے، حضرت قدس سرہٗ کے اس ارشاد پر میں جلدی سے بول پڑا کہ میں تو حضرت ہی کے ساتھ ہوں۔ اس پر حضرت اقدس مولینا رائے پوری نے فرمایا کہ تم دونوں کو چھوڑ کر میرا جانا بھی مشکل ہے۔[1]

آج چالیس برس بعد حضرت کے اس پیغمبرانہ فیصلہ کی عظمت کا اندازہ شاید نہ لگایا جاسکے۔ مگر ممکن ہو تو اس کی قدر و قیمت اُن مسلمانوں سے پوچھیے جو اُس وقت موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ اُس ماحول سے دریافت کیجیے جو اُس وقت آگ و خون برسا رہا تھا اور اُس زمین و آسمان سے معلوم کیجیے جس نے اُس وقت دنیا کے سب سے بڑے حادثے کا بوجھ اپنے سینے پر اُٹھا رکھا تھا۔ کہ حضرت کے اس اعلان اور عزم و ارادے نے رِستے ہوئے ناسور کس طرح مندمل کردئے، ٹپکتے ہوئے زخم کس خوبی سے بھر دئے اور اُجڑی ہوئی بستیاں کتنی آسانی سے پھر سے بسادیں۔

جہادِ آزادی میں حضرت کی جاں بازیوں اور سرفروشیوں کی داستان اس باب کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ چلتے چلاتے آخر میں یہ بات خوب ذہن نشین کرتے چلئے کہ یہ جنگِ آزادی میں ملک کے ساتھ شانہ بشانہ جد و جہد ہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کا نظریہ ہی تھا اور متحدہ قومیت ہی کا موقف تھا جس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کو جمعیۃ علماء کو اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو یہ حوصلہ اور استحقاق دیا کہ انھوں نے ملک کی فرقہ پرست طاقتوں کو پوری جراءت و شہامت کے ساتھ للکارا، حکومت کو خم ٹھونک کر جھنجھوڑا اور مسلمانوں کو حوصلے اور ہمت کے ساتھ ثابت قدم رہنے پر اُبھارا۔

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں ———— اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

---

[1] آپ بیتی نمبر ۵، ص ۲۸

آزادی کے بعد مسلمانوں کی خدمات

ملک کی تقسیم اور قیام پاکستان کے نتیجے میں مسلمانوں پر جو مشکلات اور مصائب نازل ہوئے، ان کی نوعیتیں اور صورتیں لاتعداد اور بے شمار ہیں۔ ان کے اعداد و شمار، تفاصیل اور ریکارڈ جمع کرنے کے لئے کئی سال اور کئی اصحاب علم و قلم کی دن رات کی کوششیں درکار ہیں۔ ہم اپنی محدود بساط کے مطابق اس خرمن کے دو ہی چار دانے پیش کر سکتے ہیں اور امید ہے ہمارے موضوع کا تقاضا کسی نہ کسی درجے میں پورا ہو جائے گا۔ مسلمان ایسا کمزور اور دل شکستہ بھی نہیں تھا کہ طوفان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا مگر یہ مقابلہ اس لئے بہت مشکل ہو گیا تھا کہ آزاد حکومت اور کانگریس ایڈمنسٹریشن کے بہت سے سربرآوردہ حضرات اور ذمہ دار افراد مسلمانوں کی دشمنی میں کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ مار کاٹ قتل و غارت اور ظلم و بربریت کی جو تھوڑی بہت تفاصیل پچھلے صفحات میں گزری ہیں۔ یہ وہ مظالم تھے جو سب کو کھلی آنکھوں نظر آ رہے تھے۔ مگر انتقاموں اور کینہ پروریوں کی کچھ سازشیں اور منظم اسکیمیں ایسی بھی تھیں جو قانون اور انتظام کے نام پر شروع کی گئیں۔ یہ سازشیں اوپر سے تو نظر آتی نہیں تھیں مگر ان کی جڑیں بہت گہری تھیں۔

"مشرقی پنجاب میں چیف منسٹر بھارگو اور مرکزی حکومت میں ہوم منسٹر ولبھ بھائی پٹیل کا منصوبہ یہ تھا کہ دہلی اور اس کے آس پاس کے مسلمانوں کی شدھی کر لی جائے اور اس پر مسلمانوں کا سایہ بھی باقی نہ رہے۔"[1]

اس سلسلے کا آغاز محکمہ کسٹوڈین کے قیام سے کیا گیا۔ یہ محکمہ اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ ہندوستان چھوڑ کر جانے والے لوگوں کی جائدادوں، دکانوں اور مکانوں کی قاعدہ

---

[1] الجمعیۃ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن نمبر، ص ۹۶

ضابطہ کے ساتھ حفاظت کی جائے اور ان میں حسب استحقاق شرنارتھیوں کو آباد کیا جائے۔ ایسی ضرورت تھی جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اصل کام کے بجائے یہ محکمہ مسلم دشمنی، تعصب اور عناد کا مرکز ہو کر رہ گیا تھا۔ چار بھائیوں میں سے ایک بھائی پاکستان چلا گیا تو حکومت نے چاروں بھائیوں کی جائداد کے انخلا کا نوٹس دے دیا اور دلیل یہ دی کہ چونکہ جائداد تقسیم شدہ نہیں تھی اس لئے جائداد کے سارے ہی اجزا میں جانے والے کا حق اور حصہ بیٹھتا ہے اور ساری ہی جائداد متروکہ پراپرٹی کے ضمن میں آتی ہے۔ اس طرح یہ تینوں ہندوستانی بھائی بھی بے گھر اور بے در ہو گئے۔ کوئی شخص اپنے گاؤں، شہر اور ضلع سے دور بمبئی، کلکتہ میں بغرض معاش مقیم ہے، محکمہ کسٹوڈین نے فیصلہ کر دیا کہ وہ پاکستان چلا گیا ہے۔ اب وہ آئے، عذر داری کرے اور تین چار بلکہ بعض حالتوں میں سات آٹھ سال تک یہ ثابت کرتا رہے کہ جانا اور رہنا تو کجا اس نے پاکستان کا نام تک بھی نہیں سنا ہے۔ اس کے بعد بھی اس کی ملکیت واگذار ہو یا نہ ہو یہ محکمہ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ کچھ لوگ اپنے اعزہ کو وداع کرنے ہندوستان کی آخری حد امرت سر، بمبئی یا کھوکھرا پار گئے، واپس آئے تو پتہ چلا کہ حکومت کے محکمہ کسٹوڈین نے ان کو راتوں رات پاکستانی قرار دے کر انخلا کا نوٹس دے دیا ہے اور وہ برسوں کے لئے عذر داریوں، اپیلوں اور دلیلوں کی پھانسی پر لٹک گئے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی اور بہت سی ناانصافیوں اور مظالم کے علاوہ ایک ایک طریقہ متوقع نکاسی کا نکالا گیا تھا۔ لوگ اپنے گھروں پر رہ رہے ہیں، اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔ اچانک محکمہ کسٹوڈین انھیں نوٹس دیتا ہے کہ چونکہ تم پاکستان جانے والے ہو اس لئے تمھاری املاک متوقع نکاسی قرار دی جاتی ہیں۔ یہ ایسا قانون تھا جس کی زد سے کوئی مسلمان بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس ننگی اور قانونی تلوار کو لے کر کسٹوڈین نے آزادی کے ساتھ چومکھا وار کرنا شروع کر دیا دہلی کے ایک بزرگ حاجی محمد دین چھتری والے دہلی ہی میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے پاکستان کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ مگر کسی ذریعے سے پاکستان میں پینتالیس ہزار روپے کی ایک جائداد اس خیال سے خرید لی تھی کہ کسی موقع پر فروخت کر کے چار پیسے کما لیں گے۔

محکمۂ کسٹوڈین تو تاک ہی میں رہتا تھا۔ اس بات کو بنیاد بنا کر ان کی ساٹھ لاکھ روپے کی ساری جائداد کو نکاسی قرار دے دیا۔ اور انھیں سڑک پر کھڑا کر دیا۔ بے شمار واقعات ایسے بھی ہیں کہ پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں نے مسلمانوں کی دکانوں اور مکانوں پر زبردستی قبضہ کرلیا اور مسلمانوں کے لئے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔

تعصب، نفرت اور فرقہ پرستی کا جو بیج برطانوی حکومت نے ہندوستان میں بویا تھا اب وہ تناور درخت بن چکا تھا تقسیم کے نتیجے میں اسے آزادی اور فراوانی کے ساتھ آبیاری نصیب ہوئی تو وہ ایسے زہریلے ناگ میں تبدیل ہوگیا جس نے سارے ملک کو نگلنا شروع کر دیا۔ ملک کے متعصب پروپیگنڈے نے عوام کے ذہن میں یہ تلخی بھر دی کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنھوں نے ملک تقسیم کرایا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں لاتعداد افراد اور متعدد جماعتیں ایسی تھیں اور آج بھی موجود ہیں جن کی بے عملی، جہالت اور پست ذہنیت کی وجہ سے ان کو سماج میں کوئی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں مل سکتی ہے۔ یہ ہارے ہوئے اور پسماندہ ذہن کے لوگ اپنی خود غرضیوں اور منفعت کوشیوں کے لئے عوام میں جذباتی فرقہ پروری اور غلط مذہبی جذبات برانگیختہ کر کے اپنی شہرت اور اقتدار کی دکان چلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس طبقے کو اس وقت منہ مانگی مراد ملی، اس نے زمین بالکل ہموار پائی اور آزادانہ فسادات اور قتل و غارت گری شروع کر دی۔ فساد اور لوٹ مار آزادی سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ مگر ہر حال میں اس کا میدان محدود ہی رہتا تھا۔ اور بہادری کے پہلے ہی دوسرے اُبال میں غباروں کی ہوا نکل جاتی تھی نیز دونوں ہی فرقوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا تھا۔ مگر آزادی کے بعد اس وحشت و بربریت میں حکومت کے تنگ نظر اور بدخصلت افسران بھی شریک ہو گئے اور اب فریق دو کے بجائے تین ہو گئے۔ فسادات کا عنوان تو یہی رہا مگر درحقیقت ان کا عمل اب قتل عام کی شکل اختیار کر گیا۔ تنظیم، ترتیب اور مکمل تیاریوں کے ساتھ اقلیتوں پر حملے کئے جانے لگے۔ حملوں کے آخر میں جو مظلوم جلانے، مارنے اور تباہی سے بچ جاتے ان کو مقدمات میں دھر کے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ یہ واقعات بڑے روح فرسا اور بہت

طویل ہیں۔ ان کی تحقیقات اور تفصیلات لکھی جائیں تو کئی ہزار صفحوں کی دستاویز تیار ہو جائے گی۔ تقسیم کا فیصلہ ہو جانے کے بعد حکومت ہندوستان نے اعلان کیا کہ مسلمان افسران اور ملازمین کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو ہندوستان میں رہیں یا پاکستان چلے جائیں اور ساتھ ہی یہ رعایت بھی ہے کہ حملوں، بلووں اور قتل و غارت گری سے بچنے کے لئے جو لوگ عارضی طور پر جانا چاہیں وہ حالات معمول پر آجانے کے بعد واپس اپنے مناصب، عہدوں اور ملازمتوں پر واپس آسکتے ہیں۔ بڑی تعداد تو ہمیشہ کے لئے پاکستان ہی چلی گئی۔ مگر ایک معتد بہ تعداد نے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اس کے ساتھ بہت سے ملازمین ایسے بھی تھے جو وقتی طور پر حالات کی سختیوں سے گھبرا کر زندگی کی حفاظت کے لئے صرف عارضی طور پر پاکستان گئے اور یہ لکھ کر گئے کہ جوں ہی حالات قابو میں آئے ہم واپس آئیں گے مگر جب انھوں نے واپس آنا چاہا تو حکومت کے متعصب افسران نے ان کی راہ میں ہزاروں کانٹے بچھا دئے۔ اس کے ساتھ جو افسران ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے ان پر ڈپارٹمنٹل اور ایڈمنسٹریٹیو راستوں سے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ اس اجمال کی تفصیلات بھی بڑی صبر آزما اور طویل ہیں جن کا احاطہ ہماری گنجائش کے لئے مشکل ہے۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور کثیر جماعت ایسی بھی تھی جو جان کی حفاظت کے لئے کیمپوں میں، اعزہ واقارب کے گھروں میں، اور مختلف محفوظ مقامات پر چلے گئے تھے مگر کسی قیمت پر اپنا ملک اور اپنے زمین و آسمان چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں نے ان کے پیچھے دروازے توڑ کر، تالے کھول کر اور دیواریں پھاند کر ان کے گھروں کو لوٹ کر ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ حالات پُرسکون ہو جانے کے بعد ان مسلمانوں نے اپنے گھروں پر واپس جانا چاہا مگر اب ان کو دوبارہ بسانا آسان کام نہ تھا۔ حضرت مولینا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی لدھیانہ میں اپنا عالی شان مکان چھوڑ کر دلی آگئے۔ حافظ محمد عثمان صاحبؒ چاندنی چوک میں اپنی دکان مقفل کر کے اپنے گھر میں قیام پذیر تھے۔ خان عبد الغفار صاحب انبالہ میں، مولینا عمر ابراہیم صاحب میواتیؒ

گوڑگانواں میں مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانیؒ پانی پت میں اور ایسے ہی ہزاروں بندگانِ خدا اللہ کے توکل پر جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر اپنی اپنی جگہوں پر ثابت قدم رہے مگر شرناتھیوں سے ان سب مکانات کی بازیابی اور مسلمانوں کی دوبارہ آبادکاری آسان نہ تھا۔ جماعتیں اور افراد تو کیا حکومت بھی اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے پس وپیش کرتی رہی۔

ایک بڑا مسئلہ اغوا شدہ دوشیزاؤں اور خواتین کی بازیابی کا تھا۔ گنتی میں تو ایسی عورتوں کی تعداد دوسری تباہیوں کے مقابلے میں کسی قدر کم رہی ہوگی۔ مگر جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے یہ واقعات سب سے زیادہ روح فرسا اور کربناک تھے۔ پہلے پہلے تو آہوں، کراہوں اور خون کے فواروں کے سامنے اس مسئلے کی طرف دھیان دینے کا ہوش ہی نہ آیا۔ مگر جب آگ کچھ ٹھنڈی پڑی اور سڑکوں اور گلیوں کی آوازوں کے ساتھ گھروں کی چیخیں بھی سنائی دینے لگیں تو پتہ چلا کہ ہزاروں بہویں اور بیٹیاں اغوا کی جا چکی ہیں اور لاتعداد بچیاں بھی بھگا لی گئی ہیں۔ دو چار دس بیس کی بات ہوتی تو ایسی مشکل بات نہ تھی۔ مگر ہزاروں لڑکیوں کا سراغ لگانا، تلاش کرنا اور پھر انھیں ناجائز اور حرام قبضوں سے نکالنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ ان میں بہت سی لڑکیاں رس بس گئی تھیں اور اپنی قسمت پر رو پیٹ کر صبر کر چکی تھیں۔ بہت سی معصوم ائیں اس خوف ودہشت میں مبتلا تھیں کہ ان کے والدین اب انھیں جیتے جی قبول نہیں کریں گے۔ ایسی دوشیزائیں بھی تھیں جنھیں ڈرایا گیا تھا کہ اگر تم چلی گئیں تو جس طرح بھی ہوگا ہم تمھاری جان لے کر رہیں گے۔

مشرقی پنجاب، دہلی، میوات اور بہت سے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد خوف ودہشت اور موت کے ڈر سے مرتد ہوگئی تھی۔ یہ انتہائی عبرت ناک اور حسرت ناک صورت حال تھی۔ قانونی اعتبار سے ان کو دوبارہ واپس نہیں لایا جاسکتا تھا۔

پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے کروڑوں روپئے کے اوقاف ہیں۔ یہ ایسی جائدادیں ہیں جن کی آمدنیاں پل پل اور منٹ منٹ بڑھنے والی تھیں۔ حکومت نے ایک کمیشن مقرر کردیا جو اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ملک میں جتنے بھی خیراتی ادارے، رفاہ عام

کی جائدادیں اور اوقاف ہیں ان سب کو ایک مشترک نظام کے ماتحت کر دیا جائے۔

ایک بڑا حملہ اردو زبان پر بھی کیا گیا اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تدبیریں کی گئیں اور آخر کار گاندھی جی کی ہندوستانی کی جگہ ایسی ہندی جاری کی گئی جس میں سنسکرت کے الفاظ اور اصطلاحات کی بھرمار کر دی گئی۔ مسلمان ہندی جانتے اور بولتے بھی تھے اور اس کو خوشی کے ساتھ قبول بھی کر سکتے تھے۔ مگر سنسکرت کے آگے وہ بالکل بے بس ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو وہ تعلیمی اور علمی میدان میں کمزور ہونے لگے اور دوسری طرف ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے پست ہمتی کا شکار ہو گئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ایسی کتابیں، مضامین اور بیانات چھاپے گئے اور بیان کئے گئے جن میں مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب، عقائد اور مذہب پر علی الاعلان حملے کئے جاتے تھے۔ ایک سے زیادہ مواقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر ناگفتہ بہ باتیں کہی گئیں۔ یہ چند مثالیں ہم نے آزادی کے بعد مسلمانوں کے بے شمار مسائل کے نمونوں کے طور پر پیش کی ہیں ورنہ حقیقت میں چھوٹے بڑے ایسے سیکڑوں معاملات اور واقعات ہیں جن میں ہندو فرقہ وارانہ تنظیمیں مسلمانوں کو اکسانے، برانگیختہ کرنے، نقصان پہنچانے اور اکھاڑنے کے منظم اور مرتب پروگراموں پر عمل پیرا ہیں۔

ان تمام جانکاہ حالات اور حادثات نے حضرت رحمۃ اللہ کی ذہنی اور جسمانی توانائیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مزاجی اعتبار سے حضرت تحمل و برداشت اور صبر و ضبط کے پہاڑ تھے۔ مگر پھر بھی انسان تھے۔ اور اب تو کم و بیش ستر بہتر برس کے ہو چکے تھے۔ عمر بھر کی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا۔ اور پوری قوم ابتلاء و آزمائش میں مبتلا دیکھی تو دل سے نکلی ہوئی آہ زبان پر بھی آہی گئی۔ ان حملوں، بلووں، سازشوں اور منتقمانہ کارروائیوں کے درمیان ایک روز

"حضرت نے ایک سرد آہ بھری اور فرمایا۔ ہماری اسکیم فیل ہو گئی اور ہماری کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اگر مسلمان ہماری بات مان لیتے تو نہ یہ تبادلۂ آبادی ہوتا اور نہ ہی امر خونی۔ خرابے کی نوبت آتی۔"[1]

[1] شیخ الحدیث مولانا زکریا آپ بیتی نمبر ۵

اس عمر، کمزوری اور ضعف کی حالت میں حضرتؒ دین، قوم اور اسلام کی خدمت کے لئے ایک بار پھر میدان میں صف آرا ہو گئے۔ آزادی کی جنگ بہت آسان تھی عزم وہمت جوان تھی اور مقابلہ بھی غیروں اور دشمنوں سے تھا مگر آج اپنے ہی عداوت پر آمادہ تھے اور جن کو ہمیشہ دوست کہا اور سمجھا وہ دشمن ثابت ہو رہے تھے مگر حضرتؒ کے عزم وحوصلے میں کوئی فرق نہ آیا۔ فوراً اپنے رفقاء، مخلصین اور مریدین مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد اور سیکڑوں دوسرے دردمندوں کو جمع کیا اور صورت حال پر غور کر کے حالات کے مقابلے اور مصائب کے مقابلے کی ممکنہ تدابیر متعین کیں۔ اور ضعف، کمزوری اور بڑھاپے کے ساتھ اس دل شکستہ وابستہ جماعت نے خود کو از سر نو ملک وقوم کی بھلائی میں جھونک دیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آزادی کے بعد اپنی بچی کھچی توانیاں اپنی زندگی کے اصل مقاصد دینی، علمی اور تعلیمی کوششوں اور جدوجہد کی جانب مرکوز کر دی تھیں، مگر ساتھ ہی مسلمانوں کے سیاسی، اجتماعی مسائل کے حل کرنے، قوم کا حوصلہ بلند رکھنے اور اس کو حالات کے مقابلے کے لئے تیار کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک زور صرف کر دیا۔ اور ملک کی طاغوتی طاقتوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

کسٹوڈین کی ناانصافیوں اور منتقمانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک طرف تو قانونی چارہ جوئیوں کا مکمل انتظام کیا گیا اور دوسری طرف حکومت کے ذمہ داروں پر ذاتی اثر ورسوخ استعمال کیا گیا۔ چھوٹے اور معمولی نوعیت کے معاملات میں جمعیۃ علماء کی نگرانی اور پیروی میں عدالتی کارروائی پورے اہتمام اور جانفشانی کے ساتھ کی گئی اور بڑے معاملات جن کا اثر اصولی سیاست پر اور پورے ہندوستان پر پڑنے والا تھا ان میں عدالتی چارہ جوئیوں کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ ذاتی طور پر پنڈت جواہر لال، اور کبھی کبھی دوسرے ذمہ داروں سے مل کر ان پر زور دیتے تھے کہ ناانصافیاں اور مظالم فوراً بند ہوں۔

جمعیۃ علماء ہند کے جن اکابر نے ان نازک اوقات میں اپنی زندگیاں ملک اور

قوم کے لئے وقف کردیں ان میں حضرت مولینا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ آپ نے جمیعۃ علماء اور حضرت رحمۃ اللہ کے مشن کو کامیاب کرنے کے لئے زندگی اور جان کی بازی لگادی۔ موصوف سیاسی معاملات میں حضرت کے دست راست اور سب سے زیادہ معتمد تھے۔ آپ کی دلسوزی اور جاں فروشی کی داستان دو چار دس صفحوں میں آنی ممکن نہیں ہے۔ دلی کے گلی کوچے اور ہندوستان کا چپہ چپہ اس بات کا شاہد ہے کہ حفظ الرحمٰن جیسا جری، صاحب فہم و فراست، عالم و فاضل اور مخلص جاں نثار نہ ماضی قریب میں نظر آتا ہے نہ مستقبل قریب میں پیدا ہونے کی امید نظر آتی ہے۔ اُس زمانے میں کسٹوڈین کے سب سے بڑے افسر کوئی اچھرورام تھے۔ محمد دین چھتری والا کے مقدمہ میں ابتدائی کسٹوڈین سے محمد دین کے خلاف فیصلہ ہوا تو کسٹوڈین جنرل اچھرورام کی عدالت میں اپیل کی گئی۔ مگر اس نے بھی ابتدائی کسٹوڈین کا فیصلہ بحال رکھا۔ اکابر جمیعۃ علماء ہمت نہ ہارے۔ وہ جانتے تھے کہ اس مقدمے میں ہار گئے تو ہندوستان بھر کے لاکھوں معاملات میں ہار جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی کوشش میں لگے رہے اور آخرکار ہندوستان کی مجلس وزراء نے اچھرورام کے فیصلہ کو غلط قرار دے کر محمد دین کو باعزت بری کر دیا اور ان کی جائدادیں واگذار کیں۔ اچھرورام نے طیش میں آکر کسٹوڈین جنرلی سے استعفےٰ دے دیا اور کیبنٹ آف منسٹرز کے فیصلہ کے خلاف پارلیمنٹ میں سوال اُٹھایا، پنڈت جواہر لال نے اس کے جواب میں قانونی اور وضاحتی بیان دے کر اس متعصبانہ کارروائی کا ہمیشہ کے لئے سدباب کر دیا۔

فسادات تو ہوتے ہی رہے اور آج تک ہو رہے ہیں۔ مگر اول تو مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے اس بات کے لئے آمادہ کیا گیا کہ وہ حملوں کا مقابلہ بہادری اور جی داری سے کریں، دوسرے وہ قانونی چارہ جوئیوں اور حکومت کے نیز عوام کے انصاف پسند حلقوں کو متوجہ کر کے ان کی شدت کو بہت کم کر دیا گیا۔

جن دکانوں، مکانوں اور جائدادوں پر ناجائز قبضے ہو گئے تھے، اگر ان کے مالکان پاکستان نہیں گئے تھے تو ان کو واگذار کرایا گیا۔ اور چاندنی چوک، صدر بازار وغیرہ کی دکانیں

پھر ان کے مالکوں کے حوالے کی گئیں۔ پانی پت، لدھیانہ، انبالہ وغیرہ میں مسلمانوں کو دوبارہ آباد کرایا گیا۔ بہت سی مسجدیں اور اوقاف کی جائدادیں خالی کرائی گئیں اور انھیں مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ جو لوگ خوف ودہشت اور زور وزبردستی کی وجہ سے مرتد اور بددین ہو گئے تھے ان کے بارے میں مرکزی حکومت سے احکام جاری کرائے گئے کہ یہ جبریہ تبدیلیٔ مذہب ہے جس کو ہندوستان کا دستور منظور نہیں کرتا ہے اس لئے سرکاری طور پر ایسے لوگوں کی مدد کی جائے اور جو لوگ اپنے قدیم مذہب پر واپس ہونا چاہیں ان کی حفاظت اور اعانت کی جائے۔ اس حکمنامہ کی بنیاد پر جمعیۃ علماء نے اپنے سارے ہی ذرائع استعمال کر کے ایسے لوگوں کی بڑی تعداد کو نعمت دین وتوحید سے دوبارہ مالامال کیا۔ جو افسران اور ملازمین جائز اور قانونی طور پر دوبارہ ہندوستان آنے پر تیار ہوئے، ان کی ساری رکاوٹوں اور مشکلات کو دور کرایا گیا۔ اور اس طرح اس ضابطہ کو بروئے کار لایا گیا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ جو لوگ عارضی طور پر جائیں گے وہ واپس آسکتے ہیں۔ دینِ اسلام اور اکابرِ اسلام کی توہین وتخفیف پر مشتمل کتابوں اور مضامین کی طرف پوری قوت کے ساتھ ذمہ داران حکومت کی توجہ دلائی گئی اور اس قسم کی کارروائیوں کا استیصال کیا گیا۔ اُردو زبان، اُردو اسکولوں اور اداروں کے لئے بہت سی آسانیاں اور رعایتیں منظور کرائی گئیں اور اسکولوں میں اس کی تعلیم کا انتظام منظور کرایا گیا۔ اغواشدہ عورتوں اور لڑکیوں کی بازیابی اور پرورش ونگہداشت کا مکمل اور منظم اہتمام کیا گیا اور ہزاروں لڑکیاں تلاش کر کے انھیں ان کے ٹھکانوں تک پہنچایا گیا۔

یہ دعویٰ تو کسی طرح نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے سارے ہی مسائل کا حل تلاش کر لیا گیا اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مسلم قوم کی زندگی ہمیشہ کے لئے مطمئن ومحفوظ ہو گئی مگر یہ اعلان تو بہانگ دہل کیا جاسکتا ہے کہ ان اللہ کے بندوں نے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر نازک اور حساس معاملات پر اسی جانکاہی کے ساتھ کام کیا اور ایسے ضوابط اور اصول بنوالئے جو ملکی اور قومی زندگی میں ہمیشہ کے لئے بنیاد بن گئے اور جن کی بنا پر کسی فرقہ یا گروہ کے لئے متعصبانہ اور منتقمانہ کارروائی آسان نہیں رہ گئی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کی جماعت اور ان کے ساتھیوں کی یہ خدمات ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ واضح الفاظ میں لکھی جائیں گی۔ ایک مورخ کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

"یہ درست ہے کہ اس قسم کے کیسز میں مولینا ابو الکلام آزاد نے دل چسپی لی مگر جس ذات نے مولینا آزاد اور پنڈت جواہر لال کو دل چسپی لینے پر مجبور کیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز صدر جمعیۃ علماء ہند کی شخصیت تھی۔ یا مجاہد ملت مولینا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کی جد وجہد تھی جو مسلسل جاری رہی۔"[1]

ان تمام ظاہری اور مادی کوششوں کے ساتھ ساتھ حضرت کی ایک جد وجہد اور بھی تھی جو عام لوگوں کی نگاہوں سے بالکل پوشیدہ تھی۔ بارہ چودہ گھنٹوں کی مسلسل تگ و دو کے بعد آدھی رات سے اپنے مولا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے تھے اور ملت کی زندگی، عزت و آبرو اور فلاح و بہبود کے لئے سسک سسک کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر بھیک مانگتے تھے۔

اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑے گا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ان تمام مساعی کی بنیاد یہی ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت، سیکولرزم، ڈیموکریسی اور نیشنلزم کے نظریات تھے جن کی حضرتؒ نے ہمیشہ حمایت کی تھی اور یہی وہ نظریہ تھا جس نے ہر ہر موقع پر ملک کی تنگ نظر، رجعت پسند اور فرقہ پرست طاقتوں کو پوری جرأت کے ساتھ للکارا، حکومت کو پوری طاقت اور استحقاق کے ساتھ پکارا اور مسلمانوں کو پورے حوصلے اور ہمت کے ساتھ ثابت قدم رہنے پر ابھارا اور یہی وہ نظریہ ہے جس کے سہارے پورا ملک آج بھی ترقی کی جانب گامزن ہے۔

---

[1] مولینا محمد میاں الجمعیۃ مجاہد ملت نمبر ص ٨٠،

دارالعلوم دیوبند کی خانہ تلاشی

برطانوی ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر مدارس اور مراکز شروع سے آخر تک علی الاعلان جنگِ آزادی کے میدان میں صف آرا رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک نوّے برس کے عرصے میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ یہ مرکز اپنے اساتذہ، طلباء اور متعلقین کے ساتھ غیر ملکی تسلط کی بیخ کنی سے غافل رہا ہو۔ مولانا محمد قاسم جو اس مدرسے کے مؤسسین میں شمار ہوتے ہیں مع اپنی کثیر جماعت کے پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک رہے تھے۔ ان کے شاگرد اور مدرسہ دیوبند کے دوسرے دور کے سب سے بڑے مقتدا شیخ الہند مولانا محمود حسن نے آزادی کے لئے سب سے پہلی سیاسی جدوجہد کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کے شاگرد اور مدرسہ کے تیسرے دور کے سالار قافلہ مولانا حسین احمد مدنی کی قربانیاں اور جاں فروشیاں جو ملک کے لئے پیش کی گئیں آپ کے سامنے ہیں۔

ان تینوں حضرات اکابر قدس اللہ اسرارہم، ان کی جماعت اور مدرسہ دیوبند کی ایک بڑی خدمت یہ بھی تھی کہ انھوں نے ملک میں فرقہ پروری، تعصب اور تنگ نظری کے خلاف جنگ میں اپنی زندگیاں داؤ پر لگادی تھیں۔ ان کے نزدیک سارے انسان، بنی آدم ہونے کی حیثیت سے برابر تھے اور یہ ہر ایک قوم اور فرقہ کے لئے خیر مانگتے تھے۔

> "ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بانی جماعت تبلیغ نے حضرت مدنی سے کہا کہ مسلمانوں کے لئے دعا فرمایئے تو حضرت مدنی نے تیز لہجہ میں فرمایا کیوں؟ کیا غیر مسلم مخلوق خدا نہیں ہیں؟"[1]

جنگ آزادی اور اتحاد و اتفاق کی راہ میں دامے درمے قدمے سخنے اس اخلاص

---

[1] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر ص ۵۶

اور بے غرضی کے ساتھ شرکت کی مثال پورے ہندوستان میں کوئی دوسرا ادارہ یا مرکز نہیں پیش کرسکتا۔ مختصر یہ ہے کہ یہی وہ تنہا اور واحد جماعت تھی جس نے ملک میں سب سے پہلے آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا اور غیر ملکی حکومت کے خلاف جھنڈا اٹھایا تھا مگر باوجود ان تمام حقائق کے حکومتِ برطانیہ نے سو برس کی مدت میں کوئی ایسا موقع نہیں پیش آنے دیا جس میں اُس نے اس مدرسے کے ساتھ رعایت، احترام اور شرافت کا معاملہ نہ کیا ہو۔ ساری ہی خرابیاں تھیں مگر یہ مان لینا چاہیئے کہ انگریز معمولی باتوں اور روزمرہ کے رکھ رکھاؤ میں کم ظرفی اور چھچھورے پن کا قائل نہ تھا۔

اس کے مقابلے میں ہندوستان کی آزاد حکومت نے اختیار حاصل کرتے ہی مدرسہ دیوبند کے ساتھ پہلا معاملہ جو کیا اس کو کم ظرفی اور احسان فراموشی کے سوا کوئی دوسرا نام دینا مشکل نظر آرہا ہے۔

دور دراز کے، غیر ملکوں کے اور مصروف و مشغول مسلمان بقرعید کے موقع پر مدرسہ میں رقوم بھیج دیا کرتے تھے اور ان کی جانب سے یہیں قربانی ہوجایا کرتی تھی۔ آزادی کے بعد پہلی بقرعید پڑی تو حسب معمول مدرسہ میں قربانی کے لئے جانور خریدے گئے۔ ان میں منجملہ دوسرے جانوروں کے گائیں بھی تھیں۔ مقامی حکام نے اعتراض کیا کہ گائے کی قربانی سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔ اتفاق سے اس موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور مولینا طیب صاحب مہتمم مدرسہ دونوں دیوبند میں موجود نہیں تھے۔ معاملہ فقہی اور دینی مسئلہ کا آپڑا تھا۔ جو جانور قربانی کی نیت سے خریدے گئے وہ اگر قربانی میں نہ دیئے جائیں تو ان کا کیا جائے۔ جو حضرات موجود تھے انھوں نے صورتِ حال پر غور کیا اور حکومت کو یقین دلایا کہ مدرسہ میں گائے کی قربانی نہیں کی جائے گی۔ مگر دو روز کے بعد مدرسہ کی تلاشی کا حکم آیا۔ آزادی سے پہلے حکومتِ برطانیہ کے دَور میں اگر کبھی حکومت کو کسی قانونی اور آئینی تفتیش و تحقیق کی ضرورت پیش آتی بھی تو حکومت مدرسہ کے وقار اور احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتی تھی۔ مگر اس بار معاملہ سودیشی حکومت سے آپڑا تھا۔ کافی بحث و تمحیص اور افہام و تفہیم کے بعد حکومت تلاشی پر مصر رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفاتر،

درس گاہوں اور کتب خانوں کے گوشہ گوشہ کی تلاشی لی گئی۔ کوئی خلاف ضابطہ چیز تو برآمد نہیں ہوئی، صرف وہ اشتہارات جن میں قربانی کے مسائل بیان کئے گئے تھے اور جن میں گائے کی قربانی کا مسئلہ بھی تھا، ضبط کر لئے گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سفر سے آئے تو ان کو ان واقعات کا بہت صدمہ ہوا اور سارے ہندوستان میں مہینوں بلکہ سالوں صدائے احتجاج گونجتی رہی۔ اس موقع پر کسی شاعر کی ایک نظم الجمعیۃ کے دارالعلوم نمبر میں نقل ہوئی ہے۔ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمایئے۔

دارالعلوم دیوبند کی تلاشی

آج توہین ملامت کا نشانہ ہوں میں !
آج نیرنگ زمانہ سے تماشہ ہوں میں !

آج حسین احمد و آزاد کا آنسو ہوں میں !
کسی ناکام وفا کا تہی پہلو ہوں میں !

کیا یہی آپ کا انصاف رواداری ہے !
وہی شے آپ کی دشمن جو ہمیں پیاری ہے !

دیوبند جس نے کئے سیکڑوں غازی پیدا !
جس نے لاکھوں کئے انگریز کے باغی پیدا !

اس ادارے کی تلاشی و اہانت افسوس !
ضامن امن و اماں اور یہ خیانت افسوس !

آہ تقدیر صداقت کے پرستاروں کی !
موسم گل میں بھی بوچھار ہے انگاروں کی !

آج کہتے ہو مسلمان وفادار نہیں !
سچ کہو تم تو جفا کیش جفا کار نہیں !

کس نے گوتم کو دیا زہر کا پیالہ بولو !
رام کو کس نے دیا دیش نکالا بولو !

پاک سیتا پہ ہوئی دست درازی کس کی !
کہئے پانڈو پہ ہوئی تیغ نوازی کس کی !

کس نے گاندھی سے وفاکیش کو مارا افسوس !
جو تھا بھارت کی نگاہوں کا ستارا افسوس !

اپنے محسن کو جو ڈس لے اسے کیا کہئے گا !
ہے یہی مسلک آئینِ وفا کہئے گا !

قوم کی موت ہے اخلاق سے عاری ہونا !
تنگیٔ ظرف کے معنی ہیں بھکاری ہونا !

قابل فخر مسلمان بزرگان جلیل !
قاسمؒ و سیدؒ و محمودؒ و شہید اسماعیلؒ !

یاد ہوگا تمھیں وہ میر اجمال افغانی !
مایۂ قوم وہ محمود حسن زندانی !

میرے ٹیپو سے بہادر کو بھی کیا بھول گئے !
شیر میسور کا اعلانِ وفا بھول گئے !

شوکت و اجمل و انصاری وہ جوہر ہیں یاد
اور وہ کاکوری کے اشفاق کی خونیں روداد !

یاد ہے کیا تمھیں ہنگامۂ قصہ خوانی !
یاد تحریک خلافت کی نہیں قربانی !

سینہ و دل میں پھپھولوں کے نشاں باقی ہیں !
اب بھی انگریز کے گولوں کے نشاں باقی ہیں !

اپنے چھوٹے، تمھیں سینے سے لگایا ہم نے !
خون اپنا سرِ میدان بہایا ہم نے !

ہم نے رنگین بنایا ترے افسانے کو !
گلشنِ ناز میں بدلا ترے ویرانے کو !

وحدتِ قوم کی عظمت کے علمدار ہیں ہم !
تمھیں ہر زد سے بچایا وہ خطاکار ہیں ہم !

ایک دن مالکِ مختار یہاں ہم بھی تھے !
ایک دن ہند کے سردار یہاں ہم بھی تھے !

ہم نے آنکھوں پہ بٹھایا تمھیں ایسا سمجھا !
تم نے نظروں سے گرایا ہمیں کانٹا سمجھا !

کیا یہی آپ کا آئینِ جہاں داری ہے !
جس کے ادراک سے ہر فہم و خرد عاری ہے !

ہم ہیں غدار تو پابندِ وفا تم بھی نہیں
اپنی کثرت پہ نہ اتراؤ خدا تم بھی نہیں

صدارت اجلاس جمیعۃ علماء بمبئی

۱۹۴۸ء

آزادی کے فوراً بعد عین وحشت، درندگی اور ظلم و ناانصافی کے ماحول میں جماعت علماء حق نے حالات کی سنگینی ان کے روح فرسا نتائج اور ان کے مقابلے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے بمبئی میں جمیعۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس مقرر کیا۔ یہ اجلاس حضرت کی زیر صدارت ۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا۔ اس میں حضرتؒ نے ۲۲ فل اسکیپ سائز کا خطبہ صدارت پیش فرمایا اور اس میں تقسیم ہند کے اسباب، اس کے بھیانک نتائج اور ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے لائحۂ عمل پر روشنی ڈالی۔ حضرت نے قیام پاکستان کے لئے کانگریس کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا۔ پورا خطبہ تو پیش کرنا ہمارے لئے مشکل ہے مگر اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ کریجئے جس سے حضرت کے تأثرات کا اندازہ ہوجائے گا:

"کلکتہ، نواکھالی، گڑھ مکتیشر، بہار اور پھر صوبۂ سرحد اور پنجاب کے انسانیت سوز ہنگاموں نے ہندوستانیوں کے دماغوں پر وہ جنون مسلط کردیا کہ ہر ذی ہوش ہر فرد تقسیم ہند کو نجات کا ذریعہ سمجھنے لگا۔ سکھوں نے تقسیم پنجاب کا مطالبہ کیا، مہا سبھا نے تقسیم بنگال کا نعرہ لگایا اور جب خود باشندگان ملک تقسیم کا مطالبہ کرنے لگے تو کانگریس کو بھی کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ SELF DETERMINATION اور اُن کے حق خود ارادیت کو سلب کرلیتی۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اپنی عظیم الشان تاریخ میں اس غلطی کا ارتکاب کیا جس کے لئے زعماء کانگریس کے دل آمادہ نہ تھے اور زبانیں اعتراف کررہی تھیں کہ ہم غلط راستے پر چل رہے ہیں۔"

آگے چل کر حضرت نے بیان کیا کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر جمیعۃ علماء ہند نے

اپنا فرض پوری جرأت اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا اور کانگریس کی پالیسی اور تقسیم سے بیزاری کا بہانگ دہل اعلان کیا:

"جمعیۃ علماء ہند نے اس غلطی میں کانگریس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ اور اجلاس لکھنؤ میں کانگریس کی اس عجیب و غریب غلطی سے بیزاری کا اعلان کیا مگر افسوس زمامِ اختیار ان ہاتھوں میں تھی جو تقسیم ہند کا فیصلہ کرچکے تھے۔"

آزادی اور تقسیم کے بعد کے فسادات اور قتل و غارت گری کے لئے بھی حضرتؒ نے برطانوی پالیسی ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ حضرتؒ آج بھی اپنے اسی نظریہ اور موقف پر قائم تھے کہ اپنے مفاد کی خاطر سامراجی ذہن دونوں قوموں میں فساد و افتراق جاری رکھنا چاہتا ہے، فرمایا کہ:

"حدود پاکستان اور لاہور کے متعلق کچھ ایسے اصول اور نکات رکھے گئے کہ اعلان تصفیہ ایک ہولناک خانہ جنگی کا الٹی میٹم بن گیا۔ اور ہر فرقہ دوسرے کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مزید برآں باؤنڈری کمیشن جو اختلافی اور نزاعی حدود کے تصفیہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا، بدقسمتی سے وہ ایسے فیصلے کی تلاش میں کامیاب ہوگیا جو مخصوص طور پر مسلمانوں کے لئے اشتعال انگیز تھا۔"

حضرتؒ نے ریڈ کلف کی تقسیم کے بارے میں اس طرف اشارہ کیا ہے، اس میں مسلمانوں کے لئے ناقابلِ اطمینان حدود مقرر کی گئیں اور یہ صرف اس لئے کیا گیا کہ مسلمان برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں رہنے پر مجبور ہوں۔ اس کی دلیل حضرتؒ نے یہ لکھی کہ:

"پنجاب خفیہ پولیس کے کمشنر MR JEN HINS نے برطانوی خفیہ کے ایک افسر اعلیٰ کو ۷ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ میں پنجاب کلب لاہور سے ایک خفیہ خط لکھا جو لندن کے اخبارات میں شائع ہوا اس میں HINS نے لکھا تھا کہ اُمید

یہی ہے کہ حد بندی کمیشن کے فیصلے سے مسلمانوں میں بے چینی بڑھ جائے گی اور اگر ایسا ہوا تو مسلمان برطانوی حفاظت کے زمرہ میں رہنا پسند کریں گے۔"

اس خط پر پاکستان ٹائمز نے لکھا کہ پنجاب کے سابق گورنر SIR AVAN JEN KINS کے خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بہت سی مشکلات کا سرچشمہ ہمارے سابق حکمراں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انتقال اختیارات پر غور ہو رہا تھا تو یہ برطانوی افسر ہمارے ملک میں خفیہ ایجنٹوں کا جال بچھا کر ایک سازش کی تیاری کر رہے تھے۔

MR JEN KINS کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حد بندی کا فیصلہ مسلمانوں کے لئے بے چینی کا موجب ہوگا؟ کیا ہم سمجھیں کہ حد بندی کا فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا؟ غیر منصفانہ فیصلہ سے ہی ہندوستان و پاکستان کے درمیان ناخوش گوار تعلقات پیدا کئے جا سکتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس لئے ناانصافی کی گئی کہ وہ کمزور پارٹی کے تھے۔ اشتعال کے نتیجے میں جب دوسری مصیبتوں سے پریشان ہوں تو لامحالہ انگریز کو یاد کریں اور محتاج ہو کر شاطران برطانیہ کے پھندے میں پھنس جائیں۔

فسادات کی ظاہری نوعیت فرقہ وارانہ تھی مگر درحقیقت سنگ دل اور ملوکیت پرست ٹوریوں کے ہاتھ اس فرقہ پرستی کے پردے میں کام کر رہے تھے۔ پنڈت سندر لال کو گاندھی جی نے پنجاب کا دورہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ انھوں نے بیان میں کہا کہ میرا یقین ہے کہ کسی غیر جانب دار عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ اسلحہ اور گولی بارود کا زیادہ تر ذخیرہ جو مختلف مقامات پر ہندو مسلمانوں یا سکھوں نے استعمال کیا یا استعمال کیا جانے والا تھا وہ ذمہ دار برطانوی افسروں کے ذریعہ آیا۔

لائل پور کے مسلم ڈپٹی کمشنر نے وہاں کے ہندو چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ سے کہا کہ اگر اس ضلع کے انگریز کرنل فینچ کو ہٹا دیا جائے تو ایک بھی ہندو یا سکھ نہ لٹے گا۔ راولپنڈی کے تقریباً تمام سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کی متفقہ رائے تھی کہ وہاں کے مارچ کے فسادات کی براہ راست ذمہ داری مسٹر سی ایل کوٹس ڈپٹی کمشنر اور مسٹر میکڈانلڈ ہوم سکریٹری پر تھی۔

مشرقی پنجاب کے ایک ضلع میں جب ہندو مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ اقلیت کے لوگوں

کو نہ ستایا جائے تو ایک برطانوی افسر نے آگ کو دوبارہ سلگانے کی غرض سے موٹر میں طویل سفر کیا اور راستہ میں عوام پر گولیاں چلائیں اور ان کو ہلاک کیا۔"

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ اُن واقعات، اعداد و شمار اور مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں سے انگریز افسران فسادات اور بدامنی کو ہوا دینے کے لئے اسلحہ اور ہتھیار سپلائی کر رہے تھے، حضرتؒ نے فرمایا:

"واقعات کی شہادت یہ ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان آزادی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا اور ہندوستانی لیڈران آئینی، قانونی اور پُرامن طریقہ پر برطانیہ سے حصولِ اختیارات کی جدوجہد میں مصروف تھے، عین اُسی زمانے میں ٹوری پارٹی کے انگریز کارکن سرزمینِ ہندوستان میں فسادات کی بارودی سُرنگیں بچھا رہے تھے۔ ابھی ۱۵ اگست آیا بھی نہ تھا کہ سُرنگیں بھڑکنے لگیں اور تقریباً ½ ہندوستان کی اقلیتوں کو نذرِ آتش کرنے لگیں، تبادلۂ آبادی نے اس آگ پر تیل کا کام کیا اور بربریت و وحشت کی وہ مثالیں پیش کیں جن کی نظیر سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔"

اس کے بعد حضرتؒ نے تبادلۂ آبادی کی اسکیم کی بناء پر جو مظالم اور تباہیاں پیش آئیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے پنڈت سُندرلال کی رپورٹ کا یہ اقتباس نقل کیا:

"انتقال آبادی کی کارروائی انسانیت کے ساتھ ایک گناہِ عظیم ہے، شاید اس سے زیادہ تاریک تر گناہ انسانی تاریخ میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ مجھے تو اکثر یہ خیال آتا ہے کہ کم از کم ہمارے ایک درجن چوٹی کے لیڈر جن میں سیاسی پارٹیوں کے لیڈر شامل ہوں اور برطانوی قوم کے سیاسی لیڈروں پر اس جرم کا مقدمہ انہی پناہ گزینوں کے سیدھے اور غیر جانب دار نمائندوں کی عدالت میں چلانا چاہیے جن پر ان مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔"

آگے چل کر حضرت نے اغوا شدہ خواتین کی مظلومیت، معصومیت اور حالِ زار کا تذکرہ کر کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ:

"ظلم وستم کا استیصال اور مظلوموں کو نجات دلانا اسلام کے پروگرام کا ایک حصہ اور مسلمانوں کا فرض ہے۔ اس لوٹ مار اور قتل وغارت کو اسلامی جہاد کہنا اسلام کی ملحدانہ توہین ہے"۔

تحریک پاکستان اور اس کے نتائج کے بارے میں وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا:

"اپنی خواہشات کو اسلام کی طرف منسوب کرنا اور من مانی چیز کو اسلامی چیز قرار دینا اسلام کے ساتھ ظلم عظیم اور ملت کے ساتھ غداری ہے۔ سیدھے سادے مسلمان ایک عرصے تک تحریک پاکستان کو اسلامی تحریک سمجھتے رہے لیکن اس سادگی اور غلط رہنمائی کے نتائج جو ہمارے سامنے ہیں۔ اگر ہم چشم بصیرت رکھتے ہیں تو ہمیں سبق لینا چاہیے"۔

آگے چل کر گاندھی جی کے قتل اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرتؒ نے جمعیۃ علماء ہند کی سیاست سے علٰحدگی کا اعلان فرمایا:

"جمعیۃ علماء ہند ہمیشہ سیاسیات میں ہندو مسلم اشتراک کی قائل رہی ہے، ہندوستان کبھی بھی سیاسی اور ملکی معاملات میں تفرقہ اور اختلاف کا قائل نہیں رہا ہے۔ اس کی حکومتیں خواہ مسلم حاکم کے زیر اثر رہی ہوں یا ہندو فرمانروا کے زیر نگیں کبھی بھی افتراق وامتیاز سے آشنا نہیں ہوئیں"۔

"۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جبکہ ہندوستان اپنی قسمت کا خود مالک ہوگیا ہے اور انڈین یونین کی دستور ساز اسمبلی نے جداگانہ انتخاب کی لعنت کو انڈیا سے ختم کر دیا تو قدرتی طور پر جمعیۃ علماء بھی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئی جو اس نے مجبوراً اپنے سر لی تھی۔ لہٰذا اس کی مجلس عاملہ منعقدہ یکم فروری ۱۹۴۸ء نے اعلان کر دیا کہ آئندہ جمعیۃ کا دائرۂ عمل صرف مذہبی، تمدنی اور تعلیمی حقوق وفرائض کے دائرے میں محدود ہوگا اور یہی اصول اب جمعیۃ علماء ہند کا مسلمہ اصول ہے"۔

"اگرچہ ہندوستان میں مسلمان اب ۱/۴ سے گھٹ کر صرف ۱/۱۰ رہ گئے ہیں ان کی تجارتی اور اقتصادی حیثیت ختم ہو گئی لیکن تمام کمزوریوں کے باوجود انڈین یونین کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے عمل اور کردار سے ملک کے لئے مفید ثابت ہوں۔"

ایک خاص نکتہ جس کی طرف حضرت نے ارشاد فرمایا غور کرنے سمجھنے اور یاد رکھنے کے بلکہ ریکارڈ رکھنے کے قابل ہے:

"پاکستان کے مفادات اور مصلحتیں الگ ہیں۔ اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے مفادات علٰحدہ ہیں۔ کہیں کہیں ان دونوں مفادات و مصالح میں تضادات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں ہی کے مصالح کی طرف نظر رکھیں۔"

"اگر مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار ہو تو ان کا فرض ہے کہ اپنے عمل اور کردار سے اپنی اہمیت اور افادیت کو ثابت کریں۔ وہ ملک کے لئے جس قدر زیادہ مفید ثابت ہوں گے اسی قدر ان کی عزت و وقعت ہوگی۔ ملک اور ملک کی خدمت کا صحیح جذبہ اور قابلیت پیدا کریں۔ لامحالہ کامیابی اور کامرانی ان کے ہم آغوش ہوگی۔ تقسیم ہندوستان نے مسلم مفادات کو بھی تقسیم کر دیا ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ جو معاملہ پاکستان کے لئے مفید ہو وہ انڈیا کے لئے بھی ہو، بلکہ بسا اوقات پاکستان اور ہند کے مفاد میں تضاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی مفید ہو۔ بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو مگر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہو۔ جب مفادات میں ایسا تضاد ہو جائے تو سوال یہ ہے کہ ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کا لحاظ رکھنا ہوگا یا پاکستانی

مسلمانوں کے مفاد کا؟ ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ خود اپنے ذمہ دار ہیں۔ ہم پر ہندوستان کے تقریباً چار کروڑ مسلمانوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمیں ہر صورت میں وہ شکل اختیار کرنی چاہیئے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔

ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوں۔ لیکن اگر کسی موقع پر ان دونوں کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہو تو ہمیں اسی اصول کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہوگا اور یہی اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔"

مذکورہ بالا مشورہ، نصیحت یا لائحۂ عمل ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصی توجہ اور اہتمام کا مستحق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک معمولی تقریر یا رسمی خطبۂ صدارت نہیں ہے بلکہ ایک قوم اور ملک کے مستقبل کا پروگرام ہے جس پر مسلمانوں کی ترقی اور عروج کا دار و مدار ہے۔ اس ضمن میں حضرتؒ نے مسلمانوں کو مسلسل جہاد میں مشغول رہنے کا مشورہ دیا کہ بغیر جہاد کے ہندوستان میں ان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے مگر جہاد کا وہ مطلب نہیں جو عوام ظاہری اعتبار سے سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ اس کے معنی صبر، استقامت، ضبط و تحمل اور اخلاقِ عالیہ سے مزین زندگی ہے۔ یہ وہ جہاد ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکۂ مکرمہ میں رہتے ہوئے اختیار فرمایا ہے:

"اسلامی تعلیمات، قرآن حکیم کے حکم و مواعظ، ربانی ارشادات آپ کے سامنے ہیں اگر آپ صحیح طور پر ان پر عمل کریں تو تاریخ پھر اپنے آپ کو دُہرا سکتی ہے۔ اور ایسے پاک نفوس سامنے آسکتے ہیں جو مرجع خلائق ہوں اور ہر فرقہ اور جماعت کے نیک سیرت ان کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہوں۔ آج مسلمانوں کو جہاد کا لفظ یاد رہ گیا ہے مگر یہ یاد نہیں رہ گیا ہے کہ باشندگانِ مکہ جیسے معاندین اسلام اور دشمنانِ ملت کے مقابلے میں صبر و استقامت، ضبط و تحمل کے ساتھ

اعلیٰ اخلاق کے مظاہرہ کو جہاد اکبر فرمایا گیا ہے۔ وجاھدھم بہ جہاداً کبیراً۔ اور خود اپنے نفس کے غیر صالح جذبات، ضبط خواہشات اور اخلاق رذیلہ کے پامال کرنے کو اور ان کے بجائے صالح جذبات اور مکارم اخلاق سے مزین ہونے کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر۔ اس جہاد کبیر اور جہاد اکبر میں نہ تیغ و تفنگ کی ضرورت ہے نہ خنجر و سناں کی۔ بلکہ صرف مضبوطی اور پختگی کے ساتھ عمل صالح کی ضرورت ہے جو ہتھیاروں سے زیادہ زود اثر ہے۔

اصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل وتوکل علی اللہ۔ ودع اذاھم وتوکل علی اللہ۔

اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ان کی ایذا رسانیوں کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔[1]

[1] خلاصہ خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء بمبئی ۱۹۴۸ء

مہتمم دار العلوم دیوبند کی ہجرت پاکستان

عام مسلمان اور پاکستان کے نام پر سب کچھ قربان کر دینے والے کم پڑھے لکھے یا بالکل ہی ناخواندہ لوگوں نے تو اس طرح ہجرت کی کہ گھر بار، جان مال، عزت و آبرو غرض پوری متاع زندگی داؤ پر لگا کر روانہ ہوئے مگر تعلیم یافتہ اور سیاست سے آشنا حضرات نے زیادہ تر ایسی حالت میں ہندوستان چھوڑا کہ ایک سوئی کا نقصان بھی نہیں اٹھایا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے کہ کسی خاص عنوان سے محدود ویزا پر پاکستان گئے، دو چار ماہ رہے، حالات کو ٹٹولتے رہے دیکھا کہ موقع بیٹھ رہا ہے تو رہ گئے ورنہ مدت مقررہ کے اندر اندر واپس آ گئے۔ بہت سے ایسے بھی رہے کہ موقع کی تلاش میں آج آج کل آج کل کرتے کرتے واپسی کی مدت ختم ہو گئی اور لاکھ لاکھ سر پٹکتے رہے مگر کبھی واپس نہیں آ سکے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ مہتمم دار العلوم حضرت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے خلیفہ تھے اور اپنے مزاج اور رجحان کے اعتبار سے مسلم لیگ اور پاکستان کے مؤید، معترف اور مددگار تھے۔ مگر چونکہ اس تائید و طرف داری سے علی الاعلان مدرسہ میں سیاسی محاذ آرائی ہوتی تھی اس لئے جماعت کے مصالح کا خیال فرماتے ہوئے ہمیشہ اپنی رائے اپنے ہی تک محدود رکھتے تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد نوعیت بالکل الگ ہو گئی تھی۔ علماء کرام وہاں تشریف لے جا رہے تھے اور شیخ الاسلام، مفتی اعظم اور مقتدائے امت جیسے مناصب پر فائز ہو رہے تھے۔ حضرت مہتمم صاحب بھی کسی موقع پر پاکستان تشریف لے گئے تو تلامذہ اور معتقدین نے وہیں قیام پر اصرار کیا۔ فوری طور پر کوئی صورت تو سامنے نہ آ سکی مگر اس تگ و دو میں واپسی کی مدت ختم ہو گئی اہل و عیال تو سب ہندوستان میں تھے ہی موصوف کی شہرت، عزت اور مقبولیت بھی بہ نسبت پاکستان کے ہندوستان میں کئی گنا

زیادہ تھی۔ ان حالات میں ہندوستان واپسی ضروری سمجھی گئی۔ مگر اب راستے ہمیشہ کے لیے مسدود ہو چکے تھے۔ معمول کے مطابق ہندوستانی ہائی کمیشن کی طرف رجوع کیا تو صاف جواب ہو گیا۔ اِدھر اُدھر سے سعی سفارش کرائی تو بالکل بے سود ہوئی۔

آخر کار حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھ کر واپسی کے لئے چارہ گری کے طالب ہوئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کے منتظر ہی تھے خط پاتے ہی مولانا حفظ الرحمٰن سے فرمایا کہ مولانا طیب صاحب کی واپسی کی اجازت حاصل کریں۔ مولانا نے ارباب حکومت سے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ اب ان کی واپسی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ ہر دلیل کے جواب میں حکومت یہ کہتی تھی کہ اگر ان کو اجازت دے دی گئی تو بڑے بڑے مسلم لیگیوں اور پاکستانیوں کے لئے دروازہ کھولنا پڑے گا' بہت سے اصحاب رائے بھی اس بات کے خلاف تھے کہ حضرت مولانا طیب صاحب کو واپس بلایا جائے مگر حضرتؒ ایسی ہر تجویز کو سختی سے رد کرتے رہے اور آخر طور پر بہ نفس نفیس مولینا ابو الکلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ وزیر تعلیم کے پاس تشریف لے گئے۔ مولانا آزاد ملاقاتوں اور معاملات میں ضوابط و قواعد اور دوسرے لفظوں میں پروٹوکول کے بہت پابند تھے۔ بلا اطلاع اور تعینِ وقت کے کسی سے نہیں ملتے تھے۔ اب تو خیر حکومت کے حلقۂ وزارت سے منسلک تھے۔ جب بالکل ہی گوشہ نشین تھے اس وقت بھی ان کے رکھ رکھاؤ اور پابندیٔ ضوابط کا یہی حال تھا۔ ایک بار ملک کے سب سے بڑے اور قابلِ احترام لیڈر سی آر داس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ میں مشغول ہوں کسی دوسرے وقت آئیں۔ اِدھر اپنے حضرت کا یہ حال تھا کہ انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ملاقات کے لئے بھی کسی پابندی اور ضابطہ داری کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ حسب دستور بلا کسی تکلف اور اہتمام کے پہنچ گئے۔ مولانا آزاد کے یہاں ان ضوابط و قواعد میں کچھ مستثنیات بھی تھے جن میں حضرت بھی شامل تھے حضرت نے سلام و دعا کے بعد اظہار مدّعا کیا۔ مولانا نے حضرت کو تفصیل سے سمجھایا کہ قانون کی پابندی لازمی ہے اور اس کی رو سے مولینا طیب صاحب کی واپسی ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نے اپنی رائے کا بھی

اظہار کیا کہ مولانا طیب صاحب وہیں بہتر ہیں آپ ان کو وہیں رہنے دیں۔ اس بات پر حضرت کے تیور بدل گئے اور سختی سے فرمایا کہ ان کو ہر حال میں یہاں آنا چاہیئے۔ آپ اس معاملے میں لیت ولعل نہ کریں۔ مجبور ہوکر مولانا آزاد نے پنڈت جواہر لال کو فون کیا اور حضرت کے اصرار کے بارے میں تفصیل سے مطلع کیا۔ پنڈت جی نے اسی وقت فرمادیا کہ آپ حضرت کو مطمئن کردیں میں ابھی ان کی واپسی کے احکامات صادر کرتا ہوں۔ مولانا طیب صاحب جب دیوبند پہنچے تو طلباء دیوبند، اساتذہ اور خود حضرت نے ان کا بہت شاندار استقبال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موصوف کوئی بڑا دینی اور اسلامی معرکہ سر کرکے آئے ہیں۔ راقم الحروف نے دیکھا اور خوب اچھی طرح یاد بھی ہے کہ مہتمم صاحب ٹرین سے اتر کر حضرت کی طرف لپکے اور معانقہ و مصافحہ کیا۔ حضرت نے اپنی خیر مقدمی تقریر اس شعر "اے تماشا گاہ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشائی روی" سے شروع کی۔ اسی شام کو مدرسہ میں مولینا کے اعزاز میں جلسہ ہوا۔ حضرت مہتمم صاحب نے اپنی تقریر سے پہلے یہ شعر پڑھا ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل — نسیم صبح تیری مہربانی

اور پھر فرمایا کہ اب جبکہ میری واپسی کی ساری تدابیر مسدود ہوچکی تھیں۔ یہ محض حضرت مدنی مدظلہم کی مہربانی ہے کہ میں آج پھر یہاں حاضر ہوں۔

مدرسہ دار العلوم کی سیاست اور معاملات میں اس واقعہ کی اہمیت کیا تھی؟ ہمیں اس سوال سے کوئی تعلق نہیں، یہاں پر نمونہ اس بات کا دکھلانا ہے کہ آزادی کے بعد حضرت نے مدارس اسلامیہ اور مراکز دینیہ کی طرف بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی توجہ مرکوز رکھی اور اس پالیسی پر عمل پیرا رہے کہ تقسیم کے نتیجہ میں اور اس افراتفری کے وقت میں مدارس میں کوئی کمزوری، تبدیلی اور بدنظمی نہ ہونے پائے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی تاریخ اور پاکستان کے لئے اس کی خدمات کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ آزادی کے فوراً بعد اس کی بقا اور تحفظ کا سوال بڑا نازک اور اہم تھا۔ حضرت کی زیر قیادت ان کے خدام اور جمعیۃ علماء کے ذمہ داران نے دن رات ایک کرکے

اس کی بنیادوں کو پھر سے مضبوط کیا جو جڑ سے ہل چکی تھیں۔ مدرسہ عالیہ عربیہ کلکتہ تو تقریباً بند ہی ہو چکا تھا۔ مگر حضرت کی زیرِ ہدایت آپ کے معتقدین، مریدین اور شمعین علما کی ایک جماعت مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حمید الدین صاحب سابق شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد کفیل صاحب بجنوری رحمہم اللہ، مولانا مفتی رشید احمد صاحب، مولانا محمد طاہر صاحب وغیرہ وغیرہ نے کلکتہ پہنچ کر مدرسہ کی خدمات کو از سرِ نو زندہ کیا اور پہلے سے زیادہ ترقی پر گامزن کیا۔ آج ہندوستان میں جو مدارس دینیہ اور مراکز اسلامیہ اپنی سابقہ روایات اور طریقوں پر سرگرم عمل ہیں اس میں حضرت رحمۃ اللہ کی پیش بندیوں، جانکاہیوں اور خدمات کا بہت بڑا دخل ہے۔

اس باب میں ایک تاریخی حقیقت جریدۂ عالم پر ہمیشہ تابندہ و پائندہ رہے گی کہ حضرت کی کوششوں کی تکمیل و تنفیذ امام الہند مولانا آزاد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ہندوستان اور ملت اسلامیہ کی تاریخ میں مولٰنا کا یہ کارنامہ ہمیشہ سنہرے حرفوں میں چمکتا رہے گا۔

حکومت ہندوستان اور حضرتؒ

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں جن اصحاب نے ہندوستان کی آزادی یا اس کی تقسیم کے لئے تھوڑی بہت بھی خدمتیں انجام دی تھیں انھوں نے آزادی کے بعد اس کی خوب خوب قیمتیں وصول کیں۔ البتہ بہت سے حضرات ایسے بھی نکلے جنھوں نے ازخود کوئی مطالبہ یا درخواست نہیں کی مگر حکومت کی طرف سے اگر کوئی پیش کش ہوتی تو بدل وجان قبول کیا۔ حضرت کا دامن اس نوع کی کسی بھی آلودگی سے کبھی ملوث نہیں ہوا۔ گورنمنٹ کی کیبنٹ کے سارے ہی ممبران حضرت کے جیل اور ریل کے پرانے رفقا تھے۔ ان میں سے بعض بہت زیادہ معتقد تھے اور بعضوں سے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ مگر شدید اور نازک ترین قومی اور ملکی مسائل کے مواقع کے علاوہ حضرت نے کبھی ان لوگوں سے ملاقات بھی نہیں کی۔ یہ ضرور ہے کہ جو صاحبان ازخود ملاقات کے لئے آستانہ پر حاضر ہوگئے یا درخواست کی ان سے پوری بشاشت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات فرمائی۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور طبیعت ثانیہ تھی کہ عامی، عالی، بڑے چھوٹے اور مال دار و فقیر ہر ایک کے ساتھ یکساں مروت، اکرام و احترام اور دلداری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ نہ کسی کے ساتھ کوئی کوتاہی کرتے تھے نہ کسی کے لئے مبالغہ آرائی فرماتے تھے۔

سنہ اور تاریخ تو اب یاد نہیں مگر واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ ذہن میں ہے کہ ایک بار ملک اور تاریخ ہندوستان کے مشہور لیڈر سبھاش چندر بوس سلہٹ گئے۔ اتفاق سے حضرت بھی اس وقت وہیں موجود تھے اور رمضان شریف کے اخیر عشرے میں حسب معمول مسجد میں معتکف تھے۔ سبھاش نے حضرت سے ملاقات کی خواہش کی۔ لوگوں نے بتلایا کہ وہ مسجد میں معتکف ہیں اور باہر تشریف نہیں لا سکتے۔ اس پر انھوں نے مسجد ہی

میں حاضری پر اصرار کیا۔ ان کی استقبالیہ کے لوگ پہلے تو بہت پس و پیش میں پڑے مگر آخر میں حضرت کے سامنے ان کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ حضرت کی اجازت پر وہ مسجد اور حسنگف ہی میں تشریف لائے۔ راقم السطور اس وقت عمر کے اس مرحلے پر تھا کہ نہ ملاقات کی کوئی اہمیت محسوس ہوئی اور نہ ملاقات کرنے والوں میں کوئی خصوصیت نظر آئی، اس لئے باوجود مجلس میں حاضری کے یہ بالکل یاد نہیں کہ ملاقات کتنی دیر ہوئی اور کیا باتیں ہوئیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی غیر ملکی اہم شخصیت کی ہندوستان آمد کے موقع پر حکومت ہند کا یہ پروگرام ہوتا تھا کہ حضرت اُن سے ملاقات کریں۔ مصر کے مشہور لیڈر اور سابق صدر انور السادات ہندوستان آئے۔ اس وقت وہ شاید مصر کے مذہبی امور کے وزیر اور جمال عبد الناصر کے بڑے معتمد تھے۔ حکومت ہند نے ان کی دیوبند حاضری کا اہتمام کیا۔ حضرت نے حسب عادت ان کے ساتھ اخلاق کریمانہ اور عزت افزائی کا معاملہ کیا۔ اس موقع پر ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا کہ بوقتِ رخصت انور السادات نے حضرت کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش ظاہر کی اور عرض کیا کہ ایک منٹ کے لئے میرے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ حضرت کو خیال بھی نہ آیا کہ اس کھڑے ہونے کا کیا مطلب مقصد ہے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے۔ فوٹو گرافر نے کیمرہ سامنے کیا تب بھی حضرت نہیں سمجھے کہ یہ کیا چیز ہے اور کیوں سامنے لائی گئی ہے۔ مگر جب فلش کی چمک ہوئی تب حضرت کو یاد آیا کہ ایسی روشنیاں جلسوں جلوسوں میں فوٹو کھینچنے کے وقت ہوتی ہیں۔ فوراً ترشروئی کے ساتھ الگ ہو گئے اور تلخی کے ساتھ سادات کو مخاطب کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے دوزخ میں جو لوگ جائیں گے وہ مصورین ہی ہوں گے۔ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی حضرت سے ملاقات اور مدرسہ میں حاضری کے لئے دیوبند آنے کا ارادہ کیا۔ صدر جمہوریہ کے باڈی گارڈ عملہ نے اعتراض کیا کہ صدر دمہ اور قلب کے مریض ہیں، دیوبند چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس میں راحت رسانی کے انتظامات نہیں ہو سکتے۔ مگر راجندر پرشاد

کے اصرار پر حکومت کو مجبور ہونا پڑا اور آخر کار وہ دیوبند آئے اور حضرت رحمۃ اللہ نے اپنی مزاجی خوش خلقی کے ساتھ ان کی تواضع فرمائی۔

سابق وزیر اعظم ہندوستان لال بہادر شاستری آستانے پر حاضر ہوئے اس وقت وہ حکومت ہند میں ریلوے منسٹر تھے۔ متواضع اور منکسر مزاج انسان تھے۔ حضرت کی مجلس میں ایک فروتر جگہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت نے مجلس کی ممتاز جگہ پر اشارہ کرکے فرمایا کہ اب آپ وزیر ہیں اس جگہ تشریف رکھیے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ حضرت آپ کو یاد نہیں رہا، جیل میں بھی آپ کے دربار میں میری یہی جگہ مقرر تھی۔ آج بھی میں یہیں بیٹھوں گا۔

ایک دوسرے مرکزی وزیر مہابیر تیاگی بھی بغیر کسی رسمی تکلفات کے حضرت کے دولت کدے پر آکر ملے۔ پنڈت گووند ولبھ پنت جس وقت یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس زمانے میں کسی سرکاری دورے پر دیوبند تشریف لائے اور حاضری کا ارادہ کیا۔ حضرت نے کثرت مشاغل کی بنا پر عذر فرمایا مگر ان کے میزبان انھیں عصر بعد کی عام مجلس میں لے آئے جس میں ہر کس و ناکس کو باریابی کی اجازت تھی۔ جب وہ آہی گئے تو حضرت نے حسب عادت و مزاج خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے ملاقات فرمائی۔ اسی طرح مرحوم رفیع احمد قدوائی بھی ایک دن بلا اطلاع تشریف لائے اور عام حاضرین کی صف میں فروکش ہوگئے۔ کسی نے انھیں پہچانا بھی نہیں۔ کچھ دیر بعد حضرت اندرون خانہ سے برآمد ہوئے تب لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ قدوائی صاحب ہیں۔ اس قسم کی ملاقاتوں کے علاوہ کبھی کبھی قومی اور ملی تقاضوں پر حضرت اور حکومت کے ذمہ داران، راجندر پرشاد، جواہر لال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان مراسلت بھی ہوتی تھی۔ افسوس کہ اس درویشانہ اور فقیرانہ ماحول میں اس کی کبھی کوئی اہمیت نہ سمجھی گئی کہ ان مراسلات کی نقول رکھی جائیں اس لئے کہ حضرت اس قسم کی رسمی اور غیر ضروری باتوں کی طرف کبھی توجہ نہیں فرماتے تھے۔

حکومت ہندوستان نے خدمات کے اعتراف کے طور پر حضرت کو پدم وبھوشن کا خطاب دیا۔ اس خطاب کے ساتھ کوئی تمغہ، خلعت اور تاحیات کوئی ماہوار رقم پیش کی جاتی ہے جس مجلس میں قاصد نے اس خطاب کی اطلاع دی حضرت نے اسی مجلس میں ارشاد فرمایا کہ

حکومت کو لکھ دیا جائے کہ میں یہ خطاب نامنظور اور واپس کرتا ہوں۔ اس بارے میں جو خط حضرت نے حکومت ہند کو لکھا وہ انکار کی صحیح وجہ پیش کرتا ہے۔

بحضور جناب فیض مآب صدر جمہوریہ ہند دام اقبالکم

بعد از آداب عرض آنکہ اگرچہ اب تک مجھ کو باقاعدہ کوئی اطلاع نہیں دی گئی مگر اخباروں میں شائع شدہ اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جناب نے پدم وبھوشن ؔ کے تمغہ سے بنا بر صدارت جمعیۃ علماء ہند، اور خدمات علمیہ دار العلوم دیوبند اور جدوجہد آزادئ وطن میری عزت افزائی ہے، اگر واقعہ صحیح ہے تو میں آپ کی اس عزت افزائی اور قدر دانی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور عرض رساں ہوں کہ چونکہ ایسا تمغہ میرے نزدیک پبلک کی نگاہوں میں بے لوث آزاد خادمانِ ملک و ملت کی آزادئ رائے اور اظہار حق کو مجروح کرنا اور قومی حکومت کی صحیح اور سچی راہ نمائی کی راہ میں ایک قسم کی رکاوٹ ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بعد شکریہ اس تمغہ کو واپس کردوں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۱۰ر ستمبر ۱۹۵۴ء

آزاد حکومت کے ساتھ حضرت کا تعلق بس انہی حدود تک محدود رہا۔ قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ حضرت نے حکومت سے نہ کوئی لفظ کہا نہ لکھا اور نہ از خود کبھی کسی ذاتی معاملات کے لئے تشریف لے گئے۔

اجلاس جمعیۃ علماء لکھنؤ کی صدارت

۱۹۴۹ء

آزادی ملے کچھ کم دو سال ہو چکے تھے، مسلمانوں کے گوناگوں مسائل اور مشکلات روز بروز فزوں تر تھے۔ تعصب اور عناد کا معاملہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں یوپی میں زیادہ نمایاں تھا۔ اس بار جمعیۃ علماء ہند کا سولہواں اجلاس اسی صوبہ کی راجدھانی یوپی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیر صدارت منعقد کیا گیا۔ اس میں حضرت نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے لئے ایک قیمتی دستاویز ہے جس میں کچھ روشنی گذشتہ سیاست پر بھی ہے اور مستقبل کا لائحۂ عمل بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس جگہ اس خطبہ کی صرف تلخیص ہی نقل کی جاتی ہے جس سے اصل کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔
حضرت نے فرمایا:

> یہ برطانیہ کی سیاست بازی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں آپس میں برسرپیکار ہوئیں۔ برطانیہ نے دو قومی نظریہ کی ایجاد اسی مقصد کے لئے کی تھی کہ ہندوستان کے ٹکڑے کرئے جائیں اور اسی نظریہ کے ذریعہ سے نواکھالی، بہار، گڈھ مکتیشر، بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور پنجاب وغیرہ کی سرزمین کو ظلم وستم کے خون سے سینچ کر تقسیم کی بنیادوں کو مضبوط کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ کانگریس جیسی قومی جماعت نے بھی تقسیم کو منظور کیا۔ جمعیۃ علماء ہند ایک اکیلی جماعت ہے جس نے آخر تک تقسیم کی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کی۔ دو سال کی قلیل مدت میں ملک کے ہر فرد اور ہر طبقہ نے دیکھ لیا کہ تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں ہندو مسلمان تباہ و برباد ہوئے اور موت کے گھاٹ اُتر گئے، کروڑوں انسان بے در، بے گھر اور خانماں برباد ہو گئے۔ ہزارہا بہنوں بیٹیوں اور بیوؤں کی عصمت وعفت کا دامن تار تار کر دیا گیا۔ یہ واقعات دل ودماغ میں زخم بن کر چبھ

رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ ہمارے ہاتھ تقسیم ہندوستان کے خون سے پاک ہیں۔

جدید ہندوستان کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصہ

جو کچھ گزر گیا وہ ختم ہوا مگر اب ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آیندہ کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ ملک کی کمزوریوں کو کس طرح ختم کیا جائے جنگ آزادی کے دوران عوام سے جو وعدے کیے تھے ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے علمی اور تعلیمی ترقی کی انتہائی ضرورت سامنے آتی ہے۔ ہماری اور خاص طور پر مسلمانوں کی پوری توجہ اور جدوجہد اس میدان میں خرچ ہونی چاہیے کہ ہم ایسی علمی قابلیت اور ایسی امتیازی حیثیت حاصل کریں کہ حکومت، عوام اور ملک ہم سے استفادہ کرنے اور ہماری قابلیت کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہمیں دینی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر بھی اپنی کوششیں مرکوز کرنی پڑیں گی۔ اگر دنیا میں اور ملک میں امن قائم رکھنا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی اور اصلاح کا بھی پورا خیال رکھا جائے اور اس کے لئے دلوں میں خوف خدا اور دینی و مذہبی اسپرٹ بیدار کرنی سب سے زیادہ ضروری ہے۔

زبان اور رسم الخط

زبان اور رسم الخط کا مسئلہ بھی نازک اور نہایت اہم ہے۔ ملک میں یک جہتی اور اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح انڈین نیشنل کانگریس اور مہاتما گاندھی نے ہندوستانی کو پورے ملک کی زبان بنانا طے کیا تھا اس پر عمل کیا جائے۔ ہندوستانی زبان کا رسم الخط دیوناگری بھی ہو اور اُردو بھی ہو۔ زبان کسی مذہب کا جزو نہیں ہوتی۔ اسلامی تصنیفات اور تعلیمات کا بڑا ذخیرہ اردو میں موجود ہے۔ مگر اب وہ ہندی اور سنسکرت میں بھی منتقل ہو سکتا ہے۔ یہ کس قدر افسوسناک اور حیرت انگیز بات ہے کہ ہندوستان کے مختلف

فرقے جو صدہا سال سے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں ایک دوسرے کے خیالات، عقائد، ان کی مذہبی فلاسفی اور ان کی تاریخ سے واقف نہیں ہوتے۔ جو ملک سیکڑوں ہزاروں میل دور ہیں ان کی زبان، تہذیب اور احساسات و نفسیات تو ہماری توجہات کا مرکز بن سکتے ہیں مگر خود اپنے ملک والوں کی تواریخ اور معتقدات سے ہم ناواقف رہتے ہیں۔ آج ہندی قومیت کے افراد اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس اجنبیت کو ختم کریں۔ ہندی قومیت والے ہندوستانی زبان اختیار کریں اور ہر ہندوستانی ہندی کے ساتھ اردو سے بھی واقف ہو اور مسلمان اردو کے ساتھ ہندی تعلیم میں بھی جدوجہد کریں۔

ملک کی حقیقی اور سچی تاریخ کی ضرورت

برطانیہ کی باقیات خبیثہ میں سے ایک وہ طومار ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ جدید کہا جاتا ہے جو اس وقت اسکولوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے اور نوجوانوں کو یاد کرائی جاتی ہے۔ یہ ہندوستان کی صحیح تاریخ نہیں ہے بلکہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے برطانوی دماغوں کی پیداوار ہے۔ تاریخی مآخذ سے نہیں بلکہ سیاسی ضرورتوں سے گڑھی گئی ہے۔ اس کے ثبوت میں حضرتؒ نے برطانوی مولفین و محققین کے حوالے دینے کے بعد فرمایا کہ "آج ہم اخلاص، اخلاق اور انسانیت کی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تعمیر کر رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مسخ شدہ تاریخ کی اصلاح کریں اور ہندوستان کے اخلاقی معیار کو اجاگر کریں۔"

ملک میں مسلمانوں کا مستقبل

آج ہر شخص یہ سوال کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سوال وہی قوم کر سکتی ہے جس کے پاس اپنی تاریخ اور اپنا لائحۂ عمل موجود نہ ہو۔ اسلام نے ہماری زندگی اور مستقبل کے لائحۂ عمل کو ہمارے اپنے کردار، جدوجہد اور عمل پر موقوف رکھا ہے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم، یعنی عزت، ذلت، بلندی، پستی، کامیابی، ناکامی

اقبال مندی و نامرادی کی جو بھی حالت کسی قوم کی ہوتی ہے خدا اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے عمل اور کردار میں تبدیلی نہ پیدا کرے۔

اجتماعی اور قومی زندگی میں جو مشکلات اور ناکامیاں پیش آتی ہیں ان کو لوگ خدا، قدرت یا قسمت پر محمول کر دیتے ہیں، مگر قرآن حکیم اس کا ذمہ دار خود ہمارے ہی کردار اور اعمال کو قرار دیتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وما اصابکم من مصیبۃ فبما ایدیکم جو مصیبت تم کو پیش آئی وہ تمھارے اپنے کرتوت کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل ان کے اپنے کردار، قوت عمل، اخلاق فاضلہ، صبر و انتظار اور حسن تعامل پر موقوف ہے۔ اپنے ملک میں اپنا حصہ قوت عمل، محنت اور ترقی کی دوڑ میں حصہ لے کر حاصل کیجئے۔ ہندوستان ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے۔ اگر آپ کے پاس اہلیت اور قابلیت ہے تو یہاں آپ کے حقوق کوئی غصب نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوئی قوم اپنے حقوق اور حصہ کی بھیک مانگتی ہے تو اس خیراتی زندگی سے موت اچھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں پر بڑا صبر آزما وقت آپڑا ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ حوصلہ شکن حالات پیش آئیں گے مگر یہ بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ آپ کی عظمت اور وقار کا راز حسن عمل، اخلاق کریمانہ اور اعلیٰ کردار میں مضمر ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کا نام سرفہرست ہونا چاہیے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صبر و اتحاد اور توکل علی اللہ کی ہدایت فرمائی ہے: اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ وان اللہ مع الصابرین۔

میں آپ کو ایک بنیادی بات بتلاتا ہوں۔ اگر آپ میں عزم و ہمت اور قوتِ عمل ہے تو دنیا، اس کی ساری ترقیاں اور دائمی سعادت آپ کے ہاتھوں میں ہے لیکن اگر یہ صفات آپ میں نہیں ہیں تو کوئی تدبیر آپ کو نفع نہیں پہنچا سکتی۔[1]

---

[1] تلخیص خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء لکھنؤ ۱۹۴۹ء

تحریکِ مدحِ صحابہ کی حمایت

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہندوستان اور خصوصاً لکھنؤ میں شیعہ سنی اختلافات اور عداوتوں کی شروعات ہوئی۔ اس معاملے کی تاریخ، اسباب اور اصل حقائق تو اس موضوع پر تحقیق و مطالعے ہی والے جانتے ہوں گے۔ مگر دونوں فریق کے اقوال، اعمال اور دلائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان غنی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں ہجوگوئی، اور سب وشتم شیعہ حضرات کے نزدیک ان کے مسلک کی اساس ہے۔ چنانچہ یہ لوگ برسرِعام، جلسوں میں، مجلسوں اور محرم کے جلوسوں میں حضرات صحابہ اور بالخصوص ان تینوں خلفائے راشدین پر تبرا پڑھتے ہیں۔ اور ظلم یہ کہ یہ حضرات تبرا کا مطلب اہانت، تحقیر اور سب وشتم قرار دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اہل سنت و الجماعت یعنی سنیوں نے بھی برسرِعام سڑکوں اور گلیوں میں جواب دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر چونکہ ہجو اور سب وشتم تو کجا ان کے مذہب میں کسی عامی اور معمولی شخص کی بھی بدگوئی اور عیب جوئی حرام ہے اس لئے انھوں نے یہ جواب مدح صحابہ پڑھ کر دیا مگر سنیوں کا یہ اقدام اور مدح صحابہ کا عمل شیعہ حضرات کے نزدیک اس درجہ قابلِ اعتراض قرار پایا کہ اس کی مخالفت میں لڑائی جھگڑے، بلوہ وفساد اور مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ اس مقابلہ بازی اور زور آزمائی کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف مستقل جماعتیں اور مکمل اکھاڑے جم گئے۔ سنیوں کی طرف سے مجلس احرار اسلام لال لال قمیصیں پہن کر اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ چار یاری جھنڈا لے کر مقابلے میں آگئے۔ اور مدح صحابہ کو ایک تحریک کی شکل دے ڈالی۔ حکومت یوپی نے ۱۹۰۸ء میں سال کے تین دنوں یوم عاشورہ، چہلم اور ۲۱ رمضان المبارک میں مدح صحابہ پڑھنے پر پابندی لگادی۔ سنیوں نے اس پابندی کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کا فیصلہ

کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس تحریک کے ماتحت ایک شاندار کانفرنس منعقد ہوئی جس میں وقت کے بہت سے سربرآوردہ علماء نے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے شرکت فرمائی اور اپنی تقریر میں فرمایا:

"مدح صحابہ امر مستحب اور مستحسن ہے۔ مگر شرعی اصول یہ ہے کہ جب کوئی ظالم جماعت اور جابر حکومت کسی امر مستحب پر بندش لگائے اور مسلمانوں کو مجبور کرے تو شرعاً اس امر کا کرنا واجب ہوجاتا ہے اور منع کرنے والی جماعت کا یہ فعل مداخلت فی الدین کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مدح صحابہ جو پہلے مستحب تھا حکومت کی دخل اندازی سے اب مسلمانوں پر واجب ہوگیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان دامے، درمے سخنے جس طرح ممکن ہو اس ناقابل نفرت قانون سے آزادی حاصل کریں۔ اگر مقامی مسلمان قربانی دیتے دیتے ہار جائیں تو قرب و جوار کی بستیوں کے رہنے والے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے۔" (ملخص)[1]

حضرت نے تحریک مدح صحابہ کے سکریٹری مولانا ظفر الملک علوی مرحوم کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں مدح صحابہ کے وجوب پر مفصل دلائل تحریر فرمائے۔ اس مکتوب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر تنقید اور ان پر نکتہ چینی کے معاملے میں بھی حضرت کے مسلک کی وضاحت ہے اور ساتھ ہندوستانی باشندوں کی رواداری اور اتحاد و اتفاق پر ان کی پالیسی کی نشاندہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"احادیث صحیحہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ثناء و صفت، ان سے محبت رکھنے کی تاکید، ان کی شان میں گستاخی کی مذمت، ان کی تابعداری کا حکم، ان کے ذکر بالخیر کا ارشاد وغیرہ نہایت کثرت سے مذکور ہے۔ اسی بناء پر مسلمانوں کے اجتماعات، عیدین، حج اور جمعہ وغیرہ میں خطبہ پڑھتے ہوئے صحابہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی ثناء و صفت کرنی نہ صرف مستحب قرار دی گئی ہے بلکہ اس کو

---

[1] مقالہ، حضرت شیخ الاسلام حیات و کارنامے، ص ۴۲۲ مرتبہ: ڈاکٹر رشید الوحیدی۔

شعار اہلِ سنت والجماعت بھی قرار دیا گیا ہے۔ (درمختار، شامی، عالمگیری، مکتوبات مجدد الف ثانی جلد دوم ص ۱۵ وغیرہ) اس کے علاوہ جس جگہ صحابہ کرام سے نہ صرف یہ کہ بدظنی پھیلائی جاتی ہو بلکہ اشھد انّ علیاً وصی اللّٰہ وخلیفۃ بلا فصل باواز بلند اذان میں کہا جاتا ہو نیز امام باڑوں، مجلس خاص، خصوصی مساجد میں ان کی طرف جھوٹے اور غلط اہانت آمیز واقعات منسوب کئے جاتے ہوں اور عوام سنیوں کا انھیں سننا، شریک ہونا اور غلطی میں پڑنا ممکن ہو تو سنیوں کی اصلاح اور تحفظ عقائد کے لئے ایسی مجالس کا منعقد کرنا جن میں صحابہ کرام کے صحیح واقعات بیان کئے جائیں اور ان کی ثنا و صفت بیان کی جائے، واجب ہے۔

بالخصوص جبکہ دوسری قومیں اس کو جرم قرار دینے لگیں اس وقت اس کا وجوب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ انہی امور کی بنا پر لکھنؤ میں مدح صحابہ کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ مگر اہل شیعہ نے حکام پر اثر ڈال کر ۱۹۰۸ء سے اس میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ تشددات ہوئے، گرفتاریاں ہوئیں، مدح صحابہ کرام رضی اللّٰہ عنہم، اس کے لئے جلسے جلوس سنیوں کا انسانی شہری اور اجتماعی حق ہے۔

ہندوستان مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے یہاں اس وقت تک امن و عافیت نہیں رہ سکتی جب تک ایسے امور اور معاملات پر روک نہ لگائی جو بین الاقوامی میل ملاپ اور رواداری کے خلاف ہوں۔ کسی بھی جماعت کے پیشواؤں کو برا بھلا کہنا اور ان کی تذلیل و توہین کرنا بین الاقوامی جرم ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اتحاد اور رواداری کو فنا کے گھاٹ اتارنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعزیرات ہند دفعہ ۲۹۸ کے ماتحت ہمیشہ سے تبرا ہندوستان میں ممنوع ہے۔ بوجوہ حکومت ایران نے بھی اسے شدید ترین جرم قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی رواداری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اور ہر جماعت کو اپنے پیشواؤں کی ثنا و صفت کی جائز طریقہ پر آزادی ہو۔ ہندوستان میں ہندو مسلم، جین، عیسائی، یہودی، شیعہ سب اپنے اپنے پیشواؤں کے جلوس نکالتے ہیں اور جلسے کرتے ہیں ان کو کسی زمانے میں رکاوٹ پیش آئی نہ

کسی کو اس پر اعتراض ہے۔ اگر کسی کو اس سے تکلیف ہوتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس مجمع المذاہب ملک میں بستا ہے تو اس کو برداشت کرنا پڑے گا۔ یہاں ہر شخص کو اپنے ضمیر اور مذہب کی آزادی ہے اگر کوئی اس حق میں مداخلت کرتا ہے تو امن عامہ میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس پر قانونی کارروائی کرنا اور حقوق عامہ کو غاصبوں کی دستبرد سے بچانا حکومت کا فرض ہے۔"[۱] (تلخیص)

مسلمانوں کے احتجاج کے نتیجہ میں حکومت یوپی نے تبرّا اور مدح صحابہ کی شرعی حیثیت کے ثبوت کے لئے ۱۹۳۷ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کے دو انگریز ممبر، الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مسٹر ایچ۔ ایس۔ راس تھے۔ حضرتؒ نے اس کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"خلفائے راشدین کی تعریف مستحب ہے لیکن اس سے روکا جائے تو فرض ہے۔ محرم کی دسویں کو اگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے تو لازم ہے کہ اس کے ساتھ صحابہ کرام کی بھی تعریف کی جائے تاکہ مخالف فرقوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ مدح صحابہ کا جلوس اور جلسے بدعت نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بُرائی کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مجمع عام میں حضرت ابوبکرؓ کی مدح سرائی میں قصیدہ پڑھا جائے۔

محرم کے موقع پر وہ ساری باتیں کی جاتی ہیں جو حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد دشمنانِ حسینؓ نے کی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھروں میں روشنی کی تھی، چراغاں کیا تھا۔ دلدل نکالے تھے اور مجلسیں منعقد کی تھیں اور شہدائے عظام کے مبارک سروں کو نیزوں پر اٹھا کر پھرایا تھا۔ یہی ساری باتیں آج تعزیہ داری میں بھی ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کو حرام سمجھا جاتا ہے اور اس کے حرام ہونے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔"[۲]

۱۔ مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۳، ص ۱۷۵ ۲۔ حیات و کارنامے، ص ۴۳۵

کیشن اور عدالت کے شخصی اور انفرادی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے علاوہ ملک کے عام مسلمانوں سے مدح صحابہ کی تائید اور اعانت کی اپیل کرتے ہوئے ایک جلسۂ عام میں فرمایا:

"مسلمانوں کو چاہیئے کہ بعد از نماز جمعہ جلسہ کریں اور اس میں گورنمنٹ کے اس فعل پر کہ اس نے مسلمانوں کے مذہبی، انسانی اور شہری حق، مدح صحابہ میں ناجائز مداخلت کر کے ان کے مذہبی جذبات کو ایسی ناقابل برداشت ٹھیس پہنچائی ہے کہ جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان پروانہ وار جیل کی کوٹھریوں میں بند ہیں۔ صدائے احتجاج بلند کریں اور مطالبہ کریں کہ وہ جلد از جلد مدح صحابہ کے جلسوں اور جلوسوں پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھالے۔"

"ہمیں چاہیئے کہ ہم ان مجاہدین ملّت کو مبارکباد دیں جنھوں نے مذہب و ملّت اور حق قومی کے لئے اپنے آرام و راحت کو تج کر قانون شکنی اور سول نافرمانی اختیار فرمائی۔"[1]

آخر میں ایک نکتہ پر غور فرمالیجئے بلکہ اُسے ذہن میں رکھیئے، صحابہ کرام کا احترام ان کے ساتھ عقیدت اور ان کا اتباع حضرتؒ کے نزدیک دینی شعار اور مذہبی حکم ہے۔ دُنیا کے ہر مذہب کو اپنے مذہبی شعائر اور دینی پیشواؤں کے احترام، محبت اور مدح سرائی کا حق ہے۔ کسی بھی قوم کو دوسری اقوام کے اکابر کو بُرا بھلا کہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ تو شرعی مذہبی اخلاقی اور معاشرتی واجبات و فرائض ہیں مگر ٹھیک اسی وقت جب ان حقوق اور فرائض کا بیان فرمارہے ہیں، شیعہ سنّی اتفاق و اتحاد پر بھی زور دے رہے ہیں:

"حضرت مدنیؒ کا بیان ایک گھنٹہ جاری رہا اس کے بعد عدالت برخاست ہوگئی۔ حضرت کے اس بیان سے جو چیز نمایاں طور پر سامنے آئی وہ مدح صحابہ کا شرعی وجوب تھا۔ لیکن آپ نے اپنے بیان میں شیعہ سنّی اتحاد پر بھی کافی روشنی ڈالی۔"[2]

---

[1] حیات و کارنامے، ص ۴۳۵ [2] حیات و کارنامے، ص ۴۳۶، مرتبہ: ڈاکٹر رشید الوحیدی

اس شیعہ سنی اتفاق کی اہمیت اور کوشش کا تذکرہ خود حضرت کی زبان سے بھی سن لیجئے :

"سنہ ۱۹۲۰ء میں میں نے امروہہ حاضر ہو کر وہاں تقریر بڑے مجمع میں کی جس کی وجہ سے اشتعال ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ہر فریق سنیوں اور شیعوں کو سمجھایا اور وقت کی نزاکتوں کو دکھلا کر زوردار اپیل کی کہ کوئی اس قسم کی کارروائی اس زمانے میں مناسب نہیں ہے جس سے افتراق کی خلیج میں وسعت ہو۔ ضروری ہے کہ اتفاق و اتحاد کو مضبوط کیا جائے۔ میں نے شریف، بغداد، عراق کے انگریزی مظالم دکھلائے نیز مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات مقدسہ کے قیامت خیز واقعات بھی دکھلائے اور شیعوں اور سنیوں دونوں کو ملامت کی"[1]

اتنی تفصیل اور سن لیجئے کہ یہ کوئی عام موقع اور معمولی مجمع نہیں تھا جس میں حضرتؒ نے اشتعال کو ٹھنڈا کیا۔ دونوں فرقوں میں جان جان کی بازی لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کے بڑے بڑے اکھاڑے باز مقررین اور مناظرین جمع تھے اور زور آزمائی اور مقابلہ بازی کی پوری پوری تیاری تھی۔

---

[1] نقش حیات، ج ۲، ص ۲۶۷

تبلیغی جماعت کی تائید

حضرت مولینا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ جماعت تبلیغ کا میدان عمل مسلمان عوام میں ارکان اسلام، اسلامی عقائد اور عبادت وریاضت کی تبلیغ واشاعت ہے۔ اس کے لئے ہفتوں، مہینوں اور سالوں کی فراغت، سفر اور مسلسل سعی وکوشش ضروری ہوتی ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دینی خدمات علوم اسلامیہ، حدیث وقرآن کی تدریس، تعلیم اور ترویج نیز روحانی اشتغال، باطنی سلوک ومعرفت اور ریاضت وعبادات پر مشتمل تھیں۔ بنیادی طور پر ان دونوں نفوس قدسیہ کی زندگیاں اور ان کی جد وجہد اور نقل وحرکت دین، اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے وقف تھیں۔ طریق کار الگ ہونے کے باوجود مقصد ومنزل کے اتحاد کی وجہ سے دونوں حضرات میں اخلاص، اشتراک، تعاون اور اتحاد فکر تھا۔ تبلیغی جماعت کی تحریک کے ابتدائی زمانے میں دہلی کی بنگلہ والی مسجد سے ہفتہ پندرہ دن میں دو دو چار چار افراد تبلیغ کے لئے تیار ہو کر نکلتے تھے۔ آج جس مقام پر تبلیغ کا بین الاقوامی مرکز قائم ہے اس زمانے میں یہاں پر صرف ایک چھوٹی سی بنگلہ والی مسجد تھی اور نکلنے، رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کرانے والے حضرات کی تعداد بھی حضرت مولینا محمد الیاس صاحب اور ان کے صاحبزادے مولینا محمد یوسف کو ملا کر معدودے چند ہی حضرات تک محدود تھی۔ اسی مسجد سے ہفتہ پندرہ دن میں دو چار افراد کی ایک دو جماعتیں جلہ گشت اور تبلیغ کے لئے نکلا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ان کی منزلیں اور دائرے بھی قریب ہی قریب کے اضلاع اور مقامات ہوا کرتے تھے۔ مولینا الیاس صاحب ان جماعتوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضری کی ہدایات دیا کرتے تھے۔ حضرتؒ ان لوگوں کی پوری پوری تواضع اور تکریم فرماتے تھے۔ مولینا الیاس کو حضرتؒ سے جو عقیدت و خلوص تھا اس کا اندازہ آپ کے ان جذبات سے ہوتا ہے کہ:

"حضرت مولانا محمد الیاس صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر تبلیغی کام کی رکاوٹ نہ ہوتی تو میں حضرت مدنیؒ سے بیعت کرلیتا اور اُن کے کام میں شریک ہو جاتا۔ اور اگر کسی وجہ سے یہ تبلیغی کام مجھ سے چھوٹ گیا تو پھر حضرت مدنیؒ کے ساتھ مل کر کام کروں گا اور اگر کسی وجہ سے حضرت مدنیؒ سے کانگریس کا کام چھوٹ گیا تو پھر وہ بھی وہی کام کریں گے جو میں کر رہا ہوں۔ کانگریس میں شرکت کے لئے اتنی دلیل کافی ہے کہ حضرت مدنی اس میں شریک ہیں۔"[1]

یہ خوب سمجھ لیجئے کہ حکایت کسی ایسے ویسے اور ہمہ شما کی نہیں بلکہ مولانا احتشام الحسن صاحب کی ہے جو مولانا الیاس صاحب کے ہمہ وقتی حاضر باشوں اور مخصوصین میں تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ تحریری اور تقریری طور پر خواص اور عوام سے اس جماعت میں شرکت اور تعاون کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ حضرت کے متعدد خلفاء، تلامذہ اور منتسبین جماعت تبلیغ کے اعیان، ارکان اور عمائدین میں شامل رہے اور آج بھی آپ کے بے شمار مریدین و متعقدین تبلیغی جدوجہد میں شریک اور تبلیغی اصطلاح کے اعتبار سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت کی ایک اپیل ملاحظہ فرمایئے:

"میرے محترم بزرگ، یہ جماعات تبلیغ نہ صرف ایک ضروری اور اہم فریضہ کی حسب استطاعت انجام دہی کرتی ہیں بلکہ اس کی بھی سخت محتاج ہیں کہ ان کی ہمت افزائی کی جائے اور ان کو خود بھی مسلمانوں سے رابطہ قومی پیدا ہو اور مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کا قومی جذبہ پیدا ہو اور ان کو مذہبی احساسات کی سرگرمیوں کی طرف چلایا جائے جس سے مستقبل میں نہایت اعلیٰ درجہ کے ثمرات اور نتائج کی قوی امیدیں ہوتی ہیں۔ بنابریں میں امیدوار ہوں کہ آیندہ اس میں پوری جدوجہد کو کام میں لایا جائے اور ان کی ہمت افزائی کی صورت عمل میں لائی جائے۔"[2]

---

[1] مقالہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی بحوالہ روزنامہ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، ص ۹۴، مطبوعہ پاکستان
[2] مکتوبات، جلد ۴، ص ۱۵۰

مولٰنا حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم حضرت کے بے تکلف ہم عصر اور مدرسہ دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے ضلع میرٹھ میں حکیم صاحب موصوف کے اثرات اور مقبولیت کے پیش نظر اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ ان کی تائید و حمایت سے دین اور تبلیغ کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوگی، حضرت ان کو تحریر فرماتے ہیں :

"یہ بات معلوم کر کے تعجب ہوا کہ حضرت مولٰنا محمد الیاس صاحب کی تبلیغی جماعتیں شہر میرٹھ اور اس کے گرد و نواح میں تبلیغی سرگرمیوں کے لئے آتی ہیں مگر آپ حضرات اور آپ کے احباب و اعزہ ان کی ہمدردی، رہنمائی اور ہمت افزائی میں کوئی حصہ نہیں لیتے، میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کا راز کیا ہے؟"[1]

اپنے ایک خلیفہ مجاز جناب سید احمد شاہ صاحب مراد آباد کو تحریر کیا :

"تبلیغی جماعت کی خدمات کے انجام دینے اور اس کے لئے مولٰنا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایات حاصل کرنے کا قصد نہایت مبارک ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور پھر توفیق عطا فرمائے کہ آپ اس عظیم الشان خدمت کو بلکہ اپنی خاندانی وراثت کو بخیر و خوبی انجام دیں۔"[2]

حضرت رحمۃ اللہ کے نزدیک تبلیغی جماعت اور کام کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ مندرجہ بالا واقعات اور اقتباسات سے بخوبی ہو رہا ہے۔ اس باب میں بہت ارشادات اور فرمودات پیش کئے جا سکتے ہیں مگر اصل موضوع کے لئے یہ دو چار ہی کلمات کافی ہیں، مزید تطویل غیر ضروری بھی ہے اور ہماری محدود گنجائش کے لئے مشکل بھی۔ تاہم آخر میں ایک دلچسپ واقعہ اور ملاحظہ کے قابل ہے :

"قصبہ کھتولی ضلع مظفر نگر یوپی میں ایک تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا جس میں مولٰنا محمد الیاس صاحب تشریف فرما تھے۔ جب ان کے فرمودات اور تقریر کا موقع آیا تو عین وقت پر مولٰنا الیاس صاحب کو پتہ چلا کہ اسی قصبہ میں کسی جگہ اسی وقت

---

[1] مکتوبات، ج ۲، ص ۲۰۹ [2] " " " "

کانگریس کا ایک جلسہ ہو رہا ہے جس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تقریر ہو رہی ہے، مولانا الیاس نے فوراً اپنے جلسے کے التواء اور اختتام کا اعلان کر دیا اور مجمع سے کہا کہ سب لوگ حضرت مدنی کی تقریر میں چلیں۔ ادھر حضرت مدنی کو تبلیغی اجتماع اور مولانا الیاس صاحب کے وعظ کی خبر ملی تو انھوں نے اپنی تقریر کا پروگرام ختم کر دیا اور تبلیغی جماعت میں شرکت کا اعلان فرمایا' نتیجہ یہ ہوا کہ نہ یہ جلسہ ہوا نہ وہ اجتماع ہو سکا۔[۱]

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کا وصال ہوا تو حضرت رحمۃ اللہ پر بڑا اثر ہوا۔ فوراً ایصال ثواب کیا اور کرایا اور مجمع عام میں مولانا کے کارناموں اور فضائل کا طویل تذکرہ فرمایا اس کے ساتھ ہی مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب کو ایک تعزیتی خط ارسال فرمایا:

وما کان قیس ھلکہٗ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

میرے عزیز محترم سلمکم اللہ تعالیٰ ورقاکم علی اعلیٰ درجات الرضوان والقرب آمین' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جب کہ میرا قلب ان آرزوؤں اور امیدوں سے بھرا ہوا تھا جن کو میں مولانا محمد الیاس کی ملاقات سے حاصل کرنے کا شرف حاصل کرتا اور احوال حاضرہ ان کی تقریب کی خوش خبری دے رہے تھے' ناگاہ مایوسی اور حزن وملال سے اخبار انصاری نے یکایک مبدل کر دیا۔ دل پر سخت چوٹ لگی۔ ہم ناکاروں کے لئے ایسے ظل رحمانی کا اُٹھ جانا سخت جانکاہی کا موجب ہے۔ جب ہم دور افتادوں کا یہ حال ہے تو متوسلین' اعزہ اور اشبال کا کیا حال نہ ہوگا۔

میرے عزیز حضرات! ہم کو ہر قدم پر قرآنی ہدایات' سنن نبوی اور اسلاف کرام رحمہم اللہ کے طریق کا اتباع کرنا اشد ضروری ہے۔ قدرت کی آنکھیں ہم سے

---

[۱] الجمعیۃ' شیخ الاسلام نمبر: ص ۶۹

اسی کی طلب گار ہیں۔

ولنبلونکم بالشر والخیر فتنه ۔ ولنبلونکم بشيء من الخوف والجوع و نقصٍ من الاموال والانفس ۔ الآیہ۔

مجھ کو توی امید ہے کہ آپ اور دوسرے اعزہ واقارب اس امتحان میں پاس ہوں گے ۔ مرحوم ہمارے درمیان ودائعِ خداوندیہ میں سے عزیزترین ودیعہ تھے، مالک نے ہم سے واپس لے لیا اس لئے شکریہ کا موقع ہے نہ حزن وملال کا۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب ادام اللہ ظلہ اور اہلیہ محترمہ اور دیگر اعزہ و احباب کی خدمات عالیہ میں بھی تاکید صبر وشکر مع سلام مسنون اور استدعائے دعوات صالحہ پہنچادیں۔ والسلام

دور افتادہ نیاز مند قدیم

چراغ محمد غفرلہٗ ۷؍رجب ۱۳۶۳ھ

یہ والانامہ جیل سے لکھا گیا تھا اس لئے عام اسم گرامی کے بجائے تاریخی نام سے بھیجا گیا تھا۔

صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ حیدرآباد

۱۹۵۱ء

اپریل ۵۱ء کی بالکل آخری تین دنوں تک حیدر آباد دکن میں جمعیۃ علماء کا سترھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ وہ ملک یا ریاست تھی جو گذشتہ سو دو سو برسوں سے علماء، فضلاء، مقررین، مصنفین، شعراء، ادباء اور دوسرے اصحاب فکر وفن کی آماجگاہ تھی۔ شمالی ہند کے چھوٹے بڑے، عالی و عامی، مشہور و گمنام کتنے ہی اصحاب علوم وفنون دن رات اس ملک اور شہر میں وارد ہوتے اور اس کی سرپرستی اور فراخ دستی سے فیضیاب و مستفید ہوتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے کہ آئے تھے تو تھوڑا بہت درجہ اپنے پاس کا بھی تھا مگر حیدر آباد کی برکت سے ڈاکٹر، پروفیسر، علامہ اور مولینا کے بلند اور مشہور مناصب تک پہنچ گئے اور ایسے بھی تھے کہ آئے تو کچھ نہ تھے اور رہے تو سب کچھ ہو گئے۔ مگر کچھ بے نیاز اور مستغنی درویش ایسے بھی تھے جنھیں اللہ نے توکل، قناعت اور استغنیٰ کی دولتوں سے مالا مال کیا تھا جنھوں نے اپنی زندگی میں کسی مادی وسیلے کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جن کا ایک قدم جیل میں دوسرا ریل میں رہا کرتا تھا اور جنھوں نے ہندوستان کے چپے چپے اور کونے کونے کا دورہ کیا تھا۔ اپنی پچھتّر برس کی عمر میں کبھی حیدر آباد نہیں گئے تھے مگر ہندوستان کے پولیس ایکشن اور قتل و غارت کے بعد پہلی بار اُن کے دکھ درد میں شرکت کے لئے حیدر آباد تشریف لے گئے۔

"تقریباً ۲۹ سال پہلے کوکناڈا جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے آپ کے یہاں حاضری کا موقع ملا تھا۔ اگر اس کو مستثنےٰ کر دیا جائے تو میرا یہ عرض کرنا صحیح ہوگا کہ آپ کے یہاں یہ میری پہلی حاضری ہے۔ لیکن اس غیوبت کے باوجود ایک خاص تعلق آپ حضرات سے ہمیشہ رہا ہے۔"[1]

---

[1] خطبۂ صدارت حیدر آباد

اجلاس کے خطبۂ صدارت میں حضرت نے جمعیۃ علماء اور علماء کرام کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت کے اہم موضوع ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلق اور دونوں کے درمیان خوشگوار ماحول کی ضرورت پر زور دیا اور فرمایا:

"جس طرح ہندوستان کا دنیا کی سیاست میں ایک مقام ہے اسی طرح پاکستان بھی بین الاقوامی سیاست کا ایک مستقل یونٹ قرار دیا جاچکا ہے۔ اب گذشتہ قصہ ہائے پارینہ کو دہرا کر مندمل زخموں کو کھرچنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب پورے ملک کا فائدہ اسی میں ہے اور نہ صرف ہندستان بلکہ پورے ایشیا کی مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خوش گوار ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر پورا اعتماد ہو۔ آپس کے تضیوں کو مفاہمت کے ذریعہ طے کریں۔ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب ہوں، ان کے تجارتی اور اقتصادی تعلقات زیادہ سے زیادہ بہتر اور مضبوط ہوں۔ آمد و رفت کے راستے کھلے رہیں۔ اور جو تلخیاں اور شکر رنجیاں برداشت کی جاچکی ہیں ان کو بھول کر محبت اور دوستی کے ترانے دونوں جگہ گائے جائیں۔"[1]

حکومت کی طرف سے حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے نام پر جو ظلم اور زیادتیاں کی گئیں۔ ان کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور تمدنی زندگی تباہ و برباد کی گئی۔ اس پر حضرتؒ نے وہاں کے عوام کو مخاطب فرمایا:

"یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے بے شمار مشکلات اور پریشانیوں کا ہجوم ہے۔ خصوصیت سے حیدرآباد کے مسلمان دوہرے انقلاب کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا انتظام معیشت درہم برہم ہوگیا ہے۔ لیکن یہ مصائب آپ کی زندگی میں پہلی بار نہیں آئے ہیں۔ آپ کی پوری تاریخ مشکلات کی نہ ٹوٹنے والی ایک زنجیر ہے۔ آپ نے ہمیشہ مصائب و مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ اور ہمیشہ ہی

---

[1] خطبۂ صدارت، حیدرآباد

استقلال، استقامت اور حسن اخلاق کے ذریعہ مشکلات کو آسان بناتے رہتے ہیں۔

اگر آپ حق پر ہیں اور آپ کا نصب العین صحیح ہے تو یقین رکھیے کہ نصرت الٰہی آپ کی رفیق ہوگی اور کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اللہ تعالیٰ کا بہت مستحکم اعلان ہے ولینصرن اللہ من ینصرہٗ۔ ان اللہ لقوی عزیز۔ وکان حقا علینا نصر المومنین (اللہ ان لوگوں کی یقیناً مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طاقت بہت بڑی ہے اور اسی کا حکم غالب رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ایمان والوں کی مدد لازم کرلی ہے) مشکلات زندگی کی علامت ہیں۔ مصائب اور حوادث زندہ ہی افراد اور زندہ ہی قوموں پر نازل ہوا کرتے ہیں۔ وہی آزمائشوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ زندہ ہی قوموں کو آگاہ کیا جاتا ہے ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات (ہم تم کو کسی قدر خوف، بھوک اور جان و مال اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کرکے آزمائیں گے) یہ تکلیفیں، یہ تاریکیاں، اور مصیبتیں مایوسی کی نہیں ایک روشن مستقبل کی علامت ہیں۔ اس اندھیرے کے بعد اجالا ضرور ہوگا۔ مگر یاد رکھیے! اس کے لئے یہ ہے کہ ہماری زندگیاں، ہمارے اعمال و افعال، کردار و اخلاق نمونہ اور مثالی ہوں ان میں خلوص اور للہیت ہو۔ ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم۔ اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔

ایک مسلمان کا پہلا فرض ہے کہ اپنی انفرادی اور جماعتی زندگی کا نصب العین معلوم کرے اور اُسے ہر لمحہ پیش نظر رکھے۔ یہ نصب العین قرآن پاک نے متعین کردیا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر (تم بہترین ہو ایسی امت میں جو انسانوں کے نفع کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ تم اچھی بات کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان و یقین رکھتے ہو)

اس امت کی بعثت کا اہم مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ تمام نسل انسانی کو اس سے نفع اور خیر پہنچے۔ جس طرح آپ کو خیر الأمۃ ہونے کی سعادت حاصل ہے اُسی طرح آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ ذات پاک رؤف و رحیم سے وابستہ ہیں جس کو دنیا میں اس لئے مبعوث کیا گیا کہ پوری کائنات پر خدا کی رحمت نازل ہو۔ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین۔ خوب سمجھ لیجئے کہ جس طرح سرور کائنات سارے عالم کے لئے باعث خیر و برکت تھے اسی طرح ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ سارے عالم کے لئے باعث راحت و اطمینان ہو۔ مسلمان کی ذات اور اس کی خدمات صرف اس کی ذات، خاندان، قبیلہ اور گروہ تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ وہ تمام عالم انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد، ایک خالق کی مخلوق اور ایک اللہ کے بندے سمجھ کر اعانت اور خیر خواہی کے جذبات عام کرے گا۔ اور بنی نوع انسانی کی فلاح و بہبود اس کا دائرۂ کار ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے اہل وعیال پر احسان کرے اور خدمت کرے (مشکوٰۃ شریف) دوسری جگہ فرمایا: المؤمن من آمنہ الناس علی دمائھم واموالھم) مومن وہ ہے جس کے ہاتھوں تمام انسانوں کی جان و مال محفوظ رہے۔ (بخاری شریف)

انسانیت اور اسلام کی روح یہ ہے کہ آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے، زیادتی کا بدلہ احسان سے اور ظلم کا بدلہ عفو و درگذر سے دیں۔ یہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: صِل من قطعک واعف عمن ظلمک واحسن الی من اساء الیک (جو تم سے قطع تعلق کرے تم اُس سے تعلق قائم کرو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اُسے معاف کردو۔ جو تمھارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو) مصائب کے طوفانوں اور مشکلات کے ہجوم میں اللہ تعالےٰ سے لمحہ بہ لمحہ تعلق مضبوط ہونا چاہیئے اور صبر و ضبط کا دامن نہایت مضبوطی کے

ساتھ پکڑنا چاہیئے۔ ضبط و تحمل، استقلال، عالی حوصلگی اور توجہ الی اللہ ایسی طاقتیں ہیں جن کے سامنے دنیا کی ہر طاقت بالآخر سپر ڈال دیتی ہے اور شکست کھا جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار انہی طاقتوں سے امداد حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یاایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ اے ایمان والو نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو۔ جذبات اور اشتعال کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان بُرائی کا بدلہ بُرائی سے بلکہ ایک بُرائی کا بدلہ ہزاروں برائیوں سے دے لیکن یہ کوئی علاج اور مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اس طرح ممکن ہے آپ گردنوں کو جھکا دیں مگر دلوں کو فتح کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ بُرائی اس طرح ختم ہو سکتی ہے کہ بُرائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے۔ اگرچہ یہ بہت مشکل ہے مگر قلوب کو اسی طرح مسخر کیا جاتا ہے۔ اور حق کا مشن اسی طرح کامیاب ہوا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادفع بالتی ھی احسن، فاذا الذی بینک وبینہٗ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذوحظ عظیم۔ بُرائی کا بدلہ ایسے اخلاق سے دیجئے جو بہت بہتر ہو، آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن سے آپ کی دشمنی ہے آپ کے مخلص دوست بن گئے، مگر یہ بات صابر و شاکر لوگوں کو اور قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہاں! یہ ضرور خیال رہے کہ صبر، ضبط اور مکارم اخلاق کا مطلب بزدلی، خوف زدگی اور کمزوری نہیں ہے۔ صبر و ضبط کا مطلب یہ ہے کہ انتقام کے مواقع ملتے ہوئے بھی شرافت، اخلاق، مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے۔"

اس کے بعد حضرت نے ہندوستان کے جمہوری، سیکولر اور غیر فرقہ واری دستور حکومت پر اطمینان اور اعتماد کا اظہار فرمایا اور اس کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کانگریس اپنے اصولوں اور نظریات پر قائم رہی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کا دستور جمہوریت اور نامذہبی اصولوں پر وضع کیا گیا۔ یہ دستور ہندوستان کے ہر باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے اور بلا

اختلاف مذہب وملت ہر ایک ہندوستانی کے لئے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر طبقہ کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقاء تحفظ و ترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں جو اس سلسلے میں ہمارے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان باتوں پر غور کریں کہ ملی اور اجتماعی فرائض کیا ہیں۔ ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب، اپنے مآثر و معابد اور اپنے اوقات کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کس طرح ملک کی تعمیر جدید میں اپنی اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت و ترقی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں۔

مذہبی تعلیم کی اہمیت

سب سے اہم اور مقدم مسئلہ مذہبی تعلیم کا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے تمام مذہبی حلقوں اور اسلامی اداروں کی یک جہتی اور ہمنوائی بے حد ضروری ہے۔ ہم ملکی مصالح کے پیش نظر سیکولرازم اور غیر مذہبی حکومت کو خوش آمدید کہہ چکے ہیں۔ اگرچہ حقیقی امن وامان کی صحیح ضمانت مذہب ہی دے سکتا ہے۔ مگر ایک سیکولر اسٹیٹ سے یہ توقع قطعاً بے محل اور غلط ہے کہ وہ ملک کے تمام فرقوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرے اس لئے اس کی ذمہ داری ہمیں اپنے کاندھوں پر برداشت کر کے آزاد اور زندہ قوموں کی طرح حیات ملی اور ایثار کا ثبوت دینا ہے، اسلام مذہبی تعلیم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے۔

اوقاف کا مسئلہ

اس کے بعد ہمیں اوقاف کے معاملہ پر توجہ دینی چاہئے۔ ایک سیکولر اسٹیٹ میں اوقاف ہی واحد ذریعہ ہیں جن کے ذریعہ مذہبیات اور مختلف طبقوں کی پرسنل ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ آج کے حالات اور آزاد ہندوستان میں اوقاف کی جو اہمیت محسوس کی جارہی ہے اتنی شاید اس سے پہلے کبھی نہیں

کی گئی ہوگی، حکومت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب ملک کے مختلف فرقے آسانی سے اپنی مذہبی ضروریات پوری کر سکیں۔ ان کے مذہبی ادارے محفوظ رہیں اور ترقی کے لئے آزاد ہوں۔ اگرچہ جمہوریہ ہندوستان نے اوقاف کو وہ اہمیت دی ہے، جو مسلمانوں کے پرسنل لا کو حاصل ہونی چاہیئے مگر خطرے کی بات یہ ہے کہ صوبائی حکومتوں میں طرزِ عمل یکساں نہیں ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر صوبہ میں مسلم وقف ایکٹ کے بنیادی دفعات کی نوعیت یکساں ہو۔ اوقاف کی آمدنی اور اس کے مصارف خالص دینی اور اسلامی احکام کے اندر محدود رہنے چاہئیں اور حکومت کی جانب سے اس میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔

ملک کا نصابِ تعلیم

تاریخ اور نصاب تعلیم کی طرف عوام اور حکومت کی مکمل توجہ قومی زندگی کی تعمیر کا اہم جزو ہے۔ آج اسی نصاب تعلیم کے ذریعہ ملک ترقی اور خوشحالی کی طرف گامزن ہو سکتا ہے اور تباہی و بربادی اور فتنہ و فساد میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اسکولوں کے نصاب کا جائزہ لیں تو ہمیں افسوس ہوگا کہ اب تک بہتر مستقبل کے لئے کوئی تخم ریزی نہیں کی گئی ہے۔ بیشک تعلیم کے لئے جو کتابیں کورس میں داخل کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کا معیار دورِ غلامی کے معیار سے بھی زیادہ پست ہے۔ ٹھیک اسی طرح تاریخ بھی ابھی تک وہی رائج ہے جو انگریزوں، سر ہنری ایلیٹ اور مسٹر کیس ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کے دماغوں کی اختراع تھی جس میں تاریخ کے بجائے وہ واقعات تیار کئے گئے ہیں جو ان کے مقاصد کے لئے بنائے گئے تھے۔ اس کو تاریخ کہنا تاریخ کا مذاق اڑانا اور اس کی توہین ہے۔ یہ ضروری ہے کہ تاریخ کے واقعات پوری تحقیق و تنقید کے بعد مرتب کئے جائیں اور انہیں مکمل احتیاط کے ساتھ صداقت و

صحت کی ترازو میں تول لیا جائے۔

اُردو اور ہندی زبان

ملک کی زبان کے بارے میں پارلیمنٹ نے فیصلہ کردیا ہے کہ سرکاری زبان ہندی ہوگی بہت سے اداروں کی کوشش یہ ہے کہ ہندی ادب کو مختلف علوم و فنون کا حامل بنادیا جائے۔ مسلمان گذشتہ سو برس سے ایک غیر ملکی زبان انگریزی کو فروغ دینے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ ہندی تو اپنے ہی ملک کی زبان ہے۔ بہت سے علاقوں میں خود مسلمانوں نے اس کی ترقی اور تخلیق میں حصہ لیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اب مسلمان ہندی کو علمی زبان بنانے کی کوشش میں حصہ نہ لیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اُردو کی حیثیت، اہمیت اور مقبولیت کو بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ انصاف اور جمہوری اقدار کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو کی ترقی اور نشوونما کو برابر کا درجہ حاصل ہو، مگر مختلف صوبہ جات کے ذمہ داران کوشش کر رہے ہیں کہ اُردو کی اہمیت کو ختم کرکے اُسے کسی بھی صوبہ کی علاقائی زبان نہ رہنے دیا جائے یہ تعصب کی افسوسناک کوتاہ بینی اور تنگ نظری ہے۔ یاد رکھیئے! کہ صرف تنقید یا واویلا سے اُردو زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے لئے آپ کو ایثار کرنا پڑے گا۔ اخبارات، رسالے، دارالمطالعے، لائبریریاں اور تصنیف و تالیف کے ادارے کسی زبان کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ اُردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ایثار و قربانی سے کام لے کر اس قسم کے ادارے، اخبارات، رسالے اور لائبریریاں قائم کرنا اور انھیں ترقی دینا آپ کا پہلا فرض ہے۔

کسٹوڈین کی ریشہ دوانیاں

یہ محکمہ کہتا ہے کہ استحصال بالجبر اور مہذب لوٹ کھسوٹ کے لئے اس کو

قانونی طاقت عطا کر دی گئی ہے۔ اس محکمہ کی نا انصافیوں اور زیادتیوں کے ازالہ کے جمعیۃ علماء اپنی پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کر رہی ہے۔ مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کو ہماری کوششوں سے ہمدردانہ دلچسپی ہے۔ توقع اور اطمینان ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے اور حالات میں اعتدال پیدا ہوگا۔

میرے اس معروضہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دین و ملت کی حفاظت اور تبلیغ و ترقی کے لئے پورے اخلاص، استقلال اور صبر و شکر کے ساتھ مکمل کوششیں صرف ہونی چاہئیں۔ وطن عزیز کی حفاظت، ترقی اور سربلندی کے لئے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ اتفاق، اتحاد، یکجہتی اور رواداری کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

میں آپ کو کسی خاص جماعت میں شرکت کا حکم نہیں دیتا مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ملک اور اہل ملک کی ترقی اور بہبود کے لئے آپ اسی جماعت میں شریک ہوں جس کو ان مقاصد اور اصولوں کی روشنی میں بہتر سمجھیں۔ آپ کا نصب العین ملک کی خدمت اور آپ کی زندگی کا سرمایہ، بلند حوصلگی، اولوالعزمی اور انتھک جدوجہد ہونا چاہیئے۔

ان الذین قالو ربنا اللّٰہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لا تخافو ولا تحزنو وابشرو بالجنۃ التی کنتم توعدون [۱]

---

[۱] خلاصہ خطبۂ صدارت، اجلاس جمعیۃ علماء حیدرآباد، ۱۹۵۱ء

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرتؒ

۱۸۵۷ء کے بعد متعدد مصلحین، اصحاب فکر اور ارباب قلم نے اردو زبان کی نشریات کے ذریعہ اجتماعی، فکری اور اصلاحی میدانوں میں قومی خدمات انجام دیں۔ ان میں سے بعض حضرات کو عوام و خواص، عالی و عامی ہر طبقے میں مقبولیت و سیادت نصیب ہوئی۔ سرسید نے اپنی تحریروں، تقریروں اور جہد و عمل کے ذریعہ سے ملی زندگی کی قیادت کی اور اس کا ذہنی و عملی رُخ اپنے افکار کی طرف موڑا۔ مولانا شبلی نے اپنا خاص اسلوب نوجوانوں کو بیدار کرنے اور انھیں اپنی عظمتِ رفتہ کا احساس دلانے کے لئے استعمال کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنی آتش نوائیوں اور دلنشین صداؤں کے ذریعہ بلا تفریق مذہب و ملت پورے ہندوستان کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کردیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پر شکوہ اندازِ نگارش اور پرجوش اسلوب سے دماغوں کو جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کردیا۔ انہی اصحاب فکر اور ارباب قلم کے سلسلے کی ایک کڑی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی ہیں۔ آپ نے بھی اپنے قلم اور خیالات سے تاریخی اہمیت کا کام کیا ہے۔ مولانا کے افکار اور ان کے مسلک سے مسلمان عمومی طور پر اور علماء کرام خصوصی طور پر متفق نہیں ہوئے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی علماء میں ہیں جو مولانا مودودی صاحب کے خیالات سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس باب میں ہمیں ان اختلافات کے اسباب و علل پر ایک ہلکی سی نظر ڈالنی ہے۔ بہتر ہے کہ پہلے مولانا مودودی صاحب کے پس منظر اور ان کے خیالات سے تھوڑا بہت تعارف ہوجائے۔

مولانا کی تعلیم رسمی اور ضابطہ کے اعتبار سے تو مکمل نہ تھی مگر اپنی قدرتی ذہانت اور فطری تیزیٔ طبع کی بدولت آپ نے اپنے ذاتی مطالعہ کا دائرہ اس قدر وسیع کرلیا تھا کہ مختلف زبانوں اور موضوعات پر خاصی دسترس پیدا ہوگئی تھی۔ حُسن سلیقہ اور

مسلسل محنت مولینا کے خاص اوصاف تھے، اس کے ساتھ اُردو زبان میں موثر اور دلنشین پیرایۂ اظہار کی نعمت بھی اللہ نے مولینا کو خصوصی طور پر عطا کی تھی۔ تاہم تعلیم کی وہ تکمیل جو مدرسہ درسگاہ کی خصوصیت ہوتی ہے مولینا کو حاصل نہ تھی۔ مولینا کے ایک معتقد کا بیان ہے:

"نوجوان ابوالاعلیٰ کی تعلیم روایتی ڈگر پر نہیں ہوئی نہ انھیں کسی مغربی طرز کے اسکول میں داخل کیا گیا نہ انھوں نے کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی گئی، لیکن ان کی لاریب ذہانت کے باوجود ابتدائی مرحلے میں کچھ خلا ضرور رہ گئے"[1]

مولینا نے جو کچھ تعلیم پائی اپنے مطالعے کے ذریعہ پائی۔ انھوں نے روایتی دینی طرز تعلیم کا مطالعہ بھی کیا اور جدید تعلیم سے بھی آشنائی رکھی مگر ان کے نزدیک دونوں میں خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں۔ اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

"مجھے گروہ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں، جس نے جدید و قدیم دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ حصہ پایا ہے اور دونوں کوچوں کو چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو"[2]

مولانا نے نوجوانی ہی کی عمر سے تلاش معاش اور مستقبل کی تعمیر کے لئے تگ و دو شروع کر دی تھی اور آخر کار صحافت کا پیشہ اختیار فرمایا جو آپ کی ذہانت، ذکاوت اور جولانیٔ طبع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ خود مولینا اپنی کہانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ڈیڑھ سال کے تجربات نے یہ سبق دیا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی

---

[1] 'ایک شخص ایک کاروان' مولینا مودودی کا شخصی مطالعہ، ص ۷،

[2] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۴، ص ۱۰۰۔ بحوالہ ترجمان القرآن نمبر ۳۲، ربیع الاول ۱۳۵۵ھ

بسر کرنے کے لئے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور استقلال کے لئے جدوجہد کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ فطرت نے تحریر و انشاء کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی۔ اسی زمانے میں جناب نیاز فتحپوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے، ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی۔ غرض ان تمام وجوہ سے یہ فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہیے۔"[1]

چنانچہ مولینا اٹھارہ برس ہی کی عمر میں جمعیۃ علماء ہند کے اخباروں روزنامہ مسلم اور پھر الجمعیۃ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے جن میں مولینا کی ایڈیٹری بہت کامیاب رہی۔ اس کے ساتھ مولینا نے کچھ رسالے بھی اسی زمانے میں تالیف کئے جو مقبول و مشہور ہوئے۔ اب آپ کی طبع رسا اور ذوق بلند پروازی اخبار کی ایڈیٹری پر قانع نہ ہو سکی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالم اسلام پر چاروں طرف سے یلغار ہو رہی تھی اور اس کی صفیں انتشار و انحراف کا شکار ہو رہی تھیں۔ ابھی ماضی قریب میں سرسید، مولینا شبلی، حالی کی تحریریں اور تحریکیں بہت کامیاب ہو چکی تھیں۔ سرسید کی اصلاحی تحریک خوب خوب کامیاب ہوئی تھی اور کم و بیش نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی اس کے آثار اور نشانِ راہ قائم اور روشن تھے۔ اس اصلاح کے بارے میں حضرت اکبر الٰہ آبادی نے فرمایا تھا:

حاضر ہوا میں خدمتِ سید میں ایک دن — فرمایا تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات — میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

مولینا کے اپنے وقت میں بھی محمد علی شوکت علی کا ڈنکا ہندوستان کے کونے کونے میں بج رہا تھا اور ان کی خلافت کی تحریک بھی قبولیت اور شہرت کے آسمان تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے موضوعات، عنوانات، منشورات اور طریق عمل تو مولینا محمد علی کے اخبارات ہمدرد اور کامریڈ میں روز ہی چھپتے رہتے تھے۔ ابھی دو ایک برس پہلے مولینا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کرنے اور حزب اللہ کے نام سے

---

[1] مولینا محمد یوسف لدھیانوی "اختلاف اُمت اور صراط مستقیم" ص ۱۹۰ بحوالہ مولینا مودودی از اسعد گیلانی ص ۲۷

ایک جماعت بنانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اس تحریک کو بھی ملک کے اطراف و جوانب سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا تھا۔ حُسن اتفاق سے مولینا آزاد اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے نہایت حسّاس، نازک طبع اور غیرت مند واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے بالکل ہی ابتدا میں محسوس کر لیا کہ قوم کا وہ طبقہ جسے دین و شریعت میں صدارت و سیادت کا مرتبہ حاصل ہے وہ مولینا آزاد کی امامت کو منظور نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے اور یہ اسکیم آگے نہیں چل سکی۔ یہ واقعہ قاضی عدیل عباسی مرحوم سے سنیئے:

"مولینا (آزاد) کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے اگر قرآن و حدیث سے انھیں بتایا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لئے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چُننا ہوگا۔ ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھوں بک نہ سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوشمند اور حالات زمانہ سے کماحقہٗ واقف ہونا چاہیئے، ظاہر ہے کہ مولینا اپنی ذات کے علاوہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے؟"[1]

اس اسکیم کے مطابق مولینا آزاد نے حزب اللہ کی دعوت پر بیعت لینی شروع کر دی اور بہت سے صوبوں میں مسلمانوں نے مولینا کے ہاتھوں پر بیعت کر بھی لی لیکن اس سلسلے کی دوسری ضروریات کے ساتھ ایک بڑی اہمیت خلفاء اور مجازین بالبیعت کی بھی تھی۔ مولینا نے بھی اپنا ایک خلیفہ اور مجاز مسلمانوں کی بیعت کے لئے روانہ کیا۔ اور مولینا عبدالرزاق ملیح آبادی کو مندرجہ ذیل خلافت نامہ عطا فرمایا:

---

[1] تحریک خلافت ص ۱۲۷

"انویم مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد و سلوک و سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ انھوں نے خود حقیر کے ہاتھ پر بیعت کی والعاقبۃ للمتقین فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ ۲۳ م/ ۱۹۲۰ء"[1]

"اسی زمانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مالٹا کی نظربندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ چنانچہ عبدالرزاق ملیح آبادی وہاں گئے اور بزعم خود دونوں بزرگوں یعنی مولانا عبدالباری اور مولانا محمود حسن کو مولانا ابوالکلام کے امام الہند بننے پر رضامند کرنا چاہا مگر دونوں حضرات بات ٹال گئے۔"[2]

"مولانا آزاد نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھا مولوی عبدالباری کا خط دیکھا 'یار ما ایں دارد و آں نیز ہم' سردست اس قصہ کو تہ کیجئے اور کام کئے جائیے۔"

"ہمارا دائرۂ عمل بہرحال مکمل ہو چکا ہے' پنجاب سندھ و بنگال متفق ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔ ان لوگوں (مولانا عبدالباری' مولانا محمود حسن اور مولانا حسرت موہانی) کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے۔"[3]

ان تمام تحریکوں کے ماند پڑ جانے کے بعد ہندوستان کا میدان بالکل خالی تھا۔ وقت مناسب اور زمین پیاسی تھی۔ افکار' خیالات' موضوعات' عنوانات' پروگرام اور طریق کار سب موجود اور تیار تھے۔ ضرورت بس سلیقہ اور ہوشیاری کے ساتھ نقشہ جمانے کی تھی۔ چنانچہ

"ایک مرحلہ پر مولانا مودودی نے مسلمانوں کے سامنے احیاءِ دین

---

[1] [2] [3] تحریک خلافت ۳۰/ ۱۲۹

اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اصل نصب العین بنا کر خالص دینی بنیاد پر اس طرح کی
ایک جماعت کی تنظیم اور اصلاحی دعوتی کام کی اسکیم پیش کی جس طرح کسی دور میں
مولانا آزاد مرحوم نے الہلال کے ذریعے 'حزب اللہ' کے نام سے ایک جماعت
کی تنظیم شروع کی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں حوالہ
کے ساتھ الہلال کے اقتباسات بھی نقل کئے تھے[1]۔

اس موقع پر اتنا اور سمجھ لیجئے کہ یہ حکایت کسی ہمہ شما اور عامی معمولی آدمی کی
نہیں ہے بلکہ اس شخصیت کی زبان وقلم سے ہے "جس سے زیادہ قدیم اور بنیادی رکن
جماعت اسلامی کا اس تحتی برِ اعظم [ہن]دو پاک میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ جماعت کے
بانیوں اور اولین ارکان اور داعی[و]ں میں ہیں۔ ایک زمانہ میں وہ مولینا (مودودی) کے
سب سے قریب رفیق اور س[ب] سے بڑے معتمد ومشیر رہ چکے ہیں[2]"۔ مولینا محمد منظور نعمانی
مدظلہم کی یہ خصوصیت ا[س کتا]ب میں ان کے دوسرے اقتباسات کے ملاحظہ کے وقت بھی
پیش رہنی چاہیے۔

اس مرحلہ تک پہنچنے سے بہت پہلے الجمعیۃ کی ایڈیٹری ہی کے وقت مولینا نے اپنی
روانی طبع کے لئے دینی، اصلاحی اور دعوتی موضوعات کا انتخاب کرلیا تھا۔ یہ ایک ایسا
میدان تھا جس میں طبع آزمائی کے لئے ہر شخص بلاکسی قید وشرط کے پوری طرح آزاد تھا۔
اور پھر یہ کہ یہ ایسا پرانا مجرب اور تیر بہدف نسخہ تھا کہ جس رنگ جس فکر اور جس ذہن
کی بھی تبلیغ کیجئے کامیابی یقینی ثابت ہوچکی تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ مولینا صاحب علامہ نیاز
فتحپوری سے بھی استفادہ کرچکے ہیں۔ مولینا نے ایڈیٹری کے ساتھ مذہبی عنوانات پر
چند کتابیں مثلاً 'پردہ' 'سود' 'مسلمان' اور 'سیاسی کش مکش' لکھیں۔ یہ تحریریں جدت پسند اور بعض
مخصوص طبقوں میں بہت مقبول اور مشہور ہوئیں۔ اس مقبولیت اور شہرت کا نتیجہ یہ ہوا

---

[1] مولینا محمد منظور نعمانی "مولینا مودودی کے ساتھ میری رفاقت" ص ۲۵ [2] " " ص ۵ پیش لفظ
از مولینا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم

کہ آپ کا اشہب قلم ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بہت جلد مولینا اس درجہ پر فائز ہوگئے کہ آپ کو ایک مستقل ماہوار رسالے کی گنجائش اور ضرورت محسوس ہوئی۔ ان ہی دنوں حیدر آباد سے ایک صاحب ایک دینی و تبلیغی رسالہ ترجمان القرآن نکالا کرتے تھے۔ کسی وجہ سے انھوں نے رسالہ سے سُبکدوشی حاصل کرنی چاہی تو مولینا نے اُن سے رسالہ لے لیا۔ مولینا کے ایک مداح لکھتے ہیں :

"انھیں (مولینا مودودی کو) اپنے افکار کی ترویج و تبلیغ کے لئے ایک معیاری رسالے کی ضرورت تھی چنانچہ ۱۹۳۱ء میں مولینا ابو مصلح سے ترجمان القرآن حاصل کرلیا۔ مولینا مصلح اس رسالے کے ذریعہ چند ماہ سے حیدرآباد دکن سے قرآن کے پیغام کی اشاعت کررہے تھے اس وقت سے یہ رسالہ مولینا مودودی کی تحریک کا داعی ہے۔"[1]

اس طرح مولینا کو ایک چلتا چلاتا رسالہ ترجمان القرآن اور بنی بنائی راہ، اشاعت تعلیمات قرآن کی مل گئی۔ تبلیغ و تفکیر کی دعوت تو یہ رسالہ پہلے ہی سے دے رہا تھا۔ اب مولینا صاحب نے اپنے افکار و خیالات کے مطابق رسالے کے مقاصد میں ایک اضافہ کیا اور مسلمانوں کو ایک نئے راستے پر چلنے کی دعوت کا اعلان کردیا۔ چند برسوں تک رسالے کے صفحۂ آخر پر یہ عبارت نمایاں طور پر چھپتی رہی :

"اس رسالے کا واحد مقصد اللہ کے احکام کی اشاعت اور لوگوں کو اللہ کے راستے پر جہاد کی دعوت دینا ہے۔ اس کا خصوصی دائرۂ کار یہ ہوگا کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے ثقافت اور تہذیب کے ان اصولوں اور نظریات پر تبصرہ کیا جائے جو اس وقت دنیا میں فروغ پارہے ہیں تاکہ قرآن و سنّت میں پیش کردہ نظریات کی تشریح ہمعصر فلسفے، سائنس، سیاسیات، معاشیات، ثقافت اور عمرانیات کے پس منظر میں واضح ہوسکے اور قرآن و سنّت کے قوانین کو جدید طور پر

[1] ایک شخص ایک کارواں، ص ۷۰، مطبوعہ دہلی

منطبق کرنے کے لئے ڈھالا جا سکے۔ یہ جریدہ اُمت مسلمہ کو ایک نئے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے۔"[1]

اس باب کو پڑھتے ہوئے قرآن و سنت کو جدید طور پر منطبق کرنے کے لئے ڈھالنے اور امت کو نئے راستے کی طرف دعوت دینے والی بات پوری طرح ذہن میں رکھئے تاکہ اس موضوع کو سمجھنے اور مولانا مودودی کی دعوت پر غور کرنے کا صحیح انداز حاصل ہو سکے۔

مولانا کا رسالہ بلکہ ان کی شگفتہ تحریر، مستدل اسلوب نگارش اور عام فہم انداز بیان تعلیم یافتہ اور کالج اور یونیورسٹیوں کے نوجوان طالب علموں میں خوب مقبول اور کامیاب ہوا۔ قدیم علماء شیوخ، واعظین اور مبلغین و مدرسین کے مقابلے میں مولانا نے ایک بالکل نیا انداز تحریر اختیار کیا تھا۔ مولانا خود بھی جدید فیشن اور نئے طرز زندگی کے دلدادہ تھے۔

"میں یہ بات سن چکا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کے ایمان افروز مضامین سے ان کے طرز زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے، ان کی زندگی اس سے بہت مختلف ہے۔ یعنی جس اسلامی زندگی کے وہ پُر زور داعی ہیں خود ان کی زندگی وہ نہیں ہے۔ جن صاحب نے یہ بات مجھے بتلائی تھی وہ مولانا کے ملنے والوں میں سے تھے اور ترجمان القرآن کے مضامین سے متاثر اور ان کے قدردان تھے انھوں نے بتلایا تھا کہ مودودی صاحب محلوق اللحیہ (داڑھی منڈے) ہیں۔"[2]

یہ تو مولانا منظور صاحب نے کسی دوسرے سے سُنی ہوئی روایت نقل کی ہے اب خود اُن کا مشاہدہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"پھر میں (مولانا منظور صاحب) نے اُن (مولانا مودودی صاحب)

---

[1] ایک شخص ایک کارواں، ص ۸۰ [2] مولانا منظور نعمانی، مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت، ص ۲۶

سے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ تقلید شخصی کو ضروری نہیں سمجھتے لیکن میرا خیال ہے کہ فتنوں کے اس زمانہ میں یہ آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے کہ جس مسئلہ پر ائمہ اربعہ متفق ہوں اس کے خلاف نہ کیا جائے انھوں نے کہا کہ ہاں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو جائز نہیں سمجھتا۔

اس زمانہ تک بھی مولینا کی داڑھی بہت مختصر تھی اور سر پر انگریزی بال بھی رہتے تھے۔ میں نے دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ ان کی داڑھی کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کیا ایسی داڑھی رکھنا آپ کے نزدیک جائز ہے؟"[لہ]

ایسے حالات اور ماحول میں مولینا مودودی صاحب نے اپنی تحریک اور جماعت کی بنیاد رکھ دی اور نام کے معاملے میں بجائے اس کے کہ حزب اللہ، دین الٰہی، خلافت اسلامیہ وغیرہ کی بحث میں پڑتے سیدھے سیدھے اپنی تحریک کا نام جماعت اسلامی رکھ دیا۔ اس نام کی حیثیت شرعی اور دینی اعتبار سے جو کچھ بھی رہی ہو مگر ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سیدھے سادے عوام یہ سمجھنے لگے کہ جو اس تحریک میں اور مولینا صاحب کی امارت میں شامل نہیں ہوگا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اسی کے ساتھ دین کی اساسی فہم و علم رکھنے والوں میں سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوگیا کہ اس قسم کے دعاوی اور دعوتیں تو انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس بارے میں مولینا نعمانی فرماتے ہیں:

"راقم سطور (مولینا محمد منظور نعمانی) کو یاد ہے کہ جماعت اسلامی کے بالکل ابتدائی دور میں جب مولینا سید سلیمان ندوی، مولینا عبد الماجد دریابادی اور مولینا مناظر احسن گیلانی نے مولینا مودودی کے اپنی طرز فکر اور اس پر مبنی دعوت سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا تھا تو مولینا گیلانی نے اپنے کسی مضمون یا مکتوب میں لکھا تھا کہ مودودی صاحب جس طریقہ پر اور جس انداز میں دعوت دے رہے

لہ مولینا منظور، مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت، ص ۳۸

ہیں۔ یہ امت کے مصلحین و مجددین کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ اللہ کے نبیوں کی دعوت کا ہوتا ہے۔ مودودی صاحب نبیوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔"[۱]

یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ جماعت کی تاسیس سے پہلے مولانا گیلانی مودودی کے ہمدرد و مددگار تھے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اُن پر مولانا کی افتادِ طبع کا یہ انداز ظاہر ہوا۔ بہرحال قبل اس کے کہ لوگ اس پر تحقیق و تدقیق کریں، مولانا صاحب سے گفت و شنید کریں اور اظہار رائے کریں مولانا مودودی صاحب نے صاف ہی صاف اعلان کر ڈالا کہ جو میری تحریک اور دعوت میں شریک نہیں ہوگا وہ یہودیوں والا طریقہ اختیار کرے گا۔ مولانا کی نیت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہوگا مگر الفاظ سے بالکل یہی مفہوم ظاہر ہوا کہ جو ہمارے ٹولے میں نہیں آئے گا وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ یہ بیان اور اعلان ملاحظہ فرمائیں:

> "اس موقع پر ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس قسم کی دعوت کا جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں ایک مسلمان قوم کے لئے اُن کو قبول نہ کرنے اور اُن کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لئے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے یا نہیں تو اُسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔"[۲]

---

[۱] مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت، ص ۱۴۴

[۲] مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت، ص ۱۴۲، بحوالہ روداد جماعت اسلامی حصہ دوم صفحات ۱۷-۱۸

اس جگہ مولانا منظور نعمانی کے ساتھ پیش آیا ہوا ایک واقعہ اس بیان کی وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمالیجئے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک سفر میں جماعت اسلامی کے کچھ حضرات ان سے ملنے آئے، مولانا نعمانی بہت پہلے جماعت اسلامی سے قطع تعلق کرچکے تھے۔ ان حضرات نے مولانا کو جماعت اسلامی کے حق میں ہموار کرنا چاہا۔ مولانا نے اس موضوع پر گفتگو سے اجتناب کیا مگر وہ حضرات اصرار کرتے رہے۔ آخر میں اُن میں سے ایک صاحب بہت غصہ میں آگئے اور فرمایا کہ اب ہم صاف کہتے ہیں کہ آپ مُرتد ہوگئے ہو، ہم دعوت دیتے ہیں کہ توبہ کرکے پھر اسلام میں آجاؤ۔ مولانا نعمانی کہتے ہیں کہ اللہ کا فضل ہے مجھے بالکل غصہ نہیں آیا اور میں یہ سمجھا کہ شاید اس بے چارے نے مودودی صاحب کے اسی مذکورہ بیان ہی سے یہ سمجھا ہو کہ جو شخص جماعت اسلامی میں شامل ہوکر الگ ہوگیا وہ مرتد ہوگیا۔[1]

اس اعلان، دعویٰ، اور فیصلے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے قرآن کے مفہوم، حدیث کی استناد، فقہ، انبیاء ورسل، صحابہ، خلفائے راشدین، اولیائے دین، اسلاف کرام، علمائے سلف اور اکابر خلف کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ بدقسمتی سے ان کے اشہب قلم نے ایسی ایسی راہیں اختیار کیں جو علمائے دین اور شرعی و اسلامی تعلیمات کا فہم و بصیرت رکھنے والوں کے لئے بالکل نئی اور ناقابلِ قبول تھیں۔

مولانا مودودی صاحب کی جماعت کے دستور میں ایک اصول یہ بھی رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو چاہے وہ کوئی بھی ہو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے۔ شرعی اور علمی طور پر یہ اصول اچھا ہے یا بُرا؟ اس پر مختلف علمائے کرام کافی بحث کرچکے ہیں مگر اس کا ظاہری نتیجہ یہ نکلا کہ مسائل و معاملات میں سمجھنے اور سمجھانے کی بات تو دب گئی اس کی جگہ مفسرین، محدثین، فقہائے کرام،

---

[1] مولانا مودودی صاحب کے ساتھ میری رفاقت، ص ۱۳۲

اسلاف عظام، علماء و فضلاء پر نکتہ چینی اور عیب جوئی پالیسی میں داخل ہوگئی اور اس کی ابتدا مولینا صاحب نے بہ نفس نفیس خود فرمائی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں قرآن فہمی کی تاریخ بتلاتے ہوئے مولینا نے فرمایا:

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ 'الٰہ' کے کیا معنی ہیں اور 'رب' کسے کہتے ہیں"۔ "لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہوگیا۔"[1]

"انہی دونوں وجوہ سے دور اخیر کی کتب لغت و تفاسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح ان معانی کے ساتھ کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے مثلاً لفظ "الٰہ" کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنادیا گیا۔ 'رب' کو پالنے اور پوسنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھہرایا گیا۔ عبادت کے معنی پوجا اور پرستش کے لئے گئے۔ دین کو دھرم اور مذہب کو ریلیجن کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا۔ طاغوت کا ترجمہ بت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہوگیا۔"[2]

"پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آرہے ہیں ان کا بڑا سبب یہی ہے۔"[3]

---

[1] مولینا ابوالحسن علی ندوی 'عصر حاضر میں دین کی تشریح' ص ۲۰ بحوالہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں از مولینا مودودی ص ۸

[2] " " " " " " "

[3] " " " " ص ۲۳ " صفحات ۸-۹

مولینا مودودی صاحب کی ان عبارتوں کو آپ نے سرسری طور پر پڑھا ہو تو ایک بار غور سے پھر پڑھ لیجئے اور اس کے بعد ان کے بارے میں مولینا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی رائے پڑھیے، جن کی قرآن فہمی اور دینی بصیرت کا آج پورا عالم معترف ہے وہ لکھتے ہیں:

"ان عبارتوں کا پڑھنے والا جس کا مطالعہ گہرا اور وسیع نہیں ہے اور جو اس حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عام گمراہی اور دین سے ایسی ناآشنائی سے جو زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہو کر ساری امت پر سایہ فگن ہو، محفوظ رکھا ہے، یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قرآن مجید کی حقیقت اس طویل مدت تک امت کی (یا زیادہ محتاط الفاظ میں امت کے اکثر افراد کی) نگاہوں سے اوجھل رہی اور امت بحیثیت مجموعی ان بنیادی الفاظ کی حقیقت سے بے خبر رہی جن کے گرد اس کتاب کا پورا نظام گردش کرتا ہے اور جن پر اس کی تعلیمات اور دعوت کی عمارت قائم ہے اور یہ پردہ اس بیسویں صدی کے وسط ہی میں اُٹھ سکا۔"

"اس نتیجہ سے اس امت کی گذشتہ تاریخ اور اس کے مجددین، مصلحین اور مجتہدین کے علمی و عملی کارنامے بھی مشکوک ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لئے بھی یہ بات بڑی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ کہا گیا اور سمجھا گیا ہے وہ صحیح ہے۔"[1]

مگر مولینا مودودی صاحب کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے کسی مستند مفسر یا تفسیر کی ضرورت نہیں ہے اور نہ تفسیر کا علم حاصل کرنے کے لئے طلبائے علوم عربیہ و دینیہ کی کوئی اہمیت ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

"قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو جدید طرز پر قرآن پڑھانے اور

---

[1] عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح، ص ۴۲

سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا۔ پھر بی۔ اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھائے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے۔" [۱]

اس کے بعد مولانا نے محدثین اور علم حدیث پر شبہ کا اظہار فرمایا ہے۔ الفاظ اور خیالات صحیح ہوں یا غلط ہوں مگر اتنی بات تو واضح ہے کہ اسی قسم کے شکوک و شبہات نے امت کے ایک گروہ کو انکار حدیث کے دلائل فراہم کئے ہیں۔ مولانا صاحب کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لئے جو حدیں اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اُس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے [۲] پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے۔"

تفسیر اور حدیث کے بعد اب فقہ، فقہا اور ائمہ مجتہدین بلکہ ائمہ اربعہ کی باری ہے۔ ان کے ساتھ علمائے دین و مفتیان شرع متین کا بھی احاطہ کر لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو۔ کیا

---

[۱] مولانا محمد یوسف لدھیانوی۔ اختلاف امت اور صراط مستقیم، ص ۱۳۰، بحوالہ تنقیحات از مولانا مودودی، ص ۱۹۳

[۲] ص ۲۹۲

ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔ ہم نے اپنے دین کو یسر بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عسر بنادو۔ ہم نے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس بازپرس میں کوئی امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق، ہدایہ، اور عالمگیری کے مصنفین کے راستوں میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہلاء کو جوابدہی کرنے کا یہ موقع ضرور مل جائے گا کہ ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا ہ ربنا آتھم ضعفین من العذاب والعنھم لعناً کبیرا ہ[1]

مولانا صاحب کا یہ بیان پڑھنے کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ مذکورہ آیتیں کفار کے بارے میں نازل ہوئی تھیں کہ وہ لوگ باری تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کریں گے کہ ہمیں ہمارے اکابر نے گمراہ کیا تھا اس لئے انہیں دگنا عذاب دیجئے اور ان پر زبردست لعنت وارد کیجئے۔ مولانا مودودی صاحب کے مذکورہ بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ آیت کا مصداق فقہائے، امت اسلامیہ اور ائمہ مجتہدین ہیں۔ اور اسی لئے مولانا دین، شریعت اور اسلامی افکار کے بارے میں کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھے بلکہ جو کچھ اپنی رائے اور مطالعہ سے سمجھتے ہیں اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میں اپنا دین معلوم کرنے کے لئے چھوٹے یا بڑے علماء کی طرف دیکھنے کا محتاج نہیں ہوں، بلکہ خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے معلوم کرسکتا ہوں کہ اس ملک میں جو لوگ دین کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں

[1] اختلاف امت اور صراط مستقیم ص ۱۳۳ بحوالہ حقوق الزوجین از مولانا مودودی ص ۹۸

وہ کسی خاص مسئلہ میں صحیح مسلک اختیار کر رہے ہیں یا غلط؟ اس لئے میں اپنی جگہ پر مجبور ہوں کہ جو کچھ قرآن و سنت سے حق پاؤں اُسے حق بھی سمجھوں اور اس کا اظہار بھی کر دوں۔[1]

یہاں تک قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کے مسلک کا کچھ بیان پیش کیا گیا ہے۔ اگلی سطور میں انبیاء و رسل، صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور اکابر امت کے بارے میں موصوف کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے انبیاء کے بارے میں ان کے فرمودات پیش ہیں:

"موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے۔"[2]

"حضرت داؤد علیہ السلام کے فعل میں خواہش نفس کا کچھ دخل تھا۔ اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرماں روا کو زیب نہ دیتا تھا۔"[3]

سیدنا یوسف علیہ السلام کے قول، "اجعلنی علی خزائن الارض کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یہ محض وزیر مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ڈکٹیٹر شپ کا مطالبہ تھا، اور اس کے نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام

---

[1] اختلاف امت اور صراط مستقیم، ص ۱۳۲ بحوالہ حقوق الزوجین از مولانا مودودی، ص ۹۸

[2] ص ۱۰۰ بحوالہ رسالہ ترجمان القرآن عدد ۲۹، ص ۵

[3] ٭ ٭ ٭ بحوالہ تفہیم القرآن

کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے۔"[1]

"حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔ غالباً انھوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔"[2]

صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے بارے میں ان کے خیالات ان کی اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں ملاحظہ فرمایئے:

"حضرت علی (کرم اللہ وجہہٗ) نے اس پورے فتنے کے زمانے میں جس طرح کام کیا وہ ٹھیک ٹھاک ایک خلیفۂ راشد کے شایانِ شان تھا۔ البتہ صرف ایک بات ہے جس کی مدافعت میں مشکل ہی سے کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگ جمل کے بعد انھوں نے قاتلین عثمان کے بارے میں اپنا رویہ بدل لیا۔ جنگ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے، بادل ناخواستہ ان لوگوں کو برداشت کر رہے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔"

"لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ ان کے یہاں تقرب حاصل کرتے چلے گئے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش کرنے اور بالآخر انھیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے حتیٰ کہ انھوں نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دئے درآں حالیکہ قتل عثمان میں ان دونوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ حضرت علی کے پورے زمانۂ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا لگا جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"[3]

---

[1] اختلاف امت اور صراط مستقیم ص ۱۰۴ بحوالہ تفہیم القرآن

[2] " " "

[3] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت وملوکیت، ص ۱۳۷

"آخری وقت میں انھوں نے (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے) حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کو بلا کر ہر ایک سے کہا اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو گئے تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔"

"مگر بدقسمتی سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان اس معاملے میں معیار مطلوب کو برقرار نہ رکھ سکے ان کے عہد میں بنو امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دئے گئے۔"

"اس کا نتیجہ آخرکار وہی ہوا جس کا حضرت عمر کو اندیشہ تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا۔"

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ کسی نے کیا ہو۔ اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضہ ہے اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔"

"مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئے ہوں لیکن حضرت معاویہ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے سونا چاندی ان کے

ك مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص ۹۳

ك " " " ص ۱۰۷

لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے سے تقسیم کیا جائے۔[1]

مذکورہ بالا بیان اور اپنی کتاب 'خلافت و ملوکیت' میں صحابہ کرام کی غلطیوں اور کمزوریوں پر بہت سے بیانات مولینا مودودی صاحب نے تاریخ کی کتابوں سے نقل کئے ہیں۔ جو شخص محدثین کرام پر کلیتاً اعتماد نہیں کرتا اس نے مورخین پر اور وہ بھی صحابہ کرام اور خلافت راشدین کی کوتاہیوں کے بارے میں ان کے محاکمہ پر کیسے اعتبار کرلیا؟ بہت سی باتیں عوام کی عدالت میں پیش کرنے سے صرف اس بنا پر اجتناب کیا جاتا ہے کہ اُن سے ابتلا' آزمائش اور فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ اصول حدیث شریف سے ثابت ہے جو اصحاب علم و بصیرت سے مخفی نہیں ہے۔

اب ترتیب کے اعتبار سے اکابر امت کا معاملہ آتا ہے۔ ان کے بارے میں بھی مولینا صاحب کے خیالات، توجہ اور غور و فکر کے طالب ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد ہے:

> "امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو علم حدیث میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے۔ دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم ان نقائص کی ہے جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے۔"[2]

اس کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں اپنا فیصلہ سُناتے ہیں:

> "تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی ایسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے ہاتھ سے نکل کر

---

[1] خلافت و ملوکیت، ص ۱۹۲ بحوالہ طبقات ابن سعد ج ۴، ص ۱۸۸

[2] اختلاف امت اور صراط مستقیم بحوالہ تجدید احیائے دین از مولینا مودودی، ص ۶۰

اسلام کے ہاتھ میں آجائیں۔[1]

حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خلفاء کے بارے میں فرمایا ہے:

"پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کاموں میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا۔ اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا مجھے فی نفسہٖ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصل تصوف ہے اور اس کی نوعیت احسان سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور تصوف نما طریقے سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کا جاری کرنا ہے۔"[2]

آپ سمجھے یہ متصوفانہ رموز و اشارات، متصوفانہ زبان اور متصوفانہ طور طریقے جن کو مولینا صاحب لائق پرہیز فرمارہے ہیں یہ کیا ہیں؟ ان کی تفصیل بیان کی جائے تو دین و شریعت کا معمولی سا ذوق اور فہم رکھنے والا مسلمان بھی کہہ اٹھے گا کہ یہ تو غلط نہیں ہے بلکہ یہی تو اصل اسلام ہے۔ آگے چل کر تصوف اور صوفیا کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جب وہ مریض کے لئے نقصان دہ ہو اسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اسی بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اس کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو

---

[1] اختلاف امت اور صراط مستقیم، ص ۱۲۷ بحوالہ تجدید احیائے دین، ص ۷۰

[2] " " " ص ۱۲۸ " " ص ۱۳۱

پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہے جو صدیوں سے ان کو تھپک تھپک کر سُلاتی رہی ہے"۔[1]

ہر چند کہ اس بار زبان کسی درجہ میں مبتذل ہوگئی ہے مگر یہی مولینا صاحب کا کمال ہے کہ ان کو ہر صنف اسلوب پر قدرت حاصل ہے۔

ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ انسان بشری کمزوریوں کا پتلا اور خطا و نسیان سے مرکب ہے۔ اسی فطرت کے مطابق مسلمانوں سے بھی کبھی کبھی اونچ نیچ اور بھول چوک ہوجاتی ہے۔ مگر بے عمل اور قصور وار مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں اور شفاعتوں کا بڑا اسہارا تھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ:

قل لعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة اللہ ان اللہ یغفر الذنوب

آپ کہہ دیجئے۔ اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام گناہوں کو یقیناً معاف کردیں گے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من عبد قال لا الہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنة۔ قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق علی رغم انف ابی ذر (الحدیث متفق علیہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو اللہ کا بندہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے (اور اس پر ایمان رکھے) اور اسی عقیدہ پر اُسے موت آجائے تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ ابوذر فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ چاہے اُس نے چوری اور زنا کیا ہو۔ فرمایا کہ ہاں چاہے اُس نے چوری اور زنا کیا ہو۔ میں نے پھر پوچھا کہ چاہے اُس نے

[1] اختلاف امت اور صراط مستقیم، ص ۱۲۸ بحوالہ تجدید احیائے دین، ص ۱۳۱

چوری اور زنا کیا ہو۔ فرمایا کہ ہاں چاہے اُس
نے چوری اور زنا کیا ہو۔ میں نے پھر پوچھا کہ
چاہے اُس نے چوری اور زنا کیا ہو۔ فرمایا کہ
ہاں چاہے اُس نے چوری اور زنا کیا ہو ابوذر
کے علی الرغم وہ پھر بھی جنت میں جائے گا۔

(بخاری و مسلم)

یہ ایک آیت اور حدیث شریف ہے جو نمونے کے طور پر نقل کی گئی۔ اس قسم کی دوسری کتنی بشارتیں ہیں جو مسلمانوں کے لئے بڑا سہارا اور آسرا ہیں، مگر مولینا مودودی صاحب نے اس شجرِ امید کو جڑ ہی سے کاٹ دیا۔ اور فیصلہ فرمایا کہ جو مسلمان عمل میں کوتاہی اور فرائض میں غفلت برتے گا وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمایئے مولینا صاحب فرماتے ہیں:

"وہ لوگ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض ان کے ذمہ ہے، دنیا بھر کے سفر کرتے رہتے ہیں، کچھ یوروپ کو آتے جاتے ہیں، حجاز کے ساحل سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں سے مکہ صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور پھر حج کا ارادہ تک ان کے دل میں نہیں گزرتا تو وہ قطعاً مسلمان نہیں ہیں، جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔"[1]

"اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے بغیر نماز روزہ اور ایمان کی شہادت سب بیکار ہیں، کسی کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"[2]

"ان دو ارکان (روزہ نماز) سے جو لوگ روگردانی کریں ان کا دعویٰ ایمان ہی جھوٹا ہے۔"[3]

مولینا کے یہ خیالات اور اعلانات علمائے دین کی نظر سے گزرتے رہتے تھے اور

---

[1] [2] [3] رسالہ ایمان و عمل از حضرت مدنیؒ بحوالہ خطبات مولینا مودودی، ص ۱۰۶ و ص ۱۲۴ و ص ۱۳۰

ان کو اعتراض بھی ہوتا رہتا تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان تحریروں پر مطلع ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ترجمان القرآن اور بہت سے دوسرے اخبارات ومجلات حضرت کے نام آتے رہتے تھے مگر اپنی تدریسی، علمی اور روحانی مصروفیتوں کی وجہ سے حضرت کو خارجی مطالعہ کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے دوسرے علماء اور طلباء جو ترجمان القرآن کا مطالعہ کرتے تھے ان میں سے بعض ترجمان القرآن اور مولینا کی تحریر سے متاثر اور ان کے مداح بھی ہو گئے تھے۔ اسی درمیان میں مولینا نے ایک کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" لکھی۔ نظریہ متحدہ قومیت اس وقت کا بہت گرما گرم موضوع تھا۔ مودودی صاحب نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ایسے انداز میں قلم باری کی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نظریہ اور پالیسی کو عنوان بنا کر حضرت کی ذات گرامی اور شخصیت کو نشانہ بنانا مقصود تھا۔ حضرت کے مخالفین ومعاندین کے ایک بڑے حلقے نے جس کا مفصل تذکرہ پچھلے اوراق میں گزر چکا ہے مولینا کو سر آنکھوں پر بٹھالیا اور آپ کی شہرت ومقبولیت میں دن دونی رات چوگنی تیزی آگئی۔

> "تحریک پاکستان کے دو رہنماؤں اور مسلم لیگ کے مرکزی عہدیداروں یعنی مولینا ظفر احمد انصاری اور نواب زادہ صدیق علی خاں تصدیق کرتے ہیں کہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم اور مسئلہ قومیت وہ واحد لٹریچر تھا جو مسلم لیگ نظریۂ پاکستان کے حق میں استعمال کرتی تھی اور اپنے خرچ پر چھپوا کر اسے تقسیم کرتی تھی۔"[1]

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ مولینا مودودی نہ مسلم لیگ کے موافق تھے اور نہ پاکستان کے حامی تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس تحریر میں حضرت سے ذاتی مخالفت کا جذبہ بھی شامل رہا ہو اس لئے کہ اگرچہ حضرت نے اب تک کوئی اعراض واعتراض نہیں کیا تھا۔ مگر خطرہ ہر وقت تھا کہ بات آگے بڑھے گی اور تحریک کا نعرہ بلند ہوگا تو شاید

---

[1] ایک شخص ایک کارواں، ص ۳۵

حضرت اپنی رائے ظاہر فرمادیں۔ مختصر یہ کہ ان مضامین کی اشاعت اور ان کے اشتعال پر حضرت بالکل خاموش رہے۔ راقم السطور کو خوب یاد ہے کہ ایک خادم نے کتاب حضرت کو دکھائی اور متعلقہ مضامین زبانی عرض کرکے خواہش ظاہر کی کہ یا تو خود حضرت اس کا جواب دیں یا اپنے متعلقین و تلامذہ میں سے کسی کو اجازت دیں کہ وہ لکھ کر حضرت کو دکھا کر جواب دے۔ مگر حضرت نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس قسم کی باتیں روز ہی پیش آتی رہتی ہیں۔ لوگ کچھ نہ کچھ بکتے ہی رہتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ اگر ہر شخص کا جواب دینے لگو گے تو اپنے دینی و دنیوی فرائض کیسے ادا کروگے؟" اس طرح بات آئی گئی ہوگئی اور حضرت وصہ تک مولینا کی تحریروں اور تحریکوں سے لاعلم اور خاموش رہے۔ مگر آخر میں متعلقین اور مریدین نے مولینا کی کتابوں اور تحریروں کے اقتباسات بھیج کر ان کے معتقدات کے بارے میں حضرت کی رائے طلب کرنی شروع کی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مولینا ابواللیث اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہندوستان نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خطوط لکھے اور ملاقات نیز افہام و تفہیم کی دعوت دی۔ ایک دو خطوط تک تو حضرت چپ رہے مگر جب اصرار بڑھا تو حضرت نے مولینا مودودی کی تحریروں کا مطالعہ اور ان کے بارے میں اہل رائے حضرات سے مشورہ کرنا چاہا۔ اس کی تفصیل حضرت شیخ الحدیث مولینا زکریا صاحبؒ نے لکھی ہے جس کو مختصراً ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

> "شوال ۱۳۷۰ھ کی بات ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن ٹانڈہ سے دیوبند تشریف لے جارہے تھے۔ میں ملاقات کے لئے سہارنپور اسٹیشن پر حاضر ہوا۔ مولینا عبدالقادر صاحب رائے پوری بھی ہمراہ تھے۔
>
> حضرت مدنی قدس سرہٗ حضرت رائے پوری سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ مجھے تم دونوں سے مشورہ کرنا ہے۔ چنانچہ اسی روز حضرت قدس سرہٗ ہمراہیوں اور سواریوں کو دیوبند پہنچا کر واپس آئے اور ہم دونوں سے فرمایا کہ مودودی کے متعلق مجھے تفصیل سے کتابیں دیکھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ کچھ

ترازنے لوگوں نے بھیجے ہیں وہ دیکھتا رہا۔ اب مولوی ابواللیث کے خطوط اس سلسلے میں آرہے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں گفتگو کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ تم دونوں کا اس میں کیا خیال ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت! چار ماہ شب و روز ان ہی کی کتابیں دیکھنے میں گزرے ہیں اور اتنا مواد میری کاپیوں میں موجود ہے کہ حضرت اتنا دیکھ بھی نہیں سکتے۔ حضرت مدنی نے فرمایا کہ اس وقت تو فرصت نہیں ہے تین چار دن میں مولانا اعزاز علی صاحب کو ساتھ لاؤں گا پھر آپ کی ساری تحریریں سنوں گا۔ چنانچہ دونوں حضرات تشریف لائے اور وہ نوٹ بھی نے، اصل کتابوں میں نشان لگا کر وہ نوٹ اور بہت سی کتابیں ساتھ لے گئے۔ اسی وقت سے حضرت مدنی کا جوش بھی مودودیوں کے خلاف بہت تیز ہو گیا۔ اس لئے کہ حضرت مدنی نے اپنی آنکھوں سے ان مضامین کو اصل کتابوں میں پڑھ لیا تھا۔[۱]

ان تحقیقات، مطالعے اور مشوروں کے بعد ہی حضرت رحمۃ اللہ نے مودودی صاحب کی تحریروں کے بارے میں اظہار رائے فرمایا۔ حضرت تحریر و تقریر میں بالکل سادہ اسلوب بیان کے عادی تھے۔ عبارت آرائی اور سخن سازی کا کبھی اہتمام نہیں فرماتے تھے۔ خاص طور پر جس مسلک، مذہب اور موقف کو صحیح سمجھتے تھے اس کے اعلان و احقاق میں کسی رو رعایت، مداہنت اور لگا لپٹا کو روا نہیں رکھتے تھے۔ مولانا ابواللیث صاحب نے حضرت کو تین خطوط تحریر کئے جن میں سے پہلے خط میں ۲۳ر اپریل ۱۹۵۱ء کو ہونے والے جماعت اسلامی ہند کے کل ہند اجتماع منعقدہ رام پور میں شرکت کی دعوت ہم کی دوبارہ یاددہانی کی گئی تھی اور دیوبند کے اس فتویٰ کے بارے میں جو سہارنپور سے شائع ہوا تھا توجہ دلائی گئی تھی کہ

مودودی فتنہ کو مٹادو مودودی فتنہ کو مٹادو مودودی کے ہم خیال گمراہ

۱؎ فتنۂ مودودیت از حضرت شیخ مولانا زکریا صاحب

ہیں، مودودی تحریک مہلک اور زہر قاتل ہے۔ مودودیوں کے پیچھے نماز نہ پڑھو کی موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ ایسے فتویٰ کا دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونا ہمارے لئے حیرت اور قلق کا موجب ہوا۔

تیسرے خط میں بھی پچھلے خط کی یاد دہانی کرائی گئی تھی اور یہ لکھا گیا تھا کہ آں جناب کا کوئی گرامی نامہ یہاں (رامپور) کے کسی صاحب کے نام آنا معلوم ہوا ہے جس میں آپ نے ہدایت کی کہ جماعت اسلامی کی ہر طرح مخالفت کی جائے۔ اور سُنا گیا ہے کہ جماعت اسلامی کی کتابیں ایک کمیٹی کے سپرد کی گئی ہیں کہ وہ جماعت کی غلطیاں چھانٹ کر الگ کریں۔ اس لئے یہ درخواست کی گئی کہ کمیٹی مذکورہ کا فیصلہ آنے تک ان فتوؤں کا سلسلہ روک دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جماعت کو موقع دیا جائے کہ وہ اعتراضات کے ضمن میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکے۔[1]

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں خطوط کے جواب میں مولینا ابواللیث صاحب کو جو مکتوب ارسال کیا اس کی مندرجہ ذیل تلخیص سے مولینا مودودی صاحب کے افکار اور مسلک پر حضرت کے اعتراضات اور موقف کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے حضرت نے لکھا کہ

والا نامہ اور اس سے پہلے دعوت نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ میری مصروفیتوں کا جناب نے صحیح طور پر اندازہ کیا۔ جن موٹی موٹی سرخیوں والے اشتہارات کا آں جناب نے ذکر کیا ہے ان کا آپ کے والا نامہ سے پہلے مجھے کوئی علم نہ تھا ہاں ایک صاحب نے رسالہ "کشف حقیقت یعنی تحریک مودودیت اپنے اصلی رنگ میں" بھیجا تھا، اس کا البتہ علم ہوا تھا۔

محترم! پہلے میرا خیال تھا کہ آپ کی تحریک اسلامی مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی علمی، عملی اور دنیاوی انتشار اور دینی کمزوریوں کو دور کرنے تک ہی محدود

---

[1] ماخوذ از 'امیر جماعت اسلامی کی مولینا مدنی سے مراسلت'

ہے۔ اگرچہ طریق تنظیم میں اختلاف رائے ہو۔ اس لئے میں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا کبھی مناسب نہ سمجھا۔ اگرچہ افراد جماعت اور قائد جماعت کی طرف سے بسا اوقات ناشائستہ کلمات، تقریر اور تحریر میں معلوم ہوئے مگر ان سب سے چشم پوشی کرنا ہی انسب معلوم ہوا۔ مگر اب ہندوستان و پاکستان سے مختلف حضرات نے مودودی صاحب کے اقتباسات بھیج کر میری رائے معلوم کی تو میں اپنے مطالعہ اور فہم سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:

آپ کی تحریک "اسلامی" خلاف سلف صالحین مثل معتزلہ، خوارج، روافض، جہمیہ وغیرہ فرق قدیمہ اور مثل قادیانی، چکڑالوی، مشرقی، نیچری، مہدوی، بہائی وغیرہ فرق جدیدہ، ایک نیا اسلام بنانا چاہتی ہے اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچ رہی ہے۔ وہ ان اصول وعقائد واعمال پر مشتمل ہے جو کہ اہل سنت والجماعۃ اور اسلاف کرام کے خلاف ہیں۔

وہ قرآن شریف کی تفسیر بالرائے کی قائل ہے۔ ہر وہ پروفیسر جو کہ ملحدان یوروپ اور ان کی نئی روشنی کا حامل اور تھوڑی بہت عربی زبان سے واقف ہے اس کے نزدیک یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی رائے اور اپنے مذاق سے تفسیر کر کے مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہو خواہ اس کی تفسیر سلف صالحین اور صحابہ کرام کے اقوال کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قیاسات اور انکلوں پر چلانے والا بتلاتی ہوئی تاریخی واقعات کے ذریعے سے احادیث صحیحہ اور حسنہ کو ردی کی ٹوکری کی نذر کرتی ہے۔

وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سقیم یا صحیح، غیر حقیقی المراد روایات کی بنا پر مثل روافض غیر قابل وثوق اور ہدف ملامت بناتی ہے۔

وہ صحابہ کرام کی متعدد روایتوں کو خواہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں، ان کی خوش اعتقادی پر مبنی بتاتی ہوئی واقعیت سے دور کر دیتی ہے۔

وہ احادیث صحیحہ کے راویوں اور ائمہ حدیث کو مجروح اور غیر ثقہ بتاتی ہوئی اقوال ضعیفہ یا غیر ظاہر المراد اقوال صحیحہ یا ان کے خود غرض اہل اہواء دشمنوں کے اقوال پیش کرتی ہے اور مشاہیر عالم ائمہ ثقات کو غیر قابل اعتبار قرار دیتی ہے۔ حالانکہ اس سے تمام ذخائر احادیث بالکل فنا ہو جاتے ہیں اور لعن آخر ہذہ الامۃ اولہا کا سماں پیش کرتی ہے۔

وہ تقلید شخصی کو نہایت گمراہی اور ضلالت قرار دیتی ہے۔ حالانکہ یہ امر آیات قرآنیہ فاسئلوا اھل الذکر الایۃ۔ واتبع سبیل من اناب۔ الایۃ ومن یتبع غیر سبیل المومنین الایۃ۔ کی بنا پر فی زمانہ اجبکہ اہل علم و جامعین شروط اجتہاد معدوم ہیں جیسا کہ چوتھی صدی کے بعد سے آج تک کے احوال بتلا رہے ہیں) تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔

وہ ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کی تقلید کو گمراہی اور حرام بتلاتی ہے۔

وہ طریق تصوف اور اس کے اعمال کو جاہلیت اور الحاد و زندقہ قرار دیتی ہے اور اس کو بدھ ازم اور یوگ بتلاتی ہے۔

وہ سلف صالحین اور اولیاء اللہ سابقین کی شان میں نہایت زبان درازی کرتی ہوئی سخت گستاخانہ الفاظ استعمال کرتی ہے اور ان کو عوام الناس میں نہایت ذلیل و خوار کرتی ہے۔

وہ حضرت مجدد الف ثانی حضرت شیخ سرہندی قدس سرہ العزیز اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز اور ان کے اتباع و اعتقاد اور دیگر ائمہ ہندی خواجہ معین الدین چشتی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس اللہ اسرارہم ائمہ طریقت کو مسلمانوں میں افیون اور ضلالت و گمراہی کے انجکشن دینے والا بتلاتی ہے۔

وہ مذکورہ بالا مشائخ طریقت رحمہم اللہ تعالیٰ کو یوگ اور بدھ ازم

اور ضلالت پھیلانے والا بتاتی ہوئی ان کی تذلیل کرتی ہے۔

وہ علماء ظواہر اور محافظین علوم شرعیہ کی شان میں سخت گستاخی کے الفاظ استعمال کرتی ہوئی عوام کو ان سے متنفر کرتی ہے اور اُن کی تذلیل و توہین عمل میں لاتی ہوئی غیر قابل اعتماد ٹھہراتی ہے اور عام مسلمانوں کو نئے اسلام اور اس کے لیڈر کی تقلید اور تابعداری کی طرف بُلاتی ہے۔

وہ چکڑالوی کی طرح ذخیرۂ احادیث کو بے معنی اور ہذیان بتلاتی ہے۔

وہ مثل فرق قادیانیہ اپنے قائد اعظم اور امیر کو ایسا مختار بناتی ہے کہ اپنے مذاق سے جس حدیث کو قابل اعتماد قرار دے اور جس کو چاہے رد کرے۔

وہ ذخائر فقہ کو غلط اور ذخیرۂ ضلالت بتاتی ہوئی ترمیم اور اصلاح اور حذف کا حکم دیتی ہے اور مسلمانوں کے آج تک کے تیرہ سو برس کے عمل درآمد کو جاہلیت اور گمراہی بتلاتی ہے اور سب گذشتہ مسلمانوں کو غیر ناجی کہتی ہے۔

محترم! دور حاضر میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اکثریت 'موجودہ حکومت' مہا بھائیوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت، آر ایس ایس کی اسلام دشمنی وغیرہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان میں دن بدن احساسِ کمتری پیدا ہوتا جارہا ہے۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ اس شیرازہ کو مضبوط بنانے کی کوشش کی جاتی۔ مسلمانوں کے دل سے خوف وہراس، بدحواسی، اور بزدلی بے دینی اور لاعلمی کو دور کیا جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی تحریک دینی و دنیاوی انتشار کی وبا پھیلا رہی ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس تحریک سے علٰحدہ رہنے اور مودودی صاحب کے لٹریچر کو نہ دیکھنے کا مشورہ دوں۔

امور مذکورہ کی موجودگی میں میں نہیں سمجھتا کہ جناب سے شرف ملاقات سے کوئی نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے میں ایک پرانا مسلمان اُحناف کا مقلد، مشائخ طریقت کا خادم ہوں، مسلمانوں کو سلف صالحین کے راستے پر چلانا چاہتا ہوں اور اسی میں

ان کی نجات سمجھتا ہوں۔

آپ حضرات نئے اسلام کے روشن چراغ ہیں۔ مودودی صاحب کے نئے اسلام پر مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں۔ ان کی تجدید اور احیاء کو جو مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت سید احمد شہید وغیرہ رحمہم اللہ کو بھی نصیب نہیں ہوسکی اس کو مسلمانوں کے لئے ذریعۂ نجات قرار دیتے ہیں۔ آپ سلف صالحین کی تیرہ سو جاہلیت سے مسلمانوں کو نجات دلانا چاہتے ہیں۔ ان اصول بون بعید کی موجودگی میں ہم ایک دوسرے پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔

بہرحال میں آپ کی توجہ کا شکرگزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا فضل فرمائے [۱]

مذکورہ بالا بیان میں تفصیلات، کے بعد حضرت نے اپنے موقف کا بالکل وضاحت کے ساتھ بھی اعلان فرمایا:

"میں مودودی صاحب، ان کے لٹریچر اور ان کی جماعت کو سخت گمراہ اور ضال اور مضل سمجھتا ہوں۔ مجھ کو جس قدر بھی ان کی تصنیفات دیکھنے کی نوبت آئی اسی قدر میرا گمان متعلق عقیدہ بڑھتا گیا۔" [۲]

حضرت رحمۃ اللہ کے علاوہ ایک بڑی جماعت جن میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الغفار حسن، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہم، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہم۔ مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف، غازی عبد الجبار، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا وحید الدین خان صاحب بانی مرکز اسلامی و مجلہ الرسالہ دہلی، مولانا سید صبغت اللہ بختیاری، مولانا سید محمد جعفر ندوی، وغیرہ وغیرہ وہ حضرات ہیں جن میں سے بعض جماعت اسلامی کے موسسین، بانی اور السابقون الاولون ہیں، بعض مجلس مشاورت کے ارکان اور بعض امیر، نائب امیر

---

[۱] تلخیص مکتوب ماخوذ از مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۲، صفحہ ۴۰۳

[۲] مکتوبات، ج ۲، صفحہ ۲۴۷

اور قیم تھے اور بعض موید اور ہمدرد تھے، ان میں سب ثقہ، متبحر علماء اور صاحب تقویٰ بزرگ ہیں۔ رفتہ رفتہ سارے ہی حضرات جن کی مجموعی تعداد مولینا منظور نعمانی نے تقریباً ستر لکھی ہے نہ صرف جماعت سے الگ بلکہ مخالف ہوگئے اور مولینا مودودی کے ساتھ صرف وہی لوگ رہ گئے جن کا مبلغ علم دین صرف اتنا سا تھا کہ وہ اردو کی کتابیں پڑھ کر جماعت اسلامی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اور یہی لوگ اب جماعت کے امیر، نائب امیر، قیم اور شوریٰ کے رکن تھے۔ اس بارے میں مولینا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم کا بیان قابلِ ملاحظہ ہے۔ مولینا نعمانی مدظلہم کے بارے میں ایک بار پھر عرض کر دوں کہ وہ جماعت اسلامی کے سب سے پہلے بانیین اور موسسین میں تھے۔ فرماتے ہیں:

"یہ طبقہ (جو جماعت اسلامی کا اصل کارفرما عنصر ہے) اس حال میں نہیں ہے کہ براہ راست کتاب و سنت سے اور ائمۂ سلف سے اور امت کے علماء محققین سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ اس کے پاس علم دین کا سارا سرمایہ بس مودودی صاحب کی تصنیفات اور جماعت کا لٹریچر ہے۔ پھر اس (طبقہ) کو دین کی حکمت عملی کے عنوان سے مولینا نے یہ اصول بھی سکھا دیا ہے اور اس پر عمل کر کے اور کرا کے دکھلا بھی دیا ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے سلسلہ میں (جس کی عملی صورت اب الکشنی معرکے ہی ہیں) اگر ضرورت پڑے تو بقدر ضرورت کسی ناجائز حرام کام کا بھی ارتکاب کیا جا سکتا ہے۔"[1]

"احتیاط سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی میں اٹھانوے ننانوے فی صدی ایسے ہی حضرات ہیں جن کے لئے دین کا ماخذ صرف مودودی صاحب اور ان کی تصانیف ہی ہیں۔"[2]

"امیر اپنی جگہ پر خود مولینا مودودی صاحب نے یا ان کی رہنمائی میں جماعت نے ہمارے عزیز دوست میاں طفیل محمد صاحب کو جو غالباً بی۔ اے ایل ایل بی

---

[1] جماعت اسلامی میں میری شرکت [2] مودودی صاحب سے میری رفاقت

ہیں اور جماعت اسلامی پاکستان کے نمایندے کی حیثیت سے جنرل سکریٹری پروفیسر غفور احمد صاحب کو بنایا ہے۔ جماعت کے سکریٹری دوسرے صاحب ہیں وہ بھی جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے ایک فرد ہیں۔"[1]

مولانا وحید الدین خاں صاحب صدر اسلامی مرکز نئی دہلی پندرہ سال تک مسلسل جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ اس درمیان میں نہ صرف مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے بلکہ جماعت کے فکری، ذہنی اور تحریکی کاموں کی تعمیر میں بھی شریک رہے مگر آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

"مولانا مودودی کے لٹریچر میں دین کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے متعلق میرا شدید احساس یہ ہے کہ وہ دین کے صحیح تصور سے ہٹی ہوئی ہے۔ اس تشریح کے اجزائے ترکیبی تو وہی ہیں جو اصلاً خدا کے دین کے ہیں مگر نئی ترکیب میں اس کا حلیہ اس طرح بگڑ گیا ہے کہ وہ بجائے خود ایک نئی چیز نظر آنے لگا ہے اور دین کی اصل حیثیت اس میں بُری طرح مجروح ہو گئی ہے۔"[2]

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق تالیف خلافت و ملوکیت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ

"اس تازہ فتنہ انگیز تالیف کے مولف کے حق میں مجھے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ حضرت عثمان غنی مظلوم پر اعتراض ناقابلِ عفو جرم ہے۔"[3]

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے 'مودودی صاحب' کے عنوان سے مولانا کا تذکرہ لکھا ہے۔ طوالت تو ضرور ہے مگر خلاصہ اور نچوڑ کے طور پر یہ پورا تذکرہ نقل کر دینے کے قابل ہے۔ کچھ ہمت ہم کر رہے ہیں اور کچھ جبر آپ کیجئے اور مولانا مودودی صاحب

---

[1] مودودی صاحب کے ساتھ میری رفاقت [2] مولانا وحید الدین خاں، تعبیر کی غلطی، ص ۲۱

[3] ماہنامہ 'بینات' مولانا سید محمد یوسف بنوری نمبر، شمارہ فروری ۱۹۷۸ء، ص ۶۲۵

پر مولینا عبدالماجد صاحب کا یہ تذکرہ پڑھ ہی لیجئے :

"سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام سب سے پہلے اُس وقت سننے میں آیا جب وہ جمعیۃ علماء کے اخبار الجمعیۃ ہفتہ وار دہلی میں ایڈیٹر ہوکر آئے اور پھر چند سال بعد دکن جاکر وہاں سے اپنا ماہنامہ ترجمان القرآن نکالا۔ الجہاد فی الاسلام کے عنوان سے ان کے پرزور اور دلنشین مقالے الجمیعۃ میں عرصے تک نکلتے رہے اور یہی آگے چل کر ایک کتابی صورت میں مرتب ہوکر شائع ہو گئے۔ ان کے قلم کی روانی نے کتاب نویس کو ایک فاضل کی شکل میں پیش کر دیا۔ مضمون پر مضمون، مقالے پر مقالے نکلتے رہے خصوصاً پردہ اور سود پر، اور اسی طرح کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ لکھنے والا اہل نظر کو ہونہار ہی نظر آیا۔

کچھ روز بعد قلم میں بجائے اعتدال، توازن اور متانت کے تشدّد اور کٹرپن کے اثرات نظر آنے لگے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے لکھنے والا محض مقالہ نگار یا مصنف ہی نہیں بلکہ ایک مستقل پارٹی یا ٹولی (حزب) کا لیڈر ہے اور اپنا ایک جتھا بنالینا چاہتا ہے۔ اجتہاد کے قدم بھی تیز سے تیز تر ہوتے گئے اور مودودی صاحب ہندوستان سے منتقل ہوکر پٹھان کوٹ (پنجاب) پہنچ گئے اور ایک مخلص صاحب خیر نے اپنی کئی ایکڑ زمین اسلام نگر یا دارالسلام بسانے کے لئے دے دی۔ باتیں اب بھی بہت کام کی کرتے رہے لیکن جو جو عیب اکثر لیڈروں اور جماعتی کارکنوں میں پیدا ہو جاتے ہیں ان میں بھی پیدا ہو گئے اور وہ محض نظریاتی مسائل میں نہیں بلکہ عملی سیاست میں بھی پورا حصہ لینے لگے۔

تصنیفی کام بھی تیزی سے جاری رہا، خصوصاً ان کی تفسیر تفہیم القرآن جسے ان کا شاہکار کہنا چاہیئے تیار ہوتی گئی۔ خیر کا ذخیرہ یقیناً بڑھتا رہا لیکن ساتھ ہی اس کے جو شر کا ذخیرہ بھی ان کے قلم سے نکلتا رہا وہ بھی کچھ ایسا کم نہ رہا۔ "جماعت" ان کی جماعت اسلامی سے موسوم ہوئی اور ذہنیت اس کی خوارج کی سی پیدا ہو گئی، لچک یعنی خود تنقیدی ان کے قلم سے رخصت ہو گئی اور

ملی اور سیاسی معاملات میں عجب عجب رائیں دینے لگے۔ دو باتیں ان کی کسی طرح بھلائے نہیں بھولتیں اور ان کا یقین کر لینا بھی ان کے سابق مخلصوں اور قدیم نیازمندوں کے لئے آسان نہیں۔

ایک تو جب صدر پاکستان کے الکشن کا مسئلہ چھڑا اور صدر ایوب خاں (صدر پاکستان) سے خفا ہوئے تو فرمادیا کہ ایک طرف ان میں کوئی خوبی اس کے سوا نہیں کہ وہ مرد ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابل مس فاطمہ جناح ہیں جن میں کوئی برائی نہیں سوا اس کے کہ وہ عورت ہیں۔ زبان کی اس درجہ بے احتیاطی بجائے خود ایک قہر الٰہی ہے اور اللہ اپنے اس قہر سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

دوسرا معاملہ وہ ہے جو انھوں نے غلاف کعبہ تیار کرا کے پاکستان کے ہر شہر میں اس کی زیارت اس طرح کرائی جیسے روضے والی انجمنیں اپنے اپنے روضوں کی کراتی رہتی ہیں۔ اور ایک شدید بدعت کی ترویج میں پوری سرگرمی دکھادی۔ یہ اس طرز عمل کی مثالیں ہیں جو کسی طرح میرے حلق سے نہیں اترتیں اور کوئی تاویل مجھ سے بن نہیں پڑی۔ یوں الگ سے ان کی جماعت بہت سے کار خیر پاکستان میں بھی کر رہی ہے اور ہندوستان میں بھی۔ بلکہ ہندوستان میں پاکستان سے کہیں بڑھ کر۔ لیکن جو ساکھ مولینا مودودی نے اپنے ہاتھوں اپنی بگاڑ رکھی ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ تحریروں میں وہی اکڑ برابر جاری ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولینا اپنے سے کسی غلطی یا لغزش کے صدور کا امکان ہی نہیں سمجھتے اور نہ آج تک کوئی ایسی نظیر یاد پڑتی ہے کہ مولینا نے بے شمار مسائل میں اپنی غلطی کسی ایک مسئلہ میں تسلیم کی ہو۔ زبان کی بے احتیاطیوں سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت یونس انبیائے کرام تک کے باب میں پرہیز نہ رہ سکا گویا اس کا احساس ہی باقی نہیں رہ گیا ہے کہ ان کے قلم کو کبھی بھی ٹھوکر لگ سکتی ہے۔"[1]

---

[1] معاصرین

غلاف کعبہ کی زیارت اور نمائش کا تذکرہ آہی گیا ہے تو اس کی دو ایک آنکھوں دیکھی جھلکیاں بھی دیکھتے چلئے:

"آج کل مغربی پاکستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر دو ٹرینیں غلاف کعبہ زیارت کرا رہی ہیں۔ ایک ٹرین لاہور سے پشاور کی طرف منزل بہ منزل رواں ہے دوسری خاص ٹرین اوکاڑہ منڈی کی جانب تشنگانِ دیدارِ غلاف کو سیراب کر رہی ہے۔ ہر اسٹیشن پر عوام کے ذوق و شوق اور عقیدت و محبت کا عجیب عالم ہے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر لاکھوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے جسے دیکھئے بس ایک نظر دیکھ لینے کی سعادت حاصل کرنے کو بے تاب ہیں۔ خواتین غلاف کعبہ پر پھول اور پیسے نچھاور کرتی ہیں بڑے بڑے افسر اور معززین عقیدت سے اس کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ غلاف کعبہ کو چھونے اور چومنے کی اجازت نہیں ہے اس لئے بعض مقامات پر لوگوں نے فرطِ عقیدت میں ٹرین ہی کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔"[1]

یہ خیال رہے کہ یہ کسی بریلوی، آغا خانی یا رضا خانی رپورٹر کا بیان نہیں ہے بلکہ خاص الخاص جماعت اسلامی ہی کے اخبار کا آنکھوں دیکھا بیان اور اس کے کارنامے پر مفخرت نامہ ہے۔ اب دوسری جھانکی بھی ملاحظہ فرمائیے:

"۱۲ مارچ کو سوا نو بجے غلاف کعبۃ اللہ زاد اللہ عظمۃً اور اس کے ناچیز خدام کو لے کر غلاف کعبہ اسپیشل ٹرین نعرہ ہائے تکبیر کے درمیان روانہ ہوئی۔ راہ میں سادھو کے مرید وغیرہ جن اسٹیشنوں پر گاڑی کو رکنا نہیں تھا۔ لیکن ہزاروں آنکھیں متحیر و متجسس گاڑی کو تک رہی تھیں۔ لائن کی مرمت کی وجہ سے چند منٹ کے لئے ان پیاسی نگاہوں کی تسکین کا انتظام اللہ نے کر دیا۔ کاموں کے ہر گاڑی کے دونوں طرف عورتوں اور زائرین کا جم غفیر منتظر تھا۔ اسی طرح گوجرانوالہ، وزیر آباد

---

[1] مولینا مودودی کے ساتھ میری رفاقت، بحوالہ "ایشیا" لاہور، ۸ مارچ ۱۹۶۳ء

سیالکوٹ میں علی الترتیب محتاط انداز سے تقریباً دس لاکھ افراد زیارت سے مشرف ہوئے۔ لوگ دور دراز فاصلوں دیہات سے سفر کر کے آئے۔ اور عقیدت بھرے دل، محبت سے پرنم آنکھیں اور رخسار ملتے ہوئے زائرین میں سے حرکت کر کے اپنا راستہ نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ عورتیں اپنے دوپٹے، تسبیحیں، مرد رومال، ٹوپیاں اور پگڑیاں غلاف مقدس سے مس کر کے چومنے کے لئے بے تاب تھے۔ پھولوں کے ہار، گلدستے اعطر کی شیشیاں غلاف کے لئے لاتے رہے"[1]

"اسی زمانے میں مولوی عتیق الرحمان سنبھلی (ایڈیٹر الفرقان لکھنؤ) نے "الفرقان" کے ایک اداریہ میں یہ سارے اقتباسات "ایشیا" اور "شہاب" لاہور غلاف کعبہ نمبر سے نقل کئے تھے اس اداریہ کا عنوان تھا

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"[2]

چلتے چلاتے انہی مولانا عتیق الرحمان کے ایک مضمون کے کچھ ٹکڑے اور بھی پڑھ لیجئے، جن کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اعتراضات سے گہرا تعلق ہے:

"قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

حال ہی میں جماعت اسلامی پاکستان ایک بڑے حادثہ سے دوچار ہوئی اور جیسا کہ ناظرین سمجھ رہے ہوں گے۔ وہ جماعت سے بعض اہم شخصیتوں کی علٰحدگی۔ جن میں سے چار تو وہ ہیں جو مختلف اوقات میں جماعت کی امارت کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں اور پانچویں ہیں جناب مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب (ایڈیٹر ہفت روزہ المنبر لائلپور) جو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اہم ارکان میں سے تھے"[3]

"انھوں نے (حکیم عبدالرحیم اشرف نے) ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام

---

[1] مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت، بحوالہ "ایشیا" لاہور ۸ مارچ ۱۹۶۳ء

[2] " " " " " "

[3] ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بابتہ شعبان و رمضان ۱۳۷۸ھ

تھا کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟" اس کا تعلق خاص طور پر حضرت مولانا مدنیؒ کے اعتراضات سے تھا۔ یہ کتاب ہمارے پاس تبصرہ کے لئے آئی تھی بولے

"چنانچہ اسی خیال سے میں نے کچھ لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر جلد ہی یہ رائے قائم کی کہ یہ جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں کھلے تبصرے میں لکھنے کی چیز نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد وجدان پر ہے دلائل پر نہیں، چنانچہ اس کو روک کر محض مختصر سے تعارف پر اکتفا کیا تھا۔ کیا پتہ تھا کہ اس بات کے کھلے طور پر اظہار کا موقع اتنی جلدی آجائے گا اور اس وجدانی نتیجہ کے حق میں جس کے اظہار میں خود اشرف صاحب سے تکلف ہوتا تھا، حقائق کی شہادت خود اشرف صاحب ہی کے قلم سے فراہم ہوگی۔"[1]

"اس وقت اشرف صاحب کی کتاب پر میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ جہاں تک حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی علیہ الرحمۃ کے اعتراضات اور جماعت اسلامی پر عائد کردہ الزامات کے دلائل کا تعلق ہے، ایمان داری کی بات یہ ہے کہ ان کے سامنے اپنی علمی بے بضاعتی کے شعور کے ماتحت، اظہار اختلاف کو تو اگرچہ ہم اپنے حدود سے بھی تجاوز سمجھتے ہیں مگر ان کے اعتراضات کی صحت اور دلائل کے وزن کو سمجھنے سے، اپنی فہم کی حد تک ہم بھی قاصر ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اپنی جگہ پر بہت تعجب ہوتا ہے۔"[2]

"مگر یہی تعجب اور یہی الجھن ہماری رہنمائی اس طرف کرتی ہے کہ اس شدت کی بنیادیں ان ظاہری بنیادوں سے الگ کہیں اور تو نہیں ہیں؟ یعنی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مولانا مودودی کے قلم سے چھڑکے ہوئے یہ بیج جو آج بڑی حد تک ہمیں بے ضرر بلکہ نفع بخش نظر آرہے ہیں۔ یہ حضرات مستقبل میں ان سے پیدا ہونے والے کڑوے کسیلے جھنگ وبار کی بو سونگھ رہے ہوں؟ اور ان کے قلوب مصفیٰ پر مستقبل میں جماعت اسلامی کے کسی غلط موڑ کا عکس پڑ رہا ہو؟"[3]

---

[1] [2] [3] ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، بابت شعبان و رمضان ۱۳۷۷ھ، اپریل ۱۹۵۸ء

مگر اُس وقت اس کے لکھنے میں تکلف ہوا کیوں کہ یہ ایک وجدانی بات اور محض ایک خیال تھا جس کی پشت پر نہ صرف دوسروں کو قائل کرنے والی کوئی دلیل نہیں تھی بلکہ خود اپنے ذہن کو بالکل مطمئن اور فارغ از بحث کر دینے کی پوری قوت بھی اس میں نہیں تھی لیکن اب خود حکیم عبدالرحیم صاحب ہی کے قلم نے کچھ ایسے حقائق کی نشاندہی کر دی ہے جن پر نظر کر کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیال محض عقیدت ہی کا کرشمہ نہیں بلکہ حقیقت کا پرتو تھا اور اس وقت اگرچہ مشکل تھا مگر آج تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید[1]

مولینا مودودی صاحب کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نیز علمائے دین کی تحریریں خاصی مبسوط، مدلل اور طویل ہیں مگر ہم نے صرف اختصار پر اکتفا کیا ہے اس لئے کہ مولینا مودودی صاحب کے افکار اور مسلک پر بحث و تحقیق اور ان پر تبصرہ ہمارے موضوع سے بالکل خارج ہے۔ اور ہمارا موضوع صرف حضرت کے شبہات اور اعتراضات کی حکایت ہے۔

مراد ما حکایت بود و گفتیم حوالہ با خدا کردیم و رفتیم

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہٗ

وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ

---

[1] ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، بابتہ شعبان و رمضان ۱۳۷۰ھ اپریل ۱۹۵۱ء

صدارت سالانہ اجلاس جمعیۃ علماء ہند بمقام کلکتہ

۱۱ر فروری ۱۹۵۵ء

آزادی ملے، ہندوستان کو تقسیم ہوئے اور پاکستان بنے سات آٹھ برس گزر چکے تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری کوشش تھی کہ مسلمانوں کے الجھے ہوئے اور مشکل مسائل کسی طرح حل ہو جائیں اور ان کے لئے کوئی مستقل لائحہ عمل مقرر ہو جائے۔ جمعیۃ علماء کے سالانہ اجلاسوں میں تمام ہندوستان کے نمائندہ حضرات کو مل بیٹھنے، گفتگو کرنے اور مشورہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس سال کلکتہ میں اجلاس کا مقصد یہ بھی تھا کہ عام ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات کے ساتھ وہاں کے خصوصی مسائل بھی زیر بحث آئیں اور اُن پر توجہ دی جا سکے۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں حضرت نے ابتدائی کلمات کے بعد فرمایا کہ

"آج مسائل اور مشکلات پر بہت کافی لکھا اور بولا جا سکتا ہے مگر ضروری ہے کہ معاملات کو مختصر طور پر بیان کر کے باتوں سے زیادہ عمل کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔

۱۹۴۷ء کا واقعہ ملک کے لئے ایک انقلاب تھا۔ اور اس اعتبار سے دنیا کا نرالا انقلاب تھا کہ جنگجو فوجیں اور سرکاری حلقے جو انقلاب کا عام نشانہ ہوتے ہیں وہ بالکل محفوظ اور مامون رہے اور جانی و مالی تباہیاں ان کروڑوں عوام کو برداشت کرنی پڑیں جن کا اگر اس انقلاب سے واسطہ تھا بھی تو بہت دور کا تھا۔ اس انقلاب میں ہندوپاک کے لاکھوں کروڑوں عوام کو جس طرح جانی، مالی اور عزت و آبرو کی تباہی کا شکار ہونا پڑا وہ تاریخ انسانیت کا دردناک حادثہ ہے۔ مسلمان اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ انقلاب نے ان کے جماعتی نظام پر ضرب کاری لگائی اور ہندوستان کے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا۔

"اس نازک صورت حال میں جمعیۃ علماء ہند کا نظام جفاکش اور سخت جان ثابت ہوا اور بحمد اللہ اس کا شیرازہ انتشار سے محفوظ رہا۔ فخر و مباہات کے لئے نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر یہ عرض کرنا صحیح ہے کہ اس پرآشوب دور میں جس نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے بے لوث خدمات انجام دیں وہ جمعیۃ علماء ہند کا نظام ہے۔ دورِ انقلاب کے ہنگامے نہایت ہولناک تھے۔ جمعیۃ علماء ہند نے ان کا مقابلہ کرنے میں جان کی بازی لگا دی اور اللہ کے فضل و کرم سے کامرانی اور کامیابی نے ان کی جدوجہد کا استقبال کیا۔ ہم پُرامید ہیں کہ آہستہ آہستہ یہ ہنگامی حالات ختم ہو جائیں گے اور بفضل خدا مسلمانانِ ہند اپنا صحیح موقف و مقام حاصل کر سکیں گے۔

یہ ہنگامی حالات کتنے ہی دہشت انگیز ہوں مگر اس دور کے ساتھ ہی ان کے اثرات و نتائج بھی ختم ہو کر رہیں گے۔ مگر ملت کی حفاظت، دینی علوم، مذہبی تعلیمات، اسلامی آثار و روایات کی بقا اور ان کا احیاء، آنے والی نسلوں کو اسلام پر ثابت قدم رکھنا ایک اہم ترین نصب العین ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس جدوجہد کو اپنے دستور اساسی میں جگہ دی ہے اور یہ مقصد کبھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

ایک سیکولر جمہوری ملک میں پرائمری تعلیم ہر بچے کے لئے ضروری ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی تعلیم مذہبی اور روحانی تعلیم کا بدل نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں یہ ضروری ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے دنیوی نظام تعلیم میں کسی خاص مذہب کے ایسے رجحانات موجود نہ ہوں جو دوسرے مذہب کے لئے ناقابل قبول ہوں۔

مسلمانوں کے لئے خاص طور پر انتہائی ضروری ہے کہ ان کے بچے ایک طرف دنیاوی تعلیم حاصل کرکے وطن کے بہترین شہری ثابت ہوں۔ دوسری طرف پکی اسلامی تعلیم پاکر توحید کے علمبردار، خدا کے سچے پرستار اور بندگان خدا کے

حقیقی خدمت گزار بنیں۔

دینی تعلیمی کنونشن

جمعیۃ علمائے ہند کا عظیم الشان اجتماع گذشتہ مہینہ بمبئی میں 'دینی تعلیمی کنونشن' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس میں ہر مکتب خیال کے مقتدر اور صاحب الرائے علماء وفضلاء شریک ہوئے اور ایک مرکزی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس اجتماع کا روشن اور امید افزا پہلو یہ ہے کہ تمام مکاتب خیال کے مسلمان بیدار ہوکر میدان عمل قدم بڑھانے کے لئے ہم آہنگ ہیں۔ یہ بڑی مبارک فال ہے۔ اب آپ کا فرض یہ ہے کہ چاہے آپ کا تعلق کسی بھی مکتب خیال سے ہو مگر ہر قسم کے اختلاف سے اجتناب کرتے ہوئے وحدت کلمہ کی اس اساس کو جو "دینی تعلیمی کنونشن بمبئی" نے قائم کی ہے زیادہ سے زیادہ مضبوط واستوار بنائیں۔

بنیادی مذہبی تعلیم اور ہمارے فرائض

یا ایھا الذین آمنوقوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ جیسے ارشادات نے ایک کلمہ گو کی نجات کے لئے جس طرح ان فرائض کی ادائیگی ضروری قرار دی ہے اسی طرح اہل وعیال کی تربیت جو ابدی نجات کا ذریعہ ہوسکے ذاتی فریضہ قرار دیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور ارشاد الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ میں ہر سرپرست کو اس کے لواحقین کا ذمہ دار قرار دیا ہے

اگر ہمارا ہر ایک گھر تعلیم گاہ اور تربیت گاہ نہ بن سکے تو کم ازکم ہر ایک مسجد تو تربیت گاہ ہونی ہی چاہئے۔ ائمہ مساجد کا تحمل آپ کریں اور بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ائمہ پوری کریں تو یہ سہل وآسان نظام مساجد تعمیر ملت کی مشکلات حل کرسکتا ہے۔

ہمیں اپنے پرائیویٹ اسلامی مکاتب و مدارس کا جال پورے ہندوستان میں پھیلانا چاہیے، مگر مفاد ملت کا تقاضا یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم میں وہ صلاحیت بچوں اور نوجوانوں میں پیدا کریں کہ ترقی کی دوڑ میں وہ اپنے ہموطنوں سے پیچھے نہ رہیں۔

دینیات کا مفہوم

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دینیات فقط عقائد و عبادات میں ہی منحصر نہیں ہیں۔ اسلام مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے ہر دور میں روشنی بخشتا ہے۔ وعدہ اور قول کے پابند پیشہ ور کو اللہ تعالیٰ کا محبوب گردانتا ہے۔ کاشتکار کے پیدا کئے ہوئے ہر دانہ پر انعام اور ثواب کی امید دلاتا ہے۔ بچوں کی صحیح پرورش اور بیوی سے تعلق کو ثواب و انعام کا مستحق قرار دیتا ہے۔ راستہ سے پتھر ہٹانے، بھوکے پیاسے کتے اور جانوروں کو کھلانے پلانے پر آخرت کی نجات عطا کرتا ہے۔ اس کے دینیات صرف عقائد اور عبادت تک محدود نہیں ہو سکتے بلکہ جس طرح صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، پاکی ناپاکی وغیرہ کے احکام دینیات کے ابواب ہیں ویسے ہی بلکہ کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ حقوق عباد، اعزہ و اقارب کے حقوق، اہل و عیال کے ساتھ حُسن معاشرت، اکل حلال، تجارتی اور کاروباری معاملات میں بہترین کردار، رہن سہن، میل ملاقات کے طریقے، آداب مجلس، میزبانی اور مہمانی وغیرہ وغیرہ کے آداب بھی اس کے دینیات میں داخل ہیں۔

ہمیں دینی تعلیم کا دامن ایسا ہی وسیع رکھنا چاہیے تاکہ مسلمان صرف رونق مسجد ہی نہ ہو بلکہ محفل دنیا میں بھی اس کا کردار صداقت و حق پرستی کا قبلہ نما بن سکے۔

تربیت معلمین

یہ ضروری ہے کہ حضرات معلمین کی تربیت کی جائے اور ان میں یہ جذبہ

پیدا کیا جائے کہ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغہ کا رنگ ان پر غالب ہو اور اسی رنگ میں تعلیم پانے والے بچوں کو رنگ دینا ان کی زندگی کا نصب العین ہو۔

مدارس عربیہ کے فضلاء میں یہ شوق و جذبہ ہوتا ہے اور اس کے لئے وہ بسا اوقات بڑی سے بڑی قربانی بھی پیش کر دیتے ہیں۔ ان بوریہ نشین ارباب قناعت اساتذہ کا احترام نہ صرف میرا بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔

آج سیکڑوں بلکہ ہزاروں دیہات کے مسلم گھرانے خطرناک کنارے پر کھڑے ہیں۔ ان کے دین و مذہب کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ ان گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنا اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

روشن مستقبل

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وما بانفسھم۔ اگر ہم اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کرلیں، اپنے اخلاق، خصائل، جذبات اور رجحانات کو اسلامی اصول پر ڈھال لیں تو اپنے خطرات تو درکنار ہم دوسروں کے خطرات بھی دور کرسکتے ہیں آج دنیا گندم نما جو فروش ہو رہی ہے۔ خدمت خلق، آزادی رائے، اخوت، مساوات اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کے پردے میں خود غرضی، مفاد پرستی، غرور و نخوت اور تحقیر و نفرت کی بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔

آج جمہوریت کو رائے شماری سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ جمہوریت کا مطلب اخوت، مساوات، خداشناسی، خدا رسی، عدل و انصاف، آزادی ضمیر اور دین و مذہب کی آزادی ہے۔

آپ دوسروں کا انتظار نہ کریں، آپ تو وہ ہیں کہ ان اصولوں کی مقدس امانت عمل کرنے اور دوسروں سے عمل کرانے کے لئے آپ کے سپرد ہوئی ہیں۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

کورس کی کتابیں

سرکاری اسکولوں کی درسی کتابوں کے متعلق بجا طور پر یہ عام شکایت ہے کہ ان میں اکثر کتابیں سیکولر نظام تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتیں، بلکہ ایک ہی فرقے کی تعلیمات اور مذہبی رجحانات کا ذخیرہ ہیں جو دوسرے فرقوں خصوصاً مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہیں۔ ایسی کتابوں کے خلاف جمعیۃ علماء ہند احتجاج کرتی رہی ہے اور مرکزی وصوبائی حکومتوں نے اس احتجاج کی بنیاد پر ان کو درس سے خارج بھی کیا ہے اور ضبط بھی کیا ہے۔ تاہم حکومت کا فرض ہے کہ درسی کتابوں کی تصنیف وتالیف سے متعلق ایسا نظام قائم کرے کہ کوئی ایسی کتاب درس میں داخل ہی نہ ہونے پائے۔

سرکاری ملازمتیں اور مسلمان

مسلمانوں کو ملازمتوں، تجارتوں اور دوسرے پیشوں کے سلسلے میں انتہائی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ ایک طرف تو ہم حکومت کو توجہ دلاتے ہیں کہ دستور میں اقلیتوں کے جو حقوق رکھے گئے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔ قومی حکومت کے سیکولر نظام کو بروئے کار لایا جائے۔

دوسری طرف مسلمانوں کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ صبر واستقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور ملازمتوں کی طرف سے نظریں ہٹا کر تجارت، صنعت وحرفت کے میدانوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ کسی قوم کی ترقی کا دارمدار ملازمتوں پر نہیں بلکہ تجارت اور صنعت وحرفت پر ہے۔

اُردو زبان

اردو زبان کسی فرقہ یا طبقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ لاکھوں کروڑوں ہندوؤں مسلمانوں سکھوں اور عیسائیوں کی زبان ہے جیسا کہ انجمن ترقی اُردو ہند کی دستخطی مہم سے ثابت ہوا

ہے۔ جمیعۃ علماء ہند انجمن کی اس جدوجہد کی حمایت کرتی رہی ہے اور آج بھی اس کی تائید کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ اردو کو جلد جلد ریجنل سرکاری زبان کا درجہ دے کر انصاف کا حق ادا کرے۔

اُجڑے ہوئے خاندان

آخر میں مغربی بنگال اور کلکتہ کے ان ہزاروں خاندانوں سے ہمدردی کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو ۱۹۵۰ء کے ہنگاموں میں خانہ ویران ہوئے۔ کسی حکومت کے لیے اس سے زیادہ شرم کی بات کیا ہے کہ باشندگان ملک کی بڑی تعداد برسوں بے خانماں رہے۔ یہ درست ہے کہ جو بے خانماں پاکستان سے مغربی بنگال آئے ان کو ضرور آباد کرنا چاہیے مگر اس طرح نہیں کہ خود مغربی بنگال کے مسلمان اپنے ہی وطن میں خانماں برباد ہو جائیں اور اپنے مکانات میں آباد نہ رہ سکیں[1]۔

---

[1] تلخیص خطبۂ صدارت اجلاس جمیعۃ علماء ہند کلکتہ ۱۹۵۵ء

حضرتؒ کا آخری حج

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے حجوں کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں حضرت نے اپنی زندگی کا آخری حج ادا کیا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا حضرت ضعیف اور کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ عمر بھی اب کم و بیش اسی برس کی ہو گئی۔ اس لئے جیسے ہی حضرت کے سفر حج کے بارے میں لوگوں کو علم ہوا، مریدین، منتسبین اور خدام کی ایک خاصی تعداد ہمرکاب ہونے کی خواہشمند ہوئی۔ چند حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں جو اس سفر میں ساتھ تھے حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسنؒ کی دو صاحبزادیاں اور ان کے صاحبزادے مولینا ہارون حسن مرحوم، قاری اصغر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خادم خاص اور خلیفہ حضرت رحمۃ اللہ، مولینا مولوی قاضی سجاد حسین صاحب مرحوم صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، حاجی بدر الدین صاحب انچولی، مولینا مولوی بایزید شہید پانڈور ساؤتھ افریقہ، خلیفہ حضرت رحمۃ اللہ وغیرہ ہمراہیوں کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ اس سفر میں بھی چھوٹے بڑے بھی اہل خانہ مع خدام اور حضرت کے بھتیجے مولینا وحید احمد مدنی مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر رشید الوحیدی کے شریک سفر تھے حکومت سعودی عرب کے فرماں روا اس وقت ملک سعود بن عبد العزیز تھے اُن کی طرف سے حضرتؒ کے حج کے جملہ انتظامات کی پیش کش ہوئی۔ اگرچہ یہ بات حضرت کی عادت اور مزاج کے خلاف بھی مگر باوجود چند اسے منظور فرمایا اور چھ سات موٹر کاریں حج کے نقل و حمل کے لیے حاضر ہو گئیں۔ جدہ میں قیام بھی شاہی اہتمام کے ماتحت ہوا[1] حضرت رحمۃ اللہ کے چھوٹے بھائی مولینا سید محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ نے بہت اصرار کیا اور ہر قسم کے انتظامات کی پیش کش کی کہ حضرت اب ہندوستان کے قیام کو ترک کر کے مدینہ طیبہ ہی میں رہ جائیں یا جا کر واپس آ جائیں مگر حضرتؒ نے منظور نہ کیا اور فرمایا کہ

---

[1] سیرت شیخ الاسلام، مولانا نجم الدین اصلاحی، ص ۲۰۰

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایسی حالت میں ہیں کہ اپنی آسائش اور آسانیوں کے لیے انھیں چھوڑ کر کہیں چلے جانا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ میں کچھ کرسکوں یا نہ کرسکوں مگر صرف وہاں موجودگی سے بہت سے احباب اور دوستوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ چھوٹے بھائی کے علاوہ مدینہ طیبہ کے بہت سے معززین نے حضرت سے مدینہ کے قیام پر اصرار کیا مگر حضرت نے عذر فرما دیا۔ حضرت کی تشریف آوری پر حجاز مقدس کے اخبارات 'المنهل' 'البلاد' 'مكة المكرمة' 'ام القرى' 'المدينة' وغیرہ نے حضرتؒ کے حالات اور ترحیبی مقالات شائع کیے[1]۔ اور جب تک مدینہ طیبہ اور حجاز میں قیام رہا شائقین علوم حدیث اور طالبان علوم نبوت خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے رہے۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جو حضرت سے پہلے بھی شرف تلمذ حاصل کرچکے تھے۔ اس قیام کے دوران بھی حسب اسفار سابق مواجہ شریف میں طویل اوقات کے لیے حاضری اور ساکت وصامت کھڑے رہنا حضرت کا معمول رہا۔ رخصت ہوتے ہوئے مکمل تین گھنٹہ ایک طرح کھڑے ہوکر اشکبار رہے۔

---

[1] مولینا نجم الدین اصلاحی۔ سیرت شیخ الاسلام، ص ۲۹۱

آخری خطبۂ صدارت

۲۷ سے ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء تک تین دن شہر سورت میں جمعیۃ علماء ہند کا انیسواں سالانہ اجلاس ہوا۔ صدارت حضرت رحمۃ اللہ کی ہوئی اور یہ اس عالم تکوین میں حضرتؒ کی آخری صدارت تھی۔ وقت اور عمر کا تقاضہ بھی تھا اور لوگوں کو خیال بھی تھا کہ دیکھئے آئندہ اس عالم تاب روشنی کے اُجالے میں کوئی اجتماع نصیب ہوتا ہے یا نہیں، چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہزاروں ہزار بلکہ لاکھوں مریدین، معتقدین، محبین، اور معترفین ٹوٹ پڑے تھے۔ سورت کا چھوٹا سا شہر تین چار دن کے لئے ہندوستان کے مرکزی شہر کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔ اس اجلاس میں حضرتؒ نے اپنے آخری خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ:

شان و شوکت، زیبائش و نمائش اور انجمن آرائی کسی زندہ قوم اور فعال جماعت کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ اسلام ہر قول کے لئے فعل کا مطالبہ کرتا ہے۔ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔

ہم اس ملک میں باعزت بن کر رہیں یا پسماندہ بن کر رہیں یہ ہمارے فکر و فراست بیدار مغزی اور کردار پر موقوف ہے۔ اگر ہم مسلسل کوشش اور جد وجہد میں کوتاہی کریں گے تو پسماندگی کو نہیں ٹال سکتے۔ اگر ترقی مقصود ہے تو صراطِ مستقیم پر رہنے کی جد وجہد تیز کر دیجئے۔ دنیاوی امور ہوں یا دینی مقاصد ہوں حق تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ لیس للانسان الا ما سعی انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ اللہ رب العالمین کا احسان اور بخشش ہے کہ اس نے انسان کو احسن تقویم کا پیکر عطا فرمایا۔ اور اس کی عظمت کا جھنڈا لہرا کر لقد کرمنا کی سند عطا کی۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ عمدہ کردار اور عمل صالح سے اس جھنڈے

کو سر اٹھا کر دیکھیں۔

علماء ہندوستان کا کردار

جمعیۃ علماء ہند کی پچاس سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس کی خدمات اور قربانیاں کبھی بھی مفاد پرستی اور خود غرضی کے غبار سے گرد آلود نہیں ہوئیں۔ اس نے ہمیشہ ہمہ گیر اور انسانیت نواز مقاصد کو پیش نظر رکھا۔ وہ سیکڑوں ہزاروں علماء جنھوں نے دار و رسن کی عاشقانہ رسم یا قید و بند کی سنت یوسفی زندہ رکھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی اقتدار و مناصب اور مادی دولت و ثروت کا مقصد نہیں آیا۔ انھوں نے صرف ہندوستان اور بیرون ہند کے کروڑوں مظلوموں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کے لئے قربانیاں دیں۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ یہ ساری مخلوق اللہ کی عیال اور اس کا کنبہ ہے، جس کو اللہ سے محبت ہوگی وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرے گا جو عشق مولا میں سرشار ہوگا وہ اپنی زندگی اس کی مخلوق کے لئے وقف کر دے گا

حدیث شریف کا ارشاد ہے:

الخلق عیال اللّٰہ ان احب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ (مشکوٰۃ)

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بھلائی کرے۔

دوسری حدیث یہ ہے:

الراحمون یرحمھم الرحمٰن۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (صحاح)

رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

اسلام کا مستقبل روشن ہے کیونکہ اسلام کسی خاص قوم کا کلچر نہیں ہے۔ وہ ہمہ گیر اصول کا نام ہے جس کو دنیا غیر شعوری طور پر اختیار کرتی جا رہی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر اسلام کا مستقبل روشن ہے تو اس کے ساتھ بے عمل مسلمانوں کا مستقبل بھی

روشن ہو۔ اگر ہم اپنا مستقبل بنانا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں۔ اگر آپ اللہ کے احکام پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں تو اللہ کو اپنے دین حق کے لئے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم	اگر تم منہ موڑو تو اللہ تمہارے سوا کوئی دوسری
ثم لا یکونوا امثالکم	قوم بدل دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

تاریخ سے سبق

بد قسمتی سے آج ہمارے اعمال و اخلاق شمع اسلام کے لئے حجاب بنے ہوئے ہیں اور پروانوں کو شمع کے قریب آنے سے روک رہے ہیں۔ آپ اپنے کردار کو نور ایمان کا آئینہ دار بنالیں پروانے خود بخود کھنچیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا اقتدار ختم ہو گیا اسی لئے ترقی اسلام بھی رک گئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ مورخین تحقیق کر کے بتائیں کہ کیا محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، شمس الدین التمش، شیر شاہ سوری، بابر و اکبر، جہانگیر و عالمگیر نے اپنے اقتدار و حکومت سے کبھی اسلام پھیلایا ہے۔ اگر ان کے قومی جھنڈے اشاعت اسلام کے علمبردار ہوتے تو ان کے پایۂ تخت اور ان کی فرماں روائی میں غیر مسلموں کی غیر معمولی اکثریت باقی نہ رہتی۔ جن علاقوں میں ان کج کلاہوں کی سر بفلک یادگاریں آج بھی شوکت و عظمت رفتہ کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں وہاں اور ان کے مضافات میں کبھی بھی مسلمانوں کو اکثریت نہیں نصیب ہوئی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان علاقوں مہرولی، آگرہ، قنوج، دہلی، سہسرام، فتحپور سیکری، متھرا وغیرہ میں آج بھی مسلمان دس پندرہ فی صد سے زیادہ نہیں ہیں۔

شیخ ابو علی سندھی متوفی ۲۰۰ھ، شیخ علی بن عثمان ہجویری ثم لاہوری متوفی ۴۶۵ھ، شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی، خواجہ غریب نواز معین الدین حسن السنجری اجمیری، الشیخ احمد بن یحییٰ منیری، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا

فریدالدین شکرگنج، سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی وہ نفوس قدسیہ ہیں جن کے روحانی فیوض و برکات، بے لوث ہمدردیٔ خلق خدا اور بے مثال کردار و اخلاق سے اسلام کی اشاعت ہوئی اور ان کے اخلاق عالیہ سے غیر مسلم آج تک متاثر ہیں۔

شہاب الدین غوری کی فاتحانہ تلوار کسی ایک متنفس کے دل کو بھی صداقت اسلام کے اعتراف کے لئے نہیں جھکا سکی ہوگی، مگر اسی کا معاصر ایک فقیر بے نوا خواجہ غریب نواز بغیر کسی شاہانہ طمطراق کے دہلی سے روانہ ہوکر اجمیر پہنچتا ہے تو اسلام کے ایک مخالف مسٹر آرنلڈ مصنف "پریچنگ آف اسلام" کی شہادت یہ ہے کہ راہ میں سات سو خاندان اس کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے ہیں۔

خود آپ کے صوبہ گجرات میں نویں صدی ہجری کے شروع سے دسویں صدی ہجری کے آخر تک دو سو برس اولوالعزم مسلمان بادشاہ حکومت کرتے رہے۔ ان کی نیک نفسی، ملک پروری، عدل و انصاف اور داد و دہش تاریخ کی ثابت شدہ حقیقت ہے، مگر پھر بھی یہ شاہان گجرات اسلام کے داعی اور مبلغ نہیں تھے بلکہ نہروالہ کے مشائخ کبار مثلاً شیخ حسام الدین عثمان بن داود ملتانی متوفی ۷۳۲ھ، شیخ یعقوب بن مولانا خواجگی متوفی ۷۹۰ھ، قاضی علم الدین شاطبی متوفی ۸۰۲ھ، احمد آباد کے قطب طریقت گنج بخش شیخ احمد کھٹو ۸۴۹ھ، سید برہان الدین عبداللہ نبیرہ مخدوم جہانیاں ۸۵۷ھ، شیخ کبیر الدین ناگوری ۸۸۵ھ، مولانا محمد ابن طاہر، شیخ محمد غوث گوالیری، بھروچ کے سید کمال الدین قزوینی ۱۰۸۱ھ، بڑودہ کے سید یحییٰ بن علی ترمذی ۸۰۴ھ، نوساری کے شیخ نصیر بن جمال ۱۰۵۱ھ، راندیر کے شیخ نورالدین محمد بن علی، سورت کے سید عمر بن عبداللہ حضرمی ۱۰۳۰ھ وغیرہ رحمہم اللہ و قدس اللہ اسرارہم جیسے علماء و مشائخ کے مقدس چراغ دانوں سے شمع اسلام کی کرنیں پھوٹیں۔

مختصر یہ کہ اسلام اقتدار، حکومت اور طاقت سے نہیں بلکہ اعلیٰ کردار اور

بہترین اخلاق سے پھیلتا ہے۔

سب سے پہلے اپنی اصلاح، اپنے قبیلہ اور خاندان کی اصلاح، بچوں اور نوجوانوں کی اخلاقی تربیت، احکام شریعت کی پابندی، دین کی اطاعت کیجئے پھر پڑوسیوں اور اہل شہر کے حقوق کی حفاظت کیجئے، خدمت خلق کے راستے اختیار کیجئے۔ حب وطن کے فرائض انجام دیجئے۔ یہی آپ کے انفرادی اور اجتماعی مستقبل کی ضمانتیں اور کامیابی کی راہیں ہیں۔

دینی تعلیمی تربیتی مرکز

پچھلے سال بمبئی میں دینی تعلیمی کنونشن منعقد کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دینی تعلیمی بورڈ قائم کیا گیا، جمعیۃ علماء ہند نے اسی ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ میں دہلی کی مشہور تاریخی مسجد 'زینت المساجد عرف گھٹا مسجد میں ایک دینی تعلیمی مرکز قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

ایسے امام تیار کئے جائیں جو شہروں، قصبات اور دیہات بالخصوص پسماندہ دیہات میں بچوں کو محدود وقت میں دینی تعلیم دے سکیں، اُن کی دینی تربیت کر سکیں اور بڑوں میں بھی دینی ماحول اور ذوق پیدا کر سکیں۔

پیشوایانِ مذاہب کا احترام

انسانیت، شرافت، سچائی اور خدا پرستی وغیرہ ایسے اوصاف و خصائل ہیں جن کی قدر بلالحاظ فرقہ و مذہب ہر انسان پسند کو کرنی چاہیئے۔ وہ برگزیدہ حضرات جنھوں نے ان اوصاف و صفات حمیدہ کی تعلیم دی ہے، یقیناً قابل قدر اور واجب الاحترام ہیں۔ ان کی تعظیم و تکریم لازم اور توہین پوری انسانیت اور انسانی شرافت پر ظلم عظیم ہے۔

مسلمان جو تمام برگزیدہ انسانوں کے احترام کو جزو ایمان سمجھتے ہیں جب

اس ذات اقدس کے بارے میں جس نے تمام پاکبازوں کی حفاظت ناموس کا درس دیا ہے گستاخانہ حرکتیں دیکھتے ہیں تو ان کا احساس شدید ہوجاتا ہے اور روح فرسا اضطراب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ حالیہ واقعہ میں جس طرح فرقہ پرستوں نے چیرہ دستیوں سے کام لیا ہے اور یوپی، مدھیہ پردیش میں شدید سے شدید تر جانی مالی نقصان پہنچایا ہے یہ ایک ناقابل برداشت وحشت و بربریت ہے۔

اس موقع پر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ملک کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کو مبارک باد پیش کروں کہ انھوں نے اس نفرت انگیز ماحول کے خلاف فوری قدم اٹھایا اور دہلی کی مشہور تاریخی تقریر کے ذریعے فرقہ پرستوں کے مذموم عزائم کا خاتمہ کیا۔

ہمارا فرض

واضعان قانون کا فرض ہے کہ وہ ایسا قانون پاس کریں جس سے فرقہ پرستی اور تعصب کا خاتمہ ہو۔ مگر صرف قانون ہی کافی نہیں ہے۔ قانون سزا تو دے سکتا ہے مگر جرم کے رجحانات نہیں ختم کر سکتا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم قوم کی اصلاح اور تربیت کریں۔ اس کام کے لئے مختلف زبانوں میں ایسا لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے جو نوع انسان کی فلاح و بہبود کے پیغامات ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دے اور فلاح وارشاد کا مقدس فریضہ انجام دے۔

جو دعوت عمومی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اس کا مخاطب پوری نوع انسانی کو گردانا گیا ہے۔

ایک قابل توجہ پہلو

تاریخ جغرافیہ اور شہریت پر مشتمل مضامین جو پرائمری تعلیم کے لازمی اجزاء ہیں ان کو صحیح سیکولرازم کے جذبے کے ساتھ مرتب کیا جانا چاہیے، اگرچہ ایک

خاص فرقہ کے پیشواؤں، یادگاروں اور معاشرت کا تذکرہ ان کتابوں میں آتا ہے، مگر مسلمان، پارسی اور عیسائیوں کے پیشواؤں اور متبرک یادگاروں کا ذکر ان میں نہیں آتا ہے۔ یہ یک طرفہ رجحان فرقہ وارانہ شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے حکومت اور مختلف ادارہ ہائے نشرواشاعت و تعلیمی انجمنوں کو پوری توجہ دینی ضروری ہے۔

اقتصادی مسائل

پورے ملک میں لاکھوں گریجویٹ اور اونچے تعلیم یافتہ روزگار کے لئے پریشاں ہیں۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ملازمتوں میں کنبہ پروری اور قبیلہ پرری ہر محکمہ میں کارفرما ہے۔ اس خطرناک پالیسی کا مسلمان خاص طور پر شکار ہیں۔ تقرریوں کی جو رپورٹیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کی محرومی کا کامل ثبوت ہیں۔

میں احتجاجی ذہنیت کا حامی نہیں ہوں نہ موجودہ حالات میں احتجاج کو کامیاب سمجھتا ہوں۔ البتہ عملی تدبیریں اختیار کرنے میں کامیابی لازمی ہے۔

مسلمان آج بھی صنعت وحرفت اور گھریلو صنعتوں میں غیر معمولی اکثریت رکھتا ہے، اگر وہ کاروباری دیانت داری، بلند حوصلگی اور محنت کے ساتھ ترقیاتی اسکیموں میں حصہ لے تو نہ صرف یہ کہ اپنے زخموں پر مرہم رکھے گا بلکہ ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی قابل فخر حصہ لے سکے گا۔

الکشنوں میں مسلمانوں کا حصہ

آزاد جمہوریہ ہندوستان میں انتخاب تشکیل حکومت کے متعلق آخری فیصلہ کا نام ہے۔ اس فیصلے کے صادر کرنے میں مسلم اقلیت کو ایک خاص مقام اور خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور

حُبِ وطن، ملکی احساس اور بیدار مغزی کا پورا ثبوت دیں۔

اس معاملے میں حکومت اور ملک کی قوم پرور جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ ہر اقلیت کے مقام اور حیثیت کو تسلیم کرنے کا عملی ثبوت دیں۔

بزرگانِ ملت اور برادرانِ محترم

میں آپ کا کافی وقت لے چکا ہوں اور کوشش کے باوجود دامن کلام کسی قدر طویل ہوگیا ہے۔ اب ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے ہماری نیتوں میں اخلاص عطا فرمائے اور ہمیں ملک وملت کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے اور ہم ناکاروں کو اپنے ان باکار بندوں میں شمار فرمائے جن کے متعلق اس کا پختہ وعدہ ہے۔

ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز [1]

---

[1] تلخیص خطبۂ صدارت اجلاس سالانہ جمعیۃ علماء ہند، ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء، شہر سورت۔

ضعف و امراض، پیری و اعراض

عام زندگی اور بڑھاپے میں لوگوں کو جو تکلیفیں اور شکایتیں زکام، نزلہ، بخار، سردرد، کمر کا درد، پیٹ اور معدہ کی گرانی، خوگر، بلڈ پریشر وغیرہ وغیرہ امراض پیش آتے رہتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر ان امراض سے محفوظ و مامون رہے۔ محنت و مشقت، مسلسل کام اور بے آرامی، نیند کی کمی اور سکون و راحت کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ جو شدید زندگی حضرتؒ نے بیاسی برس تک گزاری وہ ایک عام انسان بیاسی دن گزارلے تو زندگی بھر کے لئے دائم المریض ہوجائے۔ مگر حضرت کے مزاج میں ایک دائمی سکون اور طمانیت کی کیفیت شامل تھی جو کسی بھی خارجی شدت و مشقت سے متاثر نہیں ہوتی تھی اور اسی سکون کی علامت ہونٹوں پر ایک دائمی مسکراہٹ کی شکل میں نمایاں رہتی تھی۔ قابل اطمینان صحت میں کچھ تو اس مزاجی کیفیت کا اثر رہا ہوگا اور کچھ یہ کہ حضرتؒ نے زندگی کے ہر مرحلہ پر اعتدال، نظم، توکل علی اللہ، راضی برضائے باری تعالیٰ کے اصولوں کی سختی کے ساتھ پابندی کی۔ تمام عمر ورزش کا اہتمام کیا۔ نہایت سادہ، معمولی اور قلیل غذا کا معمول رکھا۔ سادہ ترین زندگی گزاری، اور دل کو کسی قسم کی تمنا اور آرزوؤں سے کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔

کتنی سخت محنت کرتے تھے؟ کیسی سادہ غذا استعمال کرتے تھے؟ کیا کیا ورزشیں کرتے تھے؟ اور ان کا کیا اہتمام فرماتے تھے؟ دل جو خواہشات اور شہوات کی آماجگاہ ہے کیسا تمناؤں اور آرزوؤں سے پاک تھا؟ انھیں مولیٰ پر کس درجہ بھروسہ تھا؟ یہ بڑی طویل، دلچسپ اور سبق آموز داستانیں ہیں جن کے بیان کا اصل موقع حضرت کی سیرت، خصائل و شمائل کے باب میں، اگر زندگی اور حالات نے موقع دیا تو دوسری ہی جلد میں آسکے گا۔ اس وقت تو صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ساری صحت، طاقت اور عافیت کے باوجود بھی اب پچھتر اسی برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے حضرتؒ پر بھی بشری

تقاضوں، ضعف اور پیری کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ بصیرت کے ساتھ ساتھ بصارت کی نعمت تو آخر عمر تک مضبوط اور تیز رہی البتہ ساعت میں کسی قدر ثقل پیدا ہو گیا۔ مگر اتنا نہیں کہ سننے کے لئے کسی آلہ یا پائپ کی ضرورت پیش آتی۔ ہاں گھٹنوں میں کمزوری محسوس ہونے لگی۔ لاکھ عالی ہمتی، جفاکشی اور قوت ارادی سہی مگر یہ گھٹنے تھے تو گوشت پوشت ہی سے بنے ہوئے۔ اسّی برس تک مسلسل تکان، ریاضت، مشقت، محنت اور انتھک جدوجہد کا بوجھ نہ سنبھال پائے اور آخر کار جواب دے ہی گئے۔ مگر اس کے باوجود جسم و جان پر چاہے کچھ گزری ہو حضرت کے روزمرّہ کے مشاغل، درس حدیث، عبادت و ریاضت، نماز باجماعت، اسفار و اجتماعات، وعظ و خطبات وغیرہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ تاہم خدام و مخصوصین محسوس کرنے لگے تھے کہ دوسرے معمولات تو کسی نہ کسی طرح پورے ہو رہے تھے مگر روز روز کے طول و طویل اسفار اب ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے۔ شروع شروع میں کچھ مخلصین و خدام نے دبی زبان میں عرض کرنا شروع کیا کہ اب اسفار بند ہو جانے چاہئیں مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ آخر میں مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں اور بعض دوسرے مخصوصین محض اسی مقصد سے خدمت میں حاضر ہوئے اور اصرار کیا کہ اب سفر بند ہونے کا اعلان ہونا چاہیے۔ کافی بحث و تمحیص اور اصرار و انکار کے بعد بھی جب حضرت نے اسفار ترک کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو ان حضرات نے عرض کیا کہ کم از کم یہ تو ہو ہی جانا چاہیے کہ گاؤں دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبات جہاں آرام دہ اور تیز رفتار سواریوں کا انتظام نہیں ہے اور جہاں خاطر خواہ قیام و راحت رسانی بھی مشکل ہوتی ہے وہاں نہ جایا جائے۔ اس پر حضرتؒ نے سنجیدگی اور تاثر کے ساتھ فرمایا کہ اب میرا آخری وقت ہے۔ میرے پاس کوئی توشۂ آخرت نہیں ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کس منہ سے اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہوں گا۔ گاؤں دیہات کے یہ سیدھے سادے مومن مسلمان حضرات آتے ہیں اور مجھے لے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ میں اس امید پر ان کے ساتھ جاتا ہوں کہ شاید حق تعالیٰ میری یہ خدمت قبول فرمالے اور ان میں سے کسی کی دعا کے ذریعے میری مغفرت کا سامان ہو جائے۔

مختصر یہ کہ اسفار ساری کمزوریوں اور عوارض کے باوجود زندگی کے آخری وقت تک جاری رہے۔ ضعف اور عوارض کا علاج بھی ہوتا رہا۔ پہلے تو حسب معمول حکیمی علاج ہوتا رہا۔ یہ تو حضرت کی عادت اور معمول نہ تھا کہ معجونیں، خمیرے، شربت، عرقیات وغیرہ روزمرہ کے معمول میں داخل رہتے۔ کوئی شکایت ہوتی تھی تو بقدر ضرورت دوا استعمال فرما لیتے تھے۔ اس موقع پر بھی اطباء کی تجویز کردہ دوائیں اور غذائیں استعمال کی گئیں۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا تو ڈاکٹری علاج کیا گیا۔ گولیوں، مکسچروں اور دوسری تدابیر کے ساتھ ایک بجلی کا علاج بھی ہوا۔ موٹا سا کیبل پلیٹ کر گھٹنوں پر رکھ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے بجلی کے اثرات پہنچتے ہیں مگر کسی تدبیر سے کوئی افاقہ نہیں ہوتا تھا۔ کام، مشاغل اور مشغولیتیں حسب معمول جاری رہیں مگر آہستہ آہستہ درس حدیث کے لئے اوپر کے دارالحدیث تک سیڑھیاں چڑھ اتر کر آنا جانا متعذر ہو گیا۔ ناچار بیس برس پرانے دارالحدیث کو الوداع کہا اور درس کا انتظام نیچے کے دارالحدیث میں کیا گیا۔ یہ تبدیلیاں اور منتقلیاں تو عام طور پر وقتاً فوقتاً پیش آتی ہی رہتی ہیں مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ پہلا موقع تھا کہ روزمرہ میں کوئی تبدیلی پیش آ رہی تھی۔ طلباء، اساتذہ، مریدین و منتسبین، عوام و خواص اس دارالحدیث فوقانی کو جس میں دن رات قال اللہ و قال الرسولؐ کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں اور جو چوبیس گھنٹے خیر و برکات کی روشنیوں سے جگمگاتا رہتا تھا سنسان اور تاریک دیکھتے تھے تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ مگر ابھی تک ابتدا تھی۔ ابھی ان آنکھوں کو اس سے بھی زیادہ دل سوز و دل خراش منظر دیکھنے تھے۔ جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے لئے گھر سے مدرسہ اور وہاں سے تحتانی دارالحدیث تک چل کر پہنچنا مشکل ہو گیا اور مجبور ہو کر سواری کا انتظام کرنا پڑا۔ کہاں تو وہ بابرکت مناظر تھے کہ جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ گھر سے برآمد ہوئے تو بیسیوں پچاسوں طلباء و علماء مشایعت کرتے ہوئے روانہ ہوتے راستے میں مختلف موضوعات پر سوال کرتے۔ حضرتؒ بآواز بلند جواب دیتے کہ سب سے پیچھے آنے والے حضرات مستفید ہو سکیں۔ مدرسے کے احاطے میں داخل ہوتے تو لوگ

دوڑ دوڑ کر آتے، سلام کر کے تھوڑی دور مشایعت کا فخر حاصل کرتے اور درسگاہ تک پہنچاتے۔ مدرسے میں دور دور تک اطلاع ہو جاتی کہ حضرت سبق میں اور دارالحدیث میں رونق افروز ہو گئے ہیں اور کہاں اب گھر سے سواری پر چل کر دو منٹ میں درسگاہ پہنچ جاتے تھے، دیکھنے والوں کا بھی بڑا کلیجہ تھا کہ دیکھتے رہے اور برداشت کرتے رہے مگر ابھی تو اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا بدا تھا۔

رخصتی نصیحتیں اور آخری وصیتیں

۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے روح فرسا حادثات وواقعات کے مقابلے میں ضعف و پیری کے باوجود بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ آخری دم تک نبرد آزمار ہے۔ وصال کے دن ہر ہر لمحہ اسی فکر اور جدوجہد میں بسر ہوا کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے مسائل کا کوئی مستقل حل نکل سکے۔ فسادات، حق تلفیاں، مظالم اور مسلم دشمنیاں بھی جاری رہیں مگر حضرتؒ کی مسلسل قربانیاں بھی بارآور ہوتی رہیں۔ ہندوستان کے تمام ہی رہنے والے خصوصاً مسلمان اس حقیقت کو کبھی نہ بھلاسکیں گے اور ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھے گی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تعمیر پورے طور پر اگر نہیں تو بہت بڑی حد تک حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد اور شب وروز کی جانکاہیوں کی مرہون منت ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مسلمانوں کو حضرت کی آخری وصیتیں ہیں جو وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً جمع کر کے فرماتے رہے۔ بلاشبہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک دائمی لائحہ عمل ہے۔ ان پر عمل کرنا، انہی کے مطابق زندگی کو ڈھالنا اور انہی خطوط پر قومی زندگی کی تعمیر کرنا تو بعد کی باتیں ہیں۔ سردست ایک نظر تو ان وصیتوں پر ڈالتے ہی چلئے:

(۱) پابندیٔ شریعت

اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن مضبوطی سے تھام لیجئے۔ احکام شریعت کی پابندی کیجئے اور حقوق اللہ نیز حقوق العباد کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کیجئے،

"ہم اگر اپنا مستقبل روشن بنانا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ اسلام سے زیادہ

سے زیادہ وابستہ ہوں اور داعیٔ اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت کو زیادہ سے زیادہ مضبوطی سے تھام لیں۔

وانتم الاعلون إن کنتم مومنین — اگر صاحبِ ایمان ہوگے تو تم ہی سربلند رہوگے۔

"اپنی اصلاح، اپنے قبیلے عشیرے کی اصلاح، بچوں اور نوجوانوں کی اخلاقی تربیت، احکامِ شریعت کی پابندی، زندگی کے ہر شعبے میں دین کی اطاعت، پڑوسیوں اور اہلِ شہر کے حقوق کی ادائیگی، خدمتِ خلق کے صحیح جذبات، حبِ وطن کے فرائض کی انجام دہی، انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے آپ کے روشن مستقبل کی ضمانت، تعمیرِ ملت کی بنیاد اور منزل کی کامیابی کی شاہراہیں ہیں۔"[1]

(۲) توکل علی اللہ

اللہ پر مکمل بھروسہ رکھو اور اسی کو مالکِ خیر و شر سمجھو۔

"ہمارا مذہبی، ملی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ ہم خدائے واحد ہی کو تمام مشکلات کا حل کرنے والا اور کارسازِ حقیقی سمجھ کر پورے یقین اور اذعان کے ساتھ اس پر اعتبار کریں اور اسی پر بھروسہ رکھیں اور اس نصب العین کے لئے پورے استقلال اور استقامت کے ساتھ سرگرم جد و جہد ہوجائیں۔ اگر ہم نے یہ راہِ عمل اختیار کی تو نہ صرف دنیاوی کامیابیاں ہمارے قدم چومیں گی بلکہ عالمِ بالا کی روحانی شہادتیں ہمارے دماغی انتشار کو دور کرکے دنیا میں بھی ہمیں اطمینان و سکون کی زندگی کا موقع دیں گی اور آخرت میں بھی ہماری حیات پُرسکون اور پُرسرور ہوگی۔ (انشاء اللہ)

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون"[2]

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء شہر سورت ۱۹۵۶ء
[2] " " " حیدرآباد ۱۹۵۱ء

(۳) دینی تعلیم

کسی حالت میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم اور اسلامی تربیت سے غافل نہ ہو ہر بستی میں، ہر محلہ میں، ہر مسجد میں اور ہر گھر میں دینی تعلیم و تربیت کے ادارے قائم رکھو۔

"ضروری ہے کہ مسلمان قومی و دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنا فرض پوری بیداری اور ذمہ داری کے ساتھ محسوس کریں اور صرف اپنے اعتماد پر ایسا ہمہ گیر نظام قائم کریں جو اسلامی تعلیمات کی بقاء و حفاظت کا ذمہ دار ہو سکے اور جس وقت بچہ کے سادہ دل و دماغ پر سرکاری اسکولوں میں دنیاوی تعلیمات کے نقش کندہ کئے جائیں اسی کے ساتھ اس نظام کے ماتحت مکاتب و مدارس میں اسلامی عقائد و اخلاق کے رنگ بھی بھرے جاتے رہیں[1]"

"اگر ہمارا ہر ایک گھر تعلیم گاہ و تربیت گاہ نہ بن سکے تو کم از کم ہر مسجد تو تربیت گاہ ہونی چاہیئے۔"

"آخری شکل یہ ہے کہ ہم اپنے پرائیویٹ اسلامی مدارس و مکاتب کا جال پورے ہندوستان میں پھیلادیں[2]"

(۴) اولوالعزمی اور عالی ہمتی

عزم و ہمت اور حوصلہ بلند رکھو۔ دل شکستگی کو پاس نہ آنے دو۔ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرو۔ اگرچہ تم آج اقلیت بن کر رہ گئے ہو مگر دنیا میں اقلیتوں کا مستقبل تاریک نہیں ہوا کرتا۔ ایمان اور بزدلی اور پست ہمتی ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتی۔

"یاس اور قنوطیت مسلمان کے لئے حرام ہے۔ زندگی سعی پیہم کا نام ہے۔ اگر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو میدان عمل میں اتر یئے اور جد و جہد میں پوری ہمت

[1] خطبۂ صدارت سورت ۱۹۵۱ء [2] خطبۂ صدارت کلکتہ ۱۹۵۵ء

صرف کر دیجئے۔ پست ہمتی اور بزدلی بدترین امراض ہیں۔ مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل اور پست ہمت کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایمان باللہ اور بزدلی ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔ مشکلات سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کرنا زندہ قوموں کے نزدیک سب سے بڑا جرم اور ناموس ملت کے لئے سب سے بڑا ننگ و عار ہے۔

قل لن ینفعکم الفرار من الموت او القتل اذا لا تمتعون الا قلیلا"[1]

"ہم اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے جس قدر اس پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہوں گے اسی قدر ہم وطن عزیز کے بہترین خادم، اس کے بہادر محافظ اور اہم ترین جزو ثابت ہوں گے۔ بے شک پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان مجموعی طور پر اور صوبائی لحاظ سے بھی غیر موثر اقلیت بن گئے ہیں لیکن کیا اقلیت کا مستقبل تاریک ہوتا ہے؟"[2]

(۵) اخوت و برادری

تعصب اور فرقہ واریت سے بچو۔ یہ ایسا زہر ہے کہ اگر قلب و جسم میں سرایت کر گیا تو پورے ملک کو تباہ کر دے گا۔ ہر فرد و بشر کے ساتھ ہمدردی، خوش اخلاقی اور بھائی چارگی کا برتاؤ کرو۔

"مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تمام تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر اعلیٰ اخلاق کا نمونہ، عدل و انصاف کا مجسمہ اور تہذیب و شرافت کا پیکر بن کر دنیا کے سامنے پیش ہو۔"

"مجھے تسلیم ہے کہ فرقہ وارانہ ذہنیت کو ختم کرنے کا فرض پوری اہمیت کے ساتھ اکثریت پر عائد ہوتا ہے" اور "گلشن وطن کو فرقہ واریت کے کانٹوں سے صاف کرنا" "تمام اہل وطن کا مشترکہ فرض ہے مگر یہ مسلمانوں کا مخصوص فرض ہو جاتا ہے کیونکہ محض باشندۂ ملک کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے بھی

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء حیدر آباد ۱۹۵۱ء [2] خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء بمقام بمبئی ۱۹۴۸ء

کہ وہ اس ذات اقدس کا دامن سنبھالے ہوئے ہیں جس کو مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے تمام جہانوں کے واسطے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔"

"جب فرقہ واریت ایک مہلک مرض ہے تو اقلیت کا بھی فرض ہے کہ پوری احتیاط کے ساتھ اپنی نبض ٹٹولے اور کوئی بھی درجہ اس مرض کا وجود ہو تو جلد از جلد اس سے شفا پانے کی کوشش کرے۔ مرض کے علاج کے لئے دوسرے مریض کے اچھے ہونے کا انتظار کرنا قطعاً غلط ہے۔"[1]

(۶) عملی و علمی ترقی

اعلیٰ قابلیت اور صلاحیت پیدا کرو۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لو اور ہندوستان کے لئے اپنی ضرورت اور افادیت ثابت کرو۔

"اگر مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان کا مستقبل روشن اور شاندار ہو تو ان کا فرض ہے کہ اپنے عمل اور کردار سے اپنی اہمیت اور افادیت کو ثابت کریں، وہ ملک کے لئے جس قدر مفید ہوں گے اسی قدر ان کی عزت و وقعت ہوگی۔ جمہوری نظام میں مذہب، خاندان اور نسل ترقی کی مدار نہیں ہوتی خدمت اور قابلیت معیار ترقی ہوا کرتی ہے۔ مسلمان ملک و ملت کی خدمت کا صحیح جذبہ پیدا کریں۔ بہترین خدمت کی بہترین قابلیت پیدا کریں۔ کامیابی اور کامرانی لامحالہ ان کے قدم چومے گی۔"[2]

(۷) ملازمت سے صرف نظر

ملازمتوں کی تلاش چھوڑ دیجئے۔ تجارت، صنعت و حرفت میں ترقی کیجئے۔ ترقی کا دارومدار ملازمتوں پر نہیں، تجارت و صنعت و حرفت کی ترقی میں ہے۔

"مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صبر و استقلال کے ساتھ اپنے وطن عزیز اور

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء شہر سورت ۱۹۵۶ء
[2] خطبۂ صدارت اجلاس بمبئی ۱۹۴۸ء

ادائے فرض میں مصروف رہیں۔ ملازمتوں کی تلاش چھوڑ کر صنعت و حرفت کے میدان میں گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں کیونکہ کسی قوم کی ترقی کا دار و مدار ملازمتوں پر نہیں ہے بلکہ صنعت و حرفت اور عملی کردار قوموں کو بام عروج پر پہنچاتا ہے... یہی تابناک مستقبل کے لئے بہترین پروگرام ہے جو فرقہ پرستی کی مسموم گ... کو چھانٹ کر مستقبل کے تابندہ آفتاب کو طلوع کرے گا۔"[1]

(۸) پاکستان سے اچھے تعلقات

پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے۔ اس سے ہر قسم کے تعلقات مضبوط کیجئے اسی میں دونوں ملکوں کی اور پورے ایشیا کی بھلائی ہے۔ اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو آپس میں طے کریں۔

"ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ پاکستان کی اسکیم ایک حقیقت بن چکی ہے جس طرح انڈین یونین پوری دنیا کی سیاست میں ایک مرکز ہے اسی طرح پاکستان بھی انٹرنیشنل سیاست کا ایک یونٹ قرار دیا جا چکا ہے۔ اب پورے ملک اور ایشیا کی مصلحتوں کا یہی تقاضہ ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر پورا اعتماد ہو۔ آپس کے تصفیوں کو خود طے کریں۔ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ ان کے تجارتی اور اقتصادی تعلقات زیادہ سے زیادہ بہتر اور مضبوط ہوں آمد و رفت کے راستے کھلے ہوئے ہوں اور جو تلخیاں برداشت کی جا چکی ہیں ان کی جگہ محبت اور دوستی کے ترانے ہر جگہ گائے جائیں۔ وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز۔"[2]

(۹) ملک کی خیر خواہی

ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ دونوں ملکوں میں صلح اور بھائی چارہ قائم رہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے دونوں ملکوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو ہمیں اپنے ملک کے مسلمانوں کا مفاد پیش نظر رکھنا چاہیے۔

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس سورت ۱۹۵۶ء
[2] خطبہ صدارت حیدرآباد ۱۹۵۱ء

"ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہوں اور زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوں لیکن اگر کسی موقع پر ان دونوں کے نکتہ ہائے نظر میں اختلاف ہو تو ہمیں اسی اصول کی بنا پر فیصلہ کرنا ہوگا۔" "ہم کو ہر موقع پر وہ صورت اختیار کرنی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو" یہی ہمارا سیاسی، اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔"[1]

(۱۰) اُردو زبان کی ترقی

اُردو زبان کی حفاظت اپنے بل بوتے پر کیجئے۔ شکایتوں اور فریادوں کے ذریعہ زبانیں محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ نشر و اشاعت کیجئے اور نئی نسل کو اُردو پڑھایئے۔

"صرف فریاد، تنقید اور واویلا سے اُردو زبان محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ واقعی اردو کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایثار کرنا پڑے گا۔ صرف گفتگو سے زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ زبان کی اصل زندگی اس کا لٹریچر ہے۔ اخبارات، رسائل، دار المطالعے، لائبریریاں اور تصنیف و تالیف کے ادارے اُردو زبان کا اصل سرمایہ ہیں ان کو ترقی دینا اور ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم اُردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس فرض کی انجام دہی میں پورے ایثار سے کام لینا ہوگا۔"[2]

(۱۱) ہندی زبان کی ترقی

ہندی زبان سیکھئے۔ وہ ملک کی قومی زبان ہے۔ مسلمان سو برس تک پورے شوق کے ساتھ غیر ملکی زبان انگریزی سیکھتے رہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ملکی زبان ہندی نہ سیکھیں۔

"ہمارے ملک کی پارلیمنٹ نے ہندی زبان کو ملک کی سرکاری زبان قرار دیا ہے بہت سے اداروں کی کوشش ہے کہ ہندی کو مختلف علوم و فنون کا حامل بنا دیا جائے اور

[1] خطبۂ صدارت بمقام بمبئی ۱۹۴۳ء [2] خطبۂ صدارت حیدر آباد ۱۹۵۰ء

ہندی زبان کو ایسی ترقی یافتہ زبان بنا دیا جائے کہ پندرہ سال کے اندر وہ انگریزی کی جگہ لے سکے۔ مسلمان جو کم و بیش سو برس تک غیر ملکی زبان کو فروغ دینے میں سرگرم عمل رہے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی سے نفرت کریں اور اس کو علمی زبان بنانے کی کوششوں میں حصہ نہ لیں۔"[1]

(۱۲) اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ رکھو

احتجاج اور فریاد کا طریقہ چھوڑ دیجئے، عملی اقدامات اور جدوجہد کا راستہ اپنائیے۔

"میں احتجاجی ذہنیت کا حامی نہیں ہوں۔ نہ موجودہ حالات میں احتجاج کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہوں، ہم سب کا فرض ہے عملی تدبیریں اختیار کریں۔ ہمیں کسی بہتر صورت سے اس فرض کو انجام دینا چاہیے۔ خصوصاً وہ راستے ضرور اختیار کرنے چاہئیں جن پر چل کر ہم ملک کی ترقیاتی اسکیموں میں حصہ لے سکیں۔"

"گھریلو صنعتوں میں مسلمانوں کو غیر معمولی اکثریت حاصل ہے اور یہ میدان اب تک ان کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان کاروباری دیانت داری اور بلند حوصلگی کے ساتھ ان ترقیاتی تجویزوں میں حصہ لیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے زخموں پر مرہم رکھ سکیں گے بلکہ ملک کی تعمیر و ترقی میں قابل فخر حصہ لے سکیں گے۔"[2]

(۱۳) بزدلی سے بچو، مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرو

بزدلی اور خوف کو اپنے دل سے نکال دو۔ آج تم دس کروڑ کی تعداد میں اس ملک کے باشندے ہو۔ بہادری کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو۔ کبھی فساد کی ابتدا نہ کرو، لیکن اگر کوئی تم پر حملہ کرے اور مجبور ہی ہو جاؤ تو ڈٹ کر مقابلہ کرو، قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور عزت کی موت مر جاؤ۔

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء حیدرآباد ۱۹۵۱ء

[2] 〃 〃 〃 سورت ۱۹۵۶ء

"آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو[1]۔ یو۔پی میں تمہاری تعداد پچاسی لاکھ ہے[2] پھر بھی تمہارے خوف کا یہ عالم ہے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو۔ آخر کہاں جا رہے ہو؟ کیا تم نے کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی ہے جہاں موت تم کو پا نہیں سکتی۔ جبن، بزدلی اور خوف کو اپنے دلوں سے نکال دو۔ اسلام اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ صبر و استقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو۔ اور کبھی فساد کی ابتدا نہ کرو۔ اگر فسادی تم پر چڑھ کر آئیں تو ان کو سمجھاؤ۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں اور کسی طرح نہ مانیں تو پھر تم معذور ہو۔ بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ تمہاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی غیرت و حرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو، یہ عزت و شہادت کی موت ہوگی[3]۔"

---

[1] آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش بیس کروڑ ہے۔

[2] آج کل یو۔پی میں ڈیڑھ کروڑ مسلمان ہیں۔

[3] رسالہ پیغام آزاد و مدنی۔ مطبوعہ دیوبند۔

مرض وفات

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اسفار کے پروگرام ہفتوں، مہینوں بلکہ سال سال بھر پہلے سے مرتب اور طے ہوتے تھے۔ ان ترتیبات میں کبھی کوئی خلاف اور خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔ قیام کی مدتیں بھی ایک دن، دو چار دن، ہفتہ اور کبھی کبھی مہینہ مہینہ بھر کے لئے مقرر ہوتی تھیں۔ ان تمام پروگراموں کی حیرت ناک طور پر پابندی ہوتی تھی۔ اسی معمول کے مطابق ۸ جولائی ۱۹۵۷ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ مدراس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس صوبے کے مختلف مقامات پر کم و بیش ڈیڑھ ماہ کے سفر کا پروگرام تھا۔ مگر دس پندرہ روز بعد ہی اچانک واپس تشریف لے آئے۔ دیکھنے والوں کو نہایت حیرت اور صدمہ پہنچا کہ زندگی بھر میں پہلی بار بالکل خلاف معمول درمیان سفر میں اچانک واپسی کی کوئی غیر معمولی ہی وجہ پیش آئی ہوگی۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ سانس لینے میں تنگی محسوس ہوئی اور خطرہ ہوا کہ یہ بڑھ نہ جائے اس لئے واپسی مناسب معلوم ہوئی۔ ایسی ایسی تنگیاں، تکلیفیں اور معمولی عوارض زندگی میں ہزاروں ہی بار تو پیش آئے ہوں گے۔ معمولات میں فرق تو کیا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ سننے والوں نے سن تو لیا کہ سانس میں تنگی محسوس ہوئی مگر دلوں پر اس خبر سے قیامت گزر گئی۔ دو ہی چار دنوں کے بعد سینے میں جوانی قلب میں درد محسوس ہوا اور یہ تنفس عارضۂ قلب میں تبدیل ہوگیا۔ شروع شروع میں جب تک درد قابل برداشت رہا۔ معمولات حسب دستور جاری رہے۔ حدیث شریف کے درس بھی ہوتے رہے۔ نمازیں مسجد میں باجماعت اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں۔ عام مجلس میں تشریف آوری برابر جاری مگر مرض بھی آہستہ آہستہ زور پکڑتا رہا، تکلیف بڑھ گئی تو مقامی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑا اور انھوں نے قلب کا پھیلاؤ یا قلب کا بڑھ جانا تجویز کیا۔ عین اسی دوران سہارن پور اور رائے پور کا سفر درپیش آیا اور یہی اس دنیا کا آخری سفر ثابت ہوا۔ ۵ محرم کو سہارن پور گئے تھے۔

وہاں کے ایک قدیم اور مشہور ڈاکٹر برکت علی مرحوم نے اکسرے، کارڈیو گرام، بلڈ ٹسٹ وغیرہ کا معائنہ کیا اور نہایت احتیاط، مکمل آرام اور حتی الامکان سکوت وسکون کی تاکید کی مگر واپسی کے بعد بھی ہمت، توکل علی اللہ اور عزم وارادہ کے بل پر معمولات، ملاقاتیں، عبادتیں اور سبق وغیرہ جاری رہے۔ یہ چاہتے تھے کہ چاہے اسٹریچر پر سوار ہو کر جائیں مگر بخاری شریف کے درس کا ناغہ نہ ہو۔ دیوبند کے ایک قدیم استاد اور استاذالکل حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ شریف پڑھایا کرتے تھے۔ حضرتؒ ان کا بہت احترام اور خیال فرمایا کرتے تھے۔ وہ بیمار ہوئے اور مرض نے طول پکڑا تو حضرت سے درخواست کی اب مشکوٰۃ شریف کا سبق میرے بس کا نہیں رہ گیا ہے مجھے اس سے معذور رکھا جائے۔ مگر حضرتؒ نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ مولانا عبدالسمیع صاحب نے بہت خوشامد کی تو اتنی بات منظور فرمائی کہ دفتر تعلیمات کے انتظام میں مشکوٰۃ شریف کا درس تو آپ ہی کے ذمہ رہے گا مگر کوئی عارضی انتظام ہو جائے گا، جب شفا ہو جائے گی تو ان شاء اللہ آپ ہی کو پڑھانا پڑے گا۔ مولانا عبدالسمیع صاحب نے بادل ناخواستہ اسے منظور کیا۔ مگر اسی بیماری میں ان کا وصال ہو گیا۔ ان کی تعزیت کے جلسہ میں مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے استاد (مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کو دیوبند کے اکابر اسی لقب سے مخاطب کرتے تھے) کی درخواست ایسی سختی سے رد کی کہ ہمیں حیرت ہوئی۔ حضرت کی یہ عادت نہ تھی اور استاد کا تو وہ بہت خیال فرماتے تھے۔ مگر آج یہ محسوس ہوا کہ حضرت کی خواہش یہ تھی کہ مولانا عبدالسمیع صاحبؒ حدیث شریف کے اشتغال اور تدریس ہی کی حالت میں جان جان آفریں کے سپرد کر دیں اور قیامت میں جب ائمہ امت اور خدام حدیث کی صف آراستہ ہو تو اسی قطار میں استاذ بھی رونق افروز ہوں۔ آج حضرت کو بھی وہی وقت اور وہی حالت درپیش تھی۔ اطباء نے، خدام نے، حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اور علمائے دیوبند نے ہر ہر طرح سبق ملتوی کرنے پر اصرار فرمایا مگر اشتغال حدیث کے ترک پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے بلکہ اگر اٹھا کر اور سہارا لے کر کسی نہ کسی طرح دارالحدیث میں تشریف فرما ہوتے رہے اور دو دو تین تین گھنٹے کے درس میں حق تعالیٰ کی جانب سے اتنی دیر کے لئے ایسی طاقت عود کر آتی

رہی کہ سننے والے اور دیکھنے والے اندازہ بھی نہ کر پاتے تھے کہ یہ محدث عصر قلب کے امراض اور بیماریوں کے اعراض میں چور ہو چکا ہے۔ لیکن محض عزم و ہمت ہی کے سہارے یہ معمول کب تک نبھ سکتا تھا۔ آخر کار یہ سلسلہ باچشم گریاں اور بادل ناخواستہ منقطع کرنا پڑا اور حضرت نے ۲۸ محرم ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۵۷ء کو بخاری شریف کا آخری سبق پڑھا کر دار الحدیث کو دار العلوم کو طلبائے حدیث کو اور مسند محدثین کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اس امید میں کہ اللہ کرے گا حضرت رحمۃ اللہ اس عارضی علالت سے پھر اٹھ کر کھڑے ہوں گے۔ حضرت مولینا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد سے درخواست کی گئی اور انھوں نے عارضی طور پر بخاری شریف اور ترمذی شریف کے اسباق شروع کر دئے۔ اور بالکل مجبور ہو کر حضرت سارے معمولات سے دست کش ہو گئے۔ اب تک تو اتنی سکت تھی کہ کسی نہ کسی طرح نمازیں گھر سے متصل مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ مگر اب یہ آخری قوت بھی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی۔ ناچار بڑی بڑی مشکل سے حجرۂ استراحت سے اٹھ کر مہمان خانے تک تشریف لاتے اور نمازیں وہیں جماعت سے ادا فرماتے۔ مگر ابھی تک اٹھنے اور چلنے میں کسی کا سہارا لینے سے انکار فرماتے رہے اور ساری نمازیں کھڑے ہی ہو کر پڑھتے رہے۔ اس درمیان میں دوسرے معالجین کے ساتھ لکھنؤ سے ڈاکٹر حکیم مولینا سید عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے چھوٹے بھائی مولینا سید ابو الحسن علی الندوی کے ہمراہ معائنے کے لئے تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ مولینا علی میاں مدظلہم فرماتے ہیں کہ بھائی صاحب سفر نہیں کیا کرتے تھے مگر ایک بار حضرت کے بھتیجے مولینا وحید احمد مدنی رحمۃ اللہ کے معائنے اور علاج کے لئے ٹانڈہ ضلع فیض آباد تشریف لے گئے تھے اور دوسری بار حضرت رحمۃ اللہ کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ نہایت توجہ کے ساتھ معائنہ، تشخیص و تجویز فرمائی۔ ان کے بعد اپنے وقت کے مشہور ماہر قلب معالج لکھنؤ ہی کے ڈاکٹر عبد الحمید بھی آئے۔ یہ بھی اپنی بے پناہ مشغولیت اور رجوع خلق کے باعث کسی حالت میں اپنا مطب نہیں چھوڑتے تھے۔ ان ڈاکٹر

حضرات کی تشخیص بھی قلب کا پھیلاؤ رہی اور سخت تاکید رہی کہ باہر نکلنا زیادہ طاقتیں کرنا اور کسی قسم کی مشغولیت میں مصروف ہونا بالکل ترک کر دیا جائے۔ آخر کار وہ وقت بھی آہی پہنچا کہ حضرت اپنے کمرے ہی میں محدود ہو گئے۔ خدام، مریدین، منتسبین اور تلامذہ جوق در جوق آتے اور گھنٹوں گھنٹوں مہمان خانہ میں سراپا انتظار بیٹھ کر محروم واپس چلے جاتے۔ تکلیف برابر بڑھتی ہی رہی اور اسی کے ساتھ کمزوری میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ غذا اول تو ہوتی ہی کیا تھی اور جو تھی بھی اس میں ڈاکٹروں نے نمک کی ممانعت کر دی تھی اس لئے اب صرف برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ معالجین اس پر اصرار کر رہے تھے کہ نمازیں کھڑے ہو کر نہ پڑھی جائیں مگر حضرت اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ جیتے جی بیٹھ کر نماز پڑھنے پر تیار نہ ہوں گے مگر ایک ایسا سماں ہوا کہ لیٹنا متعذر رہو گیا۔ جیسے ہی لیٹتے تھے دل میں درد شروع ہو جاتا تھا۔ اس لئے دن رات سارا وقت بیٹھے ہی بیٹھے گزرنے لگا اور اس حالت میں جسم و جان کی رہی سہی قوت بھی تحلیل ہو کر رہ گئی۔ نماز کے لئے اٹھنا کھڑے ہونا رکوع و سجود کرنا بالکل ہی مشکل ہو گیا۔ اسی حالت میں ایک وقت نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو لڑکھڑا گئے اور چوکی سے نیچے آرہے۔ آخر بالکل ہی پا افتادہ اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ کر نمازیں شروع کیں۔ مگر مسجد نہ جا سکنے، مہمان خانے میں جماعت نہ کر سکنے، کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکنے کا دل پر بہت صدمہ گزرا اور اسی دکھ سے زندگی میں پہلی مرتبہ اب کراہنے لگے۔ ایک خادم نے عرض کی کہ جو بھی جس وقت بھی آپ سے پوچھتا ہے کہ اب طبیعت کیسی ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ الحمد للہ بالکل اچھا ہوں۔ مگر کراہتے ایسا ہیں کہ سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ فرمایا کہ میں اس لئے کراہتا ہوں کہ ساری عمر بے مصرف اور بے کار گزر گئی اور کچھ ذکر نہ سکا اور اب بالکل ہی معذور ہو کر پڑ گیا ہوں۔ دروازے ہی پر مسجد ہے۔ مہمان خانے میں لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور میں سب سے محروم ہو کر کمرے میں اور بیٹھ کر نماز پڑھتا ہوں۔ اسی عالم میں ایک روز مولانا فخر الدین صاحب جو حضرت کی جگہ حدیث پڑھا رہے تھے۔ مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت نے اُن سے اپنے قلبی احساسات بیان فرمائے کہ اب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا وقت آگیا ہے۔ کوئی عمل پاس نہیں ہے۔ نمازیں بھی تیمم

کر کے اور بیٹھ کر پڑھ رہا ہوں۔ توشہ آخرت بالکل خالی ہے۔ مغفرت کا کوئی سامان نہیں ہے دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ کی رحمت کا سلہ جوش میں آجائے اور میرا بیڑا پار ہوجائے۔ اس بیان کے درمیان حضرت کا دل بھر آیا آنکھوں سے زار وقطار آنسو رواں ہو گئے اور آہستہ آہستہ آنسو ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے۔ بیاسی برس کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ کسی نے حضرتؒ کی آنکھوں میں آنسو اور مزاج پر گریہ کا اثر دیکھا تھا۔

غذا وغیرہ تو قریب قریب چھوٹ ہی گئی تھی۔ کوشش کی جاتی تھی کہ کسی نہ کسی بہانے کوئی پھل وغیرہ استعمال میں آجائے۔ ایک دن فرمایا کہ کیا بازار میں سردہ نہیں ملتا۔ واقعی اس وقت سردہ بازار میں موجود نہیں تھا۔ ایک خادم اس کی تلاش میں سہارن پور، میرٹھ، مظفرنگر اور دہلی تک پہنچا مگر کہیں نہ ملا۔ واپس آیا تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ دو روز سے کہاں تھا۔ عرض کیا کہ سردے کی تلاش میں گیا تھا۔ فرمایا کہ "نفس کی ایک خواہش کے نتیجے میں اتنی تکلیف اور اخراجات برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس قسم کی خواہشات نفس اور شیطان کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے تمام عمر کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں کی مگر آخر وقت میں یہ کمزوری بھی صادر ہو ہی گئی"۔ حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے حضرت نے کوئی خواہش یا فرمائش نہیں کی تھی بلکہ صرف دریافت فرمایا تھا۔ خادم بیان کرتا ہے کہ یہ کلمات اور خصوصاً خواہشات سے اس درجہ احتراز سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بعد میں سردہ پاکستان سے بذریعہ ہوائی جہاز آیا بھی مگر اس کا استعمال برائے نام حد تک ہی رہا۔ کوئی افاقہ نہیں ہوا تو یونانی علاج کا مشورہ ہوا۔ چنانچہ اس وقت کے سارے ہی ہندوستان گیر شہرت کے مالک معالجین حکیم عبد الجلیل صاحب، حکیم محمد اسماعیل صاحب صدیقی دواخانہ دہلی، حکیم محمد عمر صاحب دار العلوم دیوبند، حکیم شفیق احمد صاحب دیوبند، حکیم محمد یٰسین صاحب نگینہ، حکیم محمد صدیق صاحب بریلی، حکیم ذکی احمد صاحب جانشین مسیح الملک حکیم اجمل خاں، حکیم عبد الحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی وغیرہ سارے ہی یونانی اطباء جمع ہوئے اور نہایت غور وفکر کے ساتھ دوائیں، علاج اور غذائیں تجویز کی گئیں۔ اس علاج سے حیرت ناک طور پر افاقہ ہوا اور ایک طویل مدت کے بعد حضرت باہر تشریف لائے۔ اس واقعہ سے اور

تشریف آوری کی خبر سے چاروں طرف مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر رشید الوحیدی ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ایک نظم ملاحظہ سے گزر جائے تو اس جوش مسرت کا اندازہ ہو جائے:

کیا تو نے نہیں دیکھا اے شاہد مستانہ
محفل میں نظر آیا وہ جلوۂ جانانہ
جو غنچہ و گل اب تک محروم تبسم تھے
ہے ان کی نگاہوں میں خوشیوں کا اک افسانہ
مے نوشوں نے بڑھ بڑھ کر پھر جام اٹھائے ہیں
ساقی تری آمد سے گردش میں ہے پیمانہ
وہ کون سی مے نے دی دیوانے پکار اٹھے
باقی رہے محشر تک یارب ترا مے خانہ
بے ہوش یہاں کوئی تقدیر سے ہوتا ہے
اس در کا بھٹکنا بھی منزل کو ہے پا جانا
گم کردۂ منزل کو کیا شوق جہاں بینی
بہتر ہے دو عالم سے اک رہبر فرزانہ
کیا شوقِ تماشا ہے ساقی ترے رندوں کو
اک جذب کا عالم ہے اور خود سے ہیں بیگانہ
اب تک بھی نگاہوں پر پابندیٔ نظارہ
اب جلوہ نما خود ہے وہ جلوۂ جانانہ
ہے جس کی نگاہوں میں پیغام عمل کوشی
راس آتی ہے مومن کو وہ جراتِ رندانہ

تنہائی میں سوچا ہے میں نے یہ رشید اکثر
ہے ان کی غلامی میں اک مرتبہ شاہانہ

یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ۝

اب حالت دن بہ دن کمزور ہی ہوتی جاتی تھی۔ اب تک دن رات کے بیچ میں ایک آدھ گھنٹہ نیند آجاتی تھی اب اس سے بھی معذوری ہوگئی۔ ایک منٹ کے لئے بھی لیٹ نہیں سکتے تھے۔ جیسے ہی تکیے پر سر رکھتے تھے سانس پھولنے لگتا تھا اور مجبور ہو کر پھر بیٹھ جاتے تھے۔ سارا دن ساری رات بیٹھے ہی بیٹھے گزرتا تھا۔ ٹیک لگانے سے اور آگے پیچھے دائیں بائیں کسی قسم کا سہارا لینے سے بھی معذوری ہوگئی تھی اور سانس پھولنے لگتا تھا۔ جب تک جسم میں ذرا بھی طاقت رہی اٹھنے بیٹھنے یا کھڑے ہونے میں کسی کا سہارا نہیں لیا تھا۔ نمازیں بھی کھڑے ہو کر پڑھتے تھے مگر اب لیٹنے اور بیٹھنے میں دوسروں کی مدد لازمی ہوگئی تھی۔ غذا کا اول تو نام ہی نام رہ گیا تھا مگر جو کچھ بھی رقیق سیال ایک آدھ چمچہ پیٹ میں چلا جاتا تھا فوراً تے ہو جاتی تھی۔ کوئی چیز ایک منٹ نہیں رکتی تھی۔ کمزوری، مرض کی شدت، بے خوابی، عدم راحت اور بے چینی اپنی جگہ پر تھی۔ اس پر ہر تھوڑی دیر کے بعد تے کی تکلیف نے بالکل ہی نڈھال کر دیا۔ اس حالت میں بھی ضروری کاغذات دیکھتے، ہدایات دیتے اور دستخط کرتے رہے۔ عیادت کرنے والوں سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ان کے احوال اس طرح پوچھتے رہے کہ گویا عام حالات کی معمول کے مطابق ملاقاتیں ہیں۔ امیر جماعت تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ وغیرہ تشریف لائے تو نہایت بشاشت سے ان کے ساتھ باتیں کیں۔ اپنی بیماری، کمزوری اور تکلیفوں کا کوئی شکوہ و تذکرہ نہیں فرماتے تھے۔ مزاج پرسی پر بھی یہی فرماتے رہے کہ الحمد للہ اچھا ہوں۔ ہاں بزرگان دین وعلمائے کرام کے سامنے مسجد کی عدم حاضری، جماعت سے محرومی اور بیٹھ کر نمازوں کی ادائیگی پر صدمہ اور دکھ کا اظہار فرماتے تھے۔

پہلی یا دوسری دسمبر کو تنفس کی شکایت میں بہت افاقہ ہوگیا۔ بڑی راحت محسوس فرمائی، کچھ آرام بھی فرمایا۔ اہل خانہ میں، خدام میں اور مریدین و معتقدین میں یہ مسرت افزا خبر

پھیل گئی کہ اب مرض کا ازالہ ہو رہا ہے۔ کمزوری باقی ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کی ایک ابر آلود صبح کو نو یا دس بجے کے قریب کمرے سے نکل کر بغیر کسی مدد کے چھڑی کے سہارے صحن میں تشریف لائے اور آرام فرمایا۔ بہت دنوں کے بعد صحت اور طاقت کی یہ معمولی سی نشانی نظر آئی تھی۔ امید اور اطمینان کے لئے یہ تھوڑا سا سہارا بھی بہت کافی تھا۔ منٹ منٹ پر افاقہ اور اطمینان کی خبریں مدرسے میں، شہر میں اور شہر سے باہر علاقوں میں پھیل رہی تھیں۔ لوگوں کی خوشی و مسرت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ درمیان میں باتیں بھی کرتے رہے، مسکراتے اور ہنستے بھی رہے اور ہشاش بشاش رہے۔ بارہ بجے کے قریب کمرے میں واپس آئے۔ کسی طرح غذا تناول فرمائی، بچوں اور اہلیہ محترمہ سے باتیں کیں۔ پان کھایا۔ اہلیہ محترمہ اور سب بچوں کو حسن خلق، حسن معاملہ اور پابندئ شریعت کے بارے میں نصیحتیں فرماتے رہے۔ اس کے بعد کمرہ خالی کر دیا گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا، اور سب ہی لوگ اس خیال سے باہر آگئے کہ کچھ دیر نیند آجائے۔ اس کے آدھ پون گھنٹے یا شاید ایک گھنٹے کے بعد کوئی لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ حضرت آرام کے ساتھ محو خواب تھے۔ اُس نے خوشی میں غور سے دیکھا تو پیشانی اس طرح پھڑک رہی تھی جیسے آنکھیں پھڑکتی ہیں یا گوشت کا کوئی ٹکڑا خود بخود مرتعش ہو جاتا ہے۔ خیال بھی نہ گزرا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہو سکتی ہے اور باہر آگیا۔ اس کے ایک یا ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر کے لوگ نماز کے لئے بیدار کرنے کی غرض سے اندر گئے۔ پکارا، جگایا اور آخر میں ہلایا مگر کوئی جواب کوئی حرکت نہ دیکھی۔ لوگ سراسیمہ اور بدحواس ہو کر دوڑے بھاگے، ڈاکٹروں، حکیموں کو بلایا۔ انھوں نے معائنہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں اعلان کر دیا کہ حضرت شیخ العرب والعجم، امام عصر، محدث دوراں، قطب وقت، مجدد امت، جانشین شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، سجادہ نشین قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی، یادگار حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، نقیب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، نائب رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مولانا مرشدنا وشیخنا سید حسین احمد صاحب مہاجر مدنی کا وصال ہو چکا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمیں۔ جسم پر وفات اور موت کا ذرہ برابر اثر

نہیں تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ ذرا آواز ہوئی تو ابھی آنکھیں کھول دیں گے۔ چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت طاری تھی اور وہ دائمی مسکراہٹ بھی جو زندگی بھر ہونٹوں کا طرۂ امتیاز رہی تھی۔ ابھی دو دن پہلے حسب معمول نہایت اطمینان سے حجامت بنوائی تھی جس کی وجہ سے بالوں، داڑھی، مونچھ اور چہرے کی صفائی و ترتیب میں کوئی فرق نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کشش اور جمال میں اور اضافہ ہوگیا۔ وصال کے وقت آس پاس کے اور دور دراز کے اضلاع میرٹھ، مظفر نگر، بجنور، مرادآباد، دہلی، علی گڑھ وغیرہ وغیرہ کے مخلصین و مریدین در دولت پر حاضر تھے۔ فوراً ہر جگہ تار، ٹیلیفون اور فرستادہ دوڑ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد آل انڈیا ریڈیو نے وصال کی اطلاع نشر کی۔ بہت سے شہروں میں بازار بند ہو گئے، ختم قرآن کا اہتمام ہونے لگا اور لوگ دیوانہ وار دیوبند کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسپیشل ٹرینیں اور بسیں، لاریاں، ٹرک، موٹریں، تانگے، ٹریکٹر، سائیکلیں، موٹر سائیکلیں، پیدل غرض جس کو جو سواری میسر آئی اس کے ذریعے دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی دیر میں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مدرسہ دیوبند اور حضرت قدس اللہ سرہٗ کے دولت کدہ پر جمع ہوگیا۔ لاکھوں انسانوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لوگ ہچکیاں اور سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ ہزاروں آدمی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بعض لوگ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ کہیں کہیں یہ خبر صاعقہ اثر سن کر لوگوں کے ہارٹ فیل ہو گئے۔ غم نصیبوں اور حسرت زدوں میں مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی برابر کے شریک تھے۔ بہت سے حضرات کو اس جگہ تک پہنچایا گیا جہاں جسد مبارک رکھا ہوا تھا۔ ان محبین و عاشقین کی حالت بہت قابل رحم تھی۔ قابو سے باہر ہو رہے تھے مگر پاس ادب سے آواز نہیں نکلنے دیتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولینا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس اللہ سرہٗ تشریف لائے، حضرت کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ ڈھائی تین بجے وصال ہوا تھا۔ مغرب یا عشا بعد اسی جگہ پر جہاں وفات ہوئی تھی۔ مولینا عبد الاحد صاحب مدرس دار العلوم دیوبند اور مولانا راشد حسن صاحب نبیرہ حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن صاحب رحمہم اللہ نے غسل دیا۔ ان کے ساتھ مولینا محمد حسین

صاحب مدرس دار العلوم دیوبند، مولانا سید عزیز احمد صاحب فیض آبادی، مولانا مولوی شوکت خاں صاحب رحمہما اللہ اور حضرت کے دو مخصوص تلامذہ مولوی محمد عثمان ہزاروی اور مولوی محمد زکریا کراچوی شریک رہے۔ اس کے بعد آخری حج کے احرام کی چادر کا کفن تیار کیا گیا اور اس میں حضرت کے مشائخ اور اساتذہ حدیث کے تبرکات حضرت کی خواہش کے مطابق منسلک کر کے کفن پہنا دیا گیا۔ نو بجے تک جنازہ تیار کر کے تھوڑی دیر کے لئے اہلیہ محترمہ، صاحبزادیوں اور اعزہ خواتین کی زیارت کے لئے وہیں رکھا رہا اور پھر تقریباً ساڑھے نو بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ مجمع کا بے تابیوں کا آہ وبکا کا اور رنج وصدمہ کا حال بیان کے بس کی بات نہیں ہے۔ گھنٹوں گزر جائیں گے اور یہ دلخراش وجگر سوز داستان ختم نہ ہوگی۔ گھر سے مدرسہ تک پانچ منٹ کا یہ راستہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ جنازہ کی نماز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد جنازہ زیریں دار الحدیث میں عام زیارت کے لئے رکھ دیا گیا۔ تین ساڑھے تین گھنٹے تک لائن بنا کر نظم وضبط کے ساتھ زیارت ہوتی رہی۔ آخر رات کو دو بجے کے قریب جنازہ اپنے سفر پر قبرستان کے لئے روانہ ہوا۔ اس پانچ چھ منٹ کے راستے میں ڈیڑھ پونے دو گھنٹے لگ گئے۔ قبرستان میں ہزاروں علماء، صلحاء اور اکابرین امت کے ساتھ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب، شیخ الحدیث مولانا فخر الدین صاحب، امیر جماعت تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا سید محمد میاں صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قدس اللہ اسرارہم وغیرہ موجود تھے۔ قبر میں مولانا عبد الاحد صاحب، مولانا راشد حسن صاحب عثمانی، مولانا شوکت علی خاں صاحب اور حضرتؒ کے بڑے صاحبزادہ مولانا مولوی اسعد مدنی صاحب نے اتارا۔ ایسے خوش قسمت صاحبزادگان بھی دنیا میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ زندگی میں، کمزوری میں، علالت میں، مرض وفات میں تو راحت رسانی اور خدمت کا حق ادا ہی کیا، جب حضرتؒ رحمۃ اللہ انسانوں سے آخری بار رخصت ہو کر اپنے مولیٰ کے ساتھ خلوت اور مراقبہ میں چلے گئے تو آخری انسان یہ بیٹا ہی تھا جو آخر تک باپ کا بدن دباتا رہا اور وصال سے چند ہی منٹ پہلے جدا ہوا اور آخر کار اپنے ہاتھوں سے پیوند زمین کیا۔ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

بارعب، باوقار مگر دلآویز کتابی چہرہ، گیہواں رنگ، بھری ہوئی درازی مائل داڑھی، غلافی آنکھیں، جھکی جھکی نگاہیں، دوہرا بدن، میانہ قد، ابھری ہوئی پیشانی، مضبوط جسم، چوڑا سینہ، اُٹھے ہوئے، کشادہ ابرو، کھلتا ہوا دہانہ، ترشی ہوئی لبیں، منڈے ہوئے بال، سبک خرام چال، زاہدانہ اور مومنانہ حال، بھرے بھرے ہاتھ پیر، رکھ رکھاؤ میں وضعداری، بات چیت میں دل نوازی، عادات میں مسکنت، حرکات و سکنات میں پابندیٔ سنّت، زندگی میں قناعت، دنیاداری میں توکل، بات چیت میں آواز دھیمی اور لچک دار، وعظ تقریر میں اونچی اور گرجدار، دوستوں اور مخلصین کے تابعدار، دشمنوں اور معاندین کے دل دار، دردمندوں اور محتاجوں کے غمخوار، کم خوراک، بے آزار، دنیاوی اور نفسانی خواہشات سے عاری، تلخ کلامی سے گریزاں، جاہ طلبی سے بترا، مخالفت میں للّہیت تعلقات میں پابندیٔ شریعت، مخاطبت میں ادب، لحاظ، معاملات میں دیانت و احتیاط فقیرانہ شان، درویشانہ انداز، دل میں یادِ خدا زبان پر قال اللہ وقال الرسول، وقفے وقفے سے بے ساختہ و بلا ارادہ باآواز بلند ذکر ”الا اللہ“، نیند پر مکمل قابو، میدان کارزار میں برسرپیکار سپاہی کی طرح پانچ منٹ کا موقع ملے تو گہری نیند سوکر تازہ دم ہوجائیں اور اور چوبیس گھنٹے جاگنا پڑجائے تو پیشانی پر بل نہ آئے۔ موٹا جھوٹا لباس، گرمیوں میں دوپلیا مولویانہ ٹوپی، گزہی گاڑھے کا لمبا کرتہ، ٹخنوں پاجامہ، آگے سے کھلی ہوئی شیروانی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ، ہاتھوں میں مڑے ہوئے دستہ کی چھڑی، سلیم شاہی جوتہ، سردیوں میں کمبل نما کپڑے کی اونی شیروانی، سوئٹر، سر پر سبز رنگ کا عربی انداز کا اونی رومال، جسم پر کتھئی رنگ کا عربی مشلح (عبا)، عطر اور خوشبوے رغبت میں سنّت کی پیروی، جدھر سے گزر جائیں وہ گلی گھنٹوں عود وعنبر کی خوشبو سے مہکتی رہے۔ پیروں میں روسی ساخت کا چرٹے

کا عملی نمونہ، سادہ دل، سادہ مزاج، نمود و نمائش اور ظاہرداریوں سے بیزار، دشمنِ بدعت، نہ خانقاہیت نہ مولائیت، دنیا کے مخدوم مگر رب کے غلام، لاکھوں کے ہادی و رہنما مگر ایک فقیر درویش، ایثار، قربانی، اخلاص، شرافت اور مروت کے پتلے، دیانت داری، وفاداری، للہیت اور تقویٰ و پرہیزگاری کی تصویر، کھانا پینا، سونا جاگنا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور زندگی کا ایک ایک قدم صحابہ کا نمونہ اور رسول اللہ کا اسوہ، اخلاص، للہیت، عالی ہمتی، بلند حوصلگی، فراخ دلی، صبر و استقامت، عزم و ارادہ، حلم و بردباری اور عفو و درگزر جیسی صفات حسنہ میں حضرت مولینا حسین احمد مدنی کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مختلف اوصاف حمیدہ اور متضاد محاسن آپ کی ذات میں اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ مولینا کی عظمت و عزیمت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ مسلسل جد و جہد اور لگاتار مشاغل و مصروفیات آپ کی سرگرمی اور قوتِ عمل کو کبھی مضمحل نہیں کر سکے۔[1]

---

[1] مولینا عبدالحئی۔ نزہۃ الخواطر۔ مطبوعہ حیدرآباد۔ ج ۸۔ ص ۱۱۶

مولینا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر میں ان کے خلف الرشید مولینا علی میاں صاحب مدظلہم نے بعض جگہ اضافات کئے ہیں ممکن ہے کہ ہمارے اقتباسات میں کہیں ان کا اضافہ بھی شامل ہو گیا ہو۔

اولاد و اخلاف

حضرت نے تین صاحبزادگان اور چار صاحبزادیاں چھوڑیں۔ سب سے بڑے مولینا سید اسعد مدنی صاحب مدظلہم پیدائش (۱۹۲۷ء) حضرت کی تیسری اہلیہ رحمہا اللہ کے بطن سے ہیں۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور کچھ عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ تصوف و سلوک کی تربیت حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل اور ان کی کماحقہٗ خدمت کی۔ حضرت کے وصال کے بعد ان کے خلفاء نے آپ کو خلافت و اجازت بیعت دی۔[1] حضرت کے بعد سے آج تک جمعیۃ علماء کے صدر ہیں اور ۱۹۷۳ء سے لے کر تا ایندم باستثنائے چند سال ہندوستان کی پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) کے ممبر ہیں۔ ان منصبوں کے علاوہ، بہت سی دوسری تنظیموں کے ذمہ دار اور نائب امیر الہند، صدر موتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔ آپ کی پہلی شادی آپ کے چچا مولینا سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی و مہتمم مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ کی صاحبزادی عائشہ مرحومہ سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا سید احمد ہے جو مدینہ طیبہ میں پیدا ہوا، یہیں تعلیم حاصل کی اور اب جدہ میں بنک الجزیرہ میں ملازم ہے۔ دوسری شادی مولینا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ و دارالعلوم دیوبند کی صاحبزادی بریرہ خاتون سے ہوئی جن سے چار صاحبزادے حافظ محمود، حافظ مسعود، حافظ محمد اور حافظ مودود ہیں۔ چاروں دیوبند میں زیر تعلیم ہیں۔ بڑے حافظ محمود کی شادی دارالعلوم کے مشہور مبلغ و واعظ مولینا ارشاد احمد صاحب فیض آبادی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی ہے جن سے تین بچیاں ہیں۔ دوسرے حافظ مسعود کی شادی اعظم گڑھ میں جناب امداد اللہ

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، جلد دوم، ص ۳۲۶

صدیقی کی لڑکی سے ہوئی ہے جس سے ایک لڑکی ہے۔ تیسرے حافظ محمد کی شادی جون پور کے مشہور عالم دین مولانا ضمیر احمد صاحب سابق شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ عزیزیہ جلال پور ضلع فیض آباد مرحوم و مغفور کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ چوتھے حافظ مودود ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔ مولینا اسعد کی دو صاحبزادیاں عزیزہ سعدیہ خاتون اور ذکیہ خاتون سلمہا ہیں۔ بڑی کی شادی حضرت مولینا مرغوب الرحمٰن صاحب رئیس شہر بجنور یوپی و مہتمم دار العلوم دیوبند کے صاحبزادے مولینا انوار الرحمٰن صاحب فاضل دیوبند سے ہوئی ہے۔ ان کے تین بچیاں اور ایک بچہ ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی باقی اولاد میں دو صاحبزادگان اور چار صاحبزادیاں چوتھی اہلیہ محترمہ سلمہا سے ہیں۔ ان میں بڑے مولینا مولوی حافظ قاری ارشد مدنی صاحب دار العلوم دیوبند میں درجہ علیا کے استاذ ہیں۔ آپ اپنے بڑے بھائی مولینا اسعد کے خلیفہ ہیں۔ ان کی شادی مولینا عبد الغنی صاحب فاروقی گنگوہی مرحوم کی صاحبزادی بشریٰ خاتون سے ہوئی ہے جس سے چھ صاحبزادگان اور چار صاحبزادیاں ہیں۔ آپ کے بڑے لڑکے مولینا مولوی حافظ ازہد صاحب کی شادی مولوی حکیم سید محمد نفیس صاحب خان جہانپور ضلع مظفر نگر کی صاحبزادی سے ہوئی ہے جس سے ایک بچی ہے۔ مولوی ازہد صاحب جامعہ حسینیہ جونپور میں استاذ ہیں۔ باقی پانچ حافظ امجد، حافظ ازہر، حافظ حسین احمد، حافظ حبیب اللہ اور حافظ محسن سلمہم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں۔ لڑکیاں حسانہ، ولیّہ، فاطمہ اور امامہ سلمہم ہیں۔ حسانہ کی شادی مولینا محمد سعید حسنی فاضل دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ساکن رائے بریلی (یوپی) سے ہوئی ہے جن کے ایک صاحبزادہ ہے۔ دوسری ولیہ سلمہا کی شادی ان کی پھوپھی کے لڑکے مولوی سید محمد سلمان صاحب سے ہوئی ہے۔ ان کے ایک لڑکا ہے دو بچیاں فاطمہ اور امامہ ابھی چھوٹی ہیں۔

حضرتؒ کے تیسرے صاحبزادہ مولینا مولوی سید اسجد مدنی سلمہ اللہ اس وقت تولد ہوئے تھے جب حضرت کی عمر اسّی برس کی تھی۔ دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں اور جمعیۃ علماء ہند کے ناظم ہیں۔ آپ کی شادی حاجی محمد سمیع الرحمٰن صاحب بستی پور صوبہ بہار کی صاحبزادی رضیہ خاتون سے ہوئی ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادہ حافظ سید حسن سلمہٗ زیر تعلیم ہیں۔ دو صاحبزادیاں

عالیہ اور ماریہ سلمہا صغیر الحسن ہیں۔

حضرتؒ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی عزیزہ ریحانہ سلمہا کی شادی مولانا حمید الدین صاحبؒ سابق استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و مدرسہ عالیہ کلکتہ و سابق ممبر مجلس شوریٰ دیوبند کے صاحبزادے مولانا مولوی حافظ قاری رشید الدین صاحب حمیدی خلیفہ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ و مہتمم مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد سے ہوئی ہے۔ ان کے تین صاحبزادے ہیں۔ بڑے عزیزم احمد سلمہٗ بی۔اے (جامعہ) حفظ الرحمٰن ادارہ تعلیم و تربیت میں مدرس ہیں۔ ان کی شادی ان کے خاندان میں فیض آباد میں جناب مجید الدین صاحبؒ کی پوتی سے ہوئی ہے۔ ان سے چھوٹے مولانا مولوی حافظ قاری اخلد صاحب مدرسہ جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد میں استاذ ہیں، ان کی شادی خاں جہاں پور میں سید محمد انیس صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ ریحانہ کے تیسرے صاحبزادے حافظ اشہد سلمہٗ دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں اور دو صاحبزادیاں عزیزہ عائشہ اور سعدانہ سلمہا ہیں۔

حضرتؒ کی دوسری صاحبزادی عزیزہ عمرانہ سلمہا ہیں ان کی شادی منصور پور ضلع مظفر نگر میں نواب سید محمد عیسیٰ صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا مولوی حافظ قاری حاجی سید محمد عثمان صاحب سلمہٗ استاذ درجۂ علیا دار العلوم دیوبند سے ہوئی ہے۔ ان کے دو صاحبزادے مولانا مولوی حافظ قاری حاجی مفتی سید محمد سلمان صاحب استاذ جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد اور حافظ سید محمد عفان متعلم دار العلوم دیوبند ہیں، ایک صاحبزادی عزیزہ حافظہ رشدیٰ سلمہا ہیں۔

حضرتؒ کی تیسری صاحبزادی عزیزہ صفوانہ سلمہا ہیں ان کی شادی مولانا مولوی سید محمد نعیم صاحب خاں جہاں پور ضلع مظفر نگر مالک نیشنل انجینیرنگ ورکس کھتولی سے ہوئی ہے۔ ان کے چار صاحبزادگان حافظ محمد حارثؒ، حافظ محمد معاذ، محمد سعد اور محمد بشار سلمہم ہیں اور دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں اور ایک صاحبزادی خالدہ سلمہا ہیں۔

حضرتؒ کی چوتھی صاحبزادی عزیزہ محترمہ فرحانہ ہیں۔ سلمہم اللہ

حضرتؒ کے دو بچے اور چار بچیاں ہیں صغر سنی میں ذخیرۂ آخرت ہوئے۔

کس قیامت کا یہ ماتم ہے بپا تیرے بعد

سارے تعزیت نامے، اداریے، مضامین، تجویزیں اور تقریریں تلاش کی جائیں اور نقل کی جائیں تو اتنا وقت اور گنجائش کہاں سے لائی جائے؟ اور کسی نہ کسی طرح ہمت کر بھی لی جائے تو اب اس سے فائدہ بھی کیا ہے؟ تاہم حادثہ کی شدت اور رنج والم کی عمومیت کا اندازہ کرنے کے لئے نمونتاً چند تحریریں ملاحظہ کیجئے اور یہ خیال کر لیجئے کہ ان میں بعض معترضین اور منتقدین کے غم آمیز تاثرات بھی شامل ہیں۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداء۔

ابتداہم مولینا عامر عثمانی مرحوم ایڈیٹر ماہنامہ تجلی دیوبند کے تین اشعار سے کر رہے ہیں جو موصوف نے اپنے تعزیتی اداریے میں لکھے ہیں۔ یہ اداریہ بھی آپ اگلے صفحات میں دیکھیں گے۔

حادثہ وفات حضرت شیخ الاسلام مولینا حسین احمد صاحب مدنی

وہ ایک تارا جو ضو فگن تھا حیات کے مغربی افق پر
سیاہیٔ شب کے پاسبانو خوشی مناؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ اک سفینہ جو ترجماں تھا بہت سی غرقاب کشتیوں کا
ہماری حالت پہ ہنسنے والو ہنسی اڑاؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ ایک دل جو دمک رہا تھا خلوص وایماں کی تابشوں سے
خلوص وایماں کے دشمنوں کو خبر سناؤ کہ وہ بھی ڈوبا

عامر عثمانی

تاثرات

امام الہند حضرت مولٰنا ابو الکلام آزاد

مولٰنا حسین احمد کے انتقال سے دنیا ایک عالم دین اور ہندوستان ایک سچے محب وطن سے محروم ہوگیا۔ وہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آئے اُس وقت سے اب تک چھتیس برس تک مولٰنا اس جماعت میں شریک رہے جس کا نصب العین ہندوستان کو پنجۂ فرنگ سے آزاد کرانا تھا۔[۱]

پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان

مولٰنا حسین احمد کی موت ایک ایسے عالم دین اور وطن پرست کی موت ہے جس نے جدوجہد آزادی میں ہماری رہنمائی کی۔[۱]

مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی بانیٔ جماعت اسلامی مرحوم

مولٰنا موصوف نے بطور تعزیت دو تار دیے، ایک تو مختصر تھا جو اخبار میں آچکا ہے ایک بہت مفصل تھا۔ اتنا کہ غالباً اس پر ستر اسی روپیے خرچ ہوئے ہوں گے۔ مگر ساتھ ہی یہ ہدایت تھی کہ یہ اشاعت کے لئے نہیں ہے، چنانچہ وہ نہیں چھاپا گیا۔[۲]

---

[۱] ماخوذ از اداریہ ماہنامہ رسالہ آجکل، دہلی بابتہ ماہ فروری ۱۹۵۸ء

[۱] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[۲] ماخوذ از اداریہ ماہنامہ تجلّی دیوبند، بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۵۸ء

مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری

قمر الدین نے آج شیخ اعظم حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ کی وفات کی سُنائی تو اس المیہ کو قبول کرنے پر دل آمادہ نہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ یتیم ہوگئی۔ اس ذات نے لاکھوں مسلمانوں کا شیرازہ باندھ رکھا تھا۔ اب کوئی نہیں جو دوسرا حسین احمد بن کر کھڑا ہو۔ صبح سے بار بار رو چکا ہوں۔ بار بار دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔[۱]

جناب اصغر علی عابدی ایڈیٹر سہ روزہ اخبار دعوت دہلی

"مولانا مدنی کا سانحۂ وفات بڑا غم انگیز ہے۔ ان میں اور ہم میں نظریات و افکار کا چاہے جتنا بھی اختلاف رہا ہو لیکن ان کے لئے ہمارے دلوں نے کبھی وہ جذبہ محسوس نہیں کیا، جو کسی مخالف کے لئے ہوتا ہے۔ ہمارے قلوب ان کی محبت اور عقیدت سے لبریز تھے۔ اللہ اور رسول ہی کے احکام اور دین ہی کی روشنی میں اگر ہم ان سے اختلاف کرنے سے معذور نہ ہوتے تو خدا علیم ہے ان جیسا زاہد و عابد اور عالم و رہنما تو ہمارے سر کا تاج اور ہمارے دلوں کا مسند نشیں تھا۔ بہرحال وہ اپنے رب سے جا ملے اور ہم تمنا کرتے ہیں کہ ان جیسے زہد و تقویٰ اور جہد و عمل کی ہمیں بھی توفیق نصیب ہو۔"[۲]

آل انڈیا ریڈیو دہلی

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے برگزیدہ نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ

---

[۱] ماخوذ از اداریہ ماہنامہ تجلّی دیوبند، بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۵۸ء

[۲] " " " " " "

کہتے ہوئے قلب پر عجیب عالم گزر رہا ہے۔ ان کی موت نے لاکھوں محبت بھرے دلوں کو غم و حزن کا مسکن بنادیا ہے نہ جانے کتنی آنکھیں آج ان آنسوؤں کی جلوہ گاہ ہوں گی جن میں انتہائی خلوص و گداز شامل ہے۔

جنگ آزادی کا عظیم رہنما، حب وطن کا ایک بحر مواج، عزم و استقلال کا ہمالہ، علم و انکسار کا ایک سدا بہار گلستاں، جود و کرم کا ابر گہربار، علم و عمل کے افق کا آفتاب، آج حجابات ظاہری کی محفل سے اٹھ کر عالم باطنی کی خلوت میں محو خواب ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سید حسین احمد، ہاں وہ مرد عظیم، انسانیت کی آبرو، عرفان و ایقان کا تجمل، شریعت کا ہادی، طریقت کا مرشد، مدرسہ و خانقاہ میں خشیت الٰہی سے سراپا گداز، میدان عمل میں جرأت و ہمت کا کوہ گراں، وہ خطیب شعلہ فشاں جس نے غیور ہندوستانیوں کے سینوں میں جذبۂ آزادی کی چنگاری روشن کی۔

ریشمی رومال کی تنظیم جہاد ہو یا جنگ عظیم میں برطانیہ کی شدید مخالفت، مالٹا کا زندان ہو یا کراچی کی قید، تحریک خلافت ہو یا جدوجہد آزادی، نمک سازی کی ستیہ گرہ ہو یا شراب خانوں کا احتساب، ۱۹۴۲ء کا نعرۂ انقلاب ہو یا نظریہ تقسیم کا دلیرانہ استرداد، غرض ہندوستان کی کتاب آزادی کا ایک ایک ورق حضرت مولینا کے انوار، ایثار و قربانی سے تابناک ہے۔

ایک طرف جہد و عمل کا یہ وسیع میدان دوسری طرف مسند علم و عرفان سے علوم نبوت کی گہرریزیاں اور گل باریاں، سچ تو یہ ہے کہ اس دور میں یہ امتیاز خاص حضرتؒ کی ذات اقدس پر ختم ہوگیا۔

شیخ الاسلام، ہادیٔ کل حضور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے والہ و شیدائی تھے۔ شفقت و رحمت، حلم و تواضع، عفو و کرم، جود و نوازش، ایثار و اخلاص اور خدمت و مدارات کے حسن و پاکیزگی نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو انتہائی دلآویز بنادیا تھا۔

دین حنیف کی شمع جاوداں، حریم چشتیاں کا چراغ ابد فروغ، دن علوم معارف کی خدمت و اشاعت سے روشن، راتیں ذکر و خشیت الٰہی سے پُرنور قائم اللیل و فارس النہار کی تفسیر جمیل، دشنام طرازوں اور کیچڑ اچھالنے والوں پر عفو و کرم کے پھول برسانے والا، بدخواہوں کا سچا دعاگزار، ہاں حسین احمد اپنے ہادیٔ برحق کے نقش قدم کا دیوانہ رحماء بینہم کے جمال دلنشین کا پرتو، جس کی زندگی تھی۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست ٭ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

کروڑوں ہندوستانیوں اور بے شمار دوسرے ملکوں میں رہنے والے عقیدتمندوں کے غمزدہ قلوب کی تسلی کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پاک روح عالم باقی کے جھروکوں سے اشارہ کررہی ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[1]

ریڈیو سعودی عرب جدہ تقریر مولینا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی

حضرت شیخ الاسلام کی وفات کی اطلاع یہاں بجلی بن کر گری۔ پنجشنبہ ۱۳ جمادی الاول کو یہ خبر ہندوستان اور پاکستان کے ریڈیو نے نشر کی۔ سعودی عرب ریڈیو کی اردو نشریات کا پروگرام ملتوی کرکے مندرجہ ذیل تعزیتی تقریر نشر کی گئی:

حضرت مدنی جمیعۃ علماء ہند کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جہاد حریت کے اولین سپہ سالاروں میں تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت، ترویج سنت اور احادیث نبوی کی تدریس میں گزاردی۔ وہ بزرگوں کے بزرگ، استادوں کے استاد، بڑے بڑے مرشدین کاملین کے مرشد اور بہتیرے مسلم لیڈروں کے مربی اور استاد تھے۔ ان کے نقش حیات کا ایک ایک صفحہ عظمت کی بارگاہ ہے۔ نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ برما، انڈونیشیا، افغانستان، مشرقی وجنوب مشرقی افریقہ میں ان کے شاگرد

---

[1] خصوصی ریڈیائی تعزیتی پروگرام میں روشن صدیقی جوالاپوری مرحوم و مغفور کی تقریر، ماخوذ از اخبار الجمعیۃ دہلی، ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء

ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ قوت و عزیمت کے کوہ گراں تھے جو اپنے موقف سے بال برابر بھی ہٹنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینہ کے مانند تھی۔ اگر ایک طرف گاندھی جی، موتی لال نہرو اور دوسرے ہندوستانی لیڈر ان کے مداح و قدردان تھے۔ ان سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے تعاون پر اعتماد و فخر کرتے تھے تو دوسری طرف وہ عظیم ترین روحانی مربی اور شیخ کامل تھے۔ ایک خدا رسیدہ بندے کی معراج یہی ہے کہ وہ نہ لوگوں کی مدح خوانی سے متاثر ہو نہ ان کے سب و شتم سے۔ اگر دنیا اس کے قدموں میں آجائے تو اس کے احساس بندگی و بے مائگی پر غرور کی پرچھائیں نہ پڑے اور اگر ساری دنیا اس سے منہ موڑ لے تو اللہ کی معیت و نصرت میں خود کو تنہا نہ محسوس کرے۔ جو لوگ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ حضرت ان اوصاف کے بہترین حامل تھے۔

شیخ الاسلام کا لقب حضرت پر حقیقی معنوں میں صادق آتا ہے۔ حق بات تو یہ ہے جس کے کہنے میں ہم کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے ہیں کہ حضرت مدنی اس وقت دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی و روحانی بزرگ تھے۔ سنت نبوی کو اگر کوئی زندہ شکل میں دیکھنا چاہتا تو حضرت کی روحانی رفتار و گفتار کا جائزہ لے لیتا۔ چند دن آپ کی صحبت میں گزارتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ سلف صالحین کا انداز نشست و برخاست اور طریق بود و باش کیسا تھا۔

آج تمام مسلمانوں کے لئے یوم الحزن ہے اور ہر کلمہ گو تعزیت کا مستحق ہے۔ حق تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے اور ان سے راضی ہوئے (ملخص)

اخبار چٹان لاہور شورش کاشمیری مرحوم

اس تعزیتی خبر سے اسلامی دُنیا کے ثقہ افراد بے شبہ رنج و قلق کا شکار ہوئے

لہ ماخوذ از اخبار الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۸ء یوم دوشنبہ

ہیں کہ ایشیا کی سب سے بڑی دینی درس گاہ کے رئیس الجامعہ شیخ الہند حضرت مولینا حسین احمد مدنی ۵، دسمبر کو ۲ بج کر ۵۴ منٹ پر دیوبند میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا سن شباب تھا کہ حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ اختیار کیا اور دین وسیاست میں انہی کی سیادت قبول فرمائی، پھر ان کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے۔ روضۂ اطہر کے سامنے بیٹھ کر حدیث شریف کا درس پڑھا اور پڑھایا۔ وہیں پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے مرشد و مرید دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اور مالٹا کے جزیرہ میں نظربند رکھا۔ وہاں آپ پر جو مظالم روا رکھے گئے، ان کا ذکر یہاں بیکار ہے کیوں کہ زخموں سے کھیلنے والوں کو زخم سہنے والوں کی کہانی سُنانا بجائے خود زخموں کی اہانت کرنا ہے۔

رہائی کے بعد ہندوستان پہنچے اور تحریک خلافت میں شریک ہو گئے، پھر جب تک انگریز اس برصغیر سے نکل نہیں گئے آپ نے کسی موڑ پر بھی اپنے بڑھاپے کو تھکنے نہیں دیا۔ شب و روز گزرتے رہے۔

آپ نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، کسی کے خلاف کلمۂ اہانت نہیں کہا۔ اختلاف فکر و نظر کے باوجود ہر شخص کی عزت کی۔ دین کو دین کی سطح پر رکھا۔ کاروبار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ غیرت اور جرأت دو ایسے وصف تھے جو آپ کے خون میں دوڑتے تھے۔

حضرت تقویٰ کی اس منزل میں تھے کہ مولینا الیاس دہلوی (بانی جماعت تبلیغ) نے سیاست کی گرم بازاری کے دنوں میں کہا تھا کہ "آپ سیاستاً جو کچھ کہتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر سمجھ میں آسکتا تو میں آپ کے ہمراہ دوڑتا پھرتا۔ مگر اللہ کے نزدیک آپ کا جو درجہ ہے میں اس سے کماحقہٗ واقف ہوں اس لئے آپ کی مخالفت کر کے جہنم کی آگ نہیں خریدنا چاہتا۔"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک جیش بہامتاع تھے۔ زندہ ہندوستان میں ہوتے تو آج بھارت

کے پرچم آپ کے غم میں سرنگوں ہوتے۔ لیکن آپ اس ملک میں اجنبی تھے۔[1] (ملخص)

ہفت روزہ خدام الدین لاہور

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے عالم اسلام ایک عالم بے بدل اور صاحب باطن صوفی، ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک مایۂ ناز اور جاں باز سپاہی اور مسلمانانِ ہند ایک قابل اور موثر رہنما سے محروم ہوگئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام اور متعقدین کی بہت بڑی تعداد برصغیر بلکہ سارے عالم اسلام میں موجود ہے جن میں بڑے بڑے علمائے کرام اور صوفیائے عظام بھی شامل ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نیکی، خلوص اور تقویٰ کا مجسمہ تھے۔[2] (ملخص)

ماہنامہ الصدیق ملتان (پاکستان) اداریہ مولینا عبداللہ صاحب

بروز جمعہ مدرسہ عربی خیر المدارس میں حضرت مولینا خیر محمد صاحب[3] مدظلہٗ نے ایک موثر تقریر فرمائی جس میں فرمایا کہ سلف میں دو قسم کے بزرگ ہیں ایک علوم شریعت میں ماہر اور باکمال اور دوسرے وہ علوم طریقت میں انتہائی مقام کو پہنچے ہوئے تھے۔

حضرت مدنی ان اکابر میں تھے جو ظاہر و باطن دونوں کے جامع تھے اور صحیح معنوں میں شیخ الاسلام تھے اور ان کو حضرت مولینا محمد قاسم سے تواضع و انکساری اور مولینا رشید احمد گنگوہی سے استقلال اور استقامت ورثہ میں ملی تھی۔

حضرت مولینا خدا بخش صاحب مدظلہٗ، حضرت مولینا محمود اختر صاحب اور اخیر میں امیر شریعت حضرت مولینا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے حضرت کے مناقب و محاسن بیان فرمائے[4] (ملخص)

---

[1] اداریہ ہفت روزہ چٹان، ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء
[2] ہفت روزہ خدام الدین، ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء
[3] مولینا خیر محمد صاحب حضرت تھانوی کے اجل خلیفہ میں تھے
[4] الصدیق (ملتان) ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ

ماہنامہ مدینہ لاہور (پاکستان) اداریہ مولوی محمد میاں کاندھلوی

پانچ دسمبر کی شام کو یہ جانکاہ خبر رنج والم کے ساتھ سنی کہ حضرت مولینا حسین احمد مدنی رحلت فرما گئے۔ برصغیر میں آپ کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے اور اختلاف فکرو نظر کے باوجود آپ کو ہر طبقہ میں احترام وعقیدت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ عبادات میں آپ کا خشوع وخضوع دیکھنے والے پر رقت طاری کر دیتا تھا۔ آپ کی وفات ایک فرد کی نہیں ایک تحریک، ایک جذبہ اور ایک تاریخ کی موت ہے۔ (ملخص[۱])

ماہنامہ مقام رسالت کراچی (پاکستان) اداریہ سلیم شمسی

یہ سال ۱۹۵۷ء اپنے ساتھ ایک ایسی ہستی کو لے گیا جو نہ صرف مسلمانان ہند وپاک کی متاع گراں مایہ تھی بلکہ مسلمانانِ عالم کی ایک بضاعت بے بہا تھی یعنی حضرت العلامہ مولینا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

ممدوح کی وفات ہر اس مسلمان کے لئے سوگوار کر دینے والا جانکاہ واقعہ ہے جس کے دل میں کتاب وسنت کی محبت ہے۔ مولینا مرحوم کی ذات ایک متقی مسلمان، عالم دین اور فن حدیث میں کمال رکھنے والے ایک فاضل کی ذات تھی۔ اور اسی حیثیت سے مسلمانان عالم کے لئے ایک سرمایۂ عظیم تھی۔ (ملخص[۲])

اخبار آزاد لاہور (اداریہ)

پاکستان ریڈیو نے رات کی خبروں میں جب شیخ الہند حضرت مولینا حسین احمد مدنیؒ کے حادثۂ ارتحال کی خبر نشر کی تو دینی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ سانحہ ساری دنیائے اسلام میں بڑے ہی رنج وملال سے سنا گیا ہوگا۔ رات گئے تک اس خبر کی تصدیق کے لئے فون آتے

---

[۱] مدینہ لاہور، ماہ جنوری ۱۹۵۸ء

[۲] مقام رسالت، جنوری ۱۹۵۸ء

رہے۔ حضرت کی عظیم شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ برصغیر کے علاوہ آپ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ہر اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی تھوڑی بہت بھی آبادی موجود ہے ان کے عقیدت مند موجود ہیں۔

دین کی خدمت، آزادیٔ وطن کی تڑپ اور برطانوی سامراج کی مخالفت آپ کی گھٹی میں تھی۔ خدمت ملک و ملت میں آپ نے وہ کڑی مصیبتیں جھیلیں اور ایسی مستقل مزاجی سے جنگ آزادی میں حصہ لیا کہ باید و شاید۔ ناساعد حالات سے کبھی حوصلہ نہ ہارا اور اور اپنوں اور بیگانوں کی زبان طعن کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ برطانوی حکومت نے انھیں ہمیشہ اپنا باغی جانا۔ برطانوی ایجنٹوں نے حضرت مدنی سے جب بھی بدسلوکی یا بدتمیزی کا برتاؤ کیا آپ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ آج افق اسلام کا یہ درخشندہ ستارا ڈوب چکا ہے۔ دیوبند ہی نہیں ساری دنیائے اسلام اس اُجالے کو مدتوں ترستی رہے گی۔ دعا ہے کہ باری تعالیٰ حضرت کو اپنے جوار رحمت میں مقام اعلیٰ عطا کرے اور انھیں کروٹ کروٹ چین نصیب ہو۔ (ملخص)[1]

اخبار تسنیم لاہور (اداریہ)

مولینا سید حسین احمد مدنی کا انتقال ایک نہایت المناک واقعہ ہے جس پر پورا عالم سوگوار ہوگا۔ مولینا مدنی جامع الکمالات شخصیت تھے۔ ان کا علم و فضل، ان کا ورع و تقویٰ، ان کی بے باکی و حق گوئی، حمایت اسلام اور آزادیٔ وطن کا جذبہ، ان کا استقلال اور استقامت اور ان کے دوسرے اوصاف و خصائص ایسے تھے کہ کسی ایک شخص میں بہت کم جمع ہوتے ہیں۔ ان کی موت سے اسلام، ملت اور علم و عمل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ جو لوگ ان کے مخصوص عقائد و رجحانات اور مشاغل و مصروفیت سے اختلاف رکھتے ہوں وہ بھی ان کے فضائل و محاسن سے انکار نہیں کرتے۔ آخری زمانے میں بعض مخصوص اسباب کی بنا پر

---

[1] ماخوذ از اخبار الجمعیۃ دہلی، ۱۰ دسمبر ۱۹۵۷ء

مولانائے موصوف و مرحوم جماعت اسلامی کی مخالفت کرنے لگے تھے اور اس معاملہ میں انھوں نے کسی حد تک غلو سے بھی کام لیا لیکن ہمیں گمان ہے کہ ان کا یہ طرز عمل غلط معلومات اور غلط فہمیوں پر مبنی تھا اور ہمیں توقع ہے کہ اس معاملے میں بھی ان کی نیت نیک ہی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے گا۔ ہمارے دل میں ان کی نیکیوں کی پوری قدر ہے اور ان کی مخالفت کا کوئی ملال نہیں اور ہم صدق دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولینا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (ملخص[1])

الجمعیۃ دہلی ادار یہ مولینا عثمانیہ فارقلیط[2]

جو لوگ واقف ہیں وہ شہادت دیں گے کہ حضرت سرتاج العلماء شیخ العرب والعجم سیدنا مولینا سید حسین احمد مدنی اخلاص و ایثار، تقویٰ و طہارت، عبادت و ریاضت، سخاوت و مروّت، خدا پرستی و مردم شناسی، خودداری اور علم دوستی کا پیکر تھے۔

یوں تو سارا ہندوستان حضرت کی جدائی سے غمگین و ملول ہے لیکن جب ہم نے آل انڈیا ریڈیو پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولینا ابوالکلام آزاد، صدر کانگریس مسٹر ڈھیبر، ڈاکٹر سید محمود اور روشن صدیقی کے پیغام تعزیت سُنے تو ہماری اثر پذیری میں مزید اضافہ ہوا۔ غالباً گاندھی جی کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے حضرت کے ماتم میں ایک مستقل پروگرام نشر کیا۔ دعا ہے کہ پروردگار عالم حضرت ممدوح کی روح مطہر پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور مغموم دلوں کو 'صبر جمیل' کی نعمتوں سے نوازے۔ (ملخص)

اخبار نئی دنیا دہلی ادار یہ مولینا عبدالوحید غازی پوری مرحوم

یہ روشنائی نہیں خون کے آنسو اور قلم نہیں ٹوٹا ہوا دل ہے جو شیخ الاسلام حضرت

---

[1] ماخوذ از اخبار دعوت دہلی، مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء [2] الجمعیۃ دہلی، ۸ دسمبر ۱۹۵۷ء

مولانا سید حسین احمد مدنی کے غم میں سوگوار ہے۔ علم کی ایک شمع خاموش ہوگئی۔ فضل و کمال کا ایک آفتاب غروب ہوگیا۔ موت نے زندگی کے ہاتھ سے وہ مہکتا ہوا پھول لے لیا جس کا رنگ تفسیر شریعت، جس کی پنکھڑیوں میں اسوۂ مشائخ کی خوشبو اور جس کے حسن میں اخلاق کی کشش تھی جس کے دامن میں علم و حکمت کا شہد تھا۔ وہ علم و عمل اور شریعت و طریقت کا مجمع البحرین تھے۔

عالم کی موت اگر عالم کی موت ہے تو آج حسین احمد نہیں ایک عالم مرگیا۔ علم کی ایک دنیا فنا ہوگئی۔ دنیائے اسلام کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ انسانیت کی وہ روح پرواز کرگئی جس کی مختشر انسانیت میں ہمیشہ ہی تلاش رہے گی۔ انا للہ وانا الخ (ملخص[1])

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ اداریہ حیات اللہ انصاری

مولانا مدنی جو جدوجہد آزادی کے ایک بہت بڑے سپہ سالار تھے جو قربانیوں کے وقت سپاہیوں کے آگے آگے رہا کرتے تھے اور جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ نظر بندی اور قید میں گزرا۔ وہ جس جگہ جاتے تھے تقریر کرتے تھے یا بولتے تھے ان کے پس منظر میں ایک عظیم تاریخ بولتی تھی۔ مولانا مدنی زبردست سیاسی لیڈر تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ بڑے عالم اور محدث بھی تھے۔ جن کے علم و فضل کا لوہا ان کے مخالف بھی مانتے تھے۔ دوسری طرف وہ بہت بڑے مرشد بھی تھے۔ وہ پسر دخاک کر دیے گئے لیکن زمانہ دیکھے گا کہ ان کی موت کو بھی موت آگئی ہے کیوں کہ ان کی زندگی قلب انسانی کے سنگ خارا پر نصب ہے جہاں ماضی ہمیشہ حال رہتا ہے۔ (ملخص[2])

روزنامہ خلافت بمبئی ادارِیہ

ملّتِ اسلامیہ ہند کی انتہائی بد قسمتی ہے کہ آفتابِ علم و معرفت، جامع شریعت و

---

[1] نئی دنیا دہلی، ۸ر دسمبر ۱۹۵۷ء [2] قومی آواز لکھنؤ، ۸ر دسمبر ۱۹۵۷ء

طریقت مجاہد راہ حریت مولانا حسین احمد ۵ ردسمبر کو شدید علالت قلبی کے باعث وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ۔ مرحوم دنیائے اسلام کے کبار و مرشدان طریقت میں تھے۔ علمی تبحر کے ساتھ ان کے ذاتی محاسن اخلاق نے انھیں ممدوح خلائق بنا دیا تھا۔ جو لوگ ان کے شدید مخالف تھے وہ بھی ان کے اخلاق و تقویٰ کے قائل اور مقر تھے۔ مولانا کو جنگ آزادی کی تحریک خلافت اور ترک موالات میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ طبقہ علماء میں کم لوگوں کو حاصل ہوئی۔ لیکن ان کا اصل جوہر زہد، تقویٰ، عبادتیں اور ریاضتیں تھیں جو سفر حضر میں تقریباً ہر وقت جاری رہتی تھیں۔ مولانا جیسا درس حدیث دینے والا محدث اب ملنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے اور پھر اس درس و تدریس کے لئے تقویٰ و تزکیۂ نفس کی جو شرط ہے اس کا پورا کرنے والا اس دور پُرفتن میں تو ڈھونڈے بھی نہیں ملے گا۔ مولانا کی وفات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ (ملخص)[1]

اخبار مدینہ بجنور ادار یہ

حضرت شیخ کا وصال تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے حادثۂ عظیم ہے۔ ہم ایک دوسرے کو اس پر بھی تسلی دے سکتے ہیں کہ آؤ ہم سنت اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دیں۔ بقول امام الہند مولانا آزاد خود حضرت شیخ نے اپنے جسم اور اپنی روح کو اللہ کی مرضی کے آگے جھکا دیا تھا، امت مسلمہ کی سرداری کے لئے جو صفات درکار ہیں وہ اب ہندوستان میں کسی ایک فرد میں اس طرح جمع نہیں ہو سکتیں جس طرح حضرت کی ذات قدسی صفت میں جمع ہو گئی تھیں۔

دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو اور بالخصوص حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کو صبر و استقامت کی توفیق عطا فرمائے (ملخص)[2]

---

[1] روزنامہ خلافت، ۱۳ردسمبر ۱۹۵۷ء

[2] اخبار سہ روزہ مدینہ بجنور، ۱۳ردسمبر ۱۹۵۷ء

اخبار ملاپ دہلی اداریہ رنبیر

محترم مولانا حسین احمد مدنی کے دیہانت سے ہندوستان کے ہر دیش بھگت کو دکھ ہوگا۔ وہ جدوجہد آزادی کے ان جرنیلوں میں سے تھے جنھوں نے سارا جیون دیش کی خدمت میں لگا۔ دوسرے نیتاؤں کے مقابلے میں ان کا میدان عمل زیادہ کٹھن تھا۔ انھیں ان مسلمانوں میں کام کرنا پڑا جنھیں دشواشس دلایا گیا تھا کہ سیاست کی بنیاد مذہب پر ہے اور قومیت کی بھی۔ ان کے دیہانت سے جدوجہد آزادی کا ایک شاندار ورق الٹ گیا ایشور ان کی آتما کو شانتی دے۔ (ملخص)[1]

اخبار دور جدید رنگون برما اداریہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ بیک وقت مجاہد، سپاہی، فقیہ، صوفی، محدث، شیخ طریقت اور وقت کے امام و رہنما تھے۔ سیاسی میدان میں شیخ الاسلام مولانا مدنی سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی خلوص، سچائی، حب وطن اور خدمت اسلام سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ نے تقریباً نصف صدی تک جس جوش اور انہماک کے ساتھ دین اسلام اور علم کی خدمت کی اور جس مجاہدانہ زندگی کا ثبوت دیا آج اس کی مثال معدوم ہے۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ (ملخص)[2]

اخبار نیو ایج آف ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی دہلی اداریہ

مولانا حسین احمد مدنی، عظیم محب وطن عالم، ہندوستان کی تاریخ سے متعلق اور مذہبی کتابوں کے مصنف، مسلمانوں کے عظیم الشان عالم ۵ دسمبر کو انتقال فرما گئے۔ حقیقت میں مولانا مدنی خلافت تحریک کے اولین رہنماؤں میں تھے۔ وہ کانگریس میں اس گروہ سے تعلق

---

[1] اخبار ملاپ، دہلی، ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء [2] دور جدید، رنگون، ۸ دسمبر ۱۹۵۷ء

رکھتے تھے جو مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بتاتا تھا اسی لئے آپ نے موتی لال نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ مولانا مدنی میں قوم پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے قومی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے لئے تمام ملک میں پرچار کیا۔ تمام دنیا میں انھیں ایک زبردست مذہبی عالم تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا بے حد سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی سختیوں، قربانیوں اور مصیبتوں کی زندگی تھی۔ اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی انھوں نے عوام کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آخر وقت تک وہ ایک زبردست اور بے حد مستقل مزاج سامراج دشمن ہندوستانی رہے۔[۱]

ہفت روزہ پیامِ مشرق دہلی اداریہ

آہ! آج چمن اسلام اپنے باغباں سے محروم ہوگیا۔ جس نے پون صدی تک اسلام کے ناموس کی خاطر جہاد کیا۔ جس نے ہندوستان میں اللہ رسول کا نام سربلند کرنے کے لئے بار بار دار و رسن کو دعوت دی جس نے ملک و قوم کی خاطر سجن و زنداں کو لبیک کہا۔ آج جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس، جانشین حضرت شیخ الہند مجاہد اعظم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی ۵؍ دسمبر کو دو بجے دن میں اپنے مولا کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الخ ان کی ذات ایک سمندر تھی جس کے دامن میں ہزاروں مجاہدین نے پرورش پائی۔ ان کی ذات اس دور اسلام کا بازوئے شمشیر زن تھا جس نے اسلام کی چودہ سو سالہ عظمت و عزت کا علم سربلند رکھا۔ وہ فقر و استغناء اور سخاوت و حیا میں عثمان رضی اللہ عنہ کا پرتو تھے۔ جہاد و نفس کشی سرفروشی اور بہادری انھیں علی کرم اللہ وجہہ سے ورثہ میں ملی تھی۔

یہ وہ ذات گرامی تھی جس نے ایک تاریخ بنائی ہے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی مورخ نے اپنا قلم رکھ دیا۔ اب حریت پسندی، وطن پروری اور اسلام کے لئے جاں نثاری

---

[۱] ترجمہ از نیوایج، دہلی ۲۳؍ دسمبر ۱۹۵۷ء

کی تاریخ مکمل ہوگئی۔ آنے والی نسلیں اس کو پڑھیں گی۔ سرِ شہ بصیرت سمجھیں گی اور مشعلِ راہ بنائیں گی۔ (ملخص)[1]

ہفتہ وار بیباک سہارنپور اداریہ مولینا زکریا اسعدی مرحوم

۵ر دسمبر کی ایک تاریک ترین رات تھی۔ اس شام کو جہاد حریت کی تاریخ کو ابدی زندگی اور روشنی عطا کرنے والا مجاہد اعظم اپنے مجاہدانہ کارناموں کی تکمیل کرکے دنیا سے جارہا تھا۔ بلاشبہ آج دنیا کا ہر گوشہ ایک خصوصی روشنی سے محروم ہوگیا اور ہر مجلس میں ایک بھیانک اور گہری تاریکی طاری ہوگئی۔ آج ہمارے سامنے شیخ العرب والعجم حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی نہیں ہے۔ دار العلوم دیوبند کا وہ عظیم دار الحدیث اپنے محبوب مکین سے خالی نظر آرہا ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں دار العلوم دیوبند کی رونقیں واپس آنے لگیں گی، جمعیۃ علماء کو بھی صدر اور سرپرست میسر آجائیں گے۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر کچھ ایسے چہرے بھی ہیں جو فی الحقیقت یتیم ہوگئے ہیں۔ وہ غریب مفلس اور بدحال دنیا جو نہ جانے کب سے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی زندگیوں کی روشن داستانیں سنتی چلی آرہی تھی اس کو اب کوئی حسین احمد نہ ملے گا جس کی پوری زندگی صحابہ کا نمونہ اور رسول اللہ کا اسوہ تھی۔ دار العلوم دیوبند کے مہمانانِ رسول کو اب کوئی ایسی محبت و شفقت کے ساتھ سینہ سے نہیں لگائے گا۔ (ملخص)[2]

رسالہ برہان دہلی اداریہ مولینا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم

آہ! کیونکر کہیئے کہ فلک علم و فضل کا آفتاب درخشندہ غروب ہوگیا۔ بزم انس و قدس کی شمع فروزاں گل ہوگئی۔ درج تقویٰ و طہارت کا لعل شب چراغ گم ہوگیا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کا محرم جاتا رہا۔ اخلاق و مکارم اسلامی کے ایوان میں خاک اڑنے لگی۔ ملت

[1] پیامِ مشرق، دہلی [2] بیباک، سہارنپور، ۱۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء

بیضا کا سہارا، فرزندان توحید کی امیدوں کا مرجع پیروان دین محمدی کی تمناؤں کا مرکز راہی ملک عدم ہوگیا، یعنی حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ۵ دسمبر کو بمقام دیوبند ۸۲ سال میں داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون الخ[1]

اسلام میں اعلیٰ اور مکمل زندگی کا تصور یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ساتھ فکر و نظر کی بلندی اور جہد و عمل میں پختگی اور ہمہ گیری ہو اور یہ سب کچھ تعلق باللہ کے واسطے سے ہو۔ مولینا اس دور میں اس معیار پر جس طرح پورے اترتے تھے، ہندو پاک تو کیا پورے عالم اسلامی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولینا جامعیت کمالات و اوصاف کے اعتبار سے بے شبہ شیخ العرب والعجم تھے۔ آج عالم اسلامی یتیم ہوگیا۔ (ملخص)[2]

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ اداریہ شاہ معین احمد ندوی

شیخ الہند مولینا حسین احمد صاحب مدنی کی وفات ملک و ملت کا اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اس پر اظہار سے قلم قاصر ہے۔ یہ تنہا ایک شخص کی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں موت العالم موت العالم ہے

وماکان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

علم و عمل، دین و تقویٰ، سلوک و تصوف، ارشاد و ہدایات، جہاد و جانبازی خلق جلیم و لطف عمیم کس کس چیز کا ماتم کیا جائے۔ وہ اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ اور اسلام کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی ایک ایک ادا سے اسوۂ صحابہ آشکارا تھا۔ ان پر اس سلسلۃ الذہب کی خصوصیات ختم ہوگئیں جس کا آغاز خاندان ولی اللہی سے ہوا تھا۔ (ملخص)[3]

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اداریہ مولینا عتیق الرحمان سنبھلی

آہ! کہ آج بزم عرفان سونی ہے، محراب انسانیت بے نور ہے، مسند علم کی رونق

---

[1] ماہنامہ برہان، دہلی، ماہ دسمبر ۱۹۵۷ء [2] معارف اعظم گڈھ، جنوری ۱۹۵۸ء

جا چکی ہے اور محفل طریقت جان محفل کو رو رہی ہے۔ آہ وہ سلف صالحین کی چلتی پھرتی یادگار، وہ مجسم زہد و ایثار، وہ پیکر تقدس، وہ کوہ استقامت، وہ جلوہ نمائے خلق احمد صلی اللہ علیہ وسلم جسے دیکھ کر ایمان کے بجھے ہوئے ذرات میں تازگی پیدا ہوتی تھی جس کے قرب سے دلوں میں ذوق عمل اور تعلق باللہ کی امنگ پیدا ہوتی تھی۔ اب ہم کہاں دیکھ پائیں گے۔ رودئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد (ملخص)[1]

ماہنامہ تجلّی دیوبند اداریہ عامر عثمانی (مرحوم)

۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء کی سہ پہر کو استاذ محترم حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی وفات کا جو غم انگیز سانحہ پیش آچکا ہے اس سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔ شیخ کے اوصاف کا بیان اس سادہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں ہونا چاہیئے جو صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یا ائمہ و اتقیا نے صحابہ کی توصیف میں اختیار فرمایا۔ مناسب ترین خطاب ان کے لئے مرد مومن ہے اور مرکزی حیثیت ان کے خالص اور راسخ ایمان کی ہے جس کی چاندنی میں وہ قائد اور سپہ سالار کی نہیں سخت کوش سپاہی کی زندگی گزارتے رہے۔ جانتے ہیں آپ اس مرد مومن کی دیانت و پرہیزگاری؟ مرض الموت میں جب کچھ دنوں مدرسے تشریف نہ لے جا سکے اور تنخواہ آئی تو واپس فرما دی۔ اللہ اکبر! یہ ہے وہ مقام جہاں کم از کم آج کے دور زر پرست میں جبریل کے پر جلنے کا محاورہ بولا جا سکتا ہے۔ کیا اسے انتہائی تقویٰ اور دیانت کے سوا بھی کچھ کہا جائے گا۔ شجاعت و پامردی جو انسانیت کا بہترین جوہر سمجھا گیا ہے وہ حضرتؒ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ خوف، جُبن، وہن، بزدلی اور سخن سازی سے تو آپ کی فطرت و طبیعت کو کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ جس وقت جس بات کو آپ کے قلب و ذہن نے حق سمجھا شیروں کی طرح ڈٹ گئے۔ اور ہر حال میں وہی کہا جسے اپنے نزدیک قرآن و سنت کے مطابق سمجھا۔ لگی لپٹی آپ کا شیوہ نہ تھا۔ کھری کہتے تھے اور بے جھجک کہتے تھے۔

---

[1] الفرقان، دسمبر ۱۹۵۷ء

ایک سلیم و سادہ انسان کی طرح آپ کے مزاج میں ایچ پیچ نہیں تھا' نفاق سے چڑ تھی۔ خلاف اسلام وضع قطع کو سخت مکروہ سمجھتے تھے۔ خلاف سنت چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک سچے اور پاک نفس مومن کی طرح حضرت شیخ کو زندگی بھر حب جاہ اور اپنے لئے قصائد مدحیہ سے بیزاری رہی۔ خود میرا اپنا واقعہ ہے کہ ایک جلسہ میں جو حضرت کی صدارت میں ہوا میں نے ایک نظم شروع کی (جس کا ایک مصرعہ آج تک یاد ہے ؎ یہ فخر کچھ کم نہیں ہے عامر کہ ہوں غلام حسین احمد[1]) دو ایک شعروں کے بعد یہ اندازہ کر کے کہ نظم آپ کی منقبت میں کہی گئی ہے فوراً ڈانٹ دیا کہ خرافات بند کرو۔ ناظرین سے چھپا نہیں ہے کہ انہی صفحات میں ہم بارہا شیخ کے بعض خیالات سے اختلاف اور ان کی بعض تحریروں پر تنقید کرتے رہے ہیں[2]۔ آج ہم اپنے ہر اس لفظ کی جس میں سوئے ادب کا شائبہ ہو اپنے ہزاروں ناظرین کو گواہ بنا کر حضرت کی روح سے معافی طلب کرتے ہیں۔ اس موقع پر چند شعر بے اختیار نوک قلم پر آ گئے ہیں وہ پیش ہیں۔ (یہ تین اشعار اس باب کی ابتدا میں نقل کئے جا چکے ہیں)۔

---

[1] ایک دو شعر ناقل الحروف کو بھی یاد ہیں

دیار ہندوستاں میں اپنا چراغ ہے وقف نور پاشی　　بنام پاک حسین احمد نبی کے پیارے وطن کے باشی
چمک رہا ہے بلندیوں پر مقام حسین احمد　　کہاں یہ رتبہ کہ دیکھ پائے نظر مقام حسین احمد

[2] عامر صاحب مرحوم نے تجلی کو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مدح سرائی اور تبلیغ کی طرف موڑ دیا تھا۔

شجرۂ نسب حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ

سیدنا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

سید حبیب اللہ

سید پیر علی

سید جہانگیر بخش

سید شاہ نور اشرف

شاہ مدن

شاہ محمد ماہ شاہی

شاہ خیر اللہ

شاہ صفۃ اللہ

شاہ محب اللہ

شاہ محمود

شاہ لدھن

شاہ قلندر

شاہ منور

شاہ راجو

شاہ عبد الواحد

شاہ محمد زاہدی

شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ

....

سید شاہ زید

سید شاہ احمد زاہد

سید شاہ حمزہ

سید شاہ ابوبکر

سید شاہ عمر

سید شاہ محمد

حضرت مخدوم سید شاہ احمد تو ختہ تمثال رسول (علیہ السلام)

سید علی

سید حسین

سید محمد مدنی المعروف بہ سیدنا ناصر ترمذی

سید حسین

سید موسیٰ ثمہ

سید علی

سید حسین اصغر

سیدنا الامام علی زین العابدین

سیدنا الامام حسین رضی اللہ عنہٗ نبیرہ سیدنا و مولینا

سید الاولین والآخرین، محبوب رب العالمین

محمد المصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

شجرۂ مبارکہ حسینیہ رشیدیہ صابریہ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کو چاروں سلسلوں کے مشائخ سے اجازت بیعت حاصل تھی اور آپ چاروں سلسلوں میں بیعت فرمایا کرتے تھے مگر اذکار و وظائف عموماً طریقۂ چشتیہ ہی کے بتایا کرتے تھے۔ مولانا عبدالجلیل صاحب سلہٹی مقیم خانقاہ حسینیہ دارالعلوم دیوبند نے ان چاروں سلسلوں کے شجرے اس طرح مرتب فرمائے کہ ہر ایک شیخ سلسلے کے وطن اور سنہ وفات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس نمبر میں صرف مشائخ چشتیہ کا شجرہ شائع کیا جارہا ہے کیونکہ حضرتؒ اپنے متوسلین کو یہی شجرہ عنایت فرمایا کرتے تھے۔

نام	مستقر اس مع سنہ ولادت	سنہ وفات	مقام دفن
۱۔ اللّٰھم بجاہ قطب العالم سیدنا و مرشدنا مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز	بمقام بانگر مئو ضلع اناؤ جہاں آپ کے والد ماجدؒ درس دیا کرتے تھے اور وطن اصلی آپ کا اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد، ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ ۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی رات تقریباً ۱۱ بجے	۱۲ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات بعد دوپہر بعمر ۸۱ سال ۶ ماہ ۲۴ یوم قمری اور ۷۸ سال ۲ ماہ ایک یوم شمسی مع یوم پیدائش و وفات	مقبرہ دارالعلوم دیوبند (مقبرہ قاسمی)
۲۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب الزمان مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی ولادت ۶ ذوالقعدہ	بروز جمعہ ۸ر۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت	سنہ وفات	مقام دفن
	۱۲۳۳ھ بروز شنبہ بوقت شب		
۳۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا الحاج الحافظ الشیخ امداد اللہ المہاجر قدس اللہ سرہٗ العزیز	تھانہ بھون ضلع مظفر نگر صوبہ یو۔پی	۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ	مکہ معظمہ
۴۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا نور محمد الجھنجھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	جھنجھانہ ضلع مظفر نگر صوبہ یو۔پی، ولادت ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۹ء	۴ رمضان المبارک ۱۲۵۹ھ	جھنجھانہ ضلع مظفر نگر صوبہ یو۔پی
۵۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالرحیم الشہید قدس اللہ سرہٗ العزیز	افغانستان	۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ	پنجتار ملک ولایت صوبہ سرحد
۶۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالباری الامروہوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی	۶ محرم ۱۲۲۶ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی
۷۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالہادی الامروہوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی	یوم جمعہ ۱۴ رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی
۸۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا عضدالدین الامروہوی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی	۷ رجب المرجب ۱۱۷۱ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی
۹۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ محمد المکی قدس اللہ سرہٗ العزیز	مکہ معظمہ	۱۱ رجب المرجب ۱۱۴۲ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی
۱۰۔ و بجاہ شیخ المشائخ سید الشاہ محمدی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی	۳ رجب المرجب ۱۱۴۲ھ	اکبرآباد موتی گڑھ ضلع مرادآباد صوبہ یو۔پی
۱۱۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا محب اللہ الالہ آبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز	وطن ولادت صدرپور، وطن قیام الہ آباد	۹ رجب المرجب ۱۰۵۸ھ	الہ آباد صوبہ یو۔پی

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت	سنہ وفات	مقام دفن
۱۲۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی سعید الگنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی	۱۰۴۰ھ	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی
۱۳۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا نظام الدین البلخی قدس اللہ سرہٗ العزیز	تھانیسر ضلع کرنال صوبہ پنجاب	۸ یا ۲۲ رجب ۱۰۳۵ھ	تھانیسر ضلع کرنال صوبہ یوپی
۱۴۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا جلال الدین التھانیسری قدس اللہ سرہٗ العزیز	مسکن آپکا تھانیسر ضلع کرنال صوبہ پنجاب ولادت ۸۹۴ھ	۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ	تھانیسر ضلع کرنال صوبہ پنجاب
۱۵۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب العالم شیخ عبدالقدوس الگنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یو۔پی ولادت ۸۶۱ھ	یوم سہ شنبہ ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۰ھ یا ۹۲۵ھ	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی
۱۶۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا محمد الردولی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یو۔پی	۱۷ صفر ۸۹۸ھ	ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی
۱۷۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا احمد العارف الردولی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یو۔پی	۱۷ صفر ۸۷۲ھ	ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یو۔پی
۱۸۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا شیخ عبدالحق الردولی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یو۔پی	۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ھ	ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ یو۔پی
۱۹۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا جلال الدین کبیر الاولیاء الفانی فی الحق قدس اللہ سرہٗ العزیز	پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب	۵ ذی قعدہ یا ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ	پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب
۲۰۔ و بجاہ شیخ المشائخ سیدنا شمس الدین الترک الفانی فی الحق قدس اللہ سرہٗ العزیز	ترکستان	۹ شعبان یا ۱۰ جمادی الثانی ۷۱۶ھ	پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت	سنہ وفات	مقام دفن
۲۱۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا علاء الدین علی احمد الصابر قدس اللہ سرہٗ العزیز	اجودھن غالباً ولادت ۱۹ ربیع الاول ۵۹۴ھ۔ شب پنجشنبہ	۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ	پیران کلیر شریف ضلع سہارنپور یوپی
۲۲۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا فرید الدین شکر گنج الاجودھنی قدس اللہ سرہٗ العزیز	ملتان ولادت غرہ رمضان المبارک ۵۶۹ھ	۵ محرم ۶۶۴ھ یا ۶۹۰ھ یا ۶۷۰ یا ۶۹۰ھ	پاک پٹن شریف
۲۳۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب الدین بختیار الکاکی قدس اللہ سرہٗ العزیز	اوش توابع فرغانہ ولادت شب دوشنبہ	۲۴ یا ۱۴ ربیع الاول ۶۶۳ھ	دہلی، مہرولی شریف
۲۴۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا مرکز الطریقہ معین الدین حسن السنجری قدس اللہ سرہٗ العزیز	سنجرستان یا سیستان	۶ رجب المرجب ۶۳۲ھ (اس میں اختلاف بہت ہے)	اجمیر شریف
۲۵۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ عثمان الہارونی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ ہارون توابع خراسان	۵ شوال ۶۳۳ھ یا ۵۶۷ھ یا ۵۹۰ھ	مکہ شریف متصل مکان شریف صاحب
۲۶۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الحاج السید الشریف الزندنی قدس اللہ سرہٗ العزیز	زندانہ توابع بخارا	۱۳ رجب ۶۲۱ھ	زندانہ بلاد بخارا
۲۷۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا مودودی الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت ولادت ۴۲۰ھ بعہد خلافت القائم باللہ	۵۷۰ھ یا ۵۲۷ھ	چشت
۲۸۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی یوسف الچشتی الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت ولادت ۳۷۵ھ	یکم جمادی الاول ۴۰۰ھ	〃
۲۹۔ دبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی محمد المحترم الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت ولادت محرم شب عاشورہ ۳۳۱ھ	۱۴ ربیع الاول ۴۱۱ھ	〃

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت	سنہ ولادت	مقام وفن
۳۰۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی احمد الابدال الچشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز	چشت ولادت ۲۶۰ھ	غرہ جمادی الثانی ۳۵۵ھ بعہد خلافت المطیع باللہ	چشت
۳۱۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی اسحٰق الشامی قدس اللہ سرہٗ العزیز	شام	۱۴ر جمادی الاول یا آخر ۳۲۹ھ	عکہ از بلاد شام
۳۲۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ممشاد علو الدینوری قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ دینور شہر ہاشے جبل سے ہے نزدیک قزلیین	۱۴ر محرم الحرام ۲۹۹ھ بعہد خلافت المقتدر باللہ	قصبہ دینور
۳۳۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی ہبیرۃ البصری قدس اللہ سرہٗ العزیز	بصرہ ولادت ۱۶۷ھ	۷ر شوال ۲۷۵ھ	بصرہ
۳۴۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا حذیفۃ المرعشی قدس اللہ سرہٗ العزیز	قصبہ مرعش ملک شام نواح دمشق	۱۴ر یا ۲۴ر شوال ۲۵۲ھ بعہد خلافت المستعین باللہ	بصرہ نزد بعض
۳۵۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا السلطان ابراہیم بن ادہم البلخی قدس اللہ سرہٗ العزیز	اصل آپ کی بلخ سے ہے	یکم شوال ۱۰۲ھ یا ۱۶۶ھ	در شام علی الاصح
۳۶۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا فضیل بن عیاض قدس اللہ سرہٗ العزیز	سمرقند	محرم ۱۷۷ھ	مکہ معظمہ بگورستان جنت المعلیٰ
۳۷۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبد الواحد بن زید قدس اللہ سرہٗ العزیز	مدینہ منورہ	۲۷ر صفر ۱۷۶ھ یا ۱۷۸ھ	بصرہ
۳۸۔ وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا امام الاولیاء خواجہ حسن البصری قدس اللہ سرہٗ العزیز	؍؍	یکم رجب المرجب یا ۱۴ر محرم ۱۱۰ھ اس میں اختلاف بہت ہے	؍؍

نام	مسقط راس مع سنہ ولادت	سنہ وفات	مقام دفن
۳۹۔ وبجاہ امیر المومنین باب مدینۃ العلم سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہٗ	مکہ معظمہ ولادت ۱۳ رجب بروز جمعہ واقعہ فیل سے ۳۰ سال بعد	۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ	نجف اشرف غالباً
۴۰۔ وبجاہ سید الانبیاء والمرسلین سیدنا و مولٰنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم طہّر قلبی عما سواک ونورہا بانوار معرفتک وعشقک ووفقنی لما تحبہ وترضاہ وارض عنی فی الدنیا والآخرۃ یا کریم	مکہ معظمہ بروز دوشنبہ ۹ ربیع الاول سال فیل موافق ۴۰ حکومت کسریٰ	دوشنبہ ۹ یا ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بوقت دوپہر	مدینہ منورہ زاد اللہ نورہا

حضرات خلفائے مجازین

بنگلہ دیش

۱۔	مولوی مخلص حسین صاحب مرحوم	سید پور	ڈاکخانہ سید پور	ضلع سلہٹ
۲۔	حاجی عبد الباری صاحب	بھنگا باڑی	،، چھڑ کھائی	،، ،،
۳۔	حاجی ابرو میاں صاحب	تال باڑی	،، ،،	،، ،،
۴۔	مولینا بشیر احمد صاحب	باگا	،، باگا	،، ،،
۵۔	مولوی تقدس علی صاحب	محلہ شیخ	،، بنیا چنگ	،، ،،
۶۔	مولوی سید عبد الخالق صاحب مرحوم	سید پور	،، سید پور	،، ،،
۷۔	ڈاکٹر علی اصغر نوری صاحب	غفر گاؤں	،، کمار گاؤں	،، ،،
۸۔	مولوی حبیب الرحمٰن صاحب	موضع بڑے پور	،، ڈرلب پور	،، ،،
۹۔	سلیمان خاں صاحب مولوی بازاری			،، ،،
۱۰۔	مولوی عبد الرحیم صاحب	پٹری پاڑہ	،، کنائی گھاٹ	،، ،،
۱۱۔	مولوی مجاہد علی صاحب	گنگا جل	،، گنگا جل	،، ،،
۱۲۔	مولوی عبد المتین صاحب چودھری	پھول باڑی مقیم حال	ڈھاکہ دکھن	،، ،،
۱۳۔	مولوی عبد الرحمٰن صاحب	موضع دھولیا	ڈاکخانہ خاگاوڑا	،، ،،
۱۴۔	مولینا تجمل علی صاحب	انگورا محمد پور	،، کوڑا بازار	،، ،،
۱۵۔	مولوی علاء الدین صاحب	بنیا چنگ	،، بنیا چنگ	،، ،،
۱۶۔	مولوی عبد المنان صاحب	موضع اٹھالیا	،، شیٹا جوڑی	،، ،،
۱۷۔	مولوی عبد اللطیف صاحب مولوی بازاری	موضع نالی ہوری	،، اکھاٹل کوڑا	،، ،،
۱۸۔	مولوی سراج الحق صاحب	موضع پران گاؤں	ڈاکخانہ کلیر بھنگا	،، ،،

نمبر	نام	موضع	ڈاکخانہ	ضلع
۱۹۔	مولوی عبدالحق صاحب	موضع غازی نگر	ڈاکخانہ پتھاریا	ضلع سلہٹ
۲۰۔	مولوی عبدالمومن صاحب	موضع پُران گاؤں	〃 کلیر بھنگا	〃 〃
۲۱۔	مولوی یونس علی صاحب	موضع رائے گڈھ	〃 ڈھاکہ دکھن	〃 〃
۲۲۔	مولوی عبدالمنان صاحب	موضع گموئی	〃 بنیاچنگ	〃 〃
۲۳۔	مولوی عبدالغفار صاحب	موضع عمردخانی	〃 غنشی پاڑہ	〃 〃
۲۴۔	مولوی محمد علی صاحب	موضع بلرام پور	〃 غنشی بازار	〃 〃
۲۵۔	مولوی ریاض الرب صاحب	ڈھاکہ دکھن	〃 ڈھاکہ دکھن	〃 〃
۲۶۔	مولینا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم	ساکن چوڑکھائی		〃 〃
۲۷۔	مولینا حسن علی صاحب مرحوم	گورٹن گھاٹ		〃 〃
۲۸۔	مولینا لطف الرحمن صاحب	حامد نگر	〃 بروند	〃 〃
۲۹۔	مولینا حافظ عبدالکریم صاحب	موضع اسلام آباد	〃 لکھی پاشا	〃 〃
۳۰۔	مولینا نور عالم صاحب	مغل بازار مدرسہ	〃 مغل بازار	〃 〃
۳۱۔	مولینا مسعود الحق صاحب حال شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم پوسٹ صدر چاٹگام ڈاؤن	پٹیا	〃 پٹیا	〃 〃
۳۲۔	مولینا مفتی احمد الحق صاحب	مدرسہ معین الاسلام	ڈاکخانہ ہاٹ ہزاری	〃 〃
۳۳۔	مولوی عبدالستار صاحب	فتح پور	〃 مدن بھاٹ	〃 〃
۳۴۔	مولوی احمد شفیع صاحب	مدرسہ معین الاسلام	〃 ہاٹ ہزاری	〃 〃
۳۵۔	مولوی حمید الرحمن صاحب	موضع امام نگر	〃 نظیر ہاٹ	〃 〃
۳۶۔	مولوی عبدالرحمن صاحب	موضع گچی	〃 مہاسنی	〃 〃
۳۷۔	مولوی محمد نعمان صاحب	موضع اندھر پارہ	〃 بھالی کھن	〃 〃
۳۸۔	مولوی محمد ادریس صاحب معرفت ایمان علی صاحب	موضع سارنگ سونزنر	〃 امان اللہ	〃 〃
۳۹۔	مولوی عبدالحلیم صاحب	بیر کھن		〃 〃

۴۰۔ مولوی شمس الدین صاحب معرفت وکیل باڑی کنچن نگر ڈاکخانہ کنچن پور ضلع چاٹگام

۴۱۔ مولوی عبد الغنی صاحب بادل سینیر مدرسہ ڈاکخانہ بارشور ڈانگا ضلع بابنہ

۴۲۔ مولوی ریحان الدین صاحب موضع فرید پور 〃 لکھی پور ضلع نواکھالی

۴۳۔ مولانا دلاور حسین صاحب چاند پوری فینی 〃 فینی 〃 〃

۴۴۔ مولوی عزیز الحق صاحب عدیل پور 〃 چنگا تلی 〃 〃

۴۵۔ مولوی کلیم اللہ صاحب مدرسہ افسر العلوم ننگل کوٹ ضلع پٹرہ

۴۶۔ مولوی محب الرحمٰن صاحب نینوا ڈاکخانہ نینوا 〃 〃

۴۷۔ مولوی علی اشرف صاحب سیرام پور 〃 منتل بازار 〃 〃

۴۸۔ مولانا امین الحق صاحب میمن سنگی جامعہ قرآنیہ محلہ لال باغ ڈھاکہ

۴۹۔ مولوی محمد یونس صاحب باقر گنجی موضع چر خلیفہ ڈاکخانہ رادھا بلب ضلع باقر گنج

۵۰۔ حافظ طیب علی صاحب مرحوم

صوبہ آسام

۵۱۔ مولوی عبد الواجد صاحب موضع ملا گرام ڈاک خانہ موہینا ضلع کچھاڑ

۵۲۔ مولوی سعید علی صاحب امام مسجد درگاہ بٹرشی 〃 کریم گنج 〃 〃

۵۳۔ مولانا مقدس علی صاحب موضع بوڑی بال 〃 غیر گرام 〃 〃

۵۴۔ مولانا عبد الجلیل صاحب شیخ الحدیث ، دار الحدیث بدرپور 〃 〃

۵۵۔ مولانا مصدر علی صاحب دار العلوم بانس کندی 〃 〃

۵۶ مولوی بشارت علی صاحب دار العلوم بانس کندی 〃 〃

۵۷۔ مولانا احمد علی صاحب بدرپوری شیخ الحدیث دار العلوم بانس کندی 〃 〃

۵۸۔ مقبول علی صاحب بانس کندی 〃 〃

۵۹۔ ماسٹر غلام احمد صاحب 〃 〃 〃

۶۰۔ مولوی معین الدین صاحب مدرس دار العلوم 〃 〃 〃

۶۱۔ مولوی جواد علی صاحب 〃 〃 〃 〃

۶۲- ہر مز علی صاحب موضع تاراپور ڈاک خانہ توپ خانہ سلچر ضلع کچھاڑ

۶۳- حافظ محمد مستقیم صاحب محلہ بیرنگا سلچر 〃 〃

۶۴- حافظ مکرم علی صاحب مرحوم بانس کنڈی 〃 〃

۶۵- مولوی محمد اسمٰعیل موضع جلال پور ڈاک خانہ سری گوری ضلع کچھاڑ

۶۶- حافظ شفیق الرحمٰن صاحب بانس کنڈی 〃 〃

۶۷- مولوی قاری عبد المطلب صاحب ساکن بھگاڈر ڈاک خانہ بیرنگا سلچر 〃 〃

۶۸- مولوی قاری عبد الصمد صاحب موضع بوڑی بائل ڈاک خانہ غیز گرام 〃 〃

۶۹- مولوی عبد المصور صاحب ساکن مہاتل ڈاکخانہ بھنگاپور ضلع کچھاڑ

مقیم حال دار الحدیث بدرپور 〃 〃

۷۰- مولوی معتصم علی صاحب موضع محمد پور ڈاک خانہ دکھن رنگ پور۔ ساؤتھ لالہ 〃 〃

۷۱- مولوی ظفر علی صاحب مدرسہ اسلامیہ الگاپور ڈاک خانہ الگاپور بازار 〃 〃

۷۲- مولوی عبد الحق صاحب موضع محمد پور ڈاک خانہ دکھن رنگ پور ساؤتھ لالہ 〃 〃

۷۳- مولوی عبد الحق صاحب عاصم گنجی موضع سات گھری ڈاک خانہ موہینا 〃 〃

۷۴- حافظ عبد النور صاحب کریم گنجی موضع گندر نجانی ڈاک باڑی گرام 〃 〃

۷۵- مولوی جلال الدین صاحب سوناتولی ساکن کھودراکنڈی ڈاکخانہ کالی گنج بازار 〃 〃

(حال مقیم گنفٹ ہائی اسکول، شیلانگ)

۷۶- حافظ عبد الرحیم صاحب ساکن ملاگرام۔ ڈاک خانہ موہینا 〃 〃

۷۷- محمد نجابت علی صاحب ساکن کھدراکنڈی ڈاک خانہ کالی گنج بازار 〃 〃

۷۸- عبد المالک صاحب ساکن بٹرشی ڈاک خانہ کریم گنج 〃 〃

۷۹- حاجی شمس الحق صاحب ساکن بٹرشی ڈاک خانہ کریم گنج 〃 〃

۸۰- حاجی محبت علی صاحب ساکن سونا باڑی گھاٹ 〃 〃

۸۱- مولوی رحیم الدین صاحب امام مسجد جامع بانس کنڈی 〃 〃

۸۲- مولوی محسن علی صاحب مدرس دار العلوم بانس کنڈی 〃 〃

۸۳۔ فرمان علی صاحب بانس کندی ضلع کچھار

۸۴۔ مولوی اصدر علی صاحب ساکن روپائی بالی 〃 〃

۸۵۔ مولوی عبدالرزاق صاحب انگا پور 〃 〃

۸۶۔ مولوی منذر علی صاحب تارا پور 〃 〃

۸۷۔ مولوی امان اللہ صاحب مرحوم کریم گنجی ساکن شوڑی کنڈی ڈاکخانہ واشر بازار 〃 〃

۸۸۔ مولوی کریم الدین صاحب بانس کندی 〃 〃

۸۹۔ مولوی سید احمد صاحب موضع رنگ پور دکھن رنگ پور ساؤتھ لاٹ 〃 〃

۹۰۔ مولوی عبدالباری صاحب ساکن نیتائی نگر ڈاک خانہ نیتائی نگر بازار 〃 〃

۹۱۔ مولوی محمد اسحٰق صاحب مدرسہ عربیہ اسلامیہ مسجد
ڈھاکائی پٹی ساکن گدھی ماری ڈاک خانہ دوگاؤں ضلع ونگاؤں

۹۲۔ مولوی ضمیر الدین صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول ڈھوبری ضلع گوال پاڑہ

صوبہ بہار

۹۳۔ مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرحوم مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ

۹۴۔ اظہر حسین صاحب موضع پورائن ڈاک خانہ بونسی ضلع بھاگل پور

۹۵۔ حاجی محمد ایوب صاحب موضع چلبل ڈاک خانہ پارہ ہاٹ 〃 〃

۹۶۔ خلیل الرحمٰن صاحب 〃 〃 〃 〃 〃

۹۷۔ مولوی محمد یعقوب صاحب موضع بجورا 〃 سنہولا ہاٹ 〃 〃

۹۸۔ اشرف علی صاحب موضع عظمت پور 〃 نرائن پور 〃 〃

۹۹۔ عبدالرحمٰن صاحب 〃 〃 〃 〃 〃

۱۰۰۔ حاجی مظہر الحق صاحب سمریا 〃 〃

۱۰۱۔ مولوی محمد انور صاحب ساکن کیتھا ٹیکر 〃 کرپال پرسا 〃 〃

۱۰۲۔ حکیم فدا حسین صاحب موضع سمریا 〃 〃

۱۰۳۔ حکیم عبدالسلام صاحب کوروڈیہ 〃 پورینی 〃 〃

۱۰۴۔ حاجی احمد حسین صاحب موضع سنھولی ڈاک خانہ پورینی ضلع بھاگلپور

۱۰۵۔ مولینا قاری فخرالدین صاحب جامعہ قاسمیہ شہر گیا

۱۰۶۔ مولینا نبیہ حسن صاحب موضع کوہ مرئی ڈاک خانہ پنجرانواں ضلع گیا

۱۰۷۔ حاجی منہاج الدین صاحب تمباکو مرچنٹ دھامی ٹولہ شہر گیا

۱۰۸۔ مولوی عبداللہ صاحب چھپردی موضع وڈاک خانہ مانجھا اسٹیٹ ضلع سارن

۱۰۹۔ حاجی محمد عاقل صاحب حیاگھاٹ بلاسپور ضلع دربھنگہ

۱۱۰۔ مولوی محمد ازہر صاحب موضع وڈاک خانہ رنخورس براستہ کمتول 〃 〃

۱۱۱۔ مولوی عبدالرشید صاحب موضع مبارک پور ڈاک خانہ سکھوا بازار ضلع مونگیر

۱۱۲۔ قاری مہدی بخاری صاحب مدرسہ تجوید القرآن جامع مسجد شہر مونگیر

۱۱۳۔ مولوی ادریس صاحب موضع ٹوکٹہ ڈاک خانہ اسلام پور ضلع پورنیہ

۱۱۴۔ مولوی اظہر صاحب موضع اورنگ آباد ضلع گیا۔ مقیم حال برواڈیہہ گریڈیہہ ضلع ہزاری باغ

صوبہ یو۔پی

۱۱۵۔ مولینا نعیم اللہ صاحب موضع بھولے پور ڈاک خانہ ہنسور ضلع فیض آباد

۱۱۶۔ مولوی عبدالجبار صاحب ہنسور 〃 〃 〃 〃

۱۱۷۔ مولوی حافظ محمد طیب صاحب (نابینا) قصبہ بھدرسہ محلہ آمنہ بی بی کا احاطہ 〃 〃

۱۱۸۔ مولوی فیض اللہ صاحب گونڈوی مدرسہ احمدیہ مغلپورہ شہر فیض آباد

۱۱۹۔ مولینا اویس صاحب استاذ ندوۃ العلماء قصبہ نگرام ضلع لکھنؤ

۱۲۰۔ مولینا محمد یونس صاحب مرحوم قصبہ بگھرہ ضلع مظفرنگر

۱۲۱۔ حافظ عبداللطیف صاحب مرحوم امام جامع مسجد گڑھی پختہ 〃 〃

۱۲۲۔ حکیم محمد سلیمان صاحب مرحوم و مغفور موضع وڈاک خانہ نولی ضلع غازیپور

۱۲۳۔ مولینا قاری اصغر علی صاحب سہنس پوری مدنی منزل دارالعلوم دیوبند ضلع سہارن پور

۱۲۴۔ مولینا سید محمود حسن صاحب موضع پٹھیڑ برتھا کائستھ عرف پٹھیڑ کلاں 〃 〃

۱۲۵۔ مولوی ہدایت علی صاحب مدرسہ ہدایت المسلمین کرہی ڈاک خانہ دودھارا ضلع بستی

۱۲۶۔ مولوی قطب اللہ صاحب موضع جھکھیا ڈاک خانہ ظفر کوٹ سری ضلع بستی
۱۲۷۔ مولوی سید محمد احمد صاحب مرحوم نگینہ ضلع بجنور
۱۲۸۔ مولوی عزیز الرحمٰن صاحب مہتمم یتیم خانہ شہر بجنور
۱۲۹۔ مولوی سید احمد شاہ صاحب مراد آبادی انٹر کالج 〃 〃
۱۳۰۔ مولوی عبد الحیٔ صاحب موضع انجان شہید ضلع اعظم گڑھ
۱۳۱۔ مولوی صفات اللہ صاحب محلہ بلاقی پورہ مئو ناتھ بھنجن 〃 〃
۱۳۲۔ مولوی مشتاق احمد صاحب مدرسہ دار العلوم قاضی دالوں پورہ 〃 〃 〃
۱۳۳۔ حاجی محمد احمد صاحب قصبہ مہگاؤں ضلع الٰہ آباد
۱۳۴۔ کریم بخش صاحب آزاد کان بجناب اکبر حسین صاحب چھپائی والی گلی کرنیل گنج شہر کان پور
۱۳۵۔ مولٰنا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی مدرس مدرسہ چلّہ۔ امروہہ ضلع مراد آباد
۱۳۶۔ مولوی محمود احمد صاحب جامع مسجد حسن پور 〃 〃

صوبہ مغربی بنگال

۱۳۷۔ مولٰنا احمد اللہ صاحب برن پور مسلم ہائی اسکول ڈاک خانہ برن پور ضلع بردوان
۱۳۸۔ مولوی عبد الخالق صاحب شانتی باغ 〃 شیرو رائے 〃 〃
۱۳۹۔ غلام محی الدین صاحب رحمت نگر 〃 برن رائے 〃 〃
۱۴۰۔ مولوی عبد اللہ صاحب کوارٹر ۳ لائن ۵ء۸ برن پور ضلع بردوان
۱۴۱۔ مولٰنا محمد طاہر صاحب کریم گنجی مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ شہر کلکتہ

صوبہ مدھیہ پردیش

۱۴۲۔ حافظ عبد اللطیف صاحب (نابینا) مدرسہ عربیہ اسلامیہ بیجناتھ پارا ضلع رائے پور

صوبہ مدراس

۱۴۳۔ جناب سی بشیر احمد صاحب ۱۲ محمد رضا اسٹریٹ پرنام بٹ ضلع شمالی ارکاٹ
۱۴۴۔ جناب مولٰنا شیخ حسن صاحب مالاباری شیخ الحدیث مدرسہ باقیات الصالحات
ویلور ضلع شمالی ارکاٹ

صوبہ مشرقی پنجاب

۱۴۵۔ مولانا نیاز محمد صاحب مدرسہ عربیہ اسلامیہ قصبہ نوح ضلع گوڑ گانوں
۱۴۶۔ مولوی جمیل احمد صاحب معرفت مولانا نیاز محمد صاحب " " " "
۱۴۷۔ میاں جی محمد رمضان صاحب موضع مالب " "

دلّی

۱۴۸۔ جناب منشی اللہ دتہ صاحب تبلیغی مرکز نظام الدین نئی دہلی
۱۴۹۔ قاری عبدالشکور صاحب سہنس پوری امام حوض والی مسجد نئی سڑک دہلی

پاکستان

۱۵۰۔ مولوی خورشید احمد صاحب قصبہ عبدالحکیم ضلع ملتان
۱۵۱۔ مولوی حامد میاں صاحب دیوبندی مسلم مسجد چوک انار کلی لاہور
۱۵۲۔ مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب سلیمانی دواخانہ فیض باغ لاہور
۱۵۳۔ مولوی منظر حسین صاحب بمقام بھیں تحصیل چکوال ضلع جہلم
۱۵۴۔ مولوی رحمت اللہ صاحب مدرسہ عربیہ موذب چک $\frac{1}{3.N.B}$ ڈاک خانہ ہیڈ راز قان ریاست بہاول پور
۱۵۵۔ مولوی عبدالحق صاحب دامانی موضع شیر دکنہ ڈاک خانہ کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں

بمبئی

۱۵۶۔ حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب مرحوم سملک ڈاک خانہ ڈابھیل ضلع سورت
۱۵۷۔ مولانا عبدالصمد صاحب کاچھوی مرحوم " "
۱۵۸۔ مولانا عبدالصمد صاحب موضع وانکانیر ڈاک خانہ بارودلی " "
۱۵۹۔ مولانا عبدالغفور صاحب قریشی مدرسہ فرقانیہ شہر عثمان آباد
۱۶۰۔ سید سلیمان شاہ صاحب قادری " "
۱۶۱۔ سید بدیع الدین صاحب ضلع عثمان آباد
۱۶۲۔ مولانا عبدالحکیم صاحب " "

۱۶۳۔ سید طالب علی صاحب مہتمم مدرسہ مصباح العلوم	شاستور تعلقہ لاتور		ضلع عثمان آباد
۱۶۴۔ مولوی عبدالصمد صاحب	شاستور	تعلقہ عمرگہ	″ ″

برما

۱۶۵۔ مولوی مظفر احمد صاحب	موضع مینگزی	ڈاک خانہ بوسیڈانگ	ضلع اکیاب

جنوبی افریقہ

۱۶۶۔ مولانا بایزید صاحب شہید	رسٹن برگ	ٹرانسوال	(جنوبی افریقہ)

۱۶۷۔ صاحبزادہ محترم مولانا اسعد صاحب زید مجدہم (باجازت خلفاء)

کتابیات

کتاب	مصنف	ناشر
۱۔ نقش حیات	شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ	مکتبۂ دینیہ، دیوبند
۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام	مرتبہ: مولانا نجم الدین اصلاحی	مکتبۂ دینیہ، دیوبند
۳۔ تذکرۃ الرشید	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	مکتبۂ اشاعت العلوم، سہارنپور
۴۔ تحریکِ خلافت	قاضی عدیل عباسی	انجمن ترقی اردو، دہلی
۵۔ سفرنامہ اسیرِ مالٹا	شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ	دیوبند
۶۔ تذکرہ حضرت مدنی رح	مولانا راشد حسن عثمانی	راشد کمپنی، دیوبند
۷۔ EIGHT LIVES	راج موہن گاندھی	
۸۔ آپ بیتی	مولانا زکریا صاحب	اشاعت العلوم، سہارنپور
۹۔ حضرت مدنی کے حیرت انگیز واقعات	مولانا عبدالحق سہنس پوری	مکتبۂ دینیہ، دیوبند
۱۰۔ حیات شیخ الاسلام	مولانا محمد میاں	الجمیعۃ بک ڈپو، دہلی
۱۱۔ سوانح قاسمی		دیوبند
۱۲۔ انڈین مسلمس	پروفیسر محمد مجیب	دہلی
۱۳۔ شیخ الاسلام: ایک سیاسی مطالعہ	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	کراچی (پاکستان)
۱۴۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل	مولوی طفیل احمد منگلوری	نظامی پریس، بدایوں
۱۵۔ ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	مکتبہ جامعہ، دہلی
۱۶۔ آٹو بائیگرافی	جواہر لال نہرو	
۱۷۔ ۱۸۵۷ء کی دستاویزیں		مکتبہ شاہراہ، دہلی
۱۸۔ مجموعۂ لیکچرز سرسید احمد خاں		
۱۹۔ مرقع اجتماعات احمد آباد		

کتاب	مصنف	ناشر
۲۰۔ محمد علی کی یاد میں	صباح الدین عبدالرحمٰن	مکتبۂ معارف، اعظم گڑھ
۲۱۔ اُردو ادب کی بازیافت	ری پرنٹ رسالہ زبان کاٹھیاواڑ	خدابخش لائبریری، پٹنہ
۲۲۔ خطباتِ آزاد	مرتبہ: مالک رام	دہلی
۲۳۔ حیاتِ جاوید	مولینا حالی	دہلی
۲۴۔ سیرتِ شیخ الاسلام	مولینا نجم الدین اصلاحی	مکتبۂ دینیہ، دیوبند
۲۵۔ مسٹر جناح کا پراسرار معمہ	حضرت شیخ الاسلام مدنی	الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی
۲۶۔ شاہراہِ پاکستان	چودھری خلیق الزماں	پاکستان
۲۷۔ انڈیا ونس فریڈم	مولینا ابوالکلام آزاد	اورینٹ لانگ مین، دہلی
۲۸۔ علامہ اقبال اور مولینا محمد علی	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	کراچی
۲۹۔ حضرت شیخ الاسلام: حیات و کارنامے	ڈاکٹر رشید الوحیدی	الجمعیۃ بکڈپو، دہلی
۳۰۔ دیوبند اسکول اینڈ ڈیمانڈ فار پاکستان	ضیاء الحسن فاروقی	ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی
۳۱۔ تحریکِ پاکستان پر ایک نظر	مولینا حفظ الرحمٰن	الجمعیۃ بکڈپو، دہلی
۳۲۔ پاکستان کیا ہے	حضرت شیخ الاسلام مدنی	〃 〃 〃
۳۳۔ قائد اعظم کے پچھتر سال	خواجہ رضی حیدر	کراچی
۳۴۔ خطبۂ صدارت لاہور	حضرت شیخ الاسلام مدنی	دہلی
۳۵۔ خطبۂ صدارت سہارنپور	〃 〃 〃	〃
۳۶۔ مولینا آزاد ڈائری	یحییٰ ابن اختر انصاری	دھولیہ
۳۷۔ مآثرِ شیخ الاسلام	اسیر ادروی	دیوبند
۳۸۔ کشفِ حقیقت	حضرت شیخ مدنی	〃
۳۹۔ مآثر الاجداد	منظور الحق صدیقی	کراچی
۴۰۔ قائد اعظم، جیسا کہ میں جانتا ہوں	ابوالحسن اصفہانی	〃
۴۱۔ نہرو میکنگ آف انڈیا	ایم۔ جے۔ اکبر	دہلی
۴۲۔ وانٹ آفٹر وانٹ	〃	〃

کتاب	مصنف	مقام
۴۳۔ آدھی رات کی آزادی	لیری کولنس	سری نگر (کشمیر)
۴۴۔ ماؤنٹ بیٹن:		
ایں۔ او فیشیل بایوگرافی	فلپ زیگر	لندن
۴۵۔ شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	کراچی
۴۶۔ جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی	ڈاکٹر کلیم عاجز	دہلی
۴۷۔ خمیرۂ جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	مکتبہ جامعہ، دہلی
۴۸۔ اختلاف امت اور صراط مستقیم	مولانا محمد یوسف لدھیانوی	کراچی
۴۹۔ خلافت و ملوکیت	مولانا مودودی	
۵۰۔ مسئلۂ ایمان و عمل	حضرت شیخ مدنی	دہلی
۵۱۔ ایک شخص ایک کارواں		"
۵۲۔ فتنۂ مودودیت	مولانا محمد زکریا	
۵۳۔ مراسلت حضرت مدنی اور امیر جماعت اسلامی		دہلی
۵۴۔ جماعت اسلامی میں میری شرکت	مولانا محمد منظور نعمانی	لکھنؤ
۵۵۔ تعبیر کی غلطی	مولانا وحید الدین خاں	دہلی
۵۶۔ معاصرین	مولانا عبد الماجد دریابادی	لکھنؤ
۵۷۔ جناح کریٹر آف پاکستان	ہکٹر بولیتھو	لندن
۵۸۔ نزہۃ الخواطر	مولانا سید عبد الحی صاحبؒ	حیدرآباد
۵۹۔ پیغام آزاد و مدنی		دیوبند
۶۰۔ تاریخ تحریک آزادی ہند	ڈاکٹر تارا چند	ترقی اردو بیورو نئی دہلی

رسالے

رسالہ		مقام
۶۱۔ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر		دی پرنٹ پاکستان
۶۲۔ الرشید مدنی و اقبال نمبر		ساہیوال پاکستان
۶۳۔ الفرقان جنوری سنہ ۱۹۵۰ء		لکھنؤ

۶۴۔ الجمعیۃ قومی جمہوری کنونشن نمبر — دہلی

۶۵۔ الجمعیۃ دارالعلوم دیوبند نمبر — "

۶۶۔ بینات مولانا محمد یوسف نمبر — کراچی

۶۷۔ مسلم انڈیا — سید شہاب الدین — دہلی

۶۸۔ چراغِ راہ نظریۂ پاکستان نمبر، دسمبر ۱۹۶۰ء — کراچی

۶۹۔ اُردو ڈائجسٹ — الطاف حسین قریشی — لاہور

۷۰۔ الجمعیۃ مجاہدِ ملت نمبر — دہلی

۷۱۔ الفرقان — شعبان و رمضان سنہ — لکھنؤ

۷۲۔ خطبۂ صدارت — سنہ ۱۹۴۸ء — حضرت مدنی — دہلی

۷۳۔ " — سنہ ۱۹۴۹ء — " — "

۷۴۔ " — سنہ ۱۹۵۱ء — " — "

۷۵۔ عصرِ حاضر میں دین کی تشریح — مولانا ابوالحسن علی ندوی — "

۷۶۔ حضرت مدنی صحافت کی نظر میں — دیوبند

۷۷۔ خطبۂ صدارت — سنہ ۱۹۵۵ء — حضرت مدنی — دہلی

۷۸۔ " — سنہ ۱۹۵۶ء — " — "

۷۹۔ سہ روزہ مدینہ — بجنور

۸۰۔ النہضۃ الاسلامیہ فی الجزائر الحدیثہ — مصنفہ شیخ ترکی رابحؒ ۴

اشاریہ

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ
وَ
یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ

یہ تکلیفیں، یہ تاریکیاں اور یہ مصیبتیں مایوسی
کی نہیں ایک روشن مستقبل کی علامت ہیں،
اس اندھیرے کے بعد اُجالا ضرور ہوگا۔
مگر یاد رکھیے!
اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری زندگیاں،
ہمارے اعمال و افعال اور اخلاق و کردار نمونہ
اور مثال ہوں۔ ان میں خلوص اور للٰہیت ہو۔

'شیخ الاسلامؒ'

اسکولوں اور مدرسوں کیلئے

عام فہم آسان زبان اور دلچسپ اسلوب میں

تاریخِ اسلام پر بہترین کتابیں

مؤلفہ مولانا فرید الوحیدی

رسولِ عربی اردو — ۱۰ روپے

رسولِ عربی ہندی — ۱۰ روپے

رسولِ عربی انگریزی — ۱۰ روپے

خلافتِ راشدہ اردو حصہ اول — ۱۲ روپے

خلافتِ راشدہ اردو حصہ دوم — ۱۰ روپے

تالیفات ڈاکٹر رشید الوحیدی

خلافتِ بنی اُمیہ اردو — ۱۲ روپے

اسلامی علوم اردو — ۱۵ روپے

اسلامی علوم ہندی — ۱۵ روپے

دلچسپ کہانیاں (بچوں کیلئے) ۶ روپے

یہ کتابیں چالیس برس سے ہندوستان کے بہت سے مدارس اور اسکولوں، دار العلوم دیوبند، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ قاسمیہ مرادآباد وغیرہ وغیرہ اور بیرون ملک انگلینڈ اور ساؤتھ افریقہ وغیرہ کے بعض مدارس میں داخلِ نصاب ہیں۔

ملنے کا پتہ

قومی کتاب گھر 61/1 ذاکر نگر۔ نئی دہلی 110025

اسکولوں اور مدرسوں کیلئے

عام فہم آسان زبان اور دلچسپ اسلوب میں

تاریخِ اسلام پر بہترین کتابیں

مؤلفہ مولانا فرید الوحیدی

رسولِ عربی اُردو — ۱۰ روپے

رسولِ عربی ہندی — ۱۰ روپے

رسولِ عربی انگریزی — ۱۰ روپے

خلافتِ راشدہ اردو حصہ اوّل — ۱۲ روپے

خلافتِ راشدہ اردو حصہ دوم — ۱۰ روپے

تالیفات ڈاکٹر رشید الوحیدی

خلافتِ بنی اُمیہ اُردو — ۱۲ روپے

اسلامی علوم اُردو — ۱۵ روپے

اسلامی علوم ہندی — ۱۵ روپے

دلچسپ کہانیاں (بچوں کیلئے) ۱۰ روپے

یہ کتابیں چالیس برس سے ہندوستان کے بہت سے مدارس اور اسکولوں، دارالعلوم دیوبند، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ قاسمیہ مرادآباد وغیرہ وغیرہ اور بیرونی ممالک انگلینڈ اور ساؤتھ افریقہ وغیرہ کے بعض مدارس میں داخلِ نصاب ہیں۔

ملنے کا پتہ

قومی کتاب گھر ۱/۶۱ ذاکر نگر۔ نئی دہلی 110025